سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
بازی گر
PDFBOOKSFRE.PK
چوتھا حصہ

پیرو اُن سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ منیر علی تیزی سے بولے۔
"خدا ہمیں اس کا اجر ضرور دے گا۔ یہ خدا اور رسول کا واسطہ دے رہے ہیں۔ شاید ہمارا یہی سلوک ان کے قلوب بدلنے کا سبب بن جائے۔" منیر علی جانے کیا کیا کہتے رہے۔
پیرو کے شانے جھک گئے۔ اُس کی شعلہ بار آنکھیں بھی جیسے بجھ گئیں۔ چند لمحے وہ ساکت کھڑا رہا، پھر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا اور کمرے سے نکل گیا۔

باہر راہ داری میں روشنیاں دھندلانے لگی تھیں۔ صبحِ کاذب کا وقت ہو گا۔ وہ اتنی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلے تھے جیسے صدیوں سے ہماری قید میں ہوں۔ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے وہ راہ داری میں اندھا دھند بھاگے تھے۔ دروازے سے بھی وہ ایک ہی وقت میں ایک ساتھ نکل جانا چاہتے تھے۔ اُن کی بندوقیں خالی کر کے اُنھیں لوٹا دی گئی تھیں۔ چار تمنچے چھوڑ کے باقی تمنچے بھی اُنھیں واپس کر دیے گئے تھے۔ راہ داری سے وہ چبوترے پر آئے تو اُن کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ اندر عمارت کی نسبت باہر سبزہ زار میں اندھیرا اور ٹوٹا ہوا تھا۔ اُن کی بھگدڑ کی آوازیں اِدھر اُدھر چھپے ہوئے اُن کے پانچ منتظر ساتھیوں تک بھی پہنچ گئی ہوں گی۔ شاید اسی لیے اُنھوں نے

نہ کوئی اشارہ کیا تھا، نہ صدائیں بلند کی تھیں۔ یقیناً وہ اُنھیں بھول تو نہیں گئے ہوں گے۔ اُن کا رُخ سیدھا صدر دروازے کی طرف تھا اور ہم بھی اُن کے پیچھے تمنچے تانے لپکتے رہے تھے لیکن ہم دالان کے چبوترے سے آگے نہیں گئے۔ مَیں نے اسی اثنا میں دو بندوق بردار آدمیوں کو صدر دروازے کے بائیں طرف پھیلے ہوئے سبزہ زار میں درختوں کی اوٹ سے نکلتے دیکھا تھا مگر روشنی اتنی نہیں تھی کہ وہ ہمیں صاف نظر آ سکتے۔ عمارت سے بھاگنے والوں نے چبوترے سے صدر دروازے کا فاصلہ آناً فاناً طے کیا تھا اور آخر میں صرف ایک بار ہمیں مڑ کے دیکھا تھا۔ اتنی دیر بھی اُنھیں اپنے زخمی ساتھیوں کی وجہ سے لگی۔ اُن میں سے دو سہارے کے بغیر نہیں چل سکتے تھے۔ کچھ دیر پہلے پیرو نے

جس شخص پر ضربیں لگائی تھیں، اُس کی حالت بھی بہت ابتر تھی۔ صدر دروازے کے قریب پہنچ کے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور سناٹے میں لمحوں تک اُن کے بھاگتی چاپوں کی گونج سنائی دیتی رہی۔ شامو نے کمرے میں اُن کے نکلنے سے پہلے ابّا جان سے اجازت مانگی تھی کہ اُنھیں کسی نشانی کے بغیر نہیں جانے دینا چاہیے۔ جمر وادر مارتی نے بھی اشارتاً ابّا جان سے یہی اصرار کیا تھا۔ اُن کی مراد تھی کہ کم از کم اُن سب کی ناک چاقو سے کاٹ دی جائے۔ یہ سن کے ابّا جان خاموش رہے، اُن کے چاقو جیبوں سے نہ نکلے۔ البتّہ کمرے سے سرغنہ اور اُس کے ساتھیوں کے باہر آتے وقت جو بھی مارتی اور شامو کے سامنے آیا، اُسے اُنھوں نے ٹھوکروں اور لاتوں سے بے دریغ ہنکایا۔ بندوقیں اُنھیں واپس کی جا چکی تھیں۔ کمرے میں پڑی ہوئی چھوٹی تکونی میز ٹنگو کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اُس نے اُچھل اُچھل کے اُسی سے اُن کی کمر اور کولھوں کو نشانہ بنایا۔ زورا نے اتنی تیزی سے ایک آدمی کے سر سے اپنا سر ٹکرایا تھا کہ خود اُس کے سر میں بھی گومڑا پڑ گیا ہو گا۔ کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کمرے سے نکل کے وہ بس بے تحاشا بھاگتے رہے۔ اُن کی اس حواس باختگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ صبح ہونے والی تھی۔ ہمارے لیے بھی یہی بہتر تھا کہ وہ اندھیرے ہی میں یہاں سے نکل جائیں اور جتنی دور جا سکتے ہوں، چلے جائیں۔

✿

کچھ دیر پہلے ہلکی ہلکی پھوار پڑی تھی، جھلّا سا۔ درختوں کے پتّے اور سبزہ بھگوتی ہوئی بادل کی ٹکڑیاں پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی تھیں اُن کے جاتے ہی چبوترے اور سبزے پر دھوپ اتر آئی تھی، گہری چمکیلی دھوپ لیکن ایسی تیز نہیں تھی۔ حیدر آباد کی دھوپ ویسے بھی نرم ہوتی ہے۔ اُس وقت دس بجے ہوں گے۔ سبھی سبزہ زار پر آ کے بیٹھ گئے تھے۔ ابّا جان کے آ جانے سے اُن کی کمی بھی پوری ہو گئی۔ کانتے بھی وہاں موجود تھا۔ اُس کے ماتھے اور ہاتھ پر پٹّیاں بندھی ہوئی تھیں ابّا جان کے چہرے پر بھی جگہ جگہ ہلدی کے دھبّے پڑے تھے۔ اُن کا سارا ہی چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ادھڑے ادھڑے سے ہونٹ، کٹے پھٹے گال، کسی تکلیف کے آثار بظاہر نظر نہیں آ رہے تھے لیکن انھیں اپنی تکلیفیں چھپانے کا خوب ملکہ تھا۔ مُغل آرام کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھا حقّے کی منال چوس رہا تھا۔ سب دُھلے دھلائے اُجلے اُجلے لگ رہے تھے۔ گو سبھی کی آنکھیں بوجھل تھیں اور جسم بھاری بھاری، اُن لوگوں کے جانے کے بعد کوئی بھی ایک لمحے نہیں سویا تھا۔ مُغل کے کہنے پر اُس وقت سبھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے لیکن نیند کسی کو بھی نہیں آئی۔ صبح ہونے میں وقت بھی کتنا رہ گیا تھا۔ جیسے ہی دن نکلا، سب نہا دھو کے باہر آ گئے۔ مُغل اور پیرو دالان میں کرسی بچھائے وہاں پہلے سے موجود تھے، انھیں یوں قریب بیٹھے دیکھ کے اب شاید کسی کو کوئی حیرت نہ ہوئی ہو۔ علی الصّباح اُن لوگوں کو صدر دروازے سے جاتا دیکھ کے ہم اندر آئے تھے تو پیرو اندر داخل ہوتے ہی مُغل کے گلے سے لگ گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اُس وقت مجھے شائبہ تک نہیں ہوا تھا۔ غالباً کسی کو بھی گمان نہ ہو گا کہ یہ سب کچھ عمداً تھا اور مُغل کے اشارے پر تھا۔ اسی طرح اُن پر یہ تاثر قائم کیا جا سکتا تھا کہ اُنھیں چھوڑ دینے کا فیصلہ کسی سوچے سمجھے ارادے سے نہیں بلکہ حادثاتی ہے۔ اُن کی قسمت اچھی تھی کہ ہمارے درمیان دو بزرگ موجود تھے۔ اُنھیں اچھی طرح جتا دیا گیا تھا کہ اُن کی سزائیں کتنی سنگین اور شدید ہو سکتی ہیں۔ ہمارے مابین اختلاف کے بعد ہی اُن پر ایسا کوئی تاثر قائم ہو سکتا تھا ابّا جان اور منیر علی کا فیصلہ سن کے اُنھیں خوف تھا کہیں دوسرے ہی لمحے ہم میں سے کسی کے سر میں کچھ سما نہ جائے۔ کوئی بھی سرکشی پر آمادہ ہو سکتا ہے، بزرگوں کی پاس داری بھی ایک حد تک ہوتی ہے۔ اسی لیے واپسی کے وقت اُنھیں ایسی وحشت تھی۔ انھیں یہ خیال نہ ہوا ہو گا کہ ہمارے پاس انھیں یوں چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم نے تو ایک طرح سے اُن کی حفاظت کی تھی کہ وہ اپنے پیروں پر واپس جائیں اور اُن کے جسم ضربوں کے نشانات سے محفوظ رہیں۔ یہ نشانات ہمارے راستے میں نہ جانے اور کیسی کیسی دیواریں حائل کر سکتے تھے۔

جن تین ملازموں کو رات اُنھوں نے سب سے پہلے اپنے حصار میں لیا تھا اُن میں سے دو سبزہ زار میں مصروف تھے۔ ایک کے سر پہ پٹّی بندھی ہوئی تھی، دوسرا کسی قدر بہتر تھا۔ تیسرے کی حالت کچھ زیادہ ہی ابتر ہو گی، وہ وہاں نہیں تھا۔ اُن کی آنکھوں میں ابھی تک دہشت بیٹھی ہوئی تھی، آہٹ پر چونک پڑتے تھے۔ تاہم ہماری کرسیوں کے آگے رکھی ہوئی گول میزوں پر اُنھوں نے چائے لا کے رکھ دی تھی اور ناشتے کی قابیں سجا دی تھیں۔ خاص دان میں پان بھی رکھے ہوئے تھے۔ سب نے بس رسمی سا ناشتہ کیا اور مسلسل چائے پیتے رہے۔ منیر علی وہیں کچھ دُور درخت کے سائے میں جا نماز پر سر جھکائے آہستہ آہستہ کلامِ پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ باقی سب چُپ بیٹھے تھے، جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں۔ سب بار بار ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے اور نگاہیں جھکا لیتے۔ پیرو نے درمیان میں کئی مرتبہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی کوشش کی مگر سب ہوں ہاں کر کے خاموش ہو جاتے۔ وقت گزرنے کے بعد اب اندازہ ہو رہا تھا کہ گزری ہوئی رات کتنی کالی تھی کسی نے

اتنی طویل رات کبھی نہ کاٹی ہو گی، معلوم ہوتا تھا جیسے سورج اپنی سمت بھول گیا ہے۔ کسی سے ذرا بھی لغزش ہو جاتی تو ہم اِس وقت یہاں اس طرح نہ بیٹھے ہوتے۔ یقیناً وہ ہم میں سے کسی کو ختم کرنے کے ارادے سے نہیں آئے تھے لیکن اُن کے پاس ہتھیار بھرے ہوئے تھے، اُن سے نہیں تو ہتھیاروں سے چوک ہو سکتی تھی۔ اُن کے لیے ہم میں سے کسی ایک کو کم کر دینے یا سب کو ختم کر دینے سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ وہ جس طرح آئے تھے، اُسی طرح دندناتے ہوئے چلے جاتے۔

صبح کی گاڑی کا وقت نکل چکا تھا۔ اب رات ہی کو ہمیں بمبئی کے لیے گاڑی مل سکتی تھی۔ یہ پورا دن ہمیں اسی حویلی اور اسی شہر میں کاٹنا تھا۔ رات تک اتنی جلد دوبارہ کسی کے آنے یا راستے میں مزاحم ہونے کا امکان بظاہر نہیں تھا۔ انھیں اب صبر آ جانا چاہیے تھا۔ حویلی کی تلاشی کے لیے رات آنے والے آدمیوں کو مُغل نے خود اُکسایا تھا اور اُنھوں نے اچھی طرح تلاشی لی ہو گی۔ سارے کمرے اُجڑے ہوئے تھے، اُنھوں نے کمرے کی ہر چیز اُلٹ پلٹ کے رکھ دی تھی۔ بستر الٹے ہوئے تھے اور آرائشی گل دان ٹوٹے ہوئے۔ اوپر کی منزل پر جس کمرے میں منیر علی ٹھیرے ہوئے تھے، اُس کی مقفل الماری انھوں نے توڑ دی تھی۔ الماری میں رکھے ہوئے شیشے اور چینی کے قدیم برتن کھکھوڑنے میں انھوں نے کوئی احتیاط نہیں کی تھی۔ یہ برتن حویلی کے پرانے مالک کے تھے اور ابّا جان کے پاس امانتاً رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہر کونے کھدرے کی تلاشی لی تھی۔ یہاں تک کہ دیواروں پر نصب تصویروں اور قدِ آدم آئینوں کے پیچھے کسی ممکنہ روزن یا طاقچے کے متعلق بھی تسلّی کر لی تھی۔ آرائشی چیزوں، فرنیچر اور برتنوں کے سوا گھر میں دوسری قسم کی چیزیں تھیں بھی نہیں۔ ملبوسات اور ضروریات کی دیگر اشیا ہمارے پاس نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اُن لوگوں نے اپنے آقا کے پاس جا کے تلاشی کے بارے میں بڑھ چڑھ کے بیانات دیے ہوں گے کہ بس حویلی کے در و دیوار کھودنے کی کسر رہ گئی تھی۔ دوبارہ یہاں آنے کا خیال اُن کے لیے کچھ کم دہشت ناک نہ ہو گا اس لیے انھیں اپنے آقا کو ہر طرح مطمئن کرنا چاہیے۔ اُن کے آقا کو بھی اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا کہ ہم سے مطلوبہ پتّھر حاصل کرنا ایسا آسان نہیں۔ ہماری تحویل میں ہیرے کی موجودگی کے متعلق اگر اُسے اتنا ہی یقین تھا کہ اُس نے اتنے آدمی بھیجے تھے تو اب اس یقین میں دراڑیں ضرور پڑ گئی ہوں گی کہ دوسرا کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ہر پہلو پر غور کر لینا لازم ہے۔ اپنے آدمیوں کی بہ سلامت واپسی ہی کو اُسے غنیمت سمجھنا چاہیے اگر وہ واپس نہ آتے یا مُغل کے کہنے کے مطابق پولیس بلا لی جاتی تو صورتِ حال بہت کچھ مختلف ہو سکتی تھی۔ وہ یقیناً کوئی صاحبِ حیثیت شخص ہی ہو گا جس نے اتنا بڑا قدم اُٹھانے میں کوئی عار محسوس نہ کی مگر وہ کیسا بھی شخص ہو، ریاست میں اپنے نام اور عزّت کے سلسلے میں ایسا بے پروا نہ ہو گا۔ اتنے بہت سے ہتھیار بند بھیجنے کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ ناکامی اور رسوائی کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے ہماری تعداد کا اچھی طرح علم ہو گا۔ کئی دن سے اُس کے آدمی حویلی کے باہر ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، حویلی کے کسی ملازم کو ضرور اعتماد میں لیا گیا ہو گا اور ہمارے پاس جوابی ہتھیاروں کے بارے میں بھی اطمینان کر لیا گیا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حویلی کے کسی ملازم ہی نے اُنھیں اندر آنے کا اشارہ کیا ہو کہ یہ وقت سب سے مناسب ہے، سب اپنے اپنے کمروں میں جا کے سو گئے ہیں۔ ان تمام باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حملہ آور بھیجنے والے کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ مقصد حاصل کرنے کے بعد یا کسی غیر متوقع صورتِ حال سے دوچار ہونے پر اُس نے اپنے آدمیوں کو ہمیں یکسر ختم کر دینے کا حکم دیا ہو۔ وہ چشم دید گواہی مٹا دینے کے تمام انتظامات سے لیس تھے۔ بہرصورت ہم نے اپنے طور پر اُن کے آقا کو کسی انتقامی ردِعمل سے روکنے کے لیے ہر ممکن حجّت کی تھی۔ تلاشی کی حسرت پوری کر دینے کے علاوہ مُغل نے اُن لوگوں سے اُن کے آقا کا نام پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ہم نے اپنی طرف سے سارے جتن کر لیے تھے لیکن کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ریاست میں وہ صرف ایک شخص تو نہیں تھا، پتّھروں کے لیے جس کی طلب اتنی شدید تھی اور بھی نواب راجا لوگ یہاں کم نہیں ہیں جو آدمیوں پر پتّھروں کو فوقیت دیتے ہوں گے۔ نہ جانے اور کس کس کو ریاست میں ہماری موجودگی کی خبر اور نواب حشمت جنگ کو دیے جانے والے پتّھر

کی وجہ سے بے قراری ہو۔ کل رات مہاراجا کے علاوہ اور دو آدمی آئے تھے کسی اور کی آمد آج بھی ممکن ہے۔ بہتر یہی تھا جو ابا جان نے رات کہا تھا کہ صبح ہوتے ہی کیوں نہ ہم بڑے نواب کی حویلی میں منتقل ہو جائیں۔ وہاں سے ہم زیادہ محفوظ طور پر بمبئی کے لیے روانہ ہو سکتے ہیں لیکن شاید وہ ابا جان کا مشورہ بھول گئے تھے۔ ابا جان کو بھی یاد نہیں رہا تھا اسی لیے وہ یوں فراغت سے بیٹھے تھے۔

میرے سر میں طرح طرح کے وہم اُمڈ رہے تھے۔ پیرو کی تیز آواز پر میں چونک پڑا۔ وہ نواب حشمت جنگ کے بارے میں جھجل سے کہہ رہا تھا کہ نواب کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔ اُس نے ابا جان سے صبح آنے کے لیے کہا تھا، اب گیارہ بج رہے ہوں گے۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ پیرو کا مطلب کچھ اور تو نہیں ہے؟ ممکن ہے، وہ نواب حشمت جنگ کے متعلق ابا جان کو پھر کوئی اشارہ کر رہا ہو کہ اُس کی آمد میں یہ تاخیر معنی خیز بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے پیرو کا لہجہ ٹٹولنے کی کوشش کی مگر اُس کے لہجے میں ایسی کوئی رمزیت نہیں تھی۔ کسی اور وجہ سے بھی نواب کو دیر ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات تھی تو نواب کو وقت کا خاص رکھنا چاہیے۔ مجھے بھی اُس کی آمد کا انتظار تھا۔ میں اُس کی آنکھیں، اُس کا چہرہ قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر پیرو کا گمان صحیح نکلا تو؟ اس خیال ہی سے میرا جسم کھنچنے لگتا تھا، مجھ سے پھر اُس کے سامنے اپنا چہرہ نہ چھپایا جائے گا۔

کانتے کے شانے جھکے جا رہے تھے۔ اُس کے زخم ٹیس دے رہے ہوں گے۔ وہ بار بار کرسی پر کسمسانے لگتا۔ منع کرنے کے باوجود وہ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی۔ مارتی اور شامو کے اُٹھ جانے پر ٹنکو بھی اُٹھ گیا۔ میں اور زورا کانتے کی وجہ سے رُکے رہے۔ پیرو کو نواب حشمت جنگ کا ذکر کیے ہوئے ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ صدر دروازے سے گاڑی کا شور سنائی دیا اور روشوں کے درمیان گزرتی ایک سیاہ گاڑی ہماری طرف بڑھتی دکھائی دی۔ سب اپنی اپنی کرسیوں پر سیدھے ہو گئے۔ وہ نواب حشمت جنگ ہی کی گاڑی ہو سکتی تھی۔ ہاں، وہ نواب ہی تھا میری رگوں میں خون دھڑکنے لگا۔ گاڑی سبزہ زار کے قریب ٹھیر گئی۔ ڈرائیور کے دروازہ کھولنے سے پہلے نواب جلدی سے نیچے اُترا۔ اُس کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی تھی جو دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئی۔ نیچے اُتر کے وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ابا جان کے پاس آ کے ٹھٹک گیا۔

"قبلہ گاہی! یہ کیا، یہ کیا؟" اُس کی زبان اٹکنے لگی اور اُس کی متلاشی نظریں کانتے پر مرکوز ہو گئیں جس کی کلائی پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور سارا منہ سوجا ہوا، ادھڑا ہوا سا تھا۔ زورا کے چہرے پر بھی ہلدی کے دھبے پڑے تھے۔ شامو کی باچھوں کی خراش اور جھرو کی پھٹی ہوئی بھویں بھی اُسے نظر آگئی تھیں۔ "ہم یہ کیا دیکھ رہے ہیں والا جناب؟" وہ متوحش لہجے میں بولا۔

ابا جان کے زرد چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ نواب کا بازو پکڑ کے وہ بھرائی آواز میں بولے "کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"نہیں، نہیں" نواب نے بے چینی سے کہا "ہماری عقل حیران ہے کہ ہم یہ کیسا منظر دیکھ رہے ہیں۔"

"آپ تشریف رکھیے" ابا جان پُرسکون آواز میں بولے۔ "ذرا سی چوٹ لگ گئی ہے۔"

"یہ ذرا سی چوٹ نہیں معلوم ہوتی جناب والا! اور، اور" وہ کانتے، زورا، شامو اور جھرو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہمیں بتائیے کہ یہ سب کیا ہے؟"

"پہلے آپ بیٹھیے تو سہی" ابا جان نے کرسیوں کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ اُس کے آنے پر سبھی کھڑے ہو گئے تھے۔ ابا جان کو خیال آیا اور اُنھوں نے اُسے اندر نشست گاہ میں چلنے کے لیے کہا مگر وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اُس کے ماتھے پر شکنوں کا جال پڑ گیا تھا اور وہ بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔

"ہمیں کچھ دیر ہو گئی۔ چلتے ہوئے ایک نہایت ضروری سرکاری کام پیش آگیا۔ وہ نمٹا کے ہم سیدھے یہاں پہنچے ہیں مگر یہاں..... یہاں تو" وہ بے ترتیب لہجے میں بولا "ازراہِ کرم ہماری تشفی کیجیے۔ یہ کس قسم کا حادثہ تھا؟"

مجھے جستجو تھی کہ ابا جان حادثے کی نوعیت کیا بتاتے ہیں نواب کی طرف سر اُٹھا کے اُنھوں نے گہری سانس لی اور کہنے لگے "رات کو یہاں کچھ لوگ آ گئے تھے۔"

"کچھ لوگ! کون لوگ؟"

"چور! رات کو اور کون آ سکتا ہے۔"

"چور آ گئے تھے" نواب اُلجھی ہوئی آواز میں بولا "کیا واقعی؟"

"جی ہاں" ابا جان نے پھیکی ہنسی سے کہا اور جھجل اور پیرو کی طرف بے اختیار اُن کی نگاہیں اُٹھ گئیں۔ وہ دونوں ساکت بیٹھے رہے۔ ابا جان ہی کسمساتے لہجے میں بولے "چھوٹا موٹا سا واقعہ ہے۔ یقین کیجیے، ہم سب خیریت سے ہیں۔"

"ہمیں تفصیل سے بتائیے" وہ بے تابی سے بولا۔

ابا جان کے ہونٹ لرزنے لگے۔ سوچ رہے ہوں گے کہ وہ کیا اور کس طرح بتائیں، اُنھیں کتنا حذف کرنا چاہیے۔ پیرو کی بات بھی انھیں اچھی طرح یاد ہو گی، گو وہ شدت سے اُسے مسترد کر چکے تھے لیکن شبے کی ایک کھٹک تو اُن کے دل میں ضرور ہو گی۔ اُن کی جھجک سے نواب کچھ اور بے چین ہو گیا۔ "اتفاق سے ہم لوگوں کی آنکھ کھل گئی۔" ابا جان نے شگفتگی سے کہنے کی کوشش کی "اور چوروں کو مکینوں کی بیداری سے پرانا بیر ہے۔"

"حویلی کی اونچی فصیل، چوکی داروں کی نفری عبور کر کے چور کیسے آگئے تھے؟ ہمارے علم میں نہیں کہ اس حویلی میں پہلے ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہو۔"

"پہلے حویلی میں ایسے مکین بھی نہیں تھے۔"

نواب نے کرب سے آنکھیں بھینچ لیں "اوہ!" وہ تمتمائی آواز میں بولا "ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ کیسے..... کیسے چور تھے؟"

"چور تو چور ہی ہوتے ہیں جناب والا! سر پہ سینگ نہیں تھے۔"

ابا جان کے لہجے میں کسی قدر تندی آگئی تھی، فوراً سنبھل گئے اور مسکرا کے کہنے لگے "آدمی ہی کے بچے تھے۔"

نواب نے ابا جان کی تندی پر توجہ نہیں دی "ہماری مراد ہے کیا چاہتے تھے؟"

"زر و مال۔"

نواب حشمت جنگ ابا جان کے جواب پر خفیف سا ہو گیا، پہلو بدل کے بولا "یہ ایک نہایت سنگین واقعہ ہے۔ آپ سے ربطِ خاطر کے علاوہ ہم اس ریاست کے منصب دار بھی ہیں۔ ازراہِ کرم ہمیں ساری بات بتائیے۔" اُس کی آواز میں غم و غصہ کی لرزش نمایاں تھی

"کیا عرض کریں نواب صاحب!"

"جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ایک تکلیف دہ رات گزاری ہے۔"

"مگر ہم اپنے محترم نواب صاحب کو اس واقعے کے ناگوار بیان سے کیوں مکدر کریں۔ رات گئی، بات گئی۔ میں نے عرض کیا نا کہ زر و ال کے لالچ میں کچھ چور چپکار حویلی میں گھس آئے تھے۔ مسلح تھے اور زرہ پشت بھی۔ سوچا ہوگا نئے نئے لوگ ہیں، ابھی گھر میں مکینوں سیا جماؤ نہیں ہوا ہوگا۔ حویلی کے چوکیداروں کو اُنھوں نے پہلے ہی ابو میں کر لیا تھا ہم لوگ جاگ گئے یا یوں کہیے کہ اُنھوں نے ہمیں گا دیا۔ اُن کا خیال تھا جیسے ہم کوئی خزانہ اُن سے چھپا رہے ہیں مطلب اری کے لیے اُنھوں نے دست درازی بھی کی۔"

"اور اس جارحیت کی حد تک!" نواب اداسی سے بولا۔ "یہ کس وقت کا واقعہ ہے؟ پھر اُن لوگوں سے نجات کیسے ملی؟"

"رات خاصی ڈھل چکی تھی جب اُن کی آمد کا کھٹکا ہوا" ابا جان نے دھیمے لہجے میں کہا "یہاں کچھ ہوتا تو اُنھیں ملتا اور ہمارے پاس کچھ ہوتا تو اُنھیں بتا بھی پاتے۔ اُنھیں ہماری بے سر و سامانی کا مشکل سے یقین آیا۔ اُنھوں نے ساری حویلی کی تلاشی لی اور چلے گئے۔"

نواب سوچ میں پڑ گیا۔ میری نظریں مسلسل اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کے چہرے پر پریشانی اور دکھ کے آثار تھے اور بظاہر مصنوعی معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن بعض لوگوں کو اپنی شکلیں بدلنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ ابھی ہم اُسے جانتے ہی کتنا تھے۔ آدمی کو جاننے میں کبھی ایک عمر صرف ہو جاتی ہے۔ ابا جان نے نہایت آسانی سے سب کہہ دیا تھا مگر نواب مطمئن نہیں تھا، چونک کے بولا "کس قسم کے لوگ تھے؟"

"ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ بعد میں اُن کے چہرے بھی ہمیں دیکھنے کو مل گئے۔ شکل و صورت سے اُجڈ، غیر شہری اور جنگ جو معلوم ہوتے تھے۔ مگر جانے دیجیے، زندگی میں طرح طرح کے تجربوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ کوئی ایسی نئی بات تو نہیں۔ ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ بتائیے آپ کیسے ہیں۔ ایک رات درمیان میں گزری ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ بیت گیا۔ بھائی میاں کا کیا حال ہے؟ اُس طرف جانا ہوا؟"

"ہاں، جی ہاں، رات کو جانا ہوا تھا۔ بھائی میاں آپ کے جانے سے بہت دل گیر نظر آتے تھے۔ اُن کے لیے اب ہی کو زیادہ وقت دینا ہو گا۔ عالم تاب سے اُن کا رشتہ بھائی کا کم، دوست کا زیادہ تھا۔ کچھ عاشقی کی سی کیفیت تھی۔ برسں لگیں گے اس سانحے سے سنبھلنے میں" نواب نے ڈوبتی آواز میں کہا اور لمحاتی توقف کے بعد کہنے لگا "کاش آپ وہیں سے روانہ ہوتے تو یہ سب اس طرح پیش نہ آتا۔"

"مگر یوں ہی کچھ ہونا تھا تو کون روک سکتا تھا۔"

"معاف کیجیے، ہمیں کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہماری دل داری مزاحم ہو رہی ہے مگر اس طرح تو ہم پر اور بوجھ رہے گا بہتر ہو گا، اگر آپ ہمیں اُن مجرموں کے متعلق کچھ اور بتائیں، مثلاً اُن کی زبان، لب و لہجہ، طور اطوار، ہمارے ہاتھ اتنے کوتاہ نہیں کہ اُن کی گردنوں تک نہ پہنچ سکیں۔ یقیناً وہ اپنی بعض نشانیاں یہاں چھوڑ گئے ہوں گے۔ ریاست میں ایسے واقعات کی ہم قطعاً اجازت نہیں دے سکتے یہاں ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ برسوں میں اکا دکا واقعات پیش آتے ہیں۔

ریاست کے قوانین رہ زنوں اور ڈاکوؤں کے لیے کسی قسم کی لچک نہیں رکھتے۔ اگر ہم نے انھیں اُن کی سزاؤں تک نہ پہنچایا تو یہ نہ صرف ہماری سُبکی ہوگی بلکہ ساری ریاست کی توہین۔ ہمیں حیرت ہے کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ کیا وہ یہاں سے کچھ لے گئے؟"

"جی نہیں، انھیں خالی ہاتھ ہی واپس جانا پڑا۔"

"آپ کے پاس نقدی وغیرہ تو وافر ہوگی؟"

"تھوڑی بہت ہے، یہی کوئی لاکھ سوا لاکھ کے بہ قدر۔"

"ہونہہ!" نواب سر ہلانے لگا اور بولا "کتنی دیر وہ یہاں رہے؟"

"خاصی دیر۔" ابّا جان نے تذبذب سے جواب دیا۔ "حویلی کے ہر کمرے کی تلاشی میں کچھ نہ کچھ وقت تو لگتا ہے۔"

"پھر نقدی اُن کی نگاہوں سے کیسے اوجھل رہی؟" نواب نے تیکھے لہجے میں کہا۔ اُس کے تیکھے پن میں طنز نہیں تھا۔

"شاید اس لیے کہ نقدی چھپا کے نہیں رکھی گئی تھی۔ بدحواسی میں انھیں سامنے رکھی ہوئی چیز کا خیال نہیں آیا حالانکہ اُسی کمرے میں تھی جہاں میں تھا۔"

نواب نے تعداد پوچھی تو ابّا جان بے اختیار مُغل اور پیرو کی صورت دیکھنے لگے اور بولے۔ "باقاعدہ شمار تو نہیں کیا لیکن پندرہ سولہ کی نفری تو ضرور تھی۔"

"پندرہ سولہ کی اور مسلح!" نواب اچھل سا گیا۔

نواب حشمت جنگ ایک باراں دیدہ شخص تھا۔ ابّا جان کی آواز میں کوئی لکنت نہیں تھی مگر اُن کے لہجے میں گرہیں پڑی ہوئی تھیں، اور نواب کے سامنے اُن کا چہرہ بھی تو تھا جس پر اُن کے سینے کی تمام گھٹن سمٹ آئی تھی۔ نواب نے واضح طور پر اُن کے بیان میں ابہام کا شکوہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ ابّا جان اپنے موہوم جوابوں کے بارے میں کوئی صفائی پیش کرتے، نواب کسی پولیس والے کی طرح اُن سے پے در پے سوال کرنے لگا۔ ابّا جان ہر بات صاف صاف بتا سکتے تھے لیکن اگر یہی تھا تو پھر رات اُن آدمیوں کو یوں جانے دینے کا کیا جواز رہ جاتا۔ جس وجہ سے انھیں جانے دیا گیا تھا، وہ تو اب بھی موجود تھی۔ اگر وہ خفیہ ہاتھ نواب حشمت جنگ کا نہیں تھا تو یہ ساری رُوداد نہ صرف اُس کا سکون غارت کرتی، ہمارے پیروں کی بھی زنجیر بن جاتی۔ یہ سب کچھ سُن کے اُس کے عالمِ غضب کا ایک تصور ہی کیا جا سکتا تھا۔ یہ حقیقت اُسے چین نہ لینے دیتی کہ سب اُسی ہیرے کا کرشمہ ہے جسے ابّا جان نے بہ کمالِ قلندری اُس کی نذر کر دیا تھا اور یہ تمام محض اِس ایک لغزش کا شاخسانہ ہے کہ اُس نے ریاست کے بعض امرا کو خود نمائی کے کسی مغلوب وقت میں اُس ہیرے کی جلوہ نمائی کرائی

یہ سب جان کے اُس کی نگاہوں میں جن لوگوں کی تص اُبھر سکتی تھیں، اُن میں سب سے پہلا شخص غالباً مہاراجا ہی ہوتا۔ بعد ریاست کے ایسے تمام نوابین جن کی پتھروں سے رغبت جنو حد تک ہے۔ نواب کی اُن لوگوں سے خوب آشنائی ہوگی تک پہنچنا اُس کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ ابّا جان کی ایک ذرا سی ل ریاست کے نوابوں، راجاؤں میں کسی بھی فتنے کا [illegible] ثابت تھی۔ ابّا جان کو اُن کے مابین [illegible] فساد سے اتنی [illegible] تھی حیدرآباد سے بہ عافیت نکل جانے کی بے چینی تھی۔ نواب انھیں روک لیتا اور اُس وقت تک نہ جانے دیتا جب تک ابّا جان کی نذ میں مجرموں کو کیفرِ کردار کو پہنچا دینے کی سُرخ روئی اُسے حا ہو جاتی۔ ابّا جان کی کم آمیزی اُس کے تجسّس کو اور ہوا دے اُس کا بار بار بدلتا رنگ اندرونی بے سکونی کی غمازی کر رہا تھا کے پاس کہنے کے لیے اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ مزید ایک اِس شہر میں ٹھیرنا نہیں چاہتے ہوں گے۔ ہیروں سے وابستگی، اُ لوگوں سے وابستگی، شہر میں اجنبیت اور خانم کی آمد کا واقعہ بھی نوا رو پوش نہیں رہا ہوگا۔ ایک پہر جانے کتنے روزن کھول دیتا۔ آنے والے آدمیوں کے اصل مقصد کی بھنک نواب کو بے لگام کر ابّا جان کو اپنی روانگی تک اُسے اسی تذبذب و کش مکش کی حالت دو چار رکھنا تھا اور بہتر یہی تھا کہ وہ کسی طرح اُس وقت تک ساتھ ہی رہیں۔ سبزہ زار میں زخمی ملازمین بھی نواب کی نظر و سامنے تھے لیکن ہماری موجودگی میں اُن سے کچھ پوچھنا وضع کے تھا۔ اس میں ہماری بھی توہین تھی، نواب کی بھی۔ ابّا جان کو احساس ہو رہا ہوگا کہ رات انھوں نے مُغل کی بات نہ مان کے بڑی غلطی کی تھی، رات اگر وہ مُغل اور پیرو کو چھوڑ کے سے بمبئی کے لیے نکل کھڑے ہوتے تو انھیں اس بے بسی سے دوچا نہ گزرنا پڑتا لیکن شاید انھوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ انھیں مُغ پیرو کو چھوڑ کے کہیں نہیں جانا چاہیے تھا ورنہ وہ خود سے ہمیشہ شر

نواب کی حیران و مضطرب کیفیت سے اُس کی ناآسودگی ہو رہی تھی مگر ابّا جان نے احتیاطاً وہ کانٹا اپنے سینے میں محفوظ رکھ جو رات پیرو نے انھیں چبھویا تھا۔ بے شک نواب کی تکرار عمداً سکتی تھی، اپنی آلودگی کے احساس سے۔ کہیں ابّا جان کی پہلوتہ درگزری نے اُسے کچھ مشتبہ نہ کر دیا ہو اور اُسے ابّا جان کی آنکھوں آئینے میں اپنے لیے کوئی بال نہ نظر آ گیا ہو۔ یہ بال پراگندہ آنکھ

کو نظر آ سکتا ہے۔ اِس صورت میں نواب کے لیے یہی لازم تھا کہ وہ شدّ و مد سے اِس الزام کی تردید کرتا رہے۔ اپنے دامن کے دھبّے دھونے کے لیے اُسے رات کے واقعے کی جزئیات و تفصیلات جاننے کے سلسلے میں اتنی ہی وحشت اور بے تابی کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ اُسے زندہ واپس جانے والے آدمیوں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اُن کی سمت کے بارے میں ہمیں کچھ جاننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یوں نواب کو دلیلیں دینے کا گداز حاصل تھا۔ نواب کو کیا معلوم کہ یہ گداز بھی ہم ہی نے فراہم کیا تھا۔ جان بوجھ کے، بہت جبر کر کے۔

"اتنی بڑی تعداد!" اُس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "جنابِ والا! ہمارا تجربہ ہے کہ چور اور ڈاکو کوئی گھر منتخب کرنے سے پہلے اُس کے مکینوں کی دولت و ثروت کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں انھیں اس کا موقع نہیں ملا ہوگا۔"

"شاید وہ راستہ بھول گئے تھے یا انھیں اِس گھر کے بارے میں کوئی بڑی خوش فہمی ہو گئی ہوگی۔" ابّا جان اٹکتے ہوئے بولے۔

"ہم اسی نکتے پر غور کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہاں ریاست میں خدانخواستہ آپ کی کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ ہمارے دماغ میں طرح طرح کی باتیں آ رہی ہیں لیکن یہ ہمارے انتشارِ ذہنی کے سبب سے بھی ہو سکتی ہیں۔"

"آپ کس نہج پر سوچ رہے ہیں؟" ابّا جان نے بے ترتیبی سے کہا۔

"کیا عرض کریں، سوچ رہے ہیں کہ کون ایسا..." وہ زیرِ لب بولتے بولتے رکا۔ سب اُس کی طرف متوجّہ تھے۔ نواب ایک لمبی سانس کھینچ کے رہ گیا۔

"جانے بھی دیجیے۔" ابّا جان نے خوش دلی سے کہنے کی کوشش کی۔

"کیسے جانے دیں، یقین کیجیے، ہمیں بہت صدمہ ہے۔ یہ ہمارے منصب کے لیے تازیانہ ہے۔ ہمیں آپ کے سامنے ندامت محسوس ہو رہی ہے۔" نواب کی آواز ڈوبی ہوئی تھی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں قبلۂ عالم! اِس میں آپ کی ندامت کا بھلا کون سا پہلو نکلتا ہے؟"

"ہمارے محسن، ہمارے مربّی پر انھوں نے ہاتھ اُٹھایا۔ وہ کیسے شقی القلب لوگ تھے جنھوں نے ایک بزرگ کا لحاظ نہیں کیا۔"

"انھیں مراتب کا خیال ہوا کرے تو وہ یہ مذموم کام ہی کیوں کریں۔ اُن سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔" اُسے بہلانے کے لیے ابّا جان کی سمجھ میں جیسے لفظ نہیں آ رہے تھے۔ "آپ نے دل پر بہت لے لیا ہے حالانکہ یہ تو ایک عام سا..."

"ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ہماری کسی کوتاہی کا خمیازہ ہے۔"

"آپ کی کوتاہی!" ابّا جان سراسیمگی سے بولے۔

نواب نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور آنکھیں سکڑ سی گئیں۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ کہنے لگا۔

"ریاست میں رہنے والے ہر شخص کے جان و مال کے تحفظ کی ذمّہ داری ہماری ہے اور آپ تو ہمارے مہمان، ہمارے......" وہ یقیناً کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا اور بولا۔ "ہماری حاکمی کس کام کی۔ یہ گھر ہمارا ہی تو ہے۔ انھوں نے ہمارے گھر میں داخل ہونے کی جرأت کیسے کی۔ انھوں نے آپ سے ہماری نسبت کا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔"

"انھیں اِس نسبت کا علم ہوتا تبھی تو...." ابّا جان شائستہ لہجے میں بولے۔

"ہم انھیں کبھی معاف نہیں کریں گے، اگر ہمارے بس میں ہوا تو اُن کے ہاتھ قلم کرا دیں گے۔"

"نواب صاحب! ازراہِ کرم اب یہ ذکر درگزر کیجیے۔" ابّا جان نے عاجزی سے کہا۔ "آپ بھول رہے ہیں کہ آپ نے کل ہم سے کیا کہا تھا اور آپ یہاں کس غرض سے تشریف لائے ہیں۔"

"یاد ہے لیکن ہمیں کیا خبر تھی کہ یہاں آ کے یہ کچھ دیکھنے کو ملے گا۔ کاش آپ ہمیں صبح ہی اطلاع دے دیتے۔"

"صبح آپ نے خود آنے کو فرمایا تھا، اس لیے ہم نے مناسب نہیں سمجھا، اگر ہم اپنے یہ نشان مٹانے پر قادر ہوتے تو ویسے بھی کبھی یہ ذکر نہ کرتے۔ آخر آپ کو اِس قدر کبیدہ خاطر کیوں کیا جائے؟"

"اِن نشانوں کی اذیت ہم اپنے جسم و جاں میں محسوس کر رہے ہیں۔" نواب نے آزردگی سے کہا۔

"آپ کی عنایت ہے کہ آپ ہمیں ایسا عزیز رکھتے ہیں۔ آپ کی یہ کرم گستری ہم سب کے لیے مرہم کے مترادف ہے۔ اِس کے بعد کیا چاہیے۔ یہی ہمارے لیے سب سے بڑا مداوا ہے۔"

نواب سر جھکائے لمحوں تک خاموش رہا۔

"ہمیں یاد ہی نہیں رہا۔" ابّا جان نے پھر اُس کی توجّہ مبذول کرانا چاہا اور ندامت آمیز لہجے میں بولے۔ "آپ کو آئے اتنی دیر ہو گئی ہے۔ ہم نے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ آپ کیا پئیں گے بلکہ کھانے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔"

"ہمارا کچھ جی نہیں چاہ رہا۔" نواب نے بھاری آواز میں کہا۔ "صبح سے یوں بھی طبیعت میں کچھ گراوٹ سی ہے۔"

"خیریت تو ہے؟"

"ہاں، ہاں، الحمدللہ، کوئی ایسی بات نہیں۔" وہ سنبھل کے بولا مگر دوسرے لمحے اُس کی آنکھیں بجھ سی گئیں اور وہ دل گیر آواز میں کہنے لگا۔ "رتی میاں کے جانے کے بعد سے جیسے کسی چیز کی کمی ہوگئی ہے۔ جسم جیسے کسی نے شکنجے میں کس دیا ہے۔ ہم تو کھُل کے رو بھی نہ سکے۔ دوسروں کو سنبھالا دیتے، اُن کے آنسو سمیٹتے رہے۔ رتی میاں کی موت کے بعد سے ہم نے ٹھیک طرح آئینہ بھی نہیں دیکھا ہے۔"

"سانحہ ہی ایسا تھا۔ آپ کے لیے تو دُہرا صدمہ تھا۔ ہمشیرہ عزیزہ کی اس عمر میں بیوگی ....." ابّاجان کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے، دل گرفتہ آواز میں بولے۔ "مگر والا جناب تو ایک حوصلہ مند آدمی ہیں۔ یہاں کون رُکنے کے لیے ہے۔ سب قطار میں ہیں اور کسی کو اپنی باری کا علم نہیں۔"

"ہاں، اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

ابّاجان اُس کا دھیان بٹانے کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوگئے تھے۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر ابّاجان نے دبے لہجے میں کہا۔ "چائے کی ایک پیالی تو پیجیے گا۔"

"ضرور، ضرور۔" نواب لجاجت آمیز مستعدی سے بولا۔

ابّاجان نے شامو کو چائے کے لیے اشارہ کیا ہی تھا کہ نواب کو جیسے کچھ یاد آگیا، فکرمندانہ انداز میں بولا۔ "آپ کو کوئی گہری چوٹ تو نہیں آئی ہے؟"

"نہیں، معمولی خراشیں ہیں۔"

"کسی طبیب کو بھی دکھایا؟"

"ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

ابّاجان کے چہرے پر چھائی ہوئی لکیریں کچھ دیر کے لیے نرم پڑ گئی تھیں۔ وہ پھر گہری ہونے لگیں۔ نواب کے ذہن میں ابھی تک وہی سب کچھ گردش کر رہا تھا۔ "ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُن وحشیوں نے سب سے زیادہ آپ ہی کو اپنا ہدف بنایا۔"

"نہیں۔" ابّاجان نے بہ عجلت کہا اور کانتے کی طرف اُنگلی اُٹھا کے بولے۔ "آپ اسے نہیں دیکھ رہے ہیں۔"

"یقیناً۔ انھوں نے دخل اندازی کی ہوگی۔ آپ کی طرف ان کے اُٹھتے ہوئے ہاتھ اِن سے برداشت نہیں ہوئے ہوں گے۔"

"ہاں، شاید کچھ یہی تھا۔" ابّاجان شکستہ لہجے میں بولے۔

"کیا انھوں نے ساری حویلی کی تلاشی لی؟" نواب کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میں جناب والا سے عرض کر چکا ہوں۔"

"ہوں۔" نواب کے ہونٹ پھیل گئے۔ "آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ وہ کچھ اور تو نہیں، ہمارا مقصد ہے، کوئی نادر قسم کی چیز لے جانے میں کامیاب تو نہیں ہوگئے ہیں؟"

"یہاں تھا ہی کیا، نقدی کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے۔ گھر میں کوئی خاتون موجود نہیں تھی اس لیے زیورات کی طرف خود انھوں نے توجہ نہیں دی ہوگی۔"

ملازم نواب حشمت جنگ کے منصب و ثروت سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ وہ منتظر ہی تھے۔ شامو کو گئے چند لمحے ہوئے تھے کہ خوان پوشوں سے ڈھکے، چائے، پھل اور مٹھائی کے طشت اُٹھائے ملازم بازار میں داخل ہوئے۔ اُن میں ایک زخمی ملازم بھی تھا۔ نواب کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ٹھیر گیا اور ترکی ٹوپی اُتار کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ اپنا اضطراب متوازن رکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ ابّاجان اور ہم سب کی خوش گمانی تھی۔ نواب نے کچھ دیر کے لیے از خود موضوع بدلنا مناسب سمجھا ہوگا۔ ابّاجان کے اور اپنے مراسم کی لطافت کے خیال سے یا اس طرح ابّاجان کو اپنے تعلق خاطر کا اعتماد دلانا چاہتا ہوگا۔ اسے تجدیدِ اعتماد کی اُسے بار بار ضرورت محسوس ہوتی ہوگی۔ اُسے کون سمجھاتا کہ ابّاجان اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا پائیں گے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ کانتے اور ملازم وغیرہ نواب کے سامنے آتے ہی نہیں۔ اکیلے ابّاجان اپنی خراشوں کا کوئی بھی عذر پیش کر سکتے تھے۔ نواب کی آمد صبح سے متوقع تھی مگر اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ ملازم طشت رکھ کے چلے گئے۔ ابّاجان نے اپنے ہاتھ سے نواب کے لیے چائے بنائی۔ "کل شام یہاں آنے کے بعد آپ کی کیا مصروفیت رہی ہے؟" ایک دم نواب نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"مصروفیت!" ابّاجان سٹ پٹا سے گئے۔ "ہم یہیں رہے، یہیں آرام کرتے رہے۔" کل شام آنے والے دونوں آدمیوں اور مہاراج کے بارے میں ابّاجان اُسے کیسے بتا سکتے تھے۔ "مگر..... مگر آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟" انھوں نے سیمابی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس یوں ہی ہمارے ذہن میں آگیا۔" نواب بے ربطی سے بولا۔ "آپ نے پولیس وغیرہ میں تو رپورٹ درج نہیں کرائی؟"

"جی نہیں۔" ابّاجان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"درج کرا دینی چاہیے تھی۔"

"مگر، مگر اس سے کیا حاصل تھا؟"

"احتیاطاً۔" نواب کے ہونٹ باہر نکل آئے۔

"میں، میں سمجھتا ہوں، کوئی ضروری نہیں ہے۔"

"ضروری ہے۔" نواب حتمی لہجے میں بولا

"شاید اب تو وقت بھی گزر گیا ہے۔"

"کیا آپ کسی نتیجے پر پہنچنا نہیں چاہتے؟"

"بے شک، بے شک۔" ابّاجان نے منتشر آواز میں کہا۔ "مگر اس میں ضیاعِ وقت کا بھی اندیشہ ہے۔ آپ صبح تشریف لانے والے تھے، خیال تھا کہ مشورے کے بعد ہی کوئی قدم اُٹھایا جائے۔ پولیس کے طریقۂ کار، تحقیق و تفتیش کے طولانی عمل سے ایک دو بار واسطہ پڑ چکا ہے۔ اصل میں آج ہی روانگی کا قصد تھا۔ یہاں پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی ہے۔ ورنہ بڑے نواب صاحب کے ہاں ٹھیرے رہنے میں کیا حرج تھا۔ وہ تو ہمیں روک رہے تھے اور ایسے وقت میں ہمیں اُن کی بات نہیں ٹالنی چاہیے تھی۔ انھیں بھی ہم نے آزردہ کیا۔ صورتِ حال ہی کچھ ایسی ہے کہ روانگی ازبس ضروری ہے۔ ہم تو کل ہی روانہ ہو جاتے لیکن اِدھر آپ نے ......"

"ہاں، ہاں۔" نواب اُن کی بات کاٹ کے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "ہمیں احساس ہے۔ کاش ہم آپ کو نہ روکتے مگر جہاں آپ اتنی دیر ٹھیرے ہیں، وہاں چند دن، ہماری درخواست ہے کہ چند دن اور سہی۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" ابّاجان نے بے چینی سے کہا۔ "لیکن بہتر یہی ہوگا کہ آپ مزید رُکنے کے لیے نہ فرمائیں۔"

"ہم کبھی اصرار نہ کرتے۔ ہم تو یہاں آپ کو وداع کرنے ہی کی غرض سے آئے تھے۔" نواب ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "آپ نے غور نہیں فرمایا کہ آپ کا ٹھیرنا کس قدر ضروری ہے۔ گھر سے کچھ نہیں گیا، کوئی نقصان نہیں ہوا مگر کسی بڑے نقصان ہی کے ارادے سے وہ گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اللہ کا بڑا کرم ہوا، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایسے لوگوں کو کس طرح معاف کیا جا سکتا ہے۔ آج وہ یہاں آئے تھے، کل کسی اور شریف زادے کے گریبان پر اُن کا ہاتھ دراز ہو سکتا ہے۔ آپ کی مجبوریاں اپنی جگہ مگر یہ تو ایک ریاست کے نظم و نسق کا معاملہ ہے اور دوسری طرف ہمارے اطمینانِ قلب کا بھی۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ پولیس کو بے جا کارروائیوں کی اجازت نہیں دیں گے۔ آپ دیکھیے تو سہی، ہم کیا کرتے ہیں۔ کچھ کر سکتے ہیں۔"

"جنابِ من!" ابّاجان کی آواز اڑی اڑی سی تھی۔ "ہم آپ سے کیا عرض کریں کہ اُدھر بھی وقت پر نہ پہنچنے میں کسی بڑے نقصان کا احتمال ہے۔ آپ سب کچھ درست فرما رہے ہیں۔ ایسا ہی ہونا چاہیے مگر ہم کیا عرض کریں، کچھ ایسی ہی صورت ہے اور آپ تو یہاں موجود ہی ہیں۔ پھر ہماری موجودگی کی کیا ضرورت۔ اور یہی ہے تو ہم جلد واپس آجائیں گے۔ ہفتے عشرے کے اندر اندر۔"

"مگر آپ کا یہاں ہونا بھی ضروری ہے۔"

ابّاجان نے شش و پنج کی حالت میں بھّل کو دیکھا، پیرو کو دیکھا، پھر مجھے مگر انھیں کوئی کیا اشارہ کرتا۔ انھیں ہر طرف اپنے ہی جیسے چہرے نظر آئے ہوں گے۔ انکار کر دینا ایسا مشکل نہیں تھا مگر ابّاجان کے سامنے ریاست کا ایک اقبال مند نواب ہی نہیں، ریاست کا حاکم بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اب تک اُس نے ہم سے بظاہر ایک ہم نشیں، ایک دردمند کی حیثیت سے بات کی تھی لیکن کسی بھی لمحے اُس کی آنکھوں کا رنگ بدل سکتا تھا۔ اُس پر اپنے عہدہ و منصب کا کوئی رنگ غالب آ سکتا تھا۔ اُس کے شائستہ طور طریق میں کبھی تندی و برہمی کی آمیزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ یہ آلودگی واقعے کی سنگینی، نزاکتِ احساس اور ہم سے اپنے تعلق کی پاس داری کے سبب سے بھی ہو سکتی تھی یا اپنی دولت و ثروت، اپنے عزّ و وقار کی کوئی لہر یوں ہی اُمڈ آتی ہوگی مگر ہمارے لیے یہی بہتر تھا کہ ہم اسے اُس کی حاکمیت کے فخر و زور پر محمول کریں۔ ابّاجان کا لب و لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ اُن پر نواب کی اِس دوسری ہی حیثیت کا غلبہ ہے۔ انھوں نے اُسے ایک حاکم سے کم یا زیادہ رتبہ نہیں دیا ہے اور نواب کی جنبشِ ابرو کی فتنہ گری

اور اپنی زبان سے نکلے ہوئے کسی مجہول لفظ کی ستم انگیزی کا انھیں خوب احساس ہے۔ وہ اب تک ایک ہوش مند آدمی کی طرح محتاط تھے۔

ممکن ہے اب نواب کی وہ حیثیت بھی اُن کے وہم و گمان میں دوبارہ رینگنے لگی ہو، جس کی نشان دہی پیرو نے کی تھی۔ نواب کے اصرار کی وجہ کہیں خود اُس کی پسپائی تو نہیں ؟ ضروری نہیں کہ صبح اپنے آدمی خالی ہاتھ واپس آجانے پر اُس کی خلش دور ہوگئی ہو۔ ہوسکتا ہے چنگاری باقی ہو اور نواب ابھی امید پر اندھیرے میں تیر چلا رہا ہو اور پولیس کے ذکر اور چند دن مزید قیام کی درخواست سے وہ کوئی حجت پوری کرنا چاہتا ہو۔ ابا جان کا یہ اجتناب اور گریز جسے استغنا بھی کہا جاسکتا تھا، اُس کی جستجو کا پارا اور مضطرب کر رہا ہوگا اور فرض کیا کہ اگر پہلے نہیں تو اب، رات وہ آدمی اُس کے بھیجے ہوئے نہیں تھے، حویلی میں گزرنے والی رات سے اُس کا کوئی تعلق نہیں تھا مگر اب یہ سب کچھ سُن کے مبادا اُس کے اندھیرے سینے میں ہوس کی کوئی چنگاری بھڑکی ہو۔ جیسے کسی کی آنکھیں کھُل جائیں، جیسے کوئی ٹھینگا دکھا دے۔ اُسے ملال ہوگا کہ رات ہتھیار بند آدمی بھیجنے والے کے پیمانے پر، ہمیں پرکھنے کا خیال اُسے کیوں نہیں آیا۔ اُسے بہت سُبکی محسوس ہو رہی ہوگی مگر ابا جان کو نہ ہیروں کے لیے اُس کی حرص و ہوس سے کوئی غرض تھی نہ اُس کے لیے پیرو کے الزام کی تائید و تردید سے کچھ سروکار تھا۔ رات اگر وہ ایسی بہتان لگتا تھا اور اب وہ خود نواب کے دل میں ایسا کوئی تلاطم برپا ہوتا دیکھ رہے تھے تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ اسے کیسے روک سکتے تھے۔ نجات اگر اسی طرح ممکن تھی تو ابا جان کسی پیش و پس کے بغیر ہیروں سے بھری تھیلی نواب کی نذر کر دیتے مگر نہ ہیرے نذر کیے جاسکتے تھے، نہ نواب کی خواہش کے مطابق یہاں مزید قیام مناسب تھا۔ نواب اُن سے کوئی عجیب اور بے جواز بات نہیں کہہ رہا تھا۔ ایک حساس اور مروت مند شخص اور ایک مستعد منصب دار کی حیثیت سے اُس نے جو کچھ کہا تھا، وہ ابا جان کیا، کوئی بھی رد نہیں کرسکتا تھا۔ ابا جان کے پاس روانگی میں عجلت کے سوا کون سا بڑا جواز تھا۔ روانگی ایک بڑے مقصد کے لیے ملتوی کی جاسکتی تھی، پہلے بھی کی جاچکی تھی۔ ابا جان کھوئی کھوئی نظروں سے اِردگرد دیکھتے رہے۔ اپنی مجبوری کا احساس بڑھانے کے لیے اب یہی اضطراب آمیز خاموشی باقی رہ گئی تھی، بے زبانی کی زبان۔ اِس میں اُس کے ادب اور احترام کا پہلو مضمر تھا تو اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کی گنجائش بھی نکل آتی تھی تاہم ابا جان کو منہ سے بھی تو کچھ نہ کچھ کہنا تھا۔ انھوں نے خوش اطواری سے کہنے کی کوشش

کی لیکن اُن کی آواز کی پژمردگی چھپائے نہ چھپی۔ انھوں نے کہا "بجا درست ہے، جیسا آپ کا حکم ہے، ہم ۔ ۔ ۔ ۔"

"حکم نہیں، قبلہ گاہی! ہماری درخواست ہے۔"

"درخواست ہے تو اجازت ہی دے دیجیے۔"

"ہماری کوشش ہوگی کہ وقت کم سے کم صرف ہو۔" نواب تیزی سے بولا۔ "انشا اللہ ایسا ہی ہوگا۔"

ابا جان نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ ہوسکتا ہے انھوں نے واقعی نواب کی نگاہوں میں اپنے لیے کوئی گرہ پڑتی دیکھ لی ہو۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ نواب کی طرف سے کوئی فیصلہ صادر ہونے کے بجائے انھوں نے اپنا فیصلہ خود سنا دیا۔ "مناسب ہے، پھر میں ان لوگوں کو روانہ کر دیتا ہوں۔" ابا جان نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں رک جاتا ہوں۔"

اُنھوں نے جیسے کوئی ناقابلِ فہم بات کہہ دی ہو، نواب چونک سا گیا۔ ابا جان کے چہرے پر اُس کی نگاہیں منڈلانے لگیں۔ ابا جان کے چہرے پر ایسا بوجھل سکون تھا جو عدالت میں کھڑے ہوئے ملزم پر اپنے مقدر کا لکھا سُن کے ہوتا ہے۔

"آپ پہلے جاؤ گے۔" یکایک سبزہ زار میں مُنجّل کی آواز گونجی۔ ہم سب کرسیوں پر سیدھے ہوگئے۔ "آپ کا ادھر جانا ضروری ہے۔" مُنجّل نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "ہم اِسی طرف رہیں گے۔ نواب صاحب سب ٹھیک ہی بول رہے ہیں۔"

نواب نے اب تک ہم میں سے کسی کی طرف توجہ نہیں دی تھی حالانکہ ہم اُس کے لیے نئے نہیں تھے۔ بڑے نواب کی حویلی میں کئی دن تک وہ تقریباً ہمارے ساتھ رہا تھا، ہم سے باتیں کرتا رہا تھا، مجھ سے تو بطورِ خاص۔ غالباً ابا جان کی موجودگی میں ہم سے کوئی بازپرس آداب کے منافی تھی۔ ابا جان نے بھی ہمیں اِس کا موقع نہیں دیا تھا۔ مُنجّل کی دخل اندازی پر نواب کی آنکھوں کی چمک عود کر آئی۔ "آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہم یہ اصرار کس لیے کر رہے ہیں۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ "وہ کہیں سے بھی آئے ہوں، ہماری دسترس سے دُور نہیں ہیں۔ ہمیں یقین ہے، ہم جلد ہی اُن تک پہنچ جائیں گے۔" پھر وہ بے تابی سے مُنجّل سے پوچھنے لگا۔ "آپ نے انھیں دیکھا تھا؟"

"اچھی طرح دیکھا تھا۔" مُنجّل نے گونجیلی آواز میں کہا۔

"ہماری مراد ہے، آپ کا اُن لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟" نواب کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔

"اپنے کو اوپر سے نیچے تک بالکل اُٹھائی گیرے لگتے تھے۔" مُنجّل نے سرد آواز میں جواب دیا۔ "بالکل جنگلی لوگ ۔ ۔ ۔ ۔"

مُنجّل کی بات پوری ہونے سے پہلے پیرو نے تیزی سے کہا "اپن آپ کو بولے نواب صاحب! اپن کو شبہ ہے، جیسا بابا بولا ہے، کتے کا اولاد رستہ بھول کے آیا تھا یا کسی نے ایدر کے لیے اُن کے ساتھ مخول کیا تھا۔"

"مخول! آپ کا مطلب ہے مذاق!" نواب نے تاسف آمیز درشتی سے کہا۔

"کتنا ہول ناک مذاق! مگر ہم اُن سے کوئی مذاق نہیں کریں گے۔"

"اپن کو پتہ ہے، آپ بہت کچھ کرسکتا ہے نواب صاحب اور آپ کو کرنا بھی چاہیے۔ آپ اتنی باتیں نئیں کرتا تو اپن کو شکایت ہوتا" پیرو نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ "اپن بھی ایسا ہی چاہتا ہے، پر اپن ابھی آپ سے کیا بولے۔"

"نہیں، نہیں آپ فرمائیں۔"

"اپن ابھی آپ سے ایک بات پوچھنا مانگتا ہے۔" مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں پیرو کی زبان نہ بہکنے لگے مگر اُسے خود بھی احساس ہوگا۔ وہ نسبتاً دھیمی آواز میں بولا۔ "آپ بولتے ہو تو اپن ٹھیرے جاتا ہے۔ پر اپن کی سمجھ میں نئیں آتا کہ ایدر رُک کے کیا کرے گا جب آپ ایدر ہے۔ سب جانتا ہے۔ اپن کو نکلے ہوئے بہت دن ہوگیا ہے۔ ایدر کا سیدھا کرنے سے ابھی اُدھر کا اُلٹا ہوگیا تو ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم لوگ چلے جاؤ۔" ابا جان نے کسی قدر تنبیہی لہجے میں پیرو سے کہا۔ "میں ایک دو دن بعد آجاؤں گا۔ وہاں تم میری تاخیر کا کوئی بھی معقول عذر کر دینا۔ ویسے بھی تو کسی اور وجہ سے دیر ہوسکتی تھی۔"

"ابھی آپ کیسا بولتا ہے بابا!" پیرو نے احتجاجی آواز میں کہا۔ "آپ کو اپن سے زیادہ اُودر ہونا چاہیئے۔ اپن کیا منہ لے کے جائے گا۔ کس کو کیا جواب دے گا۔ ابھی سب چوپٹ ہوسکتا ہے۔ آپ نئیں جائے گا تو اپن کے جانے سے کیا ہوئے گا۔"

"یہاں نوکر چاکر لوگ بھی تو ہیں۔" مُنجّل نے آہستگی سے نواب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اُس کا انداز ٹوکنے کا سا تھا۔ "رات تین تو اپنے ساتھ گھرے ہوئے تھے۔ سب اِن کا جانا بوجھا، دیکھا سنا ہے۔"

نواب حشمت جنگ جز بز سا ہونے لگا، وہ ابا جان، مُنجّل اور پیرو کے چہرے دیکھا کیا۔ "کوئی ایسی مجبوری ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے کم و بیش سبھی کچھ عرض کر دیا ہے۔ ہم آپ کو بتائیں، ہمیں سکون نصیب نہیں ہوگا۔ ہم اپنی سی کوشش تو بہرحال کریں گے ہی لیکن آپ لوگوں کی موجودگی میں صورتِ حال مختلف ہوگی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مدعی خود موجود نہ ہوں۔ عجب نہیں کہ ہمیں آپ کو ساتھ لے کے حضور نظام کے دربار میں فریاد کے لیے جانا پڑے ویسے ہمیں یقین ہے، اِس کی نوبت شاید ہی آئے تاہم طرح طرح کے شکوک و شبہات ہمارا ذہن منتشر کر رہے ہیں۔"

"میں، میں تو یہاں رک ہی رہا ہوں قبلہ من!" ابا جان نے بہ عجلت کہا۔ "میں اپنے معزز و محترم دوست کی تجویز کیسے رد کرسکتا ہوں۔"

"پھر ابھی اپن میں سے کوئی نئیں جائے گا۔" پیرو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اپن ایسا اکیلا اُودر نہیں جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، یہ بھی ٹھیک ہے بابا!" ہم سب پھر اِدھر ہی رہیں گے۔" مُنجّل نے زیرلبی سے کہا۔ "اور جب اِدھر ہی ٹکنا ہے تو بڑے نواب صاحب کی حویلی میں کیوں نہ چلیں۔ وہ ہم کو بہت روک رہے تھے، دیکھ کے خوش ہو جائیں گے۔" مُنجّل نے ضرور کسی مقصد سے یہ بات کی ہوگی۔ نواب حشمت جنگ نے جواب نہیں دیا، مُنجّل نے انتظار بھی نہیں کیا اور نواب کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اور اگر سیدھے اپنے نواب صاحب کے محل میں جا کے ہی ڈیرا لگائیں تو کیسا رہے۔"

نواب نے ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اچھل کے کہا۔ "کیا کہتے! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، یہ تو آپ نے ہمارے دل کی بات کہہ دی۔ ہم تو پہلے ہی گزارش کر رہے تھے۔ ہمیں موقع ہی کہاں دیا گیا۔"

"ابھی موقع ہی موقع ہے نواب صاحب!" پیرو چہلتی آواز میں بولا۔ "اپن ایک دم اکھا شکایت نکال کے جائے گا۔ جب تک آپ بولے گا، آپ کے پاس ہی رہے گا۔"

"زہے نصیب! زندگی بھر۔" پیرو کا یہ اندازِ تخاطب نواب پر گراں گزرنا چاہیے تھا۔ نواب نے اُس کے طنز کا شائستگی سے جواب دیا، شاید اِس لیے کہ پیرو کے لہجے میں طنز کم، مضحکہ زیادہ تھا۔ پیرو نے شگفتگی کی احتیاط کی تھی۔ "ہمارے لیے اِس سے بڑی خوشی، اس سے بڑی عزت کیا ہوسکتی ہے۔" نواب انکسار سے بولا۔

"جتنا بڑا آپ ہے، دل بھی آپ کا اتنا ہی بڑا ہے۔ ایسا کیدر ہوتا ہے نواب صاحب! یہ آپ کا نہیں، اپن کا عزت ہے۔" پیرو نے سر جھکا کے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "اپن آپ لوگ کے لیے نوا نوا آدمی ہے۔ آپ اپن کے بارے میں ابھی کتنا جانتا ہے، قسم سے کچھ بھی نہیں جانتا۔ ایسا کیدر ہوتا ہے نواب صاحب!"

"معلوم نہیں، جاننے سے آپ کی کیا مراد ہے۔" نواب تمتماتے لہجے میں بولا۔ "اگر شناسائی اور یک دلی کسی معین مدت سے مشروط ہے تو بخدا ہم اِس کے قائل نہیں۔ اِس مختصر مدت میں آپ حضرات نے جو نقش ثبت کیے ہیں، اُن سے ہم آشنا نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے، ہم کچھ اور جاننا بھی

نہیں چاہتے۔ یقیناً اِس سے کہیں بیش ہوگا مگر ہمارے لیے آپ سے اتنی آگہی کی سرشاری کیا کم ہے۔"

"اپن کو آپ جیسا بات کرنا نہیں آتا۔" پیرو نے لجاجت سے کہا۔ "پر اپن آپ سے کچھ بول رہا تھا۔ ابھی ہوسکے تو ذرا دھیان سے سن لو نواب صاحب!"

"جی، جی، فرمائیے۔" نواب سنبھل کے بولا۔

"اپن بول رہا تھا کہ سدا کے لیے تو کوئی اپن ایدر سے نہیں جا رہا ہے۔ ایدر یہ حویلی خریدا ہے۔ ایدر اپنا خانم موجود ہے اور آپ لوگ ہے۔ ایدر ابھی اپنا تین تین گھر ہے۔ بابا کا یہ نوا حویلی، بڑے نواب صاحب کا اور آپ کا۔ بابا بہت دن سے ایدر شہر حیدرآباد میں آنے کا بولتا تھا۔ ایدر آکے اپن کو پتہ چلا کہ بابا ٹھیک ہی بولتا تھا۔ یہ شہر، ایدر کا لوگ، ایدر کا موسم، آدھا نرم، آدھا گرم۔ ایدر آپ جیسا لوگ ہے جو اپن کے ذرا سے دُکھ پر اتنا گھبرا جاتا ہے۔ ایدر آکے اپنا من ابھی لوٹنے کو ایک دم نہیں کرتا پر اپن آپ کو کیا بولے۔ یہ ایک نہیں، اپن کے ساتھ اکھا زندگی، ایسا نوٹنکی ہوتا رہا تھا۔ کبھی وقت ملا تو اپنا کہانی سنائے گا۔ آپ کو نوٹنکی کا ہی مزا آئے گا۔ یہ رات اپن نے جیسا کاٹا ہے، ابھی اپن ہی جانتا ہے۔ معاف کرنا، اپن کا آپ سے کوئی میل نہیں بنتا ہے، اپن بہت کمتی آدمی ہے۔ کیدر بھی آپ کا آگے کھڑا نہیں ہوسکتا۔ پر اپن ایک بات میں ایک دم کمتی نہیں ہے۔ اپن کا خون آپ سے تھوڑا کم گرم نہیں ہے۔" پیرو کی آواز میں لکنت آنے لگی۔ "پر ابھی کیا کرے۔ اُودر دیکھتا ہے تو اپنے کو نوچ کے رہ جاتا ہے۔ اُودر اپن کا لوگ آس لگائے کھڑا ہوگا۔ اتنے دن کا بول کے نہیں آیا تھا اور ادھورے میں نکل پڑا تھا۔ اُودر سب بکھرا پڑا ہوگا۔ وقت پر ابھی نہیں پہنچا تو بہت کچھ خراب ہو جائے گا، خلاص ہو جائے گا۔"

نواب جھپکتی پلکوں سے سنتا رہا۔ ابا جان نے کئی مرتبہ دخل دینا اور اشاروں اشاروں میں پیرو کو ٹوکنا چاہا مگر پیرو غالباً دانستہ اُن کی اُن کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ تجمل بھی چپ بیٹھا رہا۔ سب دم بخود سے تھے اور نواب کے پیشانی پر اُبھرتی مٹتی لکیریں اور اُس کے چہرے پر بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہے تھے۔ پیرو چپ ہوا تو ابا جان نے اپنی زبان بند ہی رکھی۔ تجمل بھی نہیں بولا۔ نواب کے نتھنے بار بار پھڑکنے لگتے تھے۔ چند ثانیے یوں ہی گزر گئے۔ نواب گم صم سا بیٹھا رہا پھر جھرجھری کے سے انداز میں چونک کے بولا۔ "ہمیں اپنی عرض سے شرمندگی ہو رہی ہے۔ اصل میں ہم نے..... ہماری نظر محض عواقب کی طرف تھی۔ غالباً اِس لیے کہ ہم پر ریاست کے بعض اہم فرائض منصبی عائد ہوتے ہیں لیکن یقیناً ہم پر اپنے محسنوں، دوستوں کے حقوق بھی لازم ہیں۔"

معلوم نہیں، یہ سُن کے ابا جان کے دل کا کیا حال ہوا ہوگا، دل تو بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میری طرح ابا جان کو بھی اپنے کانوں یقین نہیں آیا ہوگا۔ نواب رُکی رُکی آواز میں بولا۔ "ہم عرض کریں ہمار معروضات محض گزارشات تھیں۔ ہمیں خدشہ ہے کہ وقت گزر نہ جائے "وقت ہی کی تو بات ہے۔ ہمارے خیال میں اُن شورہ پشتوں جلد سرکوبی نہ کی گئی تو اُن کے حوصلے اور بلند ہوں گے۔ کل کسی گھر سے کم الم ناک سانحے کی خبر آئے گی۔"

"آئے گا، ضرور آئے گا۔ کل کسی گھر سے اور، پرسوں کسی اور گھ سے خبر آسکتا ہے پر اپن لوگ کیا کرسکتا ہے؟" پیرو نے اپنی آواز قا میں رکھی تھی۔ اُس نے منکسر لہجے میں نواب سے پوچھا کہ کیا ہماری میں موجودی اُن لوگوں کے عزائم میں حارج ہونے کی ضمانت ہے؟ یہاں رہیں گے تو وہ کسی اور گھر کا رُخ نہیں کریں گے؟ پیرو نے اُ سے کہا کہ وہ یہاں اپنی کوئی نشانی یا اتا پتہ چھوڑ کے نہیں گئے ہیں جو لو کو سمتیں ٹٹولنے میں مدد دے سکے۔ جہاں تک ان کی تلاش کا تعلق ہے یہ کام کسی طور ہمارا نہیں، سر بہ سر پولیس کا ہے اور پولیس کی کامیابی کے لیے اُس کے ارادے کی سچائی نیز ساری تگ و دو میں اخفا شرط ہے۔ نے نواب کی توجہ اُن تین ملازموں کی طرف دلائی جن کا ذکر کچھ دیر پہلے نے کیا تھا کہ وہ گزشتہ رات کے ایک ایک لمحے کے شاہد ہیں اگر صرف شہادت و شناخت کا معاملہ ہے تو وہ بھی یہ کام بہ حسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں کیونکہ اب وہ زندگی بھر اُن کی صورتیں بھول نہیں سکیں گے۔ اگر نواب کا مقصد ہماری موجودی سے پولیس اور متع حکام کی فعالیت، اُن کا خون گرم رکھنا ہے تو نواب خود کوئی چھوٹا حا نہیں ہے۔ دربار سرکار میں اُس کا اثر و رسوخ مسلّم ہے۔ ریاست کی پو اُس کے مرتبے سے خوب آگاہ ہے، اُس کے اشارے اچھی طرح پہچانت ہے۔ پیرو نے اُس سے کہا کہ رات حویلی میں اُن لوگوں کی اچانک یلغار ہمار تئیں نواب کی کسی کوتاہی کا خمیازہ نہیں ہے، جو نواب کی محجوبی کا سب بنے۔ اگر ہماری آنکھوں کے سامنے اُنھیں عبرت ناک انجام سے دو کر دینے کی کوئی آرزو نواب کے دل میں تڑپتی ہے اور یوں اپنے دوستو کی خوشنودی، اُن کی نگاہوں میں سرخ روئی مقصود ہے تو وہ خاطر ج رکھے۔ نواب کے دوستوں کو اپنی عدم موجودی میں اُس سے اِسی حسن سلو اور شدتِ احساس کی توقع ہے۔

نواب انہماک اور خاموشی سے پیرو کی باتیں سنتا، اُس کی صو تکتا رہا۔ درمیان میں وہ ضرور کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُس کے ہونٹ پھڑک کے رہ گئے۔ پیرو نے رات آنے والے آدمیوں کے سلسلے میں نواب کی طرف اشارہ کیا تھا مگر خود پیرو کے ذہن میں نواب کے جملہ مراتب پوری طرح محفوظ تھے۔ نواب کی ہر حیثیت، ایک دوست جیسے رات کا حادثہ سُن کے بے حد صدمہ ہوا ہے۔ ایک حاکم جس کے اثر و اقتدار کے لیے یہ واقعہ ایک تازیانہ ہے۔ ایک حاکم دوست جو کبھی دوست اور کبھی حاکم کے طور پر نتائج اخذ کرنے کے سلسلے میں متوحش ہے۔ کبھی رنج و ملال اُس پر غالب آتا ہے، کبھی اشتعال و غضب۔ ایک ایسا منافق جو بزدل ہے، جس نے رات ہیروں کی طلب میں مسلح آدمی بھیجے تھے۔ ایک حریص جس کے دل میں یہ رُوداد سُن کے ہیروں کی ہوس جاگی ہے۔ ایک ایسا شخص جو رات آنے والے آدمیوں کا مقصد بخوبی سمجھ چکا ہے اور ہم پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے ہم رتبہ نواب یار اجا کو اُس کی جرأت و جسارت کا معقول جواب دینے کے لیے جس کا خون کھول رہا ہے۔ نواب کی کوئی ایک حیثیت پیرو کے ذہن میں واضح ہوتی تو اُسے اتنی مشکل پیش نہ آتی۔ خانم اور حویلی کا ذکر اُس نے دانستہ کیا تھا، ضمانت کے طور پر کہ شہر میں ہماری دوبارہ آمد کیسی یقینی ہے۔ نواب کو ہم سے اپنی نسبت کی مروّت کا واسطہ دینے ہی سے گلو خلاصی کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ دو یقین دہانیوں کا اعادہ ازبس لازم تھا کہ ہماری روانگی کے التوا سے کسی بڑے نقصان کا احتمال ہے اور ہم جلد واپس آرہے ہیں۔ ابا جان بھی نواب کو یہی باور کرانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ لیکن غالباً یہاں قیام کی آمادگی کے بعد ہی پیرو کی یہ تکرار کچھ اثر پذیر ہوسکتی تھی۔ ابا جان ٹھیرنے کی آمادگی ظاہر کر چکے تھے مگر انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ اپنے پیروں پر کلھاڑی مارنے کے برابر ہے۔ ایک دن کی تاخیر کتنے بڑے عرصے پر محیط ہوسکتی ہے۔ پولیس کی چھان بین کا سلسلہ کہاں تک دراز ہوسکتا ہے۔ پولیس کو اڈوں سے وابستہ لوگوں کو پہچاننے میں ایک گھڑی کی بھی دیر نہیں لگتی۔ اگر کوئی گنجائش باقی تھی، کوئی بھی نرم گوشہ تو پیرو کو ذرا بھی چوک نہیں کرنی چاہیے تھی۔ پیرو جیسے عدالت میں کھڑا دلیلیں دے رہا تھا۔ وہ نواب کو کس طرح یقین دلا سکتا تھا کہ وہ لوگ اب کسی اور گھر کا رُخ نہیں کریں گے۔ وہ صرف ہمارے پاس آئے تھے۔

نواب کی پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھر رہے تھے۔ ہر چند ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور اطراف میں پھیلی ہوئی دھوپ بھی ایسی تیز نہیں تھی۔ نواب کی آنکھوں سے مترشح تھا کہ پیرو کی کوئی دلیل اُسے قائل کر گئی ہے یا اُس نے جان لیا ہے کہ اپنے دوستوں کے راستے میں مزاحم ہونے سے انھیں مزید اذیت ہوگی یا اُسے یقین آ گیا تھا کہ ہمارے پاس وہ شے ہی نہیں ہے جس کی آرزو میں رات لوگ آئے تھے۔ ہمیں روک کے گویا آئندہ کے امکانات بھی ختم کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے اُسے کچھ اور اندیشوں نے بھی گھیر لیا ہو کہ کہیں یہ وضع و مروّت پھٹے میں پاؤں اَڑانے کے مصداق نہ ہو۔ پیرو نے اُس سے کہا کہ بہتر ہے، وہ حاکم کے بجائے ایک دوست کی حیثیت سے ہماری عرض پر غور کرے۔ اگر مدعی خود درگزری اور معافی پر آمادہ ہے تو منصف کو بھی خاموش ہو جانا چاہیے۔

نواب نے کچھ نہیں کہا تاہم جب تک وہ موجود تھا، کسی بھی لمحے کوئی حکم صادر کرسکتا تھا، کسی بھی لمحے اُس کا دماغ کروٹ بدل سکتا تھا۔ اِس کے بعد پیرو یا کسی اور کو زبان کھولنے کی توفیق نہیں ہونی چاہیے تھی۔ پیرو نے اُس کے سینے میں بچا کھچا دھواں تحلیل کرنے کے خیال سے ایک اور کوشش کی۔ نواب نے نظام سرکار کی بات کی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ ابا جان کو ساتھ لے کر دربار تک فریادی ہونے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ "اور آپ نظام سرکار کی بات بولا ہے نواب صاحب!" پیرو نے کسی قدر رازدارانہ انداز میں اُس سے کہا۔ "اپن پہلی بار اُس کے پاس شکایت لے کے جائے گا اور ایسا خالی ہاتھ جائے گا؟ کچھ ساتھ ہوگا تبھی اُودر جانا تھوڑا ٹھیک لگے گا۔ بار بار ابھی واں جانے کا موقع تو اپن لوگ کو نہیں ملے گا نا! بابا کے پاس ابھی اودر دو ایک چیز ایسا کھرا ہے کہ نظام سرکار نے بھی کبھی۔" پیرو نے اپنی بہکتی ہوئی زبان تھام لی اور جھجکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی شاید اُس کو بھی کچھ پسند آئے۔" پیرو کے لہجے میں بہت سادگی تھی بلکہ کسی حد تک حمق بھی۔ کہیں بھی نواب کو یہ تاثر نہیں ملا ہوگا کہ پیرو نے دانستہ یہ ذکر کیا ہے اور مقصود کچھ اور ہے۔

نواب حشمت جنگ نے بظاہر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ ساکت بیٹھا جیسے اپنے آپ کو گھورتا رہا۔ کسی اور نے بھی لب کشائی نہیں کی۔ لمحوں تک سبزہ زار پر سناٹا چھایا رہا۔ پھر نواب ہی کے جسم میں جنبش ہوئی کیونکہ یہ خاموشی نہایت ناروا محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے رُومال سے اپنا چہرہ خشک کیا، آنکھوں کے گوشے صاف کیے اور سامنے رکھی ہوئی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پیالی میں بچی ہوئی چائے رکھے رکھے برف ہوگئی ہوگی۔ "میں دوسری بناتا ہوں۔" ابا جان لپکتے لہجے میں بولے۔

"ہمیں ٹھنڈی چائے زیادہ مرغوب ہے۔" اُس نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا۔

"اب تو واقعی کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔"

نواب نے شیروانی کے بٹن سے پیوستہ نقرئی زنجیر کھینچ کے

جیبی گھڑی نکالی۔ "ڈیڑھ بجنے کو ہے۔" وہ تعجب سے بولا۔ "اور آپ، آپ کس وقت جانا چاہتے ہیں؟"

سب کو جیسے کسی نے چٹکی بھر لی ہو۔ سب نے بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "رات نو بجے کے قریب گاڑی جاتی ہے۔" ابا جان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"پھر تو وقت کم رہ گیا ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ دوپہر کا کھانا آپ غریب خانے پر تناول فرماتے لیکن اب اس میں اور وقت صرف ہو جائے گا۔ ہمیں بازار بھی جانا ہے۔"

"میری درخواست ہے کہ یہ تکلف اگر مناسب ہو......" ابا جان کی آواز اُن کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"تکلف کیسا؟ ہم تو کچھ بھی نہ کر سکے۔"

"آپ نے کیا کچھ نہیں کیا۔" ابا جان نے وفورِ مسرت سے کہا۔ "سب سے بڑا ثبوت تو یہ حویلی ہے۔ بناتے بناتے ایک عمر لگ جاتی ہے۔ اور، اور آپ کا اتنا وقت دینا، اتنی پرسش کرنا کچھ کم ہے کیا، یہی ہمارے لیے سب سے بڑی سوغات ہے۔ اس سے بڑی کیا چیز ہو سکتی ہے۔ میری عرض ہے، اب ہمیں جلد واپس آنا ہی ہے، پھر ہزار مواقع آئیں گے۔"

"تاہم یہ موقع کیوں جانے دیا جائے۔" بہت دیر بعد نواب کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بجھی بجھی سی مسکراہٹ۔ "دیکھیے قبلہ گاہی! کل بات طے ہو چکی ہے۔ بس اب ہمارے ساتھ چلیے۔ یہی ہماری خوشی ہے۔"

"بہتر ہے۔" ابا جان نے سر جھکا کر کہا۔ "گزارش صرف یہ تھی کہ جب سب کو یہاں آنا ہی ہے تو آ کے...... مگر۔" ابا جان کو خیال آگیا کہ انھیں اتنی ردّ و قدح نہیں کرنی چاہیے۔ وہ جلدی سے بولے۔ "میں تیار ہوں لیکن اب کھانے کے بعد ہی چلا جائے تو مناسب ہوگا۔"

"ہمیں قطعاً بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے۔"

"یہاں بھی کچھ یہی کیفیت ہے لیکن وقت تو کھانے ہی کا ہے۔"

"جی ہاں۔" نواب ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"وقت تو بھوک پر بنتا ہے بابا!" بتھّل نے حقے کی منال ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"آپ درست فرماتے ہیں۔" نواب خوش گواری سے بولا۔

"وقت تو خود بھوک طے کرتی ہے۔"

" ابا جان بتھّل کا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ ایک جھٹکے سے کرسی سے اُٹھ گئے لیکن ابھی آدھے بھی نہ اُٹھ پائے ہوں گے کہ انھیں کرسی کا دستہ پکڑنا پڑا۔ ایک ثانیے کے لیے اُن کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ نواب کی نگاہیں اُنھی کی طرف مرکوز تھیں۔ کرسی سے اُٹھنے کے دوران اُس نے اُن کی کراہ بھی سن لی ہوگی مگر ابا جان فوراً سنبھل گئے۔ پھر اُنھوں نے مضبوطی سے پیر زمین پر جمائے ہوں گے۔ نواب نے اُنھیں آرام کا مشورہ دیا اور معذرت چاہی کہ اُسے اُن کی تکلیف کا احساس ہی نہیں رہا۔ ایسی حالت میں کہیں جانے سے تکان اور سوا ہوگی، رات بھی وہ مسلسل جاگتے رہے تھے۔ ابا جان اُس ایک شکستہ لمحے کی زد سے نکل آئے۔ اُنھوں نے ہاتھ پھیلا کے شگفتگی سے کہا کہ وہ کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ باہر نکلنے سے یہ تھوڑی بہت کسل مندی بھی دُور ہو جائے گی۔ نواب نے خوش دلانہ لہجے میں ایک مرتبہ پھر اُنھیں آرام کرنے کی ہدایت کی اور بولا کہ اُن کا ہمراہ جانا ایسا ضروری نہیں ہے۔ صرف اس خیال سے وہ اُنھیں لے جا رہا تھا کہ انتخاب میں ابا جان کی پسند شامل رہے۔ ابا جان نے مارٹی کو شیروانی لانے کا اشارہ کر دیا تھا وہ آرام ہی کرتے تو زیادہ ٹھیک تھا لیکن رات گاڑی میں بیٹھنے تک اُنھیں نواب کو زیادہ سے زیادہ وقت تک مصروف بھی رکھنا چاہیے تھا، مبادا نواب کا سر پھر کسی اور طرف بھٹکنے لگے۔ مارٹی اندر سے مکلّف شیروانی لے آیا۔ ابا جان نے صبح ہی نئے کپڑے پہنے تھے اس لیے انھیں اندر جانے کی زحمت نہیں کرنی پڑی۔ موٹر میں دو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش اور تھی۔ نواب نے رسماً سہی، بتھّل اور پیرو سے بھی کہا، پھر میری طرف مڑ کے بولا۔ "آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیے گا؟"

جواب میں میری نگاہیں غیر ارادی طور پر منیر علی کی جانب اُٹھ گئیں۔ منیر علی نے پس و پیش بھی نہیں کیا۔ تینوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ آگے والی نشست پر بیٹھ سکتا تھا لیکن سب کو چھوڑ کے اُن کے ساتھ جانا مجھے اچھا نہیں لگا۔ ڈرائیور نے موٹر پہلے ہی موڑ لی تھی۔ ابا جان اور منیر علی کے بعد نواب بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ پیرو کی آواز پر رک گیا۔ پیرو نے اچانک اُسے آواز دی تھی۔ نواب دو قدم پیچھے ہٹ کے اُس کے پاس آگیا۔ اِدھر سے پیرو بھی تیزی سے آگے بڑھا، اُس نے سرگوشیانہ لہجے میں مختصراً نواب سے کچھ کہا، نواب سر ہلانے لگا۔ میں اُن سے دُور تھا۔ کچھ موٹر کے انجن کے شور میں پیرو کی آواز دب گئی تھی۔ پیرو کے اندازِ تخاطب سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے نواب سے کوئی درخواست کی ہے جسے کشادہ دلی سے نواب نے قبول کیا ہے۔ اُس نے پیرو کے شانے پر تھپکی دی اور موٹر میں بیٹھ گیا۔ ممکن ہے، پیرو نے اپنے لب و لہجہ کی معذرت کی ہو، بہر حال کوئی ایسی بات ضرور کہی تھی جس نے نواب پر اچھا اثر مرتب کیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے موٹر ہماری آنکھوں سے دُور ہو گئی مگر سب دیر تک کھڑے صدر دروازے کی طرف دیکھتے رہے۔

اور صدر دروازے کے پار سڑک سے موٹر کی پوں پوں کی آواز آئی

تبھی جیسے سب بیدار ہوئے۔ پیرو جسم ڈھیلا چھوڑ کے اتنی زور سے کرسی پر بیٹھا کہ کرسی ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ بائیں طرف سے زورا آکے مجھ سے لپٹ گیا اور میری گردن سے سر رگڑنے لگا۔ پیچھے سے مارٹی نے آکے میری کمر جکڑلی اور شامو نے آکے مجھے بھینچ لیا۔ اُن سب کی سانسیں اکھڑی ہوئی سی تھیں جیسے وہ دُور سے چل کے آرہے ہوں اور جیسے بہت دنوں بعد ایک دوسرے سے مل رہے ہوں۔ زورا، شامو، جبرو میری طرف سے ہٹ کے پیرو کی کرسی کی طرف جھپٹے اور اُس کے ہاتھ پیر چومنے، دبوچنے لگے۔ پیرو نے انھیں جھڑکا لیکن اُن میں سے کوئی اُس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ پیرو انھیں گالیاں بکنے لگا۔ میں سیدھا کانتے کے پاس چلا آیا۔ جانے کتنی بار مجھے اُس کا دھیان آیا تھا۔ میں اُس کی طرف دیکھ کے رہ جاتا تھا۔ نواب کی موجودی میں وہ اپنے آپ پر جبر کیے ہوئے تھا، اُس کے جاتے ہی اب وہ کرسی سے سر ٹکائے آنکھیں موندے بے حال نظر آرہا تھا، بکھرا ہوا سا۔ میں نے اُس کا بازو چھوا تو وہ اُچھل گیا، اُس نے میرا ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں اُسے وہاں سے اٹھا کے اندر لے آیا۔ اُسے اب چلنے میں دقت ہو رہی تھی میری منتوں سے وہ بستر پر لیٹ گیا اور چند لمحوں میں بے سُدھ ہو گیا۔

٭

سب اندر چلے آئے تھے۔ جبرو اور شامو نے ملازمین سے کہہ کے کھانا لگوا دیا تھا۔ کسی نے منع نہیں کیا۔ کانتے وہاں نہیں تھا۔ باقی سب نے پیٹ بھر کے کھایا۔ ملازمین نے نواب حشمت جنگ کے خیال سے اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک دسترخوان سجا ہوا تھا۔

میں کانتے کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد عمارت میں یوں ہی گھومتا رہا۔ کبھی اِس کمرے میں، کبھی اُس کمرے میں، اندر حویلی میں کسی جگہ میرا جی نہیں لگا۔ میں نے اُن سب کی طرح سیر ہو کے کھانا کھایا تھا لیکن بہت جلدی جلدی میں۔ سب سے پہلے میں نمٹ گیا تھا پھر بھی اُن کے ساتھ آخر تک دسترخوان پر بیٹھا رہا۔ کھانے کے دوران بھی میرا جی اُڑا اُڑا سا تھا۔ کچھ ایسا گمان ہوتا تھا کہ کہیں کچھ ہو رہا ہے اور ہم سب یہاں بے خبر بیٹھے ہیں، ہم سے کوئی چُوک ہو رہی ہے۔ میری نگاہیں بار بار اُن سب کی طرف اُٹھتی تھیں اور اُن کے چہروں پر چھایا ہوا اقرار بھی مجھے جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔

ابّا جان کو گئے ہوئے ایک گھنٹے سے اوپر ہو رہا تھا۔ ٹھِّل کے کہنے پر آرام کرنے کے لیے سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ کانتے کو ایک نظر دیکھ کے میں نشست گاہ میں واپس آگیا، یہاں پیرو اور ٹھِّل کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ٹھِّل وہیں دیوان پر آنکھیں بند کر لیٹ گیا۔ پیرو بھی اُس کے قریب صوفے پر نیم دراز تھا۔ اُن کی با سننے اور کچھ اخذ کرنے کی غرض سے میں بھی چپ چاپ ایک صو لیٹ گیا مگر وہ دونوں خاموش تھے اور سونے کی کوشش کر تھے۔ سامنے رات کا سفر تھا اور خاصا طویل سفر۔ اچھا یہی تھا تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لیں اور تازہ دم ہو کے یہاں سے میں نے بھی آنکھیں موند لیں۔ لیٹتے ہی میرا سارا جسم اکڑنے لگا نیند ایک پل کے لیے بھی نہیں آئی۔ سامنے دیواری گھڑی ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ گاڑی رات کو ۹ بجے کر روانہ ہوتی تھی۔ کم از کم آدھ گھنٹے پہلے ہمیں اسٹیشن پہنچنا اور گھنٹے پہلے حویلی سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ گویا ابھی پورے چا اور یہیں رہنا ہے۔ ابّا جان بھی واپس آتے ہوں گے۔ بازار میں اور کتنی دیر لگ سکتی ہے۔ سارا بازار تو اٹھا کے لائیں گے نہیں نواب حشمت جنگ بھی آخر کتنی دیر اُن کے ساتھ رہے گا۔ میری نظ گھڑی پر لگی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ وقت بوڑھا ہو گیا ہے یا جیسے گ تھک گئی ہے۔ میں کوئی آدھ گھنٹے تک اپنے آپ کو سمیٹے، باندھے رہا لیکن آرام کے بجائے میری رگیں اور کھنچنے لگیں۔ میں اُٹھ کے گیا۔ میری نظر سامنے کے صوفے پر دراز پیرو کی طرف گئی۔ اُس کی آ کھلی ہوئی تھیں یا میری آہٹ سے کھل گئی تھیں۔ میں دبے قدم کمرے سے نکل جانا چاہتا تھا، معاً پیرو کی آواز آئی: ”کیدر کو جا“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

”کانتے کو دیکھنے۔ اُس کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ہے دادا!“

وہ بھی اُٹھ گیا: ”ابھی لوٹ پوٹ کے ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میرا خیال ہے، اُسے کسی حکیم ڈاکٹر کو دکھا دینا چاہیے۔“

”سُور کا کھال کا بنا ہے راجا!“ پیرو نے مسکراتے ہوئے کہا ضرورت پڑا تو اودر جا کے اکٹھا دکھا دے گا۔“

”بمبئی ہی چل رہے ہیں ہم لوگ؟“ میں نے زیرلبی سے پو

”ہاں راجا! اور کیدر؟“ وہ سانس بھر کے بولا۔ ”ابھی بہ دن ہو گیا۔“

”تمہیں گیتا وغیرہ کی تو بہت یاد آتی ہو گی؟“

”ہاں!“ اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”اپن اتنی دیر کبھی گیا دور نہیں رہا۔ اُودر کبھی لمبا چھٹی کو گیا بھی تو پندرہ بیس دن بعد جا کے دیکھ آتا تھا۔ لوٹ کے اپن سیدھا ٹیم پہ واپس پہنچ جاتا تھا تو

لوگ بھی اپن کا دھیان رکھتا تھا۔“

”مگر اب کے تو یہ بھی ممکن نہیں ہوا، اب کے تو بہت دن ہو گئے۔“

”پر اپن بول کے آیا تھا، ابھی آئے گا کہ نہیں بھی آئے گا۔ اپن سب خلاص کر کے چلا تھا۔ کیا اپن کے لیے یہ تھوڑا ہے کہ ابھی پھر لوٹ کے اُودر جا رہا ہے۔“

میں جانتا تھا کہ وہ میری خاطر ایسا کہہ رہا ہے۔ اپنی بیوی اور بیٹی سے ملنے کے لیے وہ گن گن کے دن کاٹ رہا ہو گا۔ اُن دونوں سے اُس کی وابستگی کا حال مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ ”تم نے فیض آباد کلکتے وغیرہ سے خط تو لکھ دیا ہو گا؟“

”نہیں، اپن سوچا، ابھی لبھی ایک دم سامنے جائے گا۔“ پیرو کی آواز چہکنے لگی: ”اور راجا! اپن ابھی تیرے بارے میں سوچتا ہے۔ اُودر بمبئی میں اتنے دن بعد بھائی بہن لوگ سے ملے گا تو کیا ہوئے گا۔“

”وہ اب کیا پہچانیں گے دادا!“ میں نے آہستگی سے کہا: ”مجھے تو اُن کے سامنے جانے کے خیال ہی سے خوف آتا ہے۔“

”ٹیم بھی تو بیچ میں بہت بڑا ہے۔“

”ہاں دادا! اور وقت کا تو یہ ہے کہ کس پر کیسا گزرتا ہے، اسی حساب سے اِس کی پیمائش ہونی چاہیے۔ کبھی ایک پل بھی برسوں کے برابر ہوتا ہے۔ ہر ایک کے لیے تو اِس کا حساب اَلگ ہے۔ یوں تو دس سال ہوئے ہیں۔ لیکن کیا یہ ٹھیک ہے؟“

پیرو پلکیں پٹ پٹانے لگا اور مچلتی آواز میں بولا۔ ”اپن بھی اُودر تیرے ساتھ چلے گا راجا!“

”تماشا دیکھنے دادا؟“

”کیسا بولتا ہے۔“ وہ تنک کے بولا۔

”تماشا ہی ہو گا دادا! میں کس منہ سے اُن کے سامنے جاؤں گا۔ انھیں تو اپنے بھائی کی حیثیت سے مجھے پہچاننے سے انکار کر دینا چاہیے۔“

”کیوں راجا؟“

”سب کچھ میری ہی وجہ سے تو ہوا ہے۔ میری وجہ سے وہ بے گھر ہوئے، دربدر مارے مارے پھرتے رہے۔ مجھے کسی کا کوئی خیال نہیں آیا۔ میں انھیں چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ میں نے اُن سے اُن کی ماں چھین لی۔“ میری زبان اینٹھنے لگی۔

”ابھی بار بار کیوں دُہراتا ہے اس کو۔“

”دُہراؤں بھی نہیں دادا؟ اپنی خطائیں خود سے چھپاؤں، اپنے آپ کو دھوکا دوں، یہ تو اب ہمیشہ کا عذاب ہے، سوچتا ہوں تو سینہ پھٹنے لگتا ہے۔ میں کوئی غلط کہتا ہوں۔ امی کی عمر بھلا ابھی جانے کی تھی؟ میں انھیں اچھی بھلی چھوڑ کے نکلا تھا۔ میری وجہ سے وہ زندہ نہ رہ سکیں۔ وہ ایک میری ہی ماں تو نہیں تھیں، اُن سب کی بھی تھیں۔ میں نے اُن سے اُن کی ماں چھین لی۔ باپ بھی اُن کا اپنا نہیں رہا۔ ابّا جان کا دماغ میں نے بھٹکایا تھا۔ نہ انھیں تبّت کے وہ منحوس کاغذات ملتے، نہ وہ اپنا گھر برباد کرتے اور رفتی! رفتی بھی تو میری وجہ سے بے پردہ ہوئی تھی اور جہاں گیر...... “ میری آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔

”ہو جاتا ہے جانی! ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ آدمی سالا ابھی دیکھتا رہ جاتا ہے۔ سارا کچھ آدمی کا بس میں تو نہیں ہوتا، آنکھ ہونے کا مطلب سدا دیکھتے رہنے کا اور کان کا مطلب سدا سننے کا نہیں ہے، ٹھیک دیکھنے، ٹھیک سننے کا۔ ابھی ایسا کوئی ایدر کو ہے تو اپن کو بولو۔“

”دادا! میرا جی چاہتا ہے، مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ پر ٹوٹ پڑیں، وہ خنجروں سے میرا جسم چھلنی کر دیں۔ میں کسی طرح اُن کا بھائی کہلانے کا مستحق نہیں ہوں۔“

”کیسا!“ اُس نے بڑھ کے مجھے دبوچ لیا: ”راجا! تُو نے سب جان کے کیا ہے کیا؟ اُودر خون کا بات ہے۔ وہ ایسا کرے گا؟ ابھی دیکھنا وہ تجھ کو دیکھتے ہی پاگل ہوا پڑے گا۔“ میں نے اپنے آنسو اپنی آنکھوں تک گھونٹنے کی بہت کوشش کی۔

پیرو مجھے اپنے بازو میں سمیٹے ہوئے باہر لے آیا۔ باہر راہداری

میں ملازم موجود تھے۔ پیرو نے مجھے کہنی مار کے اُن کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اُنھیں دیکھ لیا تھا اور اُن سے اپنا چہرہ چھپانے کے لیے سر جھکا لیا تھا مگر میرا سینہ جیسے کوئی کھرچ رہا تھا۔ آگے ملازموں کی طرف جانے کے بجائے پیرو مجھے دالان میں لے آیا اور وہاں سے چبوترے کی سیڑھیاں اتر کے باغ کی جانب نکل آیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح میرا جی بہلائے۔ باغ میں کون سا پھول، کون سی چڑیا دکھائے۔ وہ اِس طرح تسلیاں دے رہا تھا جیسے مَیں کوئی بچّہ ہوں، جیسے میں خود کچھ نہیں سمجھتا۔ شاید مَیں سمجھتا ہی نہیں ہوں۔ وہ آرام سے نشست گاہ میں لیٹا ہوا تھا۔ مَیں نے اُسے بھی تنگ کیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ وہ سب دہرانے سے کیا حاصل جس کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ مَیں خود بھی دُہرانا نہیں چاہتا تھا مگر کیا کروں، میری آنکھیں خود بخود اُمڈنے لگتی تھیں۔ پیرو باغ کی منڈیر پر بٹھا کے مجھے تھپکیاں دیتا رہا پھر مَیں نے ہی اُسے کانتے کے پاس چلنے کا مشورہ دیا۔ پیرو کو بھی تو میری دل داری کی ضرورت تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب دہرا کے مجھے اعتراف کا کوئی سکون ملتا تھا یا مَیں اِس خود آزاری سے اپنی سزا کا قرض ادا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اذیّت بھی تو آدمی کو آرام پہنچاتی ہے۔ مگر قرض کم کب ہوتا ہے، وہ تو اپنی جگہ رہتا ہے۔ بعض قرضے کبھی ادا نہیں کیے جا سکتے۔

کانتے پر غفلت طاری تھی۔ پیرو نے اُس کے سرہانے بیٹھ کے کئی آوازیں دیں۔ کانتے نے نہیں سُنا۔ اُس کا سارا منہ سُوجا ہوا تھا۔ پیرو نے اُس کی کلائی ٹٹول کے دیکھی۔ ہتھیلیاں گرم تھیں لیکن بخار نہیں تھا۔ ایک ملازم کو ہدایتیں دے کے پیرو باہر آگیا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ پیرو بھی اُس کی حالت سے مطمئن معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ کسی حکیم ڈاکٹر کو بلا کے اُسے دکھایا جائے ورنہ سفر اُس کے لیے اور بھاری ہو سکتا تھا۔ پیرو اور تجّل اپنے طور پر ان ضربوں کا علاج کسی نہ کسی حد تک کر لیتے تھے لیکن وہ باقاعدہ حکیم ڈاکٹر تو نہیں تھے۔ مَیں نے پیرو سے کہا کہ ملازم کے ساتھ جا کے مَیں کسی طبیب کو بلا لاتا ہوں، طبیب کے یہاں آجانے میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہے مگر مجھے اجازت دینے کے بجائے پیرو نے نشست گاہ میں آکے تجّل کو جگا دیا۔ تجّل ایسا سویا ہوا بھی نہیں تھا۔ وہ پیرو کی ایک دھیمی آواز پر اُٹھ بیٹھا اور ہم دونوں کے ساتھ کانتے کے کمرے میں آگیا۔ اُس کا کانتے کے پاس بیٹھنا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کے آواز دینا تھا کہ کانتے نے آنکھیں کھول دیں "چربی ختم ہو رہی ہے رے۔" تجّل نے اُس کے گال تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔

کانتے کی بجھی ہوئی آنکھوں میں کوندا سا لپکا۔ تجّل کے پرا اپنا چہرہ ٹکاتے ہوئے وہ ہانپتی آواز میں بولا "ابھی بہت ہے اُستاد!"

"کھینچ کے ہی رکھ۔"

کانتے کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ سر ہلا کے ر...

"تھوڑی چائے پی لے۔"

"کچھ جی نہیں چاہ رہا سالا۔"

"پی لے رے۔ ابھی رات میں دیر پڑی ہے۔"

کانتے نے اٹھنا چاہا تو تجّل نے اُس کے سینے پر دباؤ ... اُسے روک دیا اور کمر کے نیچے ہاتھ ڈال کے اُسے اُٹھا دیا۔ ... اپنی کراہیں نہ روک سکا۔ مسہری کے تکیے سے کمر ٹکا کے وہ کچھ ... نظر آیا۔ پیرو کے اشارے پر ملازم سادہ چائے لے آیا تھا۔ تجّل ... اپنے ہاتھ سے پیالی اُس کے ہونٹوں سے لگائی۔ کانتے منہ بنا ... ایک گھونٹوں میں پی گیا۔ اُس کی خواہش پر ملازم نے اُسے پان ... کھلایا۔ تجّل نے بیڑی سلگا کے اُس کے منہ سے لگا دی۔ کا... دو ایک ہی کش لگائے ہوں گے کہ تجّل نے بیڑی اُس کے ... سے کھینچ لی۔ تجّل اُس کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہیں ... اپنے آپ تکیے سے کھسکتا ہوا مسہری پر لیٹ گیا۔ کمرے سے نکلتے ... مَیں نے پلٹ کے دیکھا، اُس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

نشست گاہ میں واپس آکے مَیں نے گھڑی دیکھی ... بج کے پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ ابّا جان ابھی تک واپس نہیں ... تھے۔ جتنی دیر ہو رہی تھی، میرے دماغ میں طرح طرح کے ... اُٹھا رہے تھے۔ نواب حشمت جنگ اُنھیں کہیں اور تو نہیں ... گیا؟ مگر وہ کہاں جا سکتا ہے۔ راستے میں اُس کے دل میں ... نہ سما گیا ہو؟ ابّا جان کے ساتھ منیر علی کے سوا کوئی نہیں ... منیر علی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اب وہ کھُل کے اُن سے بات ... ہے جو یہاں اتنے لوگوں کی موجودی میں ممکن نہ تھا۔ کہیں ... تھانے نہ لے گیا ہو، رپورٹ درج کرانے پر اُسی نے زور دیا تھا ... تھا اور خود اپنے وہم ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا ... کا کھانا کِھلائے بغیر اُسے ابّا جان کو گھمانے لیے پھرنا اچھا نہیں ... وہ اُنھیں اپنے گھر لے گیا ہوگا یا کسی کلب وغیرہ میں۔ بمبئی کی طرح ... بھی صاحبِ حیثیت لوگوں کے لیے کلب اور اعلا درجے کے طعام ... ضرور ہوں گے۔ یقیناً یہی بات ہوگی۔ ابّا جان آیا ہی چاہتے ... کسی بھی لمحے موٹر کی آواز آسکتی ہے۔"

تجّل نے وہیں چائے منگالی تھی۔ ملازموں نے تازہ حقّہ لا کے اُس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ تمباکو کی میٹھی میٹھی کڑوی کڑوی خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ مَیں اندر نشست گاہ میں ہونے کے باوجود وہاں نہیں تھا۔ میری نگاہیں صدر دروازے کے اردگرد بھٹک رہی تھیں اور میرے کان ابّا جان کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ معاً مجھے بڑے نواب کی حویلی کا خیال آیا اور میری نگاہ سیدھی گھڑی پر گئی۔ ابھی سوا چار بجے ہیں۔ ہم یہاں سے ساڑھے سات بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوں گے۔ درمیان میں ابھی پورے تین گھنٹے ہیں۔ اِس عرصے میں بڑے نواب کی حویلی جا کے واپس آیا جا سکتا ہے۔ اگر مَیں جا کے آدھا گھنٹہ بھی وہاں گزاروں تو اطمینان سے واپس آسکتا ہوں۔ ابھی وقت ہے۔ برجیس کا سراپا میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا جیسے کل سہ پہر کی طرح اب بھی وہ میرے سامنے تھم کی آڑ میں کھڑی ہو، اُس کی وہ ڈوبی ڈوبی آنکھیں! اُن میں سمندر سا موج زن تھا اور اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی گھٹا۔ اُس کے سارے وجود پر سوگ طاری تھا۔ آئینے پر جیسے نمی جم جائے یا پھول تیز دھوپ میں کھِلا ہو۔ کوئی بھی تشبیہ موزوں نہیں لگتی۔

مجھ سے صوفے پر نہ بیٹھا گیا اور مَیں یک لخت اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اتنی دیر وہاں میرے سامنے موجود رہی اور مجھ سے کچھ بھی نہ کہا جا سکا۔ مجھے دوبارہ دیکھ کے وہ خوش ہو جائے گی۔ وہ بھی کیا کہتی ہوگی کہ لوگ اِس طرح چلے جاتے ہیں۔ کیا ایسی ہی اجنبیت تھی جو مَیں اجنبیوں کی طرح ...لا گیا۔ میں اُس سے کہوں گا کہ ایک تو خانم درمیاں موجود تھی۔ دوسرے میں اُس سے ...صاف صاف کہہ دوں گا کہ میرے حواس ہی مجتمع نہیں تھے۔ اُسے اِس یاس و حرماں ...کے عالم میں دیکھ کے مجھ پر بجلی سی گری تھی اور لفظ میرے سر میں منتشر ہو گئے تھے۔ تعریف ...کرنا مجھے ویسے بھی نہیں آتا مگر خانم نواب بھی موجود ہوگی۔ زنان خانے ...میں اب مَیں خانم کے نام ہی سے جا سکوں گا، بالائی منزل کے مہمان ...خانے میں قفس کی طرح کوئی کنیز اب میری منتظر نہ ہوگی، مجھے یقین ہے کہ ...اُسے جیسے ہی میرے آنے کی اطلاع ملے گی، حویلی میں وہ جہاں بھی ...ہوئی، مجھ تک آنے کی کوشش کرے گی۔ یہ وقت بھی نامناسب نہیں ...ہے۔ اگر وہ نہ آسکی تو مَیں خانم سے کہہ کے اُسے بلا لوں گا چاہے خانم ...کچھ بھی کہے۔ ایسی کون سی بات ہے جو مَیں اُسے نہیں بلا سکتا۔ اَب کے ...اُس خانم کی موجودی کی ذرا بھی پروا نہیں کروں گا، یہ موقع دوبارہ ...نصیب نہ ہوگا۔ مَیں اُس سے کہوں گا کہ اُس کی اور چھوٹی بیگم گیتی آرا ...کی ایک ایک بات میرے سینے میں محفوظ ہے اور یہ محض اُس کی خواہش ...نہیں، خود میرا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ دوبارہ یہاں آؤں، جب حویلی ...میرے لیے کوئی زنداں نہ ہو، نہ وقت کی یہ کبیدگی، نہ یہ ماتمی فضا

ہو، جب وقت کی ہوا حویلی کے مکینوں کے زخم بھر چکی ہو۔ وقت تو بہت سے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ مجھے کچھ ایسا گمان ہے کہ میری آمد شاید کسی درماں کا سبب بن جائے۔ نواب عالم تاب تو اب واپس نہیں آسکتا، نہ کوئی اور اُس کی جگہ لے سکتا ہے۔ ہر آدمی کی اپنی پرچھائیں، اپنا سایہ ہوتا ہے، اپنی صورت مگر آدمی کا مداوا بھی تو آدمی ہی ہے، مجھے یاد ہے، گیتی آرا نے اُس دن کیا اشارہ کیا تھا کہ اِس نامہرباں، بے اماں وقت میں کسی کو دریافت کرنے کی سرخوشی ہے۔ اُس کا مخاطب کوئی اور نہیں تھا۔ بڑا نواب بھی شد و مد سے ہمیں یہی باور کرانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ ہم خود کو اِسی حویلی کا فرد سمجھیں۔ کون اِس طرح عزیز رکھتا ہے، کون ایسا احترام دیتا ہے کہ اجنبیوں کے لیے اپنے زنان خانے کے دروازوں سے پہرے اُٹھا دے۔ اِس سے بڑھ کر عزّت کیا ہو سکتی ہے۔

مجھے وہاں ضرور جانا چاہیے۔ وہ نہ ملی تو بعد میں اُسے میری آمد کی اطلاع تو مل ہی جائے گی، یہ بھی بہت ہوگا۔ کل میرے یوں چلے آنے سے اُس کے دل پر کوئی غبار ہے تو کچھ اِسی طرح وہ چھٹ سکے گا۔ غبار ضرور ہوگا کیونکہ وہ تو یوں بھی ریشم کے مانند ہے، شیشے کے مانند۔ ذرا نظر بھر کے دیکھو تو شیشہ ٹوٹ جانے کا ڈر لگے۔ اُس کی آنکھیں میں نے اچھی طرح دیکھی تھیں۔ وہ آنکھیں حویلی سے واپسی پر تمام راستے میرا تعاقب کرتی رہی تھیں۔ یہ کانٹا میری رگِ جاں میں چبھتا رہے گا کہ مَیں اُس سے منہ چھپا کے چلا آیا۔ منہ چھپانا اور کسے کہتے ہیں۔

مجھے اُٹھتا دیکھ کے پیرو بھی کھڑا ہو گیا "کیا ہے راجا؟" اُس نے اُچکتی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"دادا!" مجھے تجّل کی موجودی کا خیال آیا "دادا! ذرا باہر چلو۔" مَیں نے سرگوشی میں کہا۔

تجّل نے شاید سنا نہیں، پیرو اُسی لمحے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر آگیا "دادا! ابھی خاصا وقت ہے۔ کیوں نہ ہم کچھ دیر کے لیے بڑے نواب کی حویلی چلیں اور خانم، خانم آپی کو دیکھ آئیں۔" اُس سے میں خانم ہی کا نام لے سکتا تھا۔

"ہاں راجا! چلے گا، ضرور چلے گا۔"

مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی تیار ہو جائے گا "تو پھر دیر کاہے کی ہے۔ اِس وقت ہمیں آسانی سے سواری بھی مل سکتی ہے۔"

"ابھی کچھ دیر ٹھیر جا۔" پیرو اطراف میں دیکھتے ہوئے اُلجھی اُلجھی آواز میں بولا۔

"کیا تمھیں ابّا جان کا انتظار ہے؟"

"وہ آجائے گا راجا!"

"پھر چلو دادا! جتنی جلدی ہم چلیں گے، اتنی جلدی واپس آجائیں گے۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

"یہ تجھ کو ابھی ایک دم آپی کا دھیان کیسا آگیا؟"

"بس، کل اُن سے کوئی بات ہی کہاں ہونے پائی تھی۔ اِدھر بھی وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ہے۔ میں نے سوچا، ابھی یہاں ہیں اور وقت بھی ہے تو کیوں نہ آپی کو دیکھ آؤں۔" میری وضاحت پر وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میرے لہجے میں ویسے بھی بڑی بے ترتیبی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ میں نے تندی سے اُسے ٹوکا۔ "تم نہیں جانا چاہتے تو میں کسی اور کو ساتھ لے جاتا ہوں، اکیلا بھی جا سکتا ہوں، راستہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"چلے گا راجا! اپن ساتھ ہی چلے گا۔ ابھی تیرے کو ایک دم....

.....تھوڑا سانس لے کے بول۔ اپن کو اودر دیری بھی لگ سکتا ہے، اُودر بڑا نواب بھی ہے۔ بس خانم کے پاس جا کے لوٹ آئے گا کیا؟"

بڑے نواب کے بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ حویلی جانے کے بعد کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھنا بھی تو ضروری ہے۔" اُس سے کہہ دیں گے کہ بس ہم تو سلام کرنے آئے تھے، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ چلو دادا!" میں نے منت سے کہا۔ "سواری ملنے میں وقت بھی لگ سکتا ہے۔"

"تھوڑا ٹھیر جا جانی!" وہ کسی قدر ترشی سے بولا۔ "ابھی ٹیم کتنا ہوا ہے؟"

"اندر گھڑی میں سوا چار بج رہے تھے، پانچ چھ منٹ اور اوپر ہو گئے ہوں گے۔"

"ابھی ٹیم ہے، اپن جا سکتا ہے۔"

"تو پھر چلو دادا!" میں نے بے کلی سے کہا۔ "کیا تم ٹھُل بھائی سے پوچھنا چاہتے ہو؟"

"نئیں! پر ابھی بول کے چلے تو اچھا ہے۔"

"اگر اُنھوں نے منع کر دیا؟"

"منع بول دیا تو اپن نہیں جانے کا۔"

"اُنھیں بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی ایسی اہم بات تو نہیں ہے۔ ہم وقت پر واپس آجائیں گے۔ آ کے بھی بتا سکتے ہیں، کسی غلط جگہ تو جا نہیں رہے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ کوئی بھی اڑنگا ڈال دیں گے۔"

"تجھ کو ابھی کیا ہو گیا ہے راجا؟"

"مجھے کیا ہوتا!" میں نے تلخی سے کہا۔ "ٹھیک ہے، پھر جانے دو،

تم اندر جا کے آرام سے بیٹھو۔"

"اپن کو تیرا کھوپڑی ابھی کچھ گھومتا پڑا لگتا ہے۔"

میں نے اُس سے جرح نہیں کی۔ وقت اور نکل گیا تھا۔ وہاں چھوڑ کے اندر کی طرف جانا چاہتا تھا کہ صدر دروازے [illegible] کی آواز سنائی دی۔ ابا جان واپس آرہے تھے۔ اگر پیرو کو اُن کی [illegible] سے کوئی فکر تھی اور وہ میری خاطر چھپا رہا تھا تو اب وہ آ ہی گ[illegible] اُن کی آمد کے بعد فوراً نکلنا ممکن نہیں تھا۔ نواب بھی اُن کے ر[illegible] گا، تھوڑی دیر تو اخلاقاً اُس کے سامنے بھی ٹھیرنا پڑے گا اور تب [illegible] اندازہ بھی ہو سکے گا کہ اِس دوران نواب رپورٹ درج کرا[illegible] لیے ابا جان کو تھانے وغیرہ تو نہیں لے گیا۔ چند لمحوں میں مو[illegible] سامنے آگئی لیکن یہ وہ موٹر نہیں تھی جس میں نواب ابا جان کو [illegible] سے لے گیا تھا۔ اِس کا رنگ گہرا سبز تھا اور طرز بھی دوسری [illegible] نواب کی موٹر جیسی نئی بھی نہیں تھی۔ کیا کل شام کی طرح ہیرل[illegible] میں کوئی اور شخص ابا جان کے پاس آرہا ہے؟ مگر یہ مہاراجا کی [illegible] نہیں تھی۔ قریب آنے پر اُس میں مٹیالی وردی پہنے، سفید پگڑ[illegible] ایک شخص بیٹھا نظر آیا۔ وہ ڈرائیور ہی ہو سکتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی [illegible] ہاتھ تھامے تیزی سے آگے بڑھا۔ موٹر پورچ میں آ کے ٹھیر گئی ا[illegible] تاخیر کے بغیر ڈرائیور نیچے اُتر آیا۔

"ابھی نواب صاحب نے اِس کو ایدر بھیجا ہے؟" پیرو [illegible] آواز میں اُس سے پوچھا۔

ڈرائیور نے متانت سے سر جھکایا اور دھیمے لہجے میں [illegible] معذرت کی اور عُذر کرنے لگا کہ موٹر میں ذرا سا کام تھا۔ اُس [illegible] مناسب سمجھا کہ درست کرا کے ہی چلے تاکہ بعد میں کوئی پریشانی [illegible] پیرو ٹھُل کو مطلع کرنے کے لیے اندر بھی نہیں گیا۔ ہم د[illegible] نشست پر بیٹھ گئے۔ صدر دروازہ عبور کر کے موٹر حویلی کی چار د[illegible] کے آگے پھیلی ہوئی سڑک پر آگئی کچھ ہی فاصلے پر چوراہا تھا اور د[illegible] بائیں طرف مڑ کے نواب کی حویلی کے لیے راستہ جاتا تھا۔ مجھے [illegible] حیرت ہو رہی تھی۔ گویا اُسے مجھ سے پہلے بڑے نواب کی حویلی [illegible] خیال آیا تھا۔ دوپہر نواب حشمت جنگ کے چلتے وقت اُس نے [illegible] کے متعلق نواب سے بات کی ہوگی۔ کاش موٹر کچھ پہلے آجاتی، [illegible] اب بھی کچھ نہیں گیا تھا۔ اب ہم وہاں آدھ گھنٹے سے زیادہ ٹھیر[illegible] موٹر کی رفتار بھی تیز معلوم ہوتی تھی۔ صدر دروازے سے باہر سڑ[illegible] چہل پہل تھی۔ چہل پہل سے مراد ہے، ایسا سناٹا نہیں تھا جو بڑ[illegible] مکانات کی وجہ سے یہاں عموماً رہتا تھا۔ سواریاں آجا رہی تھ[illegible]

سائکل سوار بھی گزرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پیدل چلنے والے بھی سڑک پر موجود تھے۔ باہر آ کے میری طرح پیرو نے بھی اِدھر اُدھر نظر دوڑانا ضروری سمجھا ہو گا کہ گرد و پیش میں نگرانی کے لیے آدمی تو تعینات نہیں ہیں، وہاں کوئی نہیں تھا۔ موٹر تیز رفتاری سے چوراہے پر آگئی اور ڈرائیور نے پیرو سے سمت معلوم کی۔ میرے جی میں آئی کہ موٹر سے کود پڑوں کیونکہ پیرو نے جواب میں ڈرائیور کو بڑے نواب کی حویلی جانے والے راستے کے بجائے مخالف سمت میں چلنے کی ہدایت کی تھی۔

"یہ راستہ نہیں ہے دادا!" میں نے بے چینی سے کہا۔

"اپن کو پتہ ہے۔" پیرو نے تحمل سے جواب دیا۔ "اپن بعد کو اُودر بھی چلے گا۔"

"اب تم کہاں چل رہے ہو؟"

"ایدر تھوڑا کام ہے۔"

"کام ہے؟" میں نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پھر وقت بالکل نہیں رہے گا دادا!"

"اپن کے پاس یہ اکّا چار ٹانگ کا گھوڑا ہے، وہ کیا بولتا ہے اُس کو؟" وہ مجھ سے پوچھنے لگا، پھر خود اُچک کے بولا۔ "ہاں سالا ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ اُودر سے اپن ابھی سیدھا اسٹیشن بھی جا سکتا ہے۔"

"اور یہاں جو سب انتظار کریں گے۔"

"وہ سمجھ جائے گا، ابھی اپن سیدھا اسٹیشن کو ہی پہنچے گا۔"

"اور اگر وہ انتظار کرتے رہے؟"

"ٹھُل بھائی کو پتہ ہے کہ موٹر آنے پر اپن کو تھوڑا باہر جانے کا تھا۔"

مجھے اُس کا اطمینان زہر لگ رہا تھا مگر میں اُس سے اور کس طرح کہہ سکتا تھا کہ کہیں اور جانے کے بجائے پہلے وہ بڑے نواب کی حویلی ہی کی طرف چلے۔ میرے اصرار کا خانم کے سوا کوئی اور جواز بھی تو ہونا چاہیے تھا۔ چوراہے سے گزر کے موٹر دائیں طرف والی سڑک پر آگئی اور شہر رفتہ رفتہ گنجان ہونے لگا۔ دھوپ ہلکی پڑ گئی تھی مگر ابھی پوری طرح شام نہیں ہوئی تھی۔ میں پھر چُپ بیٹھا رہا۔ مجھے اگر ذرا بھی شائبہ ہوتا کہ اُس کا ارادہ کسی اور طرف جانے کا ہے تو میں کبھی موٹر میں نہ بیٹھتا۔ موٹر چار مینار، چار کمان سے ہوتی ہوئی پتھر گٹی کے پل سے بھی گزر گئی۔ حویلی سے نکلنے کے بعد بہت دور تک پیرو کی نگاہیں اِدھر اُدھر منڈلاتی رہی تھیں مگر اب شاید اُسے یقین ہو چلا تھا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اِس وقت کہاں جا سکتا ہے۔ کیا وہ عابد شاپ روڈ کی بڑی بڑی دکانوں سے اپنی بیوی اور بیٹی کے لیے کچھ خریدنا چاہتا ہے، اتنے دنوں بعد اُن کے لیے کچھ نہ

کچھ تو لے جانا چاہیے تھا۔ پتھر گٹی کے پُل کے پار دھوپ اور ٹھُھر گئی تھی اور ہلکی ہلکی شام اطراف میں چھانے لگی تھی۔ لائبریری کے قریب ڈرائیور کے استفسار پر پیرو نے نام پلی اسٹیشن کا نام لیا۔ میں سمجھا کہ وہ عین وقت کی زحمت سے بچنے کے لیے ٹکٹ خریدنے اور نشستوں کا انتظام کرنے جا رہا ہے۔ سب کا ایک ہی ڈبے میں انتظام ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ موٹر عابد شاپ روڈ کے قریب آگئی تھی۔ پیرو نے اچانک ڈرائیور سے بائیں ہاتھ کی سڑک پر مڑنے کو کہا۔ گویا اُس نے پھر ارادہ بدل دیا تھا اور نام پلی جانے سے پہلے وہ کہیں اور جانا چاہتا تھا۔ مجھ سے خاموش نہ رہا گیا۔ میں نے دوبارہ اُسے ٹوکا۔

"ابھی رات کے آٹھ بجے بھی اپن اُودر سے نکلے تو گاڑی پکڑ لے گا۔" وہ بھن بھناتے لہجے میں بولا۔ "اپن نے پتہ کر لیا ہے، ایدر سے گاڑی ایک دم پچیس منٹ اوپر نو بجے چلنے کا ہے، سامان وامان تو اپن کے پاس ایسا نئیں ہے جو سالا دیری لگے۔"

"کیا تم پہلے بڑے نواب کی طرف نہیں چل سکتے تھے؟" نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے نکل گیا۔

"اُودر جانا ابھی ایدر سے زیادہ ضروری نئیں ہے۔"

بے شک اُسے بھی کوئی اہم کام ہو سکتا ہے۔ میں نے خود کو سرزنش کی، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، مجھے اپنے سوا کسی کا خیال ہی نہیں آتا۔

میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "مگر تم جا کہاں رہے ہو دادا؟"

اُس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولا۔ "اپن ابھی ایدر قریب ہی اتر جائے گا۔"

مجھے اور دحشت ہونے لگی تھی لیکن پھر میں نے اُس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ موٹر کچھ اور آگے چلی آئی تھی۔ کنگ کوٹھی سے کچھ آگے پیرو نے ڈرائیور کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اُسے رک جانے کو کہا اور موٹر رکتے ہی ڈرائیور کو وہیں انتظار کرتے رہنے کی ہدایت کر کے اُتر گیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ اُترا۔ میں نے گھوم کے اطراف میں نظر ڈالی۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ جہاں موٹر ٹھیری تھی، وہیں قریب کی ایک گلی میں پیرو مڑ گیا۔ اُس کی رفتار نہ اتنی تیز تھی، نہ کم۔ گلی کے اندر آگے جانے کے بجائے وہ دوسری گلی میں مڑ کے پھر عام سڑک پر آگیا۔ اِسی سڑک پر موٹر کھڑی تھی لیکن ہم ڈرائیور کی نظروں سے دور آگئے تھے۔ ڈرائیور کو اپنی منزل کا نشان نہ بتانے ہی کے لیے پیرو نے یہ پھیر کیا ہو گا۔ میں خاموشی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ کوئی دو ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد پیرو ایک گلی میں مُڑا، میرا ماتھا ٹھنکا اور ایک لمحے کے لیے میرا سارا جسم سُن ہو کے رہ گیا۔

یہ حمایت نگر کا علاقہ تھا، وہی جگہ جہاں مَیں اور پیرو حیدرآباد آتے ہی مولوی محمد شفیق کی تلاش میں آئے تھے۔ پیرو کا رخ بھی اُسی مکان کی طرف تھا، خرم منزل کی طرف جس کا پتہ اپنی منزلِ مقصود کے طور پر مولوی صاحب نے مراد آباد کے مسافرخانے کے روزنامچے میں درج کرایا تھا۔ اگر یہ پتہ نہ ملتا تو سب کچھ اس طرح نہ ہوتا جس طرح ہوا۔ نہ ہم راستہ بدل کے حیدرآباد آنے کا فیصلہ کرتے، نہ سونیا کو موت آتی۔ حیدرآباد ہی کی گاڑی میں بیٹھنے کی وجہ سے سونیا سے میرا آمنا سامنا ہوا تھا۔ پھر شاید نواب عالم تاب کو بھی کچھ دن کی مہلت اور مل جاتی، نہ خانم اتنی منتشر ہوتی۔ اُس نے یہاں ٹھیرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر زریں اور جہاں گیر کے بغیر وہ کتنے دن تک خود پر جبر کر سکے گی اور اُدھر اُس کے یوں چلے آنے سے اُن کا قرار بھی چھن گیا ہوگا۔ ابّاجان ہی جانتے ہوں گے کہ میری اور پیرو کی گم شدگی کے دوران اُنھوں نے وقت کس طرح کاٹا ہوگا۔ حویلی کے قیدخانے کے گیارہ بارہ دن ہمارے لیے گیارہ بارہ برسوں سے کم نہ تھے۔ اپنے زخمی پاؤں پر جھَلّن کا یہاں آنا، ہم نے تو زنداں میں جیسے تیسے وقت گزار دیا تھا، باہر کی کھُلی فضا جھَلّن کے لیے ہمارے محبوس قیدخانے سے کہیں زیادہ عذاب ناک ہوگی اور گزشتہ رات کی ذلت، اُنھوں نے میری آنکھوں کے سامنے ابّاجان کا گریبان چاک کیا تھا اور اُن کی داڑھی نوچی تھی اور میں تماشائی بنا دیکھتا رہا تھا۔ ابّاجان، منیر علی، جھَلّن، پیرو، زدرا، کلنتے، شامو، جمرو ٹنگو، مارٹی اور خانم حیدرآباد آنے کے لیے میری ایک ضد سے متاثر ہوئے تھے۔

نواب کی کوٹھی نزدیک آ رہی تھی۔ ہر قدم پر فاصلہ اور کم ہو جاتا تھا۔ میرے پیر ڈگمگا رہے تھے۔ پیرو اب یہاں کیوں آیا ہے؟ کیا اُسے مولوی صاحب کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے مگر کس طرح؟ ہوٹل سے نکلنے کے بعد تھانے، تھانے سے حویلی کے زنداں اور اڈّے تک، اڈّے سے پھر بڑے نواب کی حویلی تک ہم دونوں مستقلاً ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ نواب عالم تاب کے عزاداروں میں مجھے نواب ثروت یار کا چہرہ کہیں دکھائی نہیں دیا جس کے مکان کی طرف ہم بڑھ رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ثروت یار ہی اُس کا نام تھا۔ ممکن ہے، وہ کسی ایسے وقت وہاں آیا ہو جب میں نیچے نہ ہوں، کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ مَیں جھَلّن، پیرو اور ابّاجان کو چھوڑ کے بالائی منزل کے مہمان خانے میں آ گیا تھا۔ اِس دوران نواب ثروت یار اگر آیا ہوگا تو اُس نے پیرو کو اور پیرو نے اُسے ایک نگاہ میں پہچان لیا ہوگا۔ شاید اُسی سے پیرو کو کچھ معلوم ہوا ہو لیکن اگر مولوی صاحب کے بارے میں ذرا بھی سن گن پیرو کو ملی ہوتی تو وہ اتنی دیر تک خاموش نہ رہتا، کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو مجھے ضرور بتاتا۔ یہ بات وہ مجھ سے کیسے چھُپا سکتا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ "دادا!" مَیں نے دھڑکتی آواز میں پوچھا۔ "تم پھر اِس طرف کیوں جا رہے ہو؟"

"ابھی ایک بار اور جا کے دیکھ لے تو اپن کا کیا جاتا پڑا ہے۔"

وہ اُلجھے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

"کیا تمھیں کچھ معلوم ہوا ہے؟"

"نئیں، پر اپن ابھی ایک تسلّی کر لے تو ٹھیک ہے۔"

"بیکار ہے، بالکل فضول۔ تم وقت ضائع کرو گے۔۔"

"ابھی دیکھ لینے میں اپن کا کیا بگڑتا ہے۔"

"نئیں دادا! کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"دیکھتا ہے راجا!"

"وہ نواب بھی خواہ مخواہ مشکوک ہوگا۔"

"اپن اُس سے بیٹی تو مانگنے نئیں جا رہا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے دادا! کچھ نہیں ہوگا۔"

"تو ابھی ایسا ہی سمجھ راجا!"

"دادا! شاید اُن کا ملنا میری قسمت میں نہیں ہے۔ میں اُنھیں اب کبھی تلاش نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں۔"

"کیا بولتا ہے؟"

"بہت خاک چھان لی ہے دادا میں نے، دوسروں کو الگ پریشان کیا ہے۔"

"دوسرا کون؟" وہ ترشی سے بولا۔

"سبھی لوگ دادا!" میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ "جھَلّن بھائی، تم، ابّاجان، کس کس کا نام لوں۔"

"اپن دوسرا لوگ ہے راجا؟"

"تم تو بات پکڑ رہے۔ دیرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے، کیا ایک میرے لیے سبھی بے گھر اور خوار نہیں ہوئے!"

"تو اپن کا لاڈلا جو ہے راجا!"

"دادا! خدا کے لیے بس کرو، یہ تلاش ہمیں راس نہیں آتی۔ جیسلمیر میں کیا ہوا تھا، بمبئی میں اور یہاں کیا ہوا۔ مَیں نے طے کر لیا ہے، اب کہیں نہیں جاؤں گا، کسی کو پریشان نہیں کروں گا، دادا! یقین کرو، مَیں نے اپنے آپ بہت کچھ طے کیا ہے۔ تم دیکھنا۔"

"یہ تو ایک دم اچھا بات ہے۔"

"تو پھر لوٹ چلو دادا!" مَیں نے عاجزی سے کہا۔

کوٹھی ہماری نظروں کے سامنے تھی۔ پیرو میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔ "ابھی اپن ایدر آ ہی گیا ہے راجا!"

"پھر تم جا کے تسلّی کر لو۔" مَیں نے زچ ہو کر کہا۔ "مَیں یہیں کھڑا رہتا ہوں۔"

اُس نے مجھے آگے کی طرف دھکیل دیا اور کہنے لگا کہ میرے بقول جہاں اتنا وقت برباد ہوا ہے، وہاں کچھ اور سہی، جانے میں کیا حرج ہے۔ ہم کوٹھی کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ وہی سیاہ فام دربان وہاں موجود تھا جس سے پہلی مرتبہ ہماری مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ پیرو نے نواب کے بارے میں پوچھا تو دربان اوپر سے نیچے تک ہمیں دیکھنے لگا۔ پیرو نے اُسے کسمسانے کا زیادہ موقع نہیں دیا اور بولا کہ نواب صاحب سے ہمیں چند لمحوں کا کام ہے، بہتر ہے کہ اندر جا کے بتا دیا جائے۔ پیرو نے مزید تاکید کی کہ وہ نواب پر واضح کر دے کہ وہی لوگ آئے ہیں جو سترہ اٹھارہ دن پہلے اُس سے ملنے آئے تھے، دربان بھی ہمیں پہچان گیا تھا، کہنے لگا کہ نواب کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہے، شاید مشکل سے ملاقات ہو، ہم کسی اور وقت آ جائیں تو مناسب ہے مگر پیرو کے اصرار پر وہ بادلِ ناخواستہ آمادہ ہو گیا۔ ہم موٹر میں یہاں آتے تو دربان کبھی اتنی حجت نہ کرتا، اُس نے ہمیں پیدل آتے جو دیکھا تھا۔ ہم باہر کھڑے انتظار کرتے رہے۔ دربان نے واپسی میں پانچ منٹ اور لگا دیے۔ واپس آ کے اُس نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ احاطے میں قدم رکھتے ہی میرا سارا جسم دھڑکنے لگا۔ ہمیں اُس کمرے میں بٹھا دیا گیا جہاں ہم پہلے بیٹھے تھے۔ کمرے میں روشنیاں جلا دی گئی تھیں حالانکہ ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا۔ میری نظر گھڑی پر گئی، ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔

یہاں آنے کے بعد اب مجھے بھی کچھ کچھ شبہ ہونے لگا تھا کہ کہیں پیرو کا قیاس درست نہ ہو اور مولوی صاحب واقعی موجود نہ ہوں۔ اُنھوں نے ثروت یار سے کہا تھا کہ مراد آباد سے واپسی پر وہ سیدھے اُس کے گھر آئیں گے۔ ہو سکتا ہے، راستے میں اُنھیں کوئی مجبوری پیش آ گئی ہو جو وہ اپنے پروگرام کے مطابق یہاں نہ پہنچ سکے لیکن وہ بعد میں بھی تو آ سکتے ہیں، نواب ثروت یار سے ہمارے ملنے کے بعد، گزشتہ سترہ اٹھارہ روز میں کسی دن بھی۔ نواب کے والد سے اُن کے دیرینہ مراسم تھے اور اُس کے بقول جب مولوی صاحب نے حیدرآباد میں سکونت کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو اُس نے اُنھیں اپنی کوٹھی میں رہنے کی پیش کش کی تھی۔ ممکن ہے، مولوی صاحب نے یہ پیش کش قبول کر لی ہو۔ نواب کی اِس جدید طرز کی کوٹھی میں جگہ کی تنگی نہیں ہے۔ کیا معلوم اندر دروازے سے نواب ثروت یار کے بجائے مولوی صاحب ہی برآمد ہوں۔ میرے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ اُسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی، میں کرسی سے اُچھل پڑا۔ وہ خادمہ تھی۔ اُس نے پہلے کی طرح ہمارے سامنے چائے لا کے رکھ دی اور پھلوں کا طشت۔ پیرو میرے پاس ہی بیٹھا تھا اور اُس نے زور سے میرا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اُس کی گرفت بتا رہی تھی کہ اُس کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں ہے۔

اگر مولوی صاحب آ گئے ہیں تو کیا نواب نے اُنھیں بتا دیا ہے کہ ہم دونوں چند دن پہلے اُن کی تلاش میں آئے تھے۔ نہ معلوم مولوی صاحب نے کیا ردِعمل ظاہر کیا ہو۔ ہو سکتا ہے جیسا کہ نواب نے ساری روداد سن کے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اُس نے ہماری آمد کے متعلق اُنھیں کچھ نہ بتایا ہو۔ پیرو نے نواب ثروت یار سے کہا تھا کہ مولوی صاحب کی ایک امانت لوٹانے کے لیے ہمیں ایک مدّت سے اُن کی تلاش ہے۔ نواب کی تشویش دُور کرنے کے لیے پیرو کو کچھ نہ کچھ تو بتانا چاہیے تھا۔ پیرو نے مجھے مولوی صاحب کا رشتہ دار بتایا تھا اور کہا تھا کہ میری ماں مولوی صاحب کی بہن نے اُن کی جائداد ہتھیا لی تھی اور مولوی صاحب دل برداشتہ ہو کر عرصے سے مراد آباد کی سکونت ترک کر چکے تھے۔ یہ سن کے نواب نے ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور مولوی صاحب کو ہماری آمد کے متعلق کچھ نہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ مولوی صاحب کے آنے پر وہ خط کے ذریعے ہمیں مطلع کر دے گا تاکہ ہم یہاں آ جائیں اور بچھڑے ہوئے گلے مل لیں۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے میرے اور مولوی صاحب کے درمیان ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے، رفاقت کا وسیلہ بننے میں خوشی ہوگی۔ مَیں نے خط کے لیے اُسے بمبئی میں جولین کا پتہ دیا تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ مولوی صاحب کے آنے پر اُس نے اپنے وعدے کے مطابق ہمیں بمبئی کوئی خط لکھا ہو اور اُس کے لیے ہماری آمد کی اطلاع ایسی غیر متوقع نہ ہو۔ مولوی صاحب کو اُس نے کچھ بتایا تو نہیں ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو مگر ابھی تو یہ سب مفروضے ہیں۔ اصل میں مولوی صاحب کی آمد شرط ہے تبھی یہ سب کچھ ممکن ہے۔ مولوی صاحب اگر نہ آئے ہوتے تو نواب کو ہمیں اندر بلانے کی کیا ضرورت تھی، وہ دربان سے کہہ سکتا تھا کہ اگر ہم صرف اس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں تو دونوں کا وقت ضائع ہوگا۔ کوئی بات ہی ہوگی جبھی اُس نے ہمیں اندر بلایا ہے۔

اُس کے آنے میں جتنی دیر ہو رہی تھی، میرے دل کی دھڑکن معدوم ہوتی جاتی تھی۔ خادمہ کے جانے کے بعد کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ہمیں یہاں بیٹھے ہوئے اتنی دیر نہیں ہوئی تھی مگر لگتا تھا جیسے پہر گزر گیا ہو۔ پیرو بھی بُت کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ سامنے دروازے پر پردے کی سرسراہٹ پر اُس کی انگلیاں میرے بازو میں کھُبنے لگتیں۔

چند منٹ اور گزرے ہوں گے کہ دروازے پر آہٹ گونجی، مردانہ جوتوں کی چاپ تھی۔ دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں میں دھند سی اُتر آئی تھی۔ دوسرے لمحے جو شخص اندر داخل ہوا، وہ نواب ثروت یار تھا۔ مَیں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میری سانسیں ایک لمحے کے لیے رک گئی تھیں۔ اس کے نظر آنے پہ مجھے سکون سا ملا۔ مولوی صاحب اگر سامنے ہوتے تو شاید میرا دم نکل جاتا۔ پیرو نے مجھے کہنی ماری تو میں ہڑبڑاتا ہوا صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور نہ جانے کس طرح نواب کو سلام کیا۔ اُس کے بیٹھ جانے پر ہم دونوں بھی جلدی سے بیٹھ گئے۔ اُس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی، مسکراتے ہونٹوں سے اُس نے ہمارا مزاج پوچھا۔ اُس کے دیکھنے کے انداز میں تجسس بھرا ہوا تھا اور وہ پہلے سے کچھ زیادہ جوان اور تروتازہ لگ رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، پیرو نے بے وقت آنے کی معذرت چاہی اور بولا، اُسے دربان سے معلوم ہوگیا تھا کہ نواب کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ نواب نے شائستگی سے کہا کہ اُسے کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔ یہ وہ تکلفاً ہی کہہ رہا تھا۔ مکلف شیروانی، پاجامے اور جوتیوں سے ظاہر تھا کہ ہم اگر ذرا دیر سے آتے تو وہ گھر سے نکل گیا ہوتا۔ اُس کے سر پر صرف ٹوپی نہیں تھی۔ سیاہ بال سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔

"اپن آپ کو یاد ہے نا؟" پیرو نے جھجکتی زبان میں پوچھا۔

"خوب!" نواب مستعدی سے بولا۔ "ہمیں خوب یاد ہے، دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ یہ عمر بھول جانے کی تو نہیں ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہم آپ کے منتظر تھے۔" میرے کان دھکنے لگے۔

"پن، اپن کا انتظار میں تھا آپ؟" پیرو نے سٹ پٹاتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں۔" نواب نے ہچکچاہٹ سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا اپن کو آپ نے کوئی خط پتّر لکھا تھا؟"

نواب نے تامل کے بعد جواب دیا۔ "نہیں۔"

پیرو حیرانی سے اُس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"ہم آپ کو خط لکھنا ہی چاہتے تھے۔"

"کیا مولوی صاحب آگئے ہیں؟" پیرو کے بولنے سے پہلے مَیں نے پھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

نواب کی سُرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں، اُن میں چنگاریاں سی چمک رہی تھیں، وہ گہری سانس بھر کے بولا۔ "ہم آپ سے کیا کہیں۔"

"اپن کو بولو نواب صاحب! کیا، کیا وہ ایدر آگیا ہے؟" پیرو نے بے چینی سے کہا۔

"ہم آپ سے شرمندہ ہیں کہ اپنے وعدے کے مطابق آپ کو خط نہ لکھ سکے۔" نواب کی آواز تپتی ہوئی سی تھی۔

"کوئی بات نہیں، پَر وہ آگیا ہے نا؟" پیرو نے تیزی سے پوچھا۔ "اپن کو ابھی صاف صاف بولو۔"

"آپ کی اس بے تابی سے ہمیں اور خجالت ہو رہی ہے۔" نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔ "بے شک وہ آگئے تھے۔"

"آگیا تھا؟" پیرو نے بھڑکتی آواز میں کہا۔ "آپ کیا بول رہا ہے نواب صاحب!"

"وہ آگئے تھے لیکن چلے گئے۔"

"چلا گیا! کدھر؟"

"ہم آپ کو ساری بات بتاتے ہیں، یقین کیجیے، آپ کو دوبارہ یہاں دیکھ کے ہمیں اپنی کوتاہی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے لیکن، لیکن ہم نے....!"

"اس کو ابھی چھوڑو نواب صاحب!" پیرو اُس کی بات کاٹ کے تُرشی سے بولا۔ "اپن بھی ابھی اُودر بمبئی نہیں گیا تھا، ایدر ہی تھا۔"

"آپ یہیں تھے؟" نواب نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پوچھا

"اپن نہیں جاسکا تھا۔"

"تو پھر آپ نے درمیان میں یہاں زحمت کیوں نہیں کی؟"

"اپن نئیں آسکتا تھا۔" پیرو نے تندی سے کہا۔ "آپ بولو۔ ابھی بات کیا ہے؟"

"آپ کے جانے کے بعد مولوی صاحب تشریف لائے تھے۔" نواب نے تأسف سے کہا۔ "اُس کے کوئی چار پانچ روز بعد ہی وہ آگئے تھے مگر چلے گئے۔"

"کہاں چلے گئے؟" مَیں نے اُس سے پوچھا، میری آواز کپکپا رہی تھی۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

"آپ کو کچھ بول کے نئیں گیا؟"

"ہم سے رخصت ہونا بھی ضروری نہیں سمجھا اُنھوں نے۔"

"آپ کیا بول رہا ہے؟"

"کچھ یہی ہے جنابِ من!" نواب سُرلہجے میں بولا۔ "وہ اچانک چلے گئے۔ ہم سکندرآباد میں اپنے ایک ہندو دوست کی شادی میں گئے تھے اُن سے کہہ کے گئے تھے۔ واپس آئے تو وہ یہاں نہیں تھے، اُن کے پاس مختصر سا سامان تھا۔ ملازمین سے بھی اُنھوں نے کچھ نہیں کہا۔"

پیرو نے بے اختیار میری طرف دیکھا۔ میرا سارا جسم ڈھیا جا رہا تھا۔ "کیا وہ اکیلا تھا؟" پیرو نے منتشر لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" نواب نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "اُن کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔"

"لڑکی تھا!" پیرو تیزی سے بولا۔ "پھر ایسا کیا بات ہوا جو وہ چلا گیا۔"

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں، صبح دس بجے کے قریب اُن سے مل کے گئے تھے اور یہ کہہ کے کہ شام کو واپسی میں دیر ہوسکتی ہے، وہ رات کے کھانے پر ہمارا انتظار نہ کریں۔ ہم شام ہی کو واپس آگئے تھے لیکن وہ جا چکے تھے۔"

"ایسا کیسا؟" پیرو نے مایوسی سے کہا۔ "ابھی آپ نے اپن لوگ کے بارے اُن سے کچھ بولا تھا؟"

جواب میں نواب ہمارے چہرے دیکھا کیا۔ اُس کی تذبذب آمیز خاموشی پر پیرو نے دوبارہ اُس سے پوچھا۔ "اپن لوگ کا آپ کوئی بات کیا تھا؟"

"پہلے آپ یہ فرمائیں کہ آپ نے ہمیں جو روداد سنائی تھی، کیا اُس میں کوئی......؟" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "ہماری مراد ہے، شاید ہمی سے کوئی فروگذاشت ہوگئی۔"

"آپ کیا بولا تھا اُن کو؟"

"ہم نے آپ سے کہا تھا کہ ہم آپ کی آمد کی بابت انھیں کچھ نہیں بتائیں گے۔ ہم اِس پر کاربند بھی رہے تھے۔ جس روز وہ تشریف لائے، اُنھوں نے اصرار کیا کہ شرفا کے علاقے میں ہم اُن کے لیے کسی چھوٹے سے کم قیمت مکان کا بندوبست کردیں تو نہایت مناسب ہو۔ ہم نے اُن سے گزارش کی، حضرت اتنی بڑی کوٹھی ہے یہاں آپ جس جگہ چاہیں قیام فرمائیں۔ یہاں افرادِ خانہ ہی کتنے ہیں۔ ایک بھائی، ایک بہن، ایک ماں۔ باقی سب ملازم ہیں۔ ایک بھائی یورپ تعلیم حاصل کرنے گیا ہے۔ باقی بہنیں اپنے گھر کی ہوچکی ہیں۔ آپ کے آنے سے کوئی تنگی نہیں ہوجائے گی۔ خیر، اِس یقین دہانی پر وہ یہاں ٹھیرنے کے لیے آمادہ ہوگئے کہ ہم جلد ہی اُن کے لیے الگ مکان کا بندوبست کردیں گے یا اگر وہ خود اپنی ضرورت کے مطابق مکان کی تلاش میں کامیاب ہوگئے تو چلے جائیں گے۔ اُنھوں نے عمارت کے پچھلے والے حصّے میں رہنا پسند کیا۔ یہ جگہ اُن کے لیے موزوں بھی تھی، عمارت سے ملحق ہونے کے باوجود عمارت سے بڑی الگ تھلگ۔ ہمیں کچھ اندازہ تھا کہ وہ ایک گوشہ نشیں کم گو شخص ہیں، ہجوم سے گھبراتے ہیں۔ اس حصّے سے ملحق لائبریری

بھی ہے چناں چہ لائبریری بھی اُن سے قریب رہے گی۔ پہلا دن تو یوں ہی گزر گیا، دوسرے دن ہمیں آپ کا خیال آیا۔ ہم نے سوچا، آپ کو خط لکھ دیں لیکن پھر سوچتے ہی رہ گئے۔ کچھ یہ اطمینان بھی اپنی جگہ تھا کہ مولوی صاحب تو اب یہیں قیام فرما ہیں۔ ہم کسی وقت بھی آپ کو اطلاع دے سکتے ہیں۔ اصل میں ہمارا ذہن ایک اور بات سے منتشر ہو گیا تھا کہ آپ کی اچانک آمد مولوی صاحب کو گراں نہ گزر جائے۔ اچھا ہو گا کہ پہلے اس نئی جگہ سے اُن کی ذہنی مطابقت ہو جائے اور بہتر ہے کہ پہلے ہم اس سلسلے میں اُن کا عندیہ لے لیں۔ وہ بہت پریشان نظر آتے تھے۔ کسی نئی جگہ بسنے میں غالباً یہ اضطراب و تردّد ہونا بھی چاہیے۔ انھیں یہاں وسیلۂ معاش کا بھی کچھ انتظام کرنا تھا۔ حالانکہ اس معاملے میں اُنھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، یہاں اللہ نے بہت کچھ دیا ہے مگر یہ بات اُن جیسے غیور اور حساس شخص سے ہم کیسے کہہ سکتے تھے۔ وہ یہاں قیام ہی بہ مشکل سے راضی ہوئے تھے، معاف کیجیے، اس بدگمانی نے بھی ہمارے دل میں جگہ لی کہ آپ کی رُوداد میں کوئی پہلو ادھورا ہو سکتا ہے، مولوی صاحب اگر کسی سے ملنا یا تعلق رکھنا نہیں چاہتے تو ہم درمیان میں پڑنے والے کون، بہتر ہے کسی موقع پر ہم اُن سے کنایتہً ذکر کر کے دیکھیں، پھر آپ سے کوئی سلسلہ جنبانی کریں۔ یوں آپ کے اچانک آجانے سے وہ مکدّر نہ ہو جائیں، ہماری طرف سے اُن کے دل میں کوئی گرہ نہ پڑ جائے۔ جانے کیسی کیسی تلخی سینے میں بھری ہو، والدِ محترم کی نسبت اُن کے اور ہمارے درمیان ادب و لحاظ کی ایک حد تو بہر حال قائم کرتی تھی۔"

خادمہ کے کمرے میں آنے پر نواب کی بات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ دبے قدموں کمرے میں داخل ہوئی اور خاص دان میز پر رکھ کے فوراً چلی گئی۔ اُس کے آجانے سے نواب کو سامنے میز پر رکھی ہوئی چائے نظر آگئی اور وہ خفیف لہجے میں بولا۔ "آپنے چائے کو تو ہاتھ ہی نہیں لگایا، ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"ٹھنڈی ہو جائے گا تو دوسرا آجائے گا۔" پیرو نے لجاجت سے کہا۔ "ابھی آپ کیا بول رہا تھا نواب صاحب؟"

نواب نے چائے پوش اُٹھا کے چائے دانی چھو کے دیکھی۔ "ابھی گرم ہے، ہمارا خیال ہے، ایک پیالی پی لیجیے۔"

"اپن ابھی بعد کو پی لے گا۔"

نواب نے چائے دانی ڈھک دی اور سمٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "بس کچھ احتیاط و آداب نے ہمیں روکے رکھا لیکن جب بھی اُن کا سامنا ہوتا تھا، آپ دونوں حضرات کے چہرے ہماری آنکھوں میں گھومنے لگتے تھے۔ دوسرا دن گزرا، تیسرا دن بھی۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اُنھیں کسی قسم کی زحمت نہ ہو، ملازمین کو خاص طور پر اُن کا خیال رکھنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ خود والدۂ محترمہ نے جا کے اُن کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اب وہ اِسے اپنا ہی گھر سمجھیں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف فرما دیں، اُن کے آنے سے گھر کی رونق بڑھ گئی ہے، گھر میں اب ایک بڑا موجود ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں توقع تھی کہ مولوی صاحب کو یہاں تھوڑی بہت یکسوئی ضرور نصیب ہو گی۔ اُن کے چہرے سے عیاں تھا کہ یا تو اُنھیں بہت صدمے پہنچے ہیں یا انھیں آیندہ کی فکر کچھ زیادہ لاحق ہے۔ گھبرائے گھبرائے، کھوئے کھوئے، سفر کی تکان بھی اس کی وجہ ہو سکتی تھی یا جیسے کہ ہم نے عرض کیا، نئی جگہ کی اجنبیت بھی سبب ہو سکتا ہے۔ بہر حال ایک بات ضرور تھی۔ ان تمام شکستگیوں کے باوجود اُن کا چہرہ عزم سے عاری نہیں تھا۔ غالباً یہی عزم اُنھیں متحرک اور مستعد رکھے ہوئے تھا۔ سفر، نئے گھر کی تلاش، خودداری اور محتاط روی کو اسی عزم کی علامتیں کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے دل میں، یقین کیجیے، اُن کے لیے بڑی عزت تھی، تھی کیا، بلکہ ہے، اُن کے آنے سے ہمیں بہت خوشی ہوئی تھی مگر اُنھوں نے اپنے مخلصین کو موقع ہی نہیں دیا۔ شاید ہم اُن کے کسی کام آسکتے۔ چوتھے دن شام کے وقت ہم اُن کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ والدِ مرحوم کا تذکرہ تھا۔ ہم نے پہلے کی نسبت اُنھیں کسی قدر مجتمع اور مطمئن دیکھا تو وقت مناسب سمجھا۔ آپ کی بات ہمیں یاد تھی کہ آپ اُن کی کوئی امانت بھی لوٹانا چاہتے تھے، جائداد وغیرہ۔ ہم نے سوچا، مولوی صاحب ہم سے کبھی اپنا حال بیان نہیں کریں گے، ان کی مالی الجھنوں کے تدارک کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اُن کی جائداد اُن کو مل جائے۔ شاید اسی طرح زخموں کا کچھ اندمال ہو سکے اور برسوں کا جبر دُور ہو جائے۔ ہم نے جھجکتے جھجکتے اُن سے آپ کا نام لیا۔"

"آپ اُن کو اِس کا نام بول دیا تھا؟" نواب سانس لینے کے لیے رُکا تھا کہ پیرو نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں، ہم نے سرسری طور پر اُن کے خاندانی معاملات کا ذکر چھیڑا۔ اُنھوں نے بُرا نہیں مانا، ہمیں اور جرأت ہوئی، ہم نے کسی ہیر پھیر کے بجائے سیدھے سادے انداز میں بابر زماں صاحب کا نام لیا۔ یہی نام بتایا تھا آپ نے؟"

"جی، جی، یہی بولا تھا، ایک دم یہی۔" پیرو نے بے تابانہ کہا۔

میرے ہاتھ پیر شل ہوئے جا رہے تھے۔ نواب کی نظریں بار بار مجھ پر آ کے ٹک جاتیں۔ میں سر جھکاتا تو میرا دم اور گھٹنے لگتا۔

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ کیا ہوا۔" نواب ثروت یار بولا۔ "مولوی

صاحب کی اِس کیفیت کا حال بیان کرنا مشکل ہے۔ وہ بے ساختہ اچھل پڑے، پھر اُن پر جمود سا طاری ہو گیا۔ وہ مبہوت ہو کے ہمیں دیکھنے لگے۔ آپ نے ہمیں بتایا تھا کہ آٹھ نو سال سے اُن سے کوئی ربط ضبط نہیں ہے چنانچہ اُن کا استعجاب ہمارے لیے اتنا غیر متوقع نہیں تھا لیکن ہم کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہم آگے زبان کھولنے کے لیے اُن کے مثبت، منفی ردِّ عمل کا ایک اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے اسی لیے چپ رہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"اپن ایک دم سمجھ رہا ہے نواب صاحب!" پیرو نے تیزی سے کہا۔

نواب ٹھیر گیا، جیسے کچھ بھول گیا ہو۔ اُس کی آنکھوں کی سُرخی گہری ہو گئی تھی۔ چہرے پر بھی دھواں سا چھایا ہوا تھا۔ پیرو نے دخل نہیں دیا، چند لمحے بعد وہ خود ہی بوجھل آواز میں بولا۔ "ہم نے اُن سے کہا تھا کہ آپ اِس نام کے کسی شخص سے واقف ہیں؟ وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکے، ہم نے اُنھیں ٹوکا کہ آپ چپ کیوں ہو گئے۔ چونکہ ہم نے ذکر چھیڑ دیا تھا لہٰذا اب ہمیں کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ ہمارے ٹوکنے پر وہ چونک پڑے اور عالمِ اضطراب کے باوجود اُنھوں نے بہ کمال تحمل ہم سے وہی سوال کیا جس کا ہمیں علم تھا لیکن جس کا جواب ہمارے لیے آسان نہیں تھا۔ اُنھوں نے ہم سے پوچھا کہ ہم یہ نام کس طرح جانتے ہیں؟ ہم کہہ سکتے تھے کہ ہمارے پاس کوئی خط آیا تھا یا کسی واقف کار نے ہم سے مراد آباد کے اِن صاحب کا تذکرہ کیا تھا یا ہمیں خود کہیں یہ مراد آبادی صاحب ملے تھے۔ مراد آباد ویسے بھی اتنا بڑا شہر نہیں ہے، چھوٹے شہروں میں ایک دوسرے کے واقف کار نکل ہی آتے ہیں مگر ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اُنھیں صاف صاف بتا دیا جائے تاکہ بعد میں اُن کے سامنے کوئی خفت نہ ہو۔ ہم نے کہا، یہ صاحب یہاں آئے تھے۔ یہ سُن کے، ہمیں کہنا چاہیے کہ اُن پر سناٹا سا طاری ہو گیا مگر اُن کی یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ اُنھوں نے ہم سے پوچھا، یہاں آئے تھے؟ اُن کی آواز سے کبیدگی اور حیرت چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ہم نے کہا، جی ہاں، یہیں آئے تھے اور آپ کے بارے میں معلوم کر رہے تھے۔ اور آپ نے کیا فرمایا؟ اُنھوں نے ہم سے پوچھا۔ ہم نے عرض کیا، ہم نے اُنھیں بتا دیا تھا کہ مولوی صاحب قبلہ یہاں تشریف لائے تھے، مدت دراز کے بعد، اُنھیں کسی ضروری کام سے مراد آباد جانا تھا، یہیں واپس آنے کے لیے فرما گئے تھے لیکن اب کوئی ڈیڑھ ماہ کے قریب ہو رہا ہے، وہ نہیں آئے ہیں۔ ہم سے پوچھا کہ ہم نے اور کیا کہا۔ ہم نے اُن سے عرض کیا کہ اِس کے سوا بھلا ہم اور کیا کہہ سکتے تھے۔ اُنھوں نے سوال کیا کہ آپ کی آمد کا آخر کیا مقصد تھا؟ ہم نے کچھ تو اس بابت معلوم کیا ہو گا۔ ہم نے کہا، جی ہاں یہ تو ہمیں پوچھنا ہی چاہیے تھا۔ اُنھوں نے بتایا تھا کہ مولوی صاحب اُن کے قریبی عزیز ہیں، جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، ماموں کا رشتہ بتایا تھا اور کہا تھا کہ ہماری والدہ نے مدت ہوئی، اپنے بھائی کے مکان پر قبضہ کر لیا تھا۔ مولوی صاحب کو اپنی بہن سے یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ کچھ اور تو نہ کر سکے، مراد آباد کو خیرباد کہہ گئے۔ اُس کے بعد اُن کی کوئی خیر خبر معلوم نہ ہو سکی۔ بابر زماں صاحب بھی اب مراد آباد میں نہیں رہتے، بمبئی میں قیام ہے تاہم عرصے سے وہ آپ کی تلاش میں تھے۔ بڑی تگ و دو کے بعد آخر مراد آباد ہی سے انھیں آپ کا پتہ ملا اور وہ یہاں تک آن پہنچے۔ ہم نے مولوی صاحب سے حقیقتِ حال بیان کی کہ بابر زماں آپ سے ملنے کے لیے بڑے بے تاب تھے کیونکہ وہ آپ کی امانت آپ کو لوٹانا چاہتے ہیں۔"

"مولوی صاحب نے کامل انہماک سے ہماری باتیں سنیں اور کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا۔ ہم اسی جستجو میں رہے کہ پہلے اُن سے کچھ جان سکیں تو اچھا ہو لیکن بہر حال وہ ہمارے بزرگ تھے۔ اُنھوں نے ہمیں اِس کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ سوال کرتے رہے، ہم جواب دیتے رہے۔ ہم نے زندگی اُن کے مقابلے میں ظاہر ہے، نہایت کم گزاری ہے، نصف کے لگ بھگ۔ مولوی صاحب کی عمر کے لوگوں میں تحمل، برداشت اور بُردباری لازماً آجاتی ہے مگر ہم اُن سے بہت ناپختہ کار ہونے کے باوجود اتنا تو اندازہ لگا سکتے تھے کہ اِس ذکر سے وہ مضطرب اور منتشر ہو گئے تھے، متزلزل کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ آدمی ایک حد تک ہی اپنے احساسات چھپا سکتا ہے اور کم ہی لوگوں کو یہ قدرت ہوتی ہے۔ ہمیں اُن سے ایک طرح کی ندامت ہو رہی تھی کہ ہم نے اچھا نہیں کیا، اُن کے زخم کرید دیے۔ ہر چند مولوی صاحب نے کسی طرح کا اعتراض نہیں کیا تھا، خاصی دیر بعد اُنھوں نے پوچھا کہ کس قماش کے لوگ تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ دو صاحبان آئے تھے، ایک بزرگ کا تعلق بمبئی سے تھا اور معلوم بھی یہی ہوتا تھا۔ دوسرے نوجوان تھے، اُنھی کا نام ہمیں بابر زماں بتایا گیا تھا۔ نہایت مہذب، وجیہ، کھلتے ہوئے گندمیں رنگ اور اٹھی ہوئی قامت کے آدمی تھے۔ سادہ لباس مگر طبیعت میں قرار نہیں تھا۔ ہمیں وہ اچھے لگے۔ وہ ایسے لوگوں میں تھے جن سے ایک ملاقات میں سیری نہیں ہوتی اور جو اپنے نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ معاف کیجیے۔" وہ شائستگی سے بولا۔ "کم از کم ہمارا یہی تاثر تھا۔"

مجھ سے اُس کا شکریہ ادا نہیں کیا جا سکا، میں بس گنگ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ میرے اِس رویّے پر شاید اُس نے اپنی رائے میں ترمیم

کرلی ہوگی۔ اپنے اندازوں کے بارے میں اُسے بہت خوش فہمی تھی۔ میرے لیے اُس کے اندازے بس یہیں تک تھے، چہرے اور قد و قامت تک کوئی نہیں جانتا کہ اُن کے پیچھے کیسے کیسے رنگ اور کیسی کیسی قامتیں ہوتی ہیں۔ میرے جی میں آئی کہ اُس سے اپنا پورا تعارف ہی کرا دوں، جیل، چاقو بازی، 'اُٹھائی گیری' میں اسے کیا کیا بتاتا۔ اِن اجالوں کے پیچھے کیسے کیسے اندھیرے چھپے ہیں۔ یہ بھی تو میرا ہی حصّہ ہیں۔ انھیں جانے بغیر اُسے کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔

"مولوی صاحب کو ہم سے ایک سوال کرنا چاہیے تھا۔" وہ ٹوٹی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "کہ کیا وہ لوگ دوبارہ آنے کو کہہ گئے ہیں، وہ اب کہاں ہیں۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد انھوں نے ہم سے یہی پوچھا۔ ہم نے اُن سے کہا کہ اب تو وہ کبھی کے بمبئی واپس چلے گئے ہوں گے۔ اپنا بمبئی کا پتہ دے گئے تھے جو ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ہم سے کہہ گئے ہیں کہ اگر اس دوران آپ تشریف لے آئیں تو براہِ کرم اُنھیں مطلع کر دیا جائے۔ ہم اُنھیں خط لکھ دیتے لیکن آپ سے مشورہ کیے بغیر اُن سے کوئی ربط ضبط غالباً مناسب نہیں تھا۔ سُن کے دیر تک چپ رہے، پھر بے نیازانہ انداز میں بولے کہ وہ پتہ ہمیں دے دیجیے گا۔ ہم نے جسارت کی کہ آخر یہ کون صاحب ہیں۔ کیا آپ اُن سے تجدیدِ تعلق پسند کریں گے اور ہم نے اُن سے یہ بھی کہا کہ اب بھول بھی جائیے، وہ صاحب بہت نادم تھے خطائیں آدمیوں سے ہوتی ہیں، معاف کر دیں تو احسن ہوگا، ہمیں بھی خوشی ہو گی۔ بس سنتے رہے۔ ہم نے اُن سے دوبارہ پوچھا تو صرف اتنا کہا کہ آپ ہمیں پتہ دے دیجیے۔ مناسب ہوا تو کسی وقت اُن سے رابطہ قائم کر لیا جائے گا۔ ابھی دماغ کچھ حاضر نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی۔ باقی ہمیں دخل در معقولات والی بات معلوم ہوئی۔ میزبانی کے بھی آداب ہوتے ہیں، ہم نے زبان بند رکھی۔ رات کے کھانے پر ہماری اُن سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے ہم سے پتہ طلب نہیں کیا، ہم نے بھی اس سلسلے میں اُن سے کوئی بات نہیں کی۔ رات کو وہ مطالعے کا عُذر کر کے جلد ہی ہم سے رخصت ہو گئے۔ اُس کے بعد کا حال ہم آپ کو بتا چکے ہیں۔ دوسرے دن ہم سکندر آباد چلے گئے۔ واپس آئے تو وہ موجود نہیں تھے۔"

نواب چپ ہو گیا۔ پیرو اُس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر شاید اُسے خیال آ گیا کہ اب اور کیا پوچھنا باقی رہ گیا ہے۔ اُس نے میرے ہاتھ پر تھپکی دی، میرے جی میں آئی کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ نواب کی سُرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ "اید رکسی سے بول کے بھی نہیں گیا؟" پیرو نے نواب سے پوچھا۔ پیرو کا دماغ بھی چل گیا تھا۔ اتنی دیر سے نواب اور کیا کہہ رہا تھا۔

"یہاں صرف والدہ محترمہ تھیں" نواب نے بجھی ہوئی آواز میں کہا "ہمشیرہ بھی ہمارے ہمراہ سکندر آباد گئی تھیں۔ جانا تو امّی جان کو بھی تھا مگر اُس دن اُن کا مزاج کسی قدر ناساز تھا۔ ملازم کہتے ہیں کہ مولوی صاحب نے والدہ کے بارے میں اُن سے پوچھا، کھانے کے بعد اُنھیں قیلولے کی عادت ہے۔ ملازموں نے بتایا کہ سو رہی ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا 'بہتر ہے' اُنھیں جگایا نہ جائے۔ ملازم سے انھوں نے تانگہ منگایا۔ ملازم اُن سے کیا کہہ سکتے تھے۔"

"ابھی ابھی آپ کیا سمجھتا ہے۔ اپن کا مطلب ہے، وہ ایسا اید رسے کیوں چلا گیا؟" اتنا کچھ سننے کے بعد پیرو نے پھر ایک فضول بات کہی۔

نواب کے چہرے کا رنگ لال ہو گیا۔ "ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔" وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ سبھی نے اُن کی دل جوئی کی کوشش کی تھی، اُن کے آنے سے ہمیں بڑی مسرت ہوئی تھی مگر جانے کیوں، کون سی کوتاہی ہم سے سرزد ہوئی۔ اگر صرف یہی وجہ تھی کہ ہم نے اُنھیں آپ کے بارے میں بتا دیا تھا تو کیا یہ ہم نے اچھا نہیں کیا تھا۔ سب کچھ اُنھی کی آمادگی پر منحصر تھا۔ وہ آمادہ نہ ہوتے تو بخدا ہم کبھی آپ کو نہ لکھتے۔ اس میں ایسی کیا بات تھی جو وہ اتنے دل برداشتہ ہو گئے یا یوں کہیے کہ برہم ہو گئے۔ ہمارے آنے کے بعد وہ جا سکتے تھے۔ وہ اپنی مرضی کے مالک و مختار تھے کسی وقت بھی جانے کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ یوں سامان اُٹھا کے گھر کے مکینوں سے کہے بغیر چلے جانا، کوئی رسمی سا معذرتی پرزہ بھی لکھنا گوارا نہیں کیا، اسے کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہمیں اپنی خطا سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ ہی کچھ بتائیے۔"

"اپن کیا بولے نواب صاحب!"

"ہم آپ سے سچ کہیں۔ ہماری عقل میں کچھ نہیں آتا۔ یہ تو ایک بہت سیدھی سادی بات تھی۔ کچھ لوگ اُن کی عدم موجودگی میں اُن سے ملنے آئے تھے۔ ہم نے اُن کے آنے پر تذکرہ کر دیا۔ یقیناً کوئی اور ہی بات ہوگی۔"

"ابھی اور کیا ہو سکتا ہے نواب صاحب!"

"دیکھیے، آپ خود ہی سوچیے، جو کچھ ہم نے آپ کے گوش گزار کیا۔ یقین کیجیے، من و عن یہی پیش آیا ہے۔ اس میں آپ کو ہماری کون سی لغزش نظر آتی ہے۔ یہ ہماری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ امّی جان کو جتنا رنج ہوا ہے، ہم بتا نہیں سکتے۔ ہم سے پوچھتی ہیں لیکن ہم کوئی جواب نہیں دے پاتے، ہمارے آنے سے پہلے امّی جان کو ملازموں سے اُن کے جانے کی اطلاع مل چکی تھی لہٰذا سکندر آباد سے آنے پر ہم مولوی صا

کی اچانک روانگی کے بارے میں اُن سے کوئی بہانہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم تو آپ کے خود ششدر رہ گئے تھے۔ ہم نے پوری طرح تصدیق کرلی ہے کہ ہمارے سکندرآباد جانے کے بعد کوئی شخص اُن سے ملنے نہیں آیا۔ کسی خط یا تار وغیرہ کی موصولی کا معاملہ بھی خارج از بحث ہے۔ فرض کیجیے، اُنھیں کوئی بھولا ہوا کام یاد آگیا تھا اور اُن کا جانا اتنا ہی ضروری ہو گیا تھا اور والدہ سو رہی تھیں تو یہاں ملازم موجود تھے۔ وہ دو لفظی رقعہ تو لکھ سکتے تھے۔ ہم سمجھتے ہیں، ہم نے اِس پہلو پر بھی غور کیا کہ آپ کا ذکر اُن کے لیے ایسا ہی ناقابلِ برداشت تھا یا اُنھیں آپ سے کوئی خوف لاحق تھا اور آپ نے ہمیں جو رُوداد سنائی تھی، معاف کیجیے، ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ وہ رُوداد حقائق پر مبنی نہیں تھی تو کیا.... نہیں نہیں، وہ ہمیں اعتماد میں لے سکتے تھے۔ اُنھوں نے سب کچھ سن کے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ہم اُن کی نظروں میں اتنے نامعتبر تھے؟ اشارہ کر دیتے تو یہاں پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا تھا۔"

"اپُن سمجھتا ہے کہ آپ کو کیسا دکھ ہو گا۔" پیرو نے افسردگی سے کہا اور یکایک نواب سے پوچھنے لگا۔ "اور وہ، وہ لڑکی! آپ نے اُس کو دیکھا تھا نواب صاحب؟"

"دیکھنے سے کیا مراد ہے آپ کی؟" وہ تیزی سے بولا۔

"اپُن کا مطلب ہے، وہ کیسا تھا، ابھی تو بہت بڑا ہو گیا ہو گا؟" پیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

نواب کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے پیرو کو تکتا رہا، پھر دبے لہجے میں بولا۔ "ہاں، جی ہاں، اِسے اتفاق کہیے، اُس روز حسبِ عادت، دستک کی ضرورت سمجھے بغیر ہم اندر گھر میں داخل ہوئے تو وہ والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمیں بڑی ندامت ہوئی اور ہم فوراً واپس ہو گئے۔ یوں ہمارا اُن کا آمنا سامنا ہوا تھا، بس چند لمحوں کے لیے۔" یہ کہہ کے وہ جیسے کہیں گم ہو گیا۔

"ابھی کیسا تھا وہ؟" پیرو نے اٹکتی زبان سے اُسے ٹوکا۔

پیرو کے سوال پر وہ جز بز سا ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے اُس کے ماتھے کی شکنیں دُور ہو گئیں اور وہ معذرتی لہجے میں بولا۔ "ہاں، آپ نے تو انھیں عرصے سے نہیں دیکھا ہو گا۔"

پیرو نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ماشا اللہ! خدا نظرِ بد سے بچائے۔ اب تو وہ ایک، ایک مکمل دوشیزہ نظر آتی تھیں، ایک، ایک قلمی گردن اپ خاتون...." لفظ نواب کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ بات بدلنے کے انداز میں پیرو سے پوچھنے لگا۔ "کیا وہ مولوی صاحب کی دختر تھیں؟"

"ابھی مولوی صاحب نے کیا بولا آپ کو؟"

"انھوں نے یہی فرمایا تھا۔"

"پھر آپ ایسا کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"نہیں، یوں ہی۔" نواب سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ایک لمحے کے لیے اُس کا سارا جسم بل کھا گیا۔ "یوں ہی ہمیں خیال آ گیا۔" وہ سنبھل کے بولا۔ "یعنی کہ وہ متبنّٰی لے پالک بھی ہو سکتی ہیں۔"

"وہ اُسی کا بٹیا ہے۔" اچھا ہوا جو پیرو نے یہ کہہ کے نواب کو غیر ضروری سوالوں سے نجات حاصل کر لی۔ نواب اُس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ پیرو نے اُسے مزید تذبذب و کشمکش کی مہلت نہیں دی، عاجزانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔ "ابھی آپ کا ماں، بہن تو اُس کو زیادہ بھالا، بات کیا ہو گا۔ وہ اُس کے لیے کیا بولتا ہے۔"

"اُن کی زبانیں تو مدح سرائی کرتے نہیں تھکتیں۔" نواب نے تمتماتی آواز میں کہا۔ "اُنھیں تو گویا اپنا کوئی کھویا ہوا مل گیا تھا۔ امّی کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اُنھیں مسلسل اپنی نظروں کے سامنے رکھیں۔ دن میں وہ اُن سے اِس قدر مانوس ہو گئی تھیں جیسے برسوں کی شناسا ہو۔ ہمشیرہ کا بھی یہی عالم تھا، نرجس بانو...." نرجس بانو سے نواب کی مراد کوراہی ہو گی، مولوی صاحب کا رکھا ہوا یہ نام مجھے زہرہ نے بتایا تھا۔ نواب بھی یہی نام لے رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "نہایت متین، کم گو لڑکی ہیں۔ امّی جان کا خیال تھا کہ ماں بہن نہ ہونے سے اُن پر گہرا اثر ہے۔ امّی جان نے اُن کی یہ خلش دُور کرنے کی کوشش کی۔ وہ عموماً خاموش خاموش رہتی تھیں، ڈوبی ہوئی، ہمہ وقت کسی سوچ میں گم۔ اگر ہم یہ کہیں کہ چند دنوں میں وہ امّی جان اور ہمشیرہ کی آنکھ کا تارا بن گئی تھیں تو غلط نہ ہو گا۔ ہمارا یہ گمان بھی شاید غلط نہیں کہ اِس توجہ کا نرجس بانو پر اچھا اثر مرتب ہو رہا تھا۔ ہمشیرہ کا کہنا تھا کہ اُن کا جی یہاں لگنے لگا تھا۔ اُن کے لیے اُن دونوں کی محبتوں کا احوال ہم کیا بیان کریں۔ امّی تو بہت جذباتی ہو گئی تھیں۔ اُنھوں نے مولوی صاحب سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمارا جی چاہتا ہے نرجس بانو کو مستقل اپنی بیٹی بنا لیں۔ امّی جان نے اپنے جذبات کے اظہار میں خاصی جلدی کی تھی لیکن وہ بھی اپنی جگہ درست تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ نرجس بانو کی طرف سے مولوی صاحب کے دل و دماغ پر بوجھ ہے تو شاید اِس طرح کم ہو سکے۔ اِس سے پہلے متعدد بار ایسے مواقع آئے، اُنھوں نے ہماری رائے جاننی چاہی، یہ جانتے ہوئے کہ اُن کے حکم سے سرتابی کی مجال ہم میں نہیں ہے۔ اُس بار اُنھوں نے سے کوئی ذکر نہیں کیا، شاید اِس لیے، اِس لیے کہ ہم بھی کوئی اعتراض نہ کرتے۔" نواب کی آواز جھرجھرانے لگی تھی۔ "کتنی بار امّی جان نے ہم پر زور دیا تھا اور جانے کہاں کہاں وہ دوڑ دھوپ کرتی رہی تھیں اور خود ہی مسترد کر دیتی تھیں۔ خاندانی نجابت اور شرافت اُن کے ہاں پہلی شرط ہے لیکن اِس مرتبہ تو اُن پر جیسے جادو ہو گیا تھا۔" نواب لفظ چباتے ہوئے بولا۔ "ہم آپ کو یہ سب یوں بتا رہے ہیں کہ آپ مولوی صاحب کے لیے اِس گھر کے عزّت و احترام کا اندازہ کر سکیں۔ بے شک امّی جان نے عجلت کی تھی لیکن یہ عجلت مولوی صاحب ہی کی طمانیتِ قلب کی خاطر تھی۔ وہ سُن کے چپ رہے اور منکسرانہ کہنے لگے کہ نرجس بانو تو آپ ہی کی بیٹی ہیں۔ وہ اُس لمحے کوئی بھی عذر کر سکتے تھے۔ یہی کچھ ہوتا ہے۔ امّی جان نے تو ایک اشارہ کیا تھا، اپنی خواہش کا اظہار، محض عرض گزاری تھی۔ مولوی صاحب کی نگاہیں دیکھے بغیر وہ دوبارہ ایسی بات کبھی زبان سے نہ نکالتیں۔ مولوی صاحب کو تحمّل کرنا چاہیے تھا۔ وہ شرفا میں آئے تھے۔ سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں، ہاں۔" پیرو اُچھل کے بولا۔ "اپُن ابھی سب سمجھ رہا ہے۔"

"بس یہی کچھ احوال تھا۔" نواب تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی دیکھو، شاید وہ لَوٹ کے آ جائے۔"

نواب کے ہونٹ لٹک گئے، تندی سے بولا۔ "نہیں، نہیں، اب شاید وہ کبھی نہ آئیں۔ واپس آنے والے اِس طرح نہیں جایا کرتے۔"

"ابھی آپ ٹھیک ہی بولتا ہے پر آ بھی سکتا ہے۔ بھُولا بھٹکا کبھی ایدر کو آ جائے تو اپُن کا بنتی ہے، ابھی آپ اپنے کو اُس کو بولے بنا چٹھی لکھ دے گا۔ اپُن پر بڑا احسان ہو گا۔"

"پہلے وہ آ تو جائیں۔" نواب نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

پیرو کی متوحّش نظریں میری طرف اُٹھ گئیں۔ اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا، میں اُس کا مطلب سمجھ گیا، وہ میری طرف سے تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ کوئی اور سوال جواب تو باقی نہیں رہ گیا ہے۔ میرے دماغ میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میں نواب سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا، وہ کہہ رہا تھا، کورا جتنے دن یہاں رہی، زیادہ تر اُس کی ماں اور بہن کے ساتھ رہی۔ اُن دونوں نے اُس سے جانے کتنی باتیں کی ہوں گی۔ کورا مسلسل تو خاموش نہیں رہی ہو گی۔ جیسلمیر سے نکلنے کے بعد مولوی صاحب جانے اُسے کہاں کہاں لیے پھرتے رہے، کتنے گھر، کتنے شہر بدل چکے ہیں۔ وہ کب تک اپنے آپ کو باندھے، سمیٹے ہوئے رکھ سکے گی مگر میں جیسے ہی نواب سے کچھ پوچھنے کا ارادہ کرتا، میری آنکھوں میں دُھندسی اُتر آتی۔

جب پیرو نے نواب سے اجازت چاہی، اُس وقت مجھے کچھ ہوش آیا۔ دوبارہ یہاں آنا ممکن نہیں ہو گا۔ میں نے اپنے اوسان مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ میں نواب سے ایک التجا کرنا چاہتا تھا کہ کیا وہ کچھ دیر کے لیے مجھے اپنی ماں اور بہن سے ملا سکتا ہے، یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم وہ مجھے اُن جگہوں ہی پر لے چلے جہاں جہاں کورا رہی تھی، وہ مجھے اُس کمرے میں لے چلے جہاں وہ ٹھیری تھی۔ میں بس وہاں جا کے فوراً واپس آ جاؤں گا۔ نواب نے اچھی طرح دیکھ بھی لیا ہے، ہو سکتا ہے، وہ اپنی کوئی چیز بھول گئی ہو، مگر میں سوچتا ہی رہ گیا، میری زبان پتھرا گئی تھی، میرا سارا وجود پتھر ہو گیا تھا۔ نواب کے حکم پر تازہ چائے آ گئی تھی۔ نواب نے پیالی میری طرف بڑھائی، وہ میرے لرزتے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی۔ میں بمشکل ایک دو گھونٹ حلق سے اُتار سکا۔ نواب ہمیں روکنا چاہتا تھا لیکن پیرو اُٹھ گیا، اُس نے نواب کو بتا دیا تھا کہ ہمیں رات ۹ بجے بمبئی کی گاڑی پکڑنی ہے، اب وقت کم رہ گیا ہے، دوسرے کچھ کام بھی نمٹانے ہیں۔ نواب عمارت کے باہر تک ہمیں چھوڑنے آیا، اُس نے پیرو سے وعدہ لیا کہ جب بھی ہمارا حیدرآباد آنا ہو گا، ہم اُس سے ملنے ضرور آئیں گے۔

مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ نواب ثروت یار کے گھر سے موٹر تک ہم کتنی دیر میں پہنچے۔ پیرو راستے بھر خاموش رہا۔ سورج ڈوب چکا تھا، دکانیں اور کھمبے روشن ہو چکے تھے۔ میں اپنے ہی پیروں پر موٹر تک آیا تھا لیکن بیٹھتے ہی میرا جسم ڈھے گیا تھا۔ میرے گلے میں پڑا ہوا پیرو کا ہاتھ بھی مجھ پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے دبوچ رکھا تھا۔ موٹر تیز رفتاری سے سڑکوں پر گزرتی رہی۔ پھر وہ چار مینار کا علاقہ تھا جہاں پیرو نے ڈرائیور کو بڑے نواب کی حویلی چلنے کی ہدایت کی، میرے کان جلنے لگے۔ اُس نے ڈرائیور کو بڑے نواب ہی کی حویلی چلنے کے لیے کہا تھا۔ "نہیں دادا!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "سیدھے گھر چلو۔" میری آواز پھٹی ہوئی تھی۔

"کیا راجا!" وہ تھپکتے لہجے میں مجھ سے بولا۔ "ابھی تُم نے اپن نے چار مینار کا گھڑیال دیکھا ہے۔ ابھی لوٹ کے اپن سیدھا گھر پہنچ سکتا ہے۔"

"گھر ہی چلو دادا!"

"ابھی بس جا کے ایک دم لَوٹ پڑے گا۔ اُودر خانم دیکھ کے تھوڑا خوش ہو جائے گا۔ اُودر سے اپنا ٹھکانے کا رستہ اتنا دُور نہیں ہے۔"

"میرا جی بالکل نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اپُن جانتا ہے، پر اپُن اِسی لیے تو اُودر جانے کا بولتا ہے۔ اُودر جا کے ابھی جی بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں دادا! میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اب کہیں اور مت چلو۔"

پیرو نے مجھ سے اصرار نہیں کیا، ڈرائیور کو گھر کی طرف چلنے کا اشارہ کر دیا۔ موٹر زیادہ دُور نہیں آئی تھی، ڈرائیور نے وہیں سے موڑ لی۔ "ابھی

سنبھل کے راجا!" پیرو نے سرگوشی میں کہا۔ "ابھی اپن سوچتا ہے، اُودر نئیں جاتا تو ٹھیک تھا۔ سمجھ لے کہ نئیں گیا تھا۔ تو تو پہلے ہی نابول رہا تھا۔"

میں نے پھر نہیں کہا۔ پیرو بھی چپ ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد موٹر ابا جان کی حویلی کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ حویلی میں دو موٹریں اور کھڑی تھیں۔ ہم اندر پہنچے تو نواب حشمت جنگ بھی موجود تھا۔ شامو، زورا اور مارٹی وغیرہ نشست گاہ کے درمیان رکھے ہوئے چمڑے کے سوٹ کیسوں میں سامان رکھ رہے تھے۔ ہر طرف مختلف چیزوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ ساڑیاں، دوسرے کپڑے، چینی اور چاندی کے برتن، انگریزی بسکٹوں اور ٹافیوں کے ڈبے، بلوری گل دان، سنگھار دان اور زیورات کے بکس، جانے کیا کیا بکھرا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابا جان کو آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی نواب صوفے سے اُٹھ کے لپکتا ہوا ہماری جانب بڑھا اور دونوں بازو پھیلائے، وہ مجھے اور پیرو کو لیے ہوئے سامنے کی نشست پر بیٹھ گیا۔ "ابھی آپ تو پورا بازار اُٹھا لایا نواب صاحب!" پیرو نے حیرت سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں ہے، ہمیں وقت ہی کتنا ملا، جو سامنے نظر آیا، جلدی جلدی اُٹھا لائے۔" نواب حشمت جنگ نے انکسار سے کہا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم نے آپ کے لیے بہت سوچا، کیا چیز لائیں۔ آپ کی پسند کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بہرحال کچھ لائے ہیں، شاید آپ کو پسند آئے۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میری زبان پر لفظ منڈلا کے رہ گئے۔ میں وہاں سے اُٹھ جانا چاہتا تھا لیکن ایسے کس طرح اُٹھ سکتا تھا۔ نواب نے اُسی وقت جیب سے ایک مخمل پوش ڈبیا نکالی۔ اُس میں ایک سنہری دستی گھڑی چمک رہی تھی۔ میرا ہاتھ تھام کے اُس نے کلائی پر گھڑی باندھ دی۔ "کیسی ہے؟" وہ شگفتگی سے بولا۔

"بہت، بہت اچھی ہے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

اچھا ہوا جو پیرو نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور چینی کے برتنوں کے متعلق پوچھ گچھ کرنے لگا۔ میں فوراً وہاں سے اُٹھ آیا اور باہر سبزہ زار کے سامنے چبوترے کی کرسی پر آ کے بیٹھ گیا۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ باہر کی ٹھنڈی ہوا سے مجھ پر کپکپی سی طاری ہونے لگی۔ کچھ دیر میں وہاں بیٹھا اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ ملازم آ جا رہے تھے اور ہر کوئی ٹھٹک کے مجھے گھور کے دیکھتا تھا۔ میں وہاں سے اُٹھ کر اندر کمرے میں آ کے بستر پر لیٹ گیا۔ بستر پر آ کے میرا سینہ اور دھنکنے لگا۔ کورا کی مالا کے دانے جیسے میرے سینے میں پیوست ہوئے جاتے تھے اور جیسے مالا زنجیر بن کے میرے گلے کے گرد اپنا حلقہ تنگ کر رہی تھی۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی، جیسا کہ پیرو کہہ رہا تھا اگر ہم وہاں جانے کا ارادہ ہی نہ کرتے! مجھے سمجھ لینا چاہیے میں وہاں گیا ہی نہیں۔ کوئی فرق تو نہیں پڑا۔ میں تو خود ... کو وہاں جانے سے روک رہا تھا اس لیے کہ مجھے اُن کے بارے میں کسی حسن گمان کی توقع ہی نہیں تھی۔ میں دیر تک خود کو تسلیاں دیتا رہا لیکن میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ میرے سر میں اچانک شور مچنے لگتا اور بار بار بس یہی سودا سماتا کہ کسی طرح نواب ثروت یار کی کوٹھی پر پہنچ جاؤں اور جا کے اُس سے التجا کروں کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے مجھے اپنی ماں اور بہن سے بات کرنے کی اجازت دے دے، میں اُس سے کہہ دوں گا کہ جب تک وہ مجھے یہ اجازت نہیں دے گا، اُس کے دروازے پڑا رہوں گا۔ وہ نوجوان ہونے کے باوجود ایک سنجیدہ اور معقول آدمی ہے، میری بات نہیں ٹالے گا۔ میں اُس سے کچھ چھین تو نہیں رہا، ضرور نہیں کہ اُس کی ماں اور بہن نے کورا کی ساری باتیں اُسے بتا دی ہوں۔ نواب ضرور مان جائے گا۔ بہ صورتِ دیگر دوسرے طریقے بھی ہیں۔ میں رات کو کسی وقت کوٹھی کی دیوار پھلانگ کے اندر داخل ہو سکتا ہوں۔ پھر زنان خانے کا راستہ تلاش کر لینا ایسا مشکل نہیں، جا کے اور تمنچے کے سامنے وہ کچھ نہیں چھپا سکیں گی۔ میرا مقصد اُنھیں کوئی نقصان پہنچانا تو نہیں۔

بے اختیار میں بستر سے اُٹھ گیا، پھر اس سے پہلے کہ دروازے سے نکلتا، میرے پیروں کو جیسے کسی نے جکڑ لیا۔ اب میں کہاں جا سکتا ہوں۔ صبح یہاں حیدر آباد سے نکلنے کے لیے نواب حشمت جنگ کو آمادہ کرنے میں سب کس عذاب سے دوچار ہوئے تھے۔ میرے رُک جانے سے کیا وہ ٹھیر جائیں گے؟ وہ اب یہاں ایک پہر بھی مزید ٹھیرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ نواب کے راضی ہو جانے پر سب نے سکون کی سانس لی ہے جیسے انھیں قید سے نجات مل گئی ہو۔ پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ سیدھے بمبئی جاتے جاتے میں نے ہی ایک ساعت کے لیے مراد آباد رک جانے کا شوشہ چھوڑا تھا اور وہاں مسافر خانے کے رجسٹر سے مولوی صاحب کا پتہ ملنے کے بعد حیدر آباد آنے کے لیے ضد کی تھی اور اُن کا راستہ کھوٹا کیا تھا، ورنہ یہ سب کچھ یوں پیش نہ آتا۔ میں بمبئی جانے کے بعد بھی حیدر آباد آ سکتا تھا۔ اب میں کس منہ سے اُن سے کہوں گا۔ اُن سے کہے بغیر جاؤں گا تو اُنھیں اور آزمائش میں ڈالوں گا۔ اتنی مشکلوں کے بعد کہیں یہاں سے نکلنا ہو رہا ہے۔ میں وہیں بستر پر پڑا اپنے آپ کو کھسوٹتا رہا۔ نواب ثروت یار کی کوٹھی، حرم منزل کا نقشہ میری آنکھوں میں گھومنے لگتا تھا۔ ابھی عمارت کے در و بام میں وہ گھومتی ٹہلتی رہی ہے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ میں اس

... اس قدر قریب ہوں، ایک گھنٹے سے کم کی مسافت میں اُس کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔ وہ اُنھی دنوں اس شہر میں تھی جب میں اور پیرو بڑے نواب کی حویلی کے زنداں سے فرار ہونے کے لیے دیواروں سے سر پھوڑ رہے تھے۔ اگر ہم اور چند دن پہلے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو پیرو اسی طرح روانہ ہونے سے پہلے ایک بار نواب ثروت یار کی کوٹھی کا رُخ ضرور کرتا اور، اور ..... یہ سوچ کے میرا جسم لرزنے لگتا۔ وہ بھی تو اُدھر زنداں ہی میں تھی، کھلے دروازوں کے زنداں میں۔ وہ دن اُس کی دعاؤں کی قبولیت کا بھی ہوتا مگر قبولیت کی گھڑی تو طے ہوتی ہے۔ وہ گھڑی آئی ہوتی تبھی تو ایسا ہوتا۔

مارٹی کی آواز سن کے میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ وہ مجھے بتانے آیا تھا کہ سب روانگی کے لیے تیار رہیں۔ میں کچھ کہے بغیر اُس کے ساتھ چل پڑا۔ چبوترے پر سبھی تیار منتظر تھے۔ میرے آنے کی دیر تھی کہ سب سامنے کھڑی ہوئی دو موٹروں میں بیٹھ گئے۔ حویلی کے کئی ملازم صدر دروازے پر موجود تھے۔ موٹریں چند ثانیوں کے لیے اُن کے دوائی سلام کا جواب دینے کے لیے ٹھیریں اور سڑک پر آ گئیں۔ میں، مارٹی، زورا اور شامو ٹھسے ہوئے بیٹھے تھے۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ جمرو اور ٹنگو تھے۔ موٹر میں خاموشی تھی۔ سب مضطربانہ، اِدھر اُدھر سڑکوں پر بجلی کی روشنیوں اور گزرتے لوگوں کو دیکھتے رہے۔ اُنھیں اپنی روانگی کا یقین نہیں آ رہا ہو گا اور اُن کی وحشت زدہ خاموشی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُنھیں ابھی تک اپنے تعاقب کا اندیشہ لاحق ہو۔ وہ راستے میں پیش آنے والی کسی رکاوٹ کی طرف سے شاید ابھی تک مطمئن نہیں تھے۔ کبھی کبھی آدمی اپنے سائے پر بھی شک کرنے لگتا ہے۔ موٹر جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی، اُن کی بے چینی فزوں ہوتی گئی۔ سڑکوں پر آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ دکانیں یا تو بند ہو گئی تھیں یا بند ہو رہی تھیں۔ پھر جب دُور سے اسٹیشن کی روشنیاں نظر آئیں تب اُنھیں کچھ قرار آیا۔ مارٹی مجھے کہنیاں مارنے لگا اور اگلی نشست پر ٹنگو کے مٹکتے دیدے دیکھ کے سب ہنس پڑے، میں نے بھی اُن کا ساتھ دینے کی کوشش کی لیکن بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُنھیں دیکھا کیا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسٹیشن پر موٹریں ٹھیرا ہی چاہتی تھیں کہ شیروانیوں میں ملبوس دو ادھیڑ عمر آدمی تیزی سے ہماری طرف بڑھے۔ اُنھوں نے ہی دروازہ کھولا اور ابا جان سے تو سلام کیا۔ اُن کے اشارے پر کسی تاخیر کے بغیر ایک جانب انتظار میں کھڑے قلیوں نے سامان اُٹھا لیا۔ پلیٹ فارم پر گاڑی لگی ہوئی تھی اور ہر طرف شور اُمڈا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم کے دروازے سے ریلوے کا ایک افسر بھی اُن دو آدمیوں کے ساتھ ہو گیا اور کچھ دیر میں فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے کے سامنے رُک گیا۔ یہاں ہجوم نسبتہً کم تھا۔ برابر برابر دو ڈبے ہمارے لیے مخصوص کیے گئے تھے، اُن کے درمیان بس ایک دیوار حائل تھی۔ ببّل کی ہدایت پر مارٹی نے کانتے کا بازو پکڑ کے سب سے پہلے اُسے ڈبے پر چڑھانا چاہا۔ مجھے کانتے کا دھیان ہی نہیں رہا تھا، اب جو اُس پر نظر پڑی تو میں ٹھٹک کے رہ گیا۔ اُس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب معلوم ہوتی تھی۔ سفید شال سے اُس کا سارا جسم چھپا ہوا تھا، اُس کے چہرے کی سوجن اور تمتماہٹ بتا رہی تھی کہ اُسے تیز بخار ہے۔ مارٹی نے اُس کا بازو پکڑا تو اُس نے اُسے جھٹک دیا اور اپنے ہاتھ سے ڈنڈا پکڑ کے اوپر چڑھا۔ وہ اپنے سہارے سے ڈبے میں چلا تو گیا لیکن اُسے پوری قوت مجتمع کرنی پڑی ہو گی۔ اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور لگتا تھا کہ جسم پیروں پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ اندر جا کے وہ نشست پر لیٹ گیا۔ مارٹی نے ڈبے سے اُتر کے سرگوشیانہ انداز میں ببّل کو بتایا کہ کانتے کا بدن بُری طرح جل رہا تھا۔ ببّل سُن کے رہ گیا۔

ہم ڈبے کے باہر کھڑے تھے، ہمیں یہاں آئے چند منٹ سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے کہ دو آدمی بڑے بڑے ناشتے دان اور سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی ٹوکریاں اُٹھائے تیز تیز قدموں سے ہماری طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ جن آدمیوں کی رہ نمائی میں ہم ڈبے تک آئے تھے، اُنھوں نے بہ عجلت دونوں چیزیں اپنی تحویل میں لے کے ہمارے ڈبوں میں رکھ دیں۔ کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ نواب حشمت جنگ نے زادِ راہ کے طور پر کھانے پینے کا سامان بھیجا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر وہ خود بھی موجود تھا اور کشاں کشاں ہماری طرف چلا آ رہا تھا۔ وہ عین وقت پر آیا۔ اِدھر وہ آیا، اُدھر گاڑی کی روانگی کے لیے پلیٹ فارم کی گھنٹی بجنے لگی۔ نواب حشمت جنگ باری باری سب سے بغل گیر ہوا، سب سے آخر میں میرے پاس آیا کیونکہ میں سب سے پیچھے کھڑا تھا، وہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میں نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ نواب کو زیادہ وقت بھی نہیں ملا۔ سب جلدی جلدی ڈبوں میں چڑھ گئے۔ گارڈ نے سیٹی بجا دی تھی۔ جب تک نواب حشمت جنگ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا، پیرو اور شامو دروازے پر کھڑے رہے۔

میں کانتے کے پاس اُس کے ڈبے میں جانا چاہتا تھا لیکن اُس طرف ابا جان، ببّل اور منیر علی کو بڑھتا دیکھ کے میں نے ارادہ بدل دیا اور دوسرے ڈبے میں آ گیا، یہاں پیرو کے علاوہ شامو، جمرو، مارٹی اور ٹنگو موجود تھے۔ اسٹیشن پر کئی مرتبہ میرے جی میں آئی تھی کہ ہجوم میں کہیں گم ہو جاؤں، وہ گاڑی میں بیٹھ جائیں گے اور دو

ڈبوں کی وجہ سے یہی سمجھیں گے کہ مَیں دوسرے ڈبے میں ہوں۔ اگلے اسٹیشن پر جب کسی کو میرا خیال آئے گا، گاڑی دُور جا چکی ہوگی اور تب تجمّل سفر ملتوی نہیں کر سکے گا۔ مارٹی بعد میں اُن کی نظروں میں کتنا ہی بُرا بنے مگر میری خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مَیں اُسے اعتماد میں لے سکتا تھا کہ اگلے اسٹیشن پر وہ اُنھیں بتا دے، میری اتنی فکر نہ کریں، مَیں عمداً حیدرآباد میں ٹھیر گیا ہوں اور تین چار دن بعد بمبئی پہنچ جاؤں گا۔ ممکن ہے، دوسرے ہی دن پہنچ جاؤں۔ مَیں نے لمحے بھر میں جانے کتنے ارادے باندھے تھے لیکن سب مجھے نارَوا، نازیبا معلوم ہوتے تھے۔ وہ چلے تو جائیں گے لیکن پھر شاید کوئی مجھ سے کلام کرنا بھی پسند نہ کرے۔ تجمّل، ابّا جان کو میرے رُکنے کا کیا جواز دے سکے گا۔ وہ تو پریشان ہو جائیں گے۔ کیا کہیں گے کہ اتنے زمانے بعد بھائی بہنوں سے ملنے کی صورت پیدا ہوئی تھی اور مَیں نے پروا نہیں کی۔ مَیں کیسا آدمی ہوں، کیا بھائی۔ اُنھیں کون بتاتا کہ اُن کا خیال مجھے ابّا جان سے کم نہیں ہے۔ مَیں ایسے کیا جاؤں گا۔ مَیں کھُلی آنکھوں اور کھُلے سینے کے ساتھ ہی اُن کے سامنے جانا چاہتا ہوں۔ میری رگوں میں کانٹے چبھے ہوئے ہیں، مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ مَیں اپنے آپ ہی کو بُرا لگ رہا ہوں۔ ایک ابّا جان کیا، سبھی مجھ سے برگشتہ ہو جاتے۔ مَیں ایسے وقت اُس شہر میں رُک گیا ہوں جہاں سے نکلنا اُن کے لیے پہاڑ بنا ہوا تھا۔ یہی ٹھیک تھا کہ دو تین روز بمبئی میں ٹھیر کے مَیں پھر یہاں واپس آجاؤں۔ تب کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ مَیں نے اپنے دل میں یہی طے کیا تھا لیکن ڈبے میں آکے پھر مجھے طرح طرح کے وہم ستانے لگے۔ میرے ہاتھ پیروں میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی اور یہی کچھ گمان ہوتا تھا کہ مَیں کچھ بھول رہا ہوں، مجھ سے کوئی چوک ہو رہی ہے۔ مَیں آپ ہی آپ چونک پڑتا تھا۔

گاڑی چلتے ہی ٹنگو نے فرش پر اُچھلنا کودنا شروع کر دیا تھا۔ سب کھِلے جا رہے تھے، جیسے کوئی شہر فتح کر کے لوٹ رہے ہوں۔ مجھے وہ سب اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ ٹنگو کو اُٹھا کے دروازے سے باہر پھینک دُوں یا خود ہی کُود پڑوں۔ میری طرف آکے ٹنگو مضحکہ خیز انداز میں دیدے مٹکانے اور مسخرا پن کرنے لگا مگر دوسرے ہی لمحے اُس کے جسم کا پارا اُٹھہر کے رہ گیا۔ میری نظروں میں جانے کیسی تندی تھی۔ پھر ڈبے میں سبھی کو چُپ لگ گئی، وہ مجھ سے دُور نشستوں پر جا بیٹھے۔ بہتر یہی تھا کہ مَیں خود اُن کے سامنے سے ہٹ جاؤں، سو مَیں اوپر کی برتھ پر چلا آیا۔ مارٹی نے خاموشی سے چادر میری طرف بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد انھوں نے کھانے کے لیے مجھ سے پوچھا، مَیں نے منع کر دیا۔ گاڑی مختصر مختصر وقفوں سے اسٹیشنوں پر ٹھیرتی رہی۔ مَیں جاگتا رہا تھا۔ نیند اُن میں سے بھی کسی کو نہیں آئی تھی۔ ہر اسٹیشن پر دوسرے ڈبے کی خیر خبر لینے کے لیے کوئی نہ کوئی نیچے اتر جاتا تھا۔ دو تین گھنٹے گزرے ہوں گے، کوئی تیسرا یا چوتھا اسٹیشن تھا، گاڑی ٹھیری ہوئی تھی۔ اچانک مارٹی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ وہ سن سناتے لہجے میں پیرو سے کہہ رہا تھا۔ "دادا! اپن کا ساتھ ایدر آدمی لوگ لگا ہوا ہے۔"

"کیا بولتا ہے ماسٹر!" پیرو نے بگڑی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں دادا! اپن نے دو آدمی ایسا دیکھا ہے، پہلے بھی اترنے پر شک پڑا تھا پر اپن چپ رہا کہ ابھی دوبارہ دیکھنے پر ہی زبان کھولے گا۔ وہ سالا ڈبے میں ہے، اور لوگ بھی ہو سکتا ہے پر اپن ابھی دو....."

"تو نے تجمّل بھائی کو بولا؟"

"اپن ابھی اُس کو بول کے ہی ایدر آیا ہے۔"

"پھر وہ کیا بولا؟"

"وہ اپن کے ساتھ دیکھنے کو نیچے اُترا اور پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر گھوم کے بولا، ٹھیک ہے ماسٹر! ابھی سالا آدھا آنکھ بچا کے ہے اور کھڑکی کھول کے، اپن کا طرف سے کوئی تڑی پڑی مت کرنا، کو بمبئی تک ڈھیل دینے کا ہے۔ سیدھا چلتا رہا تو اپن اُدھر ہی جا کے اُن کو اکھا دیکھے گا۔"

"اپن ابھی چل کے دیکھتا ہے۔" پیرو اپنی نشست سے اُٹھا۔ مَیں بھی فوراً نیچے کود پڑا۔

"استاد نے بولا ہے۔" مارٹی اضطراری لہجے میں بولا۔ "تو بار بار نیچے اترے گا تو ابھی سمجھ جائے گا، اپن اُن لوگ کو پہچان لیا۔ استاد بولتا ہے، ابھی اُن کو ایسا پتہ نہ چلے تو ٹھیک ہے۔"

پیرو نے مارٹی کے شانے پر ہاتھ مار کے اُسے سامنے سے ہٹایا۔ "اپن ابھی تھوڑا اُتر کے دیکھتا ہے۔" وہ بھڑکتی آواز میں بولا۔ "اصل ہے کہ....."

پیرو کے جھپٹتے ہوئے قدم دروازے ہی پر جم کے رہ گئے۔ گارڈ نے سیٹی بجا دی تھی اور لمحوں میں روشنیوں سے اندھیروں میں آگئی۔ اُس کی رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ مَیں نے غیر ارادی طور پر اپنی جیب ٹٹول کے دیکھی۔ مارٹی کا چاقو میری جیب میں محفوظ تھا۔

پیرو دیر تک ڈبے کے دروازے پر گم صم کھڑا رہا۔ گاڑی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ اندر ڈبے میں خاصی روشنی تھی مگر باہر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پیرو نشست پر آکے بیٹھا، سبھی اُس کے گرد بیٹھ گئے اور پٹ پٹاتی پلکوں سے اُس کا منہ تکنے لگے۔ "ابھی کون لوگ ہو سکتے ہیں دادا؟" لمحوں تک سناٹا رہا، پھر شامو جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔

جواب میں پیرو نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ہو سکتا ہے۔" جمرو تذبذب سے بولا۔ "ابھی تیرے کو تھوڑا دھوکا لگا ہو ماسٹر؟"

"کیسا بولتا ہے جمرو بھائی!" مارٹی نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "نہیں نہیں، اپنا مطلب ہے کہ اُن لوگ کو....."

"اپن نے اُن کو اِن دو آنکھ سے دیکھا ہے۔" مارٹی ترشی سے بولا۔ "اپن آنکھ کا ایک دم پرفیکٹ ہے، ہاتھ کے بارے میں ابھی ٹھیک سے نئیں بول سکتا۔ اپن ابھی کیا بولا، اپن نے جا کر سیدھا دادا استاد کو بولا تھا۔ وہ بھی نیچے اُتر کے اُس لوگ کو دیکھ کے آیا ہے۔"

"کس ٹائپ کے آدمی تھے؟"

"بالکل سالا شہری بابو، ایک شیروانی میں تھا تو دوسرا واسکٹ میں۔ دونوں کا کلر ہاف بلیک وائٹ، اپن کیا بولے۔ دونوں کا فا نیوا ہیڈ ہات سے اوپر کو نکلا تھا۔"

"ٹھیک ہے ماسٹر! ابھی جو تجمّل بھائی نے بولا وہی ٹھیک ہے۔" پیرو نے بھاری آواز میں کہا۔ "اپن ابھی بمبئی جا کے اُن لوگ کو دیکھنے کا ہے۔ اپن کو ابھی ڈھیل دینے کا ہی ہے۔"

"تو نے صرف دو ہی دیکھے ہیں؟" شامو نے بے چینی سے پوچھا۔

"ابھی اور ہوئیں گا تو اپن کیا بول سکتا ہے۔"

"گاڑی ابھی کون سے ٹیم پہ دوسرا اسٹیشن پکڑنے کا ہے؟" ٹنگو نے مارٹی سے پوچھا۔

"اپن سالا کوئی ریلوے بابو لگتا ہے ایدر؟" مارٹی تنک کے بولا۔ سبھی ہنس پڑے۔ اُن کی ہنسی بے ساختہ نہیں تھی، خوش دلی کے اظہار کی ایک مصنوعی کوشش تھی۔ دوسرے ہی لمحے اُنھیں احساس ہو گیا کہ یہ بے وقت کی راگنی ہے۔ اُن کی سوالی نگاہیں پھر پیرو پر مرکوز ہو گئیں۔ پیرو کے چہرے پر خود اَن گنت سوال بکھرے ہوئے تھے، وہ اُنھیں کیا جواب دیتا۔ اُس نے اُن سب کو برتھوں پر لیٹنے اور سو جانے کی ہدایت کی اور نرمی سے کہنے لگا کہ اگلا اسٹیشن آنے پر وہ خود نیچے اُتر کے اُنھیں ایک نظر دیکھ کے آئے گا۔ پیرو اپنی آواز کے سکون میں لپٹا ہوا اضطراب اُن سے نہ چھپا سکا۔

"نیند سالی ابھی کیدر آئے گا دادا۔ نیند تو اِس ماسٹر تو کے....." جمرو شکستہ لہجے میں بولا اور مارٹی کا تمتماتا چہرہ دیکھ کے چپ ہو گیا۔

"اپن کو لوٹ کے نئیں بولنے کا تھا کیا؟" مارٹی نے تلخی سے کہا۔ "ابھی اُن باسٹرڈ کو اپن نے بلایا ہے؟"

"منہ کیوں بناتا ہے ماسٹر!" پیرو نے اُس کے سینے پر ہاتھ مارا۔ مارٹی فرش پر اُلٹ گیا۔ پیرو کو اندازہ نہیں تھا کہ اُس کا ہاتھ غیر اختیاری طور پر اتنی زور سے پڑے گا۔ سب خاموش ہو گئے اور یکے بعد دیگرے پیرو کے پاس سے ہٹ گئے۔ پھر کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ بیس پچیس منٹ گزرے ہوں گے کہ گاڑی کی رفتار کم ہونے کے آثار پیدا ہوئے۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ رفتار ٹوٹتے ٹوٹتے معدوم ہونے لگی۔ گاڑی ابھی ٹھیری نہیں تھی کہ سبھی بے تابانہ کھڑے ہو گئے۔ وہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ اِس طرف سے میں نے، اُس طرف سے پیرو نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ اسٹیشن پر بجلی نہیں تھی۔ اِکّا دُکّا لالٹینوں کے سوا سارا اسٹیشن خاموشی اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جمرو اور مارٹی میری طرف دائیں کھڑکیوں کے پاس آگئے۔ اسٹیشن کی تین کمروں پر مشتمل عمارت اِسی طرف بنی ہوئی تھی۔ آگے کہنی تک مختصر پلیٹ فارم اُٹھا ہوا تھا۔ یہاں گاڑی زیادہ ٹھیرنے کا امکان نہیں تھا، اِس لیے پیرو نے اُترنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ البتہ وہ دروازہ کھولے اور ڈنڈا پکڑے باہر نظریں جمائے رہا۔ میں بھی اُس کے پیچھے تھا۔ ایک دو منٹ بعد ہی گاڑی نے کھسکنا شروع کر دیا۔ خاصا وقت گزر جانے کے باوجود گاڑی کسی جگہ نہیں ٹھیری تو وہ سب آڑے ترچھے ہو کے ایک دوسرے کے ساتھ برتھوں پر لیٹ گئے۔ اوپر کی برتھ پر کوئی نہیں گیا۔ ٹنگو نے پیرو کے پیر دبانا چاہا مگر پیرو نے اُسے جھڑک دیا۔ ناچار ٹنگو جمرو کی برتھ پر آگیا اور اُس کے پیروں کی طرف دبک کے پڑ گیا۔ آگے بھی گاڑی کسی اسٹیشن پر ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیری۔ سب نے ہر بار باہر جھانک کے تسلّی کی۔ گاڑی چلنے کے بعد سب برتھوں پر آکے لیٹ جاتے تھے۔ گزشتہ روز بھی وہ رات بھر جاگتے رہے تھے، دن کو بھی کوئی ایک پل نہیں سویا تھا۔ دیوار کے پار دوسرے ڈبے میں بھی شاید کوئی نہ سویا ہو۔ یا ہو سکتا ہے، تجمّل نے ابّا جان، منیر علی، زورا اور کلثوم کے آرام کی خاطر اُنھیں بتایا ہی نہ ہو کہ مارٹی نے آکے اُس سے کیا کہا ہے اور وہ اکیلا ہی چوکسی سے رہا ہو لیکن اُس نے احتیاطاً زورا کو ضرور اشارہ کیا ہوگا۔

کھُلی کھڑکیوں سے تیز ہوا اندر آ رہی تھی اور میرے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ مجھ سے ایک بڑی لغزش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اگر میں جیسا کہ میرے جی میں آئی تھی، واقعی حیدرآباد اسٹیشن کے ہجوم میں گم ہو جاتا! نواب ثروت یار کے ہاں سے آنے کے بعد مجھے تو ہوش ہی اُس وقت آیا تھا جب مارٹی نے اُن دو آدمیوں کے تعاقب کی خبر سے کانوں میں چنگاریاں بھری تھیں۔ اتنی دیر تک، ابّا جان کی حویلی سے اسٹیشن تک ویسے تو میں سب کے ساتھ آیا تھا، مَیں اُن کے ساتھ ہوتے اور سب کچھ دیکھتے سنتے کے باوجود مجھے اپنی سُدھ بُدھ نہیں تھی۔ میری آنکھیں تو مسلسل نواب ثروت یار کے مکان میں بھٹک رہی تھیں۔ مَیں ایک لاش کے مانند اُن کے ساتھ گھسٹتا ہوا اسٹیشن تک آیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ جانے اور گاڑی چلنے کے باوجود مَیں کسی بھی اسٹیشن کی بھیڑ میں گم ہو جانے کے ارادے باندھتا رہا تھا کہ حیدرآباد ابھی دُور ہی کتنا ہوا ہے، واپس جانے والی کسی گاڑی سے وہاں پہنچ سکتا ہوں، صرف ایک پہر کے لیے۔ اب وہاں ایک پہر سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا، مجھے کام ہی کتنا ہے، نواب کے ہاں جا کے اُس

کی ماں اور بہن تک رسائی حاصل کرنا اور اُن سے اُس بدبخت کی خیریت معلوم کرنا۔ وہ کیسی ہے؟ ابھی تک وہی حال ہے یا کچھ بدل گئی ہے؟ اب بھی اُس کے چہرے پر کیا وہی گھٹا، وہی سوگواری چھائی رہتی ہے، وہی ڈوبی ڈوبی آنکھیں، وہی بات بات پر لرزتے کپکپاتے ہونٹ جن کا حال مجھے زہرہ نے بتایا تھا؟ نواب ثروت یار اُس کے متعلق اتنا کچھ نہیں جانتا ہوگا جتنا اُس کی ماں اور بہن جانتی تھیں، وہ زیادہ وقت اُن ہی کے ساتھ رہی تھی۔ وہ باتیں جو نواب مجھے نہیں بتا سکا تھا، مجھے اُس کی ماں اور بہن سے معلوم ہو سکتی تھیں۔ اِس طرح اُس کا سراغ ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی، مجھے تو صرف اُس کا احوال جاننے کی فکر تھی۔ اتنے دنوں بعد جیسلمیر کے سفر میں زہرہ، منیر علی اور اُن کے گھر والوں کے بعد اب کہیں کوئی ملا تھا جن کے ساتھ وہ پورے چار پانچ دن رہی تھی۔ میں اُن سے ملے بغیر چلا آیا۔ وہاں سے آنے کے بعد میرے سارے جسم میں سوئیاں سی چبھتی رہی تھیں۔

جس وقت میں اور پیرو نواب ثروت یار کے ہاں بیٹھے تھے، اور نواب ہمیں مولوی صاحب اور کورا کے آنے کی رُوداد سُنا رہا تھا، میں اُسی وقت نواب سے منّت کرتے کرتے رہ گیا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے مجھے اپنی ماں اور بہن کے پاس لے چلے، میری زبان ہی ٹھٹھر کے رہ گئی۔ ایک اجنبی کو جس سے صرف دوسری ملاقات ہو، وہ کس طرح اپنی پردہ نشین خانہ دار ماں اور بہن کے سامنے پیش کر دیتا۔ اس کی تو یہی صورت تھی کہ میں نواب کی عدم موجودگی میں کسی وقت اُس کے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرتا، کسی طرح بھی۔ اِس کے لیے مجھے دیوار پھاندنی پڑتی یا مقصد برآری کے لیے اُن عورتوں کو چاقو دکھانا پڑتا یا اُن کے پیروں پڑنا پڑتا۔ میں نے سوچا تھا کہ دو ڈبوں میں تقسیم ہو جانے کی وجہ سے سب سمجھیں گے کہ میں دوسرے ڈبے میں ہوں اور تجمّل گاڑی میں بیٹھنے کے بعد سفر ملتوی نہیں کر سکے گا۔ مارٹی جانے بعد میں کتنا ہی بُرا منے مگر میری خوشنودی اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ میرے لیے وہ اُن کی ہر سزا برداشت کر لیتا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اُسے اعتماد میں لے سکتا ہوں، میرے اوجھل ہونے کے بعد وہ اُنھیں بتا دے گا کہ صرف ایک دن کی بات ہے، میں دوسرے ہی دن بمبئی پہنچ جاؤں گا۔ پہلی گاڑی سے نہیں تو دوسری گاڑی سے۔ مگر مجھے اپنا یہ اقدام اُسی وقت بہت ناروا، نازیبا لگا تھا اِس لیے میں خود کو باندھے ہوئے اُن کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ آگے تو بے شک چلے جاتے لیکن پھر شاید کوئی بھی مجھ سے کلام کرنا گوارا نہ کرتا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ تجمّل ابّا جان کو میرے حیدرآباد رُک جانے کا کیا جواز پیش کر سکے گا۔ وہ تو میرے یوں اچانک غائب ہو جانے سے پریشان ہو جائیں گے، کیا کہیں گے کہ اتنے زمانے بعد بھائی بہنوں سے ملنے کا وقت آیا تھا مگر میں نے کوئی پروا نہیں کی۔ میں کیسا بھائی ہوں۔ کون اُنھیں بتاتا کہ میرے سینے میں کیسا اندھیرا بھرا ہوا ہے۔ میں اپنی دھندلی آنکھیں لیے اُن کے سامنے کیا جا سکوں گا۔ میں نے خود پہ جبر کیے رکھا، مارٹی سے اپنے ارادے کا اظہار نہیں کیا۔ جو شہر اُن کے لیے زنداں بنا ہوا تھا، جہاں سے بہ عافیت نکل آنا کوئی پہاڑ سر کرنے سے کم نہیں تھا، وہاں میں پھر ٹھہر جاتا تو وہ میرے بارے میں کیا فیصلہ کرتے۔ پاگل تو وہ مجھے سمجھتے ہی ہو گئے، اب یہ جان کے معاف بھی نہ کرتے۔ آدمی خدا نہیں ہوتا کہ کسی کو اتنا معاف کرتا رہے، اتنی رعایتیں دیتا رہے۔

ایک نہیں، بہت سی پشیمانیوں، بہت سے عواقب و نتائج کے خیال نے مجھے روکے رکھا تھا لیکن یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حیدرآباد سے گاڑی نکلنے کی دیر ہوگی اور مارٹی یہ مذاق کرے گا۔ میں بھول گیا کہ زنداں کا تعین تو افراد سے ہوتا ہے، جگہ سے نہیں، آدمی آدمی کی زنجیر ہے۔ اگر پہلے اتنا نہیں تو اب مجھے اپنی ناکردہ لغزش کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ ایسے وقت اگر میں ان کے ساتھ موجود نہ ہوتا تو؟ اِس عالم میں تو مجھے ہر وقت ان کے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔ ایک میرے چلے جانے سے بے شک وہ اکیلے نہ ہو جاتے مگر میں اپنے آپ کو کیا جواب دیتا۔ میں تو ہمیشہ خود کو نوچتا کھسوٹتا رہتا۔ دو آدمیوں کے تعاقب سے ظاہر تھا کہ وہ طالع آزما ابھی ہم سے مطمئن نہیں ہوئے جنھوں نے کل رات ابّا جان کی حویلی میں حملہ آوروں کو بھیجا تھا۔ اگر حیدرآباد میں اُن میں سے کسی کی نظر مجھ پر جا پڑتی تو مجھ اکیلے کو اپنی منزل کا سرا سمجھ کر گرفت میں لینے سے ہرگز نہ چوکتے۔ وہ مجھے کبھی واپس نہ آنے دیتے۔ اسٹیشن پر ہمارے ہر آدمی کی نقل و حرکت پر اُن کی نظر ہوگی، میں اُن کی نگاہوں سے کیسے بچ سکتا تھا۔ میں تو اُن کے لیے خوش بختی کا شگون بن جاتا۔ میرے ارادے اور عمل کے درمیان بس ایک لمحے کی دیوار رہ گئی تھی۔ خطا کاری ہی پشیمانی کا سبب نہیں ہوتی، اس کی نیت بھی کبھی کبھی آدمی کو اپنی نظروں میں بہت گراتی ہے۔ میں حیدرآباد میں رُک جانے یا دورانِ سفر اُن سے دُور ہو جانے کے نتائج کا تصور ہی کر سکتا تھا اور اِس تصور ہی سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا اور شاید کسی کو بھی نہیں تھا کہ حیدرآباد سے بہ سلامت واپسی ہم پر نگاہ رکھنے سے دست برداری نہیں ہے، اُن کے حوصلے کی پستی نہیں ہے۔

دیر سے کوئی اسٹیشن نہیں آیا تھا۔ گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی کہ یکا یک انجن نے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ سب ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے حالانکہ اُن میں سے کسی کی بھی آنکھ نہیں لگی تھی۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کے باہر جھانکا۔ دُور دُور تک آبادی کا نشان نہیں تھا، نہ آگے کسی اسٹیشن کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ آگے کوئی ہالٹ قسم کا اسٹیشن ہی ہو سکتا تھا جہاں سے سگنل نہیں ملا تھا۔ انجن مسلسل سیٹیاں دے رہا تھا، پھر رینگتے رینگتے گاڑی ایک ویران جگہ ٹھہر گئی۔ سب یک لخت کھڑے ہو گئے، دونوں طرف کے دروازے کھول دیے گئے۔ ڈبوں کے باہر اور اندر کی روشنیوں سے اردگرد کسی قدر اُجالا ہو گیا۔ آس پاس جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور اُن کے پار گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے دروازے سے سر نکال کے دیکھا تو برابر کے ڈبے کے دروازے پہ مجھے تجمّل کھڑا نظر آیا۔ مدھم روشنی کے باوجود میں اُسے خوب پہچان سکتا تھا۔ خود

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی موجودگی کی تصدیق کر دی۔ کسی نے اُن سے کچھ نہیں کہا تھا مگر سب جیسے اپنی اپنی جگہ پوری طرح چوکنا کھڑے تھے۔ ڈبّے کے دوسرے دروازے پہ پیرو اور جمرو چلے گئے تھے۔ اُنھوں نے اگلے ڈبّے کے دروازے پر زور آور کو کھڑے دیکھ لیا تھا۔ پیرو نے ہانک لگائی "جاگ رہے ہو سجنا!" پیرو کی آواز اتنی بلند نہیں تھی مگر سنّاٹے کی وجہ سے دُور دُور تک پہنچی ہوگی۔

اُدھر سے زور آور نے کوئی جواب دیا مگر میں اُس کی آواز صاف نہیں سُن سکا۔ اُسی لمحے شامو نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"لاڈلے!" اُس نے پوچھا۔ "چاقو ہے نا تیرے کنے؟"

"ہاں ہاں۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

اُس نے تین چار مرتبہ ناک سُڑسُڑ کی۔ "ہوا بہت گیلی ہے بھیّا۔ اپنے کو کوئی جنگل جان پڑتا ہے، بولو تو اُتر کے دیکھیں؟"

"نہیں۔" میں نے اُسے کہنی ماری۔ "ابھی ٹھہرے رہو۔"

"سالی بار بار ہانپنے لگتی ہے۔" شامو اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"ضرور کسی نے چین کھینچا ہوگا۔" میرے برابر کھڑے ہوئے مارٹی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے اُس سے نہیں کہا کہ زنجیر کھینچے جانے پر نہ تو انجن اتنی سیٹیاں بجاتا ہے، نہ گاڑی ایسے رینگتے ہوئے ٹھہرتی ہے۔ یہ تو کوئی اور بات ہے۔ دروازے پر میرے کھڑے ہو جانے کی وجہ سے راستہ بند ہو گیا تھا۔ مارٹی، شامو اور منگومری باہر آنے کے لیے بے قرار تھے، اُن میں سے کسی کو قرار نہیں تھا۔ کبھی وہ اِس کھڑکی سے سر نکال کے دیکھتے، کبھی اُس کھڑکی سے۔ یقیناً وہ کسی ایسی بات کا اعادہ نہیں چاہتے تھے جس کا تجربہ اُنھیں گزشتہ رات ہوا تھا۔ گزری ہوئی رات کا ایک ایک لمحہ اُنھیں زندگی بھر یاد رہے گا، زندگی تو دور کی بات ہے، ابھی تو صرف ایک دن گزرا تھا۔ ایک دن میں کلنتے کے جسم کی خراشیں اور اُبھر آئی تھیں۔ سرغنہ کے ہاتھوں کھائے ہوئے طمانچوں سے ابّا جان کا چہرہ کچھ اور سوج گیا تھا۔ پیرو، شامو، جمرو اور تجمّل جنھوں نے ضربیں کھائی تھیں اور باقی جو کھڑے دیکھتے رہے تھے، سب کی آنکھوں میں بیتی ہوئی رات کے مناظر اپنے پیچھے دو آدمیوں کی نگرانی کی نوید سُن کے کچھ اور اجاگر ہو جانے چاہئیں تھے۔ مارٹی نے صرف دو آدمیوں کی نشان دہی کی تھی، ضروری نہیں تھا کہ صرف دو ہوں۔ جن لوگوں نے اتنی بڑی نفری ابّا جان کی حویلی میں بھیجی تھی اُن کے پاس نہ مزید آدمیوں کی کمی ہوگی، نہ ہتھیاروں کی اور جب کہ چند ایک کو چھوڑ کے اُن کے سبھی آدمی صحیح و سلامت ہتھیاروں سمیت واپس پہنچ گئے تھے۔

کل رات اُنھیں حویلی سے کچھ نہیں مل سکا تھا، اب ایک اور کوشش کر دیکھنے میں اُن کا کیا جاتا تھا۔ اِس کے لیے یہ نہایت معتبر جگہ تھی۔ اُن کے خیال میں اگر واقعی ابّا جان کی تحویل میں نادر پتھروں کا کوئی ذخیرہ ہے تو وہ اُسے حویلی میں نہیں چھوڑ گئے ہوں گے اور ابّا جان بے شک تو اپنے ساتھ لے کے چل رہے تھے۔ اتنے ہمراہیوں کی موجودگی ہی اُن کے پاس زر و جواہر ہونے کی سب سے بڑی شہادت ہے، کوئی بھی بے سبب اتنا لاؤ لشکر لے کے نہیں چلتا۔ اُنھیں خوب آگہی تھی کہ ہتھیاروں پر ہماری دسترس کس درجے کی ہے۔ ممکن ہے اُنھیں اڈّوں سے ہماری وابستگی کا بھی کوئی علم ہو۔ چنانچہ اُنھیں اب کے نفری زیادہ بھیجنی چاہیے اور ہتھیار بھی زیادہ۔ ہر چند تلاشی کے لیے اب اُن کے سامنے ایک بڑی حویلی کے در و بام اور بے اندازہ ساز و سامان کے بجائے ریل کے دو مختصر ڈبے تھے اور مختصر سا زادِ راہ۔ یہاں تو تلاشی بہت آسان تھی۔ ہیروں کی پوٹلی ابّا جان کے پاس محفوظ ہی ہوگی، کہیں دل سے لگی۔ اُسے برآمد کر لینا اب اُن کے لیے لمحوں کا کام تھا۔ اِس بار وہ محتاط بھی پہلے سے زیادہ ہوں گے۔ حویلی جانے سے پہلے اُنھیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ خون خرابے سے حتی الوسع اجتناب کریں اور اپنی کوئی نشانی چھوڑ کر نہ آئیں جیسا کہ تجمّل کا قیاس تھا اور اُنھوں نے خود بھی کہا تھا، وہ ہمیں مارنے کے ارادے سے نہیں آئے تھے لیکن بھرے ہوئے ہتھیاروں سے چُوک بھی ہو سکتی تھی۔ ہتھیار اسی لیے ساتھ لائے گئے تھے کہ ہم صورتِ حال سمجھنے میں دیر نہ کریں اور ضرورت پڑے تو وہ اُنھیں کام میں بھی لا سکیں۔ ترازو میں تول کے آدمی نہیں بھیجے گئے ہوں گے۔ کسی ایک میں آگ زیادہ بھری ہو سکتی تھی تاہم ریل میں ایسی احتیاطوں کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ شامو اور مارٹی مضطرب انداز میں میرے پاس کھڑے تھے۔ جو باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں، وہی اُن کے ذہنوں میں بھی چکرا رہی ہوں گی۔

گاڑی رُکے ہوئے کئی منٹ گزر گئے۔ یہاں سے وہاں تک کوئی مسافر بھی نیچے نہیں اُترا۔ شامو سے تحمّل نہ ہو سکا۔ میرا بازو پکڑ کے اُس نے مجھے دروازے سے کھینچ لیا اور مجھ سے پوچھے بغیر نیچے اُتر گیا۔ "آگے تھوڑا موڑ ہے لاڈلے!" اُس نے اپنی آواز دبی رکھنے کی پوری کوشش کی۔ "سگنل اِدھر کہیں کو بھی دکھائی نہیں دے رہا۔"

آگے موڑ تھا تو سگنل کیسے دکھائی دے سکتا تھا۔ میں نے اُس سے اوپر آنے کو کہا مگر اُس نے سنی اَن سُنی کر دی۔ اردگرد جھاڑیوں میں سانپ اور زہریلے کیڑے مکوڑے بھی ہو سکتے تھے۔ اُس کی دیکھا دیکھی مارٹی بھی جھٹ نیچے اُتر گیا۔ اُن کے اُترنے کی دیر تھی کہ تجمّل سے آگے والے ڈبّے میں سے بھی ایک شخص نیچے اُتر آیا۔ مارٹی نے میرے پیر میں چٹکی بھر کے اشارہ کیا۔ میں نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا۔ مارٹی اور شامو کے کندھے سیدھے ہو گئے۔ اتنی دُور سے اُس شخص کی پہچان مشکل تھی۔ ڈبّے سے اُترنے کے بعد ایک ثانیے کے لیے اُس کا جسم لہراتا، بل کھاتا نظر آیا، پھر پُرسکون ہو گیا اور وہ اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔

"راجا استاد! ابھی بڑھے آگے کو؟" مارٹی رینگتی آواز میں بولا۔

"ابھی بولے تو بڑھ کے دیکھے؟"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اُس سے کیا کہوں۔

"اپن ابھی دادا استاد کے پاس جانے کا بولتا ہے۔" مارٹی نے دوسرے دروازے پر کھڑے ہوئے تھل کی طرف اشارہ کیا۔

اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کے دونوں آہستہ روی سے چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھ گئے۔ چند قدم بعد ہی وہ تھل کے سامنے کھڑے تھے "کیسا ہے ماسٹر؟" تھل کی نسبتہً تھکی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔

"ایک دم فرسٹ کلاس دادا!" مارٹی نے مستعدی سے جواب دیا۔ "اپن ایک دم......"

"آگے سالی لین میٹھی لگتی ہے۔" شامو نے مارٹی کی بات پوری نہ ہونے دی۔ "ادھر ساری مٹی گیلی ہے لگتا ہے، پورے دن پانی پیتی رہی ہے۔"

تھل نے سر ہلایا، کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"مٹی بہت نرم ہے اُستاد!" شامو مِن مناتی آواز میں بولا۔

"ہاں رے!" تھل نے سانس بھر کے کہا۔

"من کرتا ہے ادھر ہی ٹھکانا بنا دے۔"

تھل ہنکاری بھر کے رہ گیا۔

"گاڑی ابھی جلدی نہیں چلنے والی اُستاد!" شامو نے ٹوکتی آواز میں کہا۔

"لگتا ہے تجھ کو ادھر ہی چھوڑ کے جانا پڑے گا لالے!" تھل کے لہجے میں تندی آگئی۔ شامو بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ اُس کی آواز بھی اتنی دھیمی نہیں تھی، جب مجھ تک پہنچ رہی تھی تو اُس شخص کے کانوں میں بھی جا رہی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ شامو اور بے لگام ہوتا، میں اُسے قابو میں کرنے کے ارادے سے نیچے کود گیا لیکن اُتر کے میں اپنے دروازے سے آگے نہیں گیا۔

اسی اثنا میں اُس شخص نے اپنی جگہ سے پہلی مرتبہ حرکت کی اور ہماری طرف آنے کے بجائے مخالف سمت میں جانے لگا۔ وہ چند قدم آگے گیا ہوگا کہ شامو جھینپتی آواز میں کہنے لگا "حکم کرو اُستاد! قسم سے اپنے کو بس جھاڑی تک کھینچنا پڑے گا، بولو تو ابھی دو ایک کو......"

"اس کو ابھی اِدھر سے لے جا ماسٹر!" تھل نے تپیدہ لہجے میں مارٹی سے کہا، میں لپک کے اُن کے پاس پہنچ گیا، میں نے شامو کا بازو دبا کے خاموش ہو جانے کی تاکید کی۔ وہ آدمی چند قدم آگے جا کے پھر پلٹ پڑا۔ میرا گمان تھا کہ وہ چلتا چلاتا ہماری طرف بھی آئے گا لیکن وہ پہلے کی طرح اپنے ڈبے کے دروازے پر آ کے ٹھیر گیا۔ ہم سے لاتعلقی ظاہر کرنے کے لیے اُسے اپنی جگہ سے حرکت کرنا ہی چاہیے تھا۔

شامو کے چپ ہو جانے سے سکوت چھا گیا۔ ہم تینوں پہلو بدلتے یوں ہی تھل کے سامنے کھڑے رہے۔ "کالنتے بھائی ابھی کیسا ہے دادا؟" مارٹی نے شامو کی طرف سے تھل کا دھیان ہٹانے کے لیے پوچھا۔

"ٹھیک ہے رے۔" تھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

"ابھی ٹمپریچر تو نئیں ہے؟"

"بھُن رہا ہے سُور کا جنا۔"

مارٹی نے زبان بند کر لی۔ اچھا ہوا، وہ جلد ہی سمجھ گیا کہ تھل اس وقت بات کرنا نہیں چاہتا، اتنے دن ساتھ رہتے رہتے اتنا کچھ تو جا[نن]ا چاہیے تھا۔ مارٹی تو ویسے بھی اُس کے سامنے کم ہی زبان کھولتا تھا۔ ہم[اری] نظریں بار بار اُس آدمی پر منڈلا رہی تھیں جو ہم سے زیادہ دور نہیں [تھا۔ میں] اُسے نہیں جانتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی دوسرا ہی مسافر ہو۔ تھل اور ما[رٹی کے] سوا اُن دو آدمیوں کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال مارٹی کے انداز سے یہ[ی ظاہر] ہوتا تھا کہ اُس نے اُسے پہچان لیا ہے۔ وہ آدمی وہیں ٹھیرا رہا۔ اتنی دیر میں [دوسرے] ڈبوں سے بھی چند مسافر اُتر آئے تھے۔ گاڑی ٹھیرے دس پندرہ منٹ [ہو] گئے تھے۔ اندھیرا اب کچھ کچھ نگاہوں کو مانوس لگنے لگا تھا، متعدد لوگ آ گئے تھے اور گاڑی رُکنے کا سبب جاننے کے لیے ایک دوسرے سے پوچھ[تاچھ] کر رہے تھے، مختلف آوازوں نے فضا کی ویرانی بڑی حد تک دور کر دی [تھی۔ اُس] طرف کوئی نہیں آیا اور نہ شاید اب کسی کے آنے کا امکان تھا۔ اگر گاڑی ٹھیرائی گئی تھی تو اب وقت بہت گزر چکا تھا۔ مسافر جاگے ہوئے تھے۔ ہم آدمی نیچے تھے اور راجا جان، منیر علی اور کالنتے کو جھ... پر مستعد کھڑے تھے۔ جیسے ہی گاڑی ٹھیری تھی اور آس پاس گھنی جھا[ڑیاں] نظر آئی تھیں، جانے کیوں میرے ذہن [میں] یہ شبہ ابھرا تھا کہ کہیں وہ انھی [جھاڑیوں] میں نہ چھپے ہوئے ہوں اور اچانک ہمارے ڈبوں پر یلغار نہ کر دیں۔ ایسے ج[انے کتنے] اندیشے، کتنے بے سروپا وہم میرے سر میں اُمڈ رہے تھے۔ کہتے ہیں کبھی [کبھی] اپنی آہٹ، اپنے سائے پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ گ[اڑی] ٹھیر جانے سے جیسے رات ٹھیر گئی تھی۔ رات ہی کا وقت اُن کے لیے سب[سے موزوں] تھا۔ یہاں نہ سہی تو کسی اور جگہ، اور ابھی اُس جگہ کے بارے میں یقین سے [کچھ کہا نہیں] جا سکتا تھا۔ رات کا بڑا حصہ ابھی باقی تھا اور ہم کچھ بھی نہ جان پائے [تھے۔ ہم] کچھ بھی طے نہیں کر سکتے تھے۔

ہم تینوں تھل کے سامنے سے ہٹ آئے اور اپنے ڈبے سے گز[ر کے آگے] بڑھتے گئے۔ تھل کے پاس بھی کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا، اس لیے اُس[نے ہمیں] روکنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ہم دو ڈبوں سے آگے چلے گئے تھے کہ مارٹی ب[ے چین] لہجے میں بولا۔ "راجا اُستاد! حکم کرے تو ابھی اپن اور شامو اُسی کے [ڈبے] میں جانے کا ٹرائی کرے؟ ایدر گاڑی اسٹارٹ ہوگا، اُدھر اپن ڈبا پکڑے گا، شک بھی کوئی نئیں پڑے گا۔"

"کیا وہ وہی آدمی ہے؟"

"ایک دم راجا، سینٹ پرسینٹ۔"

"پر تم وہاں جا کے کیا کرو گے؟"

"اپن، اپن دیکھتا ہے ابھی اُدھر وہی ہے یا اور، اور......"

"باقی دوسرے ڈبوں میں بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے پر......" مارٹی سے جواب نہ بن پڑا، وہ کسمسا کے رہ گیا۔

ہم زیادہ دور نہیں گئے، تیس چالیس قدم تک جا کے پھر اپنے ڈبے کی طرف لوٹ پڑے۔ واپسی میں ہم نے دیکھا کہ وہ آدمی ابھی تک اُسی جگہ کھڑا ہے اور سگریٹ پھونک رہا ہے۔ ہماری رفتار رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی رفتار سے کوئی نسبت نہیں رکھتی تھی۔ اُس پر یہ جبری سست گامی اور خون کھولانے لگی تھی۔ ہم نے ابھی تیسرا پھیرا لگایا تھا اور اپنے ڈبے سے دور تھے کہ ناگہاں انجن نے سیٹی بجا دی۔ ہم تینوں اچھل سے پڑے۔ میری طرح اُن دونوں کو بھی اپنے کانوں پر شبہ ہوا ہوگا اور اُن کے دل زور سے دھڑکے ہوں گے۔ گاڑی نے سیٹی بجاتے ہی گڑگڑاہٹ سے کھسکنا شروع کر دیا۔ نتیجتہً ہم نے تیز قدموں سے چل کے اپنا ڈبا پکڑا۔ وہ آدمی پہلے ہی اندر جا چکا تھا تاہم گاڑی کی رفتار تیز نہیں ہوئی تھی، گاڑی چوں چوں کرتی، لڑکھڑاتی ہوئی سی بڑھتی رہی۔ کچھ دور بعد وہ موڑ بھی آ گیا جس کا ذکر شامو نے کیا تھا۔ موڑ سے خاصے فاصلے پر ریلوے لائن کی مرمت ہو رہی تھی اور ارد گرد لالٹین تھامے بہت سے مزدور کھڑے تھے۔ گاڑی مخدوش حصے سے چیونٹی کی چال سے گزرتی رہی، رفتار اتنی سست تھی کہ آدمی نیچے جا کے بہ آسانی اوپر آ سکتا تھا۔ دوسرے ڈبے کے دروازے پر تھل بھی کھڑا رہا۔ ہم دروازے سے اُس وقت تک نہیں ہٹے جب تک گاڑی نے رفتار نہ پکڑ لی۔ اب وہاں کھڑے رہنے یا دروازے کھلے رکھنے سے کیا حاصل تھا۔

اندر برتھوں پر سب یوں ہاتھ پاؤں بکھیر کے بیٹھ گئے جیسے بھاگتے بھاگتے تھک کے چور ہو گئے ہوں۔ بہت دیر میں جا کے اُن کی سانسیں استوار ہوئیں اور میں یہ دیکھ کے چونک پڑا کہ سامنے کی برتھ پر پیرو کے ہاتھ میں تمنچا موجود ہے۔ اُس نے اُس کا چیمبر کھول کے گولیاں نکالیں اور اندر باہر پھونکیں مار کے گرد صاف کی، کُرتے کے دامن سے اُسے چمکایا اور کھٹکا دبا کے دیکھا۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ رات حویلی میں آنے والے آدمیوں کو اُن کے سارے ہتھیار خالی کر کے واپس کر دیے گئے تھے البتہ چار تمنچے روک لیے گئے تھے تاکہ واپسی میں بھاگتے وقت کسی کا دماغ نہ پھر جائے، وہ نشانے ہی پر رہیں۔ ایک تمنچا جمرو کے پاس بھی تھا، پیرو نے اپنا تمنچا صاف کرنے کے بعد اُسے بھی قبضے میں لے لیا۔ باقی دو تمنچے دوسرے ڈبے میں تھل اور رنورا کے پاس بھی ہونے چاہئیں، یہ دو بھی اُنھوں نے ہی پیرو کے حوالے کیے ہوں گے۔ پیرو کے پاس پہلے سے ہوتے تو ضرور نظر آ جاتے۔ دوسری طرف کے دروازے پر پیرو اور جمرو ہی کھڑے تھے، زور ابھی اُسی طرف تھا۔ ہمارے نیچے جانے کے دوران یہ تبادلہ عمل میں آیا ہوگا۔ اُنھیں دیکھ کے بہرحال مجھے سکون سا ملا لیکن پھر میری رگیں اور کھنچنے لگیں۔ تمنچے نکل آنا کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پیرو کو ان کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ دوسرا تمنچا صاف کر کے پیرو نے میری طرف اُچھال دیا۔ میں نے سٹ پٹاتے ہاتھوں سے تمنچا اُچک لیا، فرش پر نہیں گرنے دیا لیکن تمنچا ہاتھ میں آتے ہی میرا سارا جسم ایک لمحے کے لیے سُن ہو گیا، میری آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا۔

گاڑی نے رفتار کچھ اور تیز کر لی تھی۔

پیرو اپنی برتھ پر لیٹ گیا تو جمرو اُٹھ کے ہماری برتھ پر آ گیا۔ سب کے منع کرنے کے باوجود ٹنگو اور مارٹی بھی ہمارے سامنے رہنے کی خاطر فرش پر بیٹھ گئے۔ مارٹی نے مشورہ دیا کہ نواب حشمت جنگ نے زادِ راہ کے لیے جو ٹوکرے ساتھ کیے تھے، اُن میں سے ایک ہمارے ڈبے میں بھی ہے، کیوں نہ اُسے کھول کے دیکھا جائے۔ مارٹی کا مطلب محض وقت گزاری تھا، کیوں کہ وقت کٹ نہیں رہا تھا مگر جمرو کو شوشہ مل گیا، آنکھ مار کے بولا۔ "کیوں ماسٹر! بہت لگ رہی ہے سالی؟"

"کیسا، کیسا" مارٹی گھبرا کے بولا۔ "اپن تو تم، تمھارے لیے......"

"میں بولتا تھا، یہ ماسٹر کا منہ سالا کیوں تھوبڑا پڑا ہوا ہے۔ ابھی پتہ چلا کہ سالی پانی کی سوجن ہے۔ ماسٹر کے منہ میں پانی بھرا ہوا ہے۔" جمرو چلبلے پن سے بولا۔

"اپن، اپن کا مطلب ایسا ایک دم......"

"نئیں نئیں کھول لے ماسٹر! کھول لے۔" شامو نے پچکارتے ہوئے لقمہ دیا۔ "قسم سے جب سے ٹوکرا اِدھر کو آیا ہے، سالا پورے ڈبے کو لپٹ مار رہا ہے۔"

"پہلے سے بول دیتا، اپنے کو۔" جمرو ہنس کے بولا۔ "جا مار لے منہ، نواب کا مال ہے، گھی ہی گھی ہوگا۔"

"تم لوگ کیسا، کیسا بولتا ہے؟" مارٹی نے احتجاج کیا۔

"ارے دیکھ رہے ہو جمرو بھائی!" شامو دیدے نچاتے ہوئے بولا۔ "اپنے ماسٹر کا مکھڑا کیسا گلابی ہو رہا ہے، بلشر شر مار رہا ہے، ہائے ہائے پٹ بجا، لیو ذرا میرا دوپٹا......"

مارٹی دُہرا ہو گیا۔ جتنا وہ نادم ہو رہا تھا، اُتنا ہی زیادہ وہ اُسے چھیڑ رہے تھے۔ مارٹی بڑی بڑی باتیں ہنس کے سُن لیتا تھا پر اس وقت جانے اُسے کیا ہوا، وہ رو ہانسا ہو گیا۔ ٹنگو نے ستم یہ کیا کہ جھٹ اُٹھ کے ٹوکرے میں سے مٹھائی کے چند دانے لے آیا اور پلیٹ مارٹی کے سامنے کر دی۔ مارٹی جھنجلا گیا اور اتنی زور کا ہاتھ مارا کہ پلیٹ چکنا چور ہو گئی، مٹھائی کے ٹکڑے ہر طرف بکھر گئے، ریزے ہم پر آ کے گرے۔ سب کھِل کھلا رہے تھے مگر پھر سب کو چپ لگ گئی۔ پلیٹ کا چھناکا سُن کے پیرو بھی اُٹھ بیٹھا مگر ایک نگاہ ہم پر ڈال کے پھر آنکھیں موند کے لیٹ گیا۔ میں نے اِدھر جمرو اور شامو کو ٹھوکا دیا، ٹنگو پہلے ہی مارٹی کے عتاب سے بچنے کے لیے میرے پیچھے آ گیا تھا۔ اُدھر میں نے مارٹی سے عاجزی کی کہ یہ سب تو مذاق تھا، وہ اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گیا۔ جمرو اور شامو نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی تھی جس کا اتنا بُرا مانا جائے۔ میری بات سُن کے مارٹی ہونٹ کاٹنے لگا۔ میں اگر درمیان میں نہ پڑتا تو کوئی بعید نہ تھا کہ وہ آپس میں اُلجھ جاتے۔ مارٹی کے تیور اچھے نہیں تھے۔ جمرو اور شامو کے چہرے بھی بگڑنے لگے تھے۔ بہرحال میرے اشارے پر اُنھوں نے مارٹی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ پہلے تو مارٹی ضد کرنے، مچلنے لگا، پھر اُس نے سر جھکا لیا۔ میں جانتا تھا کہ مارٹی نے سر کیوں جھکا لیا ہے۔ وہ اُن سے اپنی

بھری ہوئی آنکھیں چھپا رہا تھا۔ اتنی سی بات پر مارٹی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔
سب کا کم و بیش یہی حال تھا۔ پیرو نے اپنے پیر دبانے پر ٹِنگو کو جھڑک دیا تھا۔ ڈبّے سے اُتر کے اُس آدمی کو دیکھنے کے بعد شامو اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ جھل اُس کی معمول باتوں پر کیسا برافروختہ ہو گیا تھا اور اب مارٹی کا پیمانہ چھلک پڑا تھا۔ میں اُن کی تندی و تنک مزاجی کا سبب خوب سمجھتا تھا لیکن کیا کر سکتا تھا؟ دعا کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ بس کسی طور وہ خیریت سے بمبئی پہنچ جائیں، سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ بس یہ آخری بار ہے۔ اس کے بعد یا تو میں ان کے سامنے ہی کم آیا کروں گا یا ان سے کہیں دُور بہت دُور چلا جاؤں گا۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے لیکن صرف زبان سے کہنا ہی تو کچھ نہیں ہوتا۔ اُن کے چہروں پر چھائی ہوئی وحشتیں سب کچھ کہتی تھیں۔ تبّت میں ہم نے اُنھیں موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ چار راستے میں ختم ہو گئے۔ کلکتے میں پولیس والے سنگینیں اور زنجیریں لیے کھڑے تھے۔ نہ جھل اڈّے سے ہٹتا نہ رتنا کلکتے میں کبن میاں سمیت گیارہ آدمی ختم کرنے کی سرکشی کرتا۔ یہاں حیدرآباد میں آکا موجود تھا۔ کتنے دنوں تک وہ دم سادھے حاکم کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ اُس غیر اڈّے پر پورے چند دن تک زغے میں بیٹھے رہے، ہاتھ پاؤں توڑے ہوئے۔ صرف اس لیے کہ مجھے اور پیرو کو نواب کے زنداں میں کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ نہ صبح نہ شام۔ ایک ہی دن کا اُجالا، پھر وہی اندھیرا۔ بڑے نواب کی حویلی میں چند دن کا سکون ملا تھا۔ اگر چھوٹے نواب کی موت کے بعد اُسے سکھ کہا جائے۔ وہاں سے آتے ہی ایک پہر بھی گزرا تھا کہ ہتھیار بردار اُن کے سروں پر موجود تھے۔ آدمی اپنی مرضی اتنی دیر تک ترک نہیں کرتا۔ اُن کا اپنا نہ کوئی ارادہ رہا تھا، نہ اختیار۔ وہ اتنی تعمیل کے عادی نہیں ہیں۔ اُنھوں نے آخر کیا قصور کیا ہے؟ اس سے زیادہ ان کا حوصلہ نہیں آزمانا چاہیے۔ کسی کے لیے کوئی اس سے بڑھ کے کیا کر سکتا ہے۔ آدمی اپنی بساط سے زیادہ کیا کر سکتا ہے۔

کوئی چھوٹا اسٹیشن آ کے گزر گیا تھا۔ سب پہلے کی طرح ہتھیاروں کے علاوہ اپنے حواس اور اعصاب مجتمع کر کے کھڑے ہو گئے لیکن گاڑی اُس غیر آباد اسٹیشن پر ایک دو منٹ ٹھہر کے پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔ ٹِنگو نے جگہ جگہ بکھرے ہوئے ریزے فرش سے چُن لیے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب اور آمنے سامنے رہنے کے لیے سب چادر بچھا کے فرش ہی پر بیٹھ گئے۔ جمرو میرے پہلو سے چمٹا ہوا تھا۔ معاً اُسے جیسے کوئی بات یاد آ گئی۔ چونک کے مارٹی سے پوچھنے لگا۔ "ماسٹر! تُو نے اُن سُوّر کے جنوں کو نزدیک سے دیکھا تھا، کینڈا کیا تھا اُن کا؟"
"کینڈا؟" مارٹی پلکیں جھپکانے لگا۔
"اپنا مطلب ہے کھانچا، اوپر سے نیچے تک کا نقشہ۔"
"اپن پہلے نہیں بولا؟" مارٹی منتشر آواز میں بولا۔ "ایک بند گلے کا واسکٹ میں تو دوسرا شیروانی ڈالے پڑا تھا۔ دونوں کا کلر سالا ہاف بلیک اینڈ فور ٹی کے اندر اور تھرٹی سے اوپر کا ہے۔ اپن کو ابھی شہر ہی کا لوگ لگتا ہے، حیدرآبادی۔"
"آدھا گورا، آدھا کالا سالا کیا بولتا ہے؟" جمرو منہ بنا کے بولا۔ "سیدھی زبان میں بات کیا کر ماسٹر!"
"ساری جمرو بھائی! اپن ساری بولتا ہے۔" مارٹی معذرت خواہانہ بولا۔ "اپن ابھی کیا کرے، سالا منہ سے نکل جاتا ہے۔"
"ہم نے پوربیا شروع کر دی تو سالا بھاگ جائے گا۔"
"یہ عمر کے بارے میں کہہ رہا تھا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "مارٹی کہہ رہا ہے کہ دونوں کی عمریں تیس سے چالیس کے درمیان ہوں گی۔"
"اتنی گٹ پٹ اپنے کو بھی آتی ہے۔" جمرو نے ناگواری سے کہا۔ "فیض آباد میں رہتی تھی، رہتی بھی کیا، اب بھی وہیں رہتی ہے۔ نواب اصغر پڑھ کے ولایت سے پلٹا تو ساتھ میں اُس پری کو بھی لایا۔ کیا بولیں، کہ اوپر والا اُس کو کلیجے سے بنایا ہے۔ لگتا ہے سارا مکھن اور شہد اُس میں گھول دیا۔ گلبا، مار، ہاتھ لگاؤ تو لالی چھوٹے۔ پان کھائے تو گردن سے جھلکے۔ نواب کے پاس پہلی کو مال پانی کے لیے جانا ہوتا تو اُس سے ضرور بھینٹا ہوتا تھا۔ تھی، ہائے جمرو! ہاؤ آر یو؟ ٹم کیسا ہے؟ اصغر ہم کو بولتا ہے ٹم ایک فسٹ کلاس بہادر آدمی ہے۔ چاقو چلانا جانتا ہے، ہم بھی ..."
"ہر بار ایسا ہی بولتی تھی جمرو بھائی!" شامو چہک کے بولا۔
"ہاں رے ہر بار۔" جمرو نے تیزی سے کہہ تو دیا پھر فوراً شامو کے کا تیکھا پن اُس کی سمجھ میں آ گیا۔ بپھر کے بولا۔ "تُو کیا سمجھ رہا ہے، ہم جھوٹ بولتے ہیں کیا؟"
"ایمان سے جمرو بھائی!" شامو نے مچل کے کہا۔ "تم کدھر کو لے گئے؟ مطلب ہے کہ ہر بار جاتے ہو گے تو نئی بات بولتی ہو گی۔"
"بار بار ایسا نہیں بول سکتی کیا؟" جمرو غصّے سے بولا۔
"نہیں تُو مذاق سمجھ رہا ہے، سمجھ رہا ہے کہ ہم جھوٹ بولتے ہیں، ہم میں رعب مار رہے ہیں۔ اب کے فیض آباد آنا تو ہم تجھ کو لے چلیں گے۔ سالا آنکھ نہیں اُٹھا سکے گا، ایک جھلک میں ٹیں ہو جائے گا۔"
"تم آگے کی بات کرو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔
"آگے اب کیا بولیں، سالے نے بات کو کھاد کر دیا۔"
"نہیں نہیں جمرو بھائی! قسم سے، اب منہ سے کچھ بھی پھوٹے تو جو کرلینا۔" شامو لجاجت سے بولا۔
میں نے بھی ایک بار دبے لہجے میں کہا مگر جمرو آمادہ نہیں ہوا۔ اُسے ٹوک کے بُرا کیا، اُس نے غور نہیں کیا۔ جمرو کی آواز جھلملانے لگی تھی۔ جمرو بھی اپنے بارے میں کم کسی سے بات کرتا تھا۔ آج کیا بات تھی، جو وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ اس طرح وقت بھی کچھ ٹل جاتا۔ جمرو ایک ضدی تھا۔ زیادہ اصرار بھی مناسب

میں نے اُن کا تکدّر دُور کرنے کے لیے مارٹی سے پوچھا۔ "کاٹھی کیسے ہیں وہ؟"
"بس ٹھیک ہے راجا استاد!" مارٹی نے تن دہی سے جواب دیا۔
"اندھیرے میں دُور سے ایک کو دیکھا تھا، بیچ کا بدن لگتا ہے۔" شامو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کے میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا۔ "استاد نے دھیان نہیں دیا لاڈلے!" شامو اُسی سے کہنے لگا۔ "ایک کا جھٹکا تو اُسی وقت ہو جاتا۔"
"کیسے؟ کیسے ہو سکتا تھا؟" میں نے تلخی سے کہا۔
"ہو سکتا تھا۔ میں نے ہر طرف دیکھ لیا تھا۔ تبھی استاد سے بولا تھا۔ جیسے ہی وہ حرام زادہ نیچے اُترا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے دوسری طرف گیا تھا، ویسے ہی میں کسی بہانے سے اُسے اپنے ڈبّے کی طرف بلاتا۔ اُس کا باپ آتا۔ بس اُس کے آنے کی بات تھی۔ گردن پر صرف ایک اُلٹا ہاتھ پڑتا تو بولتی بند ہو جاتی۔ پھر ڈبّے کے نیچے لائن پر ڈال اپنے لیے ذرا بھی جوکھم کا کام نہیں تھا۔ تم اور مارٹی بھی ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایک منٹ میں معاملہ تلپٹ ہو جاتا۔ آڑ کی ضرورت نہیں تھی۔ پیرو اور مارٹی آڑ کا کام کرتے۔ اُس وقت ہر طرف اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھی مشکل سے سُجھائی دیتا تھا۔ ڈبّے سے ہم لوگ کے سوا اُس وقت تک کوئی اترا بھی نہیں تھا۔ اگر وہ خالی دو ہی ہیں تو اُن میں سے ایک رہ جاتا۔"
"اور اگر وہ دوسرا کھڑکی سے اپنے ساتھی کی نگرانی کر رہا ہوتا؟"
"اندھیرا بہت تھا لاڈلے!" شامو بے چینی سے بولا۔ "اپنے ساتھی کے اَتے پتے کی جانکاری کے لیے اُس کو نیچے آنا پڑتا۔ یہ تو اور بھی اچھا ہوتا۔ پھر اُسے جانے کون سالا دیتا۔ اور اِدھر اُدھر ڈبّے کے نیچے پٹری پر جھانک کے کون دیکھتا کہ اندر آدمی پڑا ہے۔"
شامو کا دماغ چل گیا تھا۔ میں نے اُس سے بحث نہیں کی۔ اوّل تو اِس کے لیے ضروری تھا کہ وہ صرف دو ہوتے، دوسرے گاڑی ٹھہرنے کے وقت کا تعیّن ضروری تھا۔ شامو کو دونوں باتیں معلوم نہیں تھیں۔ ویسے بھی یہ ایک نہایت بے محل اور عاجلانہ اقدام ہوتا۔ شامو ضربوں کا ماہر تھا لیکن ایسے موقع پر اتنا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ ضرب ذرا سی ترچھی یا اوچھی بھی پڑ سکتی تھی۔ وہ شخص شامو کے اشارے پر بے سوچے سمجھے چلا بھی نہ آتا۔ اندھیرا جس طرح شامو کے لیے مفید تھا، اُسی طرح اُس کے مقابل کے لیے بھی سود مند ہوتا۔ کل رات کے تجربے کے بعد آج اُنھیں ہتھیار کے بغیر نہیں بھیجا گیا ہو گا۔
کچھ توقف کے بعد شامو بولا کہ اگر میری اجازت ہو تو وہ ایک اور کام کر لے۔ وہ چلتی گاڑی میں چھت چھت ایک سرے سے دوسرے سرے تک آسانی سے جا سکتا ہے۔ جہاں وہ آدمی اُترا تھا، وہ ڈبّا تو بہت قریب ہے۔ درمیان میں صرف جھل کا ڈبّا ہے۔ بوگی تو ایک ہی ہے، بیچ میں دیواریں ڈبّے تقسیم کرتی ہیں ...

نہیں اُٹھانا پڑے گی۔ وہ چھت سے اُتر کے جب دروازے پر بُری طرح دستک دے گا تو ڈبے کا کوئی شخص دروازہ ضرور کھولے گا۔ وہ اُن سے کہہ کے دوسرے اسٹیشن تک وہاں بیٹھنے کی اجازت حاصل کر لے گا۔ دروازے پر دستک دینے کا مناسب وقت کسی اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہو جانے کے فوراً بعد ہی کا ہو سکتا ہے۔ ڈبے کے لوگوں کو اسی طرح یہ تاثر دیا جا سکتا ہے کہ رفتار تیز ہو جانے کے سبب وہ اپنے ڈبے تک نہیں پہنچ پایا۔ وہ احتیاطاً تمنچا ساتھ لے جائے گا، اگر ڈبے میں دو ہی دو آدمی ہوئے تو انھیں وہیں ڈھیر کیا جا سکتا ہے ورنہ اس دوران میں اُسے اُن لوگوں کو قریب سے دیکھنے اور اُن کے ارادے بھانپنے کا موقع تو مل ہی جائے گا۔"

"نہیں رے" مجھے کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جمرو دھتکارتے لہجے میں بولا۔ "ابھی سے یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"ابھی سے تو یہ ٹھیک ہے، پھر چڑیاں کھیت نہ چگ جائیں۔" شامو بھی سے کہنے لگا۔ "اپنے کو پہلے ہی سے کام ڈال دینا چاہیے۔"

"ابھی اپن کچھ بولے؟" مارٹی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے ماسٹر! ماسٹر کو ضرور دُور کی سوجھی ہے۔"

"ابھی اپن کے مغز میں ایک بات آتا ہے۔" مارٹی سب کی طرف پُر اُمید نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اپن کے پاس زیادہ لگیج تو نہیں ہے۔ یہ ٹوکرا بھی اپن اِدھر ہی چھوڑ جائے گا۔ ابھی کوئی بڑا اسٹیشن آئے تو اپن بالکل لاسٹ ٹائم پہ گاڑی سے اُتر جائے۔ دیکھتا ہے پھر وہ کتنے کا بچہ اپنے ساتھ اُترتا ہے کہ نہیں۔ اپن دوسرا کسی ٹرین سے ممبئی کے لیے روانگی کرے گا۔" کسی نے کچھ نہیں کہا، سب مارٹی کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ مارٹی کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ "اپن کا بات دھیان سے سنا جمرو بھائی! اپن پہلے ایک ایک کر کے ڈبے سے کھسکے گا، پھر جب چلنے کو ریڈی ہوگا، اپن کا باقی لوگ بھی ڈبے سے اُتر آئے گا، سمجھا کہ نہیں۔"

"ماسٹر کوڑی تو دُور کی لایا ہے۔"

"لیکن کانتے بھائی کا کیا ہوگا۔ اُس کو بخار چڑھا ہوا ہے، وہ نہ تیز اُتر سکتا ہے نہ تیز چل سکتا ہے۔" ٹنگو نے کہا۔

"پہلے آہستہ چلے، دھیرے سے اُترے۔ ابھی کون اُس سے تیز چلنے کو بولتا ہے۔ اپن کا بات سمجھو، اپن ایک دم مانڈا چینج کرے گا تو سالا کھوجی لوگ ایک بار کو تو گھوم جائے گا۔"

"اور اگر وہ بھی اپنا سامان چھوڑ ساتھ اُتر گیا؟"

"اُترتا ہے تو اُتر جائے۔"

"پر بات تو وہی ہوئی میرے راجا۔"

"پر سامنے تو سب آ جائے گا جمرو بھائی! کیا بولتا ہے اُس کو، دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔"

"اگر دیکھنے اور جاننے کی ٹھرکی ہے تو اس کے اور بھی رستے ہیں۔" شامو تمتماتے لہجے میں بولا۔ "اپنے میں سے کوئی بھی کسی بڑے اسٹیشن پر ایک کے آگے گھٹالا کر دے۔ بس ایک ٹنگیا اڑانے سے بھڑکا ہو جائے گا۔ ہاتھ پیر کے ساتھ ذرا اُٹھانا پڑے گا کہ سارا اسٹیشن اپنی طرف ہوگا۔ دیکھتے ہیں پھر کون را دن کا منہ چھپاتا ہے۔ ایک ایک کر کے سالا سب سامنے آ جاوے گا۔"

جمرو نے شامو کی نقل اتاری اور زہرخند سے بولا۔ "لاڈلے! اِدھر بریلی قریب پڑتا ہے کہ آگرہ شہر؟"

"دونوں دُور ہیں۔"

"کیوں، بہت یاد آ رہی ہے جمرو بھائی گھر کی؟" شامو ٹھنک کے بولا۔

جمرو کے زبان کھولنے سے پہلے ہی میں نے مفاہمانہ لہجے میں اُن سے کہا۔ "سرِدست ہمیں ٹھل بھائی ہی کے مشورے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ لازماً جلد ہی گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھہرے گی اور دیر کے لیے ٹھہرے گی، وہیں دیکھیں گے کہ کون [illegible] مناسب ہے۔"

"راجا استاد ایک دم ٹھیک بولتا ہے۔ استاد نے چُپ رہنے کا بولا کچھ سوچ کے ہی بولا ہوگا۔" ٹنگو نے بھڑکتی آواز میں میری تائید کی۔ "اُن [illegible] بنا اپن کو......"

"ہاں ہاں نٹ راج استاد کی دُم۔" جمرو نے پڑائی سے [illegible] "پتہ ہم کو تجھ سے زیادہ ہے۔"

"اپن کا من کرتا ہے۔ ابھی اپن کو اجازت ملے تو۔" مارٹی نے حسرت [illegible] آواز میں کہا۔ "اور کچھ نہیں تو ابھی اپن اپنے ہاتھ کا تھوڑا اڑائی کر لے۔ [illegible] دن ہو گیا، سالا زنگ نہ مار گیا ہو۔ بولے تو ابھی کوئی بڑا اسٹیشن آ [illegible] صفائی دکھاوے۔"

"پاکٹ!" جمرو بیٹھے بیٹھے اُچھل گیا اور بے اختیار ہنسنے لگا۔ "[illegible] ہاتھ صاف کرنے کو بولتا ہے ماسٹر!"

"ایک دم! اپن ابھی منہ سے کیا بولے، اودر ممبئی میں اپن کا بس [illegible] ہی بہت ہوتا تھا۔ ایدر گیا تو اودر ساتھ ہی کچھ لایا۔ اپن کم ہی خالی [illegible] آتا تھا۔"

"شامو کے سامنے اتنا بڑھ کے مت بول۔"

"بڑھ کے نئیں بولتا جمرو بھائی! اودر اپن کا دُور دُور فیم تھا [illegible] سے لوگ اپن کا پاس پاکٹ آرٹ سیکھنے کو آتا تھا، پر سیکھنا اور بات [illegible] کا دوسرا۔ آدھا آرٹ سونگھنے کا ہوتا ہے۔ اپن ٹین فیٹ ایدر سے سونگھ [illegible] دیتا تھا کہ آدمی خالی چلتا ہے کہ مال پانی ساتھ۔ بائی گاڈ، اپن ایسا [illegible] واپس نئیں آنے کا۔ اپن اُن لوگ کو دیکھ کے آیا ہے۔"

"اور اگر ہاتھ اُلٹ پڑ گیا بابو؟"

"ایسا نئیں سوچو جمرو بھائی! اپن ہاتھ کاٹ ڈالے گا۔ ہاتھ بعد میں کٹے گا، اِدھر پھندا پہلے گلے میں پڑ جائے گا سسر!"

"اپن کچھ جان کے ہی بول رہا ہے۔ ایدر سے اپن جائے، اودر سے سیکنڈ [illegible]ل پرٹ کے پاس شامو بھائی۔ دونوں کا پاکٹ ابھی ایک ساتھ خلاص ہو جائے گا [illegible]ن۔" مارٹی مچل کے بولا۔ "تھوڑا مستی رہے گا جمرو بھائی!"

جمرو نے ہونٹ سکوڑ لیے اور درشتی سے بولا۔ "ماسٹر کو ایسے میں مستی کی سُوجھ رہی ہے لاڈلے! اپنے کو یہ سب گھومے ہوئے لگتے ہیں۔ تُو نے دیکھا اُس [illegible]ے نکٹ جائے گا یہ ممبئی کا اُستاد جو اس پہ پہلے ہی نظر ڈالے ہوئے ہے۔" جمرو بالکل درست کہہ رہا تھا۔

مارٹی بچوں کی طرح اُڑنے لگا۔ "اپن جانتا ہے پر اپن اس میں ہی کام [illegible]ھا کے آئے تو بولو، کیا دے گا؟"

"کہاں میں رہ ماسٹر!" جمرو نے بیزاری سے کہا۔

"تم کو یقین نئیں آتا، کیسا آئے گا۔ ابھی ممبئی کو ہی جانا ہے، جا کے اودر [illegible]سی کو پوچھنا، مارٹی پاکٹ اسٹار کون تھا اور پوچھنے کا کیا ہے۔ اپن کا راجا استاد [illegible]ٹ نیں کے لیے ایدر ہی بیٹھا ہے۔ مارٹی نے اُس دن سے اپنا پاکٹ کے سوا کسی [illegible]و ہاتھ نہیں لگایا جب سے اپن کو راجا ملا۔ وہ پاکٹ مار اُسی دن ڈیڈ ہو گیا تھا، [illegible]ب راجا استاد مارٹی کی لائف میں انٹر ہوا تھا، اس کو دیکھنے سے اپن کو ایسا لگا [illegible] جیسا اپن پاکٹ مار نئیں، چمار ہے سالا۔"

"کتنا سچ بولتا ہے ماسٹر!" شامو درمیان میں بولا۔

"ہاں ہاں، اپن کو سچ بولنا اُسی ٹائم سے آیا۔ اپن کو اُس دن سے معلوم ہوا [illegible]ہ اپن تو سالا ایک دم تھرڈ کلاس آدمی ہے، آدمی کیا، اُلو کا پٹھا ہے۔ ابھی اپن کیا جانتا ہے اپن کائے پہ بوم مارتا ہے، پاکٹ ماری پہ؟ اُسی دن اپن نے ڈسائڈ کر لیا تھا، قسم ہے ہولی فادر کی کہ اب راجا استاد سے کچھ جان کے ہی فیلڈ میں آئے [illegible]۔ راجا ایک کے کھو گیا تھا، اپن بہت خوار ہوا۔ اکھا ممبئی میں گلی گلی راجا کو کھوجتا رہا، چرچ جا کے دعا کیا۔ ایک ایک آدمی سے پوچھتا تھا، تم نے اپنے راجا کو دیکھا ہے؟ لوگ اپن کو پاگل بولنے لگا تھا، پھر ایک دن اپنا لاٹری نکل آیا، راجا اپنے کو مل گیا۔ راجا کیا ملا، اپن کو بس اپن مل گیا۔ اُس دن مارٹی نے نیو جنم لیا۔ اپن راجا کے پیر پڑ گیا کہ ابھی ایدر سے نئیں جانے کا، کبھی نئیں جانے کا۔ راجا دل کا راجا ہے، مان گیا۔ [illegible]ن کے پاس آ کے اپن کو پتہ چلا کہ ایک مارٹی ہی اکیلا نہیں [illegible] اپن جیسا ابھی ایدر بہت سے جو راجا کا سیلو ہے۔" مارٹی کی آواز بھرانے لگی۔ [illegible] جمرو، ٹنگو تینوں [illegible]ے ٹنگ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مارٹی کہنے لگا۔ "قسم سے ابھی اپن کچھ نئیں مانگتا۔ [illegible]پن کو سب مل گیا ہے۔ اپن بس ایک دعا مانگتا ہے۔ اپن راجا کے کس طرح کام آئے۔ [illegible]یا کرے کیسا اس کو خوشی دے سکے۔ پر اپن، اپن تو خود بہت چھوٹا ہے سالا، اپن تو خود ہی بگر بھکاری ہے۔ اپن کا ہاتھ تو خود اس کے آگے پھیلا ہے۔ اِس کو ابھی [illegible] کسی کو ابھی کیا......"

"بس کرو مارٹی!" میں نے گھُٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تُو تو بالکل ہی رستا گیا ماسٹر! کدھر سے کدھر کو نکل گیا۔" شامو اضطراب سے بولا۔

"ایں جمرو بھائی! یہ تو بالکل بچّے کی طرح مُنّے کی طرح رو رہا ہے۔" مارٹی نے منہ چھپا لیا۔

"نہیں نہیں لاڈلے! یہ تو سالا ایک مُنّا ہے بالکل۔" جمرو نے بڑھ کے اُسے پہلو میں دبوچ لیا۔ مارٹی اور سسک پڑا۔ دیر تک جمرو اور شامو اُسے تھپکیاں، تسلیاں دیتے رہے، تب کہیں مارٹی کو قرار آیا۔

گاڑی کی پُرشور آواز سے رفتار کا اندازہ ہوتا تھا۔ بہت دیر سے کوئی اسٹیشن نہیں آیا تھا۔ ٹنگو نے درمیان میں کئی بار اُٹھ کے کھڑکی سے جھانکا تھا۔ مارٹی نے سبھی کو چُپ لگا دی تھی یا اُن کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا تاہم سب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، اُن کے ہاتھ پیر بھی جاگ رہے تھے۔ صرف آنکھیں کھلی ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بدن بھی آنکھوں کا تابع ہونا چاہیے۔ یکایک ٹنگو کے جسم میں بے چینی کی ایک لہر نمودار ہوئی۔ اُسے پہلو بدلتے دیکھ کے جمرو نے پوچھا۔ "کیا ہے چھنگے؟"

"کچھ نئیں جمرو بھائی!" ٹنگو جھجک کے بولا۔

"تو بے کل کیوں ہو رہا ہے، چین سے کیوں نہیں بیٹھتا؟"

"اپن، ابھی اپن کے من میں ایک بات آتا ہے۔"

"ہم سمجھ گئے تھے، ابھی تیرے پیٹ میں بھی درد ہو رہا ہے۔"

"چھُٹکا اپنے سے ڈبل بات ہی بولے گا۔"

"کیا بولے شامو بھائی! سوچتا ہے، ابھی چُپ رہے کہ زبان کھولے۔"

"جی بھر کے کھول دے، تیری کچی ٹکیا تو نہیں ہے۔"

"اپنے کو پتہ ہے، تُو جتنا اوپر ہے، اُس سے دس کے بھاؤ میں نیچے ہے۔"

ٹنگو متذبذب بیٹھا رہا۔ جمرو نے اصرار کیا تو دھڑکتی سی آواز میں بولا۔

"اپن سوچتا ہے، ابھی سارون کے بدلے اپن کوئی ایک اسٹیشن پر اُتر جائے، بابا کے پاس جتنا مال پانی ہے ساتھ لے کے ایک آدمی اُن لوگوں سے چھُپ کے اُتر سکتا ہے۔ ایدر گاڑی چلے، اودر اُتر سکتا ہے۔ وہ بعد کو دوسرا گاڑی سے ممبئی چلا جائے گا، سمجھا! ابھی آگے کوئی لفڑا شفڑا ہوتا ہے تو اپن میں سے کسی کے پاس مال تو نئیں نکلے گا نی، سمجھا!" وہ جھپکتی پلکوں سے بولا۔

سب نسبتہً سیدھے ہو کے بیٹھ گئے۔ ٹنگو نے صرف ایک لمحے کے لیے تامل کیا۔ کسی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی چہکتی آواز میں کہنے لگا۔ "اور اگر ایسا نئیں تو ابھی [illegible] کا ایک دم اُلٹا کرے۔ آگے کسی اسٹیشن پر ایک آدمی کو ٹرین میں چھوڑ کے سب نیچے اُتر جائے۔ اپن کے اُترنے کے بعد اُن لوگوں کو اتنا ٹائم ملے کہ وہ بھی نیچے اُتر سکے۔ بس اپن میں سے ایک ٹرین میں رہ جائے گا، اُسی کے پاس مال ہوگا۔ سالا ایدر اُن کتا لوگ کے دھیان میں بھی نئیں آئے گا کہ ایک آدمی کمتی ہے۔ کچھ سمجھا جمرو بھائی! اپنا آدمی سب کے ساتھ اُتر کے بعد میں گاڑی چلنے پر بھی چھپکے سے ٹرین پہ چڑھ سکتا

ہے۔ اپُن کا باقی لوگ ایڈ ارڑی کرکے اُن لوگ کو اُلجھائے، اُودر اپنا آدمی بیچ سے کھسک لے۔" ٹنگو اتنی تیزی سے بول رہا تھا کہ ہانپنے لگا: "بولو جمرو بھائی! شامو بھائی!" وہ ہیجانی لہجے میں بولا: "ابھی کیسا ہے؟"

سب گم صُم سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ ابھی کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سامنے کی برتھ پر پیرو لیکا یک اُٹھ بیٹھا: "ٹنگو سے!" اُس نے بھاری آواز میں ٹنگو سے کہا: "اپن کو ابھی تیرا ہی مغز ہتھوڑا ٹھکانے پر لگتا ہے۔"

"دادا! تم سُن رہے تھے کیا؟" ٹنگو تیزی سے بولا۔

"اسٹیشن آنے پر اپن ابھی جھل بھائی سے بولے گا" پیرو کے لہجے میں تابیدگی نرمی تھی، کہنے لگا: "اپن کے دماغ میں ابھی کچھ اور بھی آتا ہے۔"

"کیا دادا؟ بولو دادا!" ٹنگو نے بے تابی سے پوچھا۔

"ابھی جھل بھائی سے بات کیے بنا کیا بولے۔" پیرو نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور ترشی سے بولا: "پر تم لوگ ایسا کیوں بیٹھا ہے، ابھی جب تک گاڑی چلتا ہے، کمر سیدھا کرلے تو اچھا ہے۔"

"نیند ابھی تمھارے پاس تھوڑی سی ہو تو ادھر دے دو سالی!" جمرو نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"نیند کو کون بولتا ہے، ابھی لیٹنا بھی آدھا نیند کے برابر ہے۔ بیٹھا رہے گا اور ایسا گھوڑا چلاتا رہے گا تو اور ڈھیلا ہو جائے گا۔"

"اب اکٹھا ہی لیٹیں گے دادا!" شامو نے کہا۔

پیرو نے ایک ایک کا نام پکار کے برتھوں پر لیٹ جانے کی ہدایت کی۔ اُس کا لہجہ حکمیہ تھا پھر کسی نے ردّ و قدح بھی نہیں کی۔

ڈبے میں گاڑی کے شور کے سوا سکوت طاری تھا۔

پیرو انھیں خاموش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن خاموشی صرف لبوں کی نہیں ہوتی، شور تو آنکھیں بھی کرتی ہیں، آنکھیں بھی سنتی ہیں، شور تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ بے صدا لے نوا پیرو کے مشورے پر وہ مختلف برتھوں پر پھیل گئے تھے مگر یہ پیرو بھی جانتا تھا کہ اُن کے حواس کیسے کیسے وہم و گمان سے دوچار ہیں، نشست بدل لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پیرو انھیں کوئی تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ بے جواز تسلی کی بے اثری کا اُسے خوب علم ہو گا۔ پیرو یہی کر سکتا تھا کہ اُن کے اعصاب کی کشیدگی کم کرنے کے لیے خود کو نسبتاً آسودہ ثابت کرے مگر اُسے خود پر بھی قابو نہیں تھا، سب کا کم و بیش ایک ہی حال تھا۔ یہ کوئی خوف نہیں تھا بے شمار مرتبہ موت اُن کے قریب سے گزر گئی تھی۔ اُن کے انتشار کی اصل وجہ اُن کی لاعلمی تھی۔ یہ تجویزیں اُن کے اندرونی غبار کی مظہر تھیں۔ ایسی صورت میں وہ یہی کر سکتے تھے کہ اپنی اپنی بساط کے مطابق مختلف سمتوں کی نشان دہی کریں۔ کسی کو بھی اپنی تجویز صائب ہونے کا یقین نہیں تھا کیونکہ کسی کو بھی تعاقب کرنے

والوں کی تعداد معلوم نہیں تھی۔ تعداد ہی سے اُن کا ارادہ مشروط ہو گا۔ گزشتہ رات کے تجربے کے مطابق تعداد زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے۔ شلو نے دقت باتھ سے نکل نہ جانے کا خدشہ ظاہر کیا تھا، وقت واقعی آہستہ آہستہ گزر رہا تھا مگر آنے والے دن کے انتظار کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ شاید کسی کو بھی اس قسم کی صورتِ حال سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ انھیں اندازہ نہیں تھا کہ چلتی ریل میں مطلوبہ مسافروں کو کس طرح قابو میں کیا جاتا ہے۔ ہماری طرف سے کسی بھی پیش قدمی میں اتنے ہی اندیشے تھے جتنے ہماری خاموشی میں تھے۔ بہرحال پیرو نے اچھا کیا کہ اُن سب کو الگ کر دیا ورنہ وہ طرح طرح کی باتوں سے اپنا تلاطم اور بڑھاتے رہتے۔ اوپر کی برتھ پر جسم ڈھیر کرکے مجھے کسی قدر یکسوئی نصیب ہوئی۔ میرا ذہن سسپنس کے بعد تاک میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے طریقِ کار کے تعین اور ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، اگر واقعی اُن کی تعداد زیادہ ہے تو وہ کس طرح ہم تک پہنچیں گے، اُنھوں نے کون سی جگہ، کون سا وقت منتخب کیا، اُنھوں نے کوئی تو طریقِ کار اپنے لیے متعین کیا ہو گا۔

میری کلائی پر نواب حشمت جنگ کی دی ہوئی گھڑی بندھی تھی ... بج رہے تھے۔ حیدر آباد سے گاڑی روانہ ہوئے پانچ گھنٹے کے قریب ہو رہے تھے، جگہ جگہ رکنے کی وجہ سے گاڑی یقیناً کچھ لیٹ بھی ہو گئی ہو گی۔ رات کا بڑا حصہ گزر چکا تھا مگر ابھی اندھیرے کے دو تین گھنٹے باقی تھے، صبحِ کاذب تک کچھ بھی ممکن تھا۔ ایسی حالتوں میں اندھیرا اجالے سے زیادہ مفید ہوتا ہے مگر وہ کس طرح آئیں گے؟ کسی ویران جگہ زنجیر کھینچ کے گاڑی رکوا کر، یا کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر اچانک وہ ہمارے ڈبے کا رخ کریں گے؟ انھیں پہلے ابا جان کے ڈبے کی طرف بڑھنا چاہیے کیونکہ اُن کی دانست میں اُن کے مطلوبہ تیمور ابا جان ہی کی تحویل میں ہو سکتے ہیں۔ اس دوران میں ہمارا ڈبا بھی پوری طرح اُن کی نگاہوں میں ہو گا۔ گزشتہ رات چھوڑے ہوئے اپنے چار تمنچے اور بڑی تعداد میں گولیاں انھیں خوب یاد ہوں گی۔ وہ شترِ بے مہار کی طرح دندناتے ہوئے تو ہمارے ڈبوں کی طرف نہیں بڑھ سکتے۔ ہر اسٹیشن پر انھوں نے ہمیں دروازوں پر تعینات دیکھ لیا تھا۔ پھر انھوں نے کیا طے کیا ہے؟ ہو سکتا ہے، ابھی تک اُن کی احتیاط کا سبب ہماری بیداری اور چوکسی ہی ہو۔ مبادا وہ کسی موقع کے منتظر ہوں، ہماری غفلت کے ایک لمحے کے منتظر، یا انھوں نے کوئی خاص جگہ سوچی ہوئی ہے؟ ابھی گاڑی ریاست کی حدود میں ہے، ریاست کی آخری سرحدوں تک اُن کی عمل داری ہے۔ پولیس کی ہے، حکم اُن کا چلتا ہے۔ وہ یہاں چلتی گاڑی رکوا سکتے ہیں اور جب تک چاہیں ٹھہرائے رکھ سکتے ہیں۔ وہ ایک ایک ڈبے کی تلاشی کے احکام بھی صادر کر سکتے ہیں۔ ریاستوں میں آدمی کی خریداری عام بات ہے۔ زر سے نہیں تو زور سے، ریاستیں زور ہی سے چلتی ہیں۔ عجب نہیں کہ اُنھوں نے بعض اہل کار یا افسر بھی ہماری حرکت کی نگرانی کے لیے ساتھ کیے ہوں مگر جن لوگوں کو ابا جان کے نادر تحفے

کی جستجو ہے، اُنھیں اصولاً پولیس کو بیچ میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ وہ ایسے ہی افسرادر اہل کار ہو سکتے ہیں جن کی وفاداری پر اُنھیں ایمان کی حد تک یقین ہو۔ اُنھیں ہم سے کوئی ذاتی پرخاش تو ہے نہیں کہ تھیر نہ ملنے سے اُن میں کوئی انتقامی ردِعمل پیدا ہو۔ اُنھیں تو ہماری حفاظت اور سلامتی بھی عزیز ہونی چاہیے اور صورت حال زیادہ پیچیدہ بنانے سے ہر ممکن اجتناب کرنا چاہیے۔ وہ اس معاملے میں غیر ضروری، غیر متعلق اور مشکوک لوگوں کا درمیان میں پڑنا اور پولیس کی شمولیت یا دلچسپی کسی طور پسند نہیں کریں گے بلکہ اُن کی کوشش ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہو پولیس ہم سے دُور ہی رہے۔ میں نے مارٹی اور ٹنگو کی تجویزیں سُن کے کچھ نہیں کہا تھا۔ اُنھیں خود ہی احساس تھا کہ ذرا سی بات اُلجھنے سے اور ہمارے کسی نارو اقدم پر پولیس کسی بھی کونے سے نمودار ہو سکتی ہے۔ پولیس ہمیں بھی مطلوب نہیں تھی۔ ابا جان کے پاس اَن مول تھیر تھے، ہمارے پاس تمنچے تھے، پولیس ویسے بھی راستہ کھوٹا کرنے کا سبب بنتی۔

گھڑی میں تین بج رہے تھے۔

گاڑی دو مرتبہ چھوٹے اسٹیشنوں پر ٹھیری تھی مگر کسی کو اُترنے کا وقت نہ مل سکا۔ دو چار منٹ سے زیادہ گاڑی کہیں نہیں رکی۔ دونوں اسٹیشنوں پر میں نے تھل اور زورا کو دروازوں پہ کھڑے دیکھا۔ اُن کا جاگتے رہنا اور ہر اسٹیشن پر پہرا دینا ہم سب کے لیے احتیاط اور تقلید ہی کا اشارہ ہو سکتا تھا۔ وقت جتنا گزرتا جا رہا تھا، رات بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں مرتبہ اسٹیشنوں پر اُن آدمیوں کے چہرے یکے بعد دیگرے دروازے پر نظر آئے اور بھی کئی لوگ مختلف ڈبوں سے اُترے لیکن اُن دو آدمیوں سے کسی کا ربط ضبط دکھائی نہیں دیا۔ گاڑی سے اُترنے والے کئی مسافر ہمارے ڈبوں کے سامنے سے بھی گزرے اور کچھ دُور جا کے پان بیڑی وغیرہ خرید کے لَوٹ گئے۔ وہ دونوں نیچے نہیں اُترے، اس لیے ہم نے بھی پہل نہیں کی۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں گاڑی بھی روانہ ہوتی رہی۔ اس دوران تھل کو دروازے پر کھڑا دیکھ کے ایک فقیر بھی آیا اور اُوٹ پٹانگ صدائیں بلند کرنے لگا۔ تھل نے اُس کی طرف روپے کا نوٹ بڑھا دیا، اُس نے تھل کو غور سے دیکھا اور دعائیں دیتا رخصت ہو گیا۔ پھر وہی فقیر ہماری طرف بھی آیا، مارٹی نے اُس کی طرف سکہ اُچھال دیا۔ سکہ پلیٹ فارم پر گرا۔ مارٹی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ فقیر بے تابانہ پلیٹ فارم پر سکہ ڈھونڈنے لگا۔ جب تک سکہ اُس کے ہاتھ نہیں آ گیا، اُسے چین نہ پڑا۔

گاڑی رُکنے پر دروازوں، کھڑکیوں پر جھپٹنا اور گاڑی چلنے پر برتھیں سنبھال کے پڑ جانا، ہر اسٹیشن پر سب کا معمول یہی رہا، جتنا وقت گزرتا جا رہا تھا، سب کے چہروں پر خون کی تمازت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

ابھی چار نہیں بجے تھے، گھڑی میں ٹھیک تین بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ معاً کھڑکیوں سے دُور دُور روشنیاں ٹمٹماتی دکھائی دیں۔ گاڑی کی رفتار بھی سُست ہونے لگی۔ ہم انجن کی سیٹی بجنے سے پہلے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ روشنیاں بتدریج بڑھتی گئیں۔ بار بار پٹریاں بدلنے کی کھڑکھڑاہٹ سے ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی بڑا شہر یا بڑا اسٹیشن آ رہا ہے۔

وہ واڑی جنکشن تھا۔ گاڑی بہت دُور سے سیٹیاں بجاتی اور آ[...] ہوئی ٹھیر گئی تھی۔ اچانک ایسا لگا جیسے دن نکل آیا ہے۔ پلیٹ فارم پر بہ[...] خوانچہ فروشوں کی صداؤں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی[...] پر گاڑی انتظار کے بعد آئے تو عجیب نفسانفسی ہوتی ہے۔ گاڑی ٹھیرتے ہی[...] ٹوٹ پڑے۔ بہت سے مسافر ڈبوں سے اُترے۔ ہم نے جلدی نہیں کی۔ [...] میں سے صرف ایک نیچے آیا۔ تیز روشنی میں اُس کا چہرہ اچھی طرح [...] تھا۔ تقریباً وہی حلیہ اور ناک نقشہ تھا جو مارٹی نے بتایا تھا۔ البتہ اُس[...] شیروانی پہنے ہوئے نہیں تھا۔ سفید کُرتے پر جگہ جگہ شکنیں پڑی تھیں۔ [...] تھکا، ٹوٹا ٹوٹا معلوم ہوتا تھا مگر تھکن کے باوجود اُس کے چہرے پر کا[...] ہوا تھا۔ کبھی کبھی اُس کی ایک چھلکتی ہوئی نگاہ ہم پر پڑتی تھی پھر وہ سگ[...] ہوئے کسی اور طرف دیکھنے لگتا تھا۔ ہم سب کی کوشش بھی یہی تھی کہ ا[...] سے اُسے پہچان لینے کا کوئی تاثر قائم نہ ہونے دیں۔ بے شمار مسافر اُس [...] گزرے لیکن نہ کسی شخص نے اُس کی طرف توجہ دی، نہ اُس نے کسی کی طرف[...] بعد پیرو ڈبے سے اُتر گیا، شامو، مارٹی اور ٹنگو بھی اُتر گئے۔ میں بھی نیچے جا[...] لیکن اُن تینوں کے جانے کے بعد جمرو اور میں ڈبے میں اکیلے رہ گئے تھے[...] نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ مجھے اس احتیاط کی وجہ خود معلوم نہیں تھی۔ ڈبے م[...] حشمت جنگ کے خوان اور ایک چرمی بیگ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چائے [...] آنے پر مارٹی نے اُسے روک لیا۔ ضرور کسی نے اشارہ کیا ہوگا جو مارٹی نے [...] رکھا۔ وہ ایک ساتھ بھی چائے کے کلھڑ طلب کر سکتا تھا لیکن وہ ایک ایک [...] کے پھر کلھڑ طلب کر رہا تھا۔ سموسے اور بسکٹ بھی مارٹی نے اسی طرح [...] تقسیم کیے۔ کچھ وقت اُس نے چائے بسکٹ وغیرہ ہم تک پہنچانے میں اور کچھ [...] سے اور ٹھیلے والے سے حجت کرنے میں صرف کیا۔ ٹھیلا اسی طرح ڈبے کے [...] تک کھڑا رکھا جا سکتا تھا۔ ٹنگو، شامو، جمرو اور زورا نے ایک کلھڑ پر اکتفا [...] چائے تھی بھی تازہ۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے اُس کا ذائقہ [...] ہو گیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ٹھیلے کے گرد اور بھی کئی مسافر اکٹھے ہو گئے۔ اُن میں سے ایک آدمی پلیٹ فارم ہی پر موجود تھا، وہ پہلے تو الگ کھڑا سب [...] پھر اُسے بھی ہمک ہوئی یا یہ ہمارے قریب آنے کا بہانہ تھا۔ اُس نے دو کلھ[...] کلھڑ وہ ڈبے کے دروازے پر کھڑے ہوئے اپنے ساتھی کو دے آیا۔ دونوں [...] سامنے چائے ختم کی اور پان کے خوانچے والے کو روک کے پان کھایا۔ میری نگ[...] کا[...] کیے ہوئے تھیں۔ دونوں کے چہروں پر کوئی خاص اضطراب نہیں [...] والے کے اطراف جمع ہونے والے لوگوں میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں [...] اُن کے تعلق کا ذرا شائبہ ہو لیکن اس عرصے میں کئی مسافروں کی نگا[...] ڈبوں کی طرف منڈلائیں۔ ٹھیلے کے گرد کھڑے ہونے والوں، پلیٹ فا[...]

[...] جانے والوں میں دونوں طرح کے مسافر تھے۔ کوئی آلودہ نگاہ پرکھنا آسان نہیں تھا [...]ا تم تین مسافر جیرے مہرے سے عام آدمیوں سے مختلف لگتے تھے، اُن پر مجھے ایک [...]لمحے کے لیے شک ہوا تھا لیکن وہ ہماری طرف کسی اور سبب سے بھی تو متوجہ ہو سکتے تھے۔ [فر]سٹ کلاس کے ڈبے کے مسافروں پر ویسے بھی نگاہیں اُٹھ جاتی ہیں، مارٹی اور شامو ٹھیلے والے سے مسخراپن کرنے لگے تھے۔ وہ آدھا سموسا کھا کے، لڈو کا [...]ک کو ناک کے منہ بنا کر لائن پر پھینک دیتے۔ اس طرح اُنھوں نے سموسوں اور لڈوؤں کا آدھا تھال ختم کر دیا۔ ٹھیلے والا بے دلی سے ہنستا اور کسمسا کے رہ [جا]تا۔ وہ تین مسافر جو میری آنکھوں میں کھٹکے تھے، اُن پر میرا شبہ رفع ہونے کی ایک [و]جہ یہ بھی تھی کہ وہ ہمارے نشان زدہ دونوں آدمیوں سے قطعاً بے خبر رہے تھے حالانکہ وہ [دو]نوں اُن کے بہت قریب کھڑے تھے۔ اُن کی نظر اُن پر گئی ہی نہیں، اچٹتی ہوئی [س]ی بھی کوئی نظر نہیں گئی۔ ذرا بھی شناسائی ہوتی تو ایسا نہ ہوتا، کسی بھی بے [ا]ختیار حرکت سے اس کی تصدیق ہو جاتی۔

پیرو تھوڑی دیر کے لیے تھل کے ڈبے میں گیا تھا، کانتے کو دیکھنے۔ اُس [...]نے شامو، ٹنگو، مارٹی وغیرہ کی تجویزوں کے متعلق تھل سے بات ضرور کی ہوگی لیکن [ت]ھل نے شاید کوئی توجہ نہیں دی، پیرو جلد ہی نیچے آ گیا اور ڈبے سے اُتر کے تھل کے [س]امنے رہا۔ ٹھیلے والے کو مارٹی نے گنے بغیر ایک بڑی رقم دے دی، مارٹی کی اس [ف]یاضی پر اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اب وہ کہیں اور جانا نہیں چاہتا تھا لیکن [ک]سی طرف سے ایک تنومند، تندخو مسافر آ کے اُسے لتاڑنے لگا کہ وہ ایک جگہ کیوں [ج]م گیا، آگے دوسرے ڈبوں میں بھی مسافر ہیں اور اُس کا انتظار کر رہے ہیں۔ مارٹی ٹھیلے والے کو مزید روک سکتا تھا لیکن ٹھیلے والے کی معذرت پر اُس نے اُسے جانے دیا۔ [ت]ندخو مسافر کے طور طریق کچھ مناسب نہیں لگے، اُس نے ہماری طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ [ا]یک ہمی لاٹ صاحب گاڑی میں سوار نہیں ہیں۔ کوئی دوسرا موقع ہوتا تو مارٹی اور [ش]امو اُسے سمجھ لیتے۔ اُس شخص کو دیکھ کے میری رگوں میں بھی چبھن ہوئی تھی، [ا]ُس کا حلیہ ذات ابا جان کی حویلی میں آنے والے آدمیوں سے خاصا مشابہ تھا، وہی [ر]نگ اور کاٹھی، چہرے پر وہی درشتی اور آنکھوں میں وہی شعلہ باری لیکن وہ اُن [م]یں سے قطعی نہیں تھا، حویلی سے باہر رہ جانے والوں میں ہو تو ہو، اُنھیں ہم نہیں [د]یکھ پائے تھے۔ اُس کی نظریں کئی بار ہم پر تلملائیں۔ اس سے میرا شبہ کچھ کم ہوا، [...]دوسرے اُن دو آدمیوں سے اُس کا بھی کوئی تال میل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایسی [...]وئی گرہ ہوتی تو اس کا رویہ کترایا ہوا ہوتا۔ ٹھیلے والا آگے بڑھ گیا تھا، پلیٹ فارم [...]بھی اب ٹھیراؤ آ چکا تھا۔ ڈبوں میں تازہ پانی بھر دیا گیا تھا، ایک خاکروب نے آ کے ہمارے [ڈب]وں کی صفائی بھی کر دی تھی۔ اسٹیشن پر اُترنے والے کم، سوار ہونے والے زیادہ تھے۔ [کئ]ی مسافر جگہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمارے ڈبوں کی طرف بھی بھٹکے تھے لیکن [...]مد تو ڈبے پر فرسٹ کلاس کا نشان دیکھ کے خود آگے چلے گئے، کچھ کو یاد کرانا پڑا [ک]ہ یہ کون سا درجہ ہے۔ انگریزی لباس میں ملبوس ایک افسر قسم کا شخص بھی آیا، مگر وہ یہ سُن کے کہ ہمارا ڈبا ریزرو ڈبا ہے، چند لمحوں کے پس و پیش کے بعد آگے بڑھ گیا۔

واڑی جنکشن پر گاڑی ٹھیرے ہوئے بیس منٹ سے اوپر ہو چکے تھے۔ چار بجنے والے تھے۔ پلیٹ فارم کو جیسے قرار آ گیا تھا۔ وہ آدمی بھی اب اوپر چلا گیا تھا لیکن دروازے سے نہیں ہٹا۔ ٹنگو، شامو بھی ڈبے میں واپس آ گئے۔ اُن کے آنے پر میں نے نیچے اُترنے اور ایک نظر کانتے کو دیکھ آنے کا ارادہ کیا مگر پلیٹ فارم کے آثار بتا رہے تھے کہ گاڑی روانہ ہوا چاہتی ہے۔ ابھی سیٹی نہیں بجی تھی تاہم کسی لمحے بھی بج سکتی تھی۔ پیرو اور مارٹی، تھل کے ڈبے کے سامنے کھڑے رہے۔ اتنے میں انجن کی طرف سے ایک اُدھیڑ عمر شخص، سُرمئی واسکٹ اور پاجامہ، رام پوری طرز کی ٹوپی، سلیم شاہی جوتی پہنے اور موسیقاروں کی طرح شانوں پر شال ڈالے لپکتا جھپکتا دُور سے آتا دکھائی دیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ ایک برقع پوش عورت بھی اُس کے پیچھے تھی، اُس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ قلی چرمی سوٹ کیس اور چرمی بیگ اُٹھائے اُس شخص سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں سٹ پٹاتے قدموں سے ایک ایک ڈبا جھانک رہے تھے، عورت پیچھے رہ جاتی تو وہ شخص نہایت مضطربانہ انداز میں رُک کر اور قلی کو روک کر عورت کا انتظار کرتا۔ گاڑی چلنے والی تھی اس لیے اُس کا یہ تاخیر نافطری تھا۔ عورت تیز چلنے کی کوشش کرتی لیکن تین چار قدم بعد ہی سُست پڑ جاتی۔ پھر ایک دم گارڈ کی سیٹی یہاں سے وہاں تک پورے پلیٹ فارم پر گونجنے لگی۔ وہ شخص حواس باختگی سے بڑھتے بڑھتے پہلے اُن دو آدمیوں کے ڈبے کی طرف گیا اور بے چینی سے اندر جھانکنے لگا، پھر فوراً وہ تھل کے ڈبے کے سامنے آ گیا۔ پہلے اُس نے کھڑکیوں سے جھانک کے اندر دیکھا، اُسے ابا جان اور منیر علی کے چہرے نظر آئے ہوں گے۔ تھل دروازے ہی پر کھڑا تھا، پیرو اُس کے مقابل نیچے پلیٹ فارم پر تھا۔ اُس آدمی کو ٹھیرے ہوئے ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ پیرو نے اُسے بتایا کہ یہ فرسٹ کلاس کا ڈبا ہے۔ جواب میں اُس نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا کہ اُس کے پاس بھی اسی درجے کا ٹکٹ ہے۔ پیرو نے پھر ملائمت سے اُسے بتایا کہ یہ دو برابر برابر کے ڈبے خاص طور پر ہمارے لیے محفوظ کیے گئے ہیں۔ اُدھیڑ عمر شخص شش و پنج میں پڑ گیا، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی کیفیت تھی۔ اُس نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا، اُس کے ساتھ کی عورت گھسٹتی پھسٹتی اُفتاں و خیزاں ہماری طرف آ رہی تھی۔ "مجھے گلبرگے تک بیٹھنے کی جگہ دیجیے۔" وہ شخص عاجزی سے بولا۔ "گلبرگہ یہاں سے صرف بیس میل دُور ہے۔"

مارٹی نے اشارۃً کہا کہ اُس کے ساتھ ایک پردہ نشین عورت ہے اور ڈبے میں سارے مرد بیٹھے ہیں مگر وہ آدمی کہنے لگا کہ اُس کی بیوی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ گاڑی روانہ ہونے والی ہے۔ وقت شاید نہ مل پائے۔ شاید وہ اُسے زنانہ ڈبے میں نہ بٹھا سکے، اس لیے مجبوراً اس کی دیکھ بھال کے لیے وہ مردانہ ڈبے کو ہی ترجیح دے گا۔ ڈبے میں اُسے [...]مہ دو بزرگ نظر آ گئے ہیں اس لیے وہ خود کو یہاں زیادہ محفوظ و مطمئن محسوس کرتا [ہ]ے، اگلے اسٹیشن تک کی بات ہے، اس سے آگے وہ کوئی مناسب جگہ تلاش کر لے گا۔ "آپ کو صرف آدھ گھنٹے کی زحمت ہوگی۔" اُس کا انداز عاجزانہ تھا۔ وہ حیدرآبادی لہجے میں

بات کر رہا تھا۔ کہنے لگا کہ اپنی بیوی کے آرام کی خاطر اُس نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا ہے۔ اُس کی بیوی ڈبّے کے پاس کچھ فاصلے پر ترچھی کھڑی ہو گئی تھی۔ سر سے تک سفید برقع بدن کسی قدر فربہی کی طرف مائل، قد نکلتا ہوا۔ اس دوران میں مَیں بھی نیچے اُتر کے اُن کے قریب پہنچ گیا تھا۔

"آپ کو اِدھر تکلیف ہوگا میاں صاحب!" پیرو نے تحمّل سے کہا۔

"تکلیف تو آپ کو ہوگی۔" وہ لجاجت سے بولا۔

پیرو نے تجمل کی طرف دیکھا۔ تجمل کا تذبذب دیکھ کے وہ شخص کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ تجمل نے ہاتھ اُٹھا کے کہا: "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے میاں صاحب! اگلے اسٹیشن پر آپ ٹھکانا ڈھونڈ لینا۔"

اُس نے ممنونیت کی نگاہ سے تجمل کو دیکھا اور بے ترتیب لفظوں میں شکریہ ادا کرنا چاہا۔ ساتھ ہی اُس نے قلی کو حکم دیا کہ وہ سامان اندر رکھ دے اور جلدی کرے۔ قلی نے ہینڈ بیگ دروازے میں بڑھا دیا، معاً تجمل نے اُسے روک دیا۔ "ابھی ایسا کرو میاں صاحب! آپ اپنے برابر کے ڈبّے میں بیٹھ جاؤ، اُدھر آپ زیادہ آرام سے ہوگے۔"

"جی، جی ہاں۔" وہ انتشار زدہ مستعدی سے بولا۔

"اُدھر سے ہم آدمی تھوڑے کم کر لیں گے، اچھی جگہ آپ کو مل جائے گی۔"

"جگہ کیا جناب! آپ کی مہربانی ہے کہ....." اُس نے سیمابی آواز میں کہا۔

"ہم کو بخدا یہاں بھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تھوڑی دُور کی تو بات ہے۔"

"اِدھر اپنے ساتھ ایک بیمار بھی ہے۔ عورت کے سامنے اُس کا لیٹے لیٹے پڑے رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"اِس کی ضرورت نہیں۔" وہ کسی توقف کے بغیر بولا۔ "وہ بے شک آرام کرتے رہیں۔"

"پر اپنے کو اچھا نہیں لگتا۔ اگلا ڈبّا بھی اپنا ہی ہے۔ آپ بولو گے تو ہم بھی ساتھ چلیں گے۔"

"جی، جی۔" اُس نے کسی قدر بدحواسی سے کہا۔

"جلدی کرو میاں صاحب! سیٹی بج گئی ہے۔" تجمل نے تندی سے کہا اور قلی کو ہمارے ڈبّے میں سامان رکھنے کی ہدایت کی اور مجھ سے کہا کہ میں شامو، جمرو اور ٹنگو کو یہاں بھیج دوں۔

"آدھ گھنٹے کی تو بات....." مگر اُس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ تجمل تیزی سے اُتر گیا، قلی کو جھڑکنے کے انداز میں اُس نے عجلت کی تلقین کی۔ عورت قلی اور اپنے شوہر کو بڑھتا دیکھ کے چند قدم اور آگے آ گئی۔ اِدھر میں نے لپک کے جمرو، شامو اور ٹنگو کو ڈبّا خالی کرنے کا اشارہ کیا۔ مارٹی پہلے ہی نیچے تھا، وہ تینوں بھی دروازے پر کھڑے تھے، فوراً اُتر آئے۔ قلی نے آدمی اور عورت کے ڈبّے میں چڑھنے سے پہلے سامان رکھ دیا تھا۔ پہلے وہ دونوں اوپر گئے پھر تجمل اور پیرو۔ مجھے پیرو سے یہ کہنے کا موقع نہیں ملا کہ اُسے ابّا جان کے ڈبّے ہی میں رہنا چاہیے۔ وہاں سے دونوں کا آ جانا مناسب نہیں تھا، اُن کی عدم موجودگی میں زورا، جمرو، ٹنگی وغیرہ کوئی الٹا سیدھا قدم اُٹھا سکتے تھے، اُس وقت کسی کا .... نہیں کر رہا تھا۔ مجھ سے تجمل نے کچھ نہیں کہا تھا، پہلے تو میں ڈبّے میں چلا جاؤں لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا اور تجمل سے پوچھے بغیر چلا گیا۔ تجمل نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ عورت منہ دوسری طرف کیے ایک سمٹ گئی تھی۔ برقع کے باوجود صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت سہمی ہوئی ہے۔ مردوں کے درمیان بیٹھنے کا اُسے پہلی بار اتفاق ہوا ہو۔ تجمل نے اوپر چلا کر اُس سے کہا: "آپ بولو تو ابھی ہم تینوں بھی اُدھر دوسرے ڈبّے میں چلے جائیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ معذرتی آواز میں بولا۔ "آپ کو ہماری خاطر بہت زحمت اُٹھانا پڑی۔ شاید مجھ سے جلدی ہو گئی۔ ابھی کچھ وقت تھا، میں کوئی معقول انتظام کر سکتا تھا۔"

"اِدھر بھی کیا جاتا ہے۔" تجمل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں، پیرو اور تجمل تینوں مخالف برتھ پر بیٹھ گئے۔ ہم نے کوشش کی کہ آمنا سامنا نہ ہو لیکن وہ ایک مختصر ڈبّا تھا۔ تجمل نے ٹھیک جلدی کی تھی، گویا جیسے ہمارے ڈبّے میں آنے کا انتظار تھا۔ چند ہی لمحوں بعد انجن نے سیٹی دی، گاڑی جھٹکے لیتی ہوئی کھسکنے لگی۔ تجمل نے مجھے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ دونوں طرف کے دروازے کھلے ہوئے تھے، میں نے ایک بند کر دیا اور دوسرے پر کھڑا اسٹیشن گزرتے دیکھتا رہا۔ دوسرے ڈبّے کے دروازے پر مارٹی اور شامو مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگے۔ اس سے اگلے ڈبّے پر وہ آدمی بھی موجود تھا، وہ اس کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ دروازے کے ڈنڈے پر اُس کا ہاتھ جما ہوا تھا لیکن جسم اندر ہی کی جانب تھا۔ روشنیاں کم ہونے لگیں اور گاڑی کی رفتار بڑھنے لگی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا تھی، میرے بال اُڑے جا رہے تھے۔ گاڑی چھوٹنے پر مجھے اپنا وجود ہلکا ہو رہا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کے دروازہ بند کیا۔ دروازہ بند کر کے میں پلٹا تو یکایک میرے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ تجمل اور پیرو کے ہاتھوں میں تمنچے دیکھ کر۔

اُس شخص کا منہ کھلا ہوا تھا، دیدے باہر نکلے ہوئے تھے، وہ .... ہو رہا تھا۔ میرے حواس گُنگ ہو گئے تاہم بے اختیار میں نے بھی اپنا تمنچا ....

"اِس سے بولو کہ مکھڑے سے ذرا بدلی تو ہٹا دے۔" تجمل نے اونچی آواز میں کہا۔ "دیکھتے ہیں اندر سے چندریا کیسی ہے۔" میرے کان سنسنا رہے تھے۔ تجمل نے اُسی شخص کو مخاطب کیا تھا مگر اُس پر سکتہ طاری تھا۔ اُس کے لب پھڑپھڑا رہے تھے۔

"دادا! اِس کو سنائی نہیں دیا شاید۔" تجمل نے سرد لہجے میں کہا۔ "اِس کو بھی کچھ دینا پڑے گا اپنے کو۔"

"ہاں ہاں تجمل بھائی! دے گا، ابھی ضرور دے گا۔" پیرو کی آواز تھی۔ پھر وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور گرج کے بولا: "سنا نہیں تو نے؟ کفنا پہن لیا ہے! ابھی تو تھوڑا ٹیم ہے، اُتار دے اِس کو۔"

"یہ کیا، کیا جناب! آپ کیسا..... آپ کیا فرما رہے .....؟" اُس آدمی کی لرزتی آواز حلق میں گھٹ گئی۔

"ہتھیار نکال کے ابھی اِیدر کو ڈال دے۔" پیرو نے دباڑ کے کہا۔ "دیری ایک دم کو نئیں۔"

"آپ لوگ، آپ کیسا بولتے ہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "ہتھیار؟ اپنے پاس ہتھیار بھلا کیسا؟"

"دیر کرے گا تو گھاٹا زیادہ ہو جائے گا رے۔" تجمل نے کہا۔

اُس شخص کا پورا جسم دھڑک رہا تھا۔ عورت بھی الف ہو کے بیٹھ گئی تھی اور اُس نے برقع کس کے لپیٹ لیا تھا۔ پیرو تمنچا تانے اُس کی طرف بڑھا اور تین چار قدم بعد ہی اُس کے سر پر جا پہنچا۔ "ابھی اِیدر ٹھکانے لگانے میں بھی کوئی واندا نئیں ہے، ابھی خود اُتار رہا ہے کہ اپن..... ؟" پیرو نے انتظار نہیں کیا، دوسرے ہی لمحے اُس کا جھپٹتا ہوا ہاتھ برقع پوش کے سر پہ پڑا۔ برقع پوش کا جسم اضطراری حالت میں پیچھے کی طرف ہٹا مگر پیچھے ڈبّے کی دیوار تھی، نتیجۃً برقع کی جالی بھی اوپر ہو گئی۔ پیرو نے جالی میں انگلیاں گھسیڑ کے اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ نیچے گریبان تک کپڑا اُدھڑ گیا۔ میری آنکھیں حیرت سے اُبل آئیں، برقع کے پیچھے اُس کا چہرہ ایک مرد کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ گھنی مونچھیں، پھٹی پھٹی آنکھیں، لرزتے ہوئے ہونٹ۔ اُس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگ گہرا گندمی تھا۔ پیرو نے دوسرے جھٹکے میں برقع ٹانگوں تک چیر دیا۔ میرے لیے یہ ایک ناقابلِ یقین منظر تھا لیکن میں پوری تن دہی سے اُسے تمنچے کی زد پر لیے رہا۔ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑا ہو گیا، اُس کا تمنچا نہ جانے کہاں دبا ہوا تھا کہ اسی وحشت میں فرش پر گر پڑا۔ پیرو نے اُس کے گال پر پوری طاقت سے طمانچہ مارا، وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا، کھڑکی کے کونے سے اُس کا سر ٹکرایا۔

تجمل سامنے کی برتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ دوسرے آدمی کے پاس بھی ہتھیار ہونے چاہییں، گو یہ ناگہانی دیکھ کے وہ بے حس و حرکت ہو لیا اور اُس کے پاس ہتھیار ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر احتیاط بہتر تھی۔ میں نے جھپٹ کے اُس کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ غیر ارادی طور پر ایک طرف ہٹ گیا، میرا ہاتھ اُس کے گریبان پر چلا گیا لیکن میں نے فوراً گریبان چھوڑ دیا۔ اِس طرح میرا ہاتھ گھر جاتا، ایک ہاتھ تمنچے کی وجہ سے پہلے ہی گھرا ہوا تھا۔ تمنچا بائیں ہاتھ میں لے کے میں نے اُس کی واسکٹ کی بیرونی جیبیں ٹٹولیں۔ اُن میں کچھ نہیں تھا، البتہ اندر کی جیب سے چھ انچ کا کھٹکے والا چاقو برآمد ہوا۔ چاقو فرش پہ پھینک کے میں نے اُس کی شال کھینچ لی اور کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اُس نے پہلی بار ذرا سی مزاحمت کی لیکن میری ایک ہی ترچھی ضرب سے وہ سنبھل گیا۔ کُرتے کی جیب میں تمنچا پڑا ہوا تھا اور بنیان کے نیچے کمر کے گرد کارتوسوں کی پیٹی بندھی تھی۔

پیرو نے برقع پوش کو بھی خالی کر دیا تھا۔ اب وہ عجب ہیئت کذائی کے عالم میں تھا۔ برقع جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا، اُس کا ایک حصہ شانے پر جھول رہا تھا۔

پیرو اُس پر مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔ میرے سامنے والا شخص بھی بُری طرح گھگھیانے لگا۔ اُس کی ہاتھیاں بھیجے اور زہر رنگ رہی تھیں۔ میں نے اُس کے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ مارا۔ وہ میرے پیروں پر گر گیا۔ اُسے اپنے پیروں سے دُور کرنے کے لیے میں نے اُس کے سر پہ تمنچے کے دستے سے ضرب لگائی۔ وہ چیختا ہوا اُچھلا، اُس کے ہاتھ جیسے ہی میرے پیروں سے چھوٹے، میں نے اُس کی ٹھوڑی پر گھٹنے کی ضرب رسید کی۔ وہ فرش پر کر کے بل لوٹ گیا۔ میں اُسے اور ٹھوکریں لگانا چاہتا تھا مگر تجمل کی آواز نے میرے ہاتھ پیر جکڑ لیے: "ابھی تھوڑا وقت دے دے اِس کو۔" اُس نے درشتی سے کہا۔ آدمی کی ٹوپی کب کی گر چکی تھی، میں نے بال پکڑ کے اُسے زمین سے اُٹھایا اور برتھ پر دھکیل دیا۔ وہ بلبلاتا ہوا سکڑ کے بیٹھ گیا۔

"اِدھر کو آ جا رے۔" تجمل نے مجھ سے کہا۔ "ابھی اِن سے اِن کی ماں کے یاروں کا پتہ بھی کرنا ہے، کون کون ہیں وہ رنڈی کے جنے۔"

پیرو نے بھی سُن لیا تھا، وہ برقع پوش کے پاس سے ہٹ آیا۔ دونوں آدمی ایک دوسرے سے گز بھر کے فاصلے پر بیٹھے ہانپ رہے تھے۔ برقع پوش کے ہونٹوں سے خون کی لکیر ٹھوڑی تک چلی گئی تھی۔ اُس کی ناک بھی سوجی ہوئی تھی۔

"ابھی کتنا ساتھ میں ہے کتنا آدمی؟" پیرو نے کڑکتی آواز میں پوچھا۔

"کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں۔" برقع پوش آدمی گڑگڑا کے بولا۔ "ہم بالکل اکیلے ہیں مائی باپ!" صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

"اپن پوچھتا ہے، ابھی کتنا آدمی ساتھ ہے؟"

"سات!" برقع پوش کے بجائے شال والے آدمی نے سٹپٹاتی آواز میں کہا۔ "اپنے ساتھ سات آدمی اور ہیں۔"

"یہ تھوڑا اپنے کو سمجھ والا لگتا ہے۔"

"دھوپ زیادہ لگی ہے دادا اِس کو۔"

"کیدر، کیدر بیٹھا ہے؟"

"پانچ اِس طرف والی بوگی میں ہیں، باقی دو پیچھے کی بوگی میں ہیں، سارے انٹر کلاس میں ہیں۔"

"اور اُدھر بازو والا فرسٹ کلاس میں بیٹھا اپنے باپ کو بھول گیا؟"

"بازو والے میں کون؟" وہ بدحواسی سے بولا۔

"یہ بھی ابھی اپن بولے گا؟" پیرو نے غضب آلود لہجے میں کہا۔ "دیکھ سالے! ابھی سیدھا سیدھا بولے گا تو اپنے ساتھ ہی بھلا کرے گا۔ بات تھوڑا کم کرو اور سیدھا کرو۔"

"ہم اُن کو نہیں جانتے جناب!"

"نئیں جانتا؟" پیرو نے بڑھ کے اُس کی دونوں کنپٹیاں پکڑیں اور انگلیوں سے مسلنے لگا۔ "نئیں جانتا تھا نا؟"

"ہم کو نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں۔" وہ سسکتی آواز میں بولا۔ "ہم کو اپنی ماں کی قسم، اپنے خدا کی قسم، آپ کو ضرور دھوکا ہوا ہے، ہم قسم کھاتے ہیں۔"

"ابھی سنا ٹھل بھائی! رات والا حرام زادہ بھی قسم کھاتا تھا۔ یہ حیدرآباد اسٹیٹ کا لوگ سالا کھانا نہیں کھاتا کیا؟"

"کھانا بھی کھاتا ہے، پر ہم کو یہ اٹھائی گیرے حیدرآباد کے نہیں لگتے، یہ پاری ہیں حیدرآباد پار کے۔"

"آپ بالکل، بالکل درست فرمارہے ہیں، ہمیں حیدرآباد آئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ ہم تو جناب بس یہاں آکے پھنس گئے۔ بدنصیبی یہاں کھینچ لائی، سب قسمت کی بات....."

"تم سے بولا ہے کہ ابھی زبان تھوڑا کم چلاؤ، جو اپن پوچھتا ہے، اُس کا ایک دم ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"

"ہم آپ سے کچھ نہیں چھپائیں گے۔"

"چھپانے گا تو اکھا خود چھپ جائے گا سدا کو۔" پیرو کے لہجے میں کوئی لوچ نہیں تھا۔ "ابھی کس نے ایدر کو بھیجا ہے؟"

گاڑی کو واڑی اسٹیشن سے چلے آٹھ دس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ رفتار بہت تیز تھی۔ میں نے خیال رکھا کہ موقع ملنے پر کہیں اُن میں سے کوئی اُٹھ کے زنجیر نہ کھینچ دے۔ وہ کاٹھی اور بشرے سے زور دار ایسے کم معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن اس اچانک افتاد نے اُن کے ہوش و حواس سلب کر لیے تھے۔ ہم نے حواس کی بحالی کے لیے کوئی بھی لمحہ انھیں فراہم نہیں کیا تھا۔ یہ سب کچھ اُن کے لیے ایک خواب کے مانند ہوگا جیسے خواب آدمی کو بے اختیار کر دیتے ہیں۔ پیرو نے برقع پوش کو نیم جاں کر دیا تھا، دوسرے کی حالت بھی اُس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اُس کے بہ قول آدھے گھنٹے بعد گلبرگہ آنے والا تھا۔ اِس عرصے میں ہمیں اُن سے اُن کے ساتھیوں اور بھیجنے والوں کے بارے میں یقین کر لینا تھا۔ اِس کے علاوہ اُن کا فیصلہ بھی کرنا تھا۔ پیرو کے اِس سوال سے میرے جسم و جاں پر بھی سناٹا چھا گیا کہ کس نے انھیں ہمارے تعاقب میں بھیجا ہے؟ جانے یہ کس کا نام لے دیں! بھیرو کے راجا دھرم دیر کا یا جیسا کہ پیرو نے خدشہ ظاہر کیا تھا، نواب حشمت جنگ کا؟ یہ نواب حشمت جنگ کا نام بھی لے سکتے ہیں، کاش پیرو کا وہم، وہم ہی ثابت ہو، یہ نواب حشمت جنگ کا نام نہ لیں۔ میرا دل اپنی آنکھوں کے اتنے بڑے جھوٹ، اپنے اعتبار کے اتنے بڑے فریب پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ دونوں زبان پر کسی کا نام لاتے ہوئے خوف زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کے تامل نے پیرو کو اور برافروختہ کر دیا۔ پیرو نے مجھے اشارہ کیا۔ ہماری دو ایک ضربوں نے جلد ہی اُن کی جھجک دور کر دی۔ شال والے شخص نے پیرو کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور ہزیمت خوردہ لہجے میں بولا۔ "ہم کو نواب قطب الدین علی نے بھیجا ہے۔"

"قطب الدین علی؟" پیرو نے حیرت سے کہا۔ "ابھی یہ کون ہے سالا؟"

"یہ ریاست کے ایک بڑے نواب ہیں۔"

"تم اُس کا کون ہے؟"

"ہم اُن کے نوکر ہیں جناب! اُن کے سپاہیوں میں۔"

"وہ دربار میں رہتا ہے؟"

"دربار میں اُن کی بہت پہنچ ہے۔"

"ابھی تم سالا اپن کو کسی کا بھی نام بول سکتا ہے۔"

"ہم حلف اُٹھا سکتے ہیں۔"

"حلف کا بات مت بولو۔ تم سمجھتا ہے، اپن تمھارے حلف پر یقین کرلے گا؟"

"پھر ہم آپ کو کس طرح یقین دلائیں؟"

"وہ تو ہم ابھی تم میں سے ایک کو گاڑی سے نیچے پھینک کے کرلے گا۔ تم ابھی بالکل نہیں سمجھا، تم ابھی کید ہے۔ یہ گاڑی چل رہا ہے۔ ابھی رات کا ہے۔ ایدر دروازے سے تم کو باہر ڈالے گا تو وہ تمھارا نواب کا جنا سالا مرتے تک ٹاپتا رہنے کا ہے۔ پر اُس کے پاس تمھارا جیسا نمک کا بھیک مانگنے والوں کا کمی نئیں ہے۔ تم جانے گا تو بدلے میں ابھی دوسرا چار آجائے گا۔"

"ہم بے قصور ہیں، ہم صرف حکم کے بندے ہیں۔"

"ایدر اپن بھی حکم کا بندہ ہے، پر اپنے حکم کا۔" پیرو نے دہکتی آواز میں کہا۔ "رات کو بھی آدمی اُسی نے بھیجا تھا؟"

"رات کو؟ رات کو کون سے آدمی صاحب؟"

"کل رات اودر حیدرآباد میں، اپن کا حویلی میں؟"

"ہم بخدا اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جناب!"

"اُودر اور کتنا تمھارے نواب کے تھان پہ بندھتا ہے؟"

"جی جی۔" وہ فوراً نہیں سمجھ پایا، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بہت آدمی ہیں جناب، نواب قطب الدین علی بہت بڑے نواب ہیں۔ اُن کی زمینیں جاگیر میں ..... کی گنتی نہیں ہے۔"

"اودر ابھی کوئی چھوٹا بھی ہے؟" پیرو نے نفرت سے کہا۔ "کیا بول کے بھیجا تھا اُس نے تم کو؟ ایک دم ٹھیک بولے گا اور جلدی۔ سمجھا!" گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی۔ پیرو نے بے چینی سے ٹھل کی طرف دیکھا۔ ابھی گلبرگہ کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ واڑی اور گلبرگہ کے درمیان بھی گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھیر سکتی تھی اور اسٹیشن کے بغیر بھی۔ ..... برقع تھا۔ اُن دونوں کی ..... سی ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ اگر گاڑی ٹھیرنے میں کچھ وقت لے لیا تو وہ لینے کے لیے اُن کے ساتھیوں کا اِس طرف آنا تھا۔ اِس حالت میں اُن دونوں کو سامنے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ کسی طرح بھی اُن کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا سکتے تھے۔ ویسے خاموش رہنے سے بھی اِن کے ساتھیوں کے دلوں میں شک کی گرہ پڑ سکتی تھی، اِن دونوں کو یقین ہوگا کہ ٹھیری ہوئی گاڑی میں یہ بالکل محفوظ رہیں گے کیونکہ ہم کوئی ہتھیار استعمال نہیں کر سکیں گے تو دیکھتے رہ جائیں گے۔ گاڑی کی رفتار اور کم ہوگئی۔ میں نے جھک کے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ گاڑی کسی آباد علاقے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب اُن دونوں کو ڈبے کے بیت الخلا میں چھپانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پیرو نے بھی ایک پل ضائع کیے بغیر مجھ سے یہی کہا کہ میں برقع والے کو لے کے وہاں چلا جاؤں۔ دوسرے کے کندھے پر پیرو نے ہاتھ اوپر اُٹھا کے اتنی زور سے مار کر نشست پر وہ دھنسنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ پیرو نے اُسے حکم دیا کہ گاڑی جب تک اسٹیشن پر ٹھیرے، وہ چادر اوڑھے برتھ پر لیٹا رہے، ذرا بھی حرکت ہوئی تو تمنچے کی گولی اُس کے جسم کے پار ہوگی، اُسے بلبلانے کا وقت بھی نہیں مل سکے گا۔ میں نے اِدھر برقع پوش کا بازو تھام کے جھٹکا دیا۔ وہ ہڑبڑاتا ہوا اُٹھا، میں نے اُس کے کولھے پر ٹھوکر مار کے اُسے اُس جگہ کے اور قریب کر دیا۔ ٹھل نے اُٹھ کے دروازہ کھول دیا، ہم دونوں ڈبے کے اِس مختصر حصے میں آگئے، جو فرسٹ کلاس میں کچھ مختلف ہوتا ہے، نسبتاً صاف ستھرا، ہاتھ دھونے کے لیے بیسن، آئینہ وغیرہ۔ جگہ بھی اتنی تنگ نہیں تھی۔ تین آدمی آسانی سے آسکتے تھے، چار کا سمانا مشکل ہو جاتا۔ میرے ہاتھ میں تمنچا دبا ہوا تھا، حالانکہ اِس کی ایسی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سکڑا سمٹا نظریں جھکائے ایک طرف کھڑا رہا۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی ٹھیر گئی۔ اوپر ہوا کے لیے ادھ کھلے روشن دان سے اسٹیشن کی ملی جلی آوازیں اندر آرہی تھیں۔ یہ کوئی چھوٹا اسٹیشن تھا، واڑی جنکشن کی طرح یہاں بہت زیادہ شور نہیں تھا۔ پلیٹ فارم بھی پرلی طرف معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنے سارے حواس سمیٹے مستعد کھڑا اُس پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ بظاہر کوئی کھٹکا نہیں تھا لیکن بہت کچھ گاڑی کے کم یا زیادہ ٹھیرنے پر منحصر تھا۔ کبھی گاڑی چھوٹے اسٹیشن پر بھی دیر تک ٹھیر جاتی ہے، کسی اور سبب سے بھی وقت طول کھینچ سکتا ہے لیکن خیر گاڑی دو تین منٹ بعد حرکت میں آگئی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اُن کے ساتھی اِس مختصر وقفے میں غالباً نہیں اُترے ہوں گے، ایک دو اُترے بھی ہوں گے تو اُنھیں ڈبے کے دروازے پر ٹھل کھڑا نظر آیا ہوگا اور اندر برتھ پر بیٹھا پیرو دکھائی دیا ہوگا۔ ظاہر ہے، ٹھل کی موجودگی میں اُنھوں نے ڈبے میں جھانکنے کی جرأت نہیں کی ہوگی۔ گاڑی چلتے ہی میں باہر نکل سکتا تھا لیکن میں نے انتظار کیا۔ جب تک دستک نہیں ہوئی، میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ شال والا آدمی اب بیٹھا ہوا تھا۔ اُن دونوں کا سامان برتھ کے نیچے رکھا تھا، نواب حشمت جنگ کے ٹوکرے نے اُسے بالکل چھپا دیا تھا! اندر آکے میں نے ٹھل اور پیرو سے نہیں پوچھا کہ کیا اِس طرف کوئی نزر تھا؟ ٹھل اور پیرو کی پیشانیوں پر پہلے کی طرح لکیریں پڑی ہوئی تھیں، کچھ اخذ کرنا آسان نہیں تھا۔ پیرو نے انھیں سانس لینے کی مہلت نہیں دی۔ گاڑی جنبش میں آتے ہی وہ اُن کے سامنے کھڑا ہوگیا، شال والے شخص کے گال پر اُس نے زناٹے کا طمانچہ رسید کیا۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا ہوگا۔ پیرو نے پھر اُس سے یہی سوال کیا کہ اُن کے آقا نے انھیں یا ہدایات دے کے ہمارے تعاقب میں روانہ کیا تھا؟ پیرو کے طمانچے سے اُس کا منہ ٹیڑھا ہوگیا اور ہونٹ پھٹ گئے۔ وہ حلق تر کر کے کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ برقع والے آدمی نے تیزی سے کہا۔ "میں بتاتا ہوں حضور! ایک ایک بات، میں آپ کو بتلاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، جو تجھ کو اِس سے پہلے یاد آگیا۔" پیرو نے کاٹ دار لہجے میں ایک بار پھر اُسے تفصیل سے اجتناب کی تنبیہ کی۔

"ہمارا نواب صاحب سے سامنا نہیں ہوا تھا، اُن کے ایک خاص آدمی ہیں منشی مبارک صاحب، اُنھی نے نواب صاحب کا نام لے کے کہا تھا کہ ہمیں کچھ لوگوں کے پیچھے جانا ہے۔ منشی مبارک اسٹیشن تک ہمارے ساتھ آئے تھے، وہیں اُنھوں نے آپ کی پہچان کرائی۔"

"کب؟ ابھی کب اُس نے تم کو ایسا بولا تھا؟"

"اُنھوں نے شام چار بجے کے قریب ہمیں بتایا تھا کہ رات کو تیار رہنا ہے، آٹھ بجے کے قریب، ہم تیار بیٹھے تھے، اُنھوں نے حکم دیا کہ تمھیں بمبئی کی گاڑی میں جانا ہے۔ زیادہ سے زیادہ گلبرگے تک۔"

"گلبرگے تک کیوں؟ بمبئی تک کیوں نہیں؟"

"گلبرگے کے بعد ریاست کا علاقہ تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔ وہ بولتے تھے کہ گلبرگے تک چار پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔ تمھیں رات رات میں اپنا کام کر دینا ہے۔" برقع پوش بار بار اپنے ساتھی کی طرف دیکھتا تھا مگر اُس نے ایک بار بھی دخل نہیں دیا تھا۔

"کیسا کام کو بولا تھا؟"

"کہا تھا کہ تمھیں کسی طرح بڑے صاحب کے ڈبے میں پہنچنا ہے اور گاڑی چلتے ہی تمنچا نکال لینا ہے۔ ایک پل بھی دیر نہیں لگانا۔ تلاشی میں ہو سکتا ہے تمھیں وہ چیز مل جائے جس کی ہم کو ضرورت ہے۔ بس چیز لے کے تم کو فوراً واپس آجانا ہے۔"

"صرف اتنا سا بات؟"

"اُنھوں نے کہا تھا، تم کو بہت احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ وہ لوگ نظر کے بہت تیز ہیں، دور سے آدمی کو سونگھ لیتے ہیں۔ ہتھیار پاس رکھتے ہیں اور تمنچہ چلانا بھی انھیں خوب آتا ہے۔ انھیں نہ کوئی شک ہونے دینا، نہ تمنچا نکالنے میں دیر کرنا ہے۔ سوچ سمجھ کے اندر داخل ہونا۔"

"اور اگر مال اِپن کے پاس نہ نکلا تب؟ تب؟"

"پھر اُنھوں نے ہمیں واپس ہو جانے کو کہا تھا۔ کہا تھا کہ پھر گلبرگے سے، یا اگر ہم پہلے ہی کام کرلیں تو وہیں گاڑی سے اُتر جانا ہے۔ اُنھوں نے کہا تھا، وہ لوگ اپنا سفر کھوٹا کرنا نہیں چاہیں گے اور جھگڑا کرنے سے بچیں گے۔ تمھیں بھی اُن سے خواہ مخواہ نہیں اُلجھنا ہے۔"

"پھر تم کو سالا دیر کاہے کو لگ گیا؟"

اُس کی آواز جھرجھرا رہی تھی، کہنے لگا کہ اُنھوں نے ہمارے ڈبے میں داخل ہونے کے لیے طرح طرح کے طریقے سوچے لیکن ہم ہر جگہ اُنھیں جاگتے نظر آئے۔ اُس نے بتایا کہ فقیر کی شکل میں جو آدمی ہم سے بھیک لے کے گیا تھا، وہ بھی اُنھی کا آدمی تھا۔ اُس نے لوٹ کے اُنھیں بتایا کہ اندر داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ گاڑی کے خاکروب کو اُنھوں نے کچھ پیسے تھما کے روک لیا تھا اور جو آدمی جھاڑو ڈبلے کے صفائی کے لیے آیا تھا وہ بھی کوئی اور نہیں تھا، اُنھی کے آدمیوں میں سے ایک تھا۔ اُس نے ڈبے

کا سارا نقشہ کھینچا اور بتایا کہ اُس نے ہم میں سے کسی کے ہاتھ میں تمنچا بھی دبا ہوا دیکھا ہے۔ جائے دالے کے ٹھیلے کے گرد بھی اُن کے آدمی گھومتے رہے تھے۔ راستہ ٹھیک ہونے کی وجہ سے گاڑی جہاں ٹھہری تھی، وہاں بھی اُتر کے انھوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا تھا۔ انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی اسٹیشن ہی پر ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کریں، ایسی کسی جگہ قطعاً نہیں جہاں ذرا بھی شک کی گنجائش ہو۔ ہمیں غافل بالکل نہ سمجھا جائے۔ ہمارے شک کا مطلب اُن کی ناکامی ہے، کامیابی کا یقین کیے بغیر اُن کا اندر جانا بے سُود ہوگا۔ ہمارے پاس مال کا اندازہ انھیں ہمارے چوکس رہنے سے ہو جائے گا۔ برقع پوش کے بہ قول منشی مبارک نے کہا تھا کہ اُن کے آدمی دونوں ڈبوں میں بیک وقت داخل ہوں تو بہتر ہے۔ داخل ہوتے ہی اگر موقع نہ ملے تو انھیں اُس وقت تک صبر کرنا ہے جب تک ہمیں اُن کی سادہ دلی اور نیک نیتی پر اعتبار نہ آجائے۔ پھر انھیں کوئی لمحہ ملے تو معمولی چوک بھی نہیں ہونی چاہیے۔ برقع پوش چُپ ہوگیا۔ جب بھی وہ نگاہ اُٹھا کے پیرو کی طرف دیکھتا، اُس کی زبان لڑکھڑا جاتی۔

"اور کچھ نہیں بولا تھا؟" پیرو نے بھناتی آواز میں کہا۔

"بس بس دادا! اتنا بہت ہے۔" ٹھل اپنی نشست سے اُٹھ گیا۔ "اس کا کام اب ختم ہوگیا ہے۔"

"آگے ابھی تم بولے گا، اِس سے آگے کا بات؟" پیرو نے شال والے شخص سے مخاطب ہو کے کہا۔

"اس سے بعد میں پوچھنا دادا!" ٹھل کی آواز جیسے برف میں جمی ہوئی تھی۔ "پہلے اِس ہنڈ ملے کا حساب تو چُکتا کر دو۔ اگلا پھر سرپٹ بولے گا۔" یہ کہتے ہی ٹھل نے دو قدم آگے جا کے اور ہاتھ بڑھا کے پلک جھپکتے میں برقع پوش کی گردن پیچھے سے دبوچ لی۔ گردن پر ٹھل کے گڑے ہوئے پنجے سے اُس کا سارا جسم پھڑکنے لگا۔ وہ واویلا کرنے لگا کہ اُس نے کوئی غلط بیانی نہیں کی ہے۔ ٹھل نے اسی حالت میں اُسے برتھ سے اُٹھا لیا اور گردن چھوڑ کے، دونوں ہاتھ پھیلا کے اُس کے جبڑوں پر ہتھیلیوں کی ضرب لگائی۔ وہ معاً فرش پر گر پڑا اور ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ ٹھل نے جھٹ دوبارہ اُس کی گردن پکڑ کے اُسے اٹھا لیا اور گُدّی کے قریب چٹکی بھری۔ پہلے میں کچھ اور سمجھ رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ٹھل کے ارادے کا اندازہ ہوگیا۔ چٹکی بھرنے ہی برقع پوش کے شانے جھول گئے اور وہ سسکاری بھر کے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

پیرو کے اشارے پر میں نے نواب حشمت جنگ کا ٹوکرا ہٹا کے اُن کا صندوق باہر نکال لیا۔ مجھ سے اُس کا تالا کھلنے میں دیر لگ رہی تھی، پیرو نے صندوق کے تسمے میں چاقو اڑا کے چمڑا کاٹ دیا۔ صندوق میں انگریزی بسکٹوں کے دو ڈبے، دوائی کی شیشی، چپل کی جوڑی، بوٹ، تین چار جوڑی عام قسم کے کپڑے، تہمد، سلکی شیروانی، قراقلی ٹوپی اور پولیس کی کلف دار وردی اور وردی کے دیگر لوازم کے علاوہ کارتوسوں کا ڈبا اور ایک تمنچا بھی رکھا تھا۔ چرمی بیگ کھولنے میں مجھے زحمت نہیں کرنا پڑی۔ اُس میں میلے کچیلے کپڑے، تولیا، صابن، تیل کی شیشی، کنگھی، پیتل کا سفری گلاس اور چادریں ٹھنسی تھیں۔ پیرو سارا سامان غور سے دیکھ رہا تھا۔ ٹھل نے ٹوک کے وقت کی تنگی دلایا اور کھدر کی ایک رنگین منقش چادر اُٹھا کے مجھ سے فرش پر پھیلانے کو کہا۔ نے اپنے ہاتھ سے فرش پر بکھرے ہوئے چند کپڑے بھی اُس میں ڈال دیے۔ اگلے اقدام کے تصور سے میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ میں نے حیرت سے طرف دیکھا۔ "تھوڑے کپڑے چادر میں اور گیبر دے رے۔ کریا اس کی بڑی جلدی کر۔" اُس نے مجھے سوچنے اور کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اُس کا حکم سُن کر ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے تھے۔ اُن دونوں نے میری مدد کے بغیر بے سُدھ آدمی کو اِدھر پیروں سے، اُدھر بازوؤں سے اُٹھا کے چادر پر ڈال دیا اور مجھ کھولنے کو کہا۔ دروازہ کھولنے سے روشنی باہر جانے لگی۔ ٹھل نے بٹن دبا کے ڈبے میں روشنی خاصی کم ہو گئی، خصوصاً دروازے کے سامنے۔ دیر اندھیرا تھا لیکن شال والے شخص کے لیے کسی قدر روشنی چاہیے تھی۔ ٹھل اور پیرو نے طرف چادر کے کونے پکڑ کے برقع پوش کو دروازے کے قریب رکھ دیا۔

اُسی وقت شال والا شخص اپنی نشست سے چیختا ہوا اُٹھا۔ اُس نے پیر پکڑ لیے۔ "اِس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ خدا کے لیے معاف کر دو، اِسے اتنی دو۔" وہ ٹھل کے پیروں سے چمٹ کے دہائیاں دینے لگا۔ ٹھل نے پیر چھڑانے چاہے اور زور سے پکڑ لیے۔ ٹھل نے اُس کے بال پکڑ کے اپنے پیر آزاد کرائے اور اُس کے پیٹ میں گھٹنا مارا، وہ دُہرا ہوگیا۔ پیرو نے اُسے سامنے کی برتھ پر دھکیلا، تمنچا تان کے اُسے دوسری طرف منہ پھیر کے کھڑے ہو جانے کا حکم دیا۔ تعمیل ہی اُس مناسب تھی۔ اُسی لمحے ٹھل نے بھن بھناتی آواز میں مجھے اور پیرو کو کسی تاخیر برقع پوش کو نیچے ڈال دینے کی ہدایت کی۔ ٹھل نے اِس کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن کچھ واضح تھا۔ پیرو بھی جان گیا تھا کہ ڈال دینے سے ٹھل کی کیا مراد ہے۔ وہ کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ اِس طوالت کی کیا ضرورت تھی۔ اُسے یوں بھی اُٹھا کے پھینکا جا سکتا تھا۔ گاڑی کی رفتار کی جھونک میں شاید ہی اس کے جسم کا حصہ سلامت رہ پاتا۔ اُسے ختم کر دینے میں دوسری پیچیدگیاں بھی پیدا ہو سکتی تھیں۔ ابھی سفر میں تھے۔ آبادی جانے کتنے دُور تھی۔ لاش دریافت ہونے میں ہمارے خلاف بہت کم وقت بھی لگ سکتا تھا۔ زندہ آدمی کا اختیار چاہے وہ زندہ جاں کیوں نہ ہو، اُسی کے پاس رہتا ہے اور جو آدمی ویسے بھی اپنا اختیار ہی رکھنا چاہتا ہے مگر مرنے کے بعد بعض آدمی بہت اہم ہو جاتے ہیں۔ بہرحال کے فیصلے سے میرے بند بھی جیسے کسی نے کھول دیے۔ میں نے دروازے سے کے باہر کا جائزہ لیا۔ ہمیں دونوں طرف سے چادر کے کونے پکڑ کے اُسے زمین پر تھا، اِس طرح اُس کے جسم کو بس ذرا دھچکا لگتا۔ لائن کے ساتھ بچھے ہوئے کی ڈھلان اُسے گاڑی سے کچھ دُور کر دیتی۔ اِدھر میں نے ایک ہاتھ سے چادر دونوں کونے پکڑے، اُدھر سے پیرو نے چادر پکڑی۔ برقع پوش کا جسم خمیدہ ہوگیا، جیسی شکل بن گئی بلکہ زنبیل جیسی۔ اُس کے جسم کے نیچے مختلف قسم کے کپڑے ہوئے تھے۔ ہمیں چادر کے کونے پکڑے پکڑے اپنے ہاتھ اتنے نیچے لے جانے تھے کہ گٹھری اور زمین کا فاصلہ کم سے کم رہ جائے اور اُسے چوٹ کم سے کم لگے۔

وہ اچھا خاصا بھاری آدمی تھا۔ ہم نے اُسے اُٹھا کے دروازے کے سر پر رکھ دیا۔ پیرو نے میری طرف کے سرے بھی پکڑ لیے۔ میں نے ایک بار پھر دروازے سے سر نکال کے باہر کا جائزہ لیا۔ گاڑی فراٹے بھرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ہر طرف سبزے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ تاحدِ نظر اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں نظر کی حد ہی کتنی ہوتی ہے۔ آسمان ابھی تک بادلوں کے پرتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک تارہ بھی کہیں کسی گوشے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بارش کی نمی فضا میں گھلی ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک کوئی بھی مجھے کھڑکی یا دروازے سے جھانکتا نظر نہیں آیا۔ آجان کے ڈبے کے دروازے پر بھی کوئی نہیں تھا۔ ہوتا تو شاید اچھا تھا۔ مجھے اور پیرو کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ ہم کھڑے ہو کے یا بیٹھ کے گٹھری اور زمین کا فاصلہ اتنا کم نہیں کر سکیں گے۔ ہمارے درمیان کسی لفظ کا تبادلہ نہیں ہوا مگر میں نے اور اُس نے بیک وقت فرش پر بیٹھنے کا ارادہ کیا اور گٹھری نیچے کی طرف کھسکانی شروع کی۔ گٹھری سیڑھیوں سے رگڑ کھاتی کچھ ہی دُور گئی تھی کہ ہم نے فرش پر لیٹ جانے کا فیصلہ کیا اور اپنے جسم شانوں تک باہر نکالنے کی کوشش کی کہ گٹھری سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر رہے۔

ہوا کے تھپیڑے میرے چہرے پر طمانچے سے مار رہے تھے اور بال بار بار آنکھوں پر آجاتے تھے۔ نیچے فرش کی زمین بھی صاف نظر نہیں آرہی تھی۔ تیز ہوا، گاڑی کے شور، اندھیرے اور ڈبے کی دھڑکن جیسی جنبشوں نے برقع پوش کے وزن کا احساس کچھ اور بڑھا دیا۔ ہاتھ آگے بڑھائے بڑھائے بوجھ برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہم اتنے آگے بھی نہیں بڑھ سکتے تھے کہ پیچھے سے اپنا توازن کھو بیٹھیں، پھر بھی ہم خاصے آگے جھک آئے۔ گٹھری اور زمین کے فاصلے کا اندازہ کرنے کے بعد ہم دونوں کو ایک ساتھ چادر کے کونے چھوڑ دینے تھے۔ کسی کو بھی ایک لمحے کی دیر نہیں ہونی چاہیے تھی۔ پیرو کو بھی اِس کا خیال تھا۔ ہم نے گٹھری کچھ اور نیچے کر دی۔ اب پیرو نے میرے ہاتھ میں جکڑے ہوئے کونے بھی اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے مجھے شانے سے ٹھوکا دیا۔ میں نے تامل کیا۔ اِس طرح کسی ایک کے ہاتھ میں چاروں کونے آجانے سے برقع پوش گٹھری بن جاتا۔ اُس کا جسم اتنا مڑا بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نیچے ڈالنے پر جب اُس کا جسم کھلتا تو سر کے زمین یا زمین پر پڑے ہوئے پتھروں سے ٹکرانے کی ضرب شدید ہوتی کیونکہ زیادہ مڑے ہونے کی صورت میں جسم کے درمیانی حصے سے سر کا اوپر ہونا لازم تھا۔ میں نے پیرو کا مشورہ نہیں مانا۔ اُس نے بھی دوبارہ مجھے نہیں ٹوکا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار ابھی تیز تھی اور کسی وقت بھی سُست پڑ سکتی تھی۔ رفتار کی کمی کسی اسٹیشن کی آمد کی علامت ہوتی ہے۔ ہمیں اِس سے پہلے اپنا کام یقیناً نمٹا لینا چاہیے تھا۔ اتنی دیر میں برقع پوش کو بھی ہوش آسکتا تھا۔ ہم گٹھری کو اتنی ڈھیل بھی نہیں دے سکتے تھے، کہیں وہ زمین سے نہ لگ جائے۔ جگہ کی موزونی کا تعین کر لینا بھی مناسب تھا، وہ کسی پُلیا یا کھڈ میں نہ جا گرے، کسی چٹان یا پتھر سے نہ ٹکرا جائے۔ کہیں کہیں دوسرے ڈبوں کی کھڑکیوں سے روشنی کے چھینٹے باہر آرہے تھے مگر اُن کی حیثیت جھماکوں کی سی تھی، جھماکے گاڑی کی تیز رفتاری میں سامنے کی کسی چیز کا تعین نہیں ہونے دے رہے تھے۔ متحرک روشنی اور جامد روشنی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بہرصورت زمین ہموار ہونے کا اندازہ کھڑکیوں سے آنے والی روشنی سے بھی کیا جا سکتا تھا۔ سامنے جھاڑیاں یا چٹان ہونے پر روشنی ترچھی اور زمین پر لیٹی ہوئی ہونی چاہیے تھی۔ وہاں اتنی جھاڑیاں نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ نہ پانی کا امکان تھا کہ روشنی کے لرزاں جھماکے اس پر منعکس ہوتے نظر آتے۔ گاڑی کے شور سے بھی جگہ کا کچھ تعین ہوتا تھا۔ اِرد گرد درخت ہوں، سرنگ، پُل، پُلیا یا چٹانیں اور کھلا میدان، سب میں شور مختلف ہو جاتا ہے۔ میدان میں اِس شور کی بازگشت دُور دُور تک گونجتی ہوئی صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ ہم اپنے عین نیچے یعنی سیڑھیوں کے سامنے کی زمین، ایک تو اندھیرے، دوسرے گٹھری کی دیوار کی وجہ سے دیکھنے پر قادر نہیں تھے۔

پہلے میں گٹھری دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھا لیکن پیرو کا بایاں ہاتھ کھلا دیکھ کے میں نے بھی گٹھری کے کونوں سے اپنا ایک ہاتھ کھینچ لیا اور فرش کا کنارہ پکڑ لیا۔ میرا توازن اور مستحکم ہوگیا مگر ایک بازو پر میرے حصے کا سارا زور پڑ گیا۔ صرف لٹکانے کی بات ہوتی تو اتنی دقت پیش نہ آتی۔ سیڑھیوں سے گٹھری دُور رکھنے کے لیے ہاتھ آگے بھی رکھنا پڑ رہا تھا اور نیچا بھی، اسی طرح گٹھری اور زمین کا فاصلہ کچھ اور کم ہو سکتا تھا۔ برقع پوش کی تلاشی میں پیرو کو ایک بیٹری بھی دست یاب ہوئی تھی۔ پیرو کو بیٹری استعمال نہیں کرنا چاہیے تھی لیکن اُس نے اپنا جسم دروازے کی جانب اور کھسکا لیا۔ میں نے بھی اُس کی پیروی کی۔ اِس سے زیادہ بڑھنے پر گٹھری کے ساتھ ہم خود بھی لوٹ سکتے تھے۔ کچھ اور آگے کھسکنے سے گٹھری اور ہمارے سر کے درمیان جھری بن گئی۔ پیرو نے بہت مشکل سے کرتے کی جیب سے بیٹری برآمد کی ہوگی۔ اُس نے یہ احتیاط کی کہ بیٹری کا رُخ سیدھا زمین کی جانب رہے، اِدھر اُدھر روشنی نہ پھیلے، اتفاق سے اگر کوئی دروازے یا کھڑکی سے جھانک رہا ہو تو اُسے کچھ سمجھنے کا موقع نہ ملے۔ ریلوے لائن کے ساتھ پڑے ہوئے پتھروں کے بعد ہمیں جگہ کی سطح دیکھنا تھی لیکن رُخ زمین پر رکھنے کی کوشش میں بیٹری پیرو کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ مجھے اِس سے کچھ اطمینان ہی ہوا۔

اتنی دیر میں ہماری آنکھیں اندھیرے سے کسی حد تک مانوس ہو گئی تھیں۔ میرے ذہن میں ایک اور بات آئی کہ ٹھل سے کہوں، وہ کھڑکی سے ایک نظر دیکھ کے ہمیں بتائے کہ زمین سے گٹھری کس قدر قریب ہو گئی ہے۔ شاید ترچھا دیکھنے پر اُسے کچھ نظر آسکے۔ مگر میں اُسے پکارتے پکارتے رہ گیا۔ اُسی لمحے پیرو نے اور ڈھیل دے کے گٹھری نیچے کی، پھر اور نیچے کی۔ مجھے بھی یہی کرنا تھا۔ پیرو کی بات جلد ہی میرے دماغ میں بھی آ گئی۔ چادر میں برقع پوش کے جسم کے نیچے کپڑے بھی پڑے ہوئے تھے اِس لیے تھوڑی رگڑ کھانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ہم اُسے آہستہ آہستہ نیچے کرتے کرتے زمین کی سطح

کا اندازہ کرسکتے تھے۔ جہاں گٹھری زمین سے جا ملے گی، ہم فوراً اِس سے دست بردار ہو جائیں گے۔ پیرؤ کو بھی اِس کا احساس ہوگا کہ چادر کے کنارے چھوڑتے ہوئے ہم دونوں میں ایک پل کا بھی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے یہی کیا۔ چیونٹی کی رفتار سے ہم گٹھری نیچی کرتے رہے، اچانک میرا وجود متزلزل ہوگیا۔ زمین سے رگڑ کھاتے ہی میں نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ اوپر کرلیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دماغ بالکل ہی ماؤف ہو چکا تھا۔ ہاتھ اوپر کرنے پر میری طرف کے حصّے سے گٹھری بھی اوپر ہوگئی۔ میں حواس باختگی میں چھوڑ دیتا مگر پیرؤ نے اسی لمحے میرا شانہ زور سے پکڑلیا۔ بس گٹھری چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔ مجھے جھڑکنے کے بجائے اُس نے اوسان بحال رکھنے کی تلقین کی اور پھولی ہوئی سانسوں سے کہا کہ میں جس ہاتھ سے چادر کے کونے پکڑے ہوئے ہوں اُسے اور پھیلاؤں۔ اُس نے اپنا بایاں ہاتھ اُسی طرف پھیلالیا تھا۔ چادر کھنچنے سے برقع پوش کا جسم پھیل گیا۔ گٹھری زمین سے بے شک کچھ اور اوپر ہوگئی لیکن برقع پوش کے دھڑ کی نسبت اُس کا سر ایسا اونچا نہیں رہا۔ ہم نے اِسی حالت میں دونوں طرف سے ہاتھ پھیلا پھیلا کے اُسے پھر نیچا کیا۔ میں نے اِس بار اپنے ہوش و حواس مجتمع رکھنے کی پوری کوشش کی تاآں کہ گٹھری زمین چھونے لگی۔ ساتھ ہی پیرؤ نے صدا بلند کی۔

میں نے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ چند لمحوں تک میں بے حس و حرکت وہیں پڑا رہا۔ پیرؤ کے جھنجوڑنے پر بھی مجھ سے نہ اُٹھا گیا۔ میرا بازو شل ہوگیا تھا اور سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ پیرؤ نے مجھے پیروں کی طرف سے اندر ڈبّے میں کھینچ لیا۔ لمحوں بعد جیسے میری آنکھوں میں روشنی اور میرے سینے میں سانس واپس آئی۔

پیرؤ نے دروازہ بند کردیا اور بٹن دبا کے قمقمہ بھی روشن کردیا۔ میں نے دیکھا شال والا شخص ابھی تک منہ موڑے کھڑا تھا۔ اِدھر ٹھِل تمنچا ہاتھ میں لیے برتھ پر موجود تھا۔ پیرؤ نے آگے جاکے اُس آدمی کا بازو پکڑا۔ اُسے جیسے بچھو نے ڈنک ماردیا۔ اُس کی دہشت زدہ آنکھیں سیدھی دروازے پر گئیں۔ دروازے پر اُسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اُس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ ترا پالر زرہا تھا۔ "گلبرگہ آنے کو ابھی کتنا ٹیم رہتا ہے؟" پیرؤ نے تھرتھری آواز میں پوچھا۔

وہ مبہوت کھڑا رہا جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو یا اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔ پیرؤ نے اُس کی ٹھوڑی میں اُنگلیاں گڑو دیں، وہ ڈکرانے لگا۔ "اپن کے پاس زیادہ ٹیم نئیں ہے۔" پیرؤ نے غصّے سے کہا۔ "سمجھا؟"

"وہ کہاں ہے؟" شال والا ہذیانی انداز میں بولا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"اپن نے اُس کو کچرے پہ پھینک دیلا ہے۔ ابھی تیری باری ہے۔ کچھ بولنا ہے تو ابھی......"

"نہیں نہیں۔" وہ ہیجانی آواز میں بولا۔ "نہیں نہیں، مجھے مت مارو، تمھیں خدا کا واسطہ، مجھے مت مارو۔"

"ابھی ٹھیک ٹھیک بولے گا تو اپن سوچے گا۔"

"میں آپ کو سچ بتاتا ہوں، ایک ایک لفظ سچ۔" وہ کپکپاتے لہجے میں بولا۔ "مگر میرے ساتھ ایسا مت کرو، تمھیں خدا کو......"

"ابھی بہت یاد آرہا ہے، ایدر آتے میں اُس کو بھول گیا تھا۔ چاقو، پورا ہتھیار بھر کے لایا تھا سالا۔"

"مجھے معاف کردو۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "میرے چھوٹے چھوٹے بچے ..."

"اپن بھی نامرد ائیں ہے۔"

اُس نے سچ ہی بتانا شروع کیا ہوگا۔ ایسے عالم میں شاید آدمی مجبور ... بولتا۔ اُس کا چہرہ سفید پڑگیا تھا اور آواز پر لرزش طاری تھی۔ اُس نے نواب ... الدّین علی اور اُن کے معتمدِ خاص منشی مبارک کے بجائے کسی اور کا نام نہیں ... کہنے لگا کہ نواب قطب الدّین علی کے ذاتی سپاہیوں کی ایک بڑی نفری ... اُس میں طرح طرح کے زور آزما، ہتھیار بند، شکاری اور شورہ پشت ش... ہیں۔ نواب قطب الدّین ہی نہیں، اُس جیسے تقریباً ہر بڑے نواب کے ہاں ا... قسم کے ملازموں کی چھوٹی بڑی نفری ضرور ہوتی ہے۔ یہ ملازم عموماً جاگیروں ... پڑے اینڈتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار کسی خاص موقع پر انھیں طلب کیا جاتا ... شکار یا کسی لمبے سفر کے موقع پر۔ ملازموں کا یہ سلسلہ پشتینی ہے۔ ایک ... کوئی کسی نواب سے وابستہ ہوجاتا ہے تو دوسرے کے ہاں ملازمت معیوب سمجھی جاتی ... اِس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا، خصوصاً نواب کے خاص ملازموں کے ترکِ ملازمت کی ... میں اُس کے کہنے کے مطابق، وہ ایک پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اُس کا تعلق بھو... سے تھا۔ نواب قطب الدّین علی کے ایک قدیم ملازم کے توسط سے کوئی دو سا... قبل وہ اِس کی ملازمت میں آیا تھا۔ اُس کے بیوی بچے ابھی تک بھوپال ... تھے۔ وہ ریاست بھوپال کے سپاہیوں میں شامل تھا اور حیدر آباد کی شان ... شوکت کے قصّے سُن کے یہاں قسمت آزمانے آیا تھا۔ یہاں کے رنگ ڈھنگ د... کے اُس نے کئی مرتبہ بھاگ جانے کا ارادہ کیا لیکن جس شخص نے نواب سے اُس ... سفارش کی تھی، اُس پر عتاب آنے کے خیال سے وہ رہ گیا۔ کہنے لگا کہ نواب ... سب ملازم ایک ساتھ نہیں رہتے، انھیں مختلف جاگیروں پر رکھا جاتا ہے اور اکثر ایک دو... کو خبر نہیں ہوتی کہ وہ ایک ہی نواب کے نمک خوار ہیں۔ کبھی کسی ملازم کو سپاہیوں ... کے عملے سے تبدیل کرکے حویلی میں بلالیا جاتا ہے۔ یہ درجے کی فضیلت ہے۔

پیرو اور ٹھِل نے اُسے نہیں ٹوکا۔ پیرؤ اُس کے پاس سے ہٹ کے ٹھِل کے ... پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔ اُن کے اِس انہماک نے اُس کی آواز پر اثر ڈالا، آواز کسی قدر ... کھل گئی۔ اُس نے بتایا کہ اُسے بہت جلد نواب کی خاص حویلی میں تعینات کردیا گ... تھا اور وہ ہمارا تعاقب کرنے والوں، اپنے سات ساتھیوں کا نگراں ہے۔ یہ ذمّے دار... کا احساس تھا کہ کسی اور کو بھیجنے کے بجائے اُس نے خود ہمارے ڈبّوں میں داخل ... ہونے کا عزم کیا۔ اُس کا ساتھی، برقع پوش آدمی جسے ہم نے اُس کے ... قول ڈبّے ... باہر پھینک دیا ہے، اعلا درجے کا شہ زور اور حیرت ناک چالاک شخص تھا۔ اُسے بھی نواب کی ... تحویل میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ وہ سب کے سب نواب کے آزمودہ اور منتخب آدمی تھے۔ نواب ...

... کی نظروں میں اِس معاملے کی اہمیت کا اندازہ اِسی سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہنے لگا کہ اُس کے ساتھی نے نواب قطب الدّین علی کے متعلق غلط نہیں بتایا تھا۔ وہ ایک موروثی رئیس ہے۔ ضدّی، سرکش، حاسد اور فیاض۔ اُسے انکار پسند نہیں۔ اپنے آدمیوں کی ناکامی اور بے ادبی پر اُس کا پارا کبھی اِس قدر چڑھ جاتا ہے کہ وہ اُنھیں ختم کردینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اُس کی اپنی عدالت، اپنی جیل ہے۔ حکم عدولی، بدعہدی اور بددیانتی پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ کوڑے، نشتر زنی، اُلٹا لٹکا دینا، کسی جگہ سے چمڑی کاٹ دینا، ناخن نوچ لینا وغیرہ عام سزائیں ہیں۔ دل کا بھی وہ اتنا ہی کھلا ہے۔ ہر ماہ چاند کی پہلی کو اُس کی حویلی کے باہر محتاجوں اور ناداروں کی قطاریں لگی رہتی ہیں۔ خوش ہو تو انعام و اکرام سے اتنا نوازتا ہے کہ نسلیں آرام سے کھائیں۔ اُس کی ایک بڑی لائبریری، شکارگاہ اور طرح طرح کے نوادر پر مشتمل عجائب خانہ ہے، باغات اور محلات ہیں، نئی نئی عمارتیں بنانے کا اُسے جنون کی حد تک شوق ہے۔ قیمتی پتھروں، قالینوں، زیورات، مجسموں اور کتّوں سے اُسے گہرا شغف ہے۔ وہ براہِ راست نہ تو حکم دینا پسند کرتا ہے نہ ملازموں سے بات کرنا۔ اِس کام کے لیے منشی مبارک اور دوسرے معتمد ہیں۔ پہلی مرتبہ تقرری کے وقت کے علاوہ بہت خاص خاص موقعوں ہی پر کسی ملازم کو نواب کے حضور پیش کیا جاتا ہے یا کسی ایسے شخص کو جس سے کوئی گستاخی سرزد ہوگئی ہو، ورنہ نواب کو دیکھے مدّت گزر جاتی ہے۔

پیرؤ نے اُس سے یہ نہیں پوچھا کہ نواب عالم تاب اور نواب حشمت جنگ کے خاندان سے اِس کے نواب کی قرابت داری ہے کہ نہیں اور مہاراجا دھرم دیت اُس کے کیسے مراسم ہیں۔ یہ سوال فضول تھا۔ رئیسوں میں سب سے بڑی قرابت تو رئیسی کی ہوتی ہے۔ امارت والوں کا ایک ہی خاندان ہوتا ہے۔ شال والا آدمی بہت سی غیر متعلق باتیں بھی کررہا تھا۔ پیرو اور ٹھِل کے چُپ رہنے کے بعد میرے لیے بیچ میں بولنے کا محل نہیں تھا جو کچھ وہ اپنے ہیجان اور اضطراب میں کہہ رہا تھا۔ انھوں نے اُسے کہنے دیا۔ شاید اسی طرح وہ کچھ پوچھنا، کچھ سمجھنا چاہتے تھے، بین السطور میں لکھا ہوا۔ سوال کرنے سے وہ کچھ شعوری ہوجاتا۔ وہ تیز تیز لہجے میں بول رہا تھا۔ آدمی اتنی تیزی اور تسلسل سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، وہ کٹہرے میں کھڑا اپنی صفائی پیش کررہا ہے، اُس مجرم کی طرح جسے موت کی سزا سنائی جانے والی ہے۔ اِس نے بتایا کہ منشی مبارک نے انھیں بڑی امیدیں دلائی تھیں، وہ تصور نہیں کرسکتے کہ سفر سے کامیاب واپسی پر نواب انھیں کس کس طرح نواز سکتا ہے۔ ناکامی کے بارے میں اُس نے کچھ نہیں کہا تھا کیونکہ ایک موہوم سا شبہ اُس کے ذہن میں ہمارے پاس کچھ نہ نکلنے کا بھی تھا لیکن آنے والوں کو معلوم تھا کہ ناکامی نواب کی برگشتگی اور نواب کی نظروں میں اُن کا رتبہ گرادینے کا سبب ہوگی۔ منشی مبارک نے اُن سے کہا تھا کہ اصل آدمی ایک بوڑھا شخص ہے۔ اُس نے ابّا جان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ انھیں تعین کی تھی کہ تلاشی میں اُن کا ہدف سب سے پہلے ابّا جان ہی کو ہونا چاہیے۔ اُن سے پتھر برآمد کرنے یا اُن کے پاس کہیں اور چھپے ہوئے ذخیرے کا سُراغ اگلوانے کے لیے وہ کوئی لحاظ یا مروّت روا نہ رکھیں۔ مطلب براری کے لیے ابّا جان کے تمام ساتھیوں کو بھی ختم کرنا پڑے تو انھیں اِس کی پوری اجازت ہے۔ ہاں انھیں ابّا جان کو باقی رکھنا ہے۔

اُنھیں پولیس کی وردی اِس لیے دی گئی تھی کہ ڈبّے میں داخل ہونے کی صورت پیدا نہ ہو تو آخری حربے کے طور پر وہ اسے استعمال کریں۔ اُنھوں نے یہ وردی محفوظ رہنے دی کیونکہ اِس طرح ہم لوگ شک میں پڑسکتے تھے۔ چلتے وقت اُنھیں یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ اگر گلبرگے تک وہ اپنے مقصد میں ناکام رہیں اور آگے اُن کی دانست میں کامیابی کا کوئی امکان ہو تو اپنا سفر شولا پور تک بڑھائیں۔ شال والے کے بہ قول اُس نے منشی مبارک کو مشورہ دیا تھا، اگر ایسا ہی ہے تو وہ اور زیادہ آدمیوں کی نفری کیوں نہ ساتھ رکھے۔ دُور جانے کی کیا ضرورت ہے، ان کے پاس ایک سے ایک طالع آزما، معرکہ جو پڑا ہے۔ حیدر آباد سے جیسے ہی گاڑی آگے جائے، کسی ویران جگہ زنجیر کھینچ کے اُسے روک دیا جائے اور وہ باقاعدہ ڈاکا ڈالنے کے انداز میں گاڑی پر حملہ آور ہوں۔ منشی مبارک نے سختی سے اُس کا مشورہ مسترد کردیا تھا۔ اس طریقے میں اُس کے آدمیوں کی ہلاکت کا اندیشہ تھا۔ اُسے اپنا ایک آدمی بھی کھونا گوارا نہیں تھا۔ اُنھیں تنبیہہ کی گئی تھی کہ کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں اُنھیں سلامت واپس آنا ہے اور اِس سفر پر صرف اُن لوگوں کو بھیجا جارہا ہے جو بااعتماد اور حوصلہ مند ہونے کے علاوہ ذہین بھی ہیں کیونکہ اِس معاملے میں شجاعت کی اتنی ضرورت نہیں، جتنی ذہانت کی ہے۔

اُس کے بیان کے مطابق منشی مبارک نے اُن سے ہمارے بارے میں نہایت سنگین باتیں کہی تھیں۔ اُس نے تقریباً وہی کچھ دہرایا جو اُس کا برقع پوش ساتھی ہمیں بتا چکا تھا۔ کہنے لگا، منشی مبارک نے انھیں خبردار کیا تھا کہ ہم ہر طرح سے مسلح اور محتاط ہوں گے اور شک ہونے پر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کریں گے لہٰذا ہم سے کسی رعایت کی توقع نہ کی جائے۔ منشی مبارک نے امید ظاہر کی تھی اور ہمّت دلائی تھی کہ اگر اُنھوں نے سُوجھ بوجھ اور برداشت سے کام لیا تو وہ کامیاب ہی واپس آئیں گے۔ اُس نے اُن سے وہی بات کہی تھی جو میرے ذہن میں تھی کہ ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ اتنے لوگوں کی موجودگی کی کوئی غیر معمولی وجہ ہی ہوسکتی ہے۔ آگے سفر میں ہماری احتیاط اور چوکسی دیکھ کے اُنھیں خود اِس کا اندازہ ہوجائے گا اور شال والے کے مطابق اُس نے یہی دیکھا۔

ابھی وہ یہ سب بتا رہا تھا کہ گاڑی دھیمی ہونے لگی۔ ٹھِل اور پیرؤ کو جیسے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ پیرؤ نے گھڑی دیکھی اور یک بیک برتھ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم نے بہت جلدی کی تھی، واڑی سے گاڑی چلے ہوئے پچیس منٹ سے زیادہ کسی طرح نہیں ہوئے تھے۔ اگر گلبرگہ آرہا تھا تو ہم سے دیر ہوگئی تھی۔ ہمیں اِس سے پہلے ہی اُس کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ نہیں معلوم، پیرو اور ٹھِل نے کیا سوچا تھا جو اتنے سکون سے اُس کا ہذیان سُن رہے تھے۔ گلبرگہ بڑی آبادی کا شہر ہے۔ وہاں گاڑی پانچ دس منٹ سے

کم کیا ٹھیرے گی۔ اسٹیشن پر اپنے ساتھیوں کی خبر گیری کے لیے نواب کے آدمی ہمارے ڈبّے کی طرف ضرور منڈلائیں گے۔ میں نے باہر جھانک کے دیکھا کسی بڑے اسٹیشن کے آثار نہیں تھے۔ اُس نے گلبرگے کے لیے آدھ گھنٹے کا وقت بتایا تھا۔ آدھ گھنٹا رسماً ہی کہا ہوگا، تیس سے پینتیس اور چالیس منٹ کا سفر بھی ہو سکتا ہے۔ گویا شبھل اور پیرد کو علم تھا کہ گلبرگہ آنے میں کتنی دیر لگ سکتی ہے مگر اُنھیں کیسے معلوم ہوا؟ ضرور اُنھوں نے پچھلے اسٹیشن پر کسی سے معلوم کیا ہوگا جب میں برقع پوش کو لے کے چھپا ہوا تھا۔ پیرد نے پہلے کی طرح شال والے آدمی کو فوراً برتھ پر لیٹ جانے کا حکم دیا، اُس نے کسی توقف کے بغیر تعمیل کی۔ پیرد اُس کے پیروں کے نزدیک بیٹھ گیا۔ فرش پر اُس کا بکھرا ہوا سامان سیمنٹ کے برتھ کے نیچے رکھ دیا گیا۔ وہ ایک چھوٹا اسٹیشن تھا۔ گاڑی وہاں بھی اتنی ہی دیر ٹھیری جتنی دیر گزشتہ اسٹیشن پر۔ پلیٹ فارم پر چار پانچ آدمی اُترے لیکن ہماری بوگی کے بعد والی جس بوگی کی نشان دہی برقع پوش نے کی تھی، وہاں دروازے پر مجھے دو آدمی نظر آئے۔ ایک نیچے بھی اُترا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ غالباً اسی لیے قریب آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ برابر کے ڈبّے پر جمرو اور شامو بھی بے تاب کھڑے تھے۔ میں نے ہاتھ ہلا کے اُنھیں اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ وہ میرے پاس آنا چاہتے تھے مگر میں نے اُنھیں روک دیا۔ اتنے میں گاڑی نے بھی سیٹی بجا دی۔

گاڑی چلتے ہی پیرد نے بازو پکڑ کے اُسے اُٹھا دیا۔ پیرد کے استفسار پر اُس نے اُن دو آدمیوں سے اپنی شناسائی سے دوبارہ انکار کیا جنھیں سب سے پہلے مارتی نے شناخت کیا تھا اور جو گزرنے والے اسٹیشن پر بھی اپنے ڈبّے کے دروازے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اُس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ رات ابّا جان کی حویلی میں آنے والے لوگوں کا بھی اُسے کوئی علم نہیں ہے۔ پیرد نے کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اگر وہ نواب قطب الدین علی ہی تھا تو اُسے کل رات حویلی سے نامراد جانے والوں کی رُوداد اپنے اِن تازہ دم فرستادوں کو نہیں سنانی چاہیے تھی۔ اِس سے اُن کی حوصلہ شکنی ہوتی۔ گاڑی چلے چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ پیرد نے شبھل کی طرف دیکھتے ہوئے اُس سے پوچھا: "ابھی کچھ اور بولتا ہے تو تھوڑا ٹیم ہے۔"

"میں نے جناب کو سب بتا دیا ہے۔"

"ابھی تمھارا کیا بنانے کا؟"

"جی جی۔" پیرد کی آواز کی سردی اُس تک منتقل ہونے میں لمحے لگ گئے۔ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا: "میں میں آپ سے منت کرتا ہوں، میں آپ کا غلام، آپ کے پیر پکڑتا ہوں، خدا کے لیے رحم کیجیے۔ مجھ بدنصیب کے ساتھ کئی جانیں لگی ہوئی ہیں۔"

"اکیلا ابھی ایدر کون ہے؟" پیرد نے زہرخند سے کہا۔ "اپن تم کو چھوڑ دے تو ابھی کیدر کو جائے گا؟"

"جیسا، جیسا آپ لوگ حکم کریں گے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"اپن ابھی کیا بولے گا۔"

"نہیں بندہ پرور! آپ جو حکم کریں گے، میں خدا کو حاضر و ناظر جان [illegible] ہوں، حکم سے سرتابی نہیں ہوگی۔"

"اپن بولے کہ ابھی جا کے اُس نواب حرام کے جنے کا سر کاٹ کے ایدر لے آئے گا؟" پیرد نے بھڑکتی آواز میں کہا۔

"اگر ممکن ہوا تو یقین کیجیے، غلام ......"

"تو اپنے کو اوپر سے نیچے تک اکھا حرامی لگتا ہے۔"

"میں میں آپ سے زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔" اُس نے پیرد کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور بین کرنے لگا۔ "اگر آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کے پاس جا کے میں آپ کے لیے پھر کوئی پریشانی پیدا کروں گا تو ایسا نہیں ہوگا۔ میں آپ سے قسم کھا کے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا نہیں کروں گا۔ دوسرا تو اب میں اُن کے پاس جاؤں گا ہی نہیں۔ میں گلبرگہ اسٹیشن کی بھیڑ میں اُن سے اوجھل ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں یہیں سے کہیں اور کسی اور طرف نکل جاؤں گا۔ اگر خدانخواستہ اُن سے مڈبھیڑ ہو بھی گئی تو آگے کسی اور اسٹیشن پر مجھے اُن سے دور ہو جانے کا موقع مل سکتا ہے۔ نواب کے پاس ناکام واپس جانے کا انجام آپ نہیں جانتے۔ وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔ اُسے جلال آتا ہے تو کچھ نہیں دیکھتا۔ زندہ آدمیوں کو شکاری کتوں کے آگے ڈال دیتا ہے۔ وہ شہلے، شہلے سے اُس کی موت ... آدمی ... کی موت کی ساری ذمے داری بھی مجھ پر ڈال دے گا۔ میں یہاں سے سیدھا جا کے اپنے بیوی بچوں کو لے کے کسی طرف بھی نکل جاؤں گا۔" وہ ہذیانی حالت میں جانے کیا کیا کہتا رہا۔

شبھل نے ہنکاری بھری اور سر ہلانے لگا۔

یکایک پیرد برتھ سے اُٹھ کے اُس کے پاس جا پہنچا۔ اُس نے اُسے منہ سے چلّانے کی مہلت نہیں دی۔ پیرد کو اپنے سر پر کھڑا دیکھ کے اُس پر سناٹا طاری ہو گیا۔ پہلی ضرب سے وہ بے حال ہو گیا۔ تیسری بار پیرد کو ہاتھ اُٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ شبھل کے کچھ کہے بغیر میں بھی اُس کا ارادہ جان گیا تھا۔ ابھی اندھیرا تھا لیکن بھاگتا ہوا ... میں نے چادر بچھا دی۔ میرے بازو کی رگیں ابھی تک چٹخ رہی تھیں، پیرد کا بھی یہی حال ہوگا تاہم ہم دونوں نے اُسے بہ عجلت چادر پر ڈال دیا۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ پچھلے اسٹیشن سے چلے ہوئے پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ ہم نے اُس کی چادر کی گٹھری نیچے لٹکا دی۔ دوبارہ ہمیں دیر نہیں لگی۔

کارتوس اور تمنچے رکھ کے ہم نے اُس کا سامان بھی باہر پھینک دیا۔

سات آٹھ منٹ بعد گاڑی گلبرگہ اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ جیسے دن نکل آیا ہو۔ یہاں بھی کچھ کم ہجوم نہیں تھا۔ ہم تینوں ہی ڈبّے سے اُتر آئے۔ اُدھر جمرو، شامو اور زورا بھی نیچے آ گئے۔ اُن کی بے قرار نگاہیں سب سے پہلے ہمارے ڈبّے کی طرف اُٹھیں، شبھل کی وجہ سے اُن کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ ڈبّا خالی دیکھ

کے اُن کی آنکھوں میں وحشت سمٹ آئی۔ برابر کے ڈبّے کے دو آدمیوں میں سے بھی ایک نیچے آ گیا تھا۔ ہماری بوگی سے پرے بھی دو آدمی لپکتے قدموں سے ہماری طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ دیکھتے دیکھتے وہ ہمارے ڈبّے کے سامنے پہنچ گئے لیکن اُن میں کوئی رکا یا ٹھٹکا نہیں۔ پیرد نے اُسی دم باقاعدہ ہاتھ اُٹھا کے کسی قدر مجہول انداز میں شبھل کی توجہ اُن کی جانب مبذول کرائی۔ اُنھوں نے بھی یہ اشارہ دیکھ لیا تھا۔ میرا گمان نہیں، ایک ثانیے کے لیے ضرور اُن کے جسموں میں کھنچاؤ سا پیدا ہوا تھا لیکن وہ اپنی رفتار سے بڑھتے گئے۔ اُنھوں نے پیچھے مڑ کے بھی نہیں دیکھا۔ اسٹیشن کے درمیان شیڈ میں چائے کا اِسٹال تھا۔ اُن میں سے ایک آگے چلا جانا چاہتا تھا، دوسرے نے اُسے روک لیا اور دونوں اِسٹال پر ٹک گئے۔

جیسا کہ شال والے آدمی نے بتایا تھا کہ اُن کے دو ساتھی انجن کے قریب کسی بوگی میں بھی موجود ہیں، وہ اُنھی کے پاس جانا چاہتے ہوں گے لیکن اِسٹال پر کھڑے ہو کے وہ ہماری جانب زیادہ محفوظ طریقے سے دیکھ سکتے تھے، درمیان میں مسافروں کی بھیڑ کی وجہ سے جھلکیوں میں سہی۔ پیرد نے شبھل کو اُن کی جانب اشارہ عمداً کیا ... اُنھیں متذبذب کرنے کے لیے۔ میرے جی میں آئی، اگر یہی بات ہے تو ہمیں ایک بار اُن کے ڈبّے کی طرف بھی جانا چاہیے، چند ہی قدموں کا تو فاصلہ ہے مگر میں خاموش رہا۔ اُن کی کشمکش کی کیفیت تادیر جاری رہنا چاہیے تھی۔ فیصلہ تو اُنھیں کرنا ہی تھا لیکن عجلت میں وہ کوئی ایسا قدم بھی اُٹھا سکتے تھے جو نہ اُن کے لیے بہتر ہوتا نہ ہمارے لیے۔ ڈبّے میں اُن کے ساتھیوں کا نہ ہونا اُن کے لیے یقیناً تشویش انگیز ہوگا۔ واڑی کے بعد دونوں اسٹیشنوں پر وہ پوری طرح ہوشیار رہے ہوں گے۔ اُنھوں نے ہمارے ڈبّے سے کسی کو اُترتے چڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ اسٹال پر جیسے ہی اُنھوں نے چائے ختم کی اور فوراً لوٹ پڑے۔ اِس بار وہ ہمارے پاس سے گزرنے کے بجائے دور دور رہے۔ واپسی میں اُن کی چال نپی تلی تھی۔ ایک سرسری نظر اُنھوں نے ہم پر اور ڈبّے پر ڈالی اور تجاہلِ عارفانہ سے اپنے ڈبّے تک پہنچ گئے۔ پیرد نے اُن کی جانب انگلی اُٹھا کے پھر کسی کو متوجہ نہیں کیا۔ اپنے ڈبّے کے سامنے کچھ دیر ٹھیر کے اور وہاں اپنے ساتھیوں سے گفتگو کر کے وہ گاڑی کے پچھلے حصّے کی طرف بڑھنے لگے۔ اب اُن کی پشت ہماری جانب تھی۔ گاڑی کے آخری ڈبّے تک جانے کا فیصلہ اُنھوں نے سوچ سمجھ کر کیا ہوگا، کئی وجوہ سے۔ کسی موہوم امید میں اپنے گم شدہ ساتھیوں کو دوسرے ڈبوں میں بھی دیکھ لینا، ہم پر خود اعتمادی اور بے نیازی ظاہر کرنا اور دور سے واپس آنے کے سبب ہم پر دیر تک نظر رکھنا۔

ابھی ہم وہیں کھڑے تھے کہ انجن کی طرف سے دو اور آدمی آتے دکھائی دیے۔ اُن کی پہچان ایسی مشکل نہیں تھی۔ اُنھی کی طرح چاق و چوبند، تنومند اور گٹھے ہوئے جسم کے، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، گالوں پر چربی چڑھی ہوئی۔ ہر ڈبّے میں جھانک جھانک کے گھبرائے ہوئے آگے آ رہے تھے جیسے اُنھیں کسی کی تلاش ہو۔ اِس طرح وہ ہمارے ڈبّے میں جھانکنے کا جواز بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ پہلے وہ ابّا جان کے برابر کے ڈبّے سے گزرے۔

اُن دو آدمیوں سے اُن کا آمنا سامنا ہوا مگر کسی علامت سے بھی اُن کا آپس میں کوئی رابطہ ظاہر نہیں ہوا۔ اُن سے پہلے جانے والے بھی اسی بے خبری سے اُن دونوں کے پاس سے گزر گئے تھے۔ ابّا جان کے ڈبّے میں جھانک کے وہ ہمارے ڈبّے پر آئے تھے۔ یکایک پیرد نے پیچھے سے ایک کا شانہ تھام لیا اور مخملی آواز میں بولا: "ابھی کس کا کھوج ہے بابو صاحب؟"

وہ بڑبڑا گئے اور سنبھل کے بولے کہ اُنھیں ایک صاحب کی تلاش ہے جو یہاں گلبرگے سے ممبئی کے لیے سوار ہونے والے تھے۔ یہ کہہ کے وہ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ پیرد نے اُنھیں روکا نہیں۔ اُنھوں نے ہمارا خالی ڈبّا اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اب لازماً اُنھیں اپنے ساتھیوں کے ڈبّے پر رکنا تھا۔ یہی ہوا تاہم وہاں پہنچ کے بھی اُنھوں نے اُسی تردد سے جھانکنا ضروری سمجھا اور آناً فاناً ڈنڈا پکڑ کے سیڑھیاں چڑھ گئے۔ اسٹیشن پر افراتفری کم ہو گئی تھی۔ خوانچہ فروشوں کی صدائیں بھی ہلکی پڑ گئی تھیں۔ گاڑی کے آخری سرے پر مال گاڑی کی ایک بوگی لگی ہوئی تھی چنانچہ وہ دونوں آدمی جو تھوڑی دیر پہلے دور چلے گئے تھے، مال گاڑی کی بوگی سے لوٹ پڑے۔ ڈبّے کے آس پاس لوگوں کی تعداد کم ہو جانے کے سبب ہم ایک دوسرے کو بہ خوبی دیکھ سکتے تھے۔ اُن کی رفتار متوازن تھی۔ جس قسم کا تاثر وہ ہم پر مرتب کرنا چاہتے تھے اُس کا تقاضا یہی تھا کہ اپنے ڈبّے تک آ کے یا تو وہ باہر کھڑے رہیں یا اندر داخل ہو جائیں۔ وہ اندر چلے گئے۔

اُن کے تمام ساتھی، اگر اُن کی تعداد وہی تھی جو برقع پوش اور شال بردوش شخص نے بتائی تھی، سب کے سب ایک ہی ڈبّے میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ ڈبّا انٹر کلاس کا تھا۔ اُس میں اور بھی مسافر ہوں گے۔ اُنھیں باہم مشورہ کرنے میں دقت پیش آ رہی ہوگی۔ جلد ہی کسی نتیجے پر پہنچنا تھا، سفر کے التوا یا جاری رکھنے کا فیصلہ۔ آگے اُنھیں ایک ہی ارادے سے جانا چاہیے تھا کہ اُن میں سے پھر کوئی ہمارے ڈبّے میں داخل ہونے کی کوشش کرے مگر اب اِس اقدام میں کامیابی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُن کے پیشِ نظر بے شمار الجھنیں ہوں گی، بے شمار اندیشے ہوں گے۔ اُن کے گم شدہ ساتھیوں پر آخر کیا اُفتاد پڑ گئی؟ کہیں اُنھیں ....؟ یقیناً اُنھوں نے اُن کی زندگی سے ہاتھ دھونے کا امکان مسترد نہیں کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے ... لاشیں چلتی گاڑی سے پھینک دی گئی ہوں۔ پردے کے لیے اندھیرا تھا ہی۔ اُن کی لاشیں برتھوں کے نیچے اور بیت الخلا میں چھپا کے تو ہم سکون سے پلیٹ فارم پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ انجن کی طرف سے آنے والے آدمیوں نے ہمارے ڈبّے میں جھانک لیا تھا۔ پھر اُنھیں کیا ہوا؟ اگر وہ اپنی کسی غلطی سے پہچانے گئے تھے تو اُنھوں نے کیا کیا اعتراف کیا؟ وہ اُس بوڑھے آدمی کے ڈبّے میں داخل ہونے میں ناکام ہو گئے تھے اور دوسرے ڈبّے میں نوادر ملنے کی توقع نہیں تھی، سو اُنھوں نے نتیجہ نکالنے کی جلدی نہیں کی ہوگی۔ اگر اُنھوں نے جلدی کی بھی تو کیا نوادر اُسی ڈبّے کے لوگوں کے ساتھ تھے؟ کہیں وہ سارا مال لے کے گاڑی سے فرار تو نہیں ہو گئے۔ جہاں گاڑی ذرا سی آہستہ ہوئی ہو،

وہاں کو دیڑے ہوں۔ مال و منال کے ساتھ ویسے بھی جرأت عود کر آتی ہے، خون کا رنگ بدل جاتا ہے۔ یا یہ نیت کی کھوٹ نہیں ہے۔ جس وقت مال و زر اُن کے ہاتھ آیا، اُسی لمحے اُنھوں نے وہاں سے بھاگ جانا مناسب سمجھا۔ یہ جان کے کہ اُن کے اچانک غائب ہونے سے کامیابی ہی مراد لیں گے اور واپسی کی راہ اختیار کریں گے۔ کسی ایک نتیجے پر بہر حال وہ پہنچ نہیں پائے ہوں گے۔ نوادر ابا جان ہی کے ڈبے میں ہونے چاہئیں، اِس لیے کہ ہم نے اُن دونوں کو وہاں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ وہ دُور سے سب کچھ دیکھ ہی رہے ہوں گے۔

اُن میں سے پھر کوئی باہر نہیں آیا۔ اُن کے فیصلے پر بہت کچھ دار و مدار تھا۔ وہ ہمیں اور آزمائش میں ڈالتے ہیں یا باقی سفر کے لیے فراغت کا پروانہ دے دیتے ہیں۔ ہم لوگوں میں سے کوئی ایک چہل قدمی کرتا ہوا گاڑی کے پچھلے حصے تک چلا جاتا تو ایک نظر اُن کی طرف دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ وہ پلیٹ فارم کے اُس طرف کے دروازے سے بھی تو نکل سکتے ہیں۔ اِدھر ہمارا ڈبا خالی پڑا ہے۔ یہاں دونوں طرف کے دروازوں پر کوئی موجود نہیں ہے۔ جبرو، شامو اور زورا کے نیچے آجانے کی وجہ سے مارٹی اور ننگو ابا جان کے ڈبے میں رہ گئے تھے مگر وہ دونوں پلیٹ فارم کی طرف والے دروازے پر کھڑے تھے۔ اُدھر سے کھلنے والا دروازہ اُنھوں نے بند کر دیا ہوگا کیونکہ ٹھیری گاڑی میں ایسے کسی کے چڑھ آنے کا خدشہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا، پیرو سے کہوں کہ میں گاڑی کے آخری سرے تک جاتا ہوں اور دیکھ کے آتا ہوں لیکن میں یہ سوچ کے چپ رہا کہ پیرو کو خود اِس کا احساس ہوگا۔ ممکن ہے، تجمل اور پیرو کے ذہن میں کچھ اور ہو، ہو سکتا ہے، وہ چشم پوشی کر کے اُنھیں نکل جانے کا موقع فراہم کر رہے ہوں۔

دیر ہو گئی تھی۔ جبرو کی زبانی کانتے کا حال سُن کے میں چند لمحے اُسے دیکھنے کے لیے بھی جانا چاہتا تھا لیکن اُن لوگوں کا خیال مجھے روکے لیتا تھا جو ڈبے میں بیٹھے جانے کیا مسکوٹ کر رہے تھے۔ وہ اب وہاں تھے بھی یا نہیں؟ جبرو نے بتایا تھا کہ کانتے کا سارا بدن تپ رہا ہے، وہ بار بار چونک پڑتا ہے، بڑبڑانے لگتا ہے۔ اگر صبح تک اُس کی حالت نہ سُدھری تو ہمیں سفر ملتوی کر کے اُسے پہلے کسی معقول جگہ دکھا دینا چاہیے۔ میں نے رائے زنی نہیں کی۔ جبرو کو کیا معلوم نہیں تھا کہ ہمارے ارادے کی تکمیل ہمارے ہاتھ میں کب ہے۔ ہم نہ یہاں سفر ملتوی کر سکتے ہیں، نہ آگے کسی جگہ۔ ہمارا ہر ارادہ اُن کے فیصلے سے مشروط ہے۔

اُن لوگوں کے ڈبے کی طرف خاموشی رہی تو میں ابا جان کے ڈبے میں چلا آیا۔ وہاں صرف ایک بلب جل رہا تھا اس لیے روشنی بہت دھیمی تھی یا اس کی وجہ یہ تھی کہ میں تیز روشنی سے اندر آیا تھا۔ منیر علی ایک جانب فرش پر مصلا بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ ابا جان آنکھیں مُوندے ہوئے برتھ پر نیم دراز تھے۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا، میری آہٹ سے اُن کی آنکھ کھُل گئی۔ اُنھوں نے غنودہ آواز میں پوچھا کہ میں سویا نہیں۔ کیا بات ہے، تم سبھی جاگ رہے ہو؟ میں نے کہا، بس یوں ہی نیند نہیں آرہی ہے۔ اُنھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ کتنے سرفروش کیسے کیسے ہتھیار بند اُن کے رفیقِ سفر ہیں، وہ کتنے مطلوب آدمی ہیں۔ تجمل بوجوہ اُن دونوں بہروپیا کو برابر کے ڈبے میں لے گیا تھا، ابا جان اور منیر علی کی خاطر، اُن کی موجودی اُن دونوں سے کھُل کے نمٹنے میں حارج ہوتی۔ ہم اتنے تحمل سے نہ اُن سے کچھ جان پاتے، نہ اُن کا مناسب انتظام کر سکتے۔ منیر علی سے تو یہ برداشت ہی نہیں ہوتا حالانکہ گزشتہ رات ہی اُن کی آنکھوں نے اپنی زندگی کا سب سے ہولناک تماشا دیکھا تھا۔ منیر علی اور ابا جان کے سامنے ہمارے ہاتھوں میں زنجیر سی پڑی رہتی۔

کانتے کو ہوش نہیں تھا۔ میں نے اُسے ہلکے سے متعدد آوازیں دیں، اُس نے آنکھیں کھولیں، جھپکتی پلکوں سے مجھے دیکھنے لگا اور ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی، میں نے اُس کے سینے پر زور ڈال کے اُسے لیٹے رہنے دیا اور اُس کا ہاتھ تھام لیا، وہ بخار میں پھنک رہا تھا۔ اُس سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ کیسا ہے، یہ ایک مذاق ہوتا۔ میں اُس کے پاس بیٹھا اُس کی پیشانی سہلاتا رہا۔ مجھے کچھ دیر تو بیٹھنا چاہیے تھا لیکن میرا دل باہر اٹکا ہوا تھا۔ گاڑی کی سیٹی بجنے پر مجھ سے وہاں نہ بیٹھا گیا۔ میں نے اُسے تھپکی دی اور چند قدموں میں ڈبے کا فرش پھلانگ کے باہر آگیا۔ تجمل اور پیرو وغیرہ سب وہیں کھڑے تھے اور برابر کی بوگی کے دروازے پر بھی ایک آدمی موجود تھا۔ گویا اُنھوں نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پیرو نے اصرار کر کے تجمل کو ابا جان کے ڈبے میں واپس بھیج دیا۔ باقی ہم سب، جب تک گاڑی نے حرکت نہیں کی، پلیٹ فارم پر کھڑے رہے۔ ڈبے میں آکے جبرو اُنھیں دیکھنے کے لیے فوراً دوسری طرف کے دروازے پر چلا گیا تھا، مبادا آخری لمحوں میں اُنھوں نے سفر ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو مگر شاید اُن میں سے کوئی بھی نہیں اُترا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

دروازہ بند کرنے کے لیے وہاں سے ہٹتے وقت میری نظر اُدھر انجن کی طرف ابا جان کے ساتھ والے ڈبے پر گئی۔ اُن دونوں پہلے والے آدمیوں میں سے ایک دروازے پر جما ہوا تھا۔ اِن دوسروں کے خیال میں، میں اُنھیں یکسر بھول ہی گیا تھا حالانکہ دونوں خاصی دیر تک پلیٹ فارم پر مسلسل نظروں کے سامنے رہے تھے۔ اب اِس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ اُن کا برقع پوش اور شال والے کے ساتھیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ کسی اور سے۔ ہوتا تو اِس عرصے میں کوئی تو اُن سے ملنے آتا یا وہ کسی کے پاس جاتے۔ اُن کی تعداد بھی صرف دو معلوم ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے، وہ کسی اور طرف سے آئے ہوں لیکن مقصد تو اُن کا بھی کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مقصد کے حصول کے لیے اُنھوں نے کیا عزم کیا ہوا ہے۔ میں اب کچھ سوچنا سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ گاڑی چلی تو میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ میں برتھ پر ہاتھ پیر پھیلا کے لیٹ گیا۔ جتنی دیر گاڑی چل رہی تھی اور کوئی اسٹیشن نہیں آتا تھا، اُتنی دیر میں آنکھ بند کر سکتا تھا۔ میں نے اپنا بازو جسم کے بوجھ تلے دبا دیا۔ ایکا ایکی اُس میں آگ سی بھڑک اُٹھتی تھی۔

جب گاڑی آہستہ ہونے پر میری آنکھ کھُلی، کھڑکیوں کے باہر اندھیرا مرجھا چکا تھا۔ دو ایک منٹ رُک کر گاڑی پھر چل پڑی اور میری آنکھ پھر لگ گئی۔ آگے کئی اسٹیشنوں پر جہاں گاڑی ذرا سی سُست ہوتی، میری آنکھ خود بہ خود کھُل جاتی اور سب لوگ بھی بیٹھنے سے اُٹھ جاتے۔ وہ سب چھوٹے چھوٹے اسٹیشن تھے۔ آنے والے ہر اسٹیشن پر اُجالا بڑھتا جاتا تھا تا آں کہ دھوپ نکل آئی اور ساڑھے سات بجے گاڑی ہونگی اسٹیشن پر آکے ٹھیر گئی۔ ہونگی پر وہ سارے کے سارے موجود تھے۔ نواب قطب الدین علی کے نمک خوار بھی اور ابا جان کے ساتھ والے ڈبے کے آدمی بھی۔ چلتی گاڑی میں اُن کا ڈبے میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا اور کسی اسٹیشن پر وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر ہی اندر آسکتے تھے۔ گزشتہ کئی اسٹیشنوں پر ہمارے ڈبے سے دُور دُور سہی مگر اُن کے آدمی پلیٹ فارم پر بھٹکتے منڈلاتے رہے تھے۔ جگہ وہ پہلے سے زیادہ آشفتہ معلوم ہوتے تھے۔ ویران اسٹیشنوں پر اُن کا بار بار ڈبے سے ... پلیٹ فارم کا چکر لگانا اضطراب ہی کی غمازی کرتا تھا۔ جب تک وہ ساتھ چل رہے تھے، ہمیں بھی پلک جھپکنے کی غفلت نہیں کرنا تھی۔ تعداد کے علاوہ ہتھیاروں کی موجودی سب سے زیادہ اُن کی تقویت کا سبب ہوگی۔ ایک تمنچا دس آدمیوں کو لے دست و پا کر دیتا ہے۔ کسی وقت بھی کسی کے دماغ میں کچھ سما سکتا تھا۔ اُجالا ہوتے ہوتے ریاست کا علاقہ ختم ہو چکا تھا۔ گلبرگے سے آگے وہ کسی بھی اسٹیشن پر اُتر سکتے تھے۔ ہونگی جنکشن تھا۔ وہ یہاں اُتر سکتے تھے۔ ہمارے ساتھ چلنے کا ارادہ اُنھوں نے بے وجہ ہی نہیں کیا ہوگا۔

ہونگی پر ہم سبھی اُترنا چاہتے تھے مگر پیرو نے منع کر دیا۔ شاید بار بار اُن کے سامنے جانے کی ہمیں ایسی ضرورت نہیں تھی۔ صرف مارٹی اور شامو پلیٹ فارم پر اُترے تھے۔ کسی تجربہ کار مسافر نے مارٹی کی معلومات میں اضافہ کیا تھا کہ شولا پور جنکشن نزدیک ہے۔ ناشتہ وغیرہ وہاں بہتر ملے گا اور گاڑی بھی زیادہ دیر ٹھیرے گی۔ اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہونگی پر گاڑی دس منٹ کے قریب ٹھیر کے آگے بڑھ گئی اور آدھ گھنٹے سے کم وقت میں شولا پور آگیا۔

آٹھ بج رہے تھے۔ ہر طرف چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی، تازہ تازہ دھوپ۔ پلیٹ فارم پر تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ ہم سبھی وہاں اُتر گئے۔ ابا جان اور منیر علی بھی باہر آگئے تھے۔ وقفے وقفے سے آنکھ بند کر لینے کے باعث مجھے بھی کچھ تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ سب کچھ وہی تھا لیکن اُجالا ویسے بھی بہت سی سرگرانیاں کم کر دیتا ہے۔ سرگرانی بھی ایک قسم کا اندھیرا ہی ہے۔ دو اندھیرے مل کے اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ اندھیرے کی نسبت مجھے اب اپنا جسم کچھ تنا ہوا، کھنچا ہوا نہیں لگ رہا تھا یا یہ محض نیند کا اثر تھا۔ نیند بھی آدمی کی غذا ہے۔ شامو ایک پلیٹ میں بلب حشمت جنگ کے خوان سے مٹھائی وغیرہ نکال لایا تھا۔ چائے کے ساتھ ہم ...یں کھرے کھرے مٹھائی کے دانے بھی ٹونگتے رہے۔ یہ دیکھ کے شامو اندر ٹوکری سے ...اور چیزیں بھی لے آیا۔ یکایک مارٹی نے اُچھل کے مجھے کہنی ماری۔ میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی مگر میری نظر سیدھی، پیچھے برابر کی بوگی کے ڈبے پر گئی، وہ ڈبے سے اُتر رہے تھے، اپنے مختصر سامان کے ساتھ۔ قلیوں نے آکے اُن کا سامان اُٹھانا چاہا تھا مگر اُنھوں نے جھڑک کے اُنھیں دُور رہنے کا حکم دیا۔ اسٹیشن کی جانب جاتے ہوئے وہ ہماری طرف ہی سے گزرے، ہمارے بالکل سامنے سے۔ اُنھوں نے ہمیں اور ہم نے اُنھیں بہت قریب سے دیکھا۔ نہ اُنھوں نے کسی ردِّعمل کا اظہار کیا، نہ ہماری طرف سے اُنھیں کسی قسم کا تاثر ملا ہوگا۔ میں نے اچھی طرح گن لیا تھا، اُن کی تعداد سات ہی تھی۔ وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گئے اور پشت سے ہمیں نظر آتے رہے۔ پھر ہجوم میں چھپ گئے۔ تجمل کے اشارے پر مارٹی ہجوم میں رِل مِل کے چپکے سے آگے چلا گیا۔ اُس نے آکے بتایا کہ وہ گیٹ سے باہر نکلنے یا آگے کسی ڈبے میں بیٹھنے کی بجائے اندر اسٹیشن کی انتظار گاہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ پیرو نے مارٹی کو سرزنش کی کہ اُسے لَوٹنے کی ایسی کیا جلدی تھی، وہاں وہ اُن کی نگرانی کے لیے کیوں نہیں ٹھیرا۔ مارٹی کچھ کہے بغیر چلا گیا اور اُس وقت تک وہاں سے نہیں ہٹا جب تک گاڑی چلنے کے آثار پیدا نہیں ہوئے، پھر وہ چلتی گاڑی میں ڈبے میں آیا۔ اُس کی اطلاع کے مطابق وہ لوگ انتظار گاہ میں بیٹھ گئے تھے۔

سب کے چہرے جیسے نکھر آئے تھے۔ ننگو ہمارے ڈبے میں واپس آگیا تھا۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ڈبے میں پھُدکتا پھرے۔ اتنی دیر بعد اب کہیں جا کے اُن کی پیشانیوں کے بل نکلے تھے۔ میں نے اُنھیں ٹوکا کہ ابھی دو باقی ہیں۔

پہلے والے دو آدمی، اُن کا ارادہ درمیان میں کسی اسٹیشن پر اُترنے کا بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ شولا پور سے ڈھائی گھنٹے کے سفر میں گاڑی کئی اسٹیشنوں پر ٹھیری۔ ہر جگہ اُن کا تقریباً ایک ہی معمول تھا کہ بڑے اسٹیشن پر جہاں گاڑی کچھ دیر ٹھیرنے کا امکان ہو، پلیٹ فارم پر اُتر جانا اور چھوٹا اسٹیشن ہو تو دروازے پر ایستادہ رہنا۔ کبھی ایک آدمی، کبھی دوسرا۔ رات سے اب تک شاید ہی کوئی اسٹیشن ایسا آیا ہو جہاں اُنھوں نے کچھ کوتاہی برتی ہو۔ اندھیری رات میں بھی نہیں، رات سے اب تک وہ اچٹتی نیند سوئے ہوں گے، وہ بھی صرف اُن وقفوں میں، جب گاڑی چلتی رہی۔ اُن کا طرزِ عمل شولا پور میں اُتر جانے والے آدمیوں سے قطعاً مختلف تھا۔ متحمل اور پُرسکون تاہم بار بار دروازے پر آجانے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کسی اسٹیشن پر اُنھیں ہمارے سفر ترک کر دینے کا اندیشہ ہے یا وہ کسی ایک موقع کی تلاش میں ہیں جو اُنھیں جستجوئے بسیار کے باوجود نہیں مل رہا ہے۔ مجھے حیرت تھی، اُن کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اُن کا بار بار ہماری نظروں میں آنا، پلیٹ فارم پر اور ڈبے کے دروازوں پر کھڑے رہنا، اُن کا چوکی داروں جیسا رویّہ خود اُن کے لیے کسی طور سُود مند نہیں تھا۔ وہ لوگ تو اپنے گرد و پیش کے معاملے میں بہ طورِ خاص بہت حساس ہوں گے جو اپنے ساتھ بیش قیمت مال و متاع لیے پھر رہے ہیں۔ اُنھیں تو اپنے سائے پر بھی شک ہوتا ہوگا۔ کیا وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم ابھی تک نہیں محسوس نہیں کر سکے ہیں۔ اُنھوں نے اب تک کسی جگہ ہم سے راہ و رسم پیدا کرنے کی

کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اتنے طویل سفر میں پڑوسی مسافروں کے درمیان یہ قربت عموماً ہو جاتی ہے۔ شمبھل نے انھیں چھیڑنے سے منع کر دیا تھا اور نہ ہم اپنے طور پر سلسلہ جنبانی کر سکتے تھے۔ نہ معلوم پھر اُن کا ردِ عمل کیا ہوتا۔ شمبھل نے اِس لیے منع کیا تھا کہ شناسائی کی صورت میں اُن کے لیے ہمارے ڈبے میں داخل ہونے کا جواز نکل آتا۔ وہ ہم سے کوئی لاگ نہیں کر رہے تھے تو ہمیں بھی پہل نہیں کرنا چاہیے تھی بلکہ اُن کی سگریٹ بھی نہیں قبول کرنا چاہیے تھی مگر سفر گزر رہا تھا۔ گاڑی کرواڑی جنکشن سے بھی گزر گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پھر اُنھوں نے کون سی جگہ متعین کی ہے۔ کرواڑی سے آگے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ تھک گئے ہیں۔ پلیٹ فارم پر ٹہیلنے رہنے کی مدت خاصی کم ہو گئی تھی۔

گاڑی ڈھائی بجے دَونڈ اسٹیشن پہنچی۔ ہم نے اُس سے پہلے ہی کھانا کھا لیا تھا۔ نواب حشمت نے سبھی کچھ بھر دیا تھا۔ چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے پان کے بیڑے بھی تھے جو کانے کو بہت مرغوب تھے۔ وہ یہ پان بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ میں اس اثنا میں ایک بار پھر اسے دیکھ آیا تھا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک تب امی کے سرہانے بیٹھا رہا۔ اُس کے زخم کچھ اور لال ہو گئے تھے۔ بخار میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ منیر علی کئی مرتبہ دم کیا ہوا پانی لے کر پلا چکے تھے۔ دعائیں پڑھ پڑھ کے پھونکتے رہے تھے۔ گاڑی دونڈ اسٹیشن پر پورے بیس منٹ [illegible] گارڈ نے شامو کو بتایا کہ اب بمبئی کا فاصلہ ڈیڑھ سو میل رہ گیا ہے۔ اگر ریل ابتدا سے تاخیر کا شکار نہ ہوتی اور اپنی رفتار سے چلتی رہتی تو پانچ بجے تک بمبئی پہنچ جاتی۔ معلوم ہوا کہ بارش زدہ علاقہ گو کبھی کا گزر چکا ہے لیکن آٹھ بھی بج سکتے ہیں اور اس سے اوپر بھی ہو سکتے ہیں۔ گارڈ کی زبانی یہ سُن کے شامو اُچھلتا ہوا میرے پاس آیا۔ اُس نے چہکتی آواز میں کہا۔ "لاڈلے! اب تھوڑے گھنٹوں کی بات ہے۔"

پانچ بجنے میں دس پندرہ منٹ باقی تھے کہ گاڑی پُونا شہر میں داخل ہو گئی۔ پُونا اسٹیشن پر تو جیسے اُن کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ سب سمجھ رہے تھے کہ بس ایک جست کی کسر ہے، گاڑی ہوا کے دوش پر چلے گی، ہوائی جہاز کی طرح اور بمبئی آ جائے گا۔ مارٹی پُونا شہر کی خوب صورتی کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔ جمرو سے کہہ رہا تھا کہ بمبئی والے جب شہر بمبئی سے تھک جاتے ہیں تو پُونا کی راہ لیتے ہیں۔ یہاں کی بات ہی اور ہے۔ گورے لوگ پُونا پر جان دیتے ہیں۔ "پُونا کا مطلب ہے کہ آدھا بمبئی میں آ گیا ہے۔ سمجھو پُونا بھی بمبئی کا چھوٹا بھائی ہے۔"

ابا جان کے برابر والے ڈبے کے دونوں آدمی بھی پُونا کے پلیٹ فارم پر اُتر گئے۔ ہماری بوگی چائے بسکٹ کے ایک بڑے اسٹال کے سامنے ٹھیری تھی۔ اسٹال کیا تھا، اچھا خاصا ہوٹل تھا۔ اُس کا تمام ساز و سامان دیکھنے کے لائق تھا۔ سب کا سب انگریزی طرز کا۔ اسٹال کے اطراف اونچے اونچے اسٹول رکھے تھے۔ لوگ اُن پر بیٹھے چائے اور دوسرے مشروبات پی رہے تھے۔ وہ دونوں بھی اسٹال پر چلے گئے۔ وہ دونڈ کے بعد کسی پلیٹ فارم پر اب اُترے تھے۔ کچھ دیر تک اُنھوں نے چائے سے شغل کیا، پان کھایا اور سگریٹ کے کش لیتے رہے۔ پھر کیسری رنگ کی واسکٹ والا آدمی ایک طرف چل دیا۔ کچھ دُور تک وہ نظر آتا رہا پھر آگے مسافروں کی بھیڑ نے اُسے چھپا لیا۔ یہ دیکھ کے شامو بھی جھجکتے سے ایک جانب کھسکتا ہوا اس کے پیچھے چل دیا۔ اسٹال پر رہ جانے والا آدمی یقیناً شامو کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ چند منٹ کے وقفے میں واسکٹ والا واپس آ گیا۔ شامو نہیں لوٹا تھا۔ اُس کی تلاش میں مارٹی کو بھیجنا پڑا۔ شامو آئے، پلیٹ فارم پر بھٹک رہا تھا۔ واسکٹ والا ابھر [illegible] اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ کہاں گیا تھا، کتنی دُور تک گیا تھا، شامو کو اِس کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔ واپس آنے پر واسکٹ والا اپنے ساتھی سے [illegible] انداز میں باتیں کرتا رہا۔ اُن کے تیوروں میں ایسی مسرت یا اشاریت نہیں تھی [illegible] چہرے سے اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔ گاڑی چلنے میں ابھی وقت تھا، وہ دونوں اپنے ڈبے میں جا کے بیٹھ گئے اور کھڑکیوں سے ہمیں دکھائی دیتے رہے۔

اُنھیں ڈبے میں گئے چند منٹ گزرے ہوں گے۔ اسٹیشن پر بھیڑ چھٹ چکی تھی اور گاڑی روانہ ہونے کے قرائن نظر آتے تھے، اچانک دو خوش پوش آدمی اُجلا لباس پہنے ہماری [illegible] اُن کے ساتھ قلی بھی تھا، سامان زیادہ نہیں تھا۔ ایک کی عمر چالیس، دوسرے کی پچیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ لباس اور وضع قطع سے وہ آسودہ حال لوگ معلوم ہوتے تھے۔ ہمارے ڈبے کے پاس آ کے وہ رُک گئے۔ سر اُٹھا کے اُنھوں نے اُوپر ڈبے کے نشانات کی طرف دیکھا اور قلی سے سامان رکھنے کو کہا۔ ابا جان منیر علی اور زورا کے سوا سب باہر تھے۔ اُنھوں نے کچھ پوچھے بغیر قلی کو سامان اندر رکھنے کی ہدایت کی۔ قلی ڈبے میں قدم بڑھا چکا تھا۔ وہ لوگ بھی داخل ہونا چاہتے تھے کہ جمرو نے اُن سے کہا کہ ڈبے میں کوئی جگہ نہیں ہے، ڈبا محفوظ بھی ہے۔ بہتر ہے، وہ کسی اور جگہ چلے جائیں۔ زیادہ عمر کے آدمی کو جمرو کا لہجہ شاید پسند نہیں آیا۔ کہنے لگا، اب بمبئی دُور ہی کتنا ہے۔ ڈبے میں خاصی جگہ ہے۔ محفوظ نشستیں اصل میں رات گزارنے کی حد تک ہوتی ہیں اور پھر ہم آپ سے درخواست تو کر سکتے ہیں نا۔" وہ یہ کہتے ہوئے اندر جانے لگا، مارٹی نے اُس کا شانہ تھام لیا۔ "اے بابو صاحب! یو ڈونٹ لسن! ابھی آپ تھوڑا اونچا سنتا ہے؟"

اُس نے نہایت نخوت سے مارٹی کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولا کہ "دُور رہ کر بات کرو، یہ کون سا انداز ہے شرفا سے بات کرنے کا۔" ساتھ ہی اُس نے قلی کو کہا دیا کہ وہ سامان برتھ کے نیچے رکھ دے۔ ہم سب پاس کھڑے دیکھ رہے تھے۔ پیر و اُن کے سامنے ہو گیا اور اُس نے نرم لہجے میں اُسے وہی سمجھایا جو جمرو نے کہا تھا اور بتایا کہ ڈبے میں ایک بیمار بھی ہے۔ ہم سب نیچے کھڑے ہیں، اُوپر چلے جائیں گے تو ڈبے میں کوئی نشست نہیں رہے گی۔ بہتر ہے، وہ دوسرا ڈبا تلاش کریں۔

نوجوان اب تک خاموش رہا تھا، وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "بمبئی تک آ رہا ہے، کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا، ایسا ہی ہے تو ہم کلیان میں اُتر جائیں گے۔ اتنے کم وقت میں کون سا ڈبا تلاش کریں۔"

"تو ابھی پہلے سے آ تارا جا صاحب!"

"ٹھیک ہے، دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔" ادھیڑ عمر سپاٹ لہجے میں بولا۔ "ہم دوسری جگہ ڈھونڈ لیں گے۔"

"ابھی وقت ہے، آگے پھر اکھاڑ پچھاڑ کیوں کرے گا۔"

"آپ لوگ کیسے آدمی ہیں؟"

"کیوں، سینگ لگا ہے اپن کے ابھی؟" پیرو نے تلخی سے کہا۔ "سیدھا بولی سمجھ نہیں آتا کیا؟"

"خوب آتی ہے۔" نوجوان نے تنک کے کہا۔ "دیکھیے ہم نے آپ سے رکوئسٹ کی ہے۔ ڈبا نہ آپ کی پراپرٹی ہے، نہ آپ نے کوئی پٹا کروالیا ہے کہ دوسرا نہیں بیٹھ سکتا۔"

"حیدر آباد سے بمبئی تک کا پتا ہی لکھوایا ہے اپن نے۔ تم نے کبھی فرسٹ کلاس میں سفر کیا ہے، یہ جاستی رو کڑا اپن کا ہے کو بھرلا ہے۔"

"رو کڑا ہم نے بھی بھرلا ہے اور حرام کا بھی نہیں ہے۔" ادھیڑ عمر شخص درشتی سے بولا۔ "بات کیوں بڑھاتے ہیں۔"

"بات تو آپ لوگ بڑھا رہے ہیں۔"

"آپ لوگ نہیں جانتے کہ کس سے بات کر رہے ہیں۔"

"لاٹ صاحب ہے۔" پیرو نے پھنکار کے کہا۔ "اپن دیکھ رہا ہے، صاحب کوئی بڑا تیس مار ہے، افسر بہادر گٹ پٹ بھی کرلیتا ہے۔ پر ابھی سائی ٹھیک نہیں دیتا۔"

"اور تم کو دکھائی کم دیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، پھر بات برابر ہوگیا۔" پیرو نے ہنس کر کہا اور قلی کو سامان اٹھانے کا اشارہ کیا۔

"سامان نہیں رہے گا۔" ادھیڑ عمر تیکھے لہجے میں بولا۔

"دیکھا اُستاد!" پیرو نے تھل کو مخاطب کیا۔ "ابھی یہ نقلی گورا صاحب کیا بولتا ہے؟"

تھل نے آگے آکے ہلکی آواز میں اُن سے کہا کہ وہ اپنا سامان اُٹھالیں۔

اندر منیر علی اور ابا جان بھی اپنی نشستوں سے کھڑے ہوگئے تھے۔ اُنھوں نے دھیما لہجہ دھیما رکھنے کی تلقین کی اور اُن دونوں سے کہا کہ اس ڈبے میں اُنھیں بھی تکلیف ہوگی، ہمیں بھی۔ منیر علی نے کانپنے کی طرف ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھیے، یہاں ایک بیمار موجود ہے۔ آپ کو واقعی زحمت ہوگی جناب!"

"آپ کو زحمت نہیں ہونے دی جائے گی بڑے صاحب!" ادھیڑ عمر ناگواری سے بولا۔ "اپنی ہم کو پروا نہیں ہے۔"

سبھی نے اپنے اپنے طور پر نرم گرم لہجے میں اُنھیں باز رکھنے کی کوشش کی لیکن اُن دونوں کا خون زیادہ گرم تھا۔ بلکہ نشے میں معلوم ہوتے تھے۔ نشہ تو بہت سی چیزوں کا ہوتا ہے۔ بہ ظاہر دونوں عام مسافر لگ رہے تھے لیکن ایک فی صد امکان میں بھی ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ اب ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا جو ہرگز مناسب نہیں تھا کہ اُنھیں جگہ دے دی جائے۔ پیرو یا تھل کسی نے پہلے والے دو آدمیوں کی طرح اُنھیں برابر کے ڈبے میں بیٹھ جانے کی پیش کش بھی نہیں کی۔ یہ دن کا وقت تھا۔ گو شام کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن سورج غروب ہونے میں وقت تھا۔

میرے ذہن میں ایک بات آئی تھی کہ اُنھیں اِسی ڈبے میں جگہ دے دی اور احتیاطاً ابا جان برابر کے ڈبے میں منتقل ہو جائیں لیکن اِس طرح، اگر وہ تھے تو ابا جان کے پاس زر و جواہر کی موجودگی کی بابت اُن کا یقین اور پختہ تھل نے ایک بار پھر نرم لہجے میں اُن سے سامان اُٹھا لینے کو کہا مگر وہ اندھے اور بہرے ہو چکے تھے۔ تھل کا کہنا بھی حجت پوری کرنے کے لیے تھا۔ نے پھر دخل دیا اور کسی قدر رعونت سے بولا۔ "آپ نہیں جانتے، یہ کون صاحب ہیں، یہ ایک بہت بڑے سرکاری افسر ہیں۔"

"تو ہم تالی پیٹیں کیا۔" تھل کی آواز بھی بدل گئی۔ اُس نے زورا کی طرف نگاہ اُٹھا کے دیکھا، زورا نے کسی توقف کے بغیر اُن کا سامان اُٹھا کر پھینک دیا۔ دونوں کی آنکھوں سے شعلے نکلے، وہ بُری طرح چیخنے چلّانے لگے۔ شور اور واہی تباہی سُن کے بہت سے مسافر متوجہ ہوگئے۔ دیکھتے دیکھتے اژدہام ہو گیا۔ نوجوان نے دروازے کے سامنے سے ہٹانے پر جمرو کا گریبان پکڑ لیا۔ جمرو نے اب تک بہت برداشت کیا تھا لہٰذا اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے نوجوان کو کمر سے پکڑ کے اوپر اُٹھا لیا۔ نوجوان ہاتھ پیر چلانے لگا۔ جمرو اُسے اوپر اُچھال کے ہاتھ ہٹا لیتا تو اُس کی ایک آدھ ہڈی ضرور ٹوٹتی۔ جمرو نے تھل اور پیرو کی طرف دیکھا جھٹکے سے اُسے دوبارہ زمین پر رکھ دیا۔ نوجوان بالکل حواس باختہ ہوگیا تھا۔ ادھیڑ عمر آدمی شور مچا رہا تھا۔ گاڑی کا گارڈ، ٹکٹ چیکر، اسٹیشن کا عملہ، ریلوے واچ اینڈ وارڈ اور پولیس والے دوڑتے ہوئے اس طرف آگئے۔ ادھر مارٹی اور زورا نے شامو کو لیا۔ وہ ادھیڑ آدمی پر جھپٹنا چاہتا تھا اور مارٹی اور زورا کے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کے لیے پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ اُس کے منہ سے بے تحاشا گالیاں جاری تھیں اور وہ ایسی ایسی باتیں اُن دونوں سے منسوب کر رہا تھا جو اُن کی زبان سے نہیں نکلی تھیں۔ شامو کا یہ زور شور عمداً تھا، مارٹی اور زورا کی روکنے کی کوشش بھی دانستہ تھی۔ شامو اُدھم مچا رہا تھا کہ اُسے چھوڑ دیا جائے، وہ اُن دونوں کا خون کر دے گا۔ اُنھوں نے اُسے ماں کی گالی دی ہے اور اُس کے بزرگ پر ہاتھ اُٹھایا ہے۔ کی چیخ پکار سب پر حاوی آگئی تھی۔ اِن پے بہ پے الزامات پر ادھیڑ عمر آدمی مدافعانہ انداز اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا۔ ریلوے پولیس کے سپاہی شامو کو خاموش کرنے کی بجائے خود چیخنے لگے تھے۔ اس ہاؤ ہُو میں کسی کی سمجھ میں کچھ آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے کہ پہلے مشتعل لوگوں کو قابو میں کیا جائے۔ سپاہیوں کی مداخلت پر شامو اور کچھ ہو گیا۔ کسی نے ادھیڑ عمر آدمی کو پیچھے ہٹا دیا۔ وہ ہکلا رہا تھا اور وضاحتیں کر رہا تھا کہ سب بہتان ہے، یہ لوگ بہت چالاک اور مکار معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دھمکیاں دے رہا تھا کہ میں بھی اُنھیں دیکھ لوں گا، ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔

"ہاں ہاں مینھ کوڑی پہنا دے، تیرے باپ کا دیا کھاتے ہیں۔ سالا مرکا کی دھونس جماتا ہے۔ پھندا ڈال دے۔ تھانا کچہری تیرے باپ کے خریدے ہیں۔ جا کے تو دیکھ ڈبے میں، اب تیری لاش ہی ادھر سے جائے گی۔" کبھی گرجنے لگتا تھا۔ کبھی پیرو، گارڈ، ٹی ٹی، اسٹیشن کا عملہ نظم و ضبط قائم رکھنے

ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ ابا جان کے برابر ڈبے کے دونوں آدمی پہلے تو دروازے پر کھڑے رہے۔ پھر پلیٹ فارم پر آگئے لیکن حیران کھڑے فاصلے سے سب کچھ دیکھتے رہے، کوئی قریب نہیں آیا۔ ریلوے پولیس کے سپاہی اصل بات جاننے کی فکر میں تھے۔ اُن کا ایک افسر بھی وہاں آگیا تھا، وہ کبھی ڈانٹتا، کبھی استدعا کرتا اور کبھی سب کو ریل سے اُتارنے کی دھمکی دیتا۔ ادھیڑ عمر آدمی نے بھی بہتان تراشنے شروع کر دیے تھے۔ اُس نے بڑھا چڑھا کے بیان کرنا چاہا کہ ہم نے ڈبے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُس پر ہاتھ اُٹھایا تھا حالانکہ اُس نے ہم سے صرف اگلے اسٹیشن تک بیٹھنے کی التجا کی تھی۔ شامو اُسے بولنے ہی نہیں دے رہا تھا مگر وہ صرف ایک تھا۔ نوجوان کو تو چپ لگ گئی تھی۔ شامو، جمرو اور پیرو، ادھیڑ عمر آدمی کے سرکاری افسر ہونے اور رعب داب جمانے کا کچھ ایسے احتجاجی انداز میں چرچا کر رہے تھے کہ لوگوں کا اُس سے برگشتہ ہو جانا لازم تھا۔ لوگ ویسے ہی سرکاری افسروں میں عیب ڈھونڈنے کے منتظر رہتے ہیں۔ چند لوگوں نے دبی زبان میں ہمیں بھی سمجھایا کہ دو شریف آدمیوں کو جگہ دینے میں ایسی برائی تو نہ تھی۔ آدمی میں تھوڑی بہت تو مروت ہونی چاہیے۔ شامو بار بار بھڑک اُٹھتا، وہ کہہ رہا تھا کہ اُسے اور افسر دونوں کو تھانے لے جا کے فیصلہ کیا جائے۔ اب تو وہ تھانے جا کے ہی اس گھمنڈی کا کس بل دیکھے گا، دیکھتے ہیں کہ اس کی کرسی کتنی بڑی ہے، وہیں جا کے اِسے بتائیں گے کہ ہم کون ہیں اور اِس نے کس آدمی پر ہاتھ اُٹھایا ہے، سالا کرسی کا زور دکھاتا ہے۔ ٹھوکروں پر رکھتے ہیں ہم کرسیاں۔

شامو کے منہ میں جو آیا، بکتا رہا۔ ایک بزرگ مسافر نے ہاتھ جوڑ کے اُس سے اور ادھیڑ عمر آدمی سے منت کی کہ اُن کی وجہ سے گاڑی کی روانگی میں تاخیر ہو رہی ہے اور سینکڑوں مسافر پریشان ہو رہے ہیں، وہ اپنا نہیں تو دوسروں ہی کا خیال کریں۔ ادھیڑ عمر آدمی کے پسینے چھوٹ رہے تھے، آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں، وہ بُری طرح متزلزل ہو چکا تھا۔ اتنے میں ابا جان کے برابر والے ڈبے کے دو آدمیوں میں سے ایک آدمی لوگوں کی بھیڑ کاٹتا ہمارے قریب آیا اور ادھیڑ عمر آدمی سے التجا آمیز لہجے میں بولا کہ وہ برابر کے ڈبے کا مسافر ہے، اِسی فرسٹ کلاس کا۔ وہ دونوں اُس کے ڈبے میں آجائیں۔ ادھیڑ عمر آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا، دوسرے لوگ تائید میں آوازیں اُٹھانے لگے۔ انکار کا محل نہیں تھا۔ انکار پر پولیس کی نوبت آجاتی اور لوگوں کی ناراضی کی بھی۔ ہرچند کہ شروع ہی میں ٹی ٹی نے اُن دونوں کو کسی اور ڈبے میں مناسب جگہ فراہم کرنے کی پیش کش کی تھی لیکن اُس وقت وہ طیش میں تھا۔ ٹی ٹی کی پیش کش اُس نے حقارت سے ٹھکرا دی تھی اور دعوا کیا تھا کہ اب تو وہ اِسی ڈبے میں بیٹھیں گے ورنہ گاڑی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گی۔ لوگوں نے اُس کی کمر اور شانوں پر ہاتھ رکھ کے اُسے ہم سے دُور کر دیا۔ وہ بڑبڑاتا رہا کہ بمبئی اُتر کے وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ اِدھر مارٹی اور زورا نے شامو کو پیچھے گھسیٹ لیا۔

گارڈ نے سیٹی بجانے میں عجلت کی تھی، لوگ بھاگنے دوڑنے لگے۔ گارڈ کو یہ تدبیر اور پہلے اختیار کرنی چاہیے تھی۔ اُس نے لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے سیٹی بجائی تھی۔ گاڑی روانہ ہونے میں چند منٹ اور لگ گئے۔ اندر آکے شامو ہانپنے لگا۔ جمرو نے اُسے پانی پلایا اور گلے سے لگا لیا۔

پونا اسٹیشن سے گاڑی کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ گاڑی چھوٹے چھوٹے بہت سے اسٹیشن چھوڑتی ہوئی اب خاص خاص مقامات پر رُک رہی تھی، وہ بھی تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے۔ کرجت اسٹیشن پر البتہ کچھ دیر کے لیے ٹھیری لیکن کلیان سے پہلے نہ ہم کسی جگہ باہر نکلے، نہ برابر کے ڈبے سے کوئی نکلا۔ کرجت ہی پر اندھیرا ہو گیا تھا۔ اسٹیشن پر قمقمے روشن تھے۔ کلیان پر تو رات پوری طرح غالب آچکی تھی۔ ٹھیک پونے نو بجے گاڑی وہاں پہنچی۔ ہمارے حیدر آباد سے اب تک کے ہم سایہ، ہم سفر یعنی وہ دونوں پلیٹ فارم پر آکے اُسی طرح کھڑے ہوگئے جیسے بیشتر اسٹیشنوں پر اُن کا معمول رہا تھا۔ اب اگر اُن کے دماغ میں کچھ تھا تو اس کا وقت غالباً گزر چکا تھا۔ بمبئی شہر شروع ہو رہا تھا۔ مارٹی کے کہنے کے مطابق آگے جگہ جگہ بستیاں آباد تھیں، بستیاں اور کارخانے۔ اِس علاقے کا چپا چپا زورا، ٹنگو، مارٹی اور پیرو کا چھانا ہوا تھا۔ کلیان سے بوری بندر کا فاصلہ صرف تیس میل رہ گیا۔ بوری بندر پر گاڑی ختم ہو جاتی تھی۔ کلیان کے پلیٹ فارم سے ہم نے نوجوان اور ادھیڑ آدمی کو ڈبے میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں خشونت صاف نظر آتی تھی لیکن وہ وہیں بیٹھے رہے۔ جانے بھی اُنھوں نے اپنی نشستوں پر پی۔ اُن کی اور ہمارا تعاقب کرنے والوں کی رفاقت کے بارے میں یقین سے ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے، وہ عام مسافر ہی ہوں۔ پولیس وغیرہ کی بات سُن کے ہمارا پیچھا کرنے والوں کو چونک جانا چاہیے تھا۔ اگر وہ اُن کے ساتھی تھے یا نہیں تھے، دونوں صورتوں میں اُنھیں پولیس کی مداخلت گوارا نہیں ہونی چاہیے تھی۔

زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کا سفر رہ گیا تھا۔ بمبئی پہنچ کے اُن کا کام ختم ہو جائے گا، آخر وہ کس جگہ، کون سی جگہ کے منتظر ہیں یا اُن کا مقصد ادھیڑ عمر اور نوجوان آدمی کی ناکامی پر تمام ہو گیا لیکن دونوں کی وابستگی بھی ایک گمان ہی ہے۔ اگر وہ اُن کے ساتھی نہیں ہیں تو ساری تگ و دو اور اِس طویل سفر سے اُنھیں کیا حاصل ہوا؟ میں نے سوچا کہ پیرو سے پوچھوں مگر وہ بھی کیا جواب دیتا۔ اُن کے چہروں سے ایسی بے اطمینانی اور بے چینی ہویدا نہیں تھی، تھکے تھکے وہ ضرور لگتے تھے۔ میں پلیٹ فارم پر جمرو، شامو اور مارٹی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا مگر میرا دماغ اُنھی کی طرف مرکوز تھا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ بمبئی تک پہنچ جانے کے بعد اُن کا کام ختم کہاں ہو گیا، یہ تو بہت اُدھورا ہے۔ یہاں تک اُن کا مقصد محض ہماری نگرانی تھا کہ ہم راستے میں سفر ملتوی نہ کر دیں، کسی اور سمت نہ نکل جائیں، کہیں ہم کھو نہ جائیں۔ اُن کا اصل کام تو بمبئی جا کے شروع ہونا ہے، اُن کے تعاقب کا سلسلہ تو ہمارے ٹھکانے تک دراز ہونا چاہیے، اب اُنھیں ہمارا گھر دیکھ کے بلکہ نشان زد کر کے ہی لوٹنا چاہیے۔ ہمارے شب و روز، ہمارا شجرہ جانے بغیر نہیں جانا چاہیے کیونکہ ہمارے بارے میں اُن کے آقاؤں کو حیدر آباد میں ایسا کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

سب کچھ تسلسل سے تھا۔ اُن کی گوہر شناسی، اُن کے ذوقِ نوادر، اُن

کی اُفتادِ طبع اور مزاجِ خسروی کے مطابق وہ اپنی طلب کی صداقت دسرکشی کے کئی ثبوت دے چکے تھے۔ سب سے بڑا ثبوت تو اُنھوں نے ۱۴ مسلح وحشیوں کا ایک پورا دستہ اباجان کی حویلی کی طرف بھیج کے دیا تھا۔ نواب عالم تاب کے ہاں سے ہماری واپسی کے کئی روز پہلے سے اُن کے آدمی حویلی حصار میں لیے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنے جنونِ شوق کے اظہار کے لیے حرفوں سے بنے ہوئے دو شاطر سوداگر بھی بھیجے تھے۔ سو سب کچھ تسلسل سے تھا۔ مہاراجا دھرم دیر سے تو ایک پہر کا بھی ضبط نہیں ہوا۔ سہ پہر کو ہم حویلی پہنچے تھے اور رات کو وہ اپنا کشکول لیے ہمارے دَر پر موجود تھا۔ دولت مند سے بڑا کوئی سائل نہیں ہوتا۔ اُسی جیسے اُس کے کسی ہم رتبہ نواب دلجانے یہاں سفر تک ہتھیاروں سے لیس اپنے نو منتخب آدمیوں کا نمک خواروں کا قافلہ روانہ کر دیا تھا جو حویلی سے نامراد واپس جانے والے ہتھیار بندوں کی طرح اپنے تازہ فرستادوں کی ناکامی کا خدشہ بھی اُس کے پیشِ نظر ہوگا، اِس لیے از رُوئے احتیاط اُس نے دو ایسے آدمیوں کو بھی بھیجنا ضروری سمجھا جن کا کام ہمارے بارے میں ہر قسم کی جزئیات کی چھان بین کرنا ہو، یا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اگر اس کا نام نواب قطب الدین علی تھا تو وہ اُسی کے آدمی ہوں۔ برقع پوش اور شال والے کے ساتھیوں اور اِن دونوں کا ایک دوسرے سے واقف ہونا مناسب نہیں تھا۔ اُنھیں ایک دوسرے سے بے خبر ہی رہنا چاہیے تھا۔ اُن کا آپسی ربط کہیں ظاہر ہو جاتا تو ہمیں شک میں ڈال سکتا تھا۔ مجھ سے باہر نہیں رہا جا سکا۔ میں فوراً تھل اور پیرو کے پاس جا کے اُنھیں آگاہ کرنا چاہتا تھا کہ اُنھوں نے اِس پہلو پر بھی غور کیا ہے؟ اُن لوگوں کا تعاقب ہمارے گھر تک جاری رہ سکتا ہے اور اِس کے بعد بھی۔ جمرو، شامو اور مارٹی کو وہیں چھوڑ کے میں اباجان کے ڈبے میں داخل ہو گیا اور میں نے تھل کے قریب جا کے سرگوشی میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ہاں رے!" وہ سر ہلا کے بولا۔ "تو اِن کو ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

"ممبئی تو آنے دے رے!" وہ ہنکاری بھر کے بولا۔ "اُدھر پیرو دادا نے بہت سُور کے بچّے پال رکھے ہیں۔"

میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ "مگر کیا....؟" میں کہنا چاہتا تھا کہ ہم اباجان اور منیر علی کو لے کے کیا پہلے پیرو کے علاقے میں چلیں گے؟ پیرو دادا کے باڑے کی طرف؟.... لیکن میں خاموش رہا۔ اُس طرف جانے میں حرج بھی کیا ہے؟ پیرو کا علاقہ تو اب سارے ممبئی پر پھیلا ہوا ہے۔ گرتنا کی طرح کوئی سوما پیدا نہ ہو گیا ہو، جیسے کلکتے میں ہوا تھا، اُڈے سے تھل کی ناموجودی کا فائدہ اُٹھا کر تنا کھال سے باہر ہو گیا تھا۔ پیرو کو اپنے خاص علاقے تک پہنچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ باڑے کے آدمی جگہ جگہ تعینات ہوں گے۔ پیرو کے لیے باقاعدہ کسی باڑے تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک اشارہ کافی ہوگا۔

میں اپنے ڈبے میں چلا آیا۔ میرے سینے سے جیسے دُھند چھٹ گئی۔ کلیان سے پچیس منٹ بعد ہی تھانا اسٹیشن آ گیا تھا۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھ رہی تھی، مارٹی کے چہرے کی آگ بھی بڑھتی جاتی تھی۔ ٹنگو کھڑکیوں سے نظر آنے والی سڑکوں، عمارتوں اور کارخانوں کے نام شامو اور جمرو کو بتاتا اور ڈبے میں اُچھلنے لگتا۔ پیرو بظاہر خاموش بیٹھا تھا مگر مسلسل پہلو بدل رہا تھا۔ گاڑی شہرِ ممبئی سے گزر رہی تھی۔ دونوں اطراف بلند و بالا عمارتیں شروع ہو گئی تھیں۔ ہر طرف روشنیوں کے جھنڈ سے بکھرے تھے۔ ایک عرصے بعد وہ اپنے شہر واپس آ رہے تھے۔ اُدھر اباجان کے ڈبے میں زورا کا بھی کچھ یہی حال ہوگا۔ تبت کے سفر سے سلامت لوٹ آنا، سب کے لیے نئی زندگی ملنے کے برابر تھا۔ وہ اپنے تمام رشتے، تمام سلسلے ختم کر کے ہی تبت کی طرف گئے تھے۔ اتفاق سے سُلطان، وزیر، متن خاں وغیرہ کا قرعہ نکل آیا تھا، وہ رہ جاتے تو اُن کی جگہ ہم میں سے کوئی کام آ جاتا۔

گاڑی تھانا اسٹیشن سے گزر گئی تو پیرو اپنی نشست سے اُٹھ کے میرے پاس چلا آیا۔ اُس نے میری کمر میں بازو ڈال کے مجھے دبوچ لیا۔ "ابھی کیا حال ہے راجا؟"

میں نے سیدھے ہو کے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

"ابھی ادِھر کا حال پوچھتا ہے۔" وہ میرا سینہ ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "ادِھر تو سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں دادا!" میں نے دبی آواز میں کہا۔

"تھام کے ہی رکھنا جانی!" میں نے سر جھکا لیا، اُس نے اور زور سے مجھے دبوچ لیا۔ "اپن سوچتا ہے، وہ دیکھے گا تو ابھی کیا بولے گا۔ اُس کو سب ابھی سپنا مانک ہی دکھائی دے گا، اتنا بڑا خوشی ایک دم ملنے سے تو وہ پاگل ہو جائے گا، اکھا پاگل۔"

"کیا معلوم دادا! مجھے دیکھ کے تو اُنھیں سب کچھ یاد آ جانا چاہیے۔ سارے زخم تازہ ہو جائیں گے۔ امّی، فمی، گھر بار، سب کچھ۔ معلوم نہیں جہاں گیر کے بارے میں بھی اُنھیں کچھ علم ہے یا نہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اُنھیں تو اپنے گھر میں مجھے داخل ہونے کی اجازت بھی نہیں دینا چاہیے، اُنھیں تو میرے منہ پہ تھوک دینا چاہیے۔ میرے گھر سے نکل جانے کے بعد اُن کا باپ بھی اُن کا کب رہا تھا۔" میری آواز بھرّا نے لگی۔

"نئیں راجا! نئیں۔ ابھی سب جگہ سالا ایسا ہی ہے۔ جیدر بھی دیکھے۔ ایک بار کبھی کو سرا ہاتھ سے نکل پڑتا ہے تو آگے سب اُلجھتا جاتا ہے۔ تو کیا ابھی جان کے ایسا مانگتا تھا۔ ایسا تو تو نے ایک دم نئیں سوچا تھا جانی! سب ٹیم سے کا نا ٹک ہے۔ اُلٹا چلنے کو آیا تو نیچے کا اوپر، اوپر کا نیچے۔ سالا سب اُلٹ دیتا ہے۔ ابھی دیکھنا تجھ کو سامنے دیکھ کے وہ اکھا دُکھ بھول جائے گا۔ بھائی تو بڑا چیز ہوتا ہے، دُدھ کا ناتا، خون کا ناتا، اور تو تو ویسے بھی بڑا ہے۔ تھوڑا روئے گا پر وہ دُکھ کا آنسو نئیں ہوئے گا راجا!"

"مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا دادا!"

"کیسا آئے گا۔ ابھی ٹیم بھی تو بہت اُوپر ہو گیا، دس سال کے برابر دیکھنا راجا! ملنے پہ آیا ہے تو ابھی سب کھویا ہوا مل جائے گا۔"

میں اُس کا چہرہ ایک نظر دیکھ کے رہ گیا۔

"ہاں راجا! اپن کا دل بولتا ہے۔ ایک دن ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی چپ ہو گیا۔ شاید اُسے خیال آ گیا تھا کہ بے جواز تسلّیاں تو اور بے آرام کر دیتی ہیں۔

گاڑی بیچ شہر سے گزر رہی تھی۔ تھانا اسٹیشن پر اُنھوں نے طے کیا تھا کہ بوری بندر کے بجائے دادر اُتر جائیں گے۔ گاڑی درمیان کے مختلف اسٹیشن چھوڑتی ہوئی کرلا آ گئی تھی۔ مارٹی کے بقول کرلا سے دادر کا فاصلہ چند میل سے زیادہ نہیں تھا۔ میں اپنی نشست پر بیٹھا رہا۔ میری رگوں میں کن سلائیاں سی رینگ رہی تھیں۔ مارٹی فاصلہ کم ہونے کا اعلان کرتا تو میرا سارا جسم سُن ہونے لگتا۔ فرخ زبال، فارعہ اور اکبر کے چہرے آنکھوں میں اُتر آتے۔ وہ تو سب بدل گئے ہوں گے۔ اکبر بھی خوب بڑا ہو گیا ہوگا۔ اب تو فارعہ، فرخ، فریال سب کا رنگ رُوپ ہی کچھ اور ہوگا مگر وہ کتنی بدل جائیں، میں اُنھیں ایک نگاہ میں پہچان لوں گا۔ میں اتنے عرصے اُن سے دُور رہا لیکن اُن کے چہرے تو میرے دل پر نقش تھے۔ میں حیدر آباد میں جہاں گیر کو ایک جھلک میں پہچان گیا تھا۔ پرسوں حیدر آباد سے چلتے وقت بھی پیرو سے اُن کا ذکر کیا تھا، میں نے کہا تھا کہ مجھے تو اُن کے سامنے جانے کے تصور ہی سے ہول آنے لگتا ہے اور اب.... فاصلہ ہی کتنا رہ گیا تھا۔ مجھے سب کچھ عجیب عجیب لگ رہا تھا۔ کبھی میرا جی چاہتا کہ گاڑی درمیان میں کہیں رُک جائے، اتنی تاخیر سے پہنچی ہے تو کچھ اور تاخیر ہو جائے.... میرا دل تو ابھی سے دھڑک رہا ہے، اُن کے سامنے کیسے جایا جا سکے گا؟ وہ مجھ سے کوئی سوال کریں گی تو میں کیا جواب دوں گا۔ زبان نہیں تو اُن کی نظریں ضرور سوالات کریں گی۔ بس خدا کرے وہ خیریت سے ہوں۔ مولوی اکرم کو میں نے دیکھا تھا، وہ ایک دین دار اور شفیق آدمی ہیں۔ اباجان نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی اُنھیں یہ ذمّے داری سونپی ہوگی۔ اُنھوں نے اُن کا اپنی اولاد کی طرح خیال رکھا ہوگا۔ میرے سر میں بار بار طرح طرح کے وسوسے اُٹھنے لگتے۔ کہیں وہاں جا کے کچھ اور سُننے کو نہ ملے۔ خدا کرے، وہ سب ٹھیک ہوں، ہر بلا اور ہر نظرِ بد سے محفوظ۔

کرلا پر مارٹی، ٹنگو، جمرو، شامو سب نیچے اُترے اور واپس آ کے اُنھوں نے پیرو کو بتایا کہ اُدھیڑ اور نوجوان آدمی برابر کے ڈبے میں موجود ہیں اور وہ دونوں بھی۔ اُن میں سے ایک پلیٹ فارم پر کھڑا ہے۔ تھل نے مارٹی کو تاکید کی تھی کہ دادر اسٹیشن پر ہم کوئی دیر نہ کریں۔ جیسے ہی گاڑی ٹھیرے، ڈبے سے باہر نکلیں۔ تھل نے اُن سب کی توقع کے خلاف یہ ہدایت دی تھی۔ وہ اِس کے برعکس ارادے باندھ رہے تھے کہ بالکل آخری لمحوں میں، جب گاڑی دادر سے اپنی اگلی منزل کے لیے روانہ ہونے کو تیار ہو، اُس وقت ہم ڈبے سے باہر نکلیں۔ دیکھتے ہیں پھر وہ دونوں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ یقیناً اتنی جلد اُنھیں ہماری پیروی کرنے میں بڑی دقت ہوگی اور اُنھیں ہماری نظروں میں مشکوک ہو جانے کا خدشہ بھی لاحق ہوگا۔ جمرو نے ایک مشورہ دیا تھا کہ کیوں نہ ہم اُنھیں وادر.... رستہ ختم کرنے کا تاثر دے کے ڈبے میں دوبارہ بیٹھ جائیں یا کھڑکیوں میں آ رہیں۔ دو اِس اسٹیشن پر، تین اُس اسٹیشن پر۔ وہ کس کس کے پیچھے جائیں گے مگر جمرو بھول رہا تھا۔ وہ صرف اباجان پر نظر رکھیں گے۔ سامان اُن کے پاس بھی زیادہ نہیں ہونا چاہیے اور ایسے موقع پر تو وہ کسی چیز کی فکر نہیں کریں گے۔ اتنے طویل تعاقب کے بعد وہ اِس طرح ہمیں اپنے ہاتھ سے نہیں نکلنے دیں گے۔ لازماً اُن کے ذہن میں بھی یہ تمام صورتیں ہوں گی۔ اباجان اور منیر علی کی موجودگی میں ہم زیادہ پھرتی بھی نہیں کر سکتے۔ ورنہ چلتی گاڑی سے بھی اُترا جا سکتا تھا۔ بہرحال تھل نے اُن دونوں کی مشکل آسان کر دی، اُس نے اُنھیں کسی اُلجھن میں نہ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ تھل کی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ اُنھیں اپنے تعاقب کا ہر موقع فراہم کرنا چاہتا تھا۔ ہم اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تو دوسری طرف وہ بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتے۔ جتنی اُنھیں ہماری ضرورت تھی، اُتنے ہی وہ بھی ہمیں مطلوب تھے۔

کرلا سے ابھی گاڑی چلی ہی تھی کہ مارٹی نے مختصر سا سامان سمیٹ لیا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈبے سے کود پڑے۔ "وہ دیکھو جمرو بھائی!" مارٹی بار بار جمرو کو متوجہ کر رہا تھا۔ "وہ دیکھو جمرو بھائی! وہ سامنے مٹھائی کا بڑا دکان نظر آ رہا ہے تم کو؟ رس گلا میں بنگال کو مار دیا ہے سالے نے۔ ایک دم فنٹاسٹک۔ معلوم ہے اِس کو ادِھر لوگ باگ کیا بولتا ہے؟"

"کیا بولتا ہے؟"

"حلوا بلوائی۔"

"حلوا بلوائی؟" جمرو نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں یہی تو سالا بات ہے۔ اِس کا نام تھا بلوا حلوائی، بلوا مل حلوائی کا تھوڑا شارٹ۔ چھوکرا لوگ حرامی نے ایسا گھُٹالا کیا کہ ابھی سب دُور دُور حلوا بلوائی بولتا ہے۔"

"ادِھر اپنے فیض آباد میں بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ ادِھر اپنے اڈّے کے کنے ایک اندھا رہتا تھا کلن نام کا۔ سب اِس کو اندھے کلن پکارتے تھے۔ کسی لونڈے لپاڑے سے ایک دن جلدی میں کلّے اندھن منہ سے نکل گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اب سب کلّے اندھن بولتے ہیں۔ بہت چڑتا ہے، لاٹھی اُٹھا لیتا ہے پر بے چارہ ہوا میں گھما کے رہ جاتا ہے۔"

"دادر آ رہا ہے۔" ٹنگو نے مضطرب آواز میں مارٹی کو ٹھوکا دیا۔ "ماسٹر! سالا دادر آ رہا ہے۔"

دادر پر گاڑی ٹھیری تو لوگوں کا ایک ہجوم جیسے گاڑی پر جھپٹ پڑا۔ ایک ساتھ کئی قلی ہمارے ڈبے کی جانب لپکے۔ لگتا تھا، دادر ہی پر ساری گاڑی خالی ہو جائے گی۔ سارا اسٹیشن روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور ہر طرف سے شور اُمڈا پڑ رہا تھا، شور میں روشنی اور تیز ہو جاتی ہے۔ چند لمحوں بعد اباجان کانتے اور منیر علی بھی اپنے ڈبے سے باہر آ گئے، سر سے کمر تک لپٹی ہوئی شال میں صرف اُس کا چہرہ نظر آ رہا تھا، جلتا ہوا چہرہ۔ مارٹی اور جمرو نے اُسے سہارا دینے کی کوشش کی، اُس نے

اُنھیں جھڑک دیا۔ وہ آہستہ آہستہ ڈبے سے باہر آیا۔ چند قدم چلا تھا کہ لڑکھڑانے لگا۔ پیرو اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے نہ پکڑ لیتا تو وہ یقیناً گر پڑتا۔ پیرو نے آگے لے جاکے اُسے ایک بینچ پر بٹھا دیا۔ برابر کے ڈبے سے وہ دونوں بھی افراتفری کے عالم میں اُترے، اُن کے پیچھے پیچھے ادھیڑ اور نوجوان آدمی بھی تھے، اُن کی حالت اضطراری تھی لیکن جلد ہی اعتدال پر آگئی۔ اسٹیشن سے باہر جانے کا راستہ خاصا طویل تھا۔ بھیڑ کسی حد تک چھٹی تو ہم نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا، کانتے کی وجہ سے ہمیں آہستہ آہستہ چلنا پڑا۔ اُن دونوں کی رفتار بھی اسی نسبت سے سُست ہوگئی۔ تھوڑی تھوڑی دُور بعد ہم چند قدم آگے نکل جاتے، پھر رُک کے کانتے کے آنے کا انتظار کرتے، اس طرح ہمیں اُنھیں دیکھنے کا بھی موقع مل جاتا۔ وہ چاروں ساتھ ساتھ تھے۔ ادھیڑ اور نوجوان آدمی کے تیور ابھی تک ٹھیک معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اچھا ہوا کہ اُنھوں نے چہرے کی برہمی پر اکتفا کیا ورنہ بمبئی آکے کسی کے ہاتھ ایسے جکڑے اور بندھے ہوئے نہیں رہے تھے۔

ابھی ہم گیٹ تک نہیں پہنچے تھے کہ ایک باوردی شخص گھبرایا گھبرایا اُن کے پاس گیا، اُس نے اُنھیں مؤدبانہ سلام کیا۔ جواب میں ادھیڑ آدمی نے کبیدگی کا اظہار کیا۔ وردی پوش طور طریق سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے ادھیڑ آدمی کے ہاتھ سے چرمی کیس لے لیا اور اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جُھل کی ہدایت پر مارٹی اور ٹنگو ہم سے پہلے باہر چلے گئے تھے۔ جب ہم گیٹ سے نکلے تو دو ٹرمیں تیار کھڑی تھیں۔ ہم نے بیٹھنے میں عجلت نہیں کی کچھ تو کانتے کے آنے کا انتظار کیا، کچھ ویسے ہی دیر لگائی۔ اس تاخیر کا مطلب اُنھیں سواری حاصل کرنے کا موقع دینا بھی تھا۔ وہ دونوں گیٹ کے باہر تک ادھیڑ اور نوجوان آدمی کے ساتھ رہے۔ گیٹ کے باہر سائبان میں دونوں فریق ایک دوسرے سے پُرتپاک انداز میں تکرار کرتے رہے۔ ادھیڑ آدمی نے شاید اُنھیں اپنی گاڑی میں چلنے کی پیش کش کی تھی جسے رَد کرنا اُن کے لیے دشوار ہو رہا تھا تاہم وہ کامیاب ہوگئے۔ اُن کے باہمی تعلقات سے واضح ہو رہا تھا کہ یہ تعلق زیادہ دیرینہ نہیں ہے، صرف سفر کا ہے یا یہ خاص طور پر ہمارے لیے ایک دکھاوا ہے۔ بہرحال اُن دونوں کو جلدی تھی کہ کہیں ادھیڑ اور نوجوان آدمی کے شوقِ میزبانی میں ہم اُن کی نظروں سے دُور نہ ہو جائیں۔ ایک نے ادھیڑ آدمی سے معذرت کرلی اور آگے جاکے ٹرم والے سے بات کرلی۔ ہم ابھی سو دو سو گز دُور آئے ہوں گے کہ پیچھے سے اُن کی ٹرم آتی دکھائی دی پھر دیر تک کم و بیش یہی فاصلہ برقرار رہا۔

ٹرموں کا بالائی حصہ کھلا ہوا تھا، اُن کی ٹرم کا بھی۔ دس سے اوپر ہو چکے تھے۔ سڑکوں پر روشنی نہ اتنی زیادہ تھی، نہ اتنی کم۔ اکا دکا دکانیں کھلی تھیں لیکن ایسا سناٹا بھی نہیں تھا۔ بمبئی میں سڑکوں پر رات گئے تک چہل پہل رہتی ہے۔ جگہ جگہ فٹ پاتھوں پر لوگوں کی ٹکڑیاں بیٹھی رہتی ہیں، کہیں تاش اور شطرنج کی بازیاں جمی ہیں، کہیں چوسر اور ڈرافٹ پر داؤ لگ رہے ہیں۔ آسمان کھلا ہوا تھا اور ہوا چل رہی تھی۔ نہ زیادہ گرم نہ سرد، حیدرآباد کے مقابلے میں کسی قدر گرم۔ ہماری گاڑیاں ایک سڑک سے دوسری سڑک پر مڑ گئیں۔ آگے والی ٹرم میں پیرو بیٹھا تھا، اُس کے ساتھ شامو، کانتے اور زورا تھے، ٹنگو اور پیرو کوچوان کے پہلو میں دُبکا ہوا تھا۔ ہم میں سے جو کوچوان کی پشت سے لگی ہوئی تپائی جیسی چھوٹی گدی پر بیٹھے تھے اُن کے چہرے گزرنے والے راستوں کے رُخ پر تھے۔ وہ کسی قباحت کے بغیر پیچھے دیکھنے پر قادر تھے۔ میں بھی اسی رُخ بیٹھا تھا مگر دوسری گاڑی میں، ابا جان، منیر علی، مارٹی اور جُھل کے ساتھ۔ میں اور مارٹی مسلسل اُن پر نظریں رکھے ہوئے تھے۔ اُن کی گاڑی ہمارے پیچھے پیچھے آتی رہی۔ اُنھیں سرِ دست یہیں تک یا کچھ اور آگے تک آنے پر قناعت کرنی چاہیے تھی۔ ظاہر ہے، وہ اتنے بیوقوف نہیں ہوں گے کہ زیادہ دیر ہمارا تعاقب جاری رکھ کے خود کو ہماری نگاہوں میں طشت از بام ہو جانے کا اندیشہ یقین میں بدلیں۔ ہمارے کوچوان ذرا سی تگ و دو پر اُنھیں دوبارہ مل سکتے تھے اور ذرا سی بخشش پر ہمارے اُترنے کی جگہ کی نشان دہی کر سکتے تھے۔ اُن کی تلاش میں اُن کی ٹرم کا کوچوان بھی اعانت کرسکتا تھا، اس اثنا میں اُنھوں نے ہماری گاڑیوں کے نمبر اور دوسری نشانیاں بھی ذہن نشین کرلی ہوں گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جلد ہی کسی جگہ اُتر کے وہ اپنے کوچوان ہی کو ہم پر نگاہ رکھنے کی ذمے داری سونپ دیں۔ کوچوان یہ کام بہ حسن و خوبی انجام دے سکتا تھا۔

دادر کا پاڑا گزر گیا، اس کے بعد ایک اور پاڑا بھی۔ پیرو نے ٹرم اِن پاڑوں سے دُور دُور رکھی۔ یہ اتفاق تھا کہ پاڑے کا کوئی آدمی ہمیں راستے میں نظر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے اِس کی وجہ پولیس کی اُن دنوں کی سختی ہو ویسے بھی رات ہوگئی تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ دونوں اپنی ٹرم دوسرے راستے پر لے جائیں، پیرو کو کوئی قدم اُٹھا لینا چاہیے تھا۔ دادر میں ہی مولوی اکرم کا گھر تھا۔ ٹرمیں اُس طرف جانے والے راستے کی طرف سے گزری تھیں لیکن آگے بڑھتی گئیں۔

آخر خاصا طویل چکر کاٹتے ہوئے ہم ماہم کے علاقے میں داخل ہوگئے، پیرو کے خاص علاقے میں۔ پاڑے کی عمارت سے کچھ دُور ماما پان والے کی دکان تھی۔ اپنے پاڑے کی طرف جانے کے بجائے پیرو ماما کی دُکان کی طرف آگیا۔ ٹرم کی چھوٹی نشست پر بیٹھنے کی وجہ سے میں آگے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب ٹرم سامنے سے گزر کے آگے چلی آئی تب ماما کی جگمگاتی دُکان مجھے نظر آسکی۔ ماما اپنے مخصوص انداز میں آلتی پالتی مارے چبوترے پر بیٹھا تھا، گیروا صافہ باندھے، گلے میں گیندے اور کوڑیوں کے ہار ڈالے، ململ کے بُراق کرتے میں ملبوس۔ دکان پر چند گاہک بھی کھڑے تھے۔ دُکان سے سو ڈیڑھ سو قدم دُور ہماری ٹرم کو یکایک جھٹکا سا لگا، گھوڑے کی ہنہناہٹ اور منتشر ٹاپوں کی گونج کے ساتھ ہی ٹرم کی رفتار سُست ہوگئی۔ آگے ضرور پیرو نے گاڑی ٹھہرانے کا حکم دیا ہوگا۔ میں نے اُترنے کا ارادہ کیا مگر پیرو کو اپنی طرف آتا دیکھ کے ٹھیر گیا۔ جُھل نے بھی مجھے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ گاڑی رُکنے پر ماما کی دکان کے گاہک بھی متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُن میں سے دو فوراً لپٹ پڑے۔ اُنھیں دیکھ کے میری آنکھیں سٹ پٹا گئیں۔ وہ لچھی اور گلیا تھے، پیرو کے پاڑے کے خاص آدمی۔ ٹرم رُکنے کی آہٹ پر اُن کے کان کھڑے ہوئے ہوں گے۔

دوسرے ہی لمحے اُن کی نظر اپنی طرف بڑھتے ہوئے پیرو پر پڑی، ایک ثانیے کے لیے تو وہ ہیبت زدہ رہ گئے، پھر "ہائے داوا، داوا!" اُنھوں نے بے اختیار صدا لگائی اور اُچھلتے چیختے ہوئے اتنی تیزی سے پیرو کی جانب جھپٹے کہ اطراف میں کوئی بھی بے خبر نہ رہ سکا ہوگا۔ دونوں نے پہلے تو ہیجانی انداز میں پیرو کے پیر چھوئے پھر بے تحاشا اُس کے گلے سے لگ گئے۔ ابھی چند ثانیوں میں پیرو نے اُن سے کچھ کہا ہوگا، اُن کے جسم کا پارا پھڑک کے رہ گیا۔ اُن کے شانے تھپ تھپا کے اور گالوں کا بوسہ لے کے پیرو فوراً پلٹا مگر ماما نے اُس کا راستہ روک لیا۔ ماما چبوترے سے اُتر آیا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے پیرو کے منہ میں پان کا بیڑا رکھا اور ہاتھ جوڑ کے خیریت پوچھنے لگا۔ پیرو نے نہایت رسمی طور پر جواب دیا اور اُسے وہیں چھوڑ کے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں اُن دونوں آدمیوں کی گاڑی آگے نکل گئی۔ اُسے نکل ہی جانا چاہیے تھا، رُکنے یا پلٹ کے دیکھنے کا محل نہیں تھا۔ آگے چلے جانے پر بھی اُنھوں نے مڑ کے ہماری طرف نہیں دیکھا، اُن کی ٹرم سُست ہوئی۔ قریب آنے پر میں نے اُنھیں غور سے دیکھا تھا، اُن کے چہرے بالکل بے حس تھے لیکن اُن کی نظریں ظاہر ہے کہ ہم پر منڈلا رہی ہوں گی۔ لچھی اور گلیا کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر چل پڑے تھے۔ چاقو پر اُن کا ہاتھ رواں تھا اور زور آزمائی خوب کر لیتے تھے۔ دونوں جسم کے پھرتیلے تھے مگر جُھل کے بہ قول اصل پھرتی تو نگاہ کی ہوتی ہے اور دماغ کی حاضری کی۔ آنکھ سر کے پاس ہی رہنا چاہیے۔ پیرو نے اُن سے صرف چند لفظ کہے ہوں گے، وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ اُن سے کس قدر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ دکانوں کے آگے سائبان میں وہ دونوں ہمیں آگے جاتے نظر آئے پھر نگاہ سے اوجھل ہوگئے۔ ماما کی دکان سے اگلے موڑ پر ہم نے بھی راستہ بدل دیا اور سیدھی سڑک پر جانے کے بجائے بائیں جانب مڑ گئے۔ ٹرمیں باندرے کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ ایک ایرانی چائے خانے کے نزدیک پیرو نے اُنھیں چھوڑ دیا پھر چند قدم پیدل چل کے ہم چائے خانے میں داخل ہوگئے۔ اندر بڑے ہال میں صرف چند لوگ بیٹھے تھے۔ نہ شور غل تھا، نہ روشنی ایسی تیز تھی۔ یہ ہر اعتبار سے ایک صاف ستھرا چائے خانہ تھا۔ نیا کھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ رات کا کھانا کسی نے نہیں کھایا تھا مگر سبھی نے انکار کر دیا، چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ کے سوا کسی نے کچھ نہیں کھایا۔

سب کرسیوں پر پھیل کے بیٹھ گئے۔ ہوٹل والے نے صاف تولیا فراہم کر دی تھی۔ منیر علی اور کانتے کے سوا سبھی نے منہ پر چھپکے مارے، بالوں میں کنگھی کی اور ہاتھ پیر کھولنے، انگڑائیاں لینے لگے۔ یہ نیند کی نہیں بیداری کی انگڑائیاں تھیں، جیسے صبح طلوع ہوگئی ہو۔ صبح ایک کیفیت کا بھی تو نام ہے جس کے لیے کسی خاص وقت کی شرط نہیں۔ بھری دوپہریا میں بھی یہ کیفیت طاری ہوسکتی ہے۔ اُن کے چہرے تازہ تازہ لگ رہے تھے اور آنکھیں روشن روشن۔ چائے خانے میں داخل ہوتے وقت میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پیرو نے گاڑیاں کیوں چھوڑ دی ہیں اور اِس وقت اِس عالم میں اُسے چائے نوشی کا شوق کیوں چرایا ہے۔ جمرو نے بھی منہ بنایا تھا، مارٹی نے بھی شانے اُچکائے تھے مگر پیرو بے سبب یہاں نہیں آیا تھا۔ اِس کا اندازہ کچھ دیر یہاں فراغت سے بیٹھنے کے بعد ہوا۔ پیرو کو بھی اپنی بیوی اور بیٹی کو ایک نظر دیکھ لینے کی بے کلی ہوگی لیکن بہتر یہی تھا کہ ذرا سانس لینے کی مہلت تو مل جائے، کسی چھاؤں میں بیٹھ کے دم لینے کا وقفہ۔ زندگی میں بار بار ایسے وقفوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان ہی کو کیا، مشینوں کو بھی۔ اگر محض سفر کا غبار ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ یہ تو نشانوں سے بچ آنے کی حیرت تھی۔ یوں تو ہر آنے والا لمحہ موت کا لمحہ ہوتا ہے۔ ہر لمحے آدمی نئی زندگی پاتا ہے مگر آدمی کو فکر نہیں ہوتی، جانے کیوں اُسے اُنھی لمحوں کی فکر ہوتی ہے جو چھپ کے نہیں آتے، عیاں ہو کے آتے ہیں، منادی کر کے۔ ابا جان، منیر علی اور کانتے پر یہ لمحے نہیں گزرے تھے سو اُن کے چہروں پر ایسی شگفتگی بھی نہیں تھی جو کچھ پانے کے بعد ہوتی ہے یا کچھ ٹل جانے کے بعد۔ بہت سا عذاب تو جاننے نہ جاننے کا ہوتا ہے۔

چائے خانے کی گھڑی میں گیارہ بج رہے تھے۔ جُھل نے ابا جان کو مشورہ دیا کہ اِس وقت گھر جانے کے بجائے رات کسی ہوٹل میں گزار دی جائے۔ یہ وقت گنڈیاں کھٹکھٹانے کے لیے نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ ابا جان کسمسانے لگے اور تقریباً سبھی۔ کانتے کو بھی علاج اور آرام کی ضرورت تھی۔ جُھل نے میری طرف دیکھا، میں بھلا کیا جواب دیتا، جب بھی گھر جانے کا خیال آتا تھا میری رگوں میں اینٹھن ہونے لگتی تھی۔ سب کے کپڑے میلے اور شکستہ ہوگئے تھے۔ جُھل کی رائے غلط نہیں تھی مگر پھر اُس نے خود ہی اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ سبھی ہوٹل سے باہر آگئے۔ سڑکوں پر آمد و رفت اور کم ہوگئی تھی۔ ایک گشتی پولیس والا تیز قدموں سے ہمارے قریب آیا مگر ابا جان اور منیر علی کے علاوہ ہمارے ہمراہ سامان دیکھ کر کچھ پوچھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ مارٹی اور شامو سواری ڈھونڈنے گئے ہوئے تھے۔ کانتے کو ایک دکان کے چبوترے پر بٹھا دیا گیا تھا۔ مارٹی اور شامو دیر سے آئے لیکن گاڑیاں لے کے ہی آئے۔ جُھل نے زورا، مارٹی، شامو، ٹنگو اور کانتے کو ایک ٹرم میں بیٹھ جانے کی ہدایت کی اور کہا کہ وہ کانتے کو جولین کے گھر لے جائیں، مارٹی اُس کے ساتھ رُک جائے، باقی سب پاڑے چلے جائیں۔ کانتے ضد کرنے لگا کہ اُس کی طبیعت نسبتہً بہتر ہے، وہ ہمارے ساتھ ہی چلے گا لیکن جُھل نے اُسے ٹرم میں دھکیل دیا۔ ابا جان نے گو دبے لہجے میں جُھل سے کہا کہ سب کے ساتھ چلنے میں کوئی حرج نہیں، اُن کا مکان اتنا تنگ نہیں ہے اور پھر ایک ہی رات کی تو بات ہے لیکن جُھل آمادہ نہیں ہوا۔ وہ سب بادلِ ناخواستہ رخصت ہوگئے۔ اِس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ میرا بھی جی نہیں چاہتا تھا مگر اتنی رات کو اتنے بہت سے آدمیوں کا قافلہ مولوی اکرم کے گھر لے جانا مناسب نہیں تھا۔ اب بھی ہم پانچ آدمی تھے۔ اُدھر جولین کا گھر بھی اتنا چھوٹا نہیں تھا، ہاں بہت بڑا بھی نہیں تھا۔ وہاں چمپا بیگم کے علاوہ شہ پارہ بھی تھی، اسی لیے جُھل نے کانتے اور مارٹی کے سوا باقی سب کو پاڑے جانے کی تاکید کی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جولین اِس وقت اُنھیں کہیں اور جانے ہی نہ دے۔

ہم دوسری ٹرم میں بیٹھ گئے۔ میں پیرو سے کہنا چاہتا تھا کہ پہلے اُسے اپنی بیوی اور بیٹی کے پاس جانا چاہیے مگر اُس کی ناراضی کے ڈر سے میری ہمت

نہیں پڑی۔ ابا جان نے کوچوان کو دادر کا پتہ بتایا اور ہم دوبارہ اُنھی سڑکوں پر آگئے جہاں سے ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے گزر چکے تھے۔ سڑکیں صاف ہونے کی وجہ سے ٹم ٹم کی رفتار تیز تھی ٹاپیں چاروں طرف گونج رہی تھیں۔ پیر ٹو نے مجھے اپنے بازو میں جکڑ رکھا تھا اور بار بار ترچھی نظروں سے مجھے دیکھنے لگتا تھا۔ وہ نہیں ابا جان اور منیر علی کی جھلکتی نگاہیں بھی کبھی پر آکے ٹک جاتیں ٹم ٹم ... ساتھ میرا جسم بھی کسی شکنجے میں کستا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے حواس برقرار رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن کسی بھی لمحے سب کچھ بکھر سا جاتا۔ ٹم ٹم تیز رفتاری سے اُس گھر کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں وہ سب تھے، میری فرخ، فریال، فارمہ اور اکبر۔ مجھے یہ سب جھوٹ معلوم ہو رہا تھا جیسے ابا جان اور وہ سب مجھ سے کوئی مذاق کر رہے ہوں۔

نہیں معلوم ٹم ٹم کتنی دیر تک چلتی رہی، کن کن راستوں سے گزرتی رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے تو کبھی امی کی صورت آجاتی، کبھی نن ... امی باورچی خانے میں بیٹھی چلا رہی ہیں، فمی میرے سر کی مالش کر رہی ہے۔ اُدھر آنگن میں فرخ، فریال سے کلامِ پاک سُن رہی ہے۔ سب کو شکایت تھی کہ امی سب سے زیادہ میرا خیال رکھتی ہیں، باقی سب جیسے سوتیلے ہوں۔ امی نے یہ ثابت بھی کر دکھایا، اپنے سگے بیٹے کے اِس طرح روپوش ہو جانے کے بعد وہ کیسے زندہ رہتیں۔ انھیں تو مر ہی جانا چاہیے تھا۔ میری آنکھوں میں سارا گھر گھوم رہا تھا، گھر کی ایک ایک چیز۔ فمی کو چیزیں سلیقے سے رکھنے، آتش دان کا کارنر، طاقیں اور الماریاں آراستہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ گل دان میں پھول سجا رہی ہے۔ گملوں میں نئے پھول کھلے دیکھ کے خوش ہو رہی ہے۔ کسی نے اَدھ کھلا پھول توڑ لیا تو ناراض ہونے لگی۔ بیٹھک کی چوکی پر چادر ذرا سی میلی ہوئی اور بدل دی۔ کپڑے بھی وہ ہمیشہ بے داغ پہنتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر اُس کا چہرہ کھل اُٹھتا اور کمھلا جاتا۔ وہی فمی اتنی بے بس ہو گئی تھی کہ لوگوں کے سامنے ناچنے گانے لگی۔ اُس کا محفل میں سج بن کے آنا اور مجھے دیکھتے ہی کھڑکی سے چھلانگ لگا دینا...... میری آنکھوں میں جب بھی یہ منظر اُبھرتا، میرے وجود میں اُتر جاتا، سینہ جیسے کوئی کھرچنے لگتا۔ وہ دوسروں کے لیے چاہے کتنی ہی بدل گئی ہو مگر اپنے بھائی کے لیے تو فمی ہی تھی۔ بالاخانے پر جانے کے باوجود وہ شیشے کی رہی، پھولوں کی رہی۔ سب کچھ اُس نے کسی آرے میں کسی خاص وقت کے لیے چھپایا ہوا تھا۔ مگر میں اب فرخ، فریال، فارمہ اور اکبر کے سامنے کس منہ سے جا رہا ہوں؟ میں نے تو اُن کا سب کچھ چھین لیا ہے۔ میرے جی میں آئی کہ ٹم ٹم سے کود پڑوں اور بس بھاگتا رہوں۔

کسی چوراہے پر ابا جان نے کوچوان کو کسی سمت مڑنے کے لیے کہا۔ میں بیٹھے بیٹھے چونک پڑا۔ ٹم ٹم نے چوراہے سے تھوڑا فاصلہ عبور کیا ہوگا کہ ابا جان نے گاڑی روک دینے کا حکم دیا۔ میرے دل کی دھڑکن معدوم ہونے لگی۔ میں نے سر اُٹھا کے دیکھا تو ٹم ٹم ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ عمارت احاطے کے اندر تھی۔ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں مولوی اکرم کا گھر تھا۔ سب نیچے اُترنے لگے تو پیر ٹو نے میرا بازو پکڑ کے ایک جھٹکے سے مجھے اُٹھا دیا۔ احاطے کا دروازہ بند تھا۔ آہٹ سُن کے دربان فوراً کسی طرف سے نمودار ہو گیا۔ ابا جان نے مضطرب آواز میں اُس سے گیٹ کھولنے کے لیے کہا۔ دربان ہمیں متجسس نظروں سے دیکھنے لگا۔ احاطے میں روشنی کم تھی اور عمارت دروازے سے کچھ فاصلے پر تھی، بنگلے جیسی عمارتوں سے مختلف اطراف میں اونچے اونچے درخت کھڑے تھے۔ دربان کے تذبذب پر ابا جان نے مولوی اکرم کا نام لیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں کہ کہیں دربان جواب میں کچھ اور نہ کہہ دے۔ اُس نے جواب دیا کہ اِس وقت تو سب سو رہے ہیں۔

"انھیں جا کے بتاؤ کہ مہمان آئے ہیں۔" ابا جان کی آواز میں حکم تھا۔

دربان نے چند لمحے تامل کیا پھر کوئی حجت کیے بغیر احاطے میں گیا اور عمارت کے بائیں جانب مڑ گیا۔ اوپر نیچے، ہر منزل کی کھڑکیوں سے دھیمی دھیمی روشنی جھلک رہی تھی اور ہر طرف سکوت تھا۔ دربان کی واپسی تک ہم خاموش کھڑے رہے۔ دربان اکیلا نہیں آیا تھا۔ آنکھیں مَلتا ہوا، کُرتے پاجامے میں ملبوس ایک عمر رسیدہ شخص بھی لپکتے جھپکتے قدموں سے اُس کے ساتھ آیا تھا۔ وہ مولوی اکرم کے سوا کون ہو سکتا تھا اور وہ مولوی اکرم ہی تھے۔ وہ بہت سراسیمہ نظر آرہے تھے۔ "کون! کون صاحب ہیں؟" دروازے کے پاس آنے سے پہلے انھوں نے بدحواسی سے پوچھا۔

"ہم ہیں اکرم میاں!" ابا جان کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

"کون، کون؟" وہ اضطراری لہجے میں بولے پھر جیسے ہی اُن کی نظر ابا جان پر پڑی، وہ سٹ پٹا سے گئے۔ "آپ؟ آپ ہیں صفدر بھائی! آپ ہی ہیں نا؟"

دربان نے دروازہ کھول دیا۔ اِس سے پہلے کہ ابا جان اندر داخل ہوتے، مولوی اکرم تیزی سے باہر آئے اور ابا جان کے سامنے ہو کے انھیں گھورنے لگے۔ ابا جان نے بازو پھیلا کے انھیں سینے سے لپٹا لیا۔

مولوی اکرم کی حالت ہیجانی تھی۔ وہ کبھی ابا جان کو دیکھتے، کبھی ہمیں۔ انھوں نے متوحش انداز میں دربان کو ہدایت کی کہ وہ اندر جا کے کمرہ کھلوائے۔

دربان اندر جانے لگا تو انھوں نے آواز دے کے سامان اُٹھانے کو کہا اور بولے۔ "چلیے، چلیے، اندر چلیے۔"

مولوی اکرم کا اضطراب دیکھ کے میرے سر میں طرح طرح کے وہم رینگنے لگے۔ ابا جان کی آمد جیسے اُن کے لیے عجوبہ ہو۔ تبت سے ابا جان کی واپسی کوئی عجوبہ ہی تھی مگر وہ مولوی اکرم کو تو اپنی منزل اور مقصد تک نہیں گئے ہوں گے۔ انھیں تو وہ اپنی جلد واپسی کا پورا یقین دلا گئے ہوں گے۔ مولوی اکرم کو تو معلوم نہیں ہوگا کہ کہاں کہاں کی خاک چھان کے، کن کن دشوار گزار گھاٹیوں اور پہاڑوں کو عبور کر کے ابا جان واپس آئے ہیں۔ موت اُن کے قریب سے آ آ کر گزر گئی ہے۔ تبت میں اُن کے پیچھے اگر ہم نہ پہنچتے تو تھپڑوں سے بھرے صندوقوں کے ساتھ اُن کی واپسی معجزے سے کم نہ ہوتی۔ ہم احاطے میں داخل ہو گئے۔ میرے قدم بہک رہے تھے۔ پیر ٹو میری کمر میں ہاتھ ڈالے چل رہا تھا۔ اُس کا لیے کسی ستون کی حیثیت رکھتا تھا۔

... اُس وقت میرے ... میں نے دیکھا کہ ابا جان کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں ہے، اُن ... رہے تھے، ہاتھوں پیروں میں بھی لرزش صاف نظر آرہی تھی۔ مجھے ... تھی کہ ابا جان کو آخر کیا ہو گیا، یہ تو کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ جو شخص ... تین نوخیز لڑکیوں اور ایک نوعمر لڑکے کو ایک اجنبی شہر میں کسی غیر کے سپرد کر کے ... زر کی تلاش میں نکل جائے، اُس سے بڑا طاقت ور کون ہو سکتا ہے ... اِس دربدری میں اُس کی ایک نوجوان لڑکی گھر سے غائب ہو گئی ہو اور ... جواں سال لڑکا مفقود الخبر ہو چکا ہو۔ لڑکی اور لڑکے کی گم شدگی در گزر ... وہ کاغذوں پر جھکا ہزاروں میل دور زمین دوز دفینے کی پہیلیاں بوجھتا رہا۔ ... صدیوں سے جس کا جوشِ جنوں اور ہوا ہو گیا تھا، اُسی کو اب یہ کیا ... رہا ہے! اندر جا کے کوئی بھی خبر سننے کو مل سکتی ہے۔ کیا ابا جان کو پہلے اِس کا ... نہیں تھا؟ اب اُن کے چہرے پر کیوں رنگ بدل رہے ہیں۔ مولوی اکرم ... سگے رشتے دار تو نہیں ہیں۔ ایک عمر رسیدہ اور بے وسیلہ شخص کس حد ... اِس نگرانی کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے۔ اِس عرصے میں مولوی اکرم کو کچھ بھی ہو سکتا ... اگر انھیں کوئی سانحہ پیش آجاتا تو؟ ابا جان کو اپنے غیاب میں تمام دنیا جوں ... رہنے کا اتنا یقین کیوں تھا۔ معاً جیسے کسی نے میرے سینے پر کہنی ماری، تو ... تو اِسی باپ کا بیٹا ہے، کہتے ہیں، خون میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ تو نے گھر چھوڑتے ... کسی کا خیال کیا تھا؟ تو نے تو ایک بار بھی لوٹ کے نہیں پوچھا۔ جیل سے ... اگر تو اپنی خیریت کے دو لفظ گھر لکھ بھیجتا تو تیری ماں شاید کچھ دن اور ... رہ لیتی۔

نچلی منزل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر ملازم تھا جس نے ... آگے دربان کے ہاتھوں سے سامان لیا، اُس نے بڑے حیران و پریشان انداز میں ... سلام کیا۔

"سب ٹھیک ہے نا جانی؟" پیر ٹو نے بدبداتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں دادا!" میری آواز حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔

"کوئی خط پتر تو آنے کا لکھ دیا ہوتا۔" مولوی اکرم نے منتشر لہجے میں ابا جان ... کہا۔ "کیا سیدھے اسٹیشن سے آرہے ہیں؟"

"ہاں اکرم میاں!" ابا جان نے بے ترتیب آواز میں جواب دیا۔ "سوچا اب ... ہی ملیں گے۔ خط سے بچے پریشان ہو جاتے۔"

"ہاں ہاں۔" مولوی اکرم اُلجھے ہوئے لہجے میں بولے۔

"سب خیریت تو ہے؟" ابا جان کو کوئی خوف ہی تھا جبھی اُن سے ... شت نہیں ہوا۔

"سب اللہ کا شکر ہے۔" مولوی اکرم نے گہری سانس بھر کے جواب دیا۔ ... کی آواز شکستہ تھی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

احاطہ عبور کر کے ہم ایک کشادہ کمرے میں آگئے۔ یہاں آرام کرسیاں اور صوفے پڑے تھے۔ ایک طرف دیوار سے چوکی لگی ہوئی تھی اُس پر مخمل کی چادر بچھی تھی اور گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ملازم نے پنکھا چلا دیا۔

"آپ کچھ کمزور معلوم ہو رہے ہیں؟" ابا جان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

"بس جیسے دَم اٹکا ہوا تھا۔"

"کیوں! خدا نہ کرے کیا بات ہے۔"

"آپ بہت بڑی ذمّے داری سونپ گئے تھے۔" مولوی اکرم نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

"کسی اور کو سونپتے تھوڑی گئے تھے اکرم میاں!"

"بس ہر دَم دعا مانگتا تھا کہ مولا سُرخ رُو ہی رکھے مگر مجھے اتنا اندازہ نہیں تھا۔"

"ہاں اکرم میاں!" ابا جان نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "ہم بہت مجبور تھے۔ بہرحال، بچے کیسے ہیں؟ کہاں ہیں وہ؟"

میری سانس رُک گئی۔ مولوی اکرم نے شکوہ کناں انداز میں جواب دیا کہ سو رہے ہیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے سارے جسم میں روشنی بھر گئی ہو۔

"انھیں اطلاع کر دیجیے۔" ابا جان نے مچلتی آواز میں کہا۔

"آپ خود اندر چلے جائیے۔ دیکھ کے حیران رہ جائیں گے۔"

"ابا جان نے ایسے ہاتھ اُٹھایا جیسے کہہ رہے ہوں کہ انھیں یہیں بلا لیجیے۔

"یہاں؟" مولوی اکرم نے شش و پنج سے کہا پھر ہم سب کی طرف دیکھتے ہوئے کسمساتے لہجے میں بولے "معاف کیجیے آپ صاحبان سے تو سلام دعا ہوئی ہی نہیں۔"

"سب اپنے ہیں اکرم میاں، سب اپنے ہیں۔" ابا جان نے جلدی سے کہا۔ "آپ کو اِن سے مل کے واقعی مسرت ہوگی۔"

"بے شک، بے شک۔" مولوی اکرم نے تذبذب سے کہا۔ وہ ہم سے معذرت کرنا چاہتے تھے مگر اُسی وقت دروازے کی طرف بھاگتی چاپیں اور لپکتی سرگوشیاں سنائی دی دیں۔ ایک لحظے کے لیے میرا جسم جھن جھنا اُٹھا پھر دروازے کا پردہ ہٹا کے ایک لڑکا بے تابانہ اندر داخل ہوا، وہ اکبر تھا۔ ابا جان کرسی سے کھڑے ہو گئے، وہ اُن کے قریب آکر ٹھٹک گیا۔ شاید اُسے ہم لوگوں کی موجودی کا احساس ہو گیا تھا۔ ابا جان نے بڑھ کے اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اکبر اُن کے سینے سے چمٹ کے ہڑکنے لگا۔ ابا جان کے منہ سے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے بھی پتنگے سے ناچ رہے تھے۔ وہ کتنا بڑا ہو گیا تھا، دبلا پتلا، چھڑی جیسا۔

پردے کے پیچھے سے بھن بھناتی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ وہ یقیناً وہی ہوں گی۔ "آجاؤ، سب اندر آجاؤ۔ یہاں کوئی غیر نہیں ہے۔" ابا جان نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "دیکھو دیکھو تو کون کون آیا ہے۔"

"آجاؤ بیٹا! اندر ہی آجاؤ۔" مولوی اکرم نے اُٹھ کے پردہ کھینچ لیا۔ مجھ پر بس بجلی ہی گر نا رہ گئی، وہ تینوں سامنے کھڑی تھیں۔ چند لمحوں تک تو نہ میں کچھ دیکھ سکا، نہ سُن سکا۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ میں اُچھل پڑا۔ پھر جب آنکھیں

اور کان کچھ دیکھنے اور سننے کے قابل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ وہ اباجان کے سینے میں سمائی ہوئی ہیں اور بُری طرح سسکیاں بھر رہی ہیں۔ اباجان نے انھیں آغوشں میں چھپالیا۔

"پیرُ مجھے جکڑے ہوئے تھا۔ دیکھا جاتی، دیکھا!" اُس کی دھڑکتی آواز میرے کانوں میں سن سنا رہی تھی "اپن کیا بولتا تھا۔" میں نے وحشت زدہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

مولوی اکرم نے اباجان کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے اُنھیں چوکی پر بٹھادیا۔ وہ تینوں بھی اباجان کے پہلو میں سمٹ گئیں۔ اکبر اُن کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اباجان ٹوٹی پھوٹی آواز میں مسلسل اُنھیں باور کرا رہے تھے کہ اب وہ آگئے ہیں، اب اُنھیں کہیں نہیں جانا، بس اب وہ اُنھی کے ساتھ رہیں گے۔

تھجل اور منیر علی ایک طرف خاموش بیٹھے تھے۔ اباجان کو کچھ دیر کے لیے ہم میں سے کسی کا خیال نہیں آیا۔ وہ کبھی فرخ کی پیشانی کا بوسہ لیتے، کبھی فارہہ کے سر پہ ہاتھ رکھتے۔ اُن کا عالم دیدنی تھا۔ ایک طرف وہ اُنھیں تسلی تشفی دے رہے تھے، دوسری طرف خود اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ یک لخت اُنھیں کچھ خیال آیا، اُنھوں نے ہڑبڑا کے میری جانب دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر پیرُو نے ہاتھ کے اشارے سے اُنھیں روک دیا۔ اباجان کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ فرخ اور فریال سر جھکائے بیٹھی تھیں لیکن مجھ پر بار بار اُن کی نظریں اُٹھ رہی تھیں۔ پھر فرخ سر جھکائے بیٹھی نہ رہ سکی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں اور پھیل گئیں، پھٹی ہوئی دہشت زدہ آنکھیں، وہ بت سی بن گئی۔ میرا سینہ اُمڈ رہا تھا۔ پیرُو نے مجھے روکے رکھا، ویسے بھی میرے ہاتھ پاؤں سے جان کھنچی جارہی تھی۔ معاً فرخ بے اختیار اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھ سے بھی نہ رہا جاسکا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوا، دوسرے ہی لمحے وہ مجھ میں پیوست تھی اور میرا سارا جسم پگھل رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آگ سی برس رہی تھی۔

کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے ایسا لگا جیسے کوئی طویل خواب دیکھتے دیکھتے میری آنکھ کھل گئی ہو، مولوی اکرم سرہانے کھڑے میرے سر پہ ہاتھ پھیر رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا، ہکلاتی زبان سے میں نے اُنھیں سلام کیا۔

"جیتے رہو۔" وہ مسکرائے۔ "سوچا، اب تمھیں اُٹھا ہی دیا جائے۔ اتنی دیر سو لیے ہو کہ تھوڑی بہت کسل تو دُور ہو گئی ہوگی۔ کیسی نیند آئی؟"

"مجھے تو ہوش ہی نہیں رہا۔"

"ہوش کیسے رہتا، برسوں کی نیند تھی۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟"

"ایک بج رہا ہے۔"

"ایک بج رہا ہے؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "باقی لوگ کہاں..."

"سب بیٹھک میں تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"میرا انتظار؟"

"کھانے کا وقت ہو رہا ہے میاں! اِسی وجہ سے تو میں نے تمھ..."

"نہیں نہیں، بے آرامی کیسی۔" میں بستر سے اُٹھ کے کھڑا ہوگ... آتا ہوں۔"

کہنے لگے "اطمینان سے آؤ، ایسی جلدی بھی نہیں ہے، نہا... طرح تیار ہو کے آؤ۔ صابن تولیا غسل خانے میں موجود ہے اور کپڑے میز پر رکھے ہیں۔"

"میرے کپڑے؟"

"صبح ہی اُنھوں نے بکسا کھول لیا تھا۔ اُنھوں نے ہی ب... بہ مشکل ایک دو گھنٹے بستر پر کمر لگائی ہوگی۔ مجھے تو اِس میں بھی شک..."

"کہاں ہیں وہ؟"

"کہاں ہیں، تتلی کی طرح گھر میں تھرک رہی ہیں۔ آج... ہی زمین پر نہیں ٹک رہے۔ سارے گھر کا نقشہ بدل دیا ہے۔ بار بار یہا... دیکھ جاتی تھیں۔ سب کو سختی سے تاکید تھی کہ ذرا بھی شور نہ ہو، بھا... جائے گی۔ اللہ اللہ۔ پہلی بار آج میں نے اُن کے چہروں پر یہ شادا... ہنسنا تو وہ بھول ہی گئی تھیں۔ کیا بتاؤں، کیسے کیسے جتن کرتا تھا۔ کیا کیا... لیکن بس ایک دو دن اثر ہوتا تھا، پھر وہی حالت۔"

میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن خاموش رہا۔

"مجھے اب سکون سے موت آسکے گی۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

"ہاں میاں! سچ جانو، سر پر پہاڑ کا سا لوجھ تھا۔ کمبی جد... بالیوں کا ساتھ، آدمی یہاں کم بستے ہیں، دُندے اور وحشی زیادہ... ہونا عذاب ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے، میں نے کیا کیا منتیں مانی تھیں... کی بہ سلامت واپسی کے لیے۔ سمجھو کہ مجھے سب کچھ مل گیا۔ خدا نے م... رکھ لی۔ اُس کا اس سے بڑا کرم کیا ہوسکتا ہے کہ اُس نے نہ صرف... کو بہ خیر و عافیت اپنے گھر بھیج دیا بلکہ تمھیں بھی اُن سے ملوادیا۔ سب... ہے اور اُن سے بھی میں بس یہی کہتا تھا کہ اپنے اللہ سے لو لگا... کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔" مولوی اکرم کی آواز بھرا گئی پھر وہ چو... "میں بھی یہ کیا بے وقت کا دُکھڑا لے بیٹھا۔ تم تیار ہو جاؤ، تمھارے آنے... لگے گا۔ آج تو باورچی خانے کے بھاگ جاگ گئے ہیں۔ صبح سے گھسی... کے پکوان بنا رہی ہیں۔ غریبوں میں مٹھائی بھی بھیجی ہے۔ جانے کیا کیا... کر رہی ہیں۔ کسی کو قرار نہیں ہے، اُن کی بہن ریحانہ بھی اُن کے سا... ہے۔ سب جیسے پاگل ہو گئی ہیں۔"

مولوی اکرم کے جاتے ہی میں نے غسل خانے کا رُخ کیا۔ میرا ارادہ ہاتھ منہ دھو کے کپڑے پہن لینے کا تھا لیکن سفر کی دھول سر میں اَٹی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی غسل کیا اور کپڑے بدل کے بیٹھک میں آگیا۔ بیٹھک کی ترتیب ہی بدلی ہوئی تھی۔ کرسیاں، صوفے ایک طرف کر دیے گئے تھے اور سارے فرش پر چاندنی بچھی تھی، گاؤ تکیے لگے تھے۔ درمیان میں بڑا سا پیچوان بھی رکھا تھا۔ تھجل گاؤ تکیے سے کمر لگائے حقے کے کش لگا رہا تھا۔ اکبر اُس کے پہلو میں دُبکا بیٹھا تھا۔ منیر علی نہیں تھے، پیرُو تھا۔ اُسے وہاں دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔ وہ ابھی تک اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ کمرے میں میرے قدم رکھتے ہی اُس نے اُٹھ کے مجھے گلے لگا لیا اور گُرگُدانے، قہقہے لگانے لگا۔ اُس نے اباجان کا خیال بھی نہیں کیا۔ میرے آنے کی دیر تھی، وہ تینوں بھی چلی آئیں۔ سب نئے کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ ستارے ٹکے دوپٹے، لمبا کُرتا اور چھوٹی مہری کا پاجامہ۔ صبح کوئی چار بجے مولوی اکرم نے مجھے اُن کے پاس سے اُٹھا دیا تھا۔ نہ اُن کا جی مجھ سے الگ ہونے کو چاہتا تھا، نہ میرا۔ رات بھر وہ تینوں میرے جسم و جاں کا جزو بنی بیٹھی رہیں۔ فارہہ اور اکبر میرے شانوں کو تکیہ بنائے ہوئے تھے۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھ میں سما جائیں۔

کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا، کوئی شکوہ کوئی سوال نہیں کیا۔ نہ یہ پوچھا کہ میں اتنے دنوں تک کہاں مارا مارا پھرتا رہا، میں کون سی کھوہ میں چھپ گیا تھا۔ پوچھتیں تو میں بتا بھی کیا پاتا۔ کیا یہ بتاتا کہ قتل کے الزام میں پورے سات سال تو میں نے جیل میں بسر کیے ہیں۔ اُنھیں میری ناراضی کا خوف ہوگا، جبھی اُنھوں نے زبان نہیں کھولی، مبادا میں پھر رُوٹھ کے چلا جاؤں۔ ایک بار آدمی کا اعتبار اُٹھ جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ دیر تک وہ ایک ٹک مجھے دیکھا کیں، رہ رہ کے اُن کے آنسو چھلک پڑتے تھے۔ میں نے بھی اُنھیں خوب رونے دیا۔ اُنھوں نے بھی مجھے نہیں روکا۔ وہ میرے ہاتھ چومتی اور آنکھوں سے لگاتی تھیں۔ بار بار مجھے چھُو کے دیکھتی تھیں جیسے یہ کوئی اور تو نہیں ہے، میں ہی ہوں نا؟ وہ قد و قامت، خال و خد میں بہت بدل گئی تھیں لیکن وہی اُن کا لمس تھا، وہی سانسیں، وہی خوشبو جو میری نس نس میں بسی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرے بہت سے ہاتھ، بہت سے پیر ہو گئے ہیں، میرے بہت سے جسم ہو گئے ہیں اور جیسے وقت سُکڑ گیا ہے، میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوں، امی کہیں گئی ہوئی ہیں، فمی کی آواز اب آتی ہوگی۔ فرخ بالکل فمی کی شکل پر گئی تھی۔ وہی آنکھیں، وہی رنگ روپ۔ لمبے لمبے بال، گھنی گھنی پلکیں۔ اُس کی اور فریال کی عمروں میں ویسے بھی اتنا فرق نہیں تھا۔ دونوں اتنی بڑی ہو گئی تھیں کہ اُنھیں دیکھتے دیکھتے گمان ہونے لگتا تھا کہ مجھے دھوکا تو نہیں ہو رہا۔ فارہہ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اکبر کی طرح دبلی پتلی، چھریری سی تھی۔ دیکھنے میں وہ بھی اُن سے کچھ ہی چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اُن سے فمی کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں پوچھا، نہ اُنھوں نے کوئی تذکرہ کیا۔ وہ سمجھ رہی ہوں گی کہ مجھے اباجان نے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اُنھوں نے جہاں گیر کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں نے بھی اُنھیں نہیں بتایا کہ جہاں گیر مجھے کب کا مل چکا ہے اور فیض آباد میں ہے، اپنے ہی گھر میں۔ وہ بھی کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔ اباجان کو اُن سے بات کرنے کا وقت نہیں ملا تھا، وہ جہاں گیر کی بازیابی کی نوید اُنھیں کیسے سناتے یا وہ یہ سوچ کے خاموش رہے ہوں گے کہ ایک دم اتنی مسرتیں پا کے تو وہ مولوی اکرم کے بہ قول بالکل پاگل ہو جائیں گی۔ آدمی خوشیاں بھی ایک حد تک ہی برداشت کر سکتا ہے۔

"لے تو اپن اپنے ساتھ لے جائیں گے بادا!" پیرُو نے فارہہ کی گردن میں اپنے بازو کی گرہ ڈالتے ہوئے اباجان سے کہا۔

"سبھی کو لے جاؤ بھائی! سب تمھارے ہیں۔" اباجان شگفتگی سے بولے۔

"ایسا! ابھی بولے تو اپن سبھی کو لے جائے گا، قسم سے۔" پیرُو نے اُڑتی آواز میں کہا۔ "اپن تو بہت مال دار ہو جائے گا۔ ایسا پیارا پیارا بیٹی۔۔۔۔ ایک دم پھول سا مانک۔۔۔" وہ فارہہ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "کیوں، چلے گا نا اپن کے ساتھ؟"

فارہہ دُہری ہو گئی۔ پیرُو نے اُسے پہلو میں سمیٹ لیا۔ "اپن ابھی پہلے اِس کو لے جائے گا اور گیتا سے بولے گا کہ دودھ دہی مکھن کا خوب بار اماری کرے۔ گیتا بھی کبھی اِس جیسا چھڑی مانک تھا۔ کچھ کھاتا پیتا ایک دم نہیں تھا۔ ایک دن اپن ڈنڈا لے کے بیٹھ گیا، سامنے دودھ کا گلاس رکھا۔۔۔۔"

فارہہ کھل کھلا پڑی۔ وہ سبھی پیرُو اور تھجل سے ایسی گھُلی ملی نظر آرہی تھیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو، جیسے پیرُو اور تھجل بھی بہت دنوں بعد اُن سے ملے ہوں۔ اکبر تو جہاں گیر کی طرح مستقل تھجل کے پاس بیٹھا تھا، اُس سے چپٹا ہوا۔

جتنی دیر میں منیر علی اندر آئے، اُنھوں نے دسترخوان پر کھانا چُن دیا تھا بلکہ سجا دیا تھا۔ مولوی اکرم نے کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک کابوں اور ڈونگوں کی قطار لگی تھی اور سارے کمرے میں طرح طرح کی خوشبوئیں پھیل گئی تھیں۔ جب میں گھر سے چلا تھا تو فرخ اتنی بڑی نہیں تھی۔ باورچی خانے میں بس برائے نام امی کا ہاتھ بٹا سکتی تھی۔ میرے آنے کے بعد ہی امی اور فمی نے اُسے سب کچھ سکھایا ہوگا، اُس کے ہاتھ کے کھانوں میں ساری لذت امی کے کھانوں جیسی تھی۔ وہ تینوں اور مولوی اکرم کی بیٹی ریحانہ میرے دائیں بائیں اور آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ کھانے کے بعد فرخ نے میرے آگے میٹھے چاولوں کی قاب رکھ دی۔ میری آنکھیں اُمڈ آئیں۔ میں نے آنسو روک لیے تھے مگر آنکھیں جو چھپاتی ہیں، وہ چہرہ عیاں کر دیتا ہے۔ فرخ کن انکھیوں سے میری صورت دیکھتی رہی کہ دیکھیں، مجھے کچھ یاد بھی ہے یا نہیں۔ میرے چہرے پر کچھ اُسے نظر آہی گیا۔ وہ بچگی ضبط نہ کر سکی، سسکیاں بھرنے لگی۔ سبھی کے ہاتھ رُک گئے۔ پیرُو نے اُسے سمجھایا۔ اِدھر تھجل نے اپنے پاس بُلا لیا۔ چاول میرے حلق سے اُتر نہیں رہے تھے مگر فرخ کے خیال سے میں کھاتا رہا۔

شام کو کہیں مجھے معلوم ہو سکا کہ تبت جانے سے پہلے تین منزلہ مکان اباجان نے فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر کے نام سے باقاعدہ خرید ا تھا اور اوپر کی دو منزلیں کرائے پر اُٹھا دی تھیں تاکہ اگر وہ لوٹ نہ سکے تو مکان کے کرائے سے مولوی اکرم اُن چاروں کا خرچ چلاتے رہیں۔ مولوی اکرم کو اُنھوں نے الگ سے خاصی بڑی

رقم دی تھی اور طے کر دیا تھا کہ تین سال تک اُن کی واپسی نہ ہو سکے تو مولوی اکرم کو مناسب جگہوں پر لڑکیوں کے رشتے کر دینے کا اختیار ہے۔ دستاویز کی رُو سے اکبر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے تک مولوی اکرم ہر معاملے کے مختار تھے۔ البتہ مکان فروخت کرنے یا اپنے نام منتقل کرانے کا اختیار اُنھیں نہیں تھا۔ یہ ایک کشادہ مکان تھا، باہر چاروں طرف باغیچہ تھا، چار دیواری تھی، اندر بیٹھک اور مہمانوں کے لیے الگ کمرے کے علاوہ کئی اور کمرے تھے، ہر کمرے سے غسل خانہ ملحق تھا۔ اوپر کی دونوں منزلوں سے ساڑھے چھ سو روپلے کا خطیر کرایہ آتا تھا۔ کرائے ہی سے مکان کی وسعت اور حیثیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ مولوی اکرم کا کہنا تھا کہ وہ شہر میں تھوڑا بہت کام کر لیا کرتے تھے مگر اس مکان میں آنے اور لڑکیوں کی کل وقتی نگرانی کی وجہ سے اُنھیں یہ شغل ترک کرنا پڑا۔ ابتدا میں اُنھوں نے اپنا کام جاری رکھا تھا لیکن بعد میں محلے والوں کے تیور دیکھ کے اُنھوں نے بیشتر وقت گھر میں گزارنا شروع کر دیا۔

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ کھانے کے بعد منیر علی اور ابّا جان ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہمارے پاس بیٹھے رہے پھر سونے چلے گئے۔ ابّا جان نے فرخ، فریال وغیرہ کو بھی یہ کہہ کے اُٹھا دیا کہ وہ رات بھر کی جاگی ہوئی ہیں، تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ کوئی ایک لمحے کے لیے بھی وہاں سے ٹلنا نہیں چاہتا تھا لیکن ابّا جان کی وجہ سے اُنھیں اُٹھنا پڑا۔ اُن کے جانے کے بعد کمرے میں ہم تینوں رہ گئے۔ ٹھبل، پیرو اور میں۔ مولوی اکرم بار بار آ کے ہمیں پوچھ جاتے۔ دھوپ کم ہونے پر وہ ہمیں باہر باغیچے میں لے آئے۔ سبزے پر بید کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ملازم چائے بھی وہیں لے آیا اور ٹھبل کا حقہ بھی۔ کوئی پان نہیں کھاتا تھا لیکن اندر سے خاص دان بھی آ گیا۔ اندر کی نسبت باہر کا موسم بہت خوش گوار تھا۔ نرم نرم ہوا چل رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شام کی چائے کے بعد پیرو اور ٹھبل اُٹھ جائیں گے۔ پیرو کو اپنے گھر بھی جانا تھا۔ دُور کی بات اور تھی لیکن شہر میں آنے کے بعد اُس کا دھیان مسلسل گیتا اور اُس کی ماں کی طرف جاتا ہو گا۔ اُنھیں کانتے کو بھی دیکھنے جانا چاہیے تھا۔ رات سے اب تک اُس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ کسی کو یہاں کا پتہ بھی معلوم نہیں تھا جو اطلاع دینے آ جاتا۔ اُدھر سب ہمارے منتظر ہوں گے۔ جولین، چمپا بیگم اور شہ پارہ کی نگاہیں تو رات ہی سے دروازے پر لگی ہوں گی۔ ابّا جان ٹھیک کہہ رہے تھے، اِس مکان میں اتنی گنجائش تھی کہ سبھی یہاں آ سکتے تھے۔

ٹھبل اور پیرو کو کہیں جانے کی جلدی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ کرسیوں پر پیر پھیلائے بڑے اطمینان سے مولوی اکرم کی رُوداد سن رہے تھے۔ اُن کی توجہ دیکھ کے مولوی اکرم کو بھی حوصلہ ہو رہا تھا، اپنا غبار کم کرنے کا۔ کہہ رہے تھے کہ یہاں سے کوئی ایک میل کی دُوری پر مجید نام کے ایک ہوٹل والے نے اُنھیں بہت ہلکان کیا۔ ایک بار جمعہ کی نماز میں مجید سے اُن کی سلام دعا ہو گئی تھی۔ نماز کے ذکر پر اُنھیں عصر کی نماز یاد آ گئی، دھوپ اُتر رہی تھی، وہ ہم سے معذرت کر کے فوراً اندر چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے دبی زبان میں ٹھبل سے کہا۔ ”کانتے کو دیکھنے نہیں جاؤ گے؟“

”چلیں گے رے!“ وہ کسمساتے ہوئے بولا۔

”جانے اُس کا کیا حال ہو؟“

”سور کا کھال سے بنا ہے۔“ پیرو نے بے پروائی سے کہا۔ ”ابھی نئیں مرنے کا۔“

”رات اُس کی طبیعت بہت خراب تھی۔ سارے راستے بھُنّا رہا۔“

”اُدھر ٹھنڈی جگہ پہ چلا گیا ہے۔“

”پھر بھی ہمیں جانا چاہیے۔ دادا بھی اپنے گھر نہیں گئے۔“

”ایک دو دن سے کیا بل پڑے گا رے۔ ایدر بھی اپن گھر ...“ پیرو نے کشادہ آواز میں کہا۔

اِس کے بعد کہنے کو کیا رہ جاتا تھا، میں چپ ہو گیا مگر میں نے ... اگر وہ نہیں جائیں گے تو رات کو میں خود نکل جاؤں گا۔ مولوی اکرم اندر ہی آ گئے۔ وہ آ کے خاموش بیٹھ گئے تھے۔ پیرو نے متجسس لہجے میں اُن ...

”ابھی آپ ہوٹل والا مجید کے بارے کچھ بول رہا تھا؟“

مولوی اکرم کے چہرے پر گھٹا سی چھا گئی۔ ”کیا بتاؤں بھائی ... بتاؤں۔“ وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولے۔ ”مجھے مردم شناسی کبھی نہیں آ ... میں نگاہ نے ایسا دھوکا بھی کبھی نہیں کھایا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ... کے بندے سے مسجد میں ملاقات ہوئی تھی۔ مسجد کے ایک حصے کی مرمت ... درخواست پر چندہ دینے کے لیے اُس نے مجھے اپنے ہوٹل آنے کو کہا۔ میں ... پہنچا، اُس نے وعدے کے مطابق پورے دو سو روپلے دیے اور خاطر مدارات کی۔ میں اِس علاقے میں نیا نیا ہونے کی وجہ سے اچھے لوگوں سے شناسا ... تھا۔ مجید مجھے بھلا آدمی لگا۔ داڑھی والا آدمی ہے اور جمعہ پڑھنے با... مسجد میں آتا ہے۔ ہوٹل بھی اُس کا اچھا خاصا چلتا ہے۔ کبھی کبھی اُدھ... ہوتے میں رُک کے اُس کی خیر خیریت پوچھ لیتا تھا۔ ایک روز اُس کے گھر والے ... لیے آئے۔ میں نے مقدور بھر تواضع کی۔ اُنھیں آئے تین چار روز ہوئے ... نے کسی جھجک کے بغیر فرخ بیٹی سے اپنے بیٹے حمید کے رشتے کی خواہش ظا... فرخ کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے، میں کرسی پر سیدھا ... سکا۔ مولوی اکرم نے آزردگی سے بتایا کہ اُنھیں مجید کی اِس جرأت پر تع... لیکن یہ کوئی ایسی اَن ہونی بات نہیں تھی۔ جہاں لڑکیاں ہوتی ہیں ... قسم کے معاملات چلتے ہی رہتے ہیں۔ خیر، مولوی اکرم نے معذرت کی ... کہا جو ایسے موقعوں پر شریفوں کا دستور ہے۔ اُنھوں نے اُس پاس کسی ... تھا کہ فرخ، فریال سے اُن کا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ مجید کو اُن کا ... اپنی سُبکی محسوس ہوئی تاہم اُس نے دوبارہ درخواست کی اور پھر اصرار کر... اکرم طرح طرح کے عذر کرتے رہے۔ وہ جتنی عاجزی اور پہلوتہی کرتے ...

... بڑھتی جاتی۔ یہاں تک کہ وہ تلخ و تند لہجے پر اُتر آیا۔ مولوی اکرم نے ... طرف جانا کم کر دیا۔ مجید نے بعض اجنبی لوگوں کو اُن کے پاس بھیجا شروع ... اِس عرصے میں مولوی اکرم ... کے لڑکے کی بابت بہت کچھ علم ہو گیا۔ اُس کا ... لوگوں سے بے ادر مشاغل کیا کیا ہیں۔ اُن کے کہنے کے مطابق مالی آسودگی ... نہیں ہوتی، بعض حالتوں میں تو ٹاٹ میں ٹاٹ کا اور مخمل میں مخمل کا ... نہیں جچتا۔ مجید کے گھر والوں سے مل کے وہ تھوڑا بہت اندازہ لگا چکے تھے ... کتنی گنجائش ہے۔ گنجائش ہوتی بھی تو اُنھیں ایک معین مدت تک ... کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔ مجید کی تندی و برہمی میں اُس کا لڑکا بھی شامل ... ایک مرتبہ فرخ، فریال باہر نکلیں تو اُس نے اُن کا پیچھا کیا اور اُن پر آوازے ... مولوی اکرم کی موجودگی کے باوجود وہ ... سے باز نہیں آیا۔ اُدھر مجید ... مشہور کر دیا کہ اُس نے مسجد کے لیے مولوی ... پانچ سو روپلے کا چندہ دیا تھا ... کے نام سے صرف دو سو روپلے درج کیے گئے ہیں۔ اُس کی بات کا کوئی کسی کو یقین ... آیا لیکن مولوی اکرم کو مسجد کے ہر شخص کے سامنے وضاحت کرنا پڑی۔ یہ اُن کے ... شرم ناک بات تھی۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اُنھوں نے مسجد کے چند برگزیدہ ... سے مشورہ کیا۔ مجید کے بارے میں اُن لوگوں کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا، وہ مولوی ... کے لیے اور حیران و پریشان کن تھا۔ اُنھیں معلوم ہوا کہ مجید اِس علاقے کا نامی ... آدمی ہے اور اُس کا ہوٹل بدقماشوں کا گڑھ ہے، وہ لوگ جیب میں ہر وقت ہتھیار ... ہیں اور سارے علاقے میں دندناتے پھرتے ہیں، جس سے ناراض ہو جائیں، اُس کا جینا ... تھانے، کچہری، جیل اُنھیں کسی چیز سے خوف نہیں آتا۔ مسجد کے برگزیدہ لوگوں ... اکرم کو بتایا کہ اِسی وجہ سے وہ مجید سے دُور دُور رہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مجید ... سال سے اپنے بیٹے کی شادی کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ ایک جگہ نہیں ... کئی جگہ مجید نے رشتہ بھیجا مگر کوئی بھی ہر کس و ناکس کو اپنی لڑکی کا ہاتھ نہیں ... تھوڑی بہت تحقیقات تو سبھی کرتے ہیں، چنانچہ ہر ایک نے کسی نہ کسی طور اُس ... معذرت کر لی۔ کسی نے کہا کہ ابھی ارادہ نہیں ہے، کسی نے کہہ دیا کہ اُس کی بیٹی کی ... ہو گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان حالات میں مولوی اکرم یہی کر سکتے تھے کہ اور محتاط ... اُنھوں نے فرخ اور فریال کے باہر نکلنے پر پہلے ہی پابندی لگا دی تھی ... لڑکی ہوٹل کی طرف سے گزرنے کے بجائے دوسرے راستے سے جانے کی تاکید ... اکبر کہیں جاتا تو مولوی اکرم ملازم کو اُس کے ساتھ کر دیتے۔

ایک دن مجید گھر آ گیا۔ اُس نے دو ٹوک انداز میں مولوی اکرم سے کہا کہ ... وہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لیں ورنہ نتائج کے ذمے دار وہ خود ہوں گے۔ ... اکرم نے پھر عاجزی کی کہ وہ مجبور ہیں مگر ... مطلق اثر نہ ہوا۔ مولوی اکرم ... کا دامن چھوڑ بیٹھے۔ اُنھوں نے کہا کہ آئندہ مجید اِس گھر میں قدم رکھنے کی ... نہ کرے، اگر اُس کا یہی رویہ رہا تو وہ مسجد میں جا کے اعلان کر دیں گے کہ اُن ... زیادتی ہو رہی ہے نیز وہ پولیس کو ... نے ہوا

... ہنس کے ٹال دیا اور کہا کہ ابھی تک اُنھوں نے اپنے ذرائع استعمال نہیں کیے ہیں، مجید نے ... تنگ کیا تو وہ خاموش نہیں بیٹھے رہیں گے، وہ بھی کوئی آخری قدم اُٹھا سکتے ہیں۔ مجید بھڑکتا، شور مچاتا چلا گیا۔ اِس کے بعد نہ وہ آیا، نہ اُس کا کوئی کارندہ۔ مولوی اکرم کسی قدر مطمئن ہو گئے لیکن مجید کی طرف سے یہ خاموشی نہایت عارضی ثابت ہوئی۔ ایک روز وہ محلے کے ایک شخص کی تدفین کے بعد واپس گھر آ رہے تھے، رات کا وقت تھا، ایک گلی میں اچانک دو آدمی نمودار ہوئے اور اُن پہ چاقو نکال کے کھڑے ہو گئے۔ مولوی اکرم نے شور مچانے کی کوشش کی لیکن طمانچوں اور مکّوں سے اُنھیں فوراً چپ کر دیا گیا۔ اتفاق سے اُن کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی، کچھ روپلے تھے اور ایک قیمتی گھڑی کلائی پر بندھی تھی، روپلے اور گھڑی لے کے دونوں آدمی چمپت ہو گئے۔ مولوی اکرم جیسے تیسے گھر پہنچے۔ اُن کی نکسیر پھوٹ گئی تھی اور باچھا کھُل گیا تھا۔ دونوں آدمیوں کو وہ پہچان نہیں سکے لیکن اُنھیں یقین تھا کہ وہ مجید کے آدمی ہیں۔

اُنھوں نے نہ گھر میں، نہ باہر کسی سے اِس واقعے کا ذکر کیا، خود ہی تدبیر بھی سوچتے رہے۔ چند دنوں سے وہ بعض مشکوک آدمی بھی گھر کے اطراف گھومتے دیکھ رہے تھے۔ احتیاطاً اُنھوں نے چوکی دار بدل دیا۔ کئی مرتبہ مجید کا لڑکا بھی اُنھیں مکان کے گرد منڈلاتا نظر آیا، ہر مرتبہ دو ایک دوست اُس کے ہمراہ ضرور ہوتے۔ مولوی اکرم کی نیند اُڑ گئی۔ وہ رات رات بھر نمازیں پڑھتے اور گھر کی چوکسی کرتے رہتے۔ پڑوسیوں سے اُنھیں معلوم ہوا کہ باہر طرح طرح کے افسانے اُن کی لڑکیوں سے منسوب کیے جا رہے ہیں۔ ناچار وہ نماز بھی گھر میں پڑھنے لگے۔ کئی بار اُنھوں نے سوچا کہ پولیس کا دروازہ کھٹکھٹائیں مگر گھر کی رسوائی کے خیال سے خاموش رہے۔ لڑکیوں کا معاملہ تھا۔ وہ کہاں کہاں جا کے وضاحتیں کرتے پھرتے۔ پھر ایک دن اُنھیں یہ مژدہ سُننے کو ملا کہ مجید کا لڑکا غائب ہو گیا ہے۔ مجید نے مشہور کر دیا تھا کہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے لیکن دراصل وہ جیل میں تھا۔ یہ بات ایک نمازی نے اُنھیں بتائی جو مسجد سے اُن کی مسلسل غیر حاضری کا سبب جاننے آیا تھا۔ وہ یہ مکان چھوڑ دیتے۔ دستاویز کی رُو سے وہ اِسے بیچ نہیں سکتے تھے لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ نچلی منزل بھی کرائے پر اُٹھا کے کوئی دوسرا مکان تلاش کر لیں۔ وہ اِسی پر غور کر رہے تھے۔

اُن کا اپنا فلیٹ گوکل بلڈنگ والے میں تھا لیکن یہاں آتے وقت وہ اُسے پگڑی لے کے کرائے پر دے چکے تھے۔ ابھی چند روز ہوئے، اُنھیں اطلاع ملی تھی کہ مجید کا لڑکا ضمانت پر چھوٹ کے آ گیا ہے۔ چھوٹنے کے بعد سے اُس نے اِس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا مگر اُنھوں نے طے کر لیا تھا کہ جلد ہی کسی دوسرے مکان میں منتقل ہو جائیں گے جہاں اِس قماش کے لوگ آس پاس نہ رہتے ہوں۔ وہ کسی بہتر جگہ کے لیے اُدھیڑ بُن میں تھے کہ ہم لوگ پہنچ گئے۔

مولوی اکرم بھرے بیٹھے تھے۔ بار بار اُن کی زبان لڑکھڑا جاتی، بات بات پر رو ہانسے ہو جاتے اور غیر ارادی طور پر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے جیسے

کہیں کوئی کان لگائے اُن کی باتیں سُن رہا ہو۔ کہنے لگے کہ وہ ابّا جان سے اس لیے یہ ذکر کرنا نہیں چاہتے کہ اُن کا غصہ تیز ہے، مزاج میں ضد ہے۔ پیرو اور تجّھل نے درمیان میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، بس خاموشی سے سنتے رہے۔ ساری رُوداد مولوی اکرم نے اس لیے دہرائی تھی کہ ہم ابّا جان کو مکان کی تبدیلی پر اُکسائیں۔

"پر یہ تو بہت پکّا اور اچھا بنا ہوا ہے۔" تجّھل نے بھاری آواز میں کہا۔ "جگہ بھی اچھی ہے۔"

"ہے، بے شک ہے۔" مولوی اکرم احتجاجی لہجے میں بولے۔ "پڑوس بھی بہت اچھا ہے۔ سیدھے سادے شریف لوگ رہتے ہیں لیکن اُن ناہنجاروں نے گھر دیکھ لیا ہے۔ شہدوں سے بیر اچھا نہیں ہوتا، شریف آدمی ہی نقصان میں رہتا ہے۔"

مولوی اکرم کو احساس نہیں تھا کہ وہ یہ بات کن لوگوں سے کہہ رہے ہیں۔ وہ بہت سہمے ہوئے انداز میں بتا رہے تھے۔ "آپ کو نہیں معلوم، وہ سب چاقو رکھتے ہیں۔ منہ زوری، ہاتھاپائی، خون خرابہ اُن کی خصلت ہے۔"

"ہونہہ۔" پیرو نے ہنکاری بھری اور بے چینی سے تجّھل کی طرف دیکھا۔

"ابھی کیا بولتا ہے تجّھل بھائی اپنا بڑے صاحب۔"

"ٹھیک ہی بولتے ہیں دادا!" تجّھل نے زیرِ لب کہا۔

"اپن نے سنا ہے، سب اُنگلی ایک جیسا نہیں ہوتا۔"

"میں نے بھی سُنا ہے۔" مولوی اکرم جھلّاتی آواز میں بولے۔ "لیکن یہاں تو بڑے کینہ توز لوگوں سے سابقہ پڑا ہے۔ بتائیے، میری کیا خطا تھی؟ میں نے کون سا قصور کیا تھا؟"

"ابھی کیا بولیں بڑے صاحب!" تجّھل نے آہستگی سے کہا۔

"اپن بولے، ابھی آپ کا دل کا قصور تھا سارا۔" پیرو کسی قدر تندی سے بولا۔

"دل کا! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"تھوڑا دل کا، تھوڑا پن کا۔"

"تھوڑ پن؟" مولوی اکرم تلخی سے بولے۔ "تھُڑ دلی کا؟ یہی مطلب ہے نا آپ کا؟"

"ابھی دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے گا تو کیا ہوئے گا۔ باہر والا اور مستی میں آجائے گا۔"

"آپ کا مطلب ہے، میں بھی اُن پر خنجر تان کے کھڑا ہو جاتا؟"

"اِس کا ضرورت نئیں پڑتا اور پڑتا بھی تو کیا جاتا تھا۔ دو چار کو ٹھنڈا کر کے مرتا تو اُدر ایک دم چین سے رہنے کا تھا۔"

"اور بچّے! بچّے کہاں جاتے؟"

"اوپر والا کو آپ اتنا سمجھتا ہے پھر بھی بولتا ہے بچّے کہاں جاتے؟

ابھی اگر وہ بیچ میں بلا لیتا تو اُن کا کیا بنتا؟"

"جنابِ من! مجھے نہیں معلوم، اللہ نے آپ کو کس قدر نوازا ہے۔ خدا کرے ... رہے اور سب زندہ سلامت رہیں۔ اولاد کی ذمّے داری اولاد وال... ہے۔ میں ایک بوڑھا آدمی کیا کرتا جس کے سر پر چار جوان جہان لڑک... ہو وہ تو ویسے بھی اور بوڑھا ہو جاتا ہے اور ناتواں بھی۔ وہ عال... (ابّا جان) تو مجھے اپنا بنا کے اطمینان سے چلے گئے تھے۔ انھیں ... دکھانا تھا۔ بے شک اللہ سے بڑا نگہبان کوئی نہیں مگر اللہ نے ... اور سوچنے کی توفیق یوں ہی عطا نہیں کی ہے۔ اُس نے کبھی اور ... تلقین بھی کی ہے اور کچھ حقوق و فرائض بھی متعیّن کیے ہیں۔"

"اپنا اپنا سوچنے کا بات ہے بڑے صاحب!" پیرو نے ...

"اپن زیادہ نئیں جانتا، آپ دروازہ کھول کے اور بھالا لے کے بیٹھتا ... نئیں آتا۔ وہ سالا لوگ حرام کا جنا اور ڈر سے ہی نکل جاتا۔ جھوٹا لوگ ... ہے، مچھر مافک۔ اپن پوچھتا ہے، آپ دوسری جگہ جانے کا بولتا ہے، ابھی ... ایسا لوگ سامنے پڑ گیا تو؟"

مولوی اکرم کوئی جواب نہ دے سکے۔ کچھ تامّل کے بعد انھوں ...

"اس کے سوا کوئی بہتر صورت ہو تو آپ ہی بتائیے۔"

پیرو نے بھی جواب نہیں دیا۔

مغرب کی نماز کے وقت مولوی اکرم اُٹھ گئے۔ اندھیرا چھا... نے قمقمے روشن کر دیے۔ مغرب کے بعد منیر علی اور ابّا جان بھی وہیں آ ک... اکبر بھی آگیا۔ میری رگوں میں کھولن ہو رہی تھی۔ مجھے اُن کے ہٹنے کا انت... اندر جائیں تو میں باہر نکلوں اور مجید کا ہوٹل دیکھ کے آؤں۔ وہاں ... کلنتے کی طرف نکل جاؤں گا۔ میں ابھی یہ ارادے باندھ ہی رہا تھا کہ ... پیرو اُٹھ گئے۔ انھوں نے ابّا جان سے کہا کہ وہ کلنتے کی طرف جا رہے ہیں ... نے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا مگر تجّھل نے یہ کہہ کے منع کر دیا کہ ہماری وا... ہو سکتی ہے۔ بہتر ہے، وہ دن کو کسی وقت چلے جائیں۔ میں بھی کمرا ... باہر جانے سے پہلے میں فرخ اور فریال وغیرہ کو بتانے اندر چلا گیا۔ ... دیر کے لیے جانے کا کہا مگر اُن کے چہرے بجھ سے گئے۔ فریال ضد کر... اب کھانے کے بعد ہی کہیں جائیے گا۔ دوپہر کو اتنا کچھ کھا لیا تھا کہ بھوک ... تھی اور بھوک تو ویسے بھی مولوی اکرم کی باتیں سن کے ختم ہو گئی تھی ... پر وہ چپ ہو گئیں۔ میں فوراً چلا آیا۔ پیرو اور تجّھل میرے انتظار میں ...

"آپ بھی ابھی اپن کے ساتھ چلو۔" احاطے سے نکلتے ہوئے ... مولوی اکرم سے کہا۔

"میں! میں بھلا کہاں چلوں؟" مولوی اکرم اٹکتی زبان ...

"اِدری، تھوڑا دُور تک۔"

"انھیں کہاں لیے جا رہے ہیں؟" ابّا جان نے شگفتگی سے پوچھا۔

"تھوڑا رستہ بتانے کے لیے بادا!" پیرو نے کہا۔

"راستہ؟ اور آپ کو؟" ابّا جان مسکرا کے بولے۔ "بہرحال ٹھیک ہے، جائیے، لے جائیے۔"

تجّھل اور پیرو کا ارادہ جان کے میرے جسم میں جیسے اور سلوٹیں پڑ گئیں، ...وی اکرم بھی کچھ کچھ سمجھ گئے مگر ابّا جان کے سامنے انھوں نے تردّد کا اظہار ...یں ہونے دیا۔ جیسے ہی ہم باہر آئے، وہ بے چینی سے بولے۔ "آپ کہاں جا ...ہتے ہیں؟"

"مجید کی طرف۔" تجّھل نے کہا۔

"نہیں جناب! نہیں۔ میں یہ مشورہ نہیں دوں گا آپ کو۔" وہ تیزی ...ے بولے۔ "اُن لوگوں کو آپ نہیں جانتے، بہت بُرے لوگ ہیں۔ میں نے ...ں لیے آپ سے تھوڑی کہا تھا۔"

"اپن ابھی اُس کو اوپر سے نیچے تک دیکھنا مانگتا ہے۔"

"کیا فائدہ جناب! لعنت بھیجیے، ہمیں اُس طرف سے گزرنا بھی نہیں چاہیے۔ ...منٹ میں شرفا کی پگڑی اُچھال دیتے ہیں وہ لوگ۔ بہتر ہے، آپ یہ خیال ...وڑ دیں، درگزر کیجیے۔"

"اپن تھوڑا اُس کو دیکھ کے آگے بڑھ جائے گا۔"

"کیا دیکھیں گے اُس کو، جو میں نے بتایا ہے، وہ ناکافی ہے کیا؟ میری ...ے اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ اُن کا پورا ٹولا ہے، ایک سے ایک چھٹا ہوا۔ ...آواز پر جانے کہاں کہاں سے نکل آتے ہیں۔"

"چلو بڑے صاحب! آگے بڑھو۔" تجّھل نے حتمی لہجے میں کہا۔ "آپ ...فکر ہو کے اپنے ساتھ چلو۔"

"مگر مجھے ساتھ دیکھ کے وہ ضرور کھٹک جائے گا۔"

"ابھی آپ کا ساتھ چلنا ضروری ہے۔ اُس کو پتہ چلنا چاہیے کہ اِدر آپ ...ل دم اکیلا نہیں ہے۔"

"میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ سرِ دست یہ ارادہ ملتوی کر دیجیے۔ ایسا ہی ...ے تو پھر کسی وقت دیکھیں گے۔"

"ابھی کیا جاتا ہے بڑے صاحب! ابھی اندھیرے کا وقت ہے۔" ...رنے تنک کر کہا۔

مولوی اکرم کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا مگر وہ زندگی دیکھے ہوئے تھے، ...ھ گئے کہ مزید حجت ناگواری کا سبب ہو گی۔ میں نے بھی اُن سے کہا کہ چلیے، ...دھر سے گزرنے میں کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔

ہم نسبتاً پُرسکون علاقے سے نکل کے گنجان اور پُرشور علاقے میں داخل ...گئے۔ کھمبوں اور دکانوں پر قمقمے چمک رہے تھے۔ ہر طرف ٹراموں، بسوں اور دوسری گاڑیوں کا اژدہام تھا اور بھاگ دوڑ سی مچی ہوئی تھی۔ پیرو نے آواز دے کر ایک ٹم ٹم رکوا لی۔ مولوی اکرم نے اُسے بتایا کہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہے مگر پیرو ٹم ٹم میں بیٹھ گیا۔ آگے جا کے اونچی اونچی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، اسی نسبت سے بھیڑ بھی بڑھتی گئی۔ راستے میں اڈّے کے کسی آدمی کی ہم پر نظر پڑ سکتی تھی۔ اب مجھے بھی یہاں کم لوگ نہیں جانتے تھے۔ جھنگا اور پیرو کے خاص یاروں کے تو سبھی آدمی مجھ سے واقف تھے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن ہم گاڑی میں بڑی حد تک لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ مولوی اکرم نے کوچوان کو ایک دوسری کشادہ سڑک پر گاڑی موڑنے کا اشارہ کیا۔ پیرو نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہوٹل سے کچھ دُور گاڑی رکوا لیں۔ مڑنے کے کوئی ایک فرلانگ بعد مولوی اکرم نے گاڑی رکوا دی اور سرگوشی میں پیرو سے کہا۔ "وہ سامنے دیکھ رہے ہیں آپ؟ نکڑ پر جو بڑا سا سائن بورڈ نظر آرہا ہے، وہی اُس کا ہوٹل ہے۔ وہیں دروازے کے قریب بیٹھا وہ گاہکوں سے پیسے وصول کرتا اور حکم چلاتا رہتا ہے۔"

پیرو نے جیب سے نوٹ نکال کے کوچوان کی طرف بڑھایا اور ٹم ٹم سے اُتر گیا۔ "وہی ہے نا؟" اُس نے ہاتھ کے اشارے سے تصدیق چاہی۔

"جی، جی وہی۔" مولوی اکرم کی زبان لکنت کرنے لگی۔

سڑک عبور کر کے ہم فٹ پاتھ پر آگئے۔ اب ہوٹل سامنے نظر آرہا تھا، چند قدموں کے فاصلے پر مولوی اکرم نے قریب جاتے ہوئے ایک بار پھر شکستہ آواز میں توں کار سے بچنے کی درخواست کی۔ تجّھل نے اُن کی کمر تھپک کے سرہلایا۔ میں نے دیکھا کہ مولوی اکرم کے قدم ڈگمگا رہے ہیں، پھر پیرو نے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔

باہر سے ہوٹل کا ایک حصّہ صاف نظر آرہا تھا۔ نکڑ پر ہونے کی وجہ سے وہ دو اطراف سے کھلا ہوا تھا۔ اوپر تین منزلہ عمارت تھی۔ دو ایک دکانوں کے علاوہ فرشی منزل کی ساری جگہ ہوٹل نے گھیر رکھی تھی۔ اندر خاصے لوگ موجود تھے۔ ہم قریب گئے تو دروازے کے پاس بنے ہوئے کاؤنٹر پر ایک شخص دکھائی دیا، وہی مجید ہو گا۔ چھوٹی سی داڑھی، اندر دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، رنگ پختہ تانبے جیسا، ٹھوڑی کا گوشت بڑھا ہوا، کھچڑی بال اور سیدھی مانگ، چکن کے کُرتے میں ملبوس، چہرے سے وہ ڈھلکے ہوئے جسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ تجّھل اور میں دروازے پر کھڑے رہے۔ مولوی اکرم کی پھٹی پھٹی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجید ہی ہے۔ وہ کسی گاہک اور ہوٹل کے بیرے سے حساب میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُن سے فارغ ہو کے وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔ سب سے پہلے اُس کی نگاہ مولوی اکرم پر گئی کیونکہ پیرو کاؤنٹر کے دائیں طرف ہو گیا تھا جہاں کاؤنٹر میں جانے کا مختصر راستہ تھا۔ اندر ایک خالی کرسی رکھی تھی۔

اُس کی بھویں سکڑ گئیں، وہ مولوی اکرم سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دائیں طرف سے پیرو نے ایک قدم کاؤنٹر کے اندر بڑھا کے اُس کی گردن پر

ہاتھ مارا، پھر گردن دبوچ دبوچ اسے جھٹکا دیا اور ایک ثانیے میں کرسی سے گھسیٹ لیا۔ درمیان میں رکھی ہوئی کرسی کئی جگہ سے مجید کے جسم میں پیوست ہوئی ہوگی۔ اس اچانک افتاد پر کسی کے بھی ہوش و حواس برقرار نہیں رہ سکے، مولوی اکرم کی بھی چیخ نکل گئی۔ وہ پیرو کا ہاتھ روکنے کے لیے اُس کی طرف جھپٹے اور واویلا کرنے لگے۔ شبھل نے بڑھ کے اُن کا بازو پکڑ لیا اور جھڑکتی آواز میں اُنھیں ایک طرف کھڑے ہونے اور خاموش رہنے کی تاکید کی۔ مولوی اکرم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ مجید کو کرسی سے گھسیٹ کر پیرو کاؤنٹر کے باہر لے آیا، اُس نے اُسے ایک لمحے کا موقع بھی نہیں دیا، بے دریغ اتنی ضربیں لگائیں کہ اُس کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ اُس کا کرتا اور بنیان تار تار ہوگیا۔

ہوٹل میں افراتفری پھیل گئی۔ سب لوگ کرسیاں چھوڑ چھوڑ کے چیختے چلاتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف دوڑے۔ ایک ساتھ کئی چاقو کھلنے کی آواز آئی مگر شبھل اور میں تیار کھڑے تھے۔ ہم نے بھی چاقو نکال لیے لیکن کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مجید سے ہٹ کے پیرو چشم زدن میں پلٹا اور اپنی طرف دوڑتے ہوئے آدمیوں کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اُس نے غراتے ہوئے کہا۔ "ابھی اکیلا آئے گا یا سب ساتھ میں؟"

یکایک وہ سب ٹھٹک کے رک گئے۔ ایک جانب سے کسی نے چیخ کر کہا۔

"دادا، پیرو دادا۔" اُسی لمحے ہوٹل پر سناٹا چھا گیا۔

"آؤ باپ! ابھی تم رک کیوں گیا کتے کا اولاد۔" پیرو دہاڑا لیکن وہ لوگ حیرت بھری نظروں سے کھڑے اُسے دیکھتے رہے۔ اُن میں سے کسی نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ جو شخص سب سے پہلے آگے آیا تھا، اُس کا چہرہ میرے لیے جانا پہچانا تھا مگر اُس کا نام مجھے یاد نہیں آیا۔ وہ سر جھکائے چاقو نیچے کیے آہستہ آہستہ پیرو کے قریب آیا اور جھک کے اُس نے اپنا چاقو پیرو کے قدموں میں ڈال دیا۔ مجید ایک طرف سکڑا سمٹا پڑا تھا، پیرو کے نام پر اُس نے بھی سر اٹھا کے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اُس کے پیروں سے لپٹ گیا۔ وہ بری طرح بلکنے لگا۔ پیرو نے ٹھوکر مار کے اُسے خود سے دور کر دیا۔ مجید نے کاؤنٹر کے پاس سراسیمہ کھڑے ہوئے مولوی اکرم کے پاؤں پکڑ لیے اور دہائیاں دینے لگا۔ مولوی اکرم تو خود سراپا لرز رہے تھے۔ اُنھوں نے دہشت سے شبھل کی جانب دیکھا۔ شبھل نے مجید کے بال پکڑ کے اُٹھا لیا اور اُسے اپنے چہرے کے سامنے کر کے غور سے دیکھا۔ میں نے چاہا کہ کاش شبھل اُس کے منہ پر تھوک دے مگر شبھل نے اُسے دوبارہ پیرو کی طرف دھکیل دیا۔

وہ زمین پر لڑھک گیا، پیرو نے اُس کے منہ پر پنجہ مار کے انگلیاں گڑو دیں اور جب اُس نے پنجہ کھینچا تو مجید بھی ساتھ ساتھ اُٹھتا گیا۔ "ابھی بولے تو یہ سارا بے پیندا پالتو تیرا اماں بہنی کو اُٹھا کے ادر لائے؟"

مجید کا چہرہ جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گیا، خون چھلکنے لگا۔ وہ ہاتھ جوڑ کے گھگھیایا۔ "اپن کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ یہ تمھارا آدمی ہے، پیرو دادا کا آدمی۔"

"جو اپن کا آدمی نہیں ہوئے گا، اُس کا تم پگڑی اُتار لے گا؟ اُس کا تم داڑھی نوچ لے گا؟ ایسا ابھی تم کو کس نے بولا ہے، کون رنڈی کا جنا کا دادا ہے؟ اپن جانے سے پہلے بالے کو ادر چھوڑ کے گیا تھا۔"

"ابھی ودی ادر ہے دادا۔" کسی نے دبی زبان میں کہا۔

"وہی ہے تو پھر اُس کا دوسرا ابھی پھوٹ گیا کیا؟ ابھی وہ کدھر گیا کیا اپن اِس واسطے بسوا کا جگہ اُس کو دے کے گیا تھا کہ وہ علاقے کا لوگ پر ہاتھ ڈالے؟" پیرو بالے کو گالیاں بکنے لگا پھر ایکا ایکی مڑ کے بولا۔ "وہ حرام کا جنا، تیرا دادا بنیا ابھی کیدر ہے؟"

"اُس کا کوئی دوش نہیں ہے دادا!" مجید گڑگڑا کے بولا۔ تکلیف کی شدت میں اُس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

"ابھی کیدر ہے وہ؟"

"وہ گھر پہ ہوگا مائی باپ!"

"اُس کو ابھی ادر بلاؤ۔"

"اپن اُس کا منہ کالا کر کے ابھی اکھاڑے میں گھمائے گا۔"

"ابھی رحم کرو دادا! ایک موقع اور دو، اپن دوبارہ ایسا نہیں کرے گا۔" مجید ہذیانی انداز میں بولا۔

پیرو نے بڑھ کے اُس کی ٹھوڑی پکڑ لی اور چہرہ اوپر اُٹھا کے ہاتھ سے اُس کے پیٹ پر ضرب لگائی۔ مجید بلبلا اُٹھا اور فرش پر لوٹنے لگا۔ "حساب ابھی لمبا ہے سور کا اولاد۔"

سب ساکت کھڑے تھے، سبھی نے اپنے چاقو جیبوں میں رکھ لیے۔ اچانک باہر سے شور اُٹھا۔ سب ہڑبڑا سے گئے۔ وہ بالے تھا، ایک چشم کھلتے ہوئے گندمی رنگ کا بالے۔ اُس کی ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اُسے اچھی طرح جانتا تھا مگر سامنے آنے ہی پر پہچان سکا۔ بالے تیز قدموں اندر داخل ہوا۔ اُس کی نظر سیدھی پیرو پر گئی، اپنے ساتھ آنے والوں کو چھوڑ کے وہ بے تابانہ پیرو کی طرف لپکا۔ "دادا! دادا! تم کب آئے؟ خبر بھی..." اُس کی آواز پر اضطراب طاری تھا۔ آتے ہی وہ پیرو کے پیر چھونے کو جھکا۔ پیرو پیچھے ہٹ گیا۔ "تیرا ٹیم آگیا ہے بالے!"

"کیا.... کیا ہوا دادا! کیا بول رہے ہو؟" بالے نے جنونی انداز میں پوچھا۔ "ایسا کیا ہوگیا جو تم اِدھر آئے ہو؟ پیرو دلوا اِدھر آیا ہے؟"

"ہاں ادری آیا ہے اور اِس واسطے آیا ہے کہ تو ابھی بادشاہ بن گیا ہے۔"

"اپن کو بولو دادا!" بالے نے سر جھٹک کے کہا۔ "اپن کا سر اُتار لو، اپن کو خطا بولو۔"

"خطا!" پیرو بھڑک کے بولا۔ "ابھی خطا پوچھتا ہے مٹی کا پلا، کو نئیں جانتا؟" اُس نے مجید کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ مجید ہے۔"

"ایدر کا دادا ابھی یہ بھی ہے کیا؟"

"کیا بولتے ہو، اِس حرام زادے نے کچھ کیا ہے کیا؟"

"یہ بھی اپن ہی بولے۔" پیرو نے اشتعال سے کہا۔ "پھر تو ایدر حچی کی سنبھالے کیوں بیٹھا ہے؟"

"اپن کو کچھ نہیں پتہ، قسم لے لو، قسم لے لو دادا!"

پیرو نے بے اختیار بالے کے گال پر پوری طاقت سے طمانچہ رسید کیا۔ بالے کا پورا جسم بل کھا گیا۔ "جس دادا کو نہیں مالوم کہ پاڑے کا پیچھے کس کو چھینک آیا ہے، اُس کو پاڑے کے بدلے گھوڑے پر بیٹھنے کا ہے۔"

بالے نے جھپٹ کے کاؤنٹر کے قریب گٹھری بنے ہوئے مجید کی گردن پکڑ لی۔ مجید تڑپنے لگا۔ بالے غضب ناک انداز میں اُس سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ اُس نے اُسے بے دریغ مارنا بھی شروع کر دیا۔ مجید کی حالت ہی اِس قابل نہیں تھی کہ وہ ٹھیک سے زبان کھول سکے۔ "ابھی اپن کے سامنے یہ ناٹک کیا کرتا ہے سالا!" پیرو نے زہرخند سے کہا۔ "اُس ٹیم وار وپی کے بیٹھا تھا جب یہ تیرا آدمی، تیرے پاڑے کا آدمی کا ڈوری ہلا رہا تھا۔"

"کیا بولتے ہو تم؟" بالے وحشت میں بولا۔

"ایدر علاقے سے سب چھوکری والا لوگ باگ چلا جائے نا؟" پیرو کی آواز تڑخنے لگی۔ "اپن نے پاڑا دیتے ٹیم تجھ کو کیا بولا تھا؟ بولا تھا کہ پاڑے کا دادا چار آنکھ، چار کان کا ہوتا ہے اور کچھ لوگ سے ایک دم نئیں لگنے کا جن کا چال میں فرق نئیں ہے، پاڑا علاقے کا سارا لوگ کے لیے نئیں ہے۔ اُلٹا چلنے والا کے لیے ہے، آدھا آدمی کے لیے۔"

"اپن کو سب یاد ہے۔" بالے اپنا منہ نوچتے ہوئے بولا۔ "اپن کو بولو دادا! اپن کے لیے حکم کرو، قسم سے اپن ایک دم پاڑا چھوڑ کے چلا جائے گا۔"

مَیں نے نہیں دیکھا کہ جھل نے اشارہ کیا تھا یا مولوی اکرم میں خود حوصلہ ہوا، وہ چند قدم بڑھ کے پیرو کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہرے پر کبھی آگ بھڑکنے لگتی، کبھی دھواں سا چھا جاتا۔ بہ مشکل تمام اُن کے منہ سے نکلا۔ "میں نے انھیں معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا، اب یہاں سے چلیے، خدا کے لیے بس کیجیے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

پیرو نے اُن کا شانہ تھام لیا اور چند لمحے بے حس و حرکت کھڑا رہا، گو مگو کے عالم میں، پھر بالے اور مجید پر ایک نظر ڈالتا ہوا اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ وہ باہر نکلنے کے لیے دروازے تک گیا، پھر ٹھہر گیا اور بالے کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "تو ابھی اپن کا پاڑے میں آنے کا ہے۔"

"مگر تم کہاں جا رہے ہو؟" بالے نے چڑچڑی آواز میں کہا۔

"اپن کیدر کو بھی جا رہا ہے، تجھ کو جاننے کا نئیں ہے۔" پیرو ترشی سے بولا۔ "تو ابھی لوٹ کے ادر کا پاڑے میں نئیں جانے کا، سیدھا اُدھر آ اور اس کو بول دے کہ ابھی بڑے صاحب نے بیڑی ڈال دیا ہے سالا میں پورا آٹھ ہزار روپیہ اُدھر رہ کے آئے گا تو ایدر گدی پر آ کے بیٹھے سب نمازی لوگ کو بولے گا کہ اِس نے آٹھ سو روپیہ نئیں دیا تھا، آٹھ سو مار گیا تھا۔ اِس نے اپنی ماں ......" مولوی اکرم کو دیکھ کے پیرو کی گئی۔ "اِس کا بیٹا بھی ابھی پاڑے میں ساتھ لانے کا ہے۔ اپن اُس چور بازار سے ابھی کنجری بلا کے رکھے گا۔"

بالے دوڑتا ہوا دروازے کے پاس آ گیا اور لجاجت سے کہنے لگا "بولے گا، اپن ویسا ہی کرے گا۔ اپن اِس کو ابھی اکھا دیکھ لے گا پر تم پاڑے پر چلو دادا! ابھی پاڑے کا دادا تم سے نہیں بول رہا ہے، تمھارا بالا بول رہا ہے، بالے بھی آدمی ہے۔ آدمی سے اُنیس بیس ہو سکتا ہے۔ وہ نہیں، تمھارا پاڑا ہے۔ اِدھر جھل استاد اور راجا دادا آیا ہے، اِدھر آ ایسا لوٹ جائے؟" بالے روہانسا ہو گیا اور منت کرتے ہوئے بولا۔ "تھو کے لیے ٹھیر کے جاؤ۔"

پیرو نے پہلے جھل کو راستہ دیا، پھر مولوی اکرم کو، پھر دروازے گیا۔ ہوٹل کے باہر کھڑے ہوئے لوگ ہمیں دیکھ کے ایک طرف ہو گئے۔ اُ بہت سوں نے پیرو کو سلام کیا لیکن پیرو نے اُن کی طرف دیکھا ہی نہیں قدموں کے ساتھ ہوٹل سے دور ہوتے گئے۔

❀

راستے بھر مولوی اکرم بے سُدھ سے ہمارے ساتھ چلتے رہے میں ہم نے ٹرم نہیں کی۔ گھر کے قریب چوراہے پر پیرو نے مولوی اکرم پوچھا کہ گھر تک جانے کے لیے انھیں ہماری ہم راہی کی ضرورت تو نہیں ہے اکرم نے سر ہلا کے انکار کر دیا، وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہ سکے۔ بس پیرو کو جھل ملاتی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ پیرو مسکرانے لگا اور اُس نے اپنے باز ڈیلے۔ آدمی کی کیفیتیں عمر سے مشروط نہیں ہوتیں۔ مولوی اکرم ایک بچے پیرو سے لپٹ گئے پھر نہ جانے کیا ہوا، وہ ہچکیاں لے لے کے رونے لگے۔ بڑی پر سوراہے کے نزدیک۔ پیرو اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے گھر کی طرف بڑ جب تک گھر نہیں آ گیا، ہم نے انھیں نہیں چھوڑا۔ پھر ہم باہر ہی سے چلے آ اتفاق سے دروازے کے پاس ہی ٹرم ٹرم مل گئی۔ مولوی اکرم آخر تک دروازے کھڑے رہے تا آں کہ ٹرم ٹرم آگے چلی آئی اور باندرے کی طرف جانے والے پر مڑ گئی۔

سڑکوں پر ابھی تک بھیڑ تھی، اتنی نہیں جتنی مجید کے ہوٹل جاتے وق اندھیرا بڑھنے کے ساتھ روشنیاں بھی زیادہ تیز اور چمکیلی ہو گئی تھیں۔ باندرے علاقے میں داخل ہونے سے پہلے جھل نے ایک جگہ ٹرم ٹرم رکوا کے

جھل کی یہ فرمائش ناوقت تھی۔ پان سے اُسے ایسی کوئی رغبت نہیں تھی، بھی کھا لیتا تھا۔ اِس وقت پان منگوانے سے پیرو کی توجہ مبذول کرنا ہی مقصود تا تھا۔ جانے کیوں پیرو کی پیشانی پر ابھی تک سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں جیسے وہ مجید کے ہوٹل ہی میں ہو۔ پان کی دکان کے پاس شربت کا ٹھیلا کھڑا تھا۔ ن سمیت ہم چاروں نے پستے اور بادام ملا ہوا گنے کا ٹھنڈا ٹھنڈا رس پیا۔ ی مٹی کی سوندھ نے اُس کا ذائقہ ہی بدل دیا تھا۔ پانچ چھ منٹ کے اِس کا اچھا اثر ہوا۔ پیرو کے چہرے کی بشاشت لوٹنے لگی۔ پان بھی بہت ذائقہ اور خوشبودار تھا۔ پیرو کے ہونٹوں پر لالی بکھر گئی۔ وہ جب بھی پان لگتا، ہونٹوں پہ مہندی رچائی ہوئی ہے۔ جھل نے مسکرا کے کہا بھی کہ دادا! کھانے سے پہلے ذرا کلوتے پر سلائی سے تل ٹانک لیا کرو۔

جولین کا گھر ابھی دور تھا۔ ٹرم ٹرم باندرے کی سڑکوں پر چل رہی تھی۔ پیرو کے متعلق جھل کو بتانے لگا کہ وہ اُسے چودہ پندرہ سال کی عمر میں ممبئی میں برے حالوں، پھٹے ہوئے کپڑوں میں، گندگی میں لپٹا ہوا، کسی اور شہر سے کے آیا تھا۔ بھوک سے تنگ آ کے وہ چوری پر اتر آیا، ایک روز ایک ی نے موقع پر اُسے پکڑ لیا، اتفاق سے پیرو کی نظر پڑ گئی۔ پیرو نے کہہ سن کے چھڑوا لیا اور اپنے ساتھ لے آیا، پڑھانے لکھانے کی کوشش کی۔ اسکول میں بھی دلایا لیکن وہ اسکول سے بھاگ آتا تھا۔ دو تین سال اُس نے پڑھا مگر آگے نہ پڑھ سکا۔ روز اسکول سے لڑنے جھگڑنے کی شکایتیں آتیں، ایک کسی ماسٹر پہ ہاتھ اُٹھا بیٹھا، بس اسکول میں وہی اُس کا آخری دن ثابت پیرو نے اُسے پاڑے سے دور رکھنے کے لیے بہت جتن کیے مگر بالے کے نصیب پاڑے کا آدمی بننا لکھا تھا۔ چاقو بازی اور زور آزمائی اُس نے چوری چھپے ے کے آدمیوں سے سیکھ لی تھی۔ یہ دیکھ کے پیرو نے اُسے باقاعدہ بہت کچھ سکھایا۔ ے قربت اور اپنی سرکشی کے سبب اُس نے ابتدا ہی میں بہت سے دشمن ا کر لیے تھے۔ وہ ایک نمبر کا ہتھ چھٹ، بے لگام اور بے جگر واقع ہوا تھا۔ ابھی اُس کی عمر بیس اکیس سال کے لگ بھگ ہو گی کہ وہ ایک حسین و طوائف گلابی کے ہاں آنے جانے لگا۔ کھار کے علاقے کا مشہور دادا جیتا گلابی پر جی جان سے فریفتہ تھا۔ بالاخانہ چیتے کے علاقے میں نہیں تھا لیکن چیتے کے علاقے میں رہتی تھی۔ سرِ شام صرف گانے کے لیے بالاخانے آ جاتی، وہاں نہیں جاتا تھا بلکہ جب بھی اُس کا جی چاہتا، گلابی کو اپنے ڈیرے بلا جا لیتا۔

تیس سال سے زیادہ چیتے کی عمر بھی نہیں تھی، ہاتھ کا بڑا اسجل تھا۔ ل نام اجیت تھا، پھر اجیتا ہوا اور پھر اجیتا کے بجائے لوگ اُسے چیتا کے لقب پکارنے لگے۔ پھرتی، لپک اور نگاہ میں وہ چیتے ہی جیسا تھا۔ دور دور تک کے چاقو کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ لاٹھی بھی کمال کی گھماتا تھا۔

بالے نے گلابی کے بالاخانے پر جانا شروع کیا تو پھر کہیں اور کا نہ رہا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ گلابی تو ایک طوائف ہے، اُس کے اتنے قریب ہونا مناسب نہیں مگر گلابی خود اُس کی جانب مائل تھی۔ بالے کی آمد پر بالاخانے کے دروازے بند کر دیے جاتے۔ بالے کی موجودی میں وہ صرف اُس کے لیے گاتی، اُس کے لیے ناچتی تھی۔ چیتا بھی اِس تعلق سے واقف ہو گیا تھا، اُس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے بالے کو متنبہ کیا کہ گلابی پر صرف اُس کا حق ہے۔ بالے پر مطلق اثر نہ ہوا کیونکہ اُسے گلابی کا التفات، گلابی کا اعتماد حاصل تھا۔ بالے کا اصرار تھا کہ گلابی بالاخانہ چھوڑ کے اُس کا گھر بسانے آ جائے۔ گلابی آمادہ ہو گئی اور دونوں کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ہی چاہتا تھا کہ ایک دن چیتا عین اُس وقت بالاخانے پہنچا جب بالے وہاں موجود تھا، گلابی اُس کے لیے گا رہی تھی۔ چیتے نے دروازہ توڑ دیا اور اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ گلابی نے دیوار بننے کی کوشش کی لیکن چیتے نے ایک نہ سُنی اور ایک ہی شرط رکھی کہ وہ بالے کو فی الفور نکال دے نیز بالے دوبارہ کبھی یہاں آنے کی جرأت نہ کرے۔ بالے کے پاس چاقو نکالنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چیتے نے اُس کا غلط تخمینہ لگایا تھا۔ خود سامنے آنے کے بجائے پہلے اُس نے اپنے ایک آدمی کو آگے بڑھایا۔ بالے نے اُسے دو ایک پینتروں میں ٹھنڈا کر دیا۔ چیتے نے اِسے اتفاق سمجھ کے دوبارہ یہی غلطی کی اور اپنے ایک دوسرے ساتھی کو بڑھنے کا اشارہ کیا۔ بالے میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ دوسرے آدمی کے لیے اُسے اتنی دیر بھی نہیں لگی جتنی پہلے کے لیے لگی تھی۔ اپنے دو ساتھیوں کا حشر دیکھ کے چیتے کو کچھ ہوش آیا، وہ چاقو تان کے خود سامنے آ گیا۔ پیرو کے بہ قول گلابی اور بالاخانے کے سازندے گواہ ہیں کہ ابتدائی لمحوں میں چیتا بالے پر حاوی آ گیا تھا، اُس نے بالے کے بازو پر اچٹتا ہوا سہی ایک نشان ڈال دیا۔ بالے کا حوصلہ کم نہ ہوا بلکہ وہ کچھ اور سنبھل گیا پھر چیتے کے ہر وار کا ناپ تول کے جواب دیتا رہا۔ اُس نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ سرِ دست اُس کے لیے مدافعت کرنا ہی موزوں رہے گا چنانچہ وہ مسلسل چیتے کو موقع دیتا رہا اور طرح دے دے کے اُس کی دست رس سے بچتا رہا۔ چیتے کو لا محالہ پہلے حملے کی کامیابی سے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا تاہم بالے کا یہ حربہ اُس کے لیے جھنجلاہٹ کا باعث بن گیا۔ جھنجلاہٹ نے غیظ و غضب کی صورت اختیار کر لی۔

پیرو کے کہنے کے مطابق چاقو چلاتے وقت جسم کو قابو میں رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے اور غصے میں ایسا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چیتے کو اپنے ہاتھ پر بڑا گھمنڈ تھا، اپنی پھرتی پر بہت ناز۔ کیوں نہ ہوتا، تجربے اور پے در پے کامیابیوں سے کوئی بھی برتری کے احساس میں مبتلا ہو سکتا ہے مگر اِس احساس سے کچھ حاصل اُسی وقت ہوتا ہے جب مدِ مقابل میں حوصلے یا تجربے کی کمی ہو۔ غیظ و غضب کا اظہار بسا اوقات بہت سُودمند ہوتا ہے، خصوصاً مبتدیوں اور کم تجربہ کاروں کے سامنے مگر چیتا بھول گیا تھا کہ یہ سب کچھ فریقِ ثانی کی سوجھ بوجھ اور تحمل پر موقوف ہے۔ ہر بار صورتِ حال ایک جیسی نہیں ہوتی۔ اِس میں جگہ، وقت اور مقابل کی

کسی خاص ذہنی حالت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ بالے کو چیتے کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا، چیتے کی شہرت سے وہ خوب واقف تھا مگر چیتا اُسے اچھی طرح نہیں جانتا تھا، اُسے معلوم نہیں تھا کہ بالے نے یہ فن کہاں سے سیکھا ہے۔ بالے کو بتایا گیا تھا کہ وہ ہر بار آخری معرکہ سمجھ کے چاقو اٹھائے۔ نوجوانی کے باوجود بالے استقامت کا ثبوت دیتا رہا۔ وہ پینترے بدل بدل کے چیتے کو پہلے سے زیادہ مشتعل اور منتقض کرتا رہا۔ اس دوران چیتا ایک اور کاری وار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اُس نے بالے کی بائیں بھوں کھول دی۔ چاقو بالے کے ماتھے پر نشان ڈالتا ہوا بھوں کو بیچ سے کاٹ گیا۔ بالے کی بائیں آنکھ میں خون بھر گیا، چہرہ لال ہوگیا، کپڑے بھی تر بتر ہوگئے لیکن بالے کا عزم زخمی نہیں ہوا۔ وہ تیور بتا رہا۔ اُس نے بھی ایک غلطی کی تھی اور وہ یہ کہ مدافعت کرنے اور چیتے کو مشتعل کرنے میں ضرورت سے زیادہ وقت لگا دیا، اس کا اندازہ اُسے بعد میں ہوا جب پہلی بار مدافعانہ رویہ ترک کر کے اُس نے چیتے پر حملہ کیا۔ اتنی شکستگی اور ابتری کے بعد چیتے کو یقیناً ایسی توقع نہ ہوگی۔ جو شخص مسلسل حاوی رہا ہو اُسے مدافعت پر آجانے میں چند لمحے ضرور لگتے ہیں۔ انھی منتشر لمحوں میں بالے نے اُس پر لگاتار حملے کیے۔ بالے کا چاقو بہت دیر سے پیاسا تھا۔ معدے سے ناف تک چیتے کا پیٹ چاک کر کے ہی اُس کی تشنگی کچھ بجھی۔

چیتا وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اُس کے دونوں ساتھی وہاں سے بھاگ لیے۔ بالے بھی زیادہ دیر اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ اگر مدافعت ترک کرنے کا فیصلہ کچھ دیر پہلے کر لیتا تو اتنا خون نہ بہتا اور اُس کی آنکھ بھی بچ جاتی۔ بھوں کا زخم آنکھ تک کھل گیا تھا، آنکھ میں خون الگ جم گیا تھا۔

بالے گرفتار کر لیا گیا لیکن گلابی اور سازندوں کی شہادتیں اُس کے حق میں تھیں، بالے اکیلا تھا، مخالفوں کی تعداد پانچ تھی اور بالے پہلے سے بالاخانے پر تھا۔ اُس وقت تک خوش قسمتی سے بالے کسی بھی جرم میں جیل نہیں گیا تھا۔ اُس کی عمر بھی کم تھی۔ دوسری طرف چیتا اور اُس کے ساتھیوں کا مکمل ریکارڈ پولیس کے پاس محفوظ تھا۔ مقدمے میں زیادہ دن نہیں لگے تاہم بالے کو پانچ سال کی سزا ہوگئی۔ جیل میں گلابی تواتر سے اُس کے پاس جاتی، اُس نے بالاخانہ بھی چھوڑ دیا تھا۔ بالے کو جیل سے جلد ہی چھٹی مل گئی، اپنے اچھے کردار اور سزاؤں میں عام تخفیف ہو جانے کے سبب وہ جیل کے دروازے سے نکلا تو گلابی اُس کی منتظر تھی۔ پھر بالے پاڑے کی طرف نہیں گیا۔ چند دنوں بعد دونوں نے پیرو کی موجودگی میں شادی کر لی۔ بالے کو قلابے کے کسی تاجر کے مکان میں ایک مختصر کوارٹر مل گیا۔ یہ ایک مشکل زندگی تھی لیکن اس نئی زندگی سے دونوں بہت خوش تھے۔ پیرو اُن کے گھر دو تین بار گیا۔ گزر بسر کے لیے پیرو کی اعانت سے بالے نے بندر بازار میں ایک چائے خانہ کھول لیا۔ یہ چائے خانہ ایک دکان سے بڑا نہیں تھا مگر دکان اچھی چل نکلی۔ بالے کو گھر بسائے دو ماہ کے قریب ہوئے تھے کہ ایک رات

وہ دن بھر چائے خانے میں کام کرنے کے بعد گھر پہنچا تو گلابی زندہ کی برہنہ لاش کمرے میں پڑی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ گلابی آہ... کرتی رہی۔ بالے کے پاگل ہونے میں کوئی کسر نہ رہ گئی۔ پیرو اُسے... اور پھر اُسے وہاں سے نہیں نکلنے دیا۔

بعد میں بالے نے کھار کے علاقے میں چیتے کے ایک ایک... کے ختم کر دیا۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا لیکن اتنے سال گزر جانے... بالے کو قرار نہیں آیا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ ایک دم دیوانہ سا ہو جا... کو فکر لگی ہوئی تھی کہ اُس نے بالے سے کچھ زیادہ تو نہیں کہہ... رہا تھا کہ اگر بالے پر پھر جنون طاری ہوگیا تو یہ اچھا نہ ہوگا، جانے... کا نشانہ بن جائے۔ وہ مجید کے ہوٹل کو کہیں پھونک نہ ڈالے۔

بالے کو میں نے کئی بار دیکھا تھا اور تھوڑی دیر پہلے بھی... یوں ہی سرسری اب اُسے قریب سے نہ دیکھنے کا مجھے افسوس ہو رہا... سے بس سرسری گزر جاتے ہیں۔ ہر آدمی سائے کی طرح ایک کہانی لیے پھرتا ہے۔ ع سرسری تم جہان سے گزرے   ورنہ ہر جا جہا...

بالے کو دیکھ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ لبا... سے اتنا شکستہ ہے، اتنا زخمی ہے۔ تجمل بھی پورے انہماک سے سنتا رہا، راستہ گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ کوچوان نے آ... آہستہ کر کے ہم سے اپنی منزل کے لیے پوچھا، میری سمجھ میں کچھ نہ... علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا، میں کرشنا جی کے زمانے میں اور پھر با... کے گھر لینے کے بعد انھی راستوں سے آیا جایا کرتا تھا۔ میں نے نُم... میں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ جولین کا گھر پیچھے رہ گیا تھا۔ کوچوان نے گ... اُس نے بروقت پوچھ لیا تھا، ابھی ہم اتنے آگے نہیں آئے تھے۔ میا... چلاتے سے کچھ ہی دُور ہماری منزل تھی۔ ہم نے چوراہے پر ٹم ٹم والے... دیا اور باقی راستہ پیدل طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ پورا علاقہ رہائشی... سڑکوں پر اتنی روشنی نہیں تھی۔ سات آٹھ منٹ کی چہل قدمی کے... کی گلی میں داخل ہوگئے۔ پورا ایک دن گزر چکا تھا۔ اُس نے صبح ہی... شروع کر دیا ہوگا اور اب رات ہو جانے کے بعد بھی مایوس نہیں... کاش کانتے اور مارٹی نے اُسے میرے اور تجمل کے بارے میں... ہم اچانک پہنچیں گے تو اُس کا عالم دیکھنے کا ہوگا مگر کانتے اور مارٹی... برداشت کی توقع نہیں تھی۔

گھر قریب آنے پر میرا جی گھبرانے سا لگا۔ جولین کے خیال سے... کرشنا جی کا چہرہ گھوم جاتا تھا۔ مکان کے باہر خاموشی تھی۔ دروازے... اُگا ہوا ناریل کا درخت خوب بڑا ہو گیا تھا۔ کرشنا جی کو ناریل کے... کوئی خاص نسبت تھی۔ جولین نے انھی کی یاد میں یہاں ناریل لگ...

سے کوئی آواز، کوئی چہکار نہیں آ رہی تھی۔ اگر وہ لوگ ہوتے تو دروازہ کھلا ہوتا، بیٹھنے کا کمرہ کھلا ہوتا۔ وہ ایسے خاموش تو نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ابھی رات بھی اتنی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے مڑ کے تجمل کو دیکھا، کہیں جولین نے مکان تو نہیں بدل دیا؟ وہ یہاں ٹھیر نہیں سکے، کہیں اور چلے گئے؟ تجمل نے مجھے دستک دینے کا اشارہ کیا۔ اگر چوکھٹ پر بجلی کی گھنٹی لگی تھی، میں نے اُسے دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ اندر سے گھنٹی کی آواز آئی۔ دوسری گھنٹی بجانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ پر میں نے ہاتھ روک لیا۔ دروازہ کھلا تو سامنے جولین کھڑی تھی، اپنے اُسی پسندیدہ لباس میں، سفید ساڑی میں لپٹی ہوئی، پھول کی طرح کھلی ہوئی۔ ایک لمحے کو تو جیسے اُسے بچھو نے ڈنک مار دیا، میری آنکھیں بھی چندھیا گئیں۔ گویا میری آمد کے بارے میں اُسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ پہلے تو دروازے پر حیران پریشان، سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی رہی پھر جیسے اچانک سمندر میں تلاطم آگیا۔ وہ بے تحاشا میری طرف اُمڈی، میرے بازو بھی اُٹھ گئے لیکن میرے قریب آکے وہ سمٹ سی گئی اور پھیلی پھیلی آنکھوں سے مجھے دیکھا کی۔ معاً تجمل سامنے آگیا اور اُس نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ "کیسی ہے میم؟" تجمل اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "اتنا گھٹا کیوں لیا ہے ری؟"

جولین سے ذرا دیر بھی ضبط نہ ہوا، تجمل کا سر پر ہاتھ رکھنا اور پوچھنا تھا کہ وہ پھٹ پڑی۔ تجمل نے تھپکتی آواز میں کہا۔ "لوٹ جائیں ری؟ یہ تیرا اپنے پلے بھی کتی نہیں ہیں۔"

جولین کا سوتا اور پھوٹ پڑا۔ تجمل اُسے پہلو میں سمیٹے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں کرسیاں رکھی تھیں۔ ابھی ہم بیٹھے نہیں تھے کہ اندر سے چمپا بیگم کی آواز آئی، یہ اُسی کی آواز تھی۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ کون آیا ہے؟ کسی نے جواب نہیں دیا تو چمپا بیگم خود وہاں آگئی۔ پہلے اُس کی نظر بھی پر پڑی، اُس کا حال بھی کچھ مختلف نہیں ہوا۔ بے اختیار اُس نے اپنے سینے پہ ہاتھ مارا۔ "اللہ! یہ تم ہو پیارے میاں! یا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟" وہ ہانپتی آواز میں بولی۔ میرے پاس آکے اُس نے مجھے اپنے حلقے میں لے لیا، میری پیشانی چومی اور بلائیں لیں۔ "پوچھ لو بٹیا سے۔ کل سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں کہہ رہی تھی شاید پیارے میاں آجائیں۔ اتنے دن کہاں رہے؟ خط بھی نہیں لکھا۔ کوئی خبر ہم دکھیاروں کی نہ لی۔" وہ ایک ہی سانس میں بولی۔

چمپا بیگم جب بھی سامنے آتی تھی میرا سینہ کوئی نوچنے، مسوسنے لگتا تھا۔ میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اور بے کل ہوگئی۔ "ٹھیک تو ہو؟ کیسے دبلے لگ رہے ہو؟"

"ہاں اب ٹھیک ہے۔" میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم تو ٹھیک ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے، بہت بہت احسان ہے اُس کا۔"

چمپا بیگم کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ چہرہ نکھرا ہوا، چمکتی پیشانی، رنگ کچھ اور اُجلا ہوگیا تھا۔ سفید دوپٹے اور سُرمئی کرتے پاجامے میں وہ یکسر بدلی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جگہ اور مشاغل آدمی پر یوں اثر انداز ہوتے ہیں کہ آدمی کا چہرہ بدل دیتے ہیں، رنگ بدل دیتے ہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں کے چہرے پر نور ہے، چمپا کے چہرے پر یہی کیفیت تھی جیسے اُسے کسی نے سرتاپا دھو دیا ہو۔ پاس بیٹھ کے وہ میرے ہاتھ چومنے لگی۔ پھر جولین کی ماں بھی اندر سے آگئی۔ وہ بھی اسکرٹ کے بجائے ساڑی پہنے ہوئے تھی۔

دیکھتے دیکھتے سارے گھر میں ہل چل سی مچ گئی۔ گھر کا پرانا ملازم بکھو، جولین، اُس کی ماں سبھی اِدھر اُدھر بے قرار سے پھر رہے تھے۔ مکین متحرک ہوں تو گھر کے در و دیوار متحرک ہو جاتے ہیں، مکین خاموش رہیں تو در و دیوار بھی گونگے بن جاتے ہیں۔ آدمی صحرا ہو تو گل زار بھی صحرا ہو جاتا ہے۔ تجمل اور پیرو کے منع کرنے کے باوجود اُنھوں نے درمیانی میز پر قسم قسم کی چیزوں کا انبار لگا دیا۔ تجمل نے کھانے کے لیے صاف انکار کر دیا تھا، اس پر یہ حالت تھی۔ پیرو حیرت کا اظہار کرنے لگا کہ اتنی جلد اتنی بہت سی چیزیں اُنھوں نے کس طرح اکٹھی کر لی ہیں مگر جولین کو یہ کرتب خوب آتا تھا۔ چٹ پٹ طرح طرح کی چیزیں تیار کر لیتی تھی۔ مجھے یاد تھا، اِدھر وہ مجھ سے کچھ پوچھتی، اُدھر تیار کر کے لے آتی۔ وہ بالکل وہی تھی، وہی شام سی چہرے پر چھائی ہوئی، وہی چمکیلی اور حیران حیران آنکھیں۔ تجمل نے ٹھیک کہا تھا، وہ پہلے سے کچھ گھٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی لیکن کبھی کمی بھی خوبی بن جاتی ہے۔ لگتا تھا جیسے کسی مجسمہ ساز نے اپنے مجسمے پر نظرِ ثانی کی ہو۔ اُس میں وہی تیزی اور چستی نظر آ رہی تھی جس پر مجھے بعض اوقات تو بڑی حیرت ہوتی تھی۔ یکے بعد دیگرے وہ ہر کام اِس پھرتی سے نمٹاتی کہ مشین کا گمان ہوتا۔ کتنے ہی لوگ کیوں نہ آجائیں، اُس کی پیشانی پر شکن نہیں پڑتی تھی۔ نرملا میں بھی یہی خوبی تھی۔ دونوں میں ہزار مشابہتیں تھیں پھر بھی کوئی ایک بات دونوں میں بہت مختلف تھی۔

شہ بارہ نظر نہیں آ رہی تھی نہ کانتے اور مارٹی وغیرہ دکھائی دیے۔ مجھے پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی بات ہی ہوگی جبھی اُن میں سے کوئی اُن کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ مجھے شبہ ہونے لگا، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ یہاں آئے ہی نہ ہوں: کانتے پہلے ہی منع کر رہا تھا، ممکن ہے وہ پاڑے کی طرف چلے گئے ہوں۔ چائے لانے کے بعد وہ کسی قدر اطمینان سے ہمارے سامنے بیٹھیں تو پیرو سے نہ رہا گیا۔ اُس نے کانتے کے بارے میں پوچھا۔ "ابھی وہ کیدر ہے اپن کا دادا! کانتے مہاراجا؟"

چمپا بیگم نے سر جھکا لیا اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "وہ اسپتال میں ہیں۔"

"اسپتال میں؟" تجمل نے چونک کے کہا۔ "کیا بولتی ہو؟"

"انھیں سویرے ہی اسپتال بھیج دیا گیا تھا۔"

"ابھی کیسا ہے وہ؟" پیرو نے بے چینی سے پوچھا۔

تُھل اور پیرو کے چہرے بھاری ہو گئے۔ وہ اسی لیے اُس کا ذکر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ پیرو کے پوچھنے پر چمپا بیگم نے بتایا کہ رات ہی ڈاکٹر گھر پر بلا لیا گیا تھا۔ وہ دیر تک معائنہ کرتا رہا اور ناراض ہونے لگا کہ اتنی دیر کیوں کر دی گئی ہے۔ اُس نے سوئی لگائی اور کئی قسم کی دوائیں تجویز کیں، مارتی اُس کے اسپتال سے فوراً دوائیں لے آیا۔ ڈاکٹر نے ہدایت کی تھی کہ اگر رات طبیعت نہ سنبھلے تو صبح کسی تاخیر کے بغیر کانتے کو اسپتال میں داخل کرا دیا جائے۔ رات بھر سب جاگتے رہے۔ کسی دوا نے اثر نہیں کیا، کانتے ساری رات بستر پہ تڑپتا رہا۔ صبح ہوتے ہی جولین اور مارتی اُسے ڈاکٹر شرما کے اسپتال لے گئے، دوپہر تک جولین اُس کے پاس رہی پھر شام تک چمپا بیگم اور ابھی کچھ دیر پہلے مارتی شرابارہ کو اسپتال لے گیا ہے، وہ رات بھر مارتی کے ساتھ وہاں رہے گی۔ کانتے کے لیے الگ کمرہ لیا گیا ہے، دو تیمارداروں سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ ڈاکٹر کو اچھی طرح جتا دیا گیا ہے کہ روپے پیسے کی قطعاً فکر نہ کی جائے۔

"ابھی بولتا کیا ہے ڈاکٹر؟" پیرو نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

چمپا بیگم نے بتایا کہ ڈاکٹر نے سر میں کسی اندرونی چوٹ کا خدشہ ظاہر کیا ہے۔ کوئی رگ زخمی ہونے اور خون جم جانے کا بھی کہا ہے، ضرورت پڑی تو دو تین روز بعد آپریشن کیا جائے گا۔

"ابھی کون ڈاکٹر ہے وہ؟" پیرو نے بگڑے منہ سے کہا۔

"ڈاکٹر شرما یہاں کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔" جولین نے پہلی بار زبان کھولی۔ پیرو کا لہجہ ضرور اُسے گراں گزرا تھا۔

"سنا ہے، اللہ نے اُس کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔" چمپا بیگم افسردگی سے کہنے لگی کہ شہر کے کونے کونے سے لوگ اُس کے ہاں آتے ہیں۔ صبح سے شام تک مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مریضوں کی کثرت نے اُسے تندخو بنا دیا ہے، کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا لیکن لوگ اُس کی ہر تلخی سہہ لیتے ہیں۔ بڑی مشکل سے اُس تک رسائی ہوتی ہے اور اُس کے اسپتال میں جگہ ملتی ہے۔ رات بھی اُسے بلانے کے لیے جانے کتنی منتیں کی گئیں۔ جولین نے باقاعدہ برا بھلا کہا تب کہیں ڈاکٹر شرما کو مریض کی نازک حالت کا کچھ احساس ہوا۔ چمپا بیگم نے بتایا کہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی زورا، جمرو، شاموا اور ٹنگو یہاں سے چلے گئے تھے حالانکہ انھیں روکنے کی بہت کوشش کی گئی تھی۔ چاروں صبح کسی وقت آنے کا کہہ گئے تھے۔ دوپہر کو صرف ٹنگو آیا اور اسپتال میں کئی گھنٹے ٹھہر کے شام کو چلا گیا۔ انھوں نے میرے بارے میں کسی کو ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا البتہ تُھل کے لیے صرف اتنا کہا تھا کہ اُس کی آمد کسی وقت بھی متوقع ہے۔

پیرو کچھ دیر اور کانتے کے بارے میں نہ پوچھتا تو ٹھیک تھا۔ ابھی ہمیں آئے وقت ہی کتنا ہوا تھا کہ وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ اُسے فوراً کسی طبیب کو دکھا دینا چاہیے۔ اب اُس سور کی اولاد موری کے جانور کو کیا ہو گیا جو دونوں اتنے فکرمند ہو رہے ہیں۔ سارا سفر اُس کس عذاب میں کاٹا ہوگا۔ محض ہمارا راستہ کھوٹا نہ کرنے کے لیے وہ جانے کس طرح خود کو باندھے سمیٹے رہا ہوگا، کسی ٹھکانے پر پہنچ کر ظاہر ہے سر بکھر جانا چاہیے تھا۔ جانور کی برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پیرو نے اُسی وقت اسپتال چلنے کا مشورہ دیا لیکن چمپا بیگم نے بتایا کہ ڈاکٹر نے ملاقاتیوں کی تعداد پر پابندی لگا دی ہے۔ خصوصاً رات کے وقت تو اسپتال میں ممکن ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر شرما نہایت سخت آدمی ہے۔ اتنی حجت کے بعد وہ راضی ہوا ہے، اب اگر اُس کی مرضی کے خلاف کچھ ہوا تو وہ علاج سے ہاتھ اُٹھا لے گا۔ وہ ایسا ہی بدمزاج ہے۔

تُھل کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔

"ابھی چل کے دیکھتا ہے تُھل بھائی!" پیرو نے بے تابی سے کہا۔

"بہتر ہے، آپ اِس وقت یہ ارادہ ملتوی کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سوچ سمجھ کے ہی یہ پابندی لگائی ہے۔" چمپا بیگم نے دبی زبان سے کہا۔ "صبح تک اور انتظار کر لیجیے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہاں دوائیں جاری ہیں تو یہاں سبھی کانتے کے لیے دعائیں کر رہے ہیں۔ مارتی کے علاوہ وہاں شیبارے بھی موجود ہے اور سچ پوچھیے تو اُس کی موجودگی میں کسی کی ضرورت نہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے وہ کانتے کا دم بھرتی ہے جو اُس کے بہ قول اُسے اسپتال میں لے آیا تھا۔ کانتے کو اِس حالت میں دیکھ کے وہ اپنے حواس کھو بیٹھی۔ بہت اچھی بچی ہے۔ جب سے آئی ہے، سارے گھر میں رونق آ گئی ہے۔ جولین کو کوئی کام کرنے ہی نہیں دیتی۔ دونوں میں ایسی بنی ہے کہ لوگ دیکھیں تو رشک کریں۔ جولین نے اُسے پڑھانا شروع کیا تو ایسی فرفر گٹ پٹ کرنے لگی کہ پوچھیے۔ دیکھیے گا، وہی کانتے کی مسیحا ثابت ہوگی۔ اُس سے زیادہ کون اُس کا خیال رکھ سکتا ہے۔ اپنے محسن کی خدمت کا ایک تو موقع ملا ہے اُسے۔"

تُھل بت بنا بیٹھا رہا۔

چمپا بیگم اور جولین کے کہنے پر ہم تینوں نے سیب کی چند قاشیں اور انڈے کے حلوے کے دو چار چمچے حلق میں اُتار لیے۔ انھوں نے بھی زیادہ نہیں کیا۔ چائے پینے کے کچھ دیر بعد پیرو نے اُٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا، وہ سبھی ششدر رہ گئیں۔ "کیا مطلب؟" جولین سٹ پٹا کے بولی۔ "آپ یہاں نہیں ٹھہریں گے؟"

"نہیں بیٹا! ابھی نہیں، پھر آئیں گے۔ آتے رہیں گے۔" تُھل نے زمی سے کہا۔ "ابھی ہم کو جانا ہے۔"

"کہاں؟ اب آپ کہاں جائیں گے؟"

"تھوڑا کام ہے۔" تُھل نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"اِس وقت کہاں جائیے گا؟"

"لاڈلے کے گھر۔"

"لاڈلے کے گھر؟" جولین اضطراب سے بولی۔

"ہاں ری! کل تجھ کو بھی اُدھر لے جائیں گے۔ وہ سب لوگ مل گئے" تُھل نے آہستگی سے کہا۔

"کیا، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" جولین کی آواز سنسنانے لگی۔ اُس نے جلتی بجھتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مضطربانہ پوچھا۔ "سچ مچ؟"

"ہاں ری۔" تُھل نے سر ہلا کے کہا۔

"کب، کب؟"

"کل رات ہی کو کانتے کو اِدھر بھیج کے ہم اُدھر چلے گئے تھے۔"

"مگر ہمیں تو کسی نے کچھ نہیں بتایا؟"

"ابھی کیسے بتاتے، اُدھر جا کے اور سب کو دیکھ کے ہی تو بولتے نا۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"اِدھر ہی ہیں۔" تُھل نے کہا۔ "اِدھر ہی شہر میں دادر کے علاقے میں۔"

چمپا بیگم، جولین اور اُس کی ماں کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

"ہائیں پیارے میاں!" چمپا بیگم منمناتی آواز میں بولی۔ "یہ خوش خبری تو تمھیں پہلے ہی سنانی چاہیے تھی۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ تُھل نے تندی سے کہا۔ "منہ سے کیوں نہیں پھوٹتا۔"

"ہاں ہاں بتاؤ نا ہمیں۔ یہ سب کیسے ہوا۔ اللہ نے ہماری سن لی۔ خدا گواہ ہے کوئی وقت ایسا نہیں جاتا تھا جو اُن کا خیال نہ آتا ہو، اے میرے رب۔۔۔"

چمپا بیگم کی آواز ڈوبتی گئی۔

"اُدھر چلنا تم۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔

"سبھی، وہ سبھی ہیں نا؟" جولین کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"ہاں سبھی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"مگر کیسے! یہ سب کیسے ہوا؟"

"بہت لمبا کہانی ہے۔" پیرو نے درمیان میں کہا۔

"ارے!" جولین غیر ارادی طور پر کرسی سے اُٹھ گئی۔ اُس کے چہرے پر سرخی بکھر گئی اور آنکھوں میں قمقمے سے جلنے بجھنے لگے۔ وہ کبھی مجھے دیکھتی، کبھی اُن دونوں کو کہ کہیں ہم مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔ میں بہت دنوں تک اُس کے ساتھ رہا تھا۔ وہ خود پر قابو رکھنا جانتی تھی، اتنا بے اختیار اُسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ "ہم ابھی جائیں گے۔" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

"ابھی!" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ ابھی جانے میں کوئی حرج ہے؟"

"نہیں! وہ گھر دوسرا تو نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں! اپن سب ابھی چلیں گے۔" جولین کی ماں اشتیاق سے بولی۔ "اپن سب لوگ دعائیں کرتا تھا، اوہ گاڈ!"

"ابھی جاتے جاتے دیر بہت ہو جائے گی۔ ہمیں ذرا اور جگہ بھی جانا ہے۔" تُھل نے زیرِ لبی سے کہا۔ "کل ٹھیک رہے گا۔"

"ہمیں پتہ بتا دیجیے۔" جولین تیزی سے بولی۔ "ہم خود چلے جائیں گے بابا!"

"اب سویرے ہی جانا بیٹا!" تُھل نے زمی سے کہا۔

"سویرے تک شاید ہی کسی کو نیند آ سکے۔" جولین کی ماں بولی۔

"صبح میں خود لے جاؤں گا۔"

"کیسے ہیں وہ لوگ؟" جولین کی آواز سنسنا رہی تھی۔

"خود دیکھ لینا ری، تیری طرح کانچ کے بنے ہوئے ہیں۔"

"اوہ، اوہ۔" وہ آنکھیں میچ کے بولی۔ "یہ کتنا عجیب ہے۔"

"شکلا جی آج کل کہاں ہیں؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"شکلا جی! یہیں بمبئی میں ہیں۔ اُن کی ترقی ہو گئی ہے۔ آتے رہتے ہیں اور جب بھی آتے ہیں، اپنے دوست کو ضرور پوچھتے ہیں۔"

اُس کی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی اضطراری کیفیت سے کچھ لطف آنے لگا تھا۔ تُھل اور پیرو سامنے بیٹھے تھے ورنہ میں اُس کا تجسس اور فزوں کرتا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اصل میں یہ سب شکلا جی کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔

"اُن کی وجہ سے؟ نہیں۔"

"کرشنا جی کے بعد وہ مسلسل ٹوہ میں لگے رہے۔ شکلا جی کے سوا کوئی ہوتا تو اتنی فکر کیوں کرتا۔ انھوں نے فیض آباد لکھا تھا کہ ابا جان کی وضع قطع کے ایک صاحب آسام کی طرف دیکھے گئے ہیں۔ ہم فوراً روانہ ہو گئے۔" میں نے اُسے تبت کا واقعہ نہیں بتایا، مختصراً کہا۔ "بس اُدھر ہی ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک دن ہم اُن تک پہنچ گئے۔"

اُسے عرصہ یاد تھا، کہنے لگی۔ "دس سال کے قریب ہو گئے تھے نا؟"

"ہاں کم و بیش۔"

"یہ سب کسی خواب کے مانند ہے۔" وہ لہراتی آواز میں بولی۔

اِس وقت انھیں گھر جانے اور سب کو دیکھنے کے بے پناہ ارادے سے روکنے کے لیے تُھل اور پیرو کو متعدد عذر کرنے پڑے۔ وہ کچھ دیر اور ٹھہرنے کے لیے کہہ رہی تھیں لیکن تُھل اُٹھ گیا۔ چلتے چلتے وہ تینوں صبح جلد آنے کے لیے تکرار کرتی رہیں۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہمیں رخصت کرنے کے لیے گلی کے کنارے تک آئیں۔ گلی سے نکلتے ہی پیرو نے ایک راہ گیر سے ڈاکٹر شرما کے اسپتال کا پتہ پوچھا۔ زیادہ فاصلہ نہیں تھا، ہم پیدل ہی چلتے رہے، ایک اور جگہ پوچھنے کی ضرورت پڑی۔ آدھ گھنٹے سے پہلے پہلے ہم اسپتال پہنچ گئے۔ جدید طرز کی ایک بڑی اور صاف ستھری عمارت تھی، پُرسکون دھیمی دھیمی روشنیاں۔ عمارت دروازے سے خاصی دور تھی۔ لوہے کے جالی دار گیٹ پر پختہ عمر کے لاٹھی بردار پہرے دار

کو ہم تینوں نے طرح طرح سے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ انکار میں سر ہلاتا اور گیٹ پر آویزاں بورڈ کی طرف اشارہ کرتا رہا۔ بورڈ پر اسپتال کے اوقات کے بارے میں صاف لکھا تھا، صبح ۸ سے ۱۱ بجے تک، شام ۵ سے ۸ بجے تک۔ پیرو کی طرف سے پانچ روپے کا نوٹ بڑھانے پر پہرے دار کی آنکھیں کھل گئیں لیکن اُس نے نوٹ بھی واپس کر دیا۔ وہ ایک ہاتھ کا بھی نہیں تھا۔ چار دیواری بھی اتنی اونچی نہیں تھی، کسی طرف سے بھی پھاندی جا سکتی تھی مگر یہ اسپتال تھا، کوئی اور جگہ ہوتی تو بات دوسری تھی۔ پیرو نے دس منٹ کے لیے صرف ایک آدمی کے اندر جانے کی اجازت مانگی، پہرے دار اس پر بھی راضی نہیں ہوا اور اپنی نوکری کا واسطہ دینے لگا۔ کوئی صورت نہ دیکھ کے آخر پیرو نے کمرہ نمبر ۴ سے مارٹی کو بلانے کی بات کی۔ نوٹ پیرو کے ہاتھ ہی میں تھا، پہرے دار نے اُسے جیب میں رکھا، دروازہ اندر سے بند کیا اور دو تین منٹ میں واپس آ گیا۔ اُس نے آگے جا کے کسی اور شخص کو اندر بھیج دیا تھا۔ جتنی دیر ہم باہر کھڑے مارٹی کا انتظار کرتے رہے، پہرے دار معذرتیں کرتا رہا کہ اگر ہم دس بجے تک بھی آ جاتے تو وہ کوئی راستہ ڈھونڈ لیتا۔ اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ حادثے کی صورت میں آنے والے نئے مریضوں کا راستہ پچھلی طرف سے ہے۔ ہمیں پہلے اُسی جانب جا کے کوشش کرنی چاہیے تھی۔

پانچ چھ منٹ کے اندر اندر مارٹی ہمارے سامنے تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بکھر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اُس سے کچھ جاننے کو اب کیا رہ گیا تھا۔ تجھل اور پیرو ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ "ابھی ادھر ایک بڑا اسپتال بھی ہے۔" پیرو نے مشورہ دیا۔ "بولے تو اُدھر جا کے بات کرے۔"

"اِس جگہ بھی کوئی کمتائی نہیں ہے دادا۔" مارٹی روتے ہوئے بولا۔ "ابھی ہر گھنٹا بعد کوئی ڈاکٹر وزٹ کر کے جاتا ہے۔"

"بولتا کیا ہے؟" پیرو نے تنک کے پوچھا۔

"ٹھیک سے کچھ نہیں بولتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بول کے گیا تھا کہ کل شام تک اور دیکھے گا، آپریشن کرنے کا ہے کہ نہیں۔"

مارٹی کے مزید کچھ کہنے سے پہلے میں نے تجھل سے کہا کہ مارٹی کی بجائے آج رات کانتے کے پاس میں ٹھیروں گا لیکن تجھل نے منہ بنا کے ایسے مسترد کر دیا جیسے میں نے کوئی فضول بات کہہ دی ہو، کوئی احمقانہ بات۔ کہنے لگا کہ مجھے گھر واپس جانا چاہیے، وہاں ابا جان اور وہ سب میری راہ تک رہے ہوں گے اور کہنے لگا کہ مارٹی کے بجائے وہ خود اندر جائے گا۔

"اپن جائے گا۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔ "اپن کا بات وہ بہت مانتا ہے۔ ابھی اپن اُس کا پورا دھیان رکھے گا۔"

"نہیں دادا! تم کو اب اپنے گھر اور پاڑے کی طرف جانا ہے۔" تجھل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اِدھر اُس کو بچپن سے بھگت رہے ہیں۔ کبھی وہ ایسا ہی ہٹی ہو جاتا ہے۔ مجھ کو اُس کی رگیں معلوم ہیں۔"

"ابھی تم پاڑے نہیں گیا دادا؟" مارٹی متردد لہجے میں بولا۔

"چلا جائے گا ماسٹر! اُدھر بھی جانے گا۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔

"ادھر ڈنگو آ کے بولتا تھا۔ اُدھر سب پاڑے میں بیٹھا تھا ہے۔ کبھی اور گلیا اُن دو ریل والا لوگ کو بھی پاڑے میں لے۔"

"وہ لوگ پاڑے میں ہیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ڈنگو ابھی اپن سے یہی بولا تھا۔" مارٹی نے محتاط لہجے میں کہا۔ "اُن کو اُدھر الگ کمرے میں ڈال دیا گیا ہے اور سب دادا کا انتظار ... اور دادا! ....." وہ پیرو سے مخاطب ہو کے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر

"کیا ہے ماسٹر؟" پیرو نے ناگواری سے پوچھا۔

"کیا بولے دادا!" مارٹی کتراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ڈنگو ... تھا ادھر دادا کے پیچھے بمبئی میں بہت اُلٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ ... ادھر بائی کلا کا دادا لوگ نے پاڑے کا بھتا بھیجنا بند کر دیا ہے۔ ... دادا نہیں ہے تو بھتا بھی نہیں ہے، اپن پیرو دادا کو جانتا تھا ... کے آئے گا تو دیکھے گا۔ تینوں نے سالا ایکا کر لیا ہے۔ ڈنگو بولتا ... اُدھر چاقو لے کے جانے کا تھا پر دوسرا لوگ باگ نے ابھی تھوڑا ..."

"ایسا!" پیرو کی آواز ایک دم بھڑکنے لگی۔ "ایسا! اپن سیدھا ابھی اُن کی طرف جائے گا۔"

"دیکھیں گے دادا! اُن لوگ کو بھی دیکھیں گے۔" تجھل ... کہا۔ "ایسی جلدی تو نہیں پڑی ہے۔ ہم بھی ساتھ چلیں گے۔"

"اُن لوگ کو پتہ چل گیا ہو گا کہ اپن ادھر آ گیا ہے۔ ابھی ... تو سالا اُلٹا سمجھنے لگے گا۔ ادھر اور پاڑوں کا دادا لوگ بھی ہے ... بھی دھیان میں رکھنے کا ہے۔ ابھی سمجھا تجھل بھائی!"

"اور ابھی تم کانتے بھائی کے پاس ٹھیرنے کا جو بول رہا ... منہ سے جانے کس طرح نکل گیا۔ اُسے پیرو کے منہ پہ ایسی بات نہیں ... اُسے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ پیرو نے کانتے کے پاس ٹھیرنے ... اظہار پہلے کیا تھا۔ پاڑوں کے بارے میں مارٹی نے اُسے بعد ... پیرو نے اُس کی طرف گھور کے دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی ... آیا۔ اُسے مارٹی کے منہ پر طمانچہ مار دینا چاہیے تھا۔" وہ بات ... کے لیے اپن دس دن ٹھیر جائے گا، دس سال ٹھیر جائے گا۔ پھر اپن ... نکلے گا۔ ادھر تجھل بھائی اور اپن کا راجا دادا ہے۔ اُن کو اُدھر ... دیری ٹھیرنے سے اُن کے پاس جانے کا نئیں ہے۔"

"کانتے کے پاس ابھی ماسٹر ہی رہے گا۔" تجھل نے ...

"اپن بھی یہی بولنے کا تھا۔ اپن کا دل ابھی ... نہیں لگے گا۔ ادھر ڈاکٹر سسٹر لوگ سب سے اپن کا جان کاری بن گیا ... تو سمجھو تم لوگ ادھر ہے۔ اپن سے کو..."

"ٹھیک ہے ماسٹر!" تجھل نے مارٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "پر ذرا دبی ہی رکھ، ورنہ کترنی پڑ جائے گی اپنے کو۔" مارٹی کا جسم لہرا گیا، اُس نے جھٹ تجھل کے پیر پکڑ لیے۔

تجھل آگے بڑھ گیا۔ رات اور کالی ہو گئی تھی۔ اسپتال سے کچھ دُور آنے پر تجھل کے دماغ میں نہ جانے کیا آئی، اُس نے پیرو سے واپس اسپتال چلنے کو کہا۔ پیرو نے نہ واپسی کی غرض پوچھی، نہ کوئی اعتراض کیا۔ پہرے دار کی طرف جانے کے بجائے گھومتے ہوئے ہم اسپتال کے پچھلے حصے کی طرف آ گئے۔ یہ حصہ ہنگامی طور پر آنے والے مریضوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس وقت کوئی مریض موجود نہیں تھا۔ غالباً اسی لیے سکون چھایا ہوا تھا۔ اس طرف روشنی بھی زیادہ تھی۔ نرسیں، ڈاکٹر، اسپتال کا دیگر عملہ اور ابتدائی طبی امداد کے کمرے وغیرہ بھی اسی طرف تھے۔ ایک نرس نے ہمیں ڈیوٹی پر موجود خوش وضع نوجوان ڈاکٹر کے پاس پہنچا دیا۔ وہ میز پر ٹانگیں پھیلائے انگریزی ناول پڑھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس نے ٹانگیں میز سے ہٹا لیں اور انگریزی میں پوچھا کہ وہ ہماری کیا خدمت کر سکتا ہے۔ پیرو آگے تھا۔ اُس نے شانے اچکا کے میری طرف دیکھا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، ڈاکٹر نے ہندوستانی میں دُہرایا۔ تجھل نے کسی رسمی تعارف کے بغیر کہا کہ ڈاکٹر شرما کہاں ہیں۔ نوجوان ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ کچھ دیر پہلے گھر چلے گئے ہیں لیکن ایسی کیا بات ہے؟ کیا وہ ہمارے کسی کام آ سکتا ہے؟

"اپن کو اُسی سے بات کرنے کا ہے۔" پیرو نے کہا۔

"بات کیا ہے؟" ڈاکٹر نے تجسس سے پوچھا۔

جواب میں تجھل نے کہا کہ وہ کمرہ نمبر ۴ کے مریض کانتے کے مرض کی نوعیت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر اِس طرزِ تخاطب کا عادی نہ ہو گا لیکن اُس نے خوش اطواری سے پوچھا کہ ہم مریض کے کون ہیں؟

"ہم اُس کے سگے ہیں۔" تجھل نے کسی قدر بیزاری سے کہا۔

"بھائی؟ آپ اُس کے بھائی ہوں گے؟"

"اگر ہم چچا بولیں تو آپ نہیں بتاؤ گے؟"

"نہیں نہیں۔" ڈاکٹر نے خفت سے کہا اور جلدی سے پوچھنے لگا۔ "اُسے کیا ہو گیا ہے؟"

"اور اپن ابھی کیا پوچھنے کو آیا ہے۔" پیرو نے برجستہ کہا۔

"میرا مطلب ہے، مریض کس بیماری میں اور کب داخل ہوا تھا؟" ڈاکٹر نے تشریح کی کہ یہاں مرض کی نسبت سے الگ الگ شعبے ہیں۔

"اُس کو تھوڑا زکام تھوڑا بخار ہو گیا تھا، کل داخل ہوا تھا۔ اپن کو نئیں معلوم ابھی آپ نے کیدھر اُس کو رکھا ہے۔ کمرہ نمبر ۴ ابھی کیدھر ہے؟"

"نزلے بخار میں داخل ہوا تھا اور کمرہ نمبر ۴ میں؟" ڈاکٹر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "ہمیں ذرا دیر سکون سے بیٹھنے کی ہدایت کر کے اُس نے فون اُٹھا لیا۔ فون پر اُس نے انگریزی میں کسی کو بتایا کہ یہاں تین آدمی کمرہ نمبر ۴ کے مریض کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف سے کچھ توقف کے لیے کہا گیا ہو گا، ڈاکٹر خاموش ہو گیا۔ "زخمی ہے، اچھا!" وہ چونک کے بولا۔ "مار پیٹ کے نشانات ہیں، گہرے؟" اُدھر سے کچھ اور کہا گیا ہو گا، ڈاکٹر حیرت سے "اچھا اچھا، ہُوں ہُوں" کرتا رہا اور اُس کی کریدتی، ٹٹولتی نگاہیں ہم پر مرکوز رہیں۔ "جو لوگ پوچھنے آئے ہیں، وہ بھی مجھے کچھ پُراسرار لگتے ہیں۔ اِس وقت آمد، مرض کی نوعیت کے بارے میں یہ تشویش، مجھے تو کچھ اور ہی نظر آ رہا ہے۔" اُس کی آواز بتدریج دھیمی اور گہری ہوتی گئی۔ "کون لڑکی تھی، خوب صورت خوابوں والی لڑکی، خوش لباس۔ آہ بدقسمتی سے کل میں چھٹی پر تھا۔" دوسری طرف سے یقیناً اُسے جولین کے بارے میں بتایا جا رہا تھا، اُس کے ذکر سے نوجوان ڈاکٹر کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی تھی۔ "ایک لڑکی کا داخلہ!" وہ سانس لے کے بولا۔ "ٹھیک ہے، میں اِن مرکھنے سانڈوں کو دیکھتا ہوں۔ ایک سے ایک بڑھ کے ہے۔ منہ زور اور جنگلی۔" اُس کی پیشانی پر لکیریں مٹتی اور کھنچتی رہیں۔ "میرا خیال ہے، یہ ذرا دلچسپ معاملہ ہے۔ شاید مختلف بھی، بہرحال میں اِن سے نمٹ کے تمھیں فون کرتا ہوں۔ شاید مجھے تمھاری دوبارہ ضرورت پڑے۔"

میری کنپٹیاں جلنے لگی تھیں لیکن میں نے زبان بند رکھی۔ ڈاکٹر نے فون رکھ کے معنی خیز نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور ٹھیر ٹھیر کے وہی کچھ بتانے لگا جو ہمیں معلوم ہو چکا تھا۔ "مریض کے جسم پر چوٹوں کے گہرے نشانات ہیں۔ ایک چوٹ سر پر بہت گہری ہے۔ کوئی اندرونی چوٹ۔ ڈاکٹر شرما کوشش کر رہے ہیں کہ آپریشن کے بغیر ٹھیک ہو جائے لیکن امکان کم نظر آتا ہے۔" اُس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا، کرسی پر پہلو بدل کے وہ ہم سے پوچھنے لگا۔ "مگر یہ چوٹیں کیسے آئیں؟ چوٹ کاہے سے آتا ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"لڑائی دنگا؟" ڈاکٹر نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ لڑائی دنگے والے کیس ہم نہیں لیتے۔"

"وہ لوگ پھر کیدھر جائے گا؟"

"اُن کے لیے اور بہت سے ڈاکٹر ہیں۔" ڈاکٹر رکھائی سے بولا۔ "اور ایسی صورت میں پہلے پولیس کو مطلع کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

پیرو کچھ کہنا چاہتا تھا کہ تجھل نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور ڈاکٹر سے کہا۔ "ہم لوگ مریض کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ضرور دیکھیے، صبح آٹھ بجے آ جائیے۔"

"میں ابھی کے لیے بولتا ہوں۔"

"ابھی اِس وقت؟ وقت دیکھ رہے ہیں آپ؟"

"وقت دیکھ کے ہی آئے ہیں۔"

"مریض کے پاس کوئی اٹینڈنٹ ....." اُسے خیال آیا، اُس نے

ہندوستانی میں تشریح کی۔ "دیکھ بھال کے لیے کوئی آدمی تو ہوگا، میں اُسے بُلا دیتا ہوں۔"

بُھل کو یہ کہنا نہیں چاہیے تھا کہ ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے مارٹی سے مل چکے ہیں۔ "ہم اپنے لیے بولتے ہیں ڈاکٹر صاحب!" بُھل نے کہا۔

"ہاں اپن ابھی خود دیکھنا مانگتا ہے، اپنی آنکھوں سے۔"

"آپ دیکھ کے کیا کریں گے۔ مریض کے آرام میں مخل ہوں گے۔ ممکن ہے اُسے نیند کی گولیاں دی گئی ہوں۔"

"وہ کیسا بھی اُلٹا پڑا ہو، اپنی آواز سُن کے آنکھ کھول دے گا۔ اپنے کو دیکھ کے اُسے اور آرام ملے گا۔"

"اُس کے لیے آپ خاصے بے چین نظر آتے ہیں۔ ایسا کیا رشتہ ہے آپ کا اُس سے!"

"آپ نہیں سمجھے گا۔"

"مَیں سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی آپ عمر کا تھوڑا ہے، بڑا ہو جائے گا تو اکھا سمجھ میں آجائے گا۔"

"بہتر ہے، آپ ایک رات اور صبر کرلیں۔"

"صبر ہوتا تو ایدر کیوں آتا، ایک رات اپن کے لیے بہت بڑا ہوگا۔ ابھی اُس کو دیکھنے سے تھوڑا من کو شانتی مل جائے گا۔ من سمجھتا ہے آپ؟ سنا ہے، ڈاکٹر لوگ کے پاس نئیں ہوتا۔"

"صرف من کی بات ہے؟" ڈاکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اور بھی کچھ ہوئے گا۔"

"اور کیا؟"

"ابھی کیا منہ کھولے، اپن اُس کا گلے میں گنڈا ڈالنے کا ہے، ایدر ایک بڑا مہاراج نے اپن کو دیا ہے۔" پیرو نے نسبتہً تیز لہجے میں کہا۔ "ابھی گنڈا ابھی نئیں جانتا ہوگا آپ بابو صاحب؟"

نوجوان ڈاکٹر کے چہرے پر تمسخر کے بجائے سنجیدگی چھا گئی، کہنے لگا۔ "گنڈا یہاں دے دیجیے، ہم ڈال دیں گے۔"

"قسم سے ابھی آپ بالکل نوا، ایک دم چھوٹا ہے۔"

"یہ گنڈا اونڈا، سادھو وادھو یہاں نہیں چلتے۔ یہاں اسپتال میں ایک سے ایک بڑا ڈاکٹر اُس کی نگرانی کر رہا ہے، اُن پر بھروسا کیجیے۔"

پیرو اور بُھل بے سر پا باتیں کر رہے تھے۔ اُنھیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر کا دماغ کس طرف کام کر رہا ہے، وہ اُن سے کیا جاننا چاہ رہا ہے۔ اُنھیں فوراً اُٹھ آنا چاہیے تھا۔ دن بھر تو ہم آئے نہیں تھے، ایک رات اور سہی۔ کانتے بہرحال اب اسپتال ہی میں تھا۔ میں نے سوچا، میں دخل دُوں لیکن پیرو نے ڈاکٹر سے کہا۔ "تو اپن چلا جائے؟ اپن کا کوئی بات آپ نئیں سمجھے گا۔"

"سمجھنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے گہری سانس بھر کے کہا اور بولا۔ "ٹھیک ہے، مَیں اوپر موجود ڈاکٹر سے بات کرکے دیکھتا ہوں، ممکن ہے، وہ تیار ہو جائے۔"

"اُس کو بولو، ابھی ایسا زمین نئیں پھٹ پڑے گا۔ مریض کا فکر اپن سے زیادہ ابھی اُس کو نئیں ہوئے گا۔"

ڈاکٹر نے دوبارہ فون اُٹھا لیا اور نیم سرگوشیانہ، نیم رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "ڈاکٹر ریشی! وہ لوگ ابھی موجود ہیں، ہاں ہاں وہی جن کے بارے میں مَیں نے تمھیں ابھی بتایا تھا۔ وہی لٹھ باز بگڑے منہ کے پہاڑی جانور۔ مجھے وہ پہلی ہی نظر میں پسند نہیں آئے تھے۔ جیسا کہ میرا قیاس تھا، مجھے معاملہ ٹھیک نظر نہیں آتا۔ اب یہ محض شک نہیں۔ مَیں ساری بات تو درست نہیں بتا سکتا۔ وہ مریض کے پاس جانے کے لیے بضد ہیں۔" دوسری طرف سے کچھ کہا گیا تھا کہ ڈاکٹر نے بےتابی سے کہا۔ "پہلے میری پوری بات سُن لو۔ ظاہر ہے، میں نے ابتدا ہی میں اُنھیں وقت کی پابندی، اسپتال کے ضوابط وغیرہ سے آگاہ کر دیا تھا مگر وہ مسلسل اپنی ہٹ پر جمے ہوئے ہیں۔ جس حال میں مریض اسپتال میں داخل ہوا تھا، اُس کے پیش نظر اُن کے اصرار کے کچھ بھی معانی لیے جاسکتے ہیں۔ یقیناً میں نے بھی کچھ جاننے ہی کی ٹوہ میں بات کو طول دیا تھا اور ایک گونہ سلسلۂ کلام کا باقی رکھا تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ اِسی وقت اُس کے پاس جانے کے لیے کیوں بے چین ہیں۔ کون سی اہم بات وہ اُس سے کہنا چاہتے ہیں۔ اُن کا ارادہ کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔"

ڈاکٹر کے جواب سے اندازہ ہوا کہ دوسری طرف سے پوچھا گیا ہے، اُن کے خیال میں آخر یہ ارادہ کیا ہوسکتا ہے؟ ڈاکٹر نے کہا۔ "مَیں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ مریض کو کوئی اہم بات منتقل کرنا چاہتے ہوں، کوئی تلقین، کوئی تنبیہ، ممکن ہے اُنھیں اُس سے کچھ معلوم کرنا ہو، کوئی ایسی بات جو اِس قدر زدوکوب کرنے کے بعد بھی وہ اُس سے جاننے میں ناکام رہے ہوں۔ ہوسکتا ہے کسی ایسی چیز کی اُنھیں تلاش ہو جو مریض کی تحویل میں ہے۔ یعنی یہ کہ وہ صبح بھی آسکتے ہیں مگر اِسی وقت کیوں؟ ..... اِن کی تعداد بھی تین ہے۔ تم نے اِن لوگوں کو نہیں دیکھا۔ میرے سامنے بیٹھے ہیں، میرے بہت قریب۔ مجھے گمان ہے بلکہ ایسی صورت میں یقین کی حد تک گمان کہ اِن کے پاس ہتھیار بھی ہونا چاہیے۔"

میرے سارے حواس اُسی کی طرف مرکوز تھے۔ بُھل اور پیرو کی سوالیہ نگاہیں بار بار میری جانب اُٹھتی تھیں مگر میں نے کسی اشارے سے بھی اجتناب کیا۔ میرے ہمہ تن گوش ہونے کا سبب ضرور اُن کی سمجھ میں آرہا ہوگا، چنانچہ وہ خاموش بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر ایک خلاق ذہن کا نوجوان تھا۔ ڈاکٹری کے بجائے اُسے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ انگریزی رَوانی سے بول رہا تھا۔ لب و لہجہ بھی تاثر سے عاری نہ تھا۔ دوسری طرف سے ٹوکنے پر لمحوں کے لیے خاموشی

کا وقفہ ہو جاتا تھا۔ مخاطب نے اُس کی ہم نوائی ہی کی ہوگی، ڈاکٹر کی آواز کچھ اور تمتمانے لگی۔ "سمجھ رہے ہو نا! بے شک اُنھوں نے آتے ہی ڈاکٹر شرما کا نام لیا، محض ابتدائے کلام کے لیے اور ڈاکٹر کی موجودی ناموجودی کے بارے میں مزید اطمینان کے لیے۔ حالانکہ اُنھوں نے دانستہ یہ وقت منتخب کیا ہوگا جب ڈاکٹر شرما اسپتال میں موجود ہی نہ ہوں۔ کتنے سلسلے مل رہے ہیں۔ ہاں، تم ٹھیک سمجھ رہے ہو، میں سوچتا ہوں۔" اُس کی زبان اٹکنے لگی تھی۔ "مَیں سوچتا ہوں کیوں نہ پڑوس میں فون کر دیا جائے۔"

پڑوس سے اُس کی مراد نزدیک کی پولیس چوکی ہوگی۔ مجھے باندرے کی اِس چوکی کا علم تھا۔ ہمارے سامنے اُسے پولیس کا ذکر زبان پر نہیں لانا چاہیے تھا۔ کہنے لگا۔ "وہ ذرا بہتر طریقے سے اُنھیں ٹٹول سکتے ہیں..... نہیں نہیں..... میں اُنھیں تاکید کردوں گا کہ وہ پہلے اِن کے اسپتال سے باہر نکلنے کا انتظار کریں۔ یہاں نہیں، وہ یہاں نہیں آئیں گے، اُن کی ملاقات سرِراہ ہوگی، اسپتال سے مناسب دُوری پر۔ یہ بات وہ خود اچھی طرح جانتے ہیں کہ ڈاکٹر شرما اپنی حدود میں وردی والوں کی مداخلت پسند نہیں کریں گے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

اُدھر سے لازماً کہا گیا تھا کہ اگر اُس کا قیاس سر بہ سر غلط ثابت ہوا؟

نوجوان نے جواب میں تیزی سے کہا۔ "اگر کچھ ثابت نہ ہوسکا تو معذرت، روایت کے مطابق اُن سے معذرت کرلی جائے گی۔ ہرچند کہ وردی والے اِس میں بڑے بخیل ہوتے ہیں۔ رہا یہ کہ پھر اِن لوگوں کا شبہ سیدھا میری طرف جائے گا، یہ بعد کی بات ہے۔ مجھے اِس کی پروا نہیں ہے۔ یہ ایک بے جواز شبہ ہوگا۔ میں اِن سے نمٹ سکتا ہوں۔ تمھی بتاؤ، بظاہر مجھے اِس میں ایسا کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ ایک ذرا اپنا کانٹا ہی نکل جائے گا۔ اپنی رگ غلط نہیں پھڑکتی۔"

میرا خیال تھا، اب اُسے فون بند کر دینا چاہیے لیکن وہ مذبذب انداز میں سر ہلاتا اور ہاں ہاں کرتا رہا۔ میں اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا، وہ خون کی تمازت سے سُرخ ہوگیا تھا مگر دوسری جانب سے اُس کی توقع کے خلاف کوئی بات کہی گئی تھی، اِس لیے اُس کی آنکھیں بجھنے سی لگیں، آواز بھی دب گئی۔ "ہاں، یہ تو ہے....." وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "میں نے اِس طرف توجہ نہیں کی کہ ڈاکٹر شرما مریض کو داخل کرچکے ہیں لیکن اِس سے..... کیا اِس سے بہت بڑا فرق پڑتا ہے؟"

دوسری طرف پھر معلوم نہیں کیا کہا گیا۔ نوجوان ڈاکٹر غور سے سنتا رہا اور اُس کے شانے جھکتے گئے۔ "لیکن کچھ بھی ہو، یقین کرو میرے قیافے شاذونادر ہی غلط ثابت ہوتے ہیں، بہرحال کیا کہا جاسکتا ہے۔"

اُس سے کہنا چاہیے تھا کہ اگر اُس کا مفروضہ دُرست نکلا اور معاملے نے کوئی نہایت پیچیدہ صورت اختیار کرلی تو؟ اُس سے شاید یہی کہا گیا ہو، نتائج کی نشان دہی بھی کی گئی ہوگی کہ کتنے سنگین حقائق سامنے آسکتے ہیں۔ عواقب و نتائج کا یہ تذکرہ ڈاکٹر کے لیے داد کا درجہ رکھتا تھا۔ اِسی تائید کے لیے تو وہ مضطرب تھا مگر وہ محض داد پر اکتفا کرنے والا نوجوان معلوم نہیں ہوتا تھا جو کسی شاعر کی طرح خوش ہو جاتا۔ وہ ایک عملی آدمی تھا۔ جلی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "تمھاری بات سمجھ میں آرہی ہے۔ یہ اسپتال ہے، مندر کی جگہ ہے، یہاں ڈاکٹر شرما کا بُت نصب ہے، بلکہ ڈاکٹر شرما کا بھوت ......"

اُس کی بات کاٹ دی گئی، وہ رُک گیا اور کچھ توقف کے بعد جھنجھل کے بولا۔ "نہیں نہیں، تمھیں ایسا کوئی تجربہ نہیں کرنا چاہیے، چاہے ایک آدمی ہی کیوں نہ ہو، اِس وقت کسی کو بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہماری یہ فراخ دلی کسی بڑے واقعے، کسی بڑے حادثے کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی جس کے لیے تم مجھے منع کر رہے ہو۔ ہاں ہاں، میں نے کہا تھا کہ مریض کے کمرے سے اٹینڈنٹ کو بلا دیتا ہوں لیکن اُنھوں نے ٹال دیا اور کہا کہ وہ خود مریض کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

فون بند کرکے اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ چند لمحے وہ یوں ہی بے نیاز سا، کھویا کھویا بیٹھا رہا، اُس وکیل کی طرح جس کی بہترین دلیلوں میں سے کوئی دلیل گم ہوگئی ہو، جیسے کسی ایک دلیل کی کسر رہ گئی ہو۔ بُھل اور پیرو اُس کی طرف دیکھتے رہے۔ میں بھی خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ اُس سے کوئی بات کروں یا اُن دونوں کو اُٹھ جانے کا اشارہ دوں۔ اُس نے ہمیں بہت سے خطاب دیے تھے۔ وہ سب میرے سر میں ڈنک مار رہے تھے لیکن جانے کیوں میرے سینے میں پہلے جیسی گھٹن نہیں تھی۔ اِس کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آگیا تھا، اِس کا سبب شاید وہ خود تھا۔ وہ بہت الگ سا نوجوان تھا، ایسے لوگ کم نظر آتے ہیں۔ بُھل اور پیرو میری خاموشی کی وجہ سے ٹھیرے ہوئے تھے اور منتظر ہی تھے۔ مَیں نے اشارہ کیا تو وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے جان لیا تھا کہ اب وادیلا لاحاصل ہے۔ ہمارے اُٹھنے پر ڈاکٹر چونک پڑا اور کرسی پر سیدھا ہو کے بولا۔ "اُس نے منع کر دیا۔" اُس کی آواز مرجھائی ہوئی تھی۔ "آپ لوگ اب صبح ہی آکے اُسے دیکھ سکتے ہیں۔"

"کوئی گنجائش رہ گئی ہو تو ابھی ہم ٹھیرے جاتے ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے نکل گیا۔

"کیا مطلب؟" وہ ترش رُوئی سے بولا۔ میں نے پہلی مرتبہ اُسے مخاطب کیا تھا۔ میرا لہجہ بھی اُس کے لیے تردد کا سبب بنا تھا حالانکہ میں نے انگریزی سے پہلو تہی کی تھی۔

"مطلب یہ کہ ابھی ہم یہاں موجود ہیں۔ مجھے تمھارا خیال آرہا ہے۔" میں نے جان بوجھ کے 'آپ' نہیں کہا۔ "تم نے اتنی زحمت اُٹھائی اور بے نتیجہ رہی۔"

"میں نے اپنے طور پر کوشش کی تھی، پوری کوشش ......"

"اور اچھی کوشش! تم نے اپنی طرف سے شاید کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔" میرے لفظ اُسے محسوس ہونے چاہیے تھے، وہ بیٹھے بیٹھے تیورا

گیا اور بے مقصد اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا: "مجھے افسوس ہے۔" "اچھا ہوا" اُس نے کچھ اور نہیں کہا۔

"تم نے اپنا وقت بھی برباد کیا، ہمارا بھی۔" اُس کی متغیر حالت دیکھ کے مجھ سے نہ رہا گیا۔ "نہایت سامنے کی بات تھی۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود تم مریض کے کمرے سے اٹینڈینٹ کو بُلا کے تصدیق کر سکتے تھے۔"

وہ ہکا بکا رہ گیا جیسے کسی کی جان نکل جائے، کھُلا ہوا منہ، پھٹی ہوئی آنکھیں۔ اُسے گویائی پر بھی قدرت نہیں رہی۔ اُس کے لبوں میں جنبش ہوئی مگر سِسک کر رہ گئے۔

ہم پلٹ پڑے۔ چند قدم چل کے ہم نے کمرے کا دروازہ عبور کیا اور مریضوں کے لیے بنے ہوئے سائبان میں آ گئے۔ آگے ہم نے تین چار گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اُس کی وحشت زدہ آواز سنائی دی۔ وہ اندر سے دیوانہ وار چلّا رہا تھا: "ٹھیریے، ٹھیریے۔" تھل اور پیرو دونوں رُک گئے۔ اندر سے اُس کی بھگتی چاپیں بھی سنائی دیں پھر وہ حواس باختہ انداز میں دروازے پر نمودار ہوا۔ "براہِ مہربانی تھوڑی دیر کے لیے اندر آئیے۔" اُس نے عاجزانہ کہا۔ "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔" وہ آدھی ہندوستانی، آدھی انگریزی میں بولا۔

مجھے تھل اور پیرو کو کچھ بتانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن وہ بہت کچھ از خود سمجھ چکے ہوں گے۔ اُنھیں کسی ردِ عمل کا اظہار کرنے کے لیے میری طرف دیکھنا چاہیے تھا۔ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ ڈاکٹر لپکتا ہوا ہمارے قریب آ گیا اور سیمابی لہجے میں ہم سے وہی درخواست کی۔

اندر کمرے میں جب تک ہم کرسیوں پر بیٹھ نہیں گئے، وہ کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں اُس کے چہرے پر پسینے کے بے شمار قطرے اُبھر آئے تھے۔ اُس نے ہمیں بلا تو لیا تھا لیکن اب اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ لمحوں تک وہ ہماری صورتیں تکتا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ میں نے اُس کی مشکل حل کرنا چاہی۔ "کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں جانتا ہوں۔"

اُس نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ "مجھے، مجھے لفظ نہیں مل رہے۔" اُس کی آواز سے بے چارگی و بے بسی نمایاں تھی۔ "میں آپ..... آپ سے....."

"جانے دو، بہتر ہے اب کچھ مت دہراؤ۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "ایک تجربہ یہ بھی سہی۔"

"میں آپ سے..... آپ سے۔" اُس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"جو تم کہنا چاہتے ہو، مجھے معلوم ہے اور جو بات مجھے معلوم ہے، اُسے سننے سے کیا حاصل۔"

وہ سر جھٹکنے لگا اور خفقانی انداز میں بولا: "مجھے بالکل خیال نہیں رہا..... میں کتنا وحشی..... مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔"

"ہمیں اجازت دو، وقت بہت ہو گیا ہے۔"

"نہیں آپ نہیں جائیں گے، آپ ایسے نہیں جائیں گے۔"

"یقین کرو، ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"آپ بڑے آدمی ہیں۔"

"عمر میں کچھ بڑا ضرور ہوں۔"

"آپ ہر طرح بڑے ہیں۔" وہ ڈوبتی آواز میں بولا۔ "عمر ہی نہیں، حوصلے میں، نظر میں....."

"تم پھر عجلت کر رہے ہو۔"

"نہیں نہیں۔" اُس نے بے قراری سے کہا۔ "اس بار یقیناً مجھ سے کوئی کوتاہی نہیں ہو رہی۔" اُسے ہندوستانی میں لفظ نہیں ملے تو انگریزی میں بولا: "اس بار سب میرا آزمودہ، سب میرا چشم دید ہے۔"

وہ نہیں مانا۔ رہ رہ کے اُس میں تلاطم سا اُٹھتا، وہ کیسا عجیب تھا، اُس کی محجوبی میں نازطلبی بھی تھی۔ وہ ابھی تک من مانی کر رہا تھا۔ ہم تینوں کو کلنتے کے کمرے میں لے جانا چاہتا تھا۔ پیرو نے منع کیا کہ ایک آدمی کا جانا بہت ہے۔ تین آدمی نظروں میں آ سکتے ہیں۔ اگر ضابطے کی خلاف ورزی کرنی ہے تو ایک آدمی تک محدود رہے۔ ڈاکٹر کہنے لگا کہ اسپتال کا ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے اُسے بھی کچھ اختیار ہے، بعد میں ڈاکٹر شرما نے باز پرس کی تو وہ اس سے نمٹ لے گا، وہ استعفا دے دے گا لیکن پیرو اور تھل تیار نہیں ہوئے، چنانچہ وہ صرف تھل کو لے کے دروازے سے نکل گیا۔ جانے سے پہلے اُس نے نرس کو بُلا کے ہدایت کر دی تھی کہ وہ ہمارے لیے کافی تیار کرے۔ اُس نے سنا ہی نہیں، ہم انکار کرتے رہ گئے۔ میں خود کو آمادہ کر رہا تھا کہ خلوت ملتے ہی پیرو مجھ سے کچھ سوال کرے گا، مجھے اُسے کتنا بتانا چاہیے لیکن وہ زبان بند کیے بیٹھا رہا۔ میں نے بھی خاموشی مناسب سمجھی۔

نرس صاف و شفاف برتنوں سے بھری ٹرالی خود لے کے آئی تھی۔ کافی کے علاوہ کاجو، بسکٹ اور ناریل کی مٹھائی بھی تھی۔ اُس نے خوش سلیقگی سے ہمارے سامنے پلیٹیں اور پیالیاں سجا دیں۔ ہم سے شکر اور دودھ کے لیے پوچھا۔ میں نے ڈاکٹر کے آنے تک ٹھیر جانے کو کہا، مگر وہ کہنے لگی، اُن کے آنے پر وہ تازہ کافی بنا دے گی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے پیرو یکایک مجھ سے بولا:

"راجا! ابھی چھوکرا کیسا ہے؟"

"اچھا ہے۔" مجھے ہنسی آ گئی۔

نرس کے کمرے میں آ جانے کی وجہ سے وہ چپ ہو گیا۔ نرس آ کے فوراً چلی گئی مگر پیرو گم صم بیٹھا رہا۔ میں نے بھی اُسے نہیں کریدا کہ وہ اس کے متعلق کیا تبصرہ کرنا چاہتا تھا۔ نرس کو دوسری کافی بنانے کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ پانچ منٹ سے کچھ اوپر ہوئے ہوں گے کہ وہ دونوں واپس آ گئے۔ میں اور پیرو یک لخت کھڑے ہو گئے۔ تھل کے چہرے پر کچھ ٹٹولنا بہت مشکل تھا لیکن اس وقت ڈاکٹر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کہیں دُور سے چل کے آ رہا ہو، جیسے اتنی دیر میں وہ بوڑھا ہو گیا ہو۔ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ سے اُس کے لیے کافی بنائی۔ جتنی دیر تھل

ایک تھکے ہوئے آدمی کے مانند کافی پیتا رہا، ڈاکٹر اُسے نرمی و شائستگی سے اطمینان دلانے کی کوشش میں لگا رہا کہ وہ اور اُس کے ساتھی ڈاکٹر ہر وقت کانتے پر نظر رکھیں گے حالانکہ تھل نے ہمارے سامنے اُس سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

"آپ بولے تو اپن ابھی کسی اور اسپتال کو دیکھے؟" پیرو نے ڈاکٹر سے وہی بات کہی جو وہ پہلے تھل سے کہہ چکا تھا۔

"میری رائے آپ نے پوچھی ہے تو میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا۔" ڈاکٹر محتاط لہجے میں بولا۔ "یہ ہر اعتبار سے ایک مکمل اسپتال ہے۔ کہیں آپ آپریشن سے تو نہیں گھبرا رہے؟ اپنے ملک میں لوگ آپریشن سے جانے کیوں اتنا خوف کھاتے ہیں، ضرورت ہوتی ہے تبھی کیا جاتا ہے۔ میں ولایت میں چار سال رہا ہوں۔ وہاں لوگ خوشی خوشی آپریشن کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔"

"اُدور ڈاکٹر لوگ بھی ولایت کا ہے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے مگر ڈاکٹر شرما کسی طرح ولایت کے کسی بڑے ڈاکٹر سے کم نہیں ہیں۔ وہ ایک ایکسپرٹ سرجن ہیں، اُن کے ہاتھ میں جادو ہے۔ شاید ہی اُن سے کبھی کوئی کیس خراب ہوا ہو۔"

کافی پیتے ہی تھل اُٹھ گیا۔ "پر بڑے ڈاکٹر صاحب کو آپ بول دینا کہ کاٹا چھانٹی کرنے سے پہلے ہم سے پوچھ لیں۔" تھل نے تندی سے کہا۔ "اور بول دینا، ہم اُس کے لیے اپنے کو بھی بیچ سکتے ہیں۔"

"جی جی۔" ڈاکٹر مستعدی سے بولا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔"

وہ ہمیں اسپتال کے بیرونی دروازے تک چھوڑنے آیا۔ رخصت ہونے سے پہلے اُس نے پیرو اور تھل سے زور زور سے ہاتھ ملایا اور جب میرے سامنے آیا تو ہاتھ پھیلا دیے۔ میں نے بھی بازو کھول دیے۔ "تم سے مل کے خوشی ہوئی۔" میں نے زیرِ لبی سے کہا۔ "اور دوبارہ ملنے کی جستجو ہے۔"

"آپ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ آزردگی سے بولا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"نہیں، ایسا مت سمجھو، میرے ذہن میں دُور دُور تک ایسا کوئی احساس نہیں ہے۔ تم میں بڑی دل کشی ہے۔ ہر شخص کی کوئی خوبی ہی اُس کی دل کشی کا سبب ہوتی ہے۔ تم میں بہت سی باتوں کے علاوہ دلیل سننے کی ایک جرأت بھی موجود ہے اور میں نہیں، لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہت بڑی خوبی ہے۔"

"کہاں!" وہ بچّوں کی طرح مچل کے بولا۔ "مجھ میں برداشت نہیں ہے جس کا آج میں نے مظاہرہ کیا، اِس کے بغیر ہر خوبی بے کار ہے۔"

"برداشت تجربے سے آتی ہے اور تجربہ....." میں نے مسکرا کے کہا۔

"عمر سے آتا ہے۔" اُس نے میری بات مکمل کرنا چاہی۔

"ضروری نہیں، تجربہ تو زندگی کے سلوک سے آتا ہے کہ وہ کیسا سلوک کرتی ہے اور زندگی برتنے سے آتا ہے کہ آپ کس طرح اُسے برتتے ہیں مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نہ زندگی کے بس میں کچھ ہوتا ہے، نہ آپ کے بس میں۔" جانے کیسے میری زبان یہ لفظ تراشتی رہی۔ مجھے خود بھی حیرت تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ تھل اور پیرو مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے، سُنتے تو ضرور ہنستے۔ ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کے میں آگے چلا آیا۔

وہ میرے پیچھے پیچھے آ گیا۔ "میں آپ سے دوبارہ مل سکتا ہوں؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"مجھے اپنا پتہ دے دیجیے۔"

"مگر، مگر ہم ابھی تو یہاں آتے ہی رہیں گے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا پھر اِس سے پہلے کہ وہ کوئی اور مطالبہ کرتا، میں تیز قدموں سے تھل اور پیرو کی جانب چل پڑا۔

[illegible]ت تک ہم پیدل چلتے رہے۔ چوک کی گھڑی میں ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سڑکوں پر ہر طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے ٹرام روک لی تھی لیکن وہ باہر کھڑے اُلجھتے رہے۔ وہ مختلف سمتوں میں جانا چاہتے تھے۔ پیرو گھر کی طرف چلنے کو کہہ رہا تھا کہ سب ہماری راہ تک رہے ہوں گے اور اتنی رات تک نہ پہنچنے پر تشویش میں مبتلا ہوں گے۔ خصوصاً مولوی اکرم کے دل میں تو طرح طرح کے وسوسے اُٹھ رہے ہوں گے۔ فرخ، فریال وغیرہ رات بھر سو نہیں پائیں گی۔ پیرو غلط نہیں کہہ رہا تھا مگر اُسے خود بھی تو اپنے گھر جانا تھا اور پاڑے جہاں اس کے انتظار میں ان گنت لوگ بیٹھے ہوں گے۔ بمبئی کے باڑوں کے ان گنت دادا۔ مارٹی کی زبانی تین پاڑوں کے رسّی تڑانے کی خبر سُن کے اُس نے پہلے وہیں جانے کا ارادہ کیا تھا۔ اُسے اُن دو آدمیوں کو بھی دیکھنا تھا جو حیدرآباد سے ہماری نگرانی کر رہے تھے اور مارٹی کے بیان کے مطابق پیرو کے پاڑے پر موجود تھے۔ بالے بھی وہاں پہنچ گیا ہو گا۔ تھل نے مجھ سے کہا کہ میں اکیلا گھر واپس چلا جاؤں، وہ اور پیرو پاڑے کی طرف چلے جاتے ہیں۔ میں نے یک سر انکار کر دیا۔ ٹرام والا منتظر تھا۔ تھل نے سوار ہوتے ہی اُس سے بائی کلا کی طرف چلنے کو کہا۔ بائی کلا کے اُس اڈے کی طرف جہاں کبھی بہروپیا مستانہ حکمرانی کرتا تھا اور کرشنا جی کے لیے مجھے اُس کے پاڑے میں نقب لگانی پڑی تھی۔ مستانہ کی ساری مستی اُسی رات ختم ہو گئی تھی جس رات اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑی تھی۔ اُس کے بعد وہ سنبھل نہیں سکا۔ بائی کلا کے پاڑے پر کسی اور نے قبضہ جما لیا۔ پیرو نے جب تیواڑی اور اُس کے حاشیہ برداروں کا نام و نشان مٹایا تو بائی کلا کا پاڑا بھی اُس کے پاس آ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب وہاں کون سا دادا قابض تھا۔

وہی عمارت تھی جس کا ایک ایک گوشہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ ٹرام مین دروازے کے سامنے رکوائی گئی۔ دروازہ بند تھا اور ایک آدمی چبوترے پر بیٹھا

اُونگھ رہا تھا۔ پیرو نے اُس کے بال کھینچے، وہ ہڑبڑا کے ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ اُس نے پہلی نگاہ میں پیرو کو پہچان لیا تھا چناں چہ ہوش و حواس بحال کرنے میں اُسے کچھ وقت لگ گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا، اُس کی پشت پر چبوترے کے فرش سے چار انچ کے قریب دو نجانی پر دو کنڈے دیوار میں جڑے ہوئے تھے۔ پرانی طرز کے دو گول کنڈے جو بعض گھروں کے دروازوں میں عموماً جڑے ہوتے ہیں۔ بظاہر اُن کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا تھا لیکن وہ دونوں اطلاعی گھنٹیوں کا کام کرتے تھے۔ پاڑے کا چوکی دار آنے والا آدمی دیکھ کے اُنھیں استعمال کرتا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ کولھے کی طرف لے جاکے چپکے سے پہلے کنڈا گھماتا، گھمانے سے کنڈا کھل جاتا۔ کھلنے پر وہ اُسے کھینچتا، چھوڑتا رہتا تو اندر گھنٹی بجنے لگتی۔ نہ زیادہ دُور تک اُسے کھینچنا پڑتا تھا، نہ زیادہ دیر تک، بس دو تین بار یہ عمل دُہرانے سے اندر اطلاع ہو جاتی تھی۔ کنڈا کھینچنے کے بعد اُسے فوراً گھما دیا جاتا تو وہ گرفت پکڑ لیتا اور اپنے اندر کے کھانچے میں اِس مضبوطی سے جکڑ جاتا جیسے تالا لگ جائے۔ پھر کوئی بھی اُسے چھیڑتا رہے اُس پر اثر نہ ہوتا۔ اِس سارے عمل میں لمحے صرف ہوتے تھے اور کسی کو آہٹ بھی نہ ہو پاتی تھی۔ چبوترے پر روشنی بھی ایسی تیز نہیں تھی اور رات کے وقت پاڑے کا دروازہ بند ہو جانے پر اِنھیں استعمال کیا جاتا ہو گا۔ پیرو کے اشارے پر چوکی دار نے وائیں ہاتھ کا کنڈا گھمایا تو یہ سارا انتظام میری سمجھ میں آیا۔ دوسرا بائیں ہاتھ کا کنڈا پولیس کی آمد کی اطلاع کے لیے ہو گا۔ پہلے یہ سارا انتظام نہیں تھا۔ اِس کا مطلب تھا کہ پاڑے کے موجودہ دادا نے مستانے سے کچھ زیادہ بڑے انتظامات کیے ہوئے ہیں۔ گویا اندر دُون کا سماں ہونا چاہیے۔

دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ جو شخص باہر نکل کے آیا، وہ دادو تھا۔ گویا وہ جیل کاٹ کے اپنے پرانے اڈّے واپس آچکا تھا۔ دادو نے پہلے پیرو کو دیکھا، پھر جیسے ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ اپنی جگہ جم کے رہ گیا۔ پیرو اُسے ایک طرف دھکیل کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر ڈیوڑھی کی طرز کا مختصر راستہ طے کر کے ہم آگے پہنچے تو طبلے، ہارمونیم کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ ڈیوڑھی سے ہم صحن میں آگئے۔ صحن میں یہ آوازیں اور تیز ہو گئیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف دونوں کمروں میں واقعی دن کا منظر تھا۔ اندر بہت سے لوگ بیٹھے نظر آرہے تھے۔ چھوٹے بغلی کمرے میں تاش کی بازیاں جمی ہوئی تھیں اور سامنے بڑے کمرے میں ایک لڑکی ناچ رہی تھی، دوسری فرش پر بیٹھی گا رہی تھی۔ دونوں رنگ برنگے مراٹھی کپڑے پہنے، سولہ سنگھار کیے ہوئے تھیں۔ ہم نسبتاً اندھیرے سے گزر کے آئے تھے اِس لیے کسی کی نظر نہیں پڑی۔ ویسے بھی کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ سب گم تھے اور جھوم رہے تھے اور صدائیں بلند کر رہے تھے۔ ہم دروازے پر کھڑے ہو گئے، تب بھی کسی نے توجہ نہیں دی۔ کمرے میں دارو کی بو پھیلی ہوئی تھی اور تمباکو کی۔ یہ تین دروازوں والا بڑا کمرہ تھا۔ آخری سرے پر بیچ میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے جو بھاری جسم، اوسط قد، سیاہی مائل بھرے ہوئے

اُٹھی ہوئی ناک کا چالیس سالہ شخص بیٹھا تھا، وہی پاڑے کا دادا ہو گا۔ مستا[...] کی نشست بھی یہی تھی۔ ناچنے والی سانولی کم عمر لڑکی اُس کے قریب بیٹھے ہو[...] ایک تنومند آدمی کے سامنے ناچ رہی تھی۔ نوٹ لڑکی پر اُچھال کے اُس آ[...] نے اپنی بانہیں لڑکی کے گلے میں ڈالنا چاہیں۔ لڑکی مسکراتی، شرماتی ہوئی پیچھ[...] ہٹ گئی، آدمی کے ہاتھ اُٹھے رہ گئے، وہیں وہاں کھڑے منٹ بھر کے قریب ہوا ہو گ[...] کہ لڑکی کے ہٹنے اور درمیان میں آجانے کے سبب سب کی نگاہیں منتشر ہو گئیں[...] وہ آدمی جو اپنی بانہوں میں لڑکی کو سمیٹ لینا چاہتا تھا، کچھ بے تاب سا ہو گیا[...] اُٹھ کے لڑکی کے ساتھ ناچنے لگا۔ وہ کھڑا ہی ہوا تھا کہ کمرے میں قہقہے گونج[...] لگے اور وحشیانہ صدائیں اُبھریں مگر دوسرے ہی لمحے مسند نشین دادا کو جیسے کسی[...] سوتے میں چٹکی بھر لی۔ ناچنے والی کے گھنگرو پتھر ہو گئے اور گانے والی کی آوا[...] پر برف سی جم گئی۔ "دادا! دادا! پیرو دادا!" پاڑے کا دادا اپنی جگہ سے اُ[...] کے سیدھا پیرو کی طرف جھپٹا۔ "ابھی تم کب آیا دادا؟" اُس نے لڑکھڑاتی آ[...] میں کہا۔ "آؤ، آؤ، اِدھر بیٹھو، اِدھر آکے بیٹھو۔"

"اپن بیٹھنے کے لیے نئیں آیا ہے۔"

"ایسا کیسا! ابھی ایدر آیا ہے تو تھوڑا بیٹھے گا، تھوڑا کھائے گا، پئے[...] گا۔ اپن کا بھاگ کھلا ہے جو دادا اِدھر آیا ہے۔"

"دینا! ابھی زیادہ دارو تو نئیں چڑھایا ہے؟" پیرو نے دھمکی آواز میں کہا۔

"تم کو دیکھ کے ابھی نشہ سالا کدھر کو رہنے کا ہے۔"

"ہاں ابھی ٹھیک ہے اپن کا بات سننے کا ہے، اپن ابھی چلا جائے گا[...] پورا باٹلی چڑھانا کہ بالٹی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے دادا! پر پہلے ایدر آکے بیٹھو۔"

"اپن کو ایک جگہ ابھی اور جانے کا ہے۔ ایدر اپن الٹا ٹیم پہ بھی آیا[...] تمھارا مستی کا ٹیم ہے۔"

"تمھارے لیے کیا ٹیم دادا! تم تو مالک ہے۔"

"ہا، سالا!" پیرو نے زمین پر تھوک دیا۔ "تم اکھا حرامی ہے۔ ابھی مالک بولتا ہے۔ ابھی پیچھے تم کیا سمجھا تھا، سمجھا تھا کہ دادا مر گیا، دادا خلاص ہو گیا تم کو ایدر چھوڑ کے دادا اکلا چلا جائے گا، ہاں! کیا سمجھا تھا تم؟"

"نئیں نئیں دادا! ابھی کیسا بولتا ہے۔ پہلے اپن کا بات سنو، تھوڑا دھیرج سے بیٹھو تو کوئی بات کرے۔"

"اپن سننے کو نئیں، بولنے کو آیا ہے۔" پیرو نے جھڑکتے لہجے میں کہا۔ "[...] کو کل دوپہر ۱۲ بجے تک کا ٹیم دیتا ہے، بارہ بجے کے پیچھے ابھی اُودر پاڑے[...] پر دو کڑا بھیج دے گا، نئیں بھیجنے کا ہے تو اپن ایدر ہی کھڑا ہے۔"

"ضرور کسی کتے کے بچے نے تمھارا کان بھرا ہے۔ پہلے اپن کا بات[...] سُن لو دادا۔"

"دو سڑا ملنے پہ اپن ایک دم مُننے گا۔" پیرو نے چشم زدن میں چاقو نکال [...]یا اور دینا کی طرف اُچھالتے ہوئے بولا۔ "اپن بمبئی آگیا ہے دینا! تم کو کوئی [...]نک پڑا ہے تو ابھی دُور کر سکتا ہے۔"

چاقو زمین پر گر جاتا مگر دینا نے جھک کے چابک دستی سے اُچک لیا۔ [...]چاقو بند کر کے اُس نے پیرو کی طرف بڑھا دیا اور بے حس و حرکت اُسے دیکھتا رہا۔ کمرے میں موجود ہر شخص ساکت کھڑا تھا۔ "ابھی کوئی اور ہے تو اپن [...]ایدر ہی ہے۔ چلا جائے تو بعد کو بولیاں مت بولنا۔"

کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ پیرو نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور [...]ٹ کے کمرے سے نکل آیا۔ چند قدم جانے کے بعد اُسے کچھ خیال آیا، وہ دوبارہ [...]ن کی طرف گیا، سب جوں کے توں کھڑے تھے۔ پیرو نے چمی کا نام پکارا، پختہ [...]رنگ والی سمٹی سمٹائی سامنے آگئی۔ اُس کے سلام کرنے سے پہلے پیرو نے [...]یب میں ہاتھ ڈال کے اُس کے ہاتھ میں کچھ تھما دیا، پیرو کی مٹھی بند تھی۔ چمی [...]نے بھی مٹھی بند ہی رکھی اور جھک کے دوبارہ پیرو کو سلام کیا۔

باہر ٹم ٹم ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔ ہم قلابے پہنچے تو ڈیڑھ بج [...]رہا تھا۔ قلابے کے پاڑے پر اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن پیرو کو وہیں گودی والا [...]مائی پاڑے کا ایک آدمی نظر آگیا۔ اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ پاڑے کے دادا [...]بارجی نے کچی شراب اور جوئے کا ایک اور ٹھکانا بنا لیا ہے۔ یہاں کا پاڑا خاصا [...]بدنام ہو گیا تھا، پولیس آئے دن جارجی کو پریشان کرتی تھی اِس لیے جارجی دوسری [...]جگہ بیٹھنے لگا ہے۔ وہ دوسرا ٹھکانا بھی زیادہ دُور نہیں تھا۔ ٹم ٹم بھی ہم نے [...]نہیں چھوڑی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ یہ سمندر کے کنارے کنارے جھونپڑیوں [...]اور کچے پکے مکانوں پر مشتمل علاقہ تھا۔ مچھلی کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ٹم ٹم [...]ہمیں پہلے روکنا پڑی، باقی راستہ ہم نے دو تین اندھیری گلیوں سے گزر کے [...]طے کیا۔ گودی والا ہمارے ساتھ تھا۔ گلی میں اندر آکے وہ ایک جگہ رُک گیا۔ یہاں [...]گلی ختم ہو جاتی تھی۔ سامنے کی کوٹھری پر گودی والا کی تیسری دستک سے دروازہ [...]کھل گیا۔ یہ کوٹھری بس دیکھنے کی تھی۔ اندر ایک اور دروازہ تھا، وہاں کے آدمی [...]نے کسی تامّل کے بغیر دروازہ کھول دیا۔

دروازے کے پار منظر ہی دوسرا تھا، میری آنکھوں کے لیے ایک تماشا [...]سا۔ بمبئی میں ایسا کوئی ٹھکانا میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ دروازے سے کچھ [...]فاصلے پر ایک کشادہ ہال بنا ہوا تھا، کھلا ہوا بے در ہال۔ اوپر بانسوں اور لکڑیوں [...]پر ٹکی ہوئی ٹین کی چھت، نیچے اینٹوں کا پختہ فرش۔ اندر کرسیاں، میزیں اور [...]بنچیں فاصلے فاصلے سے پڑی ہوئی۔ ایک طرف ایک بڑے کاؤنٹر کے آگے [...]اونچے اونچے اسٹول۔ تمام ساز و سامان رنگین، یہاں تک کہ بانس اور چھت [...]سب مختلف رنگوں میں رنگے ہوئے۔ اُس وقت وہاں زیادہ آدمی نہیں تھے مگر

چہل پہل کم بھی نہیں تھی۔ خالی میزوں اور کرسیوں کی تعداد سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ کتنے لوگ وہاں آتے ہوں گے۔ ہال کے چاروں طرف کھلی جگہ تھی اور کھلی جگہ کے ساتھ چھوٹی بڑی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کوئی کھلی ہوئی، کوئی بند۔ گیس کی لالٹینوں اور ہنڈوں کی روشنی میں بیٹھے ہوئے گنتی کے آدمیوں کے سامنے بوتلیں اور گلاس رکھے تھے اور تاش پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کے گرد نخنے اُچھل کود کر رہے تھے۔ ہال میں دو عورتیں اُن آدمیوں کے بیچ میں گھسی بیٹھی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کاؤنٹر پر بھی موجود تھی۔ اِدھر اُدھر چند اور آدمی بھی ایک دوسرے سے بے نیاز الگ الگ بیٹھے تھے۔ پیرو ہال کے باہر کھڑا تعجب سے دیکھتا رہا۔

"ابھی کیا دادا! ابھی جاتا ٹیم پہ آیا ہے۔ دن بھر ایدر سالا میلا لگتا پڑا ہے اور سورج ڈوبنے پہ نہ پوچھو کیسا مارا ماری ہوتا ہے، سالا بیٹھنے کا جگہ نئیں ملتا۔"

پیرو کا تجسس بھانپ کے گودی والے کا حوصلہ بڑھا۔ اُس نے بتایا کہ جو لوگ ہال میں بیٹھنا نہیں چاہتے، اُن کے لیے وہ اطراف میں بنی ہوئی کوٹھریوں کا انتظام ہے۔ ایک طرف کی کوٹھریوں کے دروازے ساحل کی طرف کھلتے ہیں، جگہ نہ ملنے پر یہاں سے گزر کے لوگ ساحل پر چلے جاتے ہیں۔ وہاں بھی دارو اور جوئے کا شغل رہتا ہے۔ شام کو کچھ عورتیں بھی آجاتی ہیں۔ کوئی ناچتی ہے، کوئی گاتی ہے، کوئی یوں ہی دارو پینے والوں کا دل بہلاتی ہے، خوش فعلیاں کرتی رہتی ہے۔

گودی والے کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ پیرو نے اُسے روک دیا اور درمیان کی تین گزی کے قریب کھلی جگہ کا فاصلہ طے کر کے ہال میں داخل ہوا۔ الگ الگ مختلف میزوں پر بیٹھے ہوئے دو آدمی پہلے تو ہمیں دیکھ کے چوکنا ہوئے اور جب ہم کاؤنٹر کی طرف بڑھے جہاں تیز روشنی تھی تو وہ دفعتاً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی کٹے ہوئے سرمئی بالوں اور تیکھے نقش و نگار والی عورت نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا، اُس کی عمر ۳۰، ۳۵ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ پہلے تو اُس نے منہ بنایا لیکن پھر اُس کی چیخ سے سارا ہال گونج اُٹھا۔ "ہے دادا! اپن کا دادا!" اُس کی والہانہ صدا سے سبھی کی نظریں ہم پر مرکوز ہو گئیں، کوئی بھی بیٹھا نہ رہ سکا۔

"ابھی کیسا ہے ماری تم؟......" پیرو کے لہجے میں اشتیاق شامل تھا۔

"اپن تو ٹھیک ہے پر تم، تم؟......" اُس نے سرخوشی سے تالی پیٹی اور اپنے ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ "اپن کیا دیکھتا پڑا ہے۔" وہ آنکھیں مسلتے ہوئے بولی۔ "کیدر سپلا گیا تھا۔ اپنا ماری کو بھی بول کے نئیں گیا۔"

"جلتے ٹیم جلدی میں تھا ماری!"

"اتنے دن کیدر چھپا رہا؟ لوگ سالا ایدر سیدھا اُلٹا بولتا تھا۔ بائی گاڈ، اپن کتنا پرے (PRAY) کیا۔ فادر جانتا ہے کہ اپن پیرو دادا کے لیے اُس کو کیا بولتا تھا۔"

"اپن جاناہے ادھر جبھی تو اپن لوٹ کے آگیا۔" پیرڈ نے ہنس کے کہا۔ "بچہ لوگ ابھی کیسا ہے؟"

"ایک دم آل رائٹ۔" ماری چہک کے بولی "ہر فورٹ نائٹ اپن اُس کو پونا دیکھنے کو جاتا ہے۔ دونوں اودر بہت ہیپی ہے۔ پرداد! اپن سوچتا ہے کیا پتہ، تھوڑا پڑھ لکھ کر اپن کو پہچانے بھی کہ نئیں۔"

"نہ پہچانے سالا پر رہے گا تو ٹھیک۔" پیرڈ نے بے پروائی سے کہا اور ماری کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "پر تم ابھی کیسا ہے؟ رنگ تھوڑا کالا کرلیا ہے؟"

"ابھی اور کالا ہوجائے گا دادا!" ماری کی آواز بدل گئی "ابھی کیا دیکھتا ہے۔ اتنا کالا ہوجائے گا کہ ابھی نظر بھی نئیں آئے گا۔"

"ایسا کیا بات ہے ماری؟" پیرڈ نے نرمی سے پوچھا۔

"بات کیا ہوئے گا دادا!" ماری نے سر جھکا لیا۔ اُس کی آواز ہی نہیں، چہرہ بھی بگڑنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، معاً اُسے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک اندر کھڑی ہے، اُس نے گلے میں پڑی ہوئی ڈوری کھینچ کے ایپرن اتاری اور جھٹ کاؤنٹر چھوڑ کے باہر آگئی۔ وہ لمبے قد اور متوازن بدن کی عورت تھی، اسکرٹ پہنے ہوئے۔ ہال میں سبھی لوگ ابھی تک کھڑے تھے۔ ماری نے گرجتے ہوئے اُن سے بیٹھ جانے کو کہا اور بیروں کو پھٹکارنے لگی "جانتا نئیں، ابھی کوئی تمھارا باپ آیا ہے۔" اُس نے اُن سے سامنے کی میز صاف کرنے اور جو کچھ ہے، سب کا سب اٹھا لانے کو کہا۔ "ابھی ایدر اپن کے پاس ولایتی بھی ہے۔" ماری نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان پیرڈ سے پوچھا "جو کر چلے گا کہ کالا کتا؟"

پیرڈ نے اُسے منع کیا کہ وہ زیادہ دیر کے لیے نہیں آیا۔

"ایسا کیسا ہوئے گا۔" ماری ناگواری سے بولی "اتنے دن بعد آیا ہے اور ایدر تو پہلا دفعہ۔ تھوڑا کھاپی کے جانے کا ہے۔ اپن کیا بولے، اپن کو تمھارا کیسا انتظار تھا۔ اُودر پاڑے کا لوگ باگ بولا ہوگا، اپن اودر دو دفعہ پاڑے کا طرف بھی گیا تھا۔"

پیرڈ نے اُسے بتایا کہ ابھی وہ اپنے پاڑے کی طرف گیا ہی نہیں۔

"پاڑے نہیں گیا، سیدھا ایدر کو آیا ہے۔"

"ہاں، ابھی سمجھو سیدھا ایدری کو آیا ہے۔" پیرڈ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اپن کو جارجی سے تھوڑا کام ہے۔ کیدر ہے وہ؟"

"کون سا... جی؟" ماری ہونٹ سکوڑ کے بولی۔

"کیا بولتا ہے؟" پیرڈ نے ترشی سے کہا۔

"ابھی جس جارجی کو تم پوچھنے آیا ہے، وہ ایدر نئیں ہے۔ ایدر دوسرا جارجی ہے۔"

پیرڈ نے ایک لمبی ہنکاری بھری۔

"جس جارجی کو تم نے اپن کا ہاتھ دیا تھا، وہ ابھی کیدر ہے... ہوگیا دادا!" ماری کی آواز ٹوٹنے لگی۔

"اپن سمجھتا ہے ماری، اپن خوب سمجھتا ہے اور ابھی اسی لیے ا..." پیرڈ نے بھری ہوئی آواز میں کہا "ابھی کیدر ہے وہ؟"

"ایدری ہے۔"

"ایدری کیدر؟"

"ایدر کسی ڈربا میں الٹام پڑا ہوگا سالا۔"

"جا کے اُس کو بول دے، اپن اُس کو دیکھنے کا ہے، ابھی سینگ کو نکل آیا ہے۔"

بیروں نے بوتلیں، گلاس، بھنا ہوا گوشت اور مونگ پھلی... کیا میز پر رکھ دیا۔

پیرڈ کا ہاتھ پکڑ کے ماری کرسی پر بیٹھنے کے لیے اصرار کر... "اپن کو جلدی ہے ماری! اُس کو جا کے بول دے کہ دادا آیا ہے۔" پ... تند لہجے میں کہا۔

"ابھی کس کو بولے دادا!" ماری کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل...

"وہ دو باٹلیاں لے کے اُودر کوٹھری میں بند پڑا ہے۔"

"دو باٹلیاں لے کے؟"

"دوسرا ابھی ابھی باٹلی مافک ہے دادا! دونوں کا نشہ ہوتا..." ماری روہانسی ہوگئی۔

"اور تُو ایدر کائے کو بیٹھا ہے؟"

"اپن تو پرانا ہوگیا۔ دونوں باٹلی میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے دا... ہلنے پہ ایک کا نشہ بڑھتا ہے، ایک کا اترتا ہے۔"

"وہ تیرا سامنے چھوکری لوگ کو لے جاتا ہے اور تُو دیکھتا پڑا ہے... ابھی گیدڑ کا اولاد کب سے ہوگیا؟"

ماری کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ "اپن کا ٹائم نکل گیا دادا!... ٹائم کا بات ہوتا ہے۔" وہ ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہنے لگی کہ جارجی اتنی تیز... آگے بڑھا کہ وہ دیکھتی رہ گئی۔ اُس نے جارجی کو لوٹانے اور اُس کے سا... کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہار گئی۔ "اپن ابھی کیا کرتا۔" وہ گرفتہ آوا... بولی "اپن جارجی دادا کو جانتا تھا، جارجی سیٹھ کو نئیں، بھڑوا جارجی کو... جانتا تھا۔"

"ابھی بھڑوا ابھی بن گیا وہ؟" پیرڈ چونک کے بولا۔

"ایدر پھر تم کیا دیکھتا پڑا ہے۔" ماری زہرخند سے بولی "ابھی ... کنجری لوگ بیٹھا ہے۔ بہت سا کوٹھری میں بند ہے اور بہت سا ایدر... کے ساتھ اُن کے ٹھکانے پر چلا گیا ہے۔ اکھا آدھا پگار کا پارٹنر ہے جار... ابھی فارس رڈ سے کئی کنجری لوگ اُٹھ کے ایدر آنڈو بازو آ کے بس گیا..."

...پیورٹ چھوکری لوگ الگ ہے۔ جارجی پہلے اُن کا ٹرائی کرتا ہے، پھر ایدر دھندا ...رنے کا لائسنس دیتا ہے۔"

...پیرڈ کی آنکھوں سے اضطراب جھلک رہا تھا۔ "ابھی جارجی ایسا کتا، ...دادا سے کتا کیا بن گیا ماری!"

ماری بہ مشکل اپنے آنسو روک سکی۔ ٹوٹی پھوٹی آواز میں بتانے لگی کہ کچھ عرصے پہلے اپنے ایک رشتے دار وکی کی موت پر جارجی گوا گیا تھا، دس پندرہ روز قیام کے بعد واپس آیا تو بالکل بدلا ہوا تھا لیکن ماری نے حوصلہ افزائی نہیں کی۔ چند مہینے بعد وکی خود بمبئی آگیا۔ پیرڈ اس دوران بمبئی میں نہیں تھا۔ ماری نے اُس کے پاڑے کا چکر بھی لگایا لیکن ناکام واپس آئی۔ کوئی پیرڈ کا پتہ بھی اُسے نہ بتا سکا۔ اُس زمانے میں پیرڈ کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں بمبئی میں گشت کر رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ پیرڈ کو ختم کرکے ماچھی اُس کے پاڑے پر قابض ہوچکا ہے یا پیرڈ کہیں مارا گیا ہے اور ماچھی اُس کی موت کو چھپا رہا ہے۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ پیرڈ بہت سوں سے کہہ سُن کے گیا ہے۔ ماچھی نہ تو یہ افواہیں روکنے میں کامیاب ہوسکا، نہ شہر کے پاڑوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھ سکا۔ گو ابھی تک صرف تین پاڑوں نے ہفتا بند کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن دوسرے پر بھی ماچھی کا اثر کم ہو رہا تھا۔ اِس کی وجہ خود ماچھی تھا، اُس کی ناتجربہ کاری، مزاج کی تیزی۔ لوگ اُس سے خار بھی کھاتے تھے کہ پیرڈ کو اپنے اتنے بڑے پاڑے کی نگرانی کے لیے ماچھی ہی کیوں نظر آیا، وغیرہ وغیرہ۔

جارجی نے وکی کو روک لیا اور اُس کی مدد سے اُس نے سستے داموں یہ جگہ حاصل کی۔ یہاں علاقے میں پہلے سے شراب کی بھٹیاں کام کر رہی تھیں اور یہ جگہ ساحل پر ہونے کی وجہ سے زیادہ دل کش اور محفوظ تھی۔ وکی نے یہ کوٹھریاں خاص طرز سے بنائیں تاکہ ایک تو پولیس کی نظروں سے اوجھل رہیں، دوسرے تخلیہ چاہنے والوں کو دور نہ جانا پڑے۔ پولیس چھاپے کی صورت میں فرار کے کئی راستے تھے اور پولیس آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ جارجی نے ہر طرف کا خیال رکھا تھا۔ پانچ مہینے پہلے یہ کام شروع کیا گیا تھا۔ دو مہینے میں سب کچھ تیار ہوگیا اور پیسہ بھی کوئی خاص صرف نہیں ہوا۔ جارجی کو اندازہ نہیں تھا کہ وکی نے اُس کے لیے سونے کا درخت لگا دیا ہے۔ وکی نے ہر چیز کے نرخ بھی خود طے کیے اور واجبی۔ وکی کے مشورے پر جارجی نے شہر کے بعض منتخب دادا خرید کے اس عشرت کدے میں تعینات کردیے۔ بائی کلا اور اندھیری کے داداؤں کو بھی اُسی نے ورغلایا اور پیرڈ کے پاڑے سے وابستگی ختم کرنے میں پہل بھی اُسی نے کی۔ ماچھی نے جانے کیا سوچ کے یہ اہم بات درگزر کردی۔ اِس سے جارجی اور شیر ہوگیا۔ کئی موقعوں پر ماری نے ایک بیوی کی حیثیت سے اُسے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جیسے جیسے جارجی بڑھ رہا تھا، ماری چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے اپنے دونوں بچوں کو پونا کے ہوسٹل میں داخل کرا دیا تھا، اُن کے لیے اُسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اِدھر اُدھر خواری کے خوف سے ماری کے بہ قول وہ اپنے شوہر کا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آگئی اور اب کاؤنٹر پر بیٹھی شرابیوں کے لیے پیمانے بناتی ہے اور کنجریوں کی پگار کا حساب رکھتی ہے۔ جارجی کے متعین کیے ہوئے دادا یہاں آنے والوں کو بے قابو ہونے سے روکے رکھتے ہیں۔ جارجی کی دیکھا دیکھی باندرے کے دادا نے بھی ایسی ایک جگہ کھولنا چاہی تھی لیکن جارجی کے زرخریدوں نے شروع ہی میں سب کچھ تہس نہس کردیا۔ جارجی اب قلابے کے پاڑے میں دن کے وقت بس چند گھنٹوں کے لیے بیٹھتا ہے اور تیسرے چوتھے دن علاقے کا چکر لگاتا ہے، اُس نے ایک پرانی موٹر خرید لی ہے۔ روز شام کو وہ یہاں آجاتا ہے اور پیتا رہتا ہے۔ رات گئے کسی بھی کوٹھری میں جا کے ڈوب جاتا ہے اور اکیلا نہیں۔ ماری بتا رہی تھی کہ تقریباً روز کا یہی معمول ہے۔

"پر سب تیرا کھوٹ ہے ماری!" پیرڈ بھنائی ہوئی آواز میں بولا۔ "بھول گیا، اپن نے تجھ کو شادی میں ابھی کیا جہیز دیا تھا؟"

"اپن نے سنبھال کے رکھا ہے۔"

"ابھی کائے کو دیا تھا، ایسا دبا کے رکھنے کو؟ زنگ لگانے کو نئیں! تُو ابھی اُس حرامی کا آنکھ کیوں نئیں نکال باہر کیا؟"

"پر دو بچہ ابھی تم نے نئیں دیا تھا۔"

پیرڈ جزبز ہو کے رہ گیا۔ "کون سا کوٹھری میں ہے ابھی وہ کُتیا کا جنا؟" اُس نے آتشیں آواز میں پوچھا۔

ماری نے دریدہ دزدیدہ نگاہوں سے ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔

پیرڈ فوراً کرسی سے اُٹھ گیا اور ماری نے جس کوٹھری کی نشان دہی کی تھی، تیز قدموں سے اُس کی جانب بڑھا۔ ماری چلانے لگی "نئیں دادا نئیں! اپن کا بات سنو۔ ابھی یہ ٹائم نئیں۔ ابھی تم ایدر آگیا ہے تو اپن کو ابھی کوئی فکر نئیں ہے۔"

پیرڈ نے توجہ نہیں دی لیکن ماری نے بھاگ کے اُس کا کرتا پکڑ لیا اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کے تڑپتی بلکتی آواز میں بولی "یہ ٹائم ٹھیک نئیں ہے دادا! ابھی بہت ٹائم آئے گا۔"

"ہٹ جا ماری! اپن تیرا نئیں، ابھی اپنا حساب کے لیے آیا ہے، تیرا تو بعد میں چکتا کرے گا۔"

"ابھی تو اُس سے بات بھی نئیں ہوئے گا دادا! وہ شام سے پی رہا ہے۔"

"اپن دیکھ لیتا ہے، پر تو ایدر سے ہٹ جا۔" پیرڈ نے اُس کا بازو پکڑ کے ایک طرف ہٹا دیا، ماری فیل مچانے لگی "ابھی زیادہ لفڑا کیا تو اپن پہلے تجھ کو......" پیرڈ نے جھنجلا کے کہا۔

اتنی دیر میں چار آدمی کوٹھری کے گرد پہنچ گئے، اُن کے تیور ٹھیک

نظر نہیں آ رہے تھے۔ ماری دم بہ خود سی الگ کھڑی ہو گئی۔ پیرو نے بھی اُن لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔ پیرو آگے بڑھا تو اُن میں سے چوڑے ڈیل کا ایک آدمی کوٹھری کے دروازے پر ٹانگیں پھیلا کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں کھُلا ہوا چاقو تھا۔

"تیرا ایدر ابھی کوئی نئیں ہے کیا؟" پیرو نے درشتی سے کہا۔ اُس کی آواز حیرت انگیز حد تک تھمی ہوئی تھی۔ قریب جانے کے بجائے اُس نے رُک کے دروازے پر پھیلائے ہوئے آدمی سے کہا کہ وہ سامنے سے ہٹ جائے۔

"جب تک اپن ایدر ہے، تم ایسا اندر نئیں جا سکتا۔"

"پر تو ہے ابھی کتنا دیر کا۔"

اُن کی تعداد چار تھی۔ باقی تین نے دروازے کے پاس ہی حصار سا بنا لیا تھا۔ پیرو دروازے والے آدمی کے سر پہ پہنچ گیا۔ تھل اور میں بھی چند قدم آگے ہو گئے۔ دروازے کے پاس جا کے پیرو ٹھیر گیا اور ماری کی طرف منہ کر کے بولا۔ "ماری! ابھی اِسی لوگ کو پیسہ دے کر جارجی نے خریدا ہے، اِن کو تو چاقو پکڑنا بھی......" پیرو نے ابھی بات مکمل نہیں کی تھی کہ دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی کی کلائی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ پیرو کے جسم میں یکایک ایک لہر سی اُٹھی تھی، میری بینائی کے لیے وہ پلک جھپکنے کی کوئی غفلت تھی یا کسی جھماکے کی خیرگی۔ عین وقت ماری سے پیرو کے مخاطب ہونے کے سبب دروازے پر سینہ تانے اور چاقو اُٹھائے ہوئے آدمی کی توجہ بھی ایک لحظے کے لیے سہی مگر منتشر ہونی چاہیے تھی، پیرو کو اِسی لمحے کی ضرورت تھی۔ اُس نے منہ پھیرے پھیرے جھپٹتے ہوئے ہاتھ سے اُس کی کلائی پر پنجہ ڈال کے اتنی زور سے زمین پر جھٹکا دیا تھا کہ کوئی بھی نہ توازن قائم رکھ سکتا تھا، نہ ہوش بجا۔

پیرو کو شبہ تھا کہ دوسرا قریب کھڑا ہوا آدمی اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کے اضطراری حالت میں اُس کی طرف بڑھ سکتا ہے حالانکہ دوسرے آدمی کی طرف سے پیرو کو اتنی مہلت ضرور ملنی چاہیے تھی کہ وہ اُس کے ساتھی سے عہدہ برآ ہو سکے مگر وہ اٹھائی گیرے تھے۔ باقاعدہ کسی باڑے سے بندھے ہوئے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کوئی دادا ہوتا تو پیرو کے نمٹنے کا انتظار کرتا۔ وہ چاقو تانے پیرو کی طرف جھپٹا، پیرو نے اپنی گرفت کے آدمی کو چھوڑنے کے بجائے دوسری مرتبہ جھٹکا دے کے اُس کے سامنے ڈال دیا۔

دوسرے آدمی کے جھپٹنے اور پہلے آدمی کو اُس کے آگے ڈالنے میں ایک لمحے کا بھی فرق نہیں ہونا چاہیے تھا، ایک ایک لمحے کا حساب پیرو کے ذہن میں ہو گا جبھی اُس نے یہ اقدام کیا۔ ہر چند کہ اِس میں اُس کے لیے اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا اُس کے پنجے میں کسے ہوئے آدمی کو چاقو لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ دوسرے نے پیرو پر جھپٹنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ پیرو نے اِدھر پہلے کو جھٹکا دے دیا۔ دوسرا بڑھنے کا ارادہ کر چکا تھا، اُس کے لیے لوٹنا مشکل تھا۔ بس یہی ہے کہ مقابل کا کوئی ارادہ اپنے لیے بہتر معلوم ہو تو اُسے اور پختہ اور یقینی بنانے کی کوشش کی جائے۔ پیرو سے ایک لمحے کی جلدی ہو جاتی تو بڑھنے والے کو لوٹنے کے لیے کچھ وقت مل جاتا۔ اُسے یقین تھا کہ پیرو اُسے بڑھتا دیکھ کے ساتھی کو چھوڑ کے اپنے بچنے کی فکر کرے گا اور اُس سے کہیں چوک ہو مگر اُس کے وہم و گمان میں نہ ہو گا کہ پیرو اُس کے ساتھی کو جوں کا توں رکھے گا اور اُس میں اُس گراں ڈیل کو ہاتھ کے بل اٹھا کے پٹخنے کا زور ہے۔ اندازے کی غلطیاں ہی آدمی کو پشیمان کرتی ہیں۔ آخری لمحے میں متزلزل ہو جانا چاہیے تھا۔ بالکل آخری لمحے میں اُس نے خود پہ قابو پا ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کے کسی بے اختیار نشانے سے اپنے ساتھی کو بچا کی، وہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے اور اس پر گرتے گرتے رہ گیا۔ اُس نے ترچھ کے کسی اور طرف نکل جانا چاہا، پیرو نے اُچھل کے اُس کے کولھے پر ضرب وہ زمین پر لڑھک گیا کیونکہ پہلے ہی اپنا توازن استوار کرنے کی کشمکش تھا۔ جتنی دیر میں وہ زمین سے اُٹھتا، پیرو کی دوسری ضرب نے اُسے بے حال کر دیا۔ اُس کا چاقو آگے جا کے گرا۔

پیرو کو باقی دو کا بھی خیال ہو گا جو ایک ایک کر کے یا ایک ساتھ ٹوٹ سکتے تھے لیکن وہ پر تولے کھڑے رہے۔ اُن کے تامل کی ایک وجہ نہیں یہ اعتماد کہ اُن کے دو ساتھی کم نہیں پڑیں گے، یہ اطمینان کہ میں اور تھل الگ ہیں۔ اِدھر ماری نے پیرو کو روکنے کے لیے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ میری اور تھل کی خاموشی نے بھی ممکن ہے اُنھیں کچھ غیرت دلائی ہو۔ اُن کی مالکہ ماری سامنے کھڑی تھی، ایک عورت۔ دو اور عورتیں بھی موجود تھیں، کچھ دوسرے لوگ بھی اُن کے سامنے ذلت اُٹھانے کا کوئی احساس اُن پر غالب نہ آ گیا ہو۔ اُنھیں یہ خدشہ بھی ہو گا کہ اُن کی شمولیت پر میں اور تھل تماشائی نہیں بنے رہیں گے۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ ہمیں اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم نے تو چاقو بھی نہیں نکالے تھے۔ پیرو اکیلا ہی اُن کے لیے کافی تھا۔ دو چار مزید تو بھی پیرو کو کوئی دقت پیش نہ آتی۔ پھر اُنھیں موقع ہی کتنا ملا تھا۔ دیکھتے دیکھتے دونوں ہراول زمین پر پڑے کراہ رہے تھے۔ پہلے کا بازو شانے سے اکھڑ گیا ہو گا۔ اپنی گراں جسمی کے سبب اُسے چوٹ اور گہری لگنی چاہیے تھی۔ دوسرے کا جسم اتنا بھاری نہیں تھا لیکن شاید اُس کے سر پہ چوٹ لگی تھی، وہ بے دم سا ہو گیا تھا۔

چار پانچ آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی میں زیادہ حیلہ جوئی سے کام لینا پڑتا ہے۔ غلط تاثر دینا اور ایک دوسرے کے فیصلے منتشر کر دینا۔ ایک دوسرے کو اشاروں کا موقع نہ دینا اور پہلے ہی حملے میں دو ایک کو نیم جاں کر دینا۔ پھرتی کی ہر وقت اور ہر مرحلے پر ضرورت ہوتی ہے لیکن زیادہ آدمیوں میں دماغ کی کارکردگی کی زیادہ۔ کوئی اور وقت ہوتا تو پیرو اِس صورتِ حال کو کچھ اور طول دیتا۔ اچھے استاد اور دادا اِسے اپنی مشق سمجھتے ہیں۔ وہ پہلے مرحلے میں اپنا کاری داؤ نہیں آزماتے۔ آزمائشی پینترے بدلتے رہتے ہیں۔ مشق کا یہ ایک نہایت فطری طریقہ

ہے۔ پیرو نے اُنھیں بس لمحوں میں نمٹا دیا، ویسے وہ زیادہ وقت کے تھے بھی نہیں۔ پیرو کو آگے اُن کے سامنے جانا بھی نہیں چاہیے تھا۔ بہتر تھا کہ وہ مجھے اشارہ کر دیتا، بعد میں اُسے غالباً اِس کا احساس ہوا ہو۔

پیرو نے دوسرے کے کولھے پر دو ضربیں لگا کے تیسری ضرب دروازے پر لگائی۔ دروازہ چوپٹ کھُل گیا۔ اندر بہت دھیمی روشنی تھی۔ پیرو تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر سے بڑبڑاتی، چونکتی چیخیں سنائی دیں۔ چند لمحوں بعد ہی پیرو باہر آ گیا۔ وہ اپنے پنجے میں جارجی کی گردن دبوچے ہوئے تھا۔ سانولے رنگ اور سجل جسم کا جارجی دیکھنے میں نوجوان لگتا تھا، اُس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں، زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ تقریباً عریاں تھا۔ پیرو نے باہر آ کے اُسے زمین پر دھکیل دیا، وہ اوندھا گرا۔ جارجی بُری طرح بوکھلایا ہوا تھا اور جھپکتی پلکوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے اور کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماری ٹھیک کہہ رہی تھی، وہ شراب میں سرتاپا ڈوبا ہوا تھا۔ پیرو نے جب اُس کے بال پکڑ کے زمین سے اُٹھایا تو اُسے کچھ ہوش آیا۔ "دادا! پیرو دادا!" وہ بہکتی اٹکتی زبان میں بولا۔ "تم، تم ایدر؟" اُس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئی تھیں۔ پیرو نے اُس کے بال چھوڑ کے بے دریغ طمانچے مارنے شروع کر دیے۔ جارجی پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا، چند طمانچوں میں زمین پر لوٹ گیا۔ پھر اُس نے اُٹھنا چاہا تو پیرو نے ٹھوکر ماری۔ اِسی اثنا میں چادر لپیٹے، منہ چھپائے ایک عورت ٹھٹکتی ہوئی کوٹھری سے برآمد ہوئی اور بے تحاشا ایک طرف بھاگ گئی۔ وہ بھاگتی چلی گئی۔

پیرو نے کچھ توقف کیا اور مضطرب نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ تھل نے آہستہ سے پاس جا کے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا اور اُسے میری طرف لے آیا۔ جارجی دوبارہ زمین سے اُٹھ گیا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تگ و دو کرنے لگا، وہ کھڑا بھی ہو گیا۔ اب کسی حد تک اُس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا لیکن اُس کی حالت اِس لائق نہیں تھی کہ اُس سے کچھ کہا سُنا جا سکتا۔ اُسے خود ہی سب کچھ سمجھ لینا چاہیے تھا۔ پیرو نے بھڑکتی آواز میں ماری کو مخاطب کیا اور وہی کچھ کہا جو اُس نے بائی کلا کے دادا دینا سے کہا تھا۔ اور اُس کو بول دینا کہ کل سے ایدر ایک بھی کنجری لوگ نئیں آئے گا۔ بھڑواگیری کرنا ہے تو ابھی اِس کو سیدھا فارس روڈ بھیج دے گا۔" پیرو نے ماری کو تاکید کی۔ "اپنے باڑے پہ آنے سے پہلے جارجی قلابے کا باڑے نئیں جائے گا، سمجھا؟" ماری ہیجانی انداز میں سر ہلانے لگی۔

جارجی گنگ کھڑا پیرو کو گھور رہا تھا۔ پیرو نے ایک جانب دبکے ہوئے گڈی والے کو اشارہ کیا اور اُسی کوٹھری کی طرف چل پڑا جس سے ہم اندر آئے تھے۔ ہم کوٹھری سے نکل آئے تھے، ماری کی صدائیں سُن کے ٹھیر گئے۔ ماری دوڑتی ہوئی گلی میں آ گئی۔ پیرو کے قریب آ کے وہ کسی مجرم کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اُس کا سارا بدن ہانپ سا رہا تھا۔

"ابھی کیا ہے ماری؟" پیرو نے برگشتگی سے پوچھا۔

"دادا! ابھی ابھی اپن سے کوئی غلطی ہو گیا ہے کیا؟" وہ دھڑکتے ہونٹوں سے بولی۔

پیرو کا جسم بَل کھا گیا۔ اُس نے بڑھ کے دونوں ہاتھوں سے اُس کا سر پکڑ لیا اور ماتھے کو بوسہ دیا۔ "غلطی اپن سے ہوا ہے۔" وہ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "جو اِس حرامی کا ہاتھ میں تیرا ہاتھ دیا، پر اپن ابھی آ گیا ہے جانی!"

ماری اُس کے شانے پر سر لگائے سسکتی رہی۔

ٹرام ابھی مین روڈ سے باڑے کی چوڑی گلی میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ اُنھوں نے ہمیں آ لیا۔ چار بجنے والے تھے۔ سڑکوں پر سناٹا طاری تھا، گھوڑے کی ٹاپیں دُور دُور تک گونج رہی ہوں گی اِسی لیے وہ بھاگتے ہوئے سڑک پر آ گئے تھے۔ اُنھیں جیسے یقین تھا کہ آنے والی ٹرام میں ہمارے سوا کوئی نہیں ہو گا۔ بس ہم پر نظر پڑنے کی دیر تھی، ہر طرف شور پھوٹ پڑا، ہم وہیں اُتر گئے۔ اُن کی چیخ پکار سُن کے گلی کے اور بہت سے آدمی بھی جیسے گجر سُن کے اپنی کمیں گاہوں سے نکل آئے۔ ماچھی گلیا، لچھمی، شامو، جمرو، ٹنگو، چھیدا، شمّے، لکھے، زورا اور جانے کون کون۔ اُن سب نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور اُچھلنے کودنے لگے۔ طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے۔ اُن کے چہروں پر خون تمتما رہا تھا، چمکتی آنکھیں، دھڑکتے سینے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پیرو کوئی بہت بڑی مہم سر کر کے لوٹا ہو، جیسے وہ اُس کی آمد سے قطعی مایوس ہو چکے ہوں۔ اُنھیں کہاں اندازہ تھا کہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ کس قدر درست ہیں۔

باڑے کی عمارت روشنیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بالکل رت جگے کا منظر تھا۔ عمارت کے ساتھ باہر لمبے چبوترے پر دری بچھی ہوئی تھی۔ رات بھر وہ یہیں بیٹھے ہمارا انتظار کرتے رہے ہوں گے۔ چبوترے کے پاس گلی اور سڑک کے نکڑ پر شرفی دادا کی چائے اور پان کی دکان اب تک کھُلی ہوئی تھی۔ اُن کا زور نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہم تینوں کو کندھوں پر سوار کر کے باڑے میں لے جائیں۔ شور غل سے گرد و پیش کے سوئے ہوئے مکان بھی جاگ گئے، دروازوں اور کھڑکیوں سے لوگ جھانکنے لگے۔ اندر باڑے کا دالان، صحن اور برآمدہ بھی تیز روشنیوں سے منور تھا۔ درمیان میں پیرو کی خالی چوکی چاندنی بچھائے پیرو کی منتظر تھی۔ تھل کے لیے حقہ بھی رکھا ہوا تھا۔ پیرو نے چوکی پر قدم رکھنے سے پہلے تھل کے لیے جگہ چھوڑ دی، تھل نے کوئی تعرض بھی نہیں کیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہ مٹھائی کے ٹوکرے اور ہار پھول لے آئے۔ پھول اِس قدر تھے کہ چوکی پر جگہ جگہ پتیاں بکھر گئیں۔ ایک ایک شخص آ کے تھل اور پیرو کے پیر چھونے لگا۔ تھل اُن کے سلام

کے جواب میں کبھی اُن کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتا، کبھی سَر پر اور کبھی زانو پر۔ پیرو کسی کے گال کی چٹکی بھر لیتا، کسی سے سَر ٹکرا دیتا اور کسی کے سینے پر مکّا مار دیتا۔ اُن کے ہاتھ میرے پیروں کی طرف بھی بڑھے تھے اسی لیے میں ماچھی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھ گیا تھا۔ بالے بھی میرے پہلو میں تھا۔ تھوڑی دیر میں صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔

صبح تک سارا دالان لوگوں سے بھر چکا تھا۔ اُن میں پاس پڑوس کے بہت سے لوگ بھی شامل تھے۔ وہ اُمڈتے اور ہمکتے ہوئے آتے، آتے ہی اشتیاق و اضطراب سے پیرو کو سلام کرتے، اُس کا حال پوچھتے۔ اُس کی کمی محسوس ہونے کا ذکر کرتے اور پوچھتے کہ آخر اتنے دن اُس نے کس معرکے، کس مجبوری میں لگا دیے؟ پیرو ہنس ہنس کے ٹالتا رہا، کہتا رہا کہ بہت دُور گیا تھا، ایدر سے بہت دُور۔ کیا بتائے، کبھی بتائے گا۔ اُسے بہت سے محلّے داروں کے بلکہ اُن کی عورتوں اور بچّوں کے نام بھی یاد تھے۔ وہ ہر ایک سے پوچھتا کہ اُس کے پیچھے کسی نے انھیں پریشان تو نہیں کیا؟ کوئی اُسے اپنی ماں کے مرنے کی خبر سناتا، کوئی اپنے بچّے کی بیماری کی۔ کسی کے ہاں چار بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا تھا، کسی سے زندگی روٹھ گئی تھی، کسی پر بہت مہربان ہو گئی تھی۔ وقت نے کہیں کچھ تماشا کیا تھا، کہیں کچھ۔ وہ اُسے اِس طرح سب کچھ سنا رہے تھے جیسے بس آج کا دن ہے، پھر وقت نہیں ملے گا۔ گویا اُنھیں دھڑکا ہو کہ پیرو پھر کہیں نہ چلا جائے۔

اب ہر طرف اُجالا پھیل چکا تھا اور جیسے جیسے اُجالا بڑھ رہا تھا لوگوں کی آمد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ سلسلہ ختم ہونے والا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ درمیان میں پیرو نے تجمل سے اور مجھ سے کچھ دیر کسی کمرے میں آرام کر لینے کو کہا لیکن ایسے میں نیند کیسے آ سکتی تھی اور اب نیند کا کون سا وقت رہ گیا تھا۔ سات بجے کے قریب پاڑے کے آدمی ناشتے کا اہتمام کرنے لگے۔ وہ کسی برات کی دعوت کی طرح سرگرم نظر آتے تھے۔ پھر اتنے بہت سے لوگوں کے لیے مٹھائی، حلوہ پوری، ترکاری اور چائے پر مشتمل ناشتے کا اہتمام اُنھوں نے اتنی جلدی نہ جانے کیسے کر لیا۔ ناشتہ ختم ہوتے ہوتے آٹھ بج گئے۔ پیرو کے جلد اُٹھنے کے آثار نہیں تھے۔ میں نے سوچا، تجمل کو یاد دلاؤں کہ اسپتال میں مریضوں سے ملنے کے لیے آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک کا وقت مقرر ہے لیکن یہ سوچ کے خاموش رہا کہ تجمل کو خود خیال ہوگا۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے، پاؤں پھیلائے، حقّے کے کش لگا رہا تھا اور آنے والوں کے طرح طرح کے فسانے سُن رہا تھا۔ گلیا دیر تک اُس کے پیر دباتا رہا تھا۔ ٹم ٹم کے پاڑے کی طرف آتے وقت میرے جی میں آیا تھا کہ درمیان میں کہیں اُتر کے گھر چلا جاؤں۔ اُس وقت تو پھر بھی ٹھیک تھا مگر اب وقت اور نکل چکا تھا۔ وہ ساری رات جاگتی رہی ہوں گی، کسی نے ہمارے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا، بار بار ابّا جان سے پوچھتی ہوں گی لیکن ابّا جان کیا بتا پاتے ہوں گے۔ ممکن ہے، مولوی اکرم نے یہ دیکھ کے انھیں مجید کے ہوٹل کا سارا قصّہ سُنا دیا ہو اور لوگ ہماری غیر حاضری کو اسی سلسلے کی کوئی کڑی سمجھ رہے ہو[ں]۔ ابّا جان کو جولین کا گھر نیز ہمارا کوئی اور ٹھکانا بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ہماری [تلاش] میں نکل کھڑے ہوتے۔ مولوی اکرم، منیر علی اور وہ بار بار باہر سڑک پر آ[تے] گے۔ میں کہیں بیچ میں ٹم ٹم سے اُتر جاتا تو ٹھیک تھا مگر مجھے کچھ اچھا [نہیں لگا]۔

پیرو کے خیال کے علاوہ حیدر آباد سے تعاقب میں آنے والے بھی [میرے] ارادے میں رکاوٹ کا سبب بنے، وہ مارٹی کی اطلاع کے مطابق پا[ڑے] میں موجود تھے۔ اِس دوران مجھے لچھمی سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا [اُس] نے اُن کی پاڑے میں موجودی کی تصدیق کر دی تھی۔ اُس نے بتایا کہ دو[نوں] کو اوپر ایک خاص کمرے میں رکھا گیا ہے اور اُس کمرے میں دن کے وقت اندھیرا چھایا رہتا ہے، کمرے کی آوازیں کمرے ہی میں گھُٹ کے رہ جاتی ہیں۔ پیرو کے انتظار میں اُن سے کوئی بات نہیں کی گئی ہے۔ تجمل اور پیرو شاید اُنھیں بھول گئے تھے۔ میرا خیال تھا، پاڑے پہنچ کے وہ سب سے پہلے اُنھی کے پاس [جائیں] گے کہ دیکھیں، وہ کیا بتاتے ہیں، کس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مجھے [یہ] جاننے کی بے کلی تھی۔ ہو سکتا ہے، وہ بھی نواب قطب الدّین علی کے فرستادہ ہوں۔ خدا کرے، ایسا ہی ہو۔ رہ رہ کے ایک ہی وسوسہ میرے دل میں [آتا] تھا کہ کہیں وہ کسی اور کا نام نہ لے دیں۔ وہ نواب حشمت جنگ کا نام بھی تو [لے] سکتے ہیں، پھر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اِس صورتِ حال میں ہمارا دوبارہ حیدر آباد جانا کس طرح مناسب ہوگا۔ کوئی اور نہ سہی، خانم تو ابھی وہاں ہے، اگر وہ ہمارے ساتھ آ جاتی تو کوئی بات نہ تھی۔

جب نو بج گئے تو مجھ سے نہ بیٹھا جا سکا۔ اُدھر جولین بھی فرخ [کے] پاس جانے کے لیے صبح سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں بیٹھے بیٹھے کھسک[تا] ہوا تجمل کے پاس چلا گیا لیکن میرے زبان کھولنے سے پہلے ہی اُس نے سر [ہلا] کر کہا: "چلتے ہیں رے۔"

"اسپتال نہیں جاؤ گے؟" میں نے تنک کے کہا۔

"ابھی ٹائم ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

میں نے سوچا، کہوں کہ ٹائم تو دیکھتے دیکھتے نکل جائے گا مگر میں چپ رہا۔ پیرو نے مجھے تجمل کے پاس آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اِس وقت بمبئی کے باہر کے کئی داداؤں کے درمیان گھرا ہوا تھا اور اپنے پیچھے پڑنے والے پولیس کے چھاپوں کے تذکرے سُن رہا تھا۔ میں نے نہ کوئی لفظ کہا، نہ اشارہ کیا مگر وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ "ابھی کیدر، کیدر دادا!" اُس کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی حیرانی سے بولے۔

"اپن ابھی جانے کا ہے۔" پیرو نے کھُردری آواز میں کہا اور چوکی سے نیچے آ گیا۔ سب دیکھتے رہ گئے۔ تجمل بھی کسمساتے ہوئے اُٹھا۔ کوئی شخص بیٹھا نہ رہ سکا۔ پیرو کا رُخ بیرونی دروازے کی جانب نہیں تھا۔ اُس نے تجمل کے آنے کا انتظار کیا اور اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے عمارت کے اندرونی حصّے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے جسم میں کانٹے چبھنے لگے۔ اندر جانے کا مطلب یہی تھا کہ اُس نے اُن دونوں کو دیکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اُنھیں زیادہ دیر پاڑے میں روکے رکھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ یہ صاف صاف حبسِ بے جا تھا۔

پاڑے کی عمارت خاصی بڑی تھی، تین منزلوں اور کئی کمروں پر مشتمل کسی سرائے کے مانند۔ عمارت کا عقبی حصّہ کھُلا ہوا اور کچّا تھا، وہاں پاڑے کے آدمی زور آزمائی کرتے تھے اور سال میں دو ایک مرتبہ تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ ہمارے گزرنے پر لوگ ایک طرف ہٹتے گئے۔ برآمدے سے ہوتے ہوئے ہم ایک کشادہ اور پُرسکون کمرے میں آ گئے، یہ کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا اور پیرو کبھی کبھی یہاں آرام کرتا تھا۔ ماچھی بھی ہمارے ساتھ تھا۔

"ابھی کیسا ہے دکنی جوڑا؟ اُلّو کا پٹھا!" کسی تمہید کے بغیر پیرو نے ماچھی سے پوچھا۔

"کل اکھا دن سے وہ ایدرِ ہی ہے دادا!" ماچھی نے کسیلی آواز میں جواب دیا اور کہنے لگا کہ ایک دن کی بندش سے وہ بڑی حد تک پگھلے ہوئے لگتے ہیں۔ شروع شروع میں اُنھوں نے بہت چیخ پکار مچائی تھی مگر پھر خود اُن کی آوازیں دم توڑتی گئیں۔ وہ اپنا جرم پوچھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہمیں یقیناً کوئی بڑا دھوکا ہوا ہے، وہ تو تاجر ہیں اور بمبئی میں کاروبار کی غرض سے آئے ہیں۔ ماچھی کے کہنے کے مطابق لچھمی اور گلیا، پاڑے کے دو تین آدمیوں کی مدد سے اُنھیں یہاں لانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ پہلے اُنھیں ورغلا کے علاقے سے قریب کیا، پھر کسی جگہ اُن سے جھگڑ پڑے، جھگڑنے والے دوسرے تھے۔ اُنھیں زد و کوب کر کے نیم جانی اور نیم ہوشی کے عالم میں یہاں لانا ایسا دشوار نہیں تھا۔ ماچھی تفصیل بتانے لگا، پیرو نے دلچسپی نہیں لی اور ہدایت کی کہ وہ اُنھیں اوپر تکونے کمرے میں پہنچا دے۔

چند منٹ بعد ہم اوپر پہنچے تو وہ کمرے میں موجود تھے۔ ماچھی اور پاڑے کے دو اور آدمی بھی۔ اُنھوں نے اُن دونوں کو دیوار کے ساتھ لگی بینچ پر بٹھا رکھا تھا۔ دونوں پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ شیروانی اور واسکٹ کے سوا وہ سفر کے اُنھی کپڑوں میں تھے، جو اَب نہایت خستہ و شکستہ ہو چکے تھے جیسے ہفتوں کے پہنے ہوئے ہوں۔ داڑھی بڑھی ہوئی، بال بکھرے ہوئے، ہونٹ خشک، آنکھیں ویران، چہرے پر جا بجا خراشیں۔ کُرتے پر خون کے دھبّے۔ پَر کٹے پرندوں کے مانند۔ ایک دن میں آدمی اِس سے زیادہ کتنا بدل سکتا ہے۔ کہتے ہیں، کبھی کان بھی سونگھنے لگتے ہیں، آہٹوں کی بُو، زینہ چڑھتے ہوئے ہمارے ڈھیلے قدموں کی آہٹیں اُنھوں نے سونگھ لی تھیں اسی لیے اُن کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہمارے داخل ہونے پر دونوں کو جھٹکا سا لگا جیسے کسی بُرے خواب کی دہشت میں آنکھ کھُل جائے۔

ہم کمرے کی تکون کی طرف بچھی ہوئی چوکی پر بیٹھ گئے۔ وہ بینچ سے کھڑے ہو گئے تھے۔ "ابھی پہچان لیا اپن کو؟" پیرو نے زہر خند سے کہا۔

اُن کے [illegible] رہ گئے۔ ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا۔

اُنھیں اپنی منتشر توانائی سمیٹنے کے لیے کچھ وقت تو چاہیے ہی تھا۔ پیرو نے اُنھیں وقت دیا مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

"ابھی اِن لوگ کو تھوڑا پانی دکھلائے۔"

ماچھی کے پہلو میں کھڑے ہوئے آدمی نے پیرو کے حکم پر فوراً عمل کیا۔ کونے میں رکھی ہوئی صراحی سے پانی لوٹا اور کٹورا اُن کے آگے کر دیا۔ وہ منع کرنا چاہتے تھے لیکن اُن میں انکار کی بھی تاب نہیں تھی۔ دونوں سے چند قطرے ہی پیے جا سکے۔

"اپن کو بات زیادہ نہیں کرنے کا ہے۔" پیرو نے سرد لہجے میں مختصراً اُن سے کہا کہ وہ سیدھی طرح اپنے آقا کا نام بتا دیں گے تو اُنھیں چھوڑ دیا جائے گا، ورنہ یہ اُن کا آخری فیصلہ ہوگا، اِس کے بعد اُن کے متعلق تمام فیصلے دوسرے کریں گے۔ بہتر ہے کہ وہ ہوش مندی کا ثبوت دیں، وہ یہ حقیقت جتنی جلد تسلیم کریں گے کہ تمام راستے اُن پر بند ہو گئے ہیں، اُتنا ہی اپنے لیے بہتر کریں گے۔ جواب میں اُنھوں نے یہ حقیقت شاید تسلیم کر لی ہو لیکن ہوش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ اُنھوں نے وہی کچھ دہرایا جو ماچھی ہمیں بتا چکا تھا کہ وہ حیدر آباد دکن سے اپنے کاروبار کے لیے یہاں آئے ہیں، ریل میں اُن کے کسی طرزِ عمل سے ضرور ہمیں کوئی غلط تاثر مل گیا ہے، وہ تو ایک بے ضرر شہری ہیں۔

پیرو نے اُنھیں دوبارہ کسی قسم کی تنبیہ نہیں کی، اُس کے اشارے پر پاڑے کے آدمی نے پلک جھپکتے میں اُن کے گریبانوں پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک جھٹکے میں نیچے تک اُن کے دامن چاک کر دیے۔ پاڑے کے دوسرے آدمی نے دیوار پر ٹنگا ہوا ہنٹر اُٹھا لیا۔ وہ چیخنے چلاّنے لگے۔ ماچھی نے پاڑے کے آدمیوں کو اُن کے سامنے سے ہٹا دیا اور خود آگے جا کر دونوں کے بال پکڑ کے اِس زور سے اُن کے سَر ایک دوسرے سے ٹکرائے کہ دونوں کی آنکھیں اُلٹ گئیں۔ اُنھوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن توازن قائم نہ رکھ سکے، چکراتے ہوئے فرش پر گر گئے۔ درد کے ابتدائی لمحے نسبتاً آسان ہوتے ہیں۔ وہ غیر ارادی طور پر سر پکڑے ہوئے زمین سے اُٹھ گئے تھے مگر اِس اثنا میں درد اُن کی رگوں میں پھیل گیا تھا۔ درد کی شدت اُن کی گویائی پر بھی غالب آ گئی۔ میرے خیال میں ماچھی نے کچھ تیزی دکھا دی تھی۔ پیرو کو اُن کے اوسان کی دُرستی کے لیے کچھ صبر کرنا پڑا۔

"اپن کیا بولا!" کچھ دیر کے سکوت کے بعد پیرو نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا کہ وہ جتنی دیر کریں گے، اُن کا وقت اتنا ہی قریب ہوتا جائے گا۔

اُن میں سے ایک گھُٹی گھُٹی آواز میں بولا کہ اُنھیں کچھ معلوم ہو تو وہ بتائیں بھی، آخر وہ کس بات کا اعتراف کریں؟ کس شخص کا نام لیں؟

جس آدمی کے ہاتھ میں ہنٹر تھا، پیرو نے اُسے اشارہ کر دیا۔ اُنھوں نے بھی دیکھ لیا، ایک دم ڈکرانے، گڑگڑانے لگے اور دونوں ایک ساتھ پیرو کے پیر پکڑنے دوڑے۔ اُنھوں نے پیرو کے پیروں پر سَر پٹخنا اور گریہ کرنا شروع کر دیا کہ خدا گواہ

ہے، وہ کچھ نہیں جانتے۔

"ابھی آگے آگے پیچھے کا یاد آجائے گا تم کو۔" پیرو نے ٹھوکر مار کے اُنھیں خود سے دُور کر دیا اور دُھتکارتے لہجے میں ماچھی سے کہا کہ وہ ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہا ہے۔ ماچھی منتظر ہی تھا۔ پیرو کی ٹھوکر سے دونوں فرش پر لوٹ گئے تھے۔ ماچھی نے اُن سے نمٹنے کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کی، دونوں کمرے کے بالکل آخری سِرے کی تکون میں دُبک گئے۔ بدحواسی میں اُنھیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ اِس طرح اُنھوں نے ماچھی کے لیے اور آسانی کر دی ہے۔ ماچھی ایک جست میں لیوار بن کے اُن کے سامنے پہنچ گیا تھا، اُس نے اُن کے اِدھر اُدھر بھاگنے کا امکان یک سر مسدود کر دیا۔ ماچھی نے ایک ہی سانس میں دونوں ہاتھوں سے پے در پے اتنے مکے اُن کے پیٹ میں مارے کہ کوئی بھی بس اسی قدر برداشت کر سکتا تھا۔ اُنھیں نہ بلبلانے کا یارا رہا، نہ اپنے پیروں پر جمے رہنے کا۔ ماچھی بالوں سے کھینچتا ہوا اُنھیں درمیان میں لے آیا۔ ایک کو اُس نے کولھے سے پکڑ کے اوپر اُٹھا لیا۔ اُن کے ذہن میں اپنے مقابل لوگوں کے بارے میں کوئی ابہام تھا تو اب دُور ہو جانا چاہیے تھا۔ ماچھی نے اُسے بہت اوپر اُٹھایا، ادھر اُدھر ہوا میں اُچھال کے دوبارہ اپنے ہاتھوں پر لے لیا، اگر اُسی لمحے وہ اُس آدمی سے دست کش ہو جاتا تو اُس کے جانے کتنے جوڑ کھل جاتے، ماچھی نے اُسے اپنے ہاتھوں پر لے کے زمین پر پھینک دیا اور پیچھے ہٹ آیا۔ ماچھی نے عمداً ایسا کیا تھا تاکہ وہ اِسے رعایت تصوّر کریں، رعایت بار بار نہیں دی جا سکتی۔

چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی طاری رہی۔ درد و کرب سے اُن کے جسم دُہرے ہو گئے تھے۔ وہ مڑے تڑے، اینڈے اکڑے ہوئے فرش پر کراہتے رہے۔ پیرو نے ایک لمحاتی توقف کے بعد ماچھی سے کہا کہ اب وہ اُن سے پوچھے، اُنھیں اب بھی کچھ یاد آیا کہ نہیں؟

ماچھی کے سوال پر دونوں نے اِس نیم جانی کے باوجود انکار کر دیا گویا ماچھی کے کس بل کے اظہار میں کوئی کسر رہ گئی تھی یا وہ مشاق لوگ تھے۔ دیکھنے میں وہ ایسے پختہ کار نہیں معلوم ہوتے تھے مگر ظاہر ہے کہ آزمودہ لوگوں ہی کو یہ ذمّے داری سونپی گئی ہوگی۔ شاید ماچھی کی رعایت اُنھوں نے اُس کی مجبوری سمجھ لی کہ وہ بس اتنا ہی ستم کر سکتا ہے۔ پولیس کے سامنے پختہ کار لوگوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے، اُنھیں اطمینان ہوتا ہے کہ پولیس اُنھیں زندہ رکھنے کی ایک رعایت ضرور دیتی ہے۔ پولیس تارِ نفس محض جھنجھناتی ہے، توڑتی نہیں۔ یہ بات بھی برداشت کا بہت کچھ حوصلہ دیتی ہے۔ پولیس کی طرف سے یہ اطمینان حاصل نہ ہو تو بھی وہ کسی بخیل کی طرح اپنے تارِ نفس کی بچی کھچی پونجی بہت دبوچ کے رکھتے ہیں، اُس پر کسی طور آنچ نہیں آنے دیتے اور اپنی دہائیوں سے ستم کو دادِ ستم بھی دیتے رہتے ہیں۔ اُن کی ہر چیخ، ہر کراہ، اذیت کی ہر دردناک صدا اُن کی بے گناہی کے ثبوت کی حیثیت رکھتی ہے، اُن کے حق میں ایک اور دلیل کی حیثیت۔ ہر خفا کا سلسلہ دُور تک جاتا ہے۔ ہر زباں بندی ایک خوف سے مشروط ہوتی ہے، اور بہت کچھ اِس پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ یہ خوف اعصاب پر کس قدر مسلّط ہے۔ دوسری طرف کون ہے، دوسری طرف کتنی بڑی کھائی ہے، کون سا ستم گر پڑا ہے۔ یہاں سے امان مل گئی

تو کیا ہوا، اُدھر جو ایک جہنم موجود ہے۔ اپنے ہی لیے نہیں، پسماندگان کے لیے بھی۔ پیرو بھی یہ سمجھ رہا ہوگا۔ اب اُسے اُنھیں یہی باور کرانا چاہیے تھا کہ سامنے کا یہ زیادہ مہلک، زیادہ ہول ناک ہے۔ سامنے کی آگ اُن کی آہ و بکا سے اور بھڑک رہی ہے۔ پیرو نے ہنٹر بدست آدمی سے کہا کہ جب تک اُنھیں اپنے آقا کا نام و نشان یاد نہ آجائے، وہ اُن پر ہنٹر برساتا رہے۔

پاڑے کا آدمی ہنٹر ہاتھ میں لہراتا اُن کے قریب پہنچ گیا، عین وقت پر ماچھی نے اُسے روک کے اُن کے جسم پر جھولتے ہوئے کُرتے کھینچ لیے۔ کُرتوں کے نیچے کھادی کی بنڈیاں بھی پھاڑ دیں۔ اُن کا بالائی جسم بے لباس ہو گیا۔ ماچھی نے ہٹتے ہٹتے اُن کی ننگی پسلیوں پر ترچھے ہاتھ سے کئی ضربیں لگا دیں جن کی کسک شاید اُن کے تارِ نفس تک پہنچ گئی ہو۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ ماچھی اور پیرو ہنٹر کی ضرب سے کیوں پس و پیش کر رہے ہیں، وہ اُن کے جسموں پر نشان ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ ماچھی کی ترچھی ضربوں نے دونوں کو اور ناتواں کر دیا۔ اِس کے ہٹنے پر جیسے ہی ہنٹر اُٹھایا گیا، اُن میں سے ایک نے دہشت سے ہاتھ بلند کر کے ٹھہر جانے کی التجا کی اور بہ عجلت تمام ہذیانی انداز میں سر ہلانے لگا۔

پیرو نے ماچھی اور پاڑے کے آدمیوں کو اُن سے دُور ہو جانے کا اشارہ کیا۔ دونوں کی سانسیں چل رہی تھیں۔ ایک نے دوسرے پر اشتعال کی نگاہ ڈالی۔ اُس نے گردن ڈال دی۔ جس آدمی نے ٹھہر جانے کی التجا کی تھی، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ پیرو نے اُسے روک دیا اور کہا کہ جو کچھ اُسے بتانا ہے، خوب سوچ سمجھ کے بتائے، اُس کے پہلے ہی بیان کو آخری بیان سمجھا جائے گا، ترمیم و تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ اچھی طرح جان لیں کہ یہاں سے وہ کسی عدالت میں نہیں لے جائے جائیں گے، اُن کی نجات اُن کے بیان کی تصدیق کے بعد ہی ممکن ہے۔

اُس نے سُن لیا تھا اور اچھی طرح ہی سُنا ہوگا۔ ماچھی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرے کان جلنے سے لگے، وہ کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ وہ شخص سر جھکائے بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ پیرو نے اُسے سانسیں بحال کرنے کی مہلت دی اور عجلت نہیں کی۔ اُس نے خود بھی دیر نہیں کی۔ گھٹی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ اُن کا مقصد ہمیں ضرر پہنچانا نہیں تھا، اُنھیں صرف اِس غرض سے ہمارے تعاقب میں روانہ کیا گیا تھا کہ وہ ...."

"اپن کو نام بولو۔" پیرو نے اُسے جھڑک دیا۔

اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے اور پھٹی پھٹی انگارا آنکھیں اُداس ہوئی اپنے ساتھی پر ٹِک گئیں۔ دوسرے کی حالت اُس سے مختلف نہیں تھی۔

"اپن کو نام بولو سالا!" پیرو نے دُرشتی سے کہا۔

اُس نے جلدی سے حلق تر کیا اور لڑکھڑاتی سٹ پٹاتی آواز میں کہا:

"نسبت شاہ خاں صاحب۔"

"نسبت شاہ خاں صاحب؟" پیرو اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "کون نواب بہادر ہے کیدر! کون ہے؟"

"یہ نواب نہیں ہیں حضور!" اُس نے گھگھیا کے کہا۔

"پھر کیا ہے؟ نواب کا ....؟"

"یہ وہاں ایک بڑے سرکاری عہدے دار ہیں، ریاست کی نظامت میں۔"

"مطلب! بڑا سرکاری آفیسر؟" پیرو تذبذب سے بولا۔

"جی، جی ہاں۔"

"کائے کا افسر؟"

"سرکاری انتظامیہ کے دفتر میں ہیں وہ۔"

"ابھی ابھی کیا بولا تھا وہ؟"

اُس نے ہچکچاتے، ہکلاتے ہوئے بتایا کہ نسبت شاہ نے اُن سے ہماری نقل و حرکت کی نگرانی، ہمارے پتے اور ہمارے مشاغل کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنے کو کہا تھا۔ کہنے لگا کہ اِس کے سوا اُن کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ وہ ہمیں کسی قسم کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔

"یہ نسبت شاہ حرام کا جنا ابھی اپن کو کیسا جانتا تھا؟" پیرو نے اُس سے وہی سوال کیا جو میرے سر میں دھمک رہا تھا۔

"ہم کو، ہم کو نہیں معلوم۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "ہم سے جیسی بھی قسم لے لیجیے حضور! ہم کو اِس بابت کچھ نہیں معلوم۔ ہم اُن سے یہ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔"

پیرو تُجھل کی صورت دیکھنے لگا۔ چند لمحے سنّاٹا سا چھایا رہا، پھر تُجھل کی تڑختی آواز کمرے میں گونجی۔ "نسبت شاہ سے کس نواب راجا کا نال جڑا ہے؟"

اُس شخص کا جواب سننے سے پہلے پیرو نے دوبارہ جتانا ضروری سمجھا کہ ہیر پھیر سے کچھ حاصل نہ ہوگا، وہ اپنے ہی ساتھ زیادتی کریں گے۔ جو کچھ اُنھیں معلوم ہے، صاف صاف بتائیں۔

"اُن کے بہت سے نوابین سے تعلقات ہیں حضور!" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہاں ایک نہیں، بہت سے نواب لوگاں ہیں۔"

"قطب الدین علی سے کیسا ہے؟"

"نواب قطب الدین علی؟" وہ چونک سا گیا اور متردد لہجے میں بولا۔ "اُن سے بھی اُن کے بہت اچھے، نیازمندانہ مراسم ہیں۔"

"اتنا تم جانتا ہے؟"

"ہمارا اندازہ ہے حضور!" وہ لرزیدہ ہونٹوں سے بولا۔ "ہم آپ سے کچھ چھپا نہیں رہے۔ اب چھپانے کو کیا رہ گیا ہے۔" اُس کی التجا میں احتجاج بھی شامل تھا۔

"پیر تم کو نئیں بولنا۔" پیرو کی پھنکارتی آواز سے وہ اُچھل پڑا۔ ایک لحظے بعد پیرو نے نرمی سے کہا۔ "تم قطب الدین علی کا آدمی ہے؟"

"نہیں نہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔ "نہیں حضور! ہم صرف اُن کے نام سے واقف ہیں۔ وہ بہت بڑے نواب ہیں۔ ہم اپنی ماں کی قسم کھاتے ہیں کہ اُن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کسی اور طرف نہ بھٹکیں۔"

"وہ آدمی ریل میں تمھارا ساتھ چل رہا تھا؟"

"کون سا آدمی؟" اُس نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"وہ چاقو پٹاخا والا ....."

"آپ کون سے آدمی کی بات کر رہے ہیں؟"

اُس کے ساتھی کے چہرے پر بھی پریشانی و حیرانی سمٹ آئی۔ "ہم اپنے سوا کسی کو نہیں جانتے۔" پہلی بار اُس نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔

"تم نئیں جانتا؟ ...."

"معاف کیجیے، آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم صرف دو ریل گاڑی میں تھے اور آپ کے برابر کے ڈبّے میں بیٹھے تھے۔"

"ہا!" پیرو نے گرج کر کہا۔ "تم کو، تم کو ابھی کیسا معلوم تھا کہ اپن اسی ڈبا میں بیٹھنے کا ہے جو تم ابھی ایک دم برابر والا ڈبا کا ٹکٹ کٹایا؟"

"ٹکٹاں ہمیں نسبت شاہ خاں صاحب نے دیے تھے۔"

"نسبت شاہ کو پتہ تھا؟" پیرو نے متجسس لہجے میں کہا۔

"ہم نہیں کہہ سکتے۔"

جس بات کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا اور میرے دل کی دھڑکن بار بار معدوم ہونے لگتی تھی، آخر وہ اسی نتیجے پر پہنچ رہے تھے۔ تُجھل نے ایک پل کی تاخیر کیے بغیر اُس سے پوچھا۔ "نسبت شاہ نواب حشمت جنگ کا کون ہے؟"

"نواب حشمت جنگ کے؟" اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور آواز حلق میں پھنس گئی۔

"اس کو تم نئیں جانتا؟ ...."

"نہیں صاحب! اُنھیں ریاست میں کون نہیں جانتا۔"

"وہ بھی اُودر ریاست کا بڑا افسر ہے؟ کیا بولتا ہے اُس کو؟"

"جی جی۔" اُس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور، اور نسبت شاہ خاں اُنھی کے ماتحت ہیں، اُن کے معتمد۔"

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرا جی اب وہاں سے بھاگ جانے کو کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، لیکن نواب حشمت جنگ سے اُن کا کوئی ربط ضبط نہیں ہے۔ اُس سے ساری زندگی میں دو ایک مرتبہ ہی اُن کی ملاقات ہوئی ہوگی اور وہ بھی رسمی طور پر۔ نواب حشمت جنگ تک عام لوگوں کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ نسبت شاہ خاں عرصے سے اُس کا معتمدِ خاص ہے۔ ریاست میں اپنے انتظامی تجربے، معاملہ فہمی کے سبب اُس کا بہت نام ہے اور اُس کے متعلق بہت سی روایتیں، جرأت اور ذہانت کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔

تُجھل اور پیرو غور سے اُس کی ایک ایک بات سُن رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر رنگ آ گیا، دونوں پر کسی انکشاف کی سی حیرانی طاری تھی، سانحے کی بھی تو حیرت ہوتی ہے اور سوگ میں بھی تو آدمی کا خون جلتا ہے مگر پیرو کی یہ حالت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اُس نے تو پہلے ہی حیدرآباد میں ابا جان کی نوخرید حویلی میں آنے والے ۴ مسلح آدمیوں کے دستے کی بابت نواب حشمت جنگ کی طرف

اشارہ کیا تھا شاید پیرو کو اپنے قیاس پر خود بھی اعتبار نہیں تھا۔ ابّا جان نے سرزنش کے انداز میں تردید کی تھی تو اُسے خفت بھی ہوئی تھی، منہ سے بات نکل جانے کا پچھتاوا۔ تھوڑی دیر بعد ہی نواب حشمت جنگ پھول اور شیرینی لے کے آگیا تھا، روتے بھی تو پھولوں اور کانٹوں کے مانند ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا، پیرو نے اُس رات کی ذہنی ابتری کا مآل سمجھ کے سب کچھ اپنے سینے سے کھرچ دیا تھا۔ نواب حشمت جنگ کی کوئی گرہ اُس کی رگوں میں نہیں پڑی تھی جو اب اُس کا چہرہ جل رہا تھا، اُس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ مجھے اب وحشت سی ہو رہی تھی۔ میں نے خود کو بہت روکنا چاہا لیکن آخر اٹھ کھڑا ہوا۔ اِس میں میرے ارادے کو اتنا دخل نہیں تھا۔

"کیدر! ابھی کیدر کو را جا؟" پیرو چونک کے بولا۔

"کہیں نہیں، بس نیچے۔" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نیچے بیٹھا ہوں۔" اُس کے کچھ کہنے سے پہلے میں تیز قدموں سے زینے میں داخل ہو گیا۔ کسی نے پیچھے سے مجھے آواز نہیں دی۔

نیچے صحن اور دالان میں لوگوں کی تعداد اور بڑھ گئی تھی۔ میں نے کسی اور طرف نکل جانا چاہا لیکن کوئی ایسا راستہ نہیں تھا جہاں میں اُن کی نظروں میں نہ آتا۔ میں دروازہ بند کر کے وہیں کمرے میں بیٹھ گیا۔ وہ دونوں نیچے نہیں اُترے۔ جانے اب وہ اُن سے کیا جاننے کے خواہش مند تھے، مزید کون سی پہیلی بوجھنا رہ گیا تھا تاہم میں اُن کے انتظار میں وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے تنہائی سے بھی گھٹن ہو رہی تھی۔ آدمی کبھی خود اپنی ذات کے لیے بھی اجنبی ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے، یہ اپنا چہرہ اپنا جسم نہیں ہے۔ یہ اپنی آنکھیں نہیں ہیں۔ کبھی سب کچھ پتھر سا لگتا ہے، اپنا آپا بھی۔

مجھے نیچے آئے اور کمرے میں خود کو محبوس کیے دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ کمرے کے آس پاس شور سا سنائی دیا۔ میں نے جتنی دیر میں اُٹھ کے دروازہ کھولا، اُدھر کسی نے دستک دی۔ زورا، چھیدا، ٹنگو، جمرو اور شامو کے درمیان میرے سامنے مارٹی کھڑا تھا۔ سوجی آنکھیں، ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی صاف نظر آ رہا تھا کہ رات بھر نہیں سو سکا ہے۔ اُس کا یہ حال دیکھ کے میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ "خیریت تو ہے؟" میں اُس کا بازو پکڑ کے اندر لے آیا۔

"ابھی دادا اُستاد کیدر ہے؟" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"اوپر ہیں مگر بات کیا ہے؟"

"اُس کو بولو را جا ابھی اسپتال چلے کانتے بھائی۔" اُس کی آواز ٹھٹھرنے لگی۔ "ابھی بڑا ڈاکٹر دیکھنے کو آیا تھا، بولتا ہے آج ہی آپریشن کرنے کا ہے۔"

"آج ہی؟"

"اپن ابھی سویرے تمھارا انتظار کرتا رہا۔ کوئی بھی نہیں آیا، ٹنگو باسٹرڈ بھی ایدر بیٹھا مستی مارتا رہا۔ کورٹن (جولین) بھی نہیں آیا۔ اپن بسمر شبارے کو بول کے موٹر میں بھاگا ایدر آیا ہے۔ اُستاد کو بولو، ابھی چلنا ہے تو جلدی، اپن کو جلدی لوٹنے کا ہے۔"

میں نے سیدھے زینے کا رُخ کیا۔ وہ ابھی اُن دونوں کو کرید رہے ... میں نے مارٹی کے آنے کی اطلاع دی تو تجمل مزید کچھ پوچھے بغیر اُٹھ گیا، پیرو ہمارے پیچھے پیچھے آگیا۔ ہم کمرے سے نکل کے جیسے ہی صحن میں آئے، لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ہماری تو کوئی بات نہیں تھی، پیرو کے لیے اُنھیں درگزر کر کے آ... بڑھ جانا خاصا دشوار تھا، وہ اُسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ چوکی کے پاس باڈی کلا کا دادا دینا بھی وہاں بیٹھا نظر آیا۔ اِس سے پہلے کہ پیرو اُس کے پاس پہنچتا، وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کا یہاں آنا اور وقت سے پہلے آ جانا ہی ... کی انفعالیت کا ثبوت تھا، اُس کے چہرے پر بھی مجوبی لکھی تھی۔ پیرو نے ... کے سلام کا جواب دیا اور ماچی کو اُس کی جانب اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ دروازے سے دُور تھا کہ ایک طرف کونے میں بیٹھا ہوا قلابے کا دادا جارجی اُٹھ ... راستے کی دیوار بن کے کھڑا ہو گیا۔ جارجی کو دیکھ کے میرا جسم بھی اکڑ گیا، وہ ... سے بہت بدلا ہوا تھا۔ "ابھی کمال میں ہے نا؟" پیرو نے ترشی سے کہا۔

جارجی، پیرو کے پیروں پر جھکنا چاہتا تھا مگر پیرو نے اُس کے شانے پکڑ ... اور سر تا پا اُس پر ایک نظر ڈالتا ہوا بولا۔ "اپن کو ابھی بھی تھوڑا بل کھائی ..."

"نئیں دادا! نئیں۔" جارجی سیدھا ہو گیا۔

"لگتا ہے، دارو ابھی خون میں مل گیا ہے۔" پیرو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا، "پر ٹھیک ہے، ابھی آگیا ہے تو ٹھیک ہے۔ اپن تجھ سے اکھا بات کرے گا۔" پیرو کی آواز میں غصے کی لرزش نمایاں تھی۔

جارجی کی نگاہیں جھک گئیں۔ پیرو نے اُسے ہدایت کی کہ جب تک واپس نہ آجائے، جارجی یہیں پاڑے پر حاضر رہے گا، جارجی بت کے مانند سنتا ... پیرو نے اُس سے مزید بات نہیں کی، دروازے کی طرف چل پڑا۔ باہر آ کے ... نے اُس سے کہا کہ پاڑے میں اُس کے لیے اتنے لوگ بیٹھے ہیں، وہ اپنے گھر ... نہیں گیا ہے، کچھ دیر یہاں ٹھہر کے اب وہ گھر چلا جائے اور ممکن ہو تو رات ابّا جان کے گھر آجائے ورنہ کل صبح ہم پاڑے آ ہی جائیں گے لیکن پیرو نے ہم ... ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اسپتال کی موٹر دروازے کے پاس ہی کھڑی ... وہ ہمارے بیٹھتے ہی چل پڑی۔ سڑکوں پر بہت بھیڑ تھی۔ موٹر کی رفتار کبھی ... ہو جاتی، کبھی سُست۔

ہم اسپتال پہنچے تو بارہ بج رہے تھے۔ اسپتال کا وقت ختم ہو گ... موٹر مریضوں کے خصوصی وارڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہاں رات والا پہرے ... نہیں ہو گا مگر اب بھی ایک آدمی مارٹی اندر جا سکتا تھا۔ رات کی طرح پہرے ... سے پھر تکرار کرنا پڑتی لہٰذا تجمل نے ڈرائیور سے اسپتال کے پچھلے حصے کی طر... لے چلنے کو کہا۔ اِس وقت رات والے نوجوان ڈاکٹر کے ملنے کی توقع نہیں تھی، ... یہی تھا کہ ہم براہِ راست ڈاکٹر شرما سے ملنے کی کوشش کریں۔ موٹر ...

... ہم اسپتال کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ ہمارا رُخ نوجوان ڈاکٹر کے کمرے کی طرف ... خلافِ توقع وہ مل گیا، اپنے کمرے کے باہر ہی، وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ "آپ ... آگئے؟" وہ بے تابی سے ہماری طرف لپکا۔ "میں آپ کا منتظر تھا۔"

"مجھے اُمید نہیں تھی کہ اِس وقت تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ تمھاری ڈیوٹی تو ... رات کو تھی؟" میں نے خجالت سے کہا۔ "ہمیں کچھ دیر ہو گئی۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ صبح ٹھیک آٹھ بجے یہاں پہنچ جائیں گے۔" وہ ... شائستگی سے بولا۔ "بس میں آپ کے انتظار میں رُک گیا۔"

"تم نے بڑی زحمت کی۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔ "لیکن سب ٹھیک ... تو ہے ڈاکٹر؟"

"ڈاکٹر شرما آپریشن کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"رات ہم کیا بولا تھا ڈاکٹر!" تجمل نے یکایک سامنے آ کے تلخی سے کہا۔

"میں نے ڈاکٹر شرما کو بتایا تھا، اُنھوں نے آپ کا انتظار کیا۔ مریض کی ... حالت ایسی نہیں تھی کہ زیادہ وقت برباد کیا جاتا۔" وہ نرمی سے بولا۔ "آپ ہوتے ... تب بھی یہی فیصلہ کرتے۔"

"کدھر ہے بڑا ڈاکٹر صاحب؟"

"وہ آپریشن تھیٹر میں ہیں۔"

"اُس کو بولو، ہم کو چیرا پھاڑی نہیں کرانی۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جو ہم بول رہے ہیں، ابھی اُس کو ایسا ہی جا کے بول دو۔" تجمل نے ... دو ٹوک آواز میں کہا۔ "ہم نے پہلے ہی منع بولا تھا۔"

"آپریشن کی ضرورت ہے جناب!" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ "آپ ... ہم کیوں نہیں رہے۔ رات سے وہ بے ہوش پڑا ہے۔ میں اُسے مسلسل دیکھتا ... رہا ہوں، اُس کی حالت دیکھ کے ہی میں گھر نہیں گیا۔ یہاں تمام ڈاکٹروں کی ... یہی رائے ہے۔"

"پر اپنی نہیں ہے۔"

"آپ اِس قدر کیوں گھبرا رہے ہیں، حوصلہ رکھیے۔"

"اُس کو اُس کے حال پر چھوڑ دو ڈاکٹر!"

"دیکھیے، دیکھیے۔" ڈاکٹر اضطراب سے بولا۔ "ہم لوگ کوئی اور طریقہ نہ دیکھ ... کے مجبوراً یہ قدم اُٹھاتے ہیں۔ مریض کی بھلائی کے لیے، اُسے جلد اچھا کرنے کے لیے۔"

"زیادہ بات مت کرو۔" تجمل نے ناگواری سے کہا۔ "بڑے ڈاکٹر صاحب ... کو جا کے بول دو، ہم لوگ کی مرضی نہیں ہے، ہم کاغذ پر دستخط نہیں کریں گے۔"

"کاغذ پر دستخط کیے جا چکے ہیں۔"

"کس نے، کس نے کیے؟" تجمل نے بھڑک کے کہا۔

"مریض کے ساتھ موجود لیڈی اٹینڈینٹ نے۔" اُس کی مراد شہپارہ ... جو رات مارٹی کے ساتھ وہی کانتے کے کمرے میں رہی تھی۔

"وہ، وہ کون ہے۔ دستخط ہم کریں گے۔"

"لیڈی نے خود کو مریض کا عزیز بتایا تھا۔"

"ابھی دوسرا عزیز منع بولتا ہے۔"

"ایسا کب ہوتا ہے جناب!" نوجوان ڈاکٹر کے لہجے میں تندی آجانی چاہیے تھی۔ "میں آپ سے بنتی کرتا ہوں۔ آپ ذرا صبر سے کام لیجیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب وقت گزر گیا ہے۔ مریض کو کمرے سے لے جایا جا چکا ہے۔ ممکن ہے، ڈاکٹر شرما نے اپنا کام شروع بھی کر دیا ہو۔"

"نہیں۔" تجمل نے جھنجلاتی آواز میں کہا۔ "وہ ایسا نہیں کر سکتا، ہم کو ابھی اُس کے پاس لے چلو، ابھی اِسی وقت....."

"میں نے آپ سے کہا نا کہ وہ آپریشن تھیٹر میں ہیں۔"

"وہ کہیں بھی ہو، اُس کو جا کے روک دو۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" ڈاکٹر جھنجلا کے بولا۔ "پھر آپ لوگ مریض کو اسپتال کیوں لائے تھے۔ ہم مریض کے دشمن نہیں ہیں، یہ اسپتال ہے جناب!"

"ابھی آواز دبی رکھو ڈاکٹر!"

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک رنگ آ کے گزر گیا، اُس نے ملائمت سے کہنے کی کوشش کی۔ "ضرور آپ کو کبھی کسی آپریشن سے تلخ تجربہ ہوا ہے۔"

"ابھی ایسا ہی سمجھو۔" تجمل بھن بھناتے ہوئے بولا۔

"ضروری نہیں کہ دوبارہ بھی یہی تجربہ ہو۔"

"تم نہیں جانتے۔" تجمل کی جلتی ہوئی آواز میں کوئی دکھ بھی شامل تھا۔ "سمجھو کہ ہم کو تمھاری چیرا پھاڑی راس نہیں آتی۔"

"اوہ، اوہ۔" ڈاکٹر مسکرا کے بولا۔ "مگر یہ آپ کا وہم ہی ہے نا۔ ہم دن میں کئی آپریشن کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ کیس میں مایوسی البتہ ہو جاتی ہے۔ آپ اطمینان رکھیں، یہاں آپ کا مریض زیادہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔"

"ہم کیا بول رہے ہیں ڈاکٹر!"

ڈاکٹر کا چہرہ تمتمانے لگا۔ "میں بھی کچھ کہہ رہا ہوں جناب! آپ میری بات کیوں نہیں سن رہے۔"

"تم بھی اپنی نہیں سن رہے۔"

"میں ایک ڈاکٹر ہوں۔"

"ہم بھی مریض کے کوئی ہیں۔"

میں نے دخل دینے کا ارادہ کیا لیکن اِس موقع پر تجمل سے کچھ کہنا ہوا دینے کے برابر تھا۔ میں نے پیرو کی طرف دیکھا مگر وہ بھی خاموش کھڑا رہا۔ تجمل اپنی ضد سے باز نہیں آیا۔ آخر ڈاکٹر کو کہنا پڑا کہ بصورتِ دیگر ڈاکٹر شرما کانتے کو اسپتال سے خارج کر دے گا۔

"ہم اُس کو ابھی لے جائیں گے۔"

"اِس حالت میں آپ اُسے لے جائیں گے؟" ڈاکٹر چیخ کر بولا۔ "یہ آپ

اُس کے ساتھ ظلم کریں گے۔ کیا.... کیا وہ جانے کے قابل ہے اور آپ کریں گے کیا ؟ کیا کریں گے ؟ میں سمجھتا ہوں مجھے افسوس سے کہنا چاہیے کہ آپ اُسے تن درست دیکھنا نہیں چاہتے۔

"ہم اس کے بارے میں تم سے زیادہ سمجھتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر درشتی سے بولا "جیسی آپ کی مرضی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ ڈاکٹر نا سے آپ کی ملاقات ہو جائے مگر وہ بہت پاگل آدمی ہیں۔"

"ہم سے زیادہ نہیں ہوگا۔"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں شعلے کوندنے لگے۔ اُس نے غصّے سے زمین پر پیر پٹخے اور سر جھٹک کے تھل کو چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اور پیرڈ بھی اُس کے ساتھ جانا چاہتے تھے لیکن ہمیں اُس نے روک دیا۔ جاتے جاتے اُسے خیال آیا، پلٹ کے اُس نے ہم سے اپنی واپسی تک کمرے میں انتظار کرنے کو کہا۔

ہم اُس کے کمرے میں داخل ہوئے تو جولین پہلے سے وہاں موجود تھی۔ "تم یہاں کیسے ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو میں نے دوسرے لمحے میں دیکھا، اور بس دیکھتا رہ گیا۔ وہ شہپارہ تھی۔ پیازی رنگ کی ساڑی میں ملبوس، کانوں میں بالیاں پڑی ہوئی۔ شرمیلی شرمیلی سمٹی سمٹی۔ اُس کا شہابی رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ میں نے اُسے صرف بالاخانے پر دیکھا تھا اور وہ بھی رات کی روشنیوں میں، بالاخانے کے خاص لباس میں، ہونٹوں پر سُرخی جمائے رخسار پر غازہ ملے۔ وہ وہاں نہ جانے سنگھار کیوں کرتی تھی۔ وہ تو خود پھول تھی۔ پھولوں کو سنگھار کیسا عجب لگے۔ پھول مخمل میں رکھ کے پیش کیے جائیں تو اُن کی خوشبو بڑھ نہیں جاتی۔ وہ تو کوئی اور ہی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ گو چمپا بیگم نے کل رات مجھے اُس کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور اُس سے پہلے کانتے نے بھی لیکن مجھے خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھنے کی بے چینی تھی کہ اُس نے اپنی نئی زندگی کس حد تک قبول کی ہے۔ اُس کے چہرے کی تازگی اور تابندگی دیکھ کے مجھے اپنی رگوں میں ٹھنڈک سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جولین ہی کی کوئی بہن معلوم ہوتی تھی۔ نقلِ مکانی سے آدمی کے ریشہ رگ اور صورت و رنگ پہ کتنا گہرا اثر پڑتا ہے مگر اِسے نقلِ مکانی کیوں کہا جائے، یہ تو نقلِ مکینی تھا، مکان تو مکینوں سے ہوتا ہے۔ آس پاس کے چہرے جو بدل گئے تھے۔ مجھے دیکھ کے اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں اور رخساروں پر خون دمکنے لگا۔ "کیسی ہو تم ؟" میں نے مضطربانہ اُس سے پوچھا۔

وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کے نتھنے پھڑکتے رہے۔

"ارے !" میں نے سرسراتی آواز میں کہا "تم کس قدر بدل گئی ہو۔ کہیں اور ملی ہوتیں تو شاید مجھے پہچاننے میں بہت دیر لگتی۔" جی میں آئی کہ بڑھ کے اُسے سینے سے لگا لوں اُس کے سر پہ ہاتھ رکھوں لیکن میرے قدم اُٹھے رہ گئے، وہ سنبھل نہ پائی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک اشارے کی منتظر ہے۔ میں نے مڑ کے پیرڈ سے کہا۔ "دادا ! تم نے دیکھا ! خبر ہے یہ کون ہے ؟ یہ شہپارہ ہے دادا ! سمجھو تمھاری ایک اور گئی۔"

"ہا ہا ہا۔" پیرڈ نے ہنستے ہوئے کہا "اس کے بارے میں تو تُو نے کبھی نہیں بتایا ! یہ تو ایک دم ابھی اِس کا دو پر کیدر کو چلا گیا۔" پیرڈ نے چند قدم آگے بڑھ کے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اُس کی کمر تھپکنے لگا۔ "اید سب سمندر ہے۔" اُس نے قریب کھڑی ہوئی جولین کو بھی اپنے پہلو میں سمیٹ لیا۔ "اپنا اتنا بہن بھائی دیکھے گا تو کیا بولے گا۔ قسم ہے بابا ! بالکل اُلٹ جائے گا۔"

ڈاکٹر ہدایت کر گیا ہوگا، کمرے میں تعینات ملازم نے چائے کی ٹرالی سامنے لاکے رکھ دی۔ چائے پینے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن جولین پیرڈ کے اور میرے آگے پیالیاں بڑھائیں تو کوئی بھی انکار نہ کر سکا۔ کچھ دیر سب بھول گئے کہ وہ کسی اسپتال میں ایک ڈاکٹر کے کمرے میں ہیں اور کانتے اپنے آپ سے لڑ رہا ہے۔ اتنی ضد اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ وقت آدمی کو یہ فریب نہ دیا کرے تو آدمی گھٹ کے مر جائے۔ میں جولین سے صبح نہ آنے کی شکایت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے شکایت نہیں کی ہے تو مجھے خود کہنا چاہیے مگر مجھے یہ معلوم ہوا۔ اُس کے لیے یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ چائے کے دوران پیرڈ کے استفسار پر اُس نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کیلاش کی طلبی پر اسپتال آئی ہے۔ رات تو ہم سے اتنی باتیں ہوئیں مگر نہ میں اُس کا نام پوچھ سکا، نہ اُسے بتانا یاد رہا۔ جولین کے کہنے کے مطابق رات کو وہ کئی بار کانتے کو دیکھنے کمرے میں آیا تھا اور اُس نے شہپارہ سے کہا تھا کہ وہ کسی بھی وقت اُسے طلب کر سکتی ہے، کسی بھی ضرورت کے وقت۔ صبح کانتے کی حالت بہت بگڑ گئی اور انتظار کے بعد بھی کوئی نہیں آیا، خلافِ توقع جولین بھی، تو شہپارہ بہت پریشان ہو گئی۔ مارٹی بھی ہمیں بلانے گیا تھا، اُس نے ڈاکٹر کیلاش کو اپنے گھر کا پتہ سمجھا کے درخواست کی کہ جولین کی بہن جولین کو فوراً بلا دے۔ ڈاکٹر کیلاش ہی نے مارٹی کو اسپتال کی موٹر فراہم کی۔ دوسری موٹر میں جولین کو وہ خود گھر سے لے کے آیا۔ وہ آدھ گھنٹے پہلے یہاں آئی تھی۔

"اپن کو تھوڑا دیر ہو گیا۔" مبیکد بجانے پیرڈ نے آہستگی سے کہا "سوتا رہا سالا۔ ابھی تک بابا بھی گھر لوٹ کے نہیں گیا ہے۔"

"گھر نہیں گئے ؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "رات کو بھی ؟"

"نہیں، جانا نہیں ہو سکا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہاں سے کہہ کے چلے تھے ؟"

"اب تک کے لیے نہیں۔"

"وہ سب تو بہت پریشان ہو رہے ہوں گے ؟"

میں ہونٹ نکال کے رہ گیا

"میرا خیال ہے، ہم لوگ یہاں موجود ہیں، آپ چلے جائیں۔" وہ شرف تائیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیوں بابا ؟"

"ہاں ہاں۔" پیرڈ نے بے ترتیبی سے کہا۔ "پر یہ نہیں جانے کا بیٹا، یہ ایسا کیسا جا سکتا ہے، کانتے اِس کا بھائی ہے۔"

"یہ جا کے بھی تو آ سکتے ہیں۔"

پیرڈ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میرا جواب شاید میرے چہرے پر لکھا تھا، اس لیے اُس نے زبان بند رکھی۔ کمرے میں یکایک خاموشی طاری ہو گئی۔ پہلی ملاقات میں اتنے لوگ ایک دوسرے سے بے گانہ بیٹھے رہیں تو خاموشی اور عذاب بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر اور تھل میں سے کوئی نہیں آیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ انھیں گئے ہوئے بیس منٹ کے قریب ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ باہر جا کے کسی نرس سے معلوم کروں۔ تھل کی حالت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی تھی، اگر ڈاکٹر شرما نے انکار کر دیا اور تھل اگر.... میرے دماغ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ نرس ایک بار کمرے میں آئی بھی لیکن میں اُس سے کیا پوچھتا۔ اتنی دیر میں دروازے کے باہر سے اُن کی آہٹ سنائی دی۔ وہ تھل ہی تھا۔ میں اُس کی چاپیں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اُن کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی ہم سب کھڑے ہو گئے تھے اور اب ہماری متوحش نگاہیں اُنھی پہ منڈلا رہی تھیں۔ پیرڈ نے اُن کی زبانی کچھ جاننے کے لیے توقف کیا لیکن وہ دونوں گنگ جیسے اپنے آپ کو دیکھتے رہے۔ میری سانسیں رکنے لگیں۔ "ابھی تم جاؤ دادا !" تھل کی بوجھل آواز نے سکوت توڑا۔

"کیا، کیا ہے تھل بھائی ؟" پیرڈ نے بے تابی سے کہا

"ہم کو ابھی اِدھر ہی رہنا ہے دادا !"

"اُودر ابھی وہ، وہ کیسا ہے ؟"

تھل نے سر جھکا لیا۔ "مر رہا ہے حرام ڈیل۔"

"کیا، کیا تھل بھائی ؟" پیر دست پٹا کے بولا۔

"نہیں نہیں۔" ڈاکٹر کیلاش احتجاجی لہجے میں بولا۔ "ہمیں بھلائی کی توقع کرنی چاہیے۔ آپریشن ہو رہا ہے، ضرور کامیاب ہوگا۔"

گویا تھل ناکام واپس آیا تھا۔ میں کچھ نہ طے کر سکا کہ یہ اچھا ہوا یا بُرا۔ تھل کا اصرار مجھے کچھ زیادہ ہی لگ رہا تھا مگر اُس کے اضطراب اور وحشت کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ وہ برہمی کی حد تک تکرار کرتا رہا تھا اور یہاں آ کے اب بھی سرنگوں ہم سب سے بے نیاز بیٹھا تھا۔ جیسے وہ ہماری موجودگی کے باوجود اکیلا ہو گیا ہو۔ میری طرح پیرڈ کے ذہن میں بھی طرح طرح کے سوال اُمڈ رہے ہوں گے لیکن کوئی اِس حال میں تھل سے کیا کہہ سن سکتا تھا۔ ڈاکٹر کیلاش کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ سرِدست خاموشی ہی مناسب ہے۔ سب بے حس و حرکت ہو گئے تھے۔

کوئی وہاں سے نہیں اُٹھا۔ ہمیں اتنی دیر تک ڈاکٹر کیلاش کا کمرہ نہیں گھیرے رہنا چاہیے تھا لیکن خود ڈاکٹر کیلاش کی یہی خواہش تھی۔ وہ کئی مرتبہ باہر گیا پھر ایک بار جب واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک پختہ عمر ڈاکٹر بھی تھا۔ ڈاکٹر کیلاش کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس نے فرطِ مسرت سے کہا "آپریشن مکمل ہو چکا ہے اور کامیاب آپریشن۔"

سب کی نگاہیں تھل کی جانب مرکوز ہو گئیں مگر اُس کے پتھر جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اُسے یوں ڈھیر دیکھ کے ڈاکٹر کیلاش کی چہکتی آواز بھی ماند پڑ گئی۔ "مریض کو اُس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا ہے۔" دوسرے ڈاکٹر نے ہمیں بتایا۔ اُس نے کہا کہ آئندہ اڑتالیس گھنٹوں تک کانتے بے ہوش رہ سکتا ہے، اُس وقت تک اُس کی نگرانی کی سخت ضرورت ہے اور دعا کی بھی۔ وہ کہنے لگا کہ اب صرف دعا ہی باقی رہ گئی ہے۔

اُسے کون بتاتا کہ دعا تو اُس کے لیے ہمارا رواں رواں کر رہا ہے۔ دعا تو بے زبانی کی بھی ہوتی ہے۔

تھل نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ ٹھہرنا چاہا، پیرڈ نے بھی، سبھی نے مگر وہ مارٹی کو اپنے ساتھ لے کے خصوصی وارڈ کی طرف چل دیا۔ ڈاکٹر کیلاش نے خود جانے کے بجائے اپنے ساتھی ڈاکٹر سے التجا کی کہ وہ تھل کو کانتے تک پہنچا آئے۔

وہ خود ہماری وجہ سے نہیں گیا، اسپتال کا بیرونی دروازہ عبور کرنے کے بعد بھی وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور مسلسل ہمیں صبر اور حوصلے کی تلقین کرتا رہا۔ جواب میں کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ دل گرفتہ سا ہو گیا۔ ہمیں وہ اسپتال کی گاڑی میں بھیجنا چاہتا تھا لیکن اُس کی اتنی نوازشیں ہی کیا کم تھیں، بہ مشکل اُس نے ہماری معذرت قبول کی۔ جب ہم ٹرام کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑے تھے، وہ ڈوبی ڈوبی آواز میں بولا "مجھے آپ کے خاندان سے مل کے عجب سا احساس ہو رہا ہے۔"

"کیسا احساس ؟" میں نے تجسّس سے کہا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" وہ اشتیاق آمیز حیرت سے بولا۔ "اِسے کیا نام دیا جائے بہرحال۔" وہ انگریزی میں بولا۔ "اِٹ لکس آل ڈریم آل مسٹری۔" "سب کچھ خواب"

سب کچھ پُراسرار لگتا ہے۔

"مگر بس اتنا ہی رکھنا۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "کوئی اور قیاس کرنے سے پہلے بہتر ہے ہم سے وضاحت طلب کرلینا۔"

"اوہ اوہ۔" وہ مچل کے بولا۔ "خدارا اُسے بھول جائیے۔"

ٹم ٹم آگئی۔ ہمارے کہنے کی دیر تھی وہ مان جاتا لیکن ہم نے اُس سے اپنے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ چلتے وقت اُس نے مودبانہ سب کو سلام کیا اور پیرد کے ہاتھ دیر تک اپنے ہاتھوں میں بھینچے رہا۔ "مجھے آپ لوگوں سے مل کے ایک عجیب سنسنی خیز مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔" اُس کا لہجہ بھی یہی غمازی کر رہا تھا۔ "کاش ہم کسی اور وقت ملے ہوتے۔" وہ حسرت بھری آواز میں بولا۔

"کاش ہمارے لیے تمھارا یہی تاثر قائم رہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے یقین ہے مجھے یقین ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"آپ ہمارے گھر تشریف لائیے گا۔" شہ پارہ نے شائستگی سے کہا۔ "اسپتال سے ایسا دُور بھی نہیں ہے۔"

"ضرور ضرور، یہ میرے لیے عزت کا سبب ہوگا۔"

ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور سڑکوں پر جیسے کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ ہر شخص جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتا تھا جن کی کوئی منزل ہوتی ہے، اُن کی رفتار میں یہی بے کلی ہونی چاہیے۔ میرا اندازہ تھا کہ اسپتال سے جولین سیدھی فرخ، فریال وغیرہ کو دیکھنے جانے کے لیے اصرار کرے گی لیکن وہ ٹم ٹم میں بُت بنی بیٹھی رہی۔ چوک سے راستے مختلف سمتوں میں جاتے تھے مگر ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کے ٹم ٹم سے اُتر جانے کا کوئی محل نہ تھا۔ میرے دل میں آیا پیرد کو ٹوکوں کہ کم از کم اُسے چلا جانا چاہیے۔ وہ پاڑے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے جلد ہی آنے کا کہہ کے آیا تھا مگر جیسے اب میرا گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اُس کا بھی یہی حال ہوگا۔ میں جولین کے گھر رہ کے اسپتال سے قریب رہ سکتا تھا اگر چلا جاؤں گا تو دل کانتے ہی میں اٹکا رہے گا لیکن جتنی دیر ہو رہی تھی ابا جان اور اُن سب کو ہول آ رہے ہوں گے۔ جیسا جولین نے کہا تھا یہی مناسب تھا کہ میں ابا جان کو بتا کے واپس آجاؤں۔ کانتے کا حال سُن کے وہ مجھے روکیں گے بھی نہیں، کانتے کا یہ حال بھی تو صرف اُنھی کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اُن کا بیٹا تماشائی بنا دیکھتا رہا مگر کانتے اُن کی ڈھال بن کے کھڑا ہو گیا تھا اور وہ سب یہاں بھی تو آسکتے ہیں۔ یہ کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔ یہاں آنے کے بعد ہی انھیں کچھ اندازہ ہوگا کہ یہ گھر بھی اُن کا اپنا ہے۔

نشست گاہ میں آکے پیرد صوفے پر پھیل گیا اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ رات بھر ہم تقریباً جاگتے رہے تھے۔ ایک پل کے لیے بھی آنکھ موندنے کا موقع نہیں ملا تھا مگر یہ اعصاب شکنی بے آرامی کی وجہ سے نہیں تھی۔ یہ تو کانتے پریشان کر رہا تھا۔ کبھی کبھی ایسا گمان ہوتا کہ وہ کوئی بہت ہول ناک مذاق کر رہا ہے۔ اپنے پریشان حال لوگوں کا حوصلہ دیکھنے، انھیں چھیڑنے یا اُن میں اپنی پیمائش کرنے کا سودا اُس کے سر میں سما گیا ہے۔

کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم نے آتے ہی منع کر دیا تھا کہ وہ کو[ئی تکلف] نہ کریں لیکن اُنھوں نے چائے کے ساتھ اتنا سامان ہمارے سامنے رکھ دیا کہ کم کیا رہ جاتا تھا۔ اُن کی خاطر ہم بس ٹونگتے رہے۔ جولین کو میرے گھر جلد[ی جانے کا] احساس تھا، اِس لیے اُس نے بہت جلدی کی تھی۔ اتنی دیر میں اُس [شہ پارہ] نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ چمپا بیگم پہلے سے تیار تھیں۔ ملازم نے آکے ب[تایا] کہ باہر ٹم ٹم موجود ہے۔ جولین نے اُس وقت گھر جانے کی بابت مجھ سے کچھ [نہیں] پوچھا تھا اُس نے از خود یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ اتنا اختیار تو وہ سمجھتی ہوگی۔ اچھا لگا۔ کبھی اپنے لیے دوسرے فیصلہ کریں تو ایک ہلکا پن سا محسوس ہوتا [ہے]۔ کوئی یوں اپنا استحقاق جتائے تو عجب سی طمانیت ہوتی ہے، اپنے وجود کا [احساس] اپنے ہونے کی آسودگی۔ وہ شخص کبھی کبھی بہت اُداس ہوتا ہوگا جسے اپنے [فیصلے] خود کرنے پڑتے ہوں۔ میں اُٹھنے کے لیے اُن کی اطلاع کا منتظر تھا کہ شہ پارہ آکھڑی ہوئی۔ وہ ہلکی نیلی ساڑی پہنے ہوئے تھی کام دانی کی ستارے جس میں [ٹکے] ہوئے تھے۔ مجھ سے دبی زبان میں کہنے لگی کہ کیا وہ برقع پہن لے۔

"برقع؟" میں نے چونک کے کہا اور فوراً مجھے خیال آیا کہ وہ یہ کیوں پوچھ رہی ہے۔ جولین کا تو پھر بھی ٹھیک تھا مگر اپنے نام کی نسبت سے اُسے [خیال] ہوگا کہ کہیں ابا جان کو اُس کی یہ بے پردگی گراں نہ گزر جائے۔ اِس کی سادگی پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے پوچھا۔ "تم برقع پہنتی ہو کیا؟"

اُس نے زیرِ لب کہا۔ "یہاں آکے نہیں پہنا۔"

"پھر کیا سوال ہے۔ جب تم پہنتی ہی نہیں ہو تو تصنع کی کیا ضرورت۔"

"دوبارہ بھی تو پہنا جا سکتا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

مجھ سے جواب نہ دیا جا سکا۔ "نہیں نہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا۔ "[اس] کی کوئی ضرورت نہیں۔" یقیناً اُسے ابا جان کا خیال ہوگا، وہ دوسری قسم کے آدمی [ہیں]۔ میں اُسے کیا بتاتا کہ وہ تو اپنی جوان لڑکیوں کو ایک اجنبی شخص کی تحویل میں [دے کر] ایک ایسے سفر پر نکل گئے تھے جہاں سے واپسی بس قسمت پر منحصر تھی۔ اُنھوں نے اپنا خاندان، اپنے رشتے دار، اپنا شہر سبھی کچھ ترک کر دیا تھا۔ اُن کی تو اس [طرف] توجہ بھی نہیں جائے گی۔

شہ پارہ لہراتی ہوئی سی کمرے سے نکل گئی۔ ٹم ٹم والا بار بار ٹن ٹن کر رہا تھا۔ میں نے سوچا، پیرد کو مشورہ دوں کہ وہ لیٹا ہے تو یہیں آرام کرتا رہے، [میں] جلدی واپس آجاؤں گا مگر وہ یک لخت اُٹھ گیا۔ مٹھائی کے ٹوکرے اور گل[دستے] ٹم ٹم میں پہلے سے رکھے تھے۔ گل دستوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ پانی ڈال ڈال کے انھیں تازہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

کوچوان اپنی عمر گزار چکا تھا۔ گھوڑے نے بھی شاید اُس کے ساتھ جوانی [گزاری] تھی۔ [...]لیا تھا جو ہانپ ہانپ کے راستہ طے کر رہا تھا۔ میری نظریں جولین کے [...]کی پلٹیں، وہ چمپا بیگم کے پہلو میں دُبکی نہ جانے کس سوچ میں گم تھی بات [...]ن کے ملنے کی خبر سُن کے وہ کیسی دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ تو اُسی وقت اُن کے [...]لیے فرخ، فریال کو دیکھنے کے لیے مچلنے لگی تھی۔ اُس کے لیے واقعی یہ خبر اتنی [...]ان کن ہونی چاہیے تھی۔ کرشنا جی کی زندگی میں اور اُن کے بعد ابا جان [...]ش کی کوششوں کی اُسے خوب سُن گن تھی۔ ایس پی شکلا اُس کے گھر [...] آتا تھا۔ ممکن ہے وہ اُسے ٹوکتی بھی رہی ہو۔ سب شمولیت کی بات ہے کون [...]تا ہوتا ہے لیکن رات کے برعکس اب اُس میں بڑا ٹھیراؤ تھا۔ کانتے میں بھی [...]نا ہی شامل تھی۔ کلکتے سے کانتے اُس کے لیے ایک تحفہ لایا تھا، شہ پارہ [...] جسے جولین اور تراش رہی تھی۔ آدمی تراشنے میں آدمی کو بڑی مسرت [...]ہے۔ کانتے ویسے بھی اُس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ شہ پارہ کی آمد سے جولین [...]یں اُس کی قنعت اور سوا ہو جانی چاہیے تھی۔ کبھی کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ [...]ن اتنی توانائی نہیں ہوتی کہ دُکھ پہ غلبہ پالے۔ نہ خوشی اتنی دیر پا ہوتی ہے [...]کا عرصہ دراز ہوتا ہے اور میں نے سُنا تھا، آدمی خوشی چھپا سکتا ہے دکھ نہیں۔ [...]ہے کہ آدمی بڑے سے بڑا دکھ بھول جاتا ہے مگر دکھ اپنے وقت پر تو سارا [...]کے رکھ دیتا ہے۔ جولین کو اِس وقت کہیں جانے کا ارادہ ملتوی کر دینا [چاہیے تھ]ا۔ ابا جان کو اب کوئی اور سفر تو درپیش تھا نہیں۔

[...]بیچ میں کوئی سڑک بن رہی تھی۔ گاڑی کو لمبا چکر کاٹنا پڑا۔ مولوی صاحب [...]کے باہر ہی مل گئے۔ اکبر بھی اُن کے ساتھ تھا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی دونوں [...]رے چیخے کہ راہ گیر بھی متوجہ ہو گئے۔ اکبر چلتی ٹم ٹم پر چڑھ گیا۔ مولوی اکرم [...]تانگوڑے کی راسیں پکڑ لیتے۔ ابا جان اِس دوپہر یا میں احاطے میں [...]لے بیٹھے تھے۔ ٹم ٹم رکتی دیکھ کے وہ بے تابانہ دروازے کی طرف دوڑے۔ [فریا]ل اور فارحہ بھی دروازے پر کھڑی تھیں یا کھڑکی سے جھانک رہی تھیں [ب]اہر نکل آئیں۔ سب کے چہروں کے رنگ ایک آن میں بدل گئے تھے۔ وہ [...]ند لر مجھ سے لپٹ گئیں۔ فارحہ تو ہچکیوں سے رونے لگی جیسے میں ایک [...]ں ایک جنگ کی جدائی کے بعد اُن کے پاس آیا ہوں۔ اپنے ہیجان میں [...]ہیجان بھی نہ رہا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ جولین، شہ پارہ اور چمپا بیگم کے [...]نا کی یہ از خود رفتگی ہر چند کہ فطری تھی مگر مجھے کچھ نامناسب سی لگی۔ ان [...]میں جولین، شہ پارہ اور چمپا بیگم نے خود کو کیسا اجنبی محسوس کیا ہوگا۔ [...]رخ کو جلد ہی احساس ہو گیا۔ وہ تعجب اور تپاک کی نظروں سے انھیں [...]اسی وقت پیرد نے درمیان میں آکے میری مشکل حل کی۔ "ابھی پتہ ہے، یہ [...]؟" اُس نے فرخ کا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اپنے ماتھے سے [...]نے بولا۔ "یہ تمھارا ابا کا کمائی ہے۔" کہنے لگا کہ تمھارے لیے یہ لوگ اجنبی [...]اُن کے لیے قطعی اجنبی نہیں ہو، یہ تو تمھارے لیے ہر دم دعا کرتی رہی ہیں [...]اُن کی سمجھ میں کچھ آیا کچھ نہیں۔ پیرد کو ایک اور بات اُن سے کہنی چاہیے تھی کہ رشتے صرف خون کے نہیں ہوتے اور خون، رشتوں کی کوئی کڑی نہیں ہے، خون کے رشتے تو جبر کے بھی ہو سکتے ہیں، اختیار کے نہیں، مگر جو رشتے اپنے اختیار کے ہوتے ہیں، جو خود کشید کیے جاتے ہیں، اُن کے پیچھے خون سے بڑے اتفاقات، خون سے بڑے سلسلے ہوتے ہیں۔ ابا جان بھی ہمارے پاس آگئے، اُن کے بارے میں جولین اور شہ پارہ کو کسی نے کچھ نہیں بتایا، اُنھوں نے خود ہی سمجھ لیا۔ اُن کے جھکتے ہوئے سلام کے جواب میں ابا جان نے انھیں رسمی دعائیں دیں، سر پہ ہاتھ رکھا اور شگفتگی سے بولے۔ "تم نے نام تو بتائے ہی نہیں۔" میں نے انھیں بتانے کی کوشش کی۔ "یہ جولین ہیں، یہ شہ پارہ اور ان کا نام ......" چمپا بیگم کے نام پر میری زبان لکنت کرنے لگی۔ وہ فرخ کو ٹکر ٹکر گھورے جا رہی تھیں۔ اُس کی آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہوگا کہ فہمیدہ کہیں زندہ تو نہیں ہو گئی۔

میں نے جولین کو اشارہ کیا کہ وہی پیش قدمی کرے۔ جولین کو یہ آداب خوب آتے تھے، اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کھلی دیکھ کے مجھے تسلی ہوئی۔ میرے اشارے میں ربطِ خاطر کی اپنائیت تھی۔ اُس کے چہرے کا کھنچاؤ کچھ میرے اس گداز کے سبب بھی کم ہوا ہوگا۔ سب احاطے میں کھڑے تھے، مولوی اکرم نے انھیں یاد دلایا کہ اندر ایک گھر بھی ہے۔ سب اندر چلے آئے لیکن بیٹھک میں آکے اُن کا اضطراب کچھ اور فزوں ہو گیا۔ جولین بھی میری مدد نہ کر سکی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ یہاں آنے کے بعد ایسی کوئی صورت بھی پیش آئے گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کروں۔ ایک دوسرے کے متعلق کیا بتاؤں جس سے اُن کے درمیان کوئی حجاب باقی نہ رہے۔ کہاں سے وہ لفظ لاؤں، اتنے موزوں، ایسے پُرتاثیر جو ایک پل میں سارے فاصلے طے کریں مگر ایسا کب ہوتا ہے۔ آدمی کی بینائی درونِ خانہ تک رسا ہوتی تو یہ دشواری پیش نہ آیا کرتی۔ پہلی بار بینائی ہمیشہ شک زدہ ہوتی ہے۔ ہزار مرتبہ دیوار کے اُس پار ندامت اُٹھانے کے بعد یہ آلودگی ہو جانی چاہیے۔ سو اُن کا یہ امتناع اتنا بے جواز نہیں تھا۔ یہی بہت تھا کہ اُن کی آنکھوں میں حیرت و تجسس کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے اشتیاق بھی موجزن تھا۔ پیرد اور ابا جان اندر آکے فوراً چلے گئے تھے۔ مجھے بھی اپنی موجودگی دیوار سی لگی۔ ممکن ہے، مردوں کے سامنے عورتیں ایک دوسرے سے مغائرت محسوس کرتی ہوں لہٰذا میں انھیں چھوڑ کے چلا آیا۔ پیرد کا ساتھ آنا اچھا ہی ہوا، ابا جان سے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ اُسی وقت کانتے کو دیکھنے جانا چاہتے تھے مگر پیرد نے اُن سے کہا کہ اگر اِس وقت وہاں جانے سے کانتے کی دل بستگی مقصود ہے تو اُس کے اتنی جلد ہوش میں آنے کا امکان نہیں اور اسپتال کا وقت بھی شام سات بجے تک ہے۔ پیرد کے سمجھانے پر وہ چپ تو ہو گئے لیکن بہت ناتواں اور منتشر نظر آ رہے تھے

ہمارے انتظار میں رات سے اب تک کسی نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا مگر پیرد نے مولوی اکرم کو صاف منع کر دیا۔ ابا جان کی بھوک بھی کانتے کا ذکر سُن کے مر گئی ہوگی۔ مزعلا نے بھی انکار کر دیا۔ کچھ دیر تک تو ہم وہیں چبوترے پر بیٹھے

رہے لیکن بار بار کرسیاں کھسکانی پڑتی تھیں، دھوپ بار بار زاویے بدل رہی تھی۔ مولوی اکرم نے فرشی منزل کا کمرہ کھول دیا۔ وہیں باہر سے فرشی منزل کا دروازہ کھلتا تھا۔ کمرے میں آرام کرسیاں رکھی تھیں اور دیگر ساز و سامان کے علاوہ مسہری بھی بچھی ہوئی تھی۔ اَبّا جان کے اصرار پر پیرو مسہری پر دراز ہو گیا۔ غالباً میری وجہ سے اَبّا جان نے کمرے سے چلے جانا مناسب سمجھا۔ سارا جسم چُور چُور تھا۔ پیرو نے مجھ سے مسہری پر آنے کو کہا بھی لیکن میں آرام کرسی ہی پر پھیلا رہا۔ میری بند آنکھیں گھر کے اندر اُن سب پر منڈلا رہی تھیں اور اُنھیں کچھ نظر آ گیا تھا کہ مجھے نیند آ گئی۔ اکبر نے کسی وقت میرے سرہانے تکیہ رکھ دیا، ایک لمحے کے لیے میری آنکھ کھلی، پھر مجھے اپنی خبر نہ رہی۔

پیرو کی دستکی آواز پر میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا مگر اب چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ منہ پر دو ایک چھپکے مار کے میں نے سیدھے گھر کے اندر کا رُخ کیا۔ اندر آ کے مجھے یقین نہیں آیا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ بھی میری خواب زدگی کا کوئی کرشمہ ہے، اُن میں اگر کوئی بھید تھا تو اُن کے چہروں کا۔ سب ایک دوسرے میں ایسی شامل تھیں جتنا آدمی خود میں شامل ہو سکتا ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے پھولوں کا سا کوئی منظر تھا۔ روشنی میں اُن کے چہرے دمک رہے تھے مگر بہت سی چمک اُن کے اندر کی تھی۔ چہرے آئینہ ہوں تبھی روشنی منعکس ہوتی ہے۔ گرد آلود آئینوں پر روشنی ٹھٹھر جاتی ہے، فرخ، چمپا بیگم کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی اور چمپا بیگم کی آنکھیں ابھی تک سمندر بنی ہوئی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بے شک اتنی ہی اجنبی تھیں جتنا کوئی ہو سکتا ہے مگر اُن کے مابین ایک حوالہ سب سے بڑی زنجیر تھا، رشتے بہت کچھ حوالوں پر منحصر ہوتے ہیں کہ کتنا بڑا حوالہ درمیان میں ہے۔ اُنھوں نے ایک دوسرے سے نہیں، مجھ سے اپنی شناسائی بڑھائی تھی۔

سات بجے تو میں سو کے ہی اُٹھا تھا، اَبّا جان نے کھانا کھلائے بغیر کسی کو نہیں جانے دیا۔ وہ تو اُنھیں رات گزارنے کے لیے روک رہے تھے لیکن کانتے کے عذر پر خاموش ہو گئے۔ جولین نے اُن سے درخواست کی کہ کیوں نہ وہ سب اُس کے گھر چلیں، وہ گھر ایسا چھوٹا نہیں ہے۔ جولین کو یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ گھر کا کیا ہے، مکین چھوٹے نہیں ہونے چاہئیں۔ اَبّا جان نے اُس سے وعدہ کیا کہ کل وہ اُس کے گھر ضرور آئیں گے۔ اتنی دیر میں اَبّا جان اُس سے خوب مانوس ہو گئے تھے۔ اِس میں اُن کے تپاک اور خوش اطواری کا اتنا دخل نہیں تھا جتنا جولین کی نشست و برخاست کی شائستگی اور اُس کے لب و لہجے کے سوز و گداز کا دخل تھا۔ جولین کے لہجے میں فرخ اور فریال جیسی ناز آفرینی تھی، اُنھی جیسا اعتماد تھا۔ اَبّا جان نے اُسے ایک گھڑی اور طلائی نیکلس دیا، شہ پارہ اور چمپا بیگم کو بھی سب قیمتی چیزیں تھیں۔ اَبّا جان کوئی کم حیثیت چیز کسی کو کیسے پیش کر سکتے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ اُنھوں نے یہ سب کچھ کس وقت خریدا تھا۔ صبح تو اُن کے بازار جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اُنھوں نے یہ خریداری حیدرآباد میں کی ہوگی۔ فرخ، فریال وغیرہ کے خیال سے۔ تینوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اُنھوں نے اَبّا جان کو اپنا بزرگ سمجھ کے اور اپنا حق جان کے ہی اُنھیں قبول کیا تھا، حق طلبی میں ممنونیت کیسی۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ پاڑے کے بہت سے آدمی پیرو سے مل گئے۔ اب بھی وہاں بڑی تعداد میں لوگ بیٹھے تھے۔ گو یہ تعداد نہیں تھی۔ دینا اور جارجی بھی ابھی تک موجود تھے اور اندھیری کا دا بھی۔ رات ہم اِس تیسرے پاڑے کی طرف دُوری کے سبب نہیں جا سکے اُن دونوں سے زیادہ عقل مند معلوم ہوتا تھا۔ پیرو چوکی کے بیچ میں بیٹھ گیا۔ اُس کی نشست کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اب اُس کے پاس وقت ہی وقت ہے۔ مجھے بھی اب کوئی جلدی نہیں تھی۔ جولین کو گھر تھوڑی دیر کے لیے ہم اسپتال ہو آئے تھے اور ڈاکٹر کیلاش کو زحمت دینے کے بجائے ہم نے گیٹ کے چوکی دار سے کہہ سُن کے مارٹی کو باہر بلوا لیا تھا۔ زیادہ دیر وہاں ٹھیرنا ممکن نہ تھا، نہ اِس کا کچھ حاصل تھا۔ مارٹی کی اطلاع کے مطابق کانتے پتھر بنا پڑا تھا۔ شِمل کی بھی کچھ یہی حالت تھی۔ وہ کانتے کے بس اُسی پر نگاہیں جمائے، اُس کی کسی ایک جنبشِ لب کا منتظر تھا۔ مارٹی نے ہم دونوں کو حیران کیا کہ شام اَبّا جان اور منیر علی بھی اسپتال آئے تھے بیٹھے رہے۔ دونوں نے طرح طرح سے کانتے کو آوازیں دیں لیکن وہ اب سُن رہا ہے۔ کانتے کا واسطہ خود سے کبھی نہیں پڑا تھا، کوئی دوسرا ہوتا کبھی کا اُس پر حاوی آ گیا ہوتا مگر اِس بار تو وہ خود اپنے مقابل تھا۔ برداشت نہیں ہوا۔ جس وقت ہم لوگ مہمان کمرے میں سو رہے تھے، اَبّا جان، منیر علی کو لے کے نکل کھڑے ہوئے ہوں گے۔ اَبّا جان چہرے ڈال کے آئے تھے۔ اُس وقت میں یہی سوچ رہا تھا، سہ پہر کی نیند بجھے بجھے، تھکے تھکے کیوں ہیں۔ اُنھوں نے چلتے وقت کانتے کے کیوں کچھ نہیں کہا اور اسپتال چلنے کے لیے اصرار کیوں نہیں کیا۔ وہ سے دیکھ کے آئے تھے پھر ہم سے کیا تذکرہ کرتے۔ مارٹی بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر پھر گھر نہیں گیا اور اب رات کی ڈیوٹی پر بھی حاضر ہے اور ہر آدھے ایک گھنٹے میں کمرے کا پھیرا لگاتا ہے۔ جیسے کانتے اُس کا کوئی عزیز ہو۔

یہاں پاڑے پر آتے ہی میں نے ٹنگو کو جولین کے گھر بھیج دیا جولین کے گھر اور پاڑے تک دوڑ بھاگ کے لیے کوئی شخص جولین کے تھا۔ اَبّا جان سے میں نے کہہ دیا تھا کہ رات کو وہ میرا انتظار نہ کریں۔ ورنہ نہیں۔ جولین سے بھی میں یہی کہہ کے آیا تھا۔ میں جولین کے گھر تو پاڑے تک پیرو کے ساتھ رہنے کے خیال سے چلا آیا۔ دوسرے میرا تھا۔ یہاں آ کے بھی وہی کچھ تھا مگر اب میں کہاں جاتا۔ اتنے گھر آدمی کو ایسی بے امانی ہوتی ہے۔ جمرو، شاہو اور نورانے آتے ہی ہر ایک کی زبان پر کانتے کا نام تھا۔ وہ وحشت کے عالم میں پوچھ رہے تھے آخر اُسے ہوا کیا ہے۔ میں اُنھیں کیا جواب دیتا۔ لوگ یہ سوال جانے کیوں کرتے ہیں، جب جان کے کیا اُن کی کچھ تسلی ہو جاتی ہے۔

دوسرے داداؤں اور پاڑے میں بیٹھے ہوئے بہت سے آدمیوں سے نمٹ کے جب پیرو نے دینا، راجن اور جارجی کی جانب رُخ کیا تو میں نے بھی کہنی مار کے جمرو اور شاہو کی توجہ اِس طرف مبذول کرنا چاہی۔ پیرو نے اُن تینوں کو پاس بلا لیا تھا۔ وہ خود بیشتر خاموش رہا اور راجن اور دینا سے اُن کے علاقوں کا حال سنتا رہا۔ ماچی نے پیرو کو پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا کہ تینوں پاڑوں کا بھتا وصول ہو گیا ہے۔ پیرو نے راجن اور دینا کو اُن کی بدعہدی پر دوبارہ نہ کوئی سرزنش کی نہ آئندہ کے لیے تنبیہ۔ وہ ان سے زمانے بھر کی باتیں سُنا کیا جیسے کوئی واقعہ ہی نہ ہوا ہو۔ رفتہ رفتہ پاڑے میں لوگوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ راجن اور دینا بھی چلے گئے مگر جارجی وہیں بیٹھا پہلو بدلتا رہا۔ پاڑے میں گنتی کے آدمی رہ گئے تو پیرو نے ماچی سے قہوے کی فرمائش کی۔ یہ تلخ اور کسی قدر کڑوا عربی قہوا دودھ اور شکر کے بغیر فنجانوں میں پیا جاتا تھا، پیرو کو نہایت مرغوب تھا۔ شروع شروع میں میرے حلق سے نہیں اترتا تھا لیکن اب مجھے بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ میں نے ایک فنجان پیا، جارجی نے بھی۔ قہوا ختم کرنے کے بعد بھی اُس نے کچھ انتظار کیا کہ شاید پیرو اُس کی طرف توجہ کرے لیکن پیرو کو جیسے وہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ آخر جارجی نے جھجکتے ہوئے زبان کھولنے کی کوشش کی۔ "بیٹھا رہ۔" پیرو نے بے پروائی سے کہا۔ "ابھی کیدر کو جائے گا؟"

"گھر کو بھی جانے کا ہے دادا!" جارجی دبے لہجے میں بولا۔ "ابھی دیری بہت ہو گیا ہے۔"

"یہ بھی تیرا گھر ہے سالا۔"

"ایک دم ہے دادا!" جارجی تیزی سے بولا۔

"پھر دیری کائے کا ہے؟"

"اپن ابھی اتنا بول کے نئیں آیا تھا۔"

"بول کے!" پیرو نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ابھی کسی کو، کس کو بول کے آنا ہے تیرے کو؟"

"گھر!" جارجی سٹ پٹاتے ہوئے بولا۔ "اپن گھر بول کے نئیں آیا تھا۔"

"ماری کو! اوہو۔" پیرو نے ہنس کے کہا۔ "ابھی تیرے کو ایک دم ما کا دھیان کیسے آ گیا؟"

"اپن کو۔" جارجی ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ "اپن کو ابھی تھوڑا معافی دیو۔"

پیرو معنی خیز انداز سے سر ہلانے لگا۔ "ایک دم دے گا، بھڑوے کا اولاد! کل رات اپن سے تھوڑا گستاخی ہو گیا۔"

"اپن نے جیسا تم نے بولا ہے، ابھی ویسا کر دیا ہے۔ اُدھر ابھی ایک بھی لوگ نئیں ہے اور اب کبھی نئیں آئے گا۔"

"آئے گا تو ابھی تو کدھر جائے گا۔" پیرو نے کہا۔ "پھر اپن ایدر کائے کو بیٹھا ہے؟"

"اپن جانتا ہے۔"

"نئیں جانتا۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔ "ابھی تیرا کھال پہ چڑھا چربی اپن تھوڑا کم کرے گا تو اکھا جان لے گا۔"

"ابھی تم ایسا کیوں بول رہا ہے۔" جارجی تنک کے بولا۔ "اپن کو بولو، ابھی اپن اور کیا کرے۔ ابھی اور کیا رہ گیا ہے۔"

"ابھی تو رہ گیا ہے۔" پیرو نے تلخی سے کہا۔ "ابھی تو ایدر پاڑے پر ہی رہنے کا ہے۔"

"پاڑے پہ! کیوں، کیوں دادا؟"

"یہ اپنے سے پوچھ حرام کا جنا کہ کیوں؟" پیرو بھڑک کے بولا۔ "اپن تیرے کو اکھا تین دن تین رات ایدر اُلٹا لٹکائے گا اور بولے گا، اپن کون ہے، ایدر کیسا بیٹھا ہے۔ اپن کا پاس کون سا جادو کا چھڑی ہے جو ایدر بیٹھا ہے۔"

"تم، تم کیا بول رہا ہے؟" جارجی کی آواز سن سنا رہی تھی۔ "تم نے راجن اور دینا کو تو کچھ نہیں بولا۔"

"اُس کو بولنے کا ضرورت نئیں تھا، وہ ایدر آنے سے پہلے اکھا تنکا جالا باہر جھاڑ کے آیا تھا۔"

"اور اپن، اپن تمھارا مطلب ہے، اپن ایدر...." جارجی کو خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ بُری طرح گڑبڑا گیا۔

پیرو نے اُسے دوبارہ یاد دلانا ضروری سمجھا کہ وہ چاقو کے بل اڈے

پر آیا تھا اور داداؤں کے درمیان تمام فیصلے چاقو کے ذریعے ہوتے ہیں۔ اگر جارجی کو کوئی ملال ہے تو وہ چاقو نکال لے، چاقو نکالنے کا اہل نہیں ہے تو خاموشی سے ہر بات قبول کرے اور پہلے چاقو پر اپنی استطاعت بڑھائے پھر بات کرے۔ یہ دو اور دو چار کی بات ہے۔ قلابے کا پاڑا اُسے وراثت میں نہیں ملا، کوئی بھی پاڑا کسی دادا کی جاگیر نہیں ہوتا۔ جاگیر کی کنجی چاقو ہے اور دادا کا بل۔ جارجی نے کیا سوچ کے بھتا بھیجنا بند کیا تھا، اُس کی دانست میں کیا اُس کے چاقو میں زیادہ زور آگیا تھا جو اُس نے ایسا کیا۔ وہ یہ بھول گیا کہ ابھی پیرو کی موت کی کوئی خبر نہیں آئی ہے اور پیرو کے پاڑے پر ابھی ایسے اور دادا بھی ہیں جو کسی وقت بھی اُس کا چاقو چھین سکتے ہیں۔ بمبئی میں پیرو کے پاڑے کا بل ان سب سے مل کے ہی بنتا ہے۔

پیرو نے جارجی کے متعلق شاید ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا۔ اُس کے اندر ضرور کوئی گرہ پڑی ہوئی تھی جیسے کچھ چھپا رہا ہو، کچھ چرائے بیٹھا ہو۔ مجھے پیرو کے مسلسل اکراہ سے اِس کا احساس ہوا۔ جارجی کے پاس اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ پیرو کو اپنے باطن کی صفائی کا یقین دلاتا رہے۔ وہ یہی کرتا رہا۔ ماچھی نے بھی اُس کی سفارش کی "ابھی جانے دو دادا!" اُس نے ملتجی آواز میں کہا "لَوٹ پیٹ کے سالا ٹھکانے پر آجائے گا۔ اپن کا پرانا آدمی ہے۔ ابھی اس کو ایک اور چانس دیو۔"

ماچھی کی دخل اندازی پر پیرو اور بھڑک اُٹھا "یہ اب دادا کیدر رہا، یہ تو چور بن گیا۔ بھڑوا ہے سالا۔ اِس کے منہ کو خون لگ گیا ہے۔ جو دادا پیسہ بنانے لگتا ہے، وہ پاڑے کا آدمی نئیں رہتا، وہ بھڑوا بن جاتا ہے، ابھی چاقو پہ زنگ لگتا ہے، پر ایسا آدمی کا ہاتھ پہ لگ جاتا ہے۔ اپن کو ابھی یہ بالکل بدلا ہوا دکھائی پڑتا ہے۔ اِس کو بول، ابھی قلابے کا پاڑا چھوڑ دے سالا، مال بنائے۔ ابھی دوسرا چھوکری رنڈی چلاتا ہے، کل اُس کا اپنا لڑکی لوگ بھی بڑا ہو رہا ہے اور ابھی ادھی بھی ایسا پرانا نئیں ہوا ہے۔ تھوڑا پیسہ دے جائے گا۔"

جارجی کا جسم پھڑکنے لگا۔ اُس نے جھٹ اپنا چاقو نکال کے پیرو کے پیروں پر ڈال دیا اور سر بھی "قسم سے دادا!" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا "اپن ہولی فادر کو بیچ میں ڈال کے بولتا ہے، اپن کا من میں ابھی کچھ بھی نئیں ہے۔ اپن تمھارا غلام ہے۔ تم بولے گا تو اپن ایدر ہی رہے گا، کبھی ایدر سے نئیں جانے کا۔ ایک دم نئیں۔ ابھی غلطی آدمی لوگ سے ہی ہوتا ہے۔"

رات خاصی گزر گئی تھی۔ دو بج رہے تھے۔ پیرو چوکی سے اُٹھ کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صبح ماچھی نے ایک مرتبہ اشارۃً اُس سے جارجی کی سفارش کی تھی۔ پیرو کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ جارجی کی طرف سے اُس کا سینہ ابھی تک آلودہ ہے، اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، ماچھی نے اُسے پیرو کا عندیہ ہی سمجھا۔ چلتے وقت پیرو نے مجھ سے بھی کمرے میں آرام کر لینے کو کہا تھا لیکن میں جمرو، شامو زدرا، چھیدا، ماچھی وغیرہ کے ساتھ باہر چوکی پر بیٹھا رہا۔

چار بجے کے قریب وہ اونگھنے لگے اور وہیں اِدھر اُدھر پڑ گئے۔ میں شامو کے قریب ایک کونے میں لیٹ گیا۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ جیسے ہی میں آنکھیں بند کرتا، میرا جسم کھنچنے لگتا اور شور سا اُٹھنے لگتا۔ میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا، پھر اُٹھ کے ننگے پاؤں ٹہلنے لگا۔ پیرو کے کمرے کی طرف جا کے میں نے جھانک کر دیکھا۔ اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پاڑے کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ میں چوکی پر آ کے پھر لیٹ گیا۔ میرا دل اُڑا اُڑا جا رہا تھا۔ میرے لیے یہ کوئی نئی کیفیت نہیں تھی مگر کیفیت کی تکرار شاید ہر بار نئی ہوتی ہے۔ ہر بار پہلے جیسا درد ہوتا ہے، ہر بار تازہ۔

پیرو صبح سویرے اُٹھ گیا۔ میں تو بیدار ہی تھا۔ ناشتے کے وقت پاڑے پر بھیڑ ہونی شروع ہو گئی۔ جس جس کو پیرو کی آمد کا علم ہو رہا تھا وہ چلا آ رہا تھا بلکہ منہ اُٹھائے چلا آ رہا تھا مگر اِس سے پہلے کہ بھیڑ اور بڑھتی، پیرو پاڑے سے نکل گیا۔ ہم سیدھے اسپتال پہنچے۔ کانتے اُسی طرح اکڑا پڑا تھا۔ بس اُس کی سانس چل رہی تھی، سینہ آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ ڈاکٹر کیلاش بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اُس کی زبان کی قینچی بھی اب کچھ کند ہو گئی تھی۔ تَجھل کے ہونٹوں کو تو جیسے کسی نے سی دیا تھا۔ ہمارے جانے پر مسکراہٹ کی ایک لہر اُس کے چہرے پر اُبھری اور اُبھر کے کہیں ڈوب گئی۔ ہم نے اُس سے کچھ نہیں پوچھا، پوچھتے بھی کیا۔ پیرو نے التجا آمیز لہجے میں اُسے مشورہ دیا کہ وہ اب کانتے کے پاس اُسے چھوڑ کے چلا جائے۔ شام تک سہی، وہ کچھ دیر آرام تو کر لے گا۔

جواب میں تَجھل نے آہستگی سے کہا "لگتا ہے، اب ادھر بھی اپنے کو زیادہ دیر نہیں لگے گی دادا!"

"کیا، کیسا بولتا ہے تم؟" پیرو ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولا۔

تَجھل کے ہونٹ پھیل کے رہ گئے۔ ڈاکٹر کیلاش نے بھی سنا ہوگا۔ پیرو کے سامنے تو وہ کچھ نہیں بولا لیکن باہر آ کے اُس نے ہمیں اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ دماغ کے نازک آپریشن سے بحالی میں وقت لگ ہی جاتا ہے۔ ابھی تو پورے ۲۴ گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں، ڈاکٹر شرما نے پہلے ہی صراحت کر دی تھی کہ کانتے کو ہوش میں آنے کے لیے ۴۸ گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔ کہنے لگا کہ کانتے کی حالت بظاہر نارمل ہے اور نبض ٹھیک چل رہی ہے۔ وہ سڑک پر دُور تک ہمارے ساتھ چلتا رہا، ہمیں امید اور حوصلے کا درس دیتا رہا۔ اُس کا ارادہ واپس جانے کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُسے جولین کے گھر چلنے کی دعوت مجھے دینی چاہیے تھی لیکن یہ سب کچھ بے محل، بے وقت لگ رہا تھا۔ آدمی کو کبھی اپنا وجود بھی بے محل لگتا ہے۔ چوک پر رُک کے میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ کہاں تک ہمارے ساتھ آئے گا، بہتر ہے کہ واپس چلا جائے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا، وہ ساتھ ہی آنا چاہتا تھا۔ شاید وہ اپنی تلقین و تعلیم پر خود بھی مطمئن نہیں تھا۔ وہ ایک نازک طبع نوجوان تھا، اُس نے اُلٹی معذرت کی اور واپس ہو گیا۔ بعد میں مجھے پشیمانی بھی ہوئی مگر وہ دُور جا چکا تھا۔

دروازے پر دستک دیتے وقت میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ جولین ہی نے دروازہ کھولا۔ وہ لمبا گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ گاؤن اور سیاہ بالوں میں اُس کا چہرہ بدلیوں میں چاند کے مانند دمک رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں ٹھٹک کے رہ گیا، گاؤن میں اُس کی قامت کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ ہمیں دیکھ کے اُس کا چہرہ کھل اُٹھا اور سراپا متلاطم ہو کے رہ گیا۔ اُس کے اور ٹنگو کے سوا گھر میں کوئی نہیں تھا۔ شہ پارہ اور چمپا بیگم ابھی ابھی اسپتال کے لیے نکلی تھیں، جولین کی ماں اور ملازم سودا سلف کے لیے گئے ہوئے تھے۔ گھر میں ٹھنڈک تھی، خاموشی کی ٹھنڈک۔ لوگوں کے کام پر جانے کی وجہ سے دن کے وقت اس علاقے میں ویسے بھی سکون چھا جاتا تھا۔ پیرو نے بیٹھک میں قدم رکھتے ہی جولین سے ٹھنڈے پانی کی فرمائش کی اور وہیں صوفے پر لیٹ گیا۔ میں نے اُسے یاد دلانا ضروری نہیں سمجھا کہ یہاں بمبئی میں اُس کا ایک گھر بھی ہے جہاں اُس کی بیوی اور اکلوتی بیٹی گیتا عرصے سے اُس کی آمد کی منتظر ہوں گی۔ مجھے احساس تھا کہ اِس عالم میں اُسے گھر میں بھی کیا چین مل سکے گا۔ کانتے کو کیا معلوم تھا کہ وہ تو بے سدھ پڑا ہے مگر اُس کے وہ پُرسانِ حال بھی اُس سے کچھ بہتر نہیں ہیں جنھیں اپنی سدھ بدھ ہے۔ جولین نے شاید میرے چہرے سے سب کچھ پہچان لیا۔ وہ میرے پاس آ کے بیٹھ گئی اور بے تابانہ پوچھنے لگی کہ کیا بات ہے؟ آنکھیں سُرخ کیوں ہیں؟ میں نے خندہ پیشانی سے تردید کی اور کہا کہ بس ذرا تھکن ہو رہی ہے۔ مجھ سے یہ نہیں کہا جا سکا کہ میرا دل ڈوب سا رہا ہے۔ اُس نے جلدی سے میرا ماتھا چھُوا، بخار نہیں تھا، پسینے کے قطروں سے اُس کی اُنگلیاں گیلی ہو گئی ہوں گی "اندر جا کے آرام کرو۔" وہ مضطرب لہجے میں بولی "ٹھنڈے پسینے آ رہے ہیں۔"

"ہاں ہاں" پیرو نے اُس کی تائید کی "رات بھر کا جاگا پڑا ہے۔ اپن ایدر ہی پڑا ہے، ابھی اپن کیدر بھی نئیں جانے کا۔"

میں خود بھی تنہائی چاہتا تھا، ٹنگو، پیرو کے پاؤں دبانے لگا۔ اس گھر کا گوشہ گوشہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ میرے قدم خود بخود اُس کمرے کی طرف اُٹھے جہاں میں پہلے رہا کرتا تھا۔ کمرے میں پہنچ کے مجھے احساس ہوا کہ اب یہاں جولین رہتی ہے۔ وہی مسہری تھی، ایک کونے میں سنگھار میز بھی وہاں رکھی تھی۔ کمرے میں بہت کم سامان تھا، صاف ستھرا بستر، کھڑکیوں اور دروازے پر نیل گوں پردے، دیواروں پر نیا رنگ و روغن۔ سامان میں اگر کچھ تھا تو کتابیں تھیں۔ دونوں اطراف لکڑی کی بڑی بڑی الماریوں میں سلیقے سے کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ چند لستر کے قریب میز پر رکھی تھیں۔ سامنے دیوار پر کرشنا جی کی تصویر سنہرے فریم میں آویزاں تھی۔ مجھے یاد تھا، ایک مرتبہ کرشنا جی نے جولین کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی طور اپنا مطالعہ جاری رکھے۔ مطالعہ اُسے مصروف بھی رکھے گا اور اُس کی علمی استطاعت بھی بڑھائے گا۔ کرشنا جی نے کہا تھا کہ کتابوں میں ایک دنیا بند ہوتی ہے، کتابیں اسرار و فسوں کی کنجی ہیں۔ سارے جہاں کی سیر اِن کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ مخاطب تو وہ جولین ہی سے تھے لیکن میں جانتا تھا، جولین کے بہانے وہ مجھے مطالعے کی ترغیب دے رہے تھے۔ اُس زمانے میں میں نے اُن کی بعض کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا لیکن پھر مجھے موقع ہی نہیں ملا، ملتا بھی کیسے۔ لگتا تھا، جولین نے اُن کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا ہے اور مسلسل پڑھتی رہی ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ ان کتابوں میں اردو کی بہت سی کتابیں بھی تھیں۔

مجھے کمرے میں آئے ایک گھنٹے کے قریب گزرا ہوگا، جولین نے کمرے میں جھانک کے دیکھا۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، وہ اندر چلی آئی۔

"جاگ رہے ہو؟" اُس نے سرگوشیانہ پوچھا۔

"ہاں، نیند نہیں آ رہی۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا "لیکن یہاں بڑا سکون ہے۔"

اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ سفید ساڑی کے کناروں پر نیلے رنگ کی چوڑی پٹی بنی تھی، کانوں میں آویزے، گلے میں نیکلس، یہ وہی نیکلس تھا جو کل اباجان نے اُسے دیا تھا۔ میرے پاس آ کے اُس نے دوبارہ میرا ماتھا چھُوا۔ اب اُس کی اُنگلیاں تر نہیں ہوئی ہوں گی۔ اُس نے اطمینان کی سانس لی اور بولی "کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

"میں یہاں مہمان نہیں ہوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

وہ میرے سرہانے کھڑی تھی۔ میں نے اُس سے بیٹھ جانے کو کہا اور خود بھی مسہری کے تکیے سے ٹیک لگا کے نیم دراز ہو گیا "پیرو بھائی سو رہے ہیں؟"

"وہ بھی جاگ رہے ہیں، ٹنگو اُن کے پاس ہے"

"شہ پارے وغیرہ نہیں آئیں؟"

"آجانا چاہیے، خدا کرے، خیریت ہو۔"

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ پلنگ کے سامنے رکھی ہوئی کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی، اتنے قریب کہ میں اُس کی سانسیں سُن سکتا تھا۔ میں نے اُسے بٹھا تو لیا تھا لیکن اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کروں۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اِس عرصے میں اُسے کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔ اور بھی بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ لیکن سب ذہن میں خلط ملط ہو گئیں۔ وہ بھی سر جھکائے جانے کیا سوچ رہی تھی، سوچتے سوچتے اچانک بولی "زرّیں کیسی ہیں؟"

"زرّیں؟" میں نے چونک کے کہا "ٹھیک، بالکل ٹھیک ہے۔"

"انھیں دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔"

"اب کے تم ساتھ چلنا۔" میں نے تیزی سے کہا "یقیناً تم اُس سے مل کے بہت خوش ہو گی، وہ بہت اچھی ہے۔"

"میں نے اُن کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔"

"کم سُنا ہو گا مگر تمھیں کس نے بتایا؟ کیا میں نے کچھ بتایا تھا؟"

"شاید.... مگر کانتے بھائی تو بس اُٹھتے بیٹھتے انھی کا ذکر کرتے ہیں۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

"ہاں، ایک کانتے کیا، شاید کوئی اُسے ناپسند نہیں کرتا۔ بہت عجیب ہے وہ۔ تبھل بھائی، مجھے یقین ہے کہ تبھل بھائی کا جی بھی اب کہیں اور نہیں لگتا۔ اسُی کے پاس رہنا چاہتے ہیں اور وہ ایک وہی ہے جو اُن پر حکم چلاتی ہے۔ تبھل بھائی کا بس نہیں چلتا کہ اُس کا حکم سُننے جائیں۔ اب کے میں تمھیں ضرور لے چلوں گا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے اُس سے بھی تمھارا تذکرہ کیا ہے۔ چلوگی نا؟"

وہ پلکیں پٹ پٹانے لگی۔

"تم دیکھنا، وہ تم سے کیسے ملتی ہے، احساس ہی نہیں ہوگا کہ تم کسی اجنبی سے مل رہی ہو، وہ تو سمندر ہے، اُس کا دل سمندر ہے۔ تمھاری طرح وہ بھی نہایت نفاست پسند اور سلیقہ شعار ہے۔ پھولوں سے بنی، شیشے کے مانند۔ تم میں اور اُس میں جانے کتنی باتیں مشترک ہیں۔"

جولین کے تراشیدہ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ وہ خاموش رہی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا۔ "بلکہ میرا خیال تو یہ ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ تم بھی وہیں رہو، سب کے ساتھ۔ تم وہاں جاؤگی تو خود واپس آنا نہیں چاہوگی۔"

"ابّاجان اب کب جائیں گے وہاں؟"

"ابّاجان؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں کب جائیں گے، اُن کا کیا ارادہ ہے اور وہ کہاں رہنا پسند کریں گے۔ وہ اب بہت بڑے آدمی ہیں۔ نوابوں کے نواب۔ مگر اُنھیں زرّیں سے بہت اُنس ہوگیا تھا۔ بہت خیال رکھتے تھے اُس کا۔ زرّیں کی حویلی بھی بہت بڑی ہے۔ خاندان کے خاندان اُس میں سما سکتے ہیں۔ کاش وہ وہیں رہنے کا ارادہ کرلیں لیکن یہ سب اُن کی مرضی پر منحصر ہے۔ چند دن ہوئے، اُنھوں نے حیدرآباد میں بھی ایک بہت بڑی حویلی خریدی ہے۔ دیکھو، وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔"

"مگر ابّاجان تمھاری رائے جاننا تو ضرور چاہیں گے۔"

"میں کیا رائے دے سکوں گا۔ مجھے کوئی رائے دینے کا حق بھی کہاں پہنچتا ہے۔ میں تو اُنھیں چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ میں نے تو ...."

"اب کیوں دُہراتے ہو۔" وہ میری بات کاٹ کے بولی۔ "ہوجاتا ہے۔ خدا نے یہی کچھ کرم کیا ہے کہ سب مل گئے۔ کیسا خواب جیسا واقعہ ہے۔"

"مجھے تو سمجھو اب بھی کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی خواب تو نہیں؟"

اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "اگر خواب ہے تو کاش یوں ہی رہے۔ خواب بھی تو ایک حقیقت ہے۔ اتنے دل کش خواب ہوں تو آنکھ کھلنے کی آرزو کوئی کیوں کرے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، خواب میں کبھی کیفیتیں تو حقیقتوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔" جولین کیسی کیسی باتیں کرنے لگی تھی! میں نے اُس سے پوچھا۔ "تمھیں فرخ وغیرہ کیسی لگیں؟"

اُس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ "کیا بتاؤں۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سب کچھ بیان سے باہر لگتا ہے۔"

"تم نے امّی کو نہیں دیکھا۔ یہ تو اُن کی گرد بھی نہیں ہیں، بس اُن کی جھلک جانو...."

"میں اندازہ کرسکتی ہوں۔"

"یہ میں اِس لیے نہیں کہہ رہا کہ وہ میری ماں تھیں، وہ سب پر سایہ تھیں، اپنا کیا، پرایا کیا۔ سارے محلّے، سارے خاندان میں لوگ اُن کی ... کرتے تھے۔ وہ سب کے لیے محبت تھیں۔ کاش، کاش وہ بھی ...."

آواز ڈگمگانے لگی۔

"ہاں، بہرحال یہ خوشی بھی کیا ...."

"بے شک یہ بہت بڑی خوشی ہے لیکن اُنھیں دیکھ کے مجھے امّی یاد آرہی ہیں۔" میری آنکھوں میں گرج سی ہونے لگی۔ "اُن کے پاس ... تو جیسے امّی میرے سامنے کھڑی ہوجاتی ہیں۔ اُن کی نگاہیں مجھے ہر طرف منڈلاتی معلوم ہوتی ہیں، اُن کی خوشبو مجھے ہر طرف محسوس ہوتی ہے۔" ... نے اپنا منہ چھپالیا۔ میں خود کو روک نہ سکا، میری سسکیاں نکل گئیں۔

"ارے ارے۔" اُسے پریشان ہو ہی جانا چاہیے تھا، وہ کرسی ... کھڑی ہوگئی اور مسہری پر میرے قریب آکے بیٹھ گئی۔ "یہ کیا، یہ کیا؟" وہ ... لہجے میں بولی۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے ریشم جیسے ہاتھوں میں بھر ... نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ میرے آنسو اُمڈے آرہے تھے۔ وہ مجھے صبر و ضبط ... کررہی تھی مگر خود اُس کی آنکھیں بھی بھری ہوئی تھیں۔ "اب اتنی دور آگئے ... حوصلہ نہیں کھونا چاہیے۔" وہ گھٹتی ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھے لگتا ہے، اب میرے اندر طاقت نہیں رہی۔"

"اب تو تمھیں خود کو زیادہ توانا محسوس کرنا چاہیے۔ امّی کا بدل ... نہیں مگر تم نے کچھ لوگ پائے بھی ہیں جو تمھیں بہت عزیز سمجھتے ہیں۔ کرشنا ... بھول گئے۔ تبھل اور پیرڈ بابا، زرّیں، شیارے، کانتے، ماسٹر، کتنے لوگ ہیں جو ... اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ زندگی اِسی آنکھ مچولی کو کہتے ہیں۔ آدمی کھوتا ہے، کبھی پاتا ہے۔ کھوتا کچھ ہے تو پاتا کچھ ہے مگر اچھا ہے، تم خوب ... جانے کب سے یہ دریا چھپائے ہوئے ہو۔" اُس نے بے اختیار میرے ہاتھوں ... دبایا اور اپنی آنکھوں سے لگالیا اور دیر تک یوں ہی بیٹھی رہی، کچھ نہیں بولی۔ یک بیک اُسے کچھ خیال آیا۔ "میں تمھارے لیے پانی لاتی ہوں۔" وہ مسہری ... اُٹھ کے ایک دم باہر نکل گئی۔

دوسرے ہی لمحے وہ گلاس لے آئی۔ اُس کے کہنے پر میں نے چند گھونٹ حلق سے اُتار لیے۔ گلاس ایک طرف رکھ کے مضطربانہ اپنی ساڑی کے ... سے آنسوؤں سے آلودہ میرا چہرہ، میری آنکھیں خشک کرنے لگی۔ مجھے عجیب لگا۔ وہ مجھے اپنا ہی کوئی حصّہ نظر آرہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اُسے گلے لگا کے بہت روؤں لیکن اُس کے جلتے ہوئے چہرے پر جیسے ہی میری نگاہیں گئیں، میرے ... کپکپا کے رہ گئے۔ وہ اُسی لمحے کمرے سے چلی گئی۔ اُس نے یہی مناسب سمجھا ... دیر کے لیے مجھ سے دُور ہوجائے، مبادا اُس کی موجودگی میرا سینہ اور نہ کرید ... ی ہو۔ اچھا ہی ہوا، وہ چلی گئی۔ مجھے اپنے آپ کو ٹٹولنے کا وقت مل گیا۔ آدمی ... کو شاید سب سے زیادہ مؤثر تلقین کرسکتا ہے۔

خاصی دیر بعد جب وہ لوٹی تو چائے لے کے آئی، کہنے لگی۔ "کھانے کا وقت ... تھا، سوچا تم ابھی کچھ کھا نہیں سکوگے۔" پھر تردد سے بولی۔ "بھوک تو نہیں ... رہی؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

"ادھر پیرڈ بابا نے بھی انکار کردیا ہے۔"

"صبح پاڑے سے خوب ناشتہ کرکے چلے تھے۔" میں نے چائے کی پیالی خالی کردی۔

وہ اُٹھ کے جانے لگی تو میں نے اُسے روک لیا۔ "بیٹھو، کوئی کام ... نہیں ہے؟"

"نہیں۔" وہ مترنم لہجے میں بولی۔

"شیارے اور چمپا بیگم ابھی تک نہیں آئیں؟"

"اب تو اُنھیں آجانا چاہیے۔ ٹنگو کو بھیج کے دیکھا جائے۔"

"کچھ دیر اور انتظار کرلو، ممکن ہے سواری نہ ملی ہو۔"

"اتنی دیر میں تو پیدل بھی آسکتی تھیں۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی، نظریں جھکائے ہوئے۔ اب میں اُسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا کہ اِس عرصے میں کتنی بدل گئی ہے۔ اُس کے رخساروں پر شفق سی چمک رہی تھی اور ہونٹ جیسے ہوا کے جھونکے سے بکھر بکھر جاتے۔ آدمی بھی گلستاں، آدمی بھی صحرا ہوتے ہیں۔ اُسے روکنے کے جواز کے طور پر مجھے کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن سب کچھ میرے ذہن میں منتشر ہوگیا۔ میں نے سوچا، جواز کی کیا بہت ضرورت ہے، کیا میں اُس سے یوں ہی سامنے بیٹھ جانے کو نہیں کہہ سکتا۔ میں بہت دنوں بعد اُسے دیکھ رہا تھا۔ تبت میں بھی کتنی بار مجھے اُس کا دھیان آیا تاہم ایک اطمینان تھا کہ چمپا بیگم یہاں موجود ہے۔ کانتے بھی آتا رہتا ہوگا۔ جولین خود بھی بہت ذہین، بہت حوصلہ مند ہے۔

میں خاموش رہا تو چند لمحوں بعد اُس کا بدن بل سے کھانے لگا اور وہ اٹکتی زبان سے بولی۔ "ابّاجان نے بھی آج آنے کو کہا تھا۔"

"ارے! کہیں تم اُن کی خاطرداری کی تیاریوں میں تو نہیں لگی ہو؟"

"خاطرداری کیا، کچھ بھی انتظام نہیں کیا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے، تم تو اِس معاملے میں طاق ہو۔" میں نے کہا۔ "ایسا ہے تو پھر تم جاؤ۔ تمھارا دل اُسی میں اٹکا رہے گا۔"

"ممی آگئی ہیں۔ میں یہاں کچھ دیر اور بیٹھ سکتی ہوں۔" وہ شگفتگی سے بولی۔

"ہاں شاید۔" میری آواز بوجھل ہوگئی۔ "تم سے بات کرنے کا وقت بھی کب ملا؟"

"اب جلدی کہیں جانا تو نہیں ہے؟" وہ زیرِ لب بولی۔

"اب کہاں!" میں نے سانس لے کے کہا۔ "فیض آباد ہی جانا ہوگا۔ تبھل بھائی اور ابّاجان پر منحصر ہے کہ وہ کب ارادہ کرتے ہیں۔ فیض آباد تو تم بھی بہرحال ساتھ چلوگی مگر ہاں، غالباً حیدرآباد کی طرف بھی جانا پڑے۔"

"حیدرآباد کیوں؟"

"آپی جو وہاں ہیں۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "مگر کیا، کیا تم خانم آپی کو جانتی ہو؟"

"کسی حد تک۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "کانتے بھائی نے اُن کے بارے میں بتایا تھا۔"

"کانتے نے کیا بتایا ہوگا۔ بس کچھ یوں ہے کہ وہ زرّیں ہی کی کوئی بچھڑی ہوئی بہن معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتی بھی یہی ہیں۔ خانم تو کسی ملکہ کے مانند ہیں۔ کوئی ملکہ ہی ایسی ہوسکتی ہے۔ تمام شاہانہ القاب و خطابات اُن پر ختم ہیں۔ اُن کی ذات کوئی طلسم خانہ ہے۔ تہ بہ تہ، وہ سر بہ سر سایہ ہیں۔ پاس جاؤ تو چھاؤں کا احساس ہو۔ ستار سے اُنھیں عشق ہے حالانکہ وہ خود کسی ساز سے کیا کم ہیں۔ آواز سے نغمگی پھوٹتی ہے۔" جانے یہ لفظ کیسے میری زبان سے ادا ہوتے گئے، جب خیال آیا تو زبان لکنت کرنے لگی۔ میں نے بہ عجلت کہا۔ "ایک لمبی داستان ہے۔ بڑی طویل کہانی ہے پھر کبھی اے دوست!"

چند لمحوں بعد میں نے کہا۔ "خانم کو ظاہر ہے، اپنے گھر فیض آباد ہی آنا ہے۔ اُنھیں لینے کوئی تو جائے گا۔ ضروری نہیں کہ میں ہی جاؤں۔ میں اب کہیں جانا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" وہ تجسس سے بولی۔

"بس اب مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"کیا کوئی سُن گُن مل گئی ہے؟" وہ ڈھیلے لہجے میں بولی۔

"کاہے کی، کاہے کی سُن گُن؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جس کی کھوج تھی؟"

"تم .... تم جانتی ہو؟" میں نے اضطراب سے کہا مگر میری یہ حیرت بے وجہ تھی۔ اُسے مجھ سے اگر کوئی نسبت تھی تو سب کچھ جاننا ہی چاہیے تھا۔ میں بھول گیا، یہ تو میں نے بھی اُس سے کہا تھا کہ مجھے کسی کے لیے جانا ہے اور میرا کچھ طے نہیں ہے کہ مجھے کتنی دُور، کہاں تک جانا پڑے۔ میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں، سب بے کار ہے، یہ دُنیا بہت بڑی ہے۔"

"مگر حوصلے کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔"

"سب کہنے کی بات ہے۔ حوصلے سے آدمی دُنیا کی پیمائش کرتا ہے اور ہمیشہ دھوکا کھا جاتا ہے۔ دُنیا اور بڑی لگتی ہے۔"

"ہو سکے تو مجھے کچھ بتاؤ۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"کیا بتاؤں! بتانے کو کچھ ہو تو بتاؤں۔ کرو گی بھی کیا جان کر۔ کوئی اچھا ذکر نہیں ہے۔ لوگ شاید صحیح کہتے ہیں کہ سب ستاروں کا کھیل ہے۔ اگر یہی ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

"لوگ اُمید کے بارے میں بھی کچھ کہتے ہیں کہ وقت موسم کی طرح نہیں ہوتا۔" وہ جھنجھناتی آواز میں بولی۔ "اچھا وقت بہار کا پابند نہیں ہے۔"

"پھر سب وقت پر ہے نا مجھ پر تو نہیں، پھر میں کیا کروں؟"

"کوشش اور ہمت تو نہیں چھوڑنا چاہیے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "ابا جان کی مثال سامنے ہے۔"

"ہاں اگر یہ ہمت بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اس کے مجھے تلخ تجربے ہوئے ہیں۔ ایک میرا معاملہ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی مگر کوئی آدمی اکیلا نہیں آتا۔ اُس کی لپیٹ میں بہت سے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک شخص کی وجہ سے بہت سے لوگ بے گھر بے در ہو سکتے ہیں۔ میں نے کتنے لوگوں کو تنگ کیا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں تو میرا رُواں رُواں لرزنے لگتا ہے۔ مجھے ہول سا آتا ہے۔ میں نے طے کیا ہے کہ اب اپنی من مانی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا جب ہم بمبئی آرہے تھے، راستے میں میرے دماغ میں سمائی، مراد آباد آرہا ہے ایک بار جا کے اور دیکھ لوں، چنانچہ میں نے بڑے بھائی سے ضد کی کہ کیوں نہ ہم بمبئی کے بجائے ایک پہر کے لیے حیدر آباد چلیں۔ میں نے تنہا جانے کو کہا تھا مگر بڑے بھائی مجھے اکیلا کیسے چھوڑ دیتے۔ اُنھوں نے کسی طرح ابا جان کو بھی آمادہ کر لیا۔ کاش ایسا نہ ہوتا، وہ انکار کر دیتے۔ ہم حیدر آباد نہ جاتے تو یوں سب کچھ پیش نہ آتا۔ وہاں جا کے وہی جواب ملا جو اب تک ملتا رہا ہے۔ ایک پہر کی بات تھی۔ ہم دوسری گاڑی سے یا دوسرے دن کسی وقت روانہ ہو جاتے مگر واپسی کے راستے ہمارے لیے بند کر دیے گئے، ایک ایسا زنداں ہمارا منتظر تھا جہاں صیاد منصف بھی تھا، مدعی بھی۔ ابا جان ہماری تلاش میں گلی کوچوں کی خاک چھانتے پھرے۔ بڑے بھائی کو اپنے زخمی پیر سے اتنا لمبا سفر کرنا پڑا۔ خانم دوبارہ منتشر ہوئیں کسی آس میں۔ نواب عالم تاب کی سانس اٹکی ہوئی تھی مگر وہ زندہ تو تھا، زندہ تھا تو ایک امید زندگی کی درازی کی بھی تھی۔ خانم کا پہنچنا اُس کی نجات کا باعث بنا مگر وہ کتنے لوگوں کو اکیلا کر گیا۔ پھر پولیس، گولیاں، خنجر، میرے سامنے ابا جان کا گریباں چاک کیا گیا، اُنھیں طمانچے مارے گئے۔ یہ جو تم کانتے کو دیکھ رہی ہو، اُس کا یہ حال صرف اس وجہ سے ہوا کہ وہ ابا جان کی سپر بن کے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ آگے نہ بڑھتا تو اُس جگہ مجھے جانا پڑتا مگر وہ بازی لے گیا۔ ایک آدمی کو یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اتنے نگہداروں کو بے آرام کرے، اتنے لوگوں کا سکون غصب کرے۔ کیا میں اندھا ہوں! مجھے نظر نہیں آتا کہ یہ سب کس وجہ، کس کے سبب سے ہوتا ہے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ امی وقت سے پہلے کیوں چلی گئیں اور پھر..." میری آواز رُندھنے لگی۔ وہ دم بخود بیٹھی تھی۔

"میں تمھیں کیا کیا بتاؤں۔" میں نے اُس سے کہا۔ "سب بکھر چکا... جاتا ہے۔ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کتنے گھر رُل جائیں گے۔ کون کون اُجڑ جائے... کے سفر میں بھی لوگ ہمارے تعاقب میں تھے، وہ یہاں تک آئے... سی چوک ہو جاتی تو جانے کس کا وقت آیا تھا اور وہاں دلی ہی سے اس کی ابتدا ہو گئی تھی۔ دلی اسٹیشن سے ہم حیدر آباد جانے والی... ہوئے تو ڈبے میں ایک دُور افتادہ لڑکی موجود تھی، میرے سان و گمان میں بھی... کم سخن، شیشہ اندام ایسی سرکش نکلے گی۔ سونیا نے وہیں ڈبے میں دم توڑ دیا..."

"کیا، کیا؟" جولین بیٹھی ہوئی آواز میں بولی۔ "سونیا کون..."

"سونیا بھی ایک لڑکی تھی، تمھارے جیسی، شہزادے جیسی ایک... دیکھنے والی ایک لڑکی..." میری آواز جل رہی تھی۔ "بہتر ہے کچھ اور..."

"مجھے بتاؤ، کون تھی وہ؟" وہ اضطراری لہجے میں بولی۔

میں نے اپنی زبان کو لگام دی۔ مجھے جولین کے ظرف کے مطابق ہی بتانا چاہیے۔ میری زبان پر سونیا کا نام بے اختیار آگیا تھا... کو کیا بتاتا اور کہاں سے بتاتا کہ سونیا کلکتہ جیل کے جیلر صاحب کی لڑکی... میں نے سات سال گزارے تھے۔ میں اُسے پڑھانے جاتا تھا اور اُس نے... اپنے آپ ہی اتنا گہرا نقش بنا لیا تھا۔ میں نے جولین سے منّت کی کہ مجھے... کہنے کا یارا ہے، نہ وہ اُس کی متحمل ہو سکتی ہے۔

"ہو سکے تو مجھے بتاؤ۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "کچھ اسی طرح... بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

"بہت سے بوجھ جسم میں شامل ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب ایسا کچھ چھپا نہیں رہا ہے، تاہم جو رہ گیا ہے، اُسے جان کے تمھیں... نہیں ہوگی۔"

اچھا ہوا، اُس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شبا... چھپا بیگم آگئیں، اُسے مجھ سے اصرار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کانتے کے بارے کوئی نئی خبر نہیں لائیں، دونوں کے چہرے سُتے ہوئے تھے۔ لباس تبدیل کے لیے وہ فوراً کمرے سے چلی گئیں۔ جولین گم صم بیٹھی رہی۔ شہر بانو اور... کمرے سے گئیں تو وہ آہستگی سے بولی۔ "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں، ہاں۔" میں نے چونک کے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"تمھارے بارے میں ہے۔"

"میرے بارے میں؟ ایسی کیا بات ہے؟"

"یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔" وہ سمٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"پھر کہاں؟"

"کہیں بھی جہاں کچھ وقت مل سکے۔"

"کہیں چلیں گے۔" میں نے تذبذب سے کہا۔ "مگر، مگر..."

"میں کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، یہ جاننے کے لیے کہ میں تمھارے کو...

آسکتی ہوں ۔"

مَیں نے ایک گہری سانس لی ۔" غالباً جو تم کہنا چاہتی ہو' میں نے پہلے ہی اُس کا فیصلہ کر لیا ہے "

" مگر وہ تمھارا فیصلہ ہے ۔"

" ہاں' ہاں ۔" مَیں نے ہچکچاہٹ سے کہا ۔

" مگر تمھارے لیے سوچنے والے دوسرے بھی تمھارے متعلق کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں' میرا مطلب ہے' تمھارے لیے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں. یہ دوسری بات ہے کہ تم اُسے قبول نہ کرو ۔"

" نہیں نہیں' مَیں تو یہی کہہ رہا ہوں ۔"

" مگر شاید میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں ۔"

" تم کیا' کیا ؟ ...." میں نے بے ربطی سے کہا ۔ اُس کے چہرے پر کیسا اعتماد تھا' اتنے عرصے جیسے وہ اِس اعتماد کی افزائش کرتی رہی ہو ۔ میں نے جھپکتی پلکوں سے اُسے دیکھا ۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر آکے گزر گئی ۔ باہر سے کسی کی چاپ سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے چمپا بیگم کمرے میں داخل ہوئی' پھر شہ پارہ ۔ دونوں اُڑتی ہوئی آئی تھیں ۔

چند لمحوں بعد جولین وہاں سے چلی گئی لیکن جانے کے بعد بھی موجود رہی ۔ چمپا بیگم جانے کیا باتیں کر رہی تھی ۔ یاد نہیں' میں نے کیا سنا' کیا نہیں

دوسرے دن سہ پہر میں پیرو کے ساتھ پاڑے آگیا تھا ۔

ابا جان' فرخ' فریال' فارہہ اور اکبر کل شام جولین کے گھر آئے تھے اور رات کو بھی واپس نہیں گئے ۔ ابا جان کو اگر کوئی تردد تھا تو دُور ہو گیا ہوگا کہ وہ کسی اور گھر میں نہیں آئے ہیں مگر صرف اتنی بات نہیں تھی ۔ ٹنگو تقریباً گھنٹے گھنٹے بھر بعد اسپتال جاتا تھا اور کانتے کے بارے میں اسپتال سے ایک ہی خبر لاتا تھا ۔ ڈاکٹروں کے بہ قول جتنی دیر ہو رہی تھی' اچھا نہیں ہو رہا تھا ۔ ٹنگو نے یہ بتا کے سب کو اور آزردہ کر دیا تھا کہ ڈاکٹروں نے ہمارے خیال سے اڑتالیس گھنٹے بتائے تھے حالانکہ خود اُنھیں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر کانتے کے ہوش میں آنے کی توقع تھی ۔ ٹنگو کو یہ بات اسپتال میں اُس کے کسی واقف کار نے بتائی تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ کانتے کے کمرے میں ڈاکٹروں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی ۔ وقفے وقفے سے ایک کے بعد دوسرا ڈاکٹر اُسے دیکھنے آتا رہا ۔ پھر کوئی بھی رات کو نہیں سویا ۔ فرخ' فریال وغیرہ کانتے کو نہیں جانتی تھیں مگر وہ اس طرح بے تعلق بھی کیسے رہ سکتی تھیں ۔ ابا جان نے آتے ہی ٹنگو اور پیرو کی مدد سے غریبوں میں کھانا تقسیم کرانے کے لیے بہ عجلت انتظام کیا تھا ۔ رات بھر چمپا بیگم جانماز پر بیٹھی دعائیں کرتی رہی ۔ شام کو میں اور پیرو بھی تھوڑی دیر کے لیے اسپتال گئے تھے ۔ مَیں باہر ہی کھڑا رہا ۔ مجھ میں تھل کے سامنے جانے کی ہمت نہیں تھی ۔

جولین کے گھر کی ساری بتیاں روشن تھیں مگر ہر طرف اندھیرا سا نظر آ

رہا تھا ۔ روشنی بینائی سے مشروط ہے مگر جتنا اُس کا تعلق بینائی سے ہے اُتنا ... سے بھی ہے ۔ دل سب سے بڑی بینائی ہے ۔ دل میں تاریکی ہو تو کتنی ہی بجلیا... اندھیرا نہیں جاتا ۔ پیرو کے اصرار پر ابا جان بیٹھک میں لیٹ گئے تھے لیکن ایک ... کے لیے بھی اُن کی آنکھ نہیں لگی ۔ جولین' شہ پارہ رات بھر سب کے لیے چائے بنا... ابا جان بار بار ٹنگو کو اسپتال بھیجتے تھے اور اُس کی آمد پر سب بیرونی کمرے ... ہو جاتے تھے اور ایک دوسرے کی صورتیں دیکھتے رہتے تھے ۔ جولین اور شہ... رات کے کھانے میں خاصا اہتمام کیا تھا مگر سب نے بس رسم ادا کی تھی ۔ صبح تا... اٹک اٹک کے گیا ۔ ابا جان سویرے ہی اسپتال چلے گئے تھے اور کوئی نو بجے ... آئے تو جیسے پھول ساتھ لائے تھے اور روشنی ساتھ لائے تھے ۔ سبھی کے چہ... روشنی جیسے واپس آگئی ۔ اُنھوں نے آکے مژدہ سنایا کہ آخر کانتے کو ہوش آ... اُن کے کہنے کے مطابق صبح کانتے نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں کھولی... اور تھل اور ابا جان کو سرہانے دیکھ کے بے چین ہوا تھا ۔ تھل نے اُس ک... کو بوسہ دیا تو اُس کے ہونٹوں میں لرزش سی ہوئی ۔ اُس نے کچھ بولنا چاہا مگ... نے اُس کے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دی ۔ اُسی وقت ڈاکٹر کو بلایا گیا' اُس نے تفص... معائنے کے بعد اطمینان کا اظہار کیا ۔ گو کانتے پھر غافل ہو گیا تھا مگر ڈاکٹر کا ... تھا کہ یہ لمحاتی بیداری کانتے کے لیے بہت اچھا شگون ہے ۔ طبعی اور نفسی... پر نہایت مفید ہے ۔ اِس سے کانتے کے ارادے کی توانائی بحال ہوگی' زندگی... ارادے کی ۔ منیر علی چوں کہ ساتھ نہیں آئے تھے' اس لیے ابا جان کو گھر پہنچ... تھی ۔ دوپہر کا کھانا کھا کے وہ پھر چلے گئے ۔ مجھ سے اُنھوں نے ساتھ چلنے کو نہیں... تھا' نہ فرخ فریال نے ۔ گویا اُن کی رائے بھی یہی تھی کہ مجھے ابھی یہیں ٹھہرنا... میں پیرو کے ساتھ پاڑے چلا آیا ۔ پیرو کا اپنے گھر جانے کا کوئی ارادہ معلو... ہوتا تھا ۔ پاڑے پر لوگوں کی تعداد بہت کم تھی ۔ ماچھی نے بتایا کہ کل ہلا... کے بعد شام تک لوگ انتظار میں بیٹھے رہے' صبح بھی بہت سے آدمی آئے تھے ... نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ ابھی چند روز تک دادا پاڑے پر نہیں بیٹھے گا' جا... وہ آنے کی زحمت نہ کریں ۔ معلوم ہوا کہ صبح جارج بھی اپنی بیوی ماری کے ... آیا تھا' وہ پیرو کے لیے مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے لایا تھا ۔ پاڑے میں ... سکون تھا' سکون کچھ کانتے کی وجہ سے بھی تھا ۔ لگتا تھا جیسے دریچے کھل... ہوں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی ہو ۔ کچھ دیر وہاں ٹھہر کے میں' جمرو اور ... کے ساتھ باہر نکل گیا ۔ سڑکوں پر شام اتنی اداس نہیں ہوتی ۔ ہم دُور تک نکل... جدھر دیکھو' ایک خلقت' ایک شور معلوم ہوتا تھا' لوگوں کے ہاں بس ... دن ہے' آج کے بعد زندگی کا یہ میلا تمام ہو جائے گا ۔ اُن میں شاید ہی ... بے کار تھے ۔

ڈھلتے سورج کے وقت ہم پاڑے سے چلے تھے ۔ چلتے چلتے اندھ... لگا اور سڑکوں پر روشنیاں جلنے لگیں ۔ شامو کی خواہش پر ہم نے ایک ... چائے پی اور رکیلا چٹنی کے ساتھ کاغذی سموسے کھائے ۔ ہوٹل سے ...

... پر یکایک شامو کو احساس ہوا کہ کچھ لوگ ہماری تاک میں ہیں ۔ مَیں نے ... سرسری انداز میں نظر دوڑا کے دیکھا ۔ شامو کا خیال صحیح تھا ۔ وہ اچکے ... برمربر ... اور ہوٹل ہی سے اُنھوں نے ہمارا تعاقب شروع کیا تھا ۔ شامو اور جمرو کی بمبئی ... نو واردی کا اندازہ لگا لینا اُن کے لیے مشکل نہیں تھا ۔ ہوٹل میں جمرو کا بٹوا ... دیکھ لیا ہوگا ۔ جمرو کو کاؤنٹر پہ دیر لگی تھی ۔ بڑا نوٹ نکالنے پر ہوٹل والے ... تھوڑی بہت چیں چیں بھی ہوئی تھی ۔ شامو کو مستی سوجھی ۔ وہ آگے کسی گنجان ... پیچھے آنے والوں کو ایک موقع دینا اور اُس کے بہ قول ذرا اُن کے ہاتھ ... مہارت دیکھنا چاہتا تھا ۔ جمرو کی رگ بھی پھڑکنے لگی تھی ۔ مَیں نے اُنھیں ... فی الحال وہ دو ہی نظر آرہے تھے مگر اِدھر اُدھر اور بھی ہو سکتے تھے ۔ ظاہر ... شامو عین موقع پر تماشا کرتا ۔ بھاگنے کی صورت نہ ہو تو ایسے وقت جواب ... زور ہاتھ چھوڑا جاتا ہے اور یہ دیکھ کے اِدھر اُدھر قریب ہی دُبکے ہوئے ساتھی ... زمانے میں سامنے آجاتے ہیں' سامنے کیا' آتے ہی ٹوٹ پڑتے ہیں اور ... مار رکھنے' واویلا مچانے والے کو اُلٹا نکو بنا دیتے ہیں ۔ شامو اور جمرو کو یہ سب ... سے زیادہ معلوم تھا لیکن وہ صرف اُن سے بھڑنے کا مزا لینا چاہتے ... اُن سب کو بے شک ہم بھگت لیتے اور آیندہ کے لیے کوئی تلقین ضرور ... لیکن ہمیں اُن سے فضول اُلجھنے کی کیا ضرورت تھی ۔ اِس پنجہ آزمائی میں ... پولیس والا بھی ہماری طرف متوجہ ہو سکتا تھا ۔ تعاقب کرنے والے صاف نو... معلوم ہوتے تھے ۔ اُنھیں آدمی آدمی کی کچھ تو پہچان ہونی چاہیے تھی' ہماری ... ارے جسم ۔ اُنھیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا' صرف جمرو کے بٹوے پر اُن کی نظر گئی ... اور بمبئی میں ہماری اجنبیت پر ۔ بہرحال آگے آگے جمرو اور شامو کو احساس ... یا کہ وہ ایک حماقت سے بچ گئے ہیں ۔ نتیجہ تو ایک ہی نکلتا ۔

ہم پاڑے سے ابھی فاصلے پر تھے کہ دُور سڑک پہ گلیا مجھے اپنی جانب ... دوڑا آتا دکھائی دیا ۔ اُس کی نگاہیں مسلسل اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں جیسے ... ہم پر اُس کی نظر پڑی' وہ وہیں سے چیخنے لگا اور دیوانوں کی طرح بھاگتا ... ہمارے پاس آگیا ۔" کیدر ہے تم لوگ ؟" وہ ہانپتے ہوئے بولا ۔

" کیوں ؟" اُس کی حالت دیکھ کے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔

" ایدر اکھا علاقے میں تم کو ڈھونڈنا پڑا ہے ۔ دادا ابھی ابھی نکلا ہے ۔"

" کیا بات ہے ؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا ۔

" اُدر کانتے بھائی کے لیے ماسٹر' ماسٹر آیا تھا ۔"

" کیا کیا ہوا اُسے ؟" میں نے پھٹتی آواز میں پوچھا ۔

" حالت ٹھیک نئیں معلوم پڑتا راجا بھائی ! ماسٹر سے سالا بات نئیں ... تھا ۔ دادا تم لوگ کے لیے تھوڑا دیر رُکا' پھر بھی نکل گیا ۔ ابھی سیدھا ... جانے کا بول کے گیا ہے ۔"

شامو نے یہ سنتے ہی ایک ٹم ٹم رکوالی ۔ مجھے چکر سا آنے لگا ۔ سڑکوں ... بھیڑ تھی' کوچوان اِس سے زیادہ تیز گاڑی نہیں چلا سکتا تھا ۔ آدھ گھنٹے

کے اندر اندر اُس نے ہمیں اسپتال پہنچا دیا ۔ احاطے میں قدم رکھتے ہوئے میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں ۔ اسپتال کا مقررہ وقت ختم ہو چکا تھا ۔ میں نے ڈاکٹر کیلاش کا حوالہ دیا' وہ اس وقت وہاں نہیں تھا لیکن مزید کسی حوالے کی ضرورت نہیں پڑی ۔ کانتے کا نام سُن کے انچارج نے سر جھکا لیا اور اُس کے ہونٹ پھڑکنے لگے ۔" مجھے افسوس ہے ۔" میں صرف اتنا سُن سکا ۔

پیچھے سے جمرو نے مجھے تھام لیا ۔

دروازہ کھلا ہوا تھا ۔ بیٹھک میں جانے کے بجائے مَیں سیدھا گھر میں داخل ہو گیا ۔ سارے گھر پہ سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے سبھی مر گئے ہوں اور مَیں کسی قبرستان میں آگیا ہوں ۔ جولین' چمپا بیگم' جولین کی ماں شہ پارہ مجھے دیکھ میری طرف جھپٹ پڑیں' اور بین کرنے لگیں ۔ مَیں نے اُن سے کچھ نہیں کہا ۔ مَیں اُن سے کچھ کہہ بھی نہ پایا ۔ میرا دماغ سُن ہو گیا تھا ۔ مَیں دریدہ آنکھوں سے بس اُنھیں دیکھا کیا ۔ شہ پارہ میرے بازو سے چمٹی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی ۔

اندر بغلی کمرے میں کانتے کی لاش پڑی تھی ۔

مارٹی نے مجھے ان سے جدا کیا اور اندر کمرے میں کانتے کے پاس لے جانا چاہا لیکن اُس کے سامنے جانے کے تصور سے میری آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا ۔ مارٹی نے ارادہ بدل دیا اور میری کمر تھپکتا ہوا بیٹھک میں لے آیا ۔ تھل' پیرو' ماچھی' گلیا' بھیمی' زورا' چھیدا اور بالے کے علاوہ ڈاکٹر کیلاش بھی وہاں موجود تھا ۔ میری نظریں سیدھی تھل پر جا کے بکھر گئیں ۔ وہ پیرو کے ساتھ بیٹھا دیوار پر نگاہیں جمائے بڑی پھونک رہا تھا ۔ میرے آنے پر اُس نے مڑ کے بھی نہیں دیکھا ۔ پیرو اُٹھ کے مجھے اپنے پاس لے آیا اور بڑبڑاتی آواز میں بولا :" ابھی راجا آگیا ہے تھل بھائی ۔"

" ہاں دادا ! دیکھ لیا ہے ۔" تھل کی آواز مجھے دُور سے آتی سنائی دی ۔" بیٹھ جا رے ۔"

مَیں اُس کے سامنے نہیں بیٹھا' نہ اُس نے مجھے پاس بلایا ۔ میرے آنے پر کمرے میں سسکیاں گونجنے لگی تھیں ۔ جتنی دیر میں وہاں رہا' میرا دم گھٹتا رہا ۔ سو مَیں وہاں سے اُٹھ آیا ۔ میرے دماغ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں' جا کے کس کا گریبان پکڑوں ۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا سارا وجود ڈوبتا جا رہا ہو ۔ گلی میں خاموشی تھی ۔ میں باہر چوکھٹ تھامے بے حس و حرکت کھڑا رہا ۔ جانے کب اندر سے شامو بلکتا ہوا آگیا اور میرے شانے پر سر پٹخنے لگا ۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی ۔ مجھ سے نہ اُسے سنبھالا دیا جا سکا' نہ میری آنکھیں اُس کا ساتھ دے سکیں ۔ خود شامو نے مجھے سہارا دیا اور ہم دونوں وہیں چوکھٹ کے پاس کیاری کی منڈیر پر بیٹھ گئے ۔ کچھ دیر گزری ہوگی کہ ابا جان کی ٹم ٹم آکے رُکی' فرخ' فریال' فارہہ' اکبر' ریحانہ' مولوی اکرم اور منیر علی ۔ وہ سب ٹم ٹم سے اُتر کے دیوانہ وار میری طرف بڑھے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ کیا ہوا ؟ میں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ منیر علی ہڑک ہڑک کے رونے لگے ۔ اُن کے اندر چلے جانے کے بعد اکبر بھی وہیں میرے پہلو میں منڈیر پر آگیا اور

سہمی ہوئی آواز میں کہنے لگا: آپ کے بہت گہرے دوست تھے نا بھائی صاحب! ایک بارگی میرے جی میں آیا کہ اُسے زور سے طمانچہ ماروں، وہ کتنی اجنبیت سے کانتے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ پھر اکبر کو شاید خود احساس ہو گیا، وہ زیادہ دیر میرے پاس نہیں ٹھہرا اور مجھ سے کچھ کہے بغیر اُٹھ گیا۔

تھوڑے تھوڑے وقفے بعد اندر سے شور اُٹھنے لگتا۔ جانے کون کون آ رہا تھا۔ جولین کے پڑوسی، پاڑے کے آدمی، برات گئے گلی سُنسان ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کُتے بھونکنے لگتے تھے۔ پہلے ہمارے قریب ہی منڈلا رہے تھے، پھر دُور چلے گئے۔ جمرو، ماچھی اور زدرا بھی کسی وقت میرے پاس آ کے بیٹھ گئے۔ وہ کبھی مجھے دبوچتے، کبھی جھنجوڑنے لگتے اور میرے گلے میں باہیں ڈال دیتے۔ میں اُنھیں خوب اچھی طرح دیکھ اور سُن رہا تھا لیکن دیکھنا اور سُننا اخذ کرنے پر، سمجھنے پر منحصر ہے۔ آنکھیں محض ایک وسیلہ ہیں اور کانوں کا بھی یہی ہے۔ دیکھنے اور سننے کا تعلق تو کسی اور چیز سے ہے۔ میری سمجھ میں اُن کی کوئی بات نہیں آ رہی تھی، میں اُنھیں کیا جواب دیتا۔ نہ مجھے اپنی اس نافہمی اور کم خیالی پر کوئی حیرت تھی، نہ وحشت۔ وہ مجھے تھجل کا واسطہ دے رہے تھے کہ مجھے اُس کے پاس بیٹھنا چاہیے اس وقت اُسے میری ضرورت ہو گی۔ کہہ رہے تھے کہ اُس کا بیٹا جا رہا ہے۔ ماچھی کہہ رہا تھا کہ ابھی وہ حرام کے جنے دونوں آدمی پاڑے پر ہیں۔ وہ اُنھیں اب واپس نہیں جانے دے گا جب تک اُن سے ابا جان کی حویلی میں بھیجنے والے آدمیوں کے سرغنہ نواب کے اصل نام کی تصدیق نہ کر لے گا اور نواب سمیت حویلی میں آنے والے ایک ایک آدمی کو ختم کر کے نہ آئے گا، اُس وقت تک اُسے قرار نہیں آئے گا۔ وہ اُن دونوں پر اُس وقت تک زندگی کیا موت بھی حرام رکھے گا۔ جمرو اور شامو نے بھی ماچھی کی ہم نوائی کی۔

زدرا کہنے لگا کہ کانتے کا وقت آ گیا تھا، جس کا وقت آ جاتا ہے اُس کا ایسے ہی کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔ پھر کوئی بھی اُسے روک نہیں سکتا۔ کہنے لگا، یہاں کسے ٹھہرنا ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو ٹھہرا رہے گا۔ میں بیٹھا سُنا کیا۔ پھر رات کے آخری پہر مارٹی نے آ کے اطلاع دی کہ سب اندر آ جائیں، پیرو داد بلا رہا ہے۔ مارٹی کی آمد کے ساتھ ہی مکان کے در و بام سے چیخیں بلند ہونے لگیں۔ مارٹی نے میرا بازو پکڑ کے مجھے اُٹھا لیا۔ میں نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی، اُس نے مجھے اُٹھایا تو میں اُٹھ گیا۔ وہ برا دو جو بیٹھے اندر صحن میں لے آیا، یہاں کانتے پھولوں کی سیج پر لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں مندی ہوئی تھیں جیسے خواب دیکھ رہا ہو، لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لگتا تھا، ابھی بیدار ہو جائے گا۔ صحن میں شور مچا ہوا تھا۔ شہر یارہ اُس کے پائنتی سے لگی اپنا سر پھوڑتی تھی، کبھی اپنا چہرہ نوچتی تھی۔ پیرو نے اُسے اُٹھایا تو وہ اور بے حال ہو گئی۔ اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ دوپٹا کس طرف جا رہا ہے اور لباس کس قدر بے ترتیب ہو گیا ہے۔ پیرو اُسے سب کی نظروں سے دُور لے گیا۔

مگر پیرو کو اُن سبھی کو دُور لے جانا چاہیے تھا، میرے اور تھجل کے سوا اُن سبھی کو۔ سب کا کم و بیش یہی حال تھا۔ خود پیرو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سبیل جاری تھا۔ جولین اور چمپا بیگم، فرخ، فریال کے ساتھ کھڑی بلک بلک کے رو رہی تھیں۔

میزر علی گلاب پاش چھڑک رہے تھے جس میں ان کے آنسو بھی شامل تھے۔ ابا جان کے سرہانے بیٹھے بچوں کی طرح بے کل ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر کیلاش میرے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔ اتنے قریب کہ اُس کی سسکیاں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ میزر علی نے تھجل کی طرف دیکھا پھر ابا جان کی طرف اور کانتے کی چارپائی پر جھک کر اُس کا چہرہ چھپانے کا ارادہ کیا۔ ابا جان نے اُنھیں روک دیا اور اُٹھ کے بڑھے، کانتے کی پیشانی چومنے لگے۔ دیر تک وہ دونوں ہاتھوں سے اُس کا چہرہ تھامے دیکھتے اور سسکتے رہے، پھر اُس کے سینے پر سر رکھ کے بلکنے لگے۔ میزر علی نے بمشکل اُس سے جدا کیا اور تھجل کے حوالے کر دیا۔ تھجل نے ایک قدم بڑھ کے اُنھیں بازو میں سمیٹ لیا۔ میزر علی نے کانتے کا چہرہ چھپا دیا۔

کانتے کی سواری اُٹھی تو سبھی شور مچا رہے تھے۔ جمرو، شامو، مارٹی، زدرا، ماچھی، گلبا، پھپھی اور چمپا بیگم، جولین، اُس کی ماں۔ وہ گلی میں آ گئی تھیں، تنگے پیر آ گے کئی مکانوں تک کانتے کی برات کے ساتھ چلتی رہیں۔

صبح دھوپ پوری طرح نہیں چڑھی تھی کہ ہم واپس آ گئے۔

*

سبھی گھر واپس آئے تھے اور میں بیٹھک میں اُن کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ دیر بعد مارٹی نے مجھے وہاں سے اُٹھا لیا اور اندر جولین کے کمرے میں لے آیا۔ جولین موجود تھی۔ اُس نے جلدی سے نئی چادر بچھائی اور مجھے آرام کرنے کی ہدایت کی۔ میں کسی چون و چرا کے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔ کمرے کا دروازہ بھیڑ کے وہ دونوں چلے گئے۔ ٹھنڈ لگ رہی تھی لیکن مجھ سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا۔ میں پڑا رہا۔ گزرتے وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔ کہتے ہیں کہ آدمی عناصر کا مرکب ہے اور حواس سے عبارت ہے۔ آدمی صرف احساس ہے، احساس ہی زندگی ہے۔ نیند بھی موت ہے مگر زندگی کی کوئی رمق اُس میں باقی رہتی ہے۔ یہ بے احساس بیداری تو نیند سے بڑی ہے۔ اس سے تو آدمی زندگی بھر ہلاک ہوتا رہتا ہے۔ پھر آئینہ بھی زندگی ہے۔ زندگی چلتی پھرتی زندگی منعکس ہوتی ہے اور آئینہ بے جان رہتا ہے۔ آدمی ہو کر مثال ہو جاتا ہے۔ سب کچھ اُس پر گزرتا ہے پر آئینے کی طرح۔ آئینے کی طرح تماشائی بنا رہتا ہے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں، وہ کیا تھا۔ نہ بیگانگی کا احساس، نہ یگانگت کا۔ بس کوئی حیرت، بس کوئی فسوں۔

دوبارہ جولین چائے لے کے کمرے میں آئی تو میری آنکھیں کھلی تھیں، بے پردہ آئینے کی طرح۔ اُس نے مجھ سے چائے پینے کو کہا۔ میں نے لُوٹ کر چائے لی لیکن پیالی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور سارا بستر خراب ہو گیا۔ جولین نے میرے کپڑے صاف کیے اور پوچھنے لگی کہ میں جلا تو نہیں؟ میں نے سر ہلا کے... وہ رونے لگی اور کمرے سے بھاگ گئی۔ پھر وہ فوراً واپس آ گئی۔ پیرو بھی اُس کے...

"کیا ہے اجا؟ ابھی کیا بات ہے؟"

میں اُسے دیکھتا رہا کہ کیا جواب دوں۔

پیرو کی گھومتی پتلیاں ایک ثانیے تک مجھ پر جمی رہیں پھر میرا بازو پکڑ کے اُس نے مجھے ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ میں زمین پر لڑھکتے لڑھکتے بچا، اُسی نے مجھے سنبھالا میرے قدم ابھی پوری طرح زمین پر نہیں جمے تھے کہ اُس نے اُلٹے ہاتھ سے میرے گال پر طمانچہ رسید کیا۔ جولین نے بڑھ کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہذیانی انداز میں چلّانے لگی پیرو نے اُسے ایک طرف ہٹایا اور میرے سامنے آ کے مجھ پے در پے بے دریغ طمانچے مارنے لگا۔ میں نے اُس کا ہاتھ نہیں روکا، نہ کوئی آہ بلند کی۔ میں بُت کی طرح ساکت اُس کے مقابل کھڑا رہا۔

اُس نے پے در پے میرے سینے، میری پسلیوں پہ مکّے مارنے شروع کر دیے اور اپنا پنجہ میرے چہرے میں گڑو دیا۔ میں نے کچھ نہیں کہا آخر اُس نے خود ہی ہاتھ کھینچ لیے اور اپنے بازو پھیلا کے بے تحاشا مجھے بھینچ لیا۔ اُس کی گرفت ایک شکنجہ تھی۔ مجھے اُس کے سینے سے لگ کے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں لیکایک آگ سی بھڑک اُٹھی ہے، جیسے میرے مساموں میں کوئی سوئیاں چبھو رہا ہے، جیسے کوئی میری رگیں مروڑ رہا ہے۔ رگ و پے میں ایسی گرج اُٹھی کہ میری چیخیں نکل گئیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے صحرا میں اتنا بڑا سمندر موجود ہے۔ آدمی کے بس میں آنسوؤں کے سوا کیا ہے۔ میرا سر پیرو کے شانے پر ڈھلک گیا۔ اُس نے مجھے جانے کب تک اپنی آغوش میں چھپائے رکھا۔ مجھے اپنی کوئی سُدھ بدھ نہ رہی۔

تین دن سبھی جولین کے گھر رہے، مولوی اکرم کے سوا۔ تیسرے دن پیرو، بھل کو اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے بھی ساتھ جانا چاہا تھا لیکن شہپارہ اور جولین نے روک لیا۔ چوتھے دن ابا جان نے جولین کے گھر سے جانے کی رسمی اجازت حاصل کر لی۔ میں بھی اُن کے ساتھ گھر آ گیا۔ ان چار دنوں میں پہلی بار میں نے باہر قدم نکالا تھا مگر ابا جان کے ساتھ آ کے بھی گھر میں بند رہا۔ وہ ہمہ وقت کسی لاچار کی طرح میری نگہداشت کر رہی تھیں، میرے پاس بیٹھنے کے بہانے ڈھونڈتی تھیں۔ کوئی میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی تھی۔ کوئی میرا جسم دباتی تھی۔ شاید انھیں اب تک کسی دھوکے کا گمان تھا جبھی وہ مجھے چھو چھو کے دیکھتی تھیں۔ رات کو میرا جی بہت گھبرانے لگا لیکن فرخ، فریال کے خیال سے میں نے رات گزار دی اور صبح ہوتے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

چلتے وقت فرخ کے کہنے پر میں نے کپڑے بدل لیے تھے اور ناشتہ بھی کر لیا تھا۔ گھر سے دُور آ جانے پر مجھے دھیان آیا کہ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ میں جیبیں لوٹنا بھول گیا تھا۔ ممکن ہے، پرانے کپڑوں میں کچھ نقدی پڑی ہو۔ گھر واپس جا کے میں ابا جان سے پیسے لے سکتا تھا مگر اب کون واپس جاتا۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ میرا ارادہ پہلے جولین کی طرف جانے کا تھا پھر بھل کو دیکھنے کے لیے پاڑے کی طرف لیکن ایک بڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے سمت کا خیال ہی نہ رہا۔ بہت دنوں بعد میں اس طرح اکیلا سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا، ایک کشادگی سی، جیسے میں اپنے ساتھ چل رہا ہوں۔ کسی شاعر کے بہ قول دوسرا کوئی ساتھ ہوتا ہے تو میں اپنے ساتھ نہیں رہتا۔ میری رفتار نہ تیز تھی، نہ ایسی سُست۔ چلتے چلتے میں جانے کہاں سے کہاں آ گیا۔

وہ جوہو کا ساحل تھا، وہاں شہر کی بھیڑ کم ہو گئی تھی۔ مکانات بھی وسیع و مختلف تھے۔ سامنے سمندر دکھائی دیا تو میں جا کے ریت پر لیٹ گیا۔ ساحل پر دھوپ بھی ہوئی تھی، نمی ملی ہوئی دھوپ۔ لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور میری طرح میں کوئی نہیں تھا۔ وہاں میں ہی میں تھا۔ سمندر کی کوئی اونچی لہر شور مچاتی ہوئی آتی، دُور تک ریت بھگو جاتی۔ چھینٹوں سے میرے کپڑے بھی بھیگ بھیگ جاتے۔ ان میں بڑی ٹھنڈک تھی۔ لہریں اُمڈ اُمڈ کے آ رہی تھیں، زندگی کی طرح۔ زندگی لہروں سے کتنی ملتی ہے۔ دُور سے ایک لہر بنتی ہوئی آتی ہے۔ کسی جگہ آ کے اُس کا قامت بڑھ جاتا ہے، اُس کا شور بڑھ جاتا ہے اور کنارے پر آ کے آخر سب کچھ ڈھیر ہو جاتا ہے۔ یہ لہریں کبھی نہیں تھکتیں، زندگی بھی نہیں تھکتی۔ ہر بار ناکامی سے دوچار ہوتی ہے اور ہر بار اُسی شد و مد سے اُبھر آتی ہے۔ سہ پہر تک میں وہیں اپنے دست و بازو کھولے پڑا رہا۔ اس دوران کئی آدمی میری طرف آئے لیکن مجھ سے کچھ کہے سُنے بغیر چلے گئے۔ جیسے جیسے دھوپ پیلی پڑتی جا رہی تھی سمندر بھی جیسے اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ میں ابھی وہاں سے نہ اُٹھتا اور اُٹھتی ڈوبتی لہروں کا تماشا دیکھتا رہتا اگر ایک سپاہی آ کے مجھے نہ ٹوکتا۔ سمندر کے شور میں مجھے اُس کی آہٹ محسوس ہی نہیں ہوئی۔ اُس نے میرے شانے پر ڈنڈا چبھویا تو میں ہڑبڑا گیا۔ وہ میرے سر پہ کھڑا تھا۔

"کون ہے تم؟" اُس نے درشتی سے پوچھا۔

اُس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے میں نے اُٹھ جانا مناسب سمجھا۔ یوں بیٹھے بیٹھے جواب دینے میں وہ اپنی سُبکی محسوس کرتا۔ مجھے ان لوگوں کا تھوڑا بہت تجربہ ہو چکا تھا۔ میری خاموشی سے وہ مطمئن نہیں ہوا اور اُس نے پہلے سے زیادہ درشت لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ "بہرا ہے تم؟ ہم کیا پوچھتا ہے۔ کون ہے تم؟"

"تمھیں کیا نظر آتا ہوں؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ چوڑے چکلے شانے اور بھاری تن و توش کا آدمی تھا۔ پیٹ باہر نکلا ہوا۔ چڑ چڑ ہو کے بولا کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے بظاہر نرم لہجے میں کہا کہ یہاں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اُسے میرا جواب قطعاً پسند نہیں آیا۔ کہنے لگا "تم جانتا نہیں، تم سے کون بات کر رہا ہے۔" میں نے پہلو تہی کی کوشش کی لیکن میرے منہ سے نکل گیا "تم بھی نہیں جانتا۔" سب لوگوں میں شاید ایک میں ہی اُسے نظر آیا تھا۔ کہنے لگا کہ میں اُسے سیدھا آدمی نہیں لگتا۔ وہ مجھے تھانے لے چلے گا تو وہاں میں اُسے اچھی طرح جان لوں گا اور وہ مجھے۔

اتنی سی بات پر تھانے کا ذکر بے جواز تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ وہ ٹوہ لے رہا تھا یا کچھ بٹورنا مقصود تھا۔ میری جیب میں کچھ تھا ہی نہیں۔ ہوتا بھی تو میں کبھی نہ دیتا۔ وہ خاصا کٹھ حجت آدمی نظر آتا تھا لیکن بے سبب عاجزی کرنے پر میرا دل آمادہ نہیں ہوا۔ میری تادیبانہ باتوں سے اُسے اور شہ ملی۔ ویسے بھی جب آدمی کا جی بات کرنے ہی کو نہ چاہے تو حجت تو بعد کی بات ہے۔ میں کسی کا کیا بگاڑ رہا تھا۔ ساحلوں پر ایسے کوئی روک ٹوک نہیں۔ نہ آسمان، نہ زمین، آدمی کا سب سے بڑا دشمن آدمی ہے۔ میں نے ایک نظر ارد گرد دیکھا۔ دُور دُور ہی کہیں کوئی آدمی تھا۔ میں بیٹھے بیٹھے اُس کی ٹانگیں پکڑ کے اُسے لٹا دیتا۔ اُس کی نرم آزاری سے میرے ہاتھ پیروں میں تشنج سی ہونے لگی تھی لیکن میں نے تحمل کیا۔ بہر حال وہ وردی میں تھا۔ کسی داد فریاد کے بجائے دفعتہً میں نے کھڑے ہو کے کہا۔ "چلو، کس طرف چلنا ہے۔"

اُسے مجھ سے یہ توقع نہ ہو گی۔ چند لمحوں تک وہ کشمکش و پیچ میں کھڑا رہا، پھر معنی خیز انداز میں سر ہلا کے بولا۔ "چلو، تم کوئی اونچا آدمی جان پڑتا ہے۔ ہم تم کو ضرور لے چلے گا اور اب اُدھر جا کے ہی تم کو دیکھے گا۔"

میں نے جواب نہیں دیا اور اُس کے ساتھ ساتھ ساحل پر چلتا رہا۔ کچھ دُور جا کے سڑک آ گئی۔ سڑک کے قریب اُس کی رفتار سُست پڑ گئی۔ کہنے لگا، میرے حق میں یہ اچھا ہو گا کہ کوئی بات ہو تو اُسے پہلے بتا دوں۔

"کیا بتا دوں؟" میں نے تنک کے کہا۔

"کوئی ایسا ویسا بات؟"

"تھانے ہی میں بتائیں گے۔" غیر ارادی طور پر میری آواز میں تلخی آ گئی۔ سڑک کے ساتھ مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دھوپ سمٹتی جا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے آگے کسی جگہ مجھے چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے جانے کیا کچھ سمجھانے اور باور کرانے لگتا۔ میرے جی میں آئی کہ اُس کا گریبان پکڑ لوں مگر شاید وہ اس کے بھی قابل نہیں تھا۔ تھانے کا فاصلہ رفتہ رفتہ کم ہوتا رہا۔ اب اگر وہ مجھے چھوڑتا بھی تو میں نے طے کر لیا تھا کہ خود اُسے تھانے لے جاؤں گا۔ وہ نہیں جائے گا تو میں خود جا کے اُس کے افسر سے بات کروں گا۔ افسر نے بھی بات نہ سُنی تو مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔ چاہے بعد میں کچھ بھی ہو۔ ایک بار انھیں کچھ معلوم، کچھ محسوس تو ہونا چاہیے کہ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ سب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہیے۔ میرا قیاس غلط نکلا۔ سڑک پار کر کے ہم دوسری طرف آئے تھے کہ تھانے کی عمارت نظر آنے لگی۔ وہ مجھے واقعی تھانے لے جا رہا تھا۔ وہاں جا کے جواز کے طور پر اُسے کوئی نہ کوئی الزام تراشی کرنی ہو گی۔ اس کے لیے مجھے خود کو آمادہ کرنا چاہیے۔ میرے پاس کیا ثبوت ہو گا۔ کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی ہے؟ میں نے خود کو ٹوکا۔ تھانے والے میری بات سُنیں گے یا میری دہائی۔ وہ شبہے میں مجھے حوالات میں ڈال سکتے ہیں۔ ایک دن، دو دن۔ بھل، ابا جان، پیرو وغیرہ سبھی کو پریشانی ہو گی اور اگر پاڑے کے کسی آدمی سے وہاں میری ملاقات ہو گئی تو؟ میں بھول رہا ہوں کہ میرا تعلق باقاعدہ پاڑے سے ہے۔ پاڑے کا آدمی تو پاڑے کا آدمی ہوتا ہے۔ اُسے تھانے سے دُور ہی رہنا چاہیے۔ میری جیب میں اتفاق سے چاقو نہیں تھا۔ گلے میں صرف میری مالا تھی لیکن مجھے شناخت کر لینا اُن کے لیے کیا مشکل ہے۔ بمبئی میں میں کوئی نیا نہیں ہوں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میں جھنگلک کے پاڑے کا باقاعدہ دادا رہ چکا ہوں، بالم خاں کے پاڑے کا بھی۔ وہ پرانی بات ہو گئی تو اب بمبئی کے سب سے بڑے پیرو کے پاڑے سے تو میری نسبت ایسی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ پاڑے کے آدمیوں کے علاوہ بہت سے پولیس والے بھی میرے صورت آشنا ہیں۔ پاڑے کے حوالے سے نہیں تو کرشنا جی کے حوالے سے۔ کرشنا جی کی جان بچانے کے سلسلے میں اور اُن کی موت کے وقت اخباروں میں میرا تذکرہ چھپا تھا اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ ایک ذرا سا اشارہ ملنے کی دیر ہو گی۔ اگر وہ بھی مجھ پر کوئی فردِ جرم عائد نہ کر سکے تو میری موجودی ہی اُن کے لیے کیا کم دل چسپی کا باعث ہو گی لیکن اب یہ سب کچھ بعد از وقت تھا۔ یہ تو مجھے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ بھاگنے کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ سڑک پر بھیڑ تھی اور تھانہ قریب تھا۔ مجھے سپاہی کے ساتھ اندر جانا تھا۔ پھر وہی جگہ، وہی لوگ، وہی سب۔ میرا جسم ٹوٹنے لگا۔

مگر اس کا موقع نہیں آیا۔ ہم تھانے کی عمارت سے دو ڈھائی سو قدم دُور ہوں گے کہ معاً پہیوں کی رگڑ سنائی دی۔ کسی نے تیز رفتاری میں موٹر روکی تھی۔ میں نے اور سپاہی نے بیک وقت مڑ کے دیکھا۔ گاڑی تیزی سے واپس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے ایک شخص دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ ڈاکٹر کیلاش تھا۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس وہ لپکتا ہوا سیدھا میری طرف آیا۔ "آپ؟" اُس نے تجسّس و اشتیاق سے پوچھا۔ "آپ یہاں کہاں؟"

"بس یوں ہی۔" میرے ہونٹوں پہ کھلی ہوئی ہنسی اُسے پھیکی لگی ہو گی۔ اُس نے اضطراب آمیز نظروں سے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ میرے کپڑے پانی اور ریت سے خستہ ہو گئے تھے۔ پھر اُس کی نظر سپاہی پر پڑی۔ "کیا بات ہے؟" وہ تشویش سے بولا۔

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے سنبھل کے کہا۔

"یہ کون ہیں؟" وہ سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ مجھے ذرا تھانے لے جا رہے ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"آپ کو!" وہ حیرانی سے بولا۔ "مگر کیوں؟"

"میں وہاں جوہو کے ساحل پر آرام کر رہا تھا۔"

"کیا بات ہے؟" اُس نے تمتماتی آواز میں سپاہی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں صاحب۔" سپاہی کے شانے سیدھے ہو گئے۔

"کچھ نہیں تو پھر یہ کیا ہے۔" ڈاکٹر کیلاش نے برہمی سے کہا۔ "تم انھیں کیوں لے جا رہے ہو۔ کس جرم میں؟"

"تھوڑا شک تھا صاحب پر اب ایک دم نہیں ہے۔"

"کیا شک تھا تمھیں اِن پر؟ ..."

"اگر صاحب پہلے ہی بول دیتا ..." وہ کتراتی ہوئی ہنسی سے بولا۔ "جائیے صاحب آپ کو ایسا تھانے لے جانے کا نہیں تھا۔ تھانے ایسا کون لے جاتا ہے ہتھکڑی بنا۔"

"پھر، پھر یہ کیا ہے؟"

سپاہی آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ وہ کس ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا کہ میں تو صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا کہ اُدھر بیچ پر ایک سے ایک لُچا لفنگا ہوتا ہے، وہ صاحب کا جگہ نہیں تھا۔ اُسے میرے سامنے ہونے کا بھی خیال نہ رہا۔ جتنی آسانی سے اُس نے مجھے تھانے چلنے کا حکم دیا تھا، اُتنی ہی آسانی سے دست بردار بھی ہو گیا۔ میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ ڈاکٹر کیلاش سے اُس کی کوئی جان پہچان معلوم نہیں ہوتی تھی۔ لگتا

تھا جیسے ڈاکٹر پولیس کا کوئی افسر ہو مگر افسری صرف عہدے کی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر کیلاش تو اپنی افسری و برتری کے تمام تمغوں، تمام علامتوں کے ساتھ تھا۔ سپاہی کو اس کا لحاظ کرنا ہی چاہیے تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" ڈاکٹر کیلاش نے ترشی سے پوچھا۔

"گپنت رائے بولتے ہیں مجھ کو۔"

"اسی جوہو والے تھانے میں ہو تم؟"

"جی، جی ہاں صاحب!"

"اُدھر انچارج راجندر بابو ہیں نا؟"

سپاہی نے اضطراری انداز میں سر ہلایا اور پھر دُہرانے لگا کہ اُسے محض شک ہوا تھا، اُس کا ارادہ مجھے تھانے لے جانے کا نہیں تھا۔ وہ چلبلے پن سے بولا۔ "زیادہ سے زیادہ آگے ملباری کے ہوٹل میں صاحب کے ساتھ ایک پیالی چائے پیتا اور بس۔"

ڈاکٹر بگڑ گیا۔ "ایسے تمھیں کسی پر بھی شک ہو جاتا ہے، تمھاری آنکھیں نہیں ہیں کیا یا سر خالی ہے۔ آدمی کھائی نہیں دیتا، کیا نظر آتا ہے۔" وہ مشتعل لہجے میں بولا۔ "تمھیں ان کے چہرے پر کیا نظر آتا ہے؟"

بس سپاہی کو معذرت کرنا ہی رہ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے سُنتا رہا اور اُس نے یہی بہتر جانا کہ جلد سے جلد ہمارے سامنے سے ہٹ جائے۔ چلتے چلتے وہ ہم دونوں کو سلام کرنا نہیں بھُولا۔

"میرا خیال ہے تھانے چل کے انچارج راجندر بابو سے اس کی شکایت کرنا چاہیے۔" ڈاکٹر بھری ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ اپنے واقف کار ہیں اور بھلے آدمی ہیں۔"

"میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"آپنے اس سے پوچھا نہیں کہ ......"

"میں کیا پوچھتا......!" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوہ!" اُس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ "میں سمجھتا ہوں۔ آپنے اُس سے کچھ نہیں کہا ہوگا جبھی تو...... لیکن آپ گھر سے کیوں آگئے؟ ابھی آپ کو وہیں رہنا چاہیے تھا۔"

"وہاں پڑے پڑے جی گھبرا گیا تھا۔"

"بے شک، بے شک۔" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ "میں صبح مس جولین کے ہاں گیا تھا معلوم ہوا اب آپ وہاں نہیں ہیں، باواجان کے ساتھ چلے گئے۔"

وہ گزشتہ تین دن تک مسلسل جولین کے گھر آتا رہا تھا۔ اُس رات بھی وہیں رہا تھا اور کانتے کو وداع کر کے ہمارے ساتھ ہی گھر آیا تھا۔ وہ اب کسی کے لیے بھی اجنبی نہیں رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ اُس کا گھر یہاں سے بہت نزدیک ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ میں تھوڑی دیر کے لیے وہاں چلوں۔

"پھر کبھی سہی اب دیر بہت ہو گئی ہے۔ صبح کا گھر سے نکلا ہوا ہوں اور کہیں بھی نہ جا سکا۔ بس یہاں ساحل پر آیا تو جی چاہا کچھ وقت یہیں گزارا جائے، پھر دیر کا احساس ہی نہیں"

"آپ مجھ سے کہہ دیتے۔ میں آپ کو لے کے آجاتا۔"

"پہلے سے کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"یہاں آگے نہایت پُرسکون جگہیں ہیں، بہت حسین۔ کبھی چلیں گے۔"

"اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے اُسے بتایا کہ جولین کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ وہ مُصر ہوگا اپنی موٹر میں پہنچا کے آئے گا۔ میں نے بہت منع کیا لیکن اُس نے موٹر کا در کھول دیا۔ پہلے اُس نے مجھے بٹھایا پھر دروازہ بند کر کے دوسری طرف سے خود وہ اُسی سمت جا رہا تھا جس طرف موٹر کا رُخ تھا۔ میں نے تعرض نہیں کیا۔ [illegible] بعد موٹر کوٹھیوں کے علاقے میں داخل ہو گئی اور ایک اچھی خاصی بڑی کوٹھی کے [illegible] میں آکے ٹھہر گئی۔ "گھر کے اتنے قریب آکے آپ لوٹ جائیں، یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔" وہ [illegible] سے بولا۔ "ہم زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے چائے پیتے ہی چل پڑیں گے۔" مجھے پھر اپنے [illegible] کا خیال آیا لیکن اب میں اُس کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔

وہ قدیم و جدید طرز کی دودھیا عمارت تھی، تعمیر ہوئے بیس سال سے زیادہ نہیں گزرے ہوں گے۔ رنگ و روغن کو بھی زیادہ وقت نہیں تھا۔ سبزہ ترشا ہوا تھا، پودے ترتیب سے لگے تھے اور رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ گیٹ سے کاریڈور تک روِشوں کے درمیان بنی ہوئی مختصر گزرگاہ میں ایک بھی خشک پتا نظر نہیں آیا، نہ کوئی تنکا۔ موٹر ٹھیرتے ہی ایک ملازم کسی جانب سے بھاگتا ہوا آیا مگر ڈاکٹر کیلاش نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ تیزی سے [illegible] پر چڑھ گیا۔ اندر جاتے ہوئے میرے قدم جھجک رہے تھے۔ وہ میری کمر پر ہاتھ رکھ کے مجھے تقریباً دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔ ڈیوڑھی کی طرز کے ایک مختصر کمرے سے گزر کے ہم نہایت کشادہ نشست گاہ میں آگئے۔ اونچی چھتیں، بے نقش و دیوار، دیواروں پر کہیں کہیں مناظر کی تصویریں آویزاں۔ فرش کے بیچ میں قالین بچھا ہوا، چھت کے [illegible] میں فانوس لٹک رہا تھا۔ کم سامان کی وجہ سے کشادگی کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ ہر چیز اِس ترتیب سے رکھی تھی جیسے اسی جگہ کے لیے بنائی گئی ہو، وہاں سے ہٹائی گئی تو [illegible] خالی ہو جائے گی۔ ایک طرف گھومتا ہوا کھلا زینہ اوپر کی منزل تک جاتا تھا۔ زینے کے آس پاس دروازے بنے ہوئے تھے اور زینے کے ساتھ سنگِ مرمر کا ایک قدِ آدم مجسمہ تھا، ساڑھی میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی کا مجسمہ، نیم وا پلکیں، سر جھکا ہوا، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، بدن کسی قدر خم کھایا، شرمایا ہوا سا۔ اُسے کسی ماہر بت تراش نے تراشا تھا۔ سچ مچ کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ لگتا تھا مصور بس جان ڈالنا بھول گیا ہے۔ نشست گاہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس مجسمہ پر نظر پڑتی تھی اور ایک ثانیے کے لیے نگاہیں ٹھٹک جاتی تھیں۔ اندر آکے ڈاکٹر کیلاش چیخنے لگا۔ "رما، انو، ممی سب کدھر گئے؟"

مجھے ایک صوفے پر بٹھا کے وہ بے تابانہ ایک دروازے سے اندر چلا گیا اور سوٹ اور ٹائی اُتار کے تھوڑی دیر میں واپس آگیا۔ وہ بہت بوکھلایا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ "کھانے کا وقت نہیں ہے مگر یقین ہے آپنے دوپہر کو کچھ بھی نہیں کھایا ہوگا۔ کیا لیجیے گا۔ بے تکلف بتایئے اور کیا پیجیے گا۔ کافی، جوس، چائے یا کچھ اور...... یہ جتنا میرا گھر ہے اُتنا ہی آپ کا......"

اُس نے ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ دی تھیں کہ جواب دینا مشکل تھا۔ میں نے مختصراً کہا۔ "چائے پی لوں گا۔"

"نہیں نہیں، سچ بتایئے آپنے دوپہر کھانا کھایا؟"

"نہیں کھایا مگر بھوک بالکل نہیں ہے۔"

یکایک وہ اوپر کی طرف دیکھ کے اُچھلنے لگا۔ "ارے رما، رما، ادھر آؤ دیکھو کون آیا ہے۔" وہ انگریزی میں بولا۔ میری نگاہیں بھی زینے کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایک نوجوان لڑکی تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ وہ عنابی رنگ کا گاؤن پہنے ہوئے تھی جس پر گلاب کے بڑے بڑے پھول کڑھے تھے۔ پختہ چمپئی رنگ، چمکیلی آنکھیں، مسکراتا چہرہ، مناسب قد، متناسب بدن۔ میں یک لخت صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے ایسا گمان ہوا جیسے میں نے پہلے بھی اُسے کہیں دیکھا ہے مگر دوسرے ہی لمحے میں اُسے پہچان گیا کیونکہ بہت دنوں، بہت ساعتوں کی بات نہیں تھی، صرف چند لمحے، چند لمحوں میں زینے کے ساتھ نصب مجسمے میں جیسے جان پڑ گئی تھی، وہ یقیناً اسی کا مجسمہ تھا۔ اُس نے سر جھکا کے مجھے تعظیم دی۔ "یہ رما ہے، میری چھوٹی بہن۔" ڈاکٹر کیلاش فرطِ مسرت میں بولا۔ "مگر یہ محض عمر میں چھوٹی ہے اور رما، پہچانو یہ کون ہیں! دیکھتے ہیں کتنی دیر میں تم انھیں پہچان پاتی ہو؟"

"تمھی بتاؤ نا۔" وہ مچل کے بولی۔

"تم انھیں اچھی طرح جانتی ہو۔"

رما کی پلکیں تھرتھرانے لگیں۔ اُس نے پلک جھپکنے کا توقف کیا ہوگا کہ اُس کی کھنکتی آواز نشست گاہ میں گونجی۔ "ارے کہیں کہیں یہ ظہیر صاحب تو نہیں ہیں۔"

"دیکھا! دیکھا آپنے!" ڈاکٹر کیلاش پر ہیجان سا طاری تھا۔ "اِس نے آپ کو کیسے پہچان لیا۔"

میں اُسے تعجب سے تک رہا تھا۔ اِس کا مطلب تھا، ڈاکٹر کیلاش اُسے میرے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا۔ میں نے اسپتال میں اپنا یہی نام ڈاکٹر کو بتایا تھا۔ کرشنا جی بھی مجھے اسی نام سے جانتے تھے اور کلکتہ جیل کے حکام اور قیدی سبھی اسی نام سے، میں نے امتحانات دیے تھے۔ بابر کی طرح اب یہ نام بھی میری ذات کا جزو بن چکا تھا۔

رما کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ ایک ذہین لڑکی ہے۔ "ہاں یہ ظہیر صاحب ہیں، ظہیر بھائی رما! اتفاق سے راستے میں مل گئے۔ بس قسمت سے سمجھو۔" ڈاکٹر کیلاش نے کہا اور حکیمہ لہجے میں رما کو ہدایت کی کہ وہ جو کچھ گھر میں تیار ہے نکلوا لائے۔ باقی باتیں میز پر ہوں گی۔ مجھ سے معذرت کر کے رما فوراً چلی گئی۔ ڈاکٹر کیلاش مجھے اُس کے بارے میں بتانے لگا۔ "یہ رما جو ہے، بڑی نٹ کھٹ ہے۔ یہ بھی ڈاکٹر ہے۔ گزشتہ سال ہی اِس نے ڈگری لی ہے۔ اِس کا جی ہی نہیں لگتا تھا۔ ڈگری کا مرحلہ آیا تو بھاگ گئی۔ بہ مشکل اِسے کالج واپس بھیجا گیا، اِس شرط پر کہ ڈاکٹری کی ڈگری لے لے گی مگر ڈاکٹری نہیں کرے گی۔ امتحان دے کے یہ گھر بیٹھ گئی۔ اِس کے شوق عجیب ہیں، مصوری، موسیقی، رقص، ستار تو یہ کمال کا بجاتی ہے۔ یہ مجسمہ جو آپ دیکھ رہے ہیں، اِس کے استاد گھوشی جی نے بنایا ہے۔ یہ بھی اب کچھ کم اچھا نہیں بناتی، گھوشی جی کہتے ہیں کہ اب میں سکون سے مر سکوں گا کہ ایک شاگرد میری موجود ہے جو میرے کام کو آگے بڑھائے گی مگر گھوشی جی کو غلط فہمی ہے، رما کسی ایک جگہ ٹکتی ہی نہیں۔ وہ تو پارا ہے۔ نہایت ضدی، کسی کام کا بیڑا اُٹھا لے تو تمام کر کے ہی دم لے، چیلنج قبول کرنا اس کی عادت ہے۔ بڑی بڑی باتیں کرتی ہے لیکن بے پناہ ڈرپوک ہے۔ اب دیکھیے نا، چیر پھاڑ ہی سے گھبرا گئی۔ ڈاکٹری یوں نہیں کرے گی کہ طرح طرح کے دکھی مریض جو آتے ہیں، مریض تو دکھی ہی ہوتے ہیں۔ بلا کی حاضر جواب ہے ورنہ منہ پھٹ ہے، کوئی ایسی ویسی بات اِس کے منہ سے نکل جائے تو در گزر کر دیجیے گا۔" وہ تیز تیز لہجے میں بولتا گیا پھر اُسے کچھ خیال آیا، سر جھٹک کے بولا۔ "اوہ، میں تو بالکل ہی بے لگام ہو گیا۔ آپ بتائیں کیا آپ تازہ دم ہونا چاہیں گے۔ میرے خیال میں منہ ہاتھ دھو لیجیے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"رما سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا، یہاں کوئی بھی آپ سے ناواقف نہیں ہے۔ ممی، انو، سبھی آپ کو جانتے ہیں، سو آپ کسی قسم کا تکلف مت کیجیے۔" میری جلد سمندر کی نمی سے چپک رہی تھی اور مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔ میں اُس کے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں آگیا۔ کمرے سے ملحق غسل خانہ بھی تھا۔ میرے بال اور کپڑوں میں ریت بھری ہوئی تھی۔ مجھے نہانا چاہیے تھا لیکن اِسے غسل ہی کہنا چاہیے، مجھے سر بھی دھونا پڑا۔ بال کاڑھ کے میں نے آئینے میں چہرہ دیکھا تو کسی قدر تازگی کا احساس ہوا۔ باہر نشست گاہ میں کیلاش منتظر تھا۔ وہیں سامنے ایک طرف کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ یہ کھانے کا حصہ تھا، یہاں ایک بڑی میز لگی تھی۔ کیلاش مجھے اسی طرف لے آیا۔ ایک ملازمہ اور ملازم میز پر جلدی جلدی پلیٹیں، چھریاں اور کانٹے سجا رہے تھے۔ اُسی لمحے رما اندر سے پکوڑوں کی قاب اُٹھائے برآمد ہوئی۔ "بس آپ لوگ بیٹھ جایئے۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔

"آپ بھی تو بیٹھیے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں بس ابھی آئی۔ پکوڑے اتنی دیر میں ٹھنڈے ہو جائیں گے۔" وہ بہت مصروف نظر آتی تھی، تقریباً بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"رما بہت کم چیزیں بنانا جانتی ہے لیکن جو بھی بناتی ہے اُس کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔" ڈاکٹر کیلاش نے قاب میرے آگے رکھ دی۔ "اب شروع کیجیے۔ اب برداشت نہیں ہو رہا ہے۔"

مجھے واقعی بھوک نہیں تھی مگر گرم پکوڑوں کے دو ایک ٹکڑے میں نے لیے،

بھوک جاگ سی اٹھی دیکھتے دیکھتے رما اور ملازمہ نے مختلف قابوں سے میز بھر دی۔ چاٹ حلوہ مٹھائی پھل اور مشروبات وغیرہ۔

"ایک آدمی کے لیے اتنا اہتمام" میرے منہ پر آتے آتے رہ گیا کہ یہ غذا کی توہین ہے یا آدمی کی۔

"ایک آدمی کے لیے کیوں، ہم کیا خالی ہاتھ بیٹھے رہیں گے۔ ایسے موقع ملتے ہی کب ہیں کیلی کے دوست ہی نہیں ہیں" کیلی سے اُس کی مراد کیلاش تھی کہنے لگی۔ "دو چار شریف آدمی سال میں کبھی کبھار اِن کے ساتھ آجاتے ہیں اور دوبارہ اُن کی صورت دیکھنے کو نہیں ملتی۔" اُس کی آواز میں چوڑیوں کی سی کھنک تھی۔ چولھے کے پاس کھڑے کھڑے اُس کا چمپئی رنگ کچھ سُرخی مائل ہوگیا تھا۔ چہرہ جل سا رہا تھا۔ اِس اہتمام سے نمٹ کے وہ میرے پہلو کی کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گئی اور سرگوشی کے انداز میں پوچھنے لگی۔ "کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے، واقعی بہت مزے دار۔"

"مجھے ہمیشہ شک ہوتا ہے۔"

"پرفیکشنسٹ کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔"

"اوہ، اوہ۔" وہ کھِل کھِلا پڑی۔ "میں تو کچھ بھی نہیں جانتی۔ ممی مجھے ڈانٹتی رہتی ہیں۔ آپ اُن کے ہاتھ کا کھانا کھائیں تو اندازہ ہوگا کہ پکانا کسے کہتے ہیں میں تو آدھا بھی نہیں جانتی۔ اچھا ہے وہ اِس وقت موجود نہیں ہیں۔"

"آپ کی ممی تو پھر کمال ہی کرتی ہوں گی۔"

"آپ کو کون سے کھانے زیادہ پسند ہیں؟"

"مجھے!" مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ بن پڑا۔ "کچھ بھی جو اچھا پکا ہو اور اچھا نہ پکا ہو تو بھی جس سے پیٹ بھر جائے۔"

"بالکل۔" وہ اُچھل کے بولی۔ "آدمی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کھانا تو نہایت ضمنی چیز ہے۔ زندگی میں اِس سے زیادہ ضروری اور ذائقہ دار چیزیں ہیں۔ ہمارے ہاں صرف زبان کے ذائقے پر توجہ دی جاتی ہے۔ آنکھ کو، ناک کو، کان کو اور دماغ کو بھی غذا کی اور ذائقوں کی ضرورت پڑتی ہے مگر ہم صرف کھانا جانتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"میں عموماً ٹھیک ہی کہتی ہوں۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "مگر بشرطیکہ آپ سے۔"

"یہ کنجوسی نہ ہوئی؟" میں نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں لیکن کیا کریں۔" اُس کے لہجے میں اور شگفتگی آگئی۔ "لوگ اس فیاضی کے متحمل نہیں ہوتے۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا نا، یہ ایسی ہی حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔" ڈاکٹر کیلاش بیچ میں بولا۔

"کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"شکر ہے، یہاں کوئی تو میرا ہم زبان ہے۔" وہ آنکھیں میچ کے بولی سے کہتی ہوں کہ پیمانوں اور باٹوں کے علاوہ بھی زندگی بہت کچھ ہے۔ پیمانوں باٹوں سے زندگی بسر کرنا جزوی طور پر زندہ رہنے کے مترادف ہے یعنی تمام تماشا دیکھنے کے مترادف۔ کچھ ایسا ہے کہ آدمی ورثے کی زندگی زیادہ گزارتا اور کھوجی ہوئی زندگی کم۔ وہ مستند اور آزمودہ پیمائشوں کے سوا زندگی چھیڑتا ہے بلکہ ڈرتا ہے اور یوں زندگی کی مجموعی آشنائی سے ناآسودہ رہتا ہے۔ زندگی حد و حساب ہے۔ اُسے جتنا کرید لے، کھود لے شاید اُتنے ہی حیرت ناک کرشمے نمودار مطلب ہے، کتنے ہیں جو پوری زندگی وصول کرتے ہیں۔ ہر جہت زندگی کا ایک حصے پر قناعت کر لیتے ہیں۔"

"مگر کبھی ایک ہی حصے سے مہلت نہیں ملتی۔" وہ چپ ہوئی تو میں کے کہا۔ میری آواز بکھری ہوئی تھی۔ "زندگی بہت مختصر، بہت تنگ بھی آدمی ایک ہی جانب سے نہیں نکل پاتا۔ سب کے لیے یکساں نہیں ہے۔ سب میں کب ہوتا ہے۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ کیلاش کے ٹوکنے پر رُک گئی۔ کیلاش دانی کی طرف اشارہ کیا جو رکھے رکھے ٹھنڈی ہو رہی ہوگی۔ کیلاش نے نہایت اچھی باتیں کر رہی تھی۔ کچے کچے منہ سے پکی پکی باتیں۔ اُس کے لہجے تھا جس سے مخاطب کو شرمندگی ہونے لگے نہ ایسی نخوت جو سماعت پر بار گزرے۔ کچھ نرم و لطیف، رواں دواں، کھنکتی چھلکتی ہوئی باتیں۔ چائے بناتے ہوئے اُس شکر کے لیے پوچھا تو میں نے دو چمچے بتائے۔ وہ اپنے بھائی کی طرف کن انکھیوں سے

"صحت مند آدمی کو اتنی ہی شکر لینی چاہیے۔" ڈاکٹر کیلاش نے ہنستے

"پھر مجھے کیوں منع کرتے ہو۔"

"تم موٹی ہو جاؤ گی۔ خوب صورت لڑکی کا موٹا ہو جانا سمجھو کہ اُس

میرے جی میں آیا لطفِ کلام کے لیے سہی یہ کہوں کہ آپ کو شاید ہے لیکن میں نے اپنی زبان بند رکھی۔

"کیلی، خدا کے لیے۔" وہ ناراضی سے بولی، مصنوعی سی ناراضی کئی بار آئینہ دیکھتی ہوں۔"

"ویسی آئینہ ہوگا۔" کیلاش نے شوخی سے کہا۔

"میں بھی تو ویسی ہوں۔"

"آئینوں کا کیا ہے آئینے اگر سچ بولا کرتے تو آدمی کہاں سے کہاں کیا سے کیا ہوتی۔" کیلاش میری جانب تائید طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے

"یہ آئینوں کی نہیں، خود آدمی کی کجی ہے۔" رما نے مستعدی مجھ سے مخاطب ہو کے پوچھنے لگی۔ "کیوں ظہیر صاحب! آپ ... ایمان!"

"میں، میں کیا بتاؤں۔" میری آواز جھرّانے لگی۔ "شاید کچھ یہی ہے۔ آئینے تو شاید سچ ہی بولتے ہیں مگر ایک بے اثر، بے مزہ سچ۔ یہ تو دیکھنے اور سننے والے پر ہے کہ اُس میں سچ قبول کرنے، اُس کا سامنا کرنے کا کتنا حوصلہ ہے۔" مجھے اپنی بات میں کچھ ابہام محسوس ہوا۔ میں نے کہا۔ "آئینہ تو سچ ہی بولتا ہوگا مگر تشریح غالباً ہم نہیں کر پاتے۔ سچ اثبات میں ہے تو جی خوش ہوتا ہے اور یقین نہیں آتا۔ نفی میں ہے تو جی مانتا نہیں جھوٹ کا گمان ہوتا ہے تو بھی یقین نہیں آتا اور آئینے کا یہ ہے کہ وہ تو محض جلوہ نما ہے۔ اُسے دلیل حجت نہیں آتی۔ پتھروں کا آمیزہ جو ہے۔ تاہم آئینے کا کوئی اشارہ اثبات میں ہے تو یہ ایک دل خوش کن بات ہے۔ آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟"

"مجھے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اُس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ "لیکن یہ ظاہری خوب صورتی ہے جو میرے نزدیک ایک سراب ہے۔ ہر ایسا کمال جو اپنا حاصل کیا ہوا نہیں ہے۔ اُس پر افتخار محض دل بہلاوا ہے۔ طویل قامت شخص کو خود کو ممتاز سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آدمی کو انھی خوبیوں پر ناز کرنا چاہیے جو اُس نے خود اختیار کی ہوں، خود جمع کی ہوں، اپنے بل بوتے پر۔ جسمانی ریاضتوں کے بعد کوئی اپنے دست و بازو ڈھالتا ہے تو بے شک اُس کے لیے وجہِ افتخار ہے۔ میرے نزدیک خوبی صرف اکتسابی ہوتی ہے اور ظاہری خوبیاں تو بہت ناپائدار ہوتی ہیں۔"

"آپ نے ایک دوسری بات کہہ دی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اکتسابی خوبیوں کی پائداری کی کیا ضمانت ہے۔"

"ہاں نہیں ہے۔" وہ شائستگی سے بولی۔ "مگر جب تک بھی رہیں، ظاہری خوبیوں سے افضل ہوتی ہیں۔ وہ اساسی ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں خوب صورتی ایک طرح کی امیری ہے۔" ڈاکٹر کیلاش تیزی سے بولا۔ "جیسے کچھ لوگ موروثی طور پر امیر ہوتے ہیں۔"

"مگر اُس دولت کی لذت ہی کچھ اور ہوگی جو خود حاصل کی جائے۔"

"لیکن ضائع تو وہ بھی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں۔" وہ اُداس ہوگئی۔ "ہاں، اور شاید اُس کے چلے جانے کا دکھ زیادہ ہو ... ہونا چاہیے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اُس پہ اصرار نہ کریں، اُس کے لیے کوشش نہ کریں اور ضائع تو آخر سبھی چیزیں ہو جاتی ہیں۔"

"اور آپ نے غور نہیں کیا۔" میں نے اپنا لہجہ استوار رکھنے کی کوشش کی۔ "ظاہری خوبیاں ہی ودیعت کی ہوئی نہیں ہوتیں، باطنی بھی ہو سکتی ہیں۔ اچھے دماغ، خوش طبعی۔ آدمی خلقی طور پر بھی تو نرم و نازک اور سخت و درشت ہوتے ہیں۔ اُن کے متعلق آپ کیا کہیں گی؟"

"وہی جو ظاہری خوبیوں کے متعلق۔" اُس نے لکتی آواز میں کہا۔ "وہ بھی ہماری نہیں ہیں، میراث اور ترکہ ہیں۔"

"لیکن وہ موجود ہیں۔" میں نے کہا۔ "اُن کا ہونا اُن کے نہ ہونے سے بہتر ہے ... ان کا ہم کیا کریں؟"

"انھیں ہم اور بالیدہ کریں۔"

"مگر اُن کا ہونا کیا ہمارے لیے باعثِ طمانیت نہیں؟ خود اپنی کیا، اپنے کسی عزیز کی برتری، کامیابی ہمیں کیسا سرشار کرتی ہے، ہمارے لیے عزت و افتخار کا باعث ہوتی ہے۔"

"کبھی حسد کا۔" وہ چہک کے بولی۔

"گویا کوئی ردِعمل ضرور ہوتا ہے، منفی ہو یا مثبت۔ ہوتا ہے نا؟" میری سوالیہ نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں، وہاں ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا۔

"ہاں ہاں، ہوتا ہے مگر آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ اُلجھے لہجے میں بولی۔ "فطری خوبیاں چاہے اپنی ہوں یا دوسروں کی اور اُن کے متعلق ہمارا ردِعمل جیسا بھی ہو، طمانیت آمیز یا نفرت زدہ۔ اُن پر فخر و مباہات یا نفرین و کراہیت جو نہ ہے، لے جا ہے۔ وہ ہماری ذات یا ہمارے کسی عزیز کی ذات کا حصہ ضرور ہیں مگر ہماری وضع کردہ نہیں ہیں۔ میری مراد تو کچھ اور ہے کہ خوبی صرف اکتسابی ہوتی ہے۔"

میں جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے خود کو روک لیا۔ مجھے خود پر حیرت سی ہوئی کہ یہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے اس نزاکت کا احساس کیوں نہیں رہا کہ میں پہلی بار اِس گھر میں آیا ہوں اور ایک ایسی لڑکی کے سامنے بیٹھا ہوں جسے آج سے پہلے میں نے نہیں دیکھا۔ جانے میری زبان سے کیا اول فول نکلتا رہا۔ گو نازک طبعی کے باوجود اُس میں حوصلے کی کمی معلوم نہیں ہوتی تاہم میرا ذرا سا ناہموار لہجہ اُسے مکدر کر سکتا ہے۔ میں اُسے کیا جتانا اور خود کو کیا باور کرانا چاہتا ہوں لیکن یہ میرا قصور نہیں تھا

بات سے بات نکلتی گئی۔ مجھے بھی اختیار نہیں رہا لیکن آشنا ہوں تو گھر اجنبی کب رہتے
ہیں لیکن ہی لطف و کرم پر آمادہ تھے اُن کا پاک سوچا سمجھا نہیں تھا وہ بھی بے
اختیارانہ تھا اور نہ میں اتنی دیر یہاں نہ ٹھیر پاتا نہ میری زبان ایسی رواں ہوتی مجھے اپنا
جی کچھ ہلکا ہلکا لگ رہا تھا جیسے کئی دن کی گھٹاؤں کے بعد بدلیاں چھٹ جائیں یا
دھوپ میں چلتے چلتے کسی جگہ چھاؤں میسر آجائے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کبھی برسوں
کی شناسائی تھوڑی پڑجاتی ہے اور کبھی ایک پل میں برسوں کا فاصلہ مٹ جاتا ہے۔

"آپ چپ کیوں ہوگئے؟" رُما کی مضطرب آواز پر میں چونک پڑا۔

"نہیں نہیں۔" میں نے ندامت سے کہا۔

"تمھاری باتیں ہی اتنی بے مثل تھیں" ڈاکٹر کیلاش نے ناز برادرانہ انداز میں
اپنی بہن سے شکایت کی۔

"کیا واقعی؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"نہیں، یہ سب تو نہایت دل چسپ اور دل نشین تھا۔" میں نے کہا "میرے
لیے نیا بھی۔"

"نیا کیوں؟ لگتا ہے آپ تو بہت پڑھتے، بہت سوچتے ہیں"

"دونوں باتیں شاید ٹھیک نہیں ہیں۔"

"یہ انکسار بھی خوب ہے۔" وہ زیرلبی سے بولی۔ "بہرحال مجھے خوشی ہے کہ کیلی
کو مردم شناسی آگئی ہے۔ کیلی نے پہلی مرتبہ ایک مکمل دوست دریافت کیا ہے۔"

"غالباً اسی مرتبہ ان سے سب سے بڑی چوک ہوئی ہے۔"

"اوہ نہیں۔" وہ بچوں کی طرح چیخ پڑی۔

"کبھی آدمی پر اثبات ہی اثبات کا تسلط ہوتا ہے، ہوا کے رُخ والی بات ایسے
ہی کسی وقت میرا ان کا آمنا سامنا ہوگیا تھا۔"

"نہیں ظہیر بھائی!" ڈاکٹر کیلاش کی آواز اُمڈ رہی تھی "اُس وقت تو مجھ پر
نفی ہی نفی کا تسلط تھا۔"

"مجھے کیلی نے آپ کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔"

"کیا بتایا ہے، یہ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔"

"سب جاننا ضروری بھی نہیں ہوتا۔ کچھ جانے بغیر بھی آدمی کبھی اچھا یا بُرا
لگ سکتا ہے۔ کچھ لوگ برائیوں سمیت بھی تو اچھے لگتے ہیں۔"

"پھر تو یہ یک طرفہ عمل ہوتا ہے۔"

"ہوا کرے۔" وہ لہکتی آواز میں بولی۔ "دو آدمیوں کی استواری میں ہمیشہ
ایک آدمی کا ترک و ایثار زیادہ ہوتا ہے۔"

میں نے سر اُٹھا کے اُسے دیکھا۔ اُس نے کیسی خیال آفریں بات کہی تھی
میں نے اُس سے نہیں کہا کہ مگر کتنے ایسے ہوتے ہیں اور کہاں بستے ہیں۔

"تم کچھ غیر مہذب نہیں ہوتی جا رہی ہو رُما؟" ڈاکٹر کیلاش نے متبسم ہونٹوں
سے اپنی بہن کو ٹوکا۔

ایک لحظے کے لیے اُس کا سراپا سِل ہوا تھا پھر اُس کی چھنا کا ہو
کمرے میں بکھر گئی پٹ پٹاتی پلکوں سے بولی "تم نے ٹھیک کہا مجھے تو خیا
رہا، ہم کنویں کے پاس بیٹھے ہیں اور کیسے۔۔۔" اُس نے پلٹ کے ملاز
اور کسی تاخیر کے بغیر چائے تیار کرنے کا حکم دیا۔

اندھیرا پھیل گیا تھا رُما نے قمقمے روشن کیے تو شام گزر جا
ہوا۔ وہ اپنے بال درست کرنے لگی۔ اُس کے کُھلے ہوئے لمبے سیاہ بال شانوں پ
تھے جنھیں وہ بار بار سر جھٹک کے ہٹاتی تھی۔ پھر اُس نے ربن سے اُن میں گرہ
اشتیاق آمیز لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگی "آپ کے مشاغل کیا رہتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے بے ربطی سے کہا "کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں۔" اُس کی مسکراتی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھ
تو ہوں گے۔"

"کیا بتاؤں آپ کو۔" میری آواز اٹکنے لگی "کچھ ہوں تو بتاؤں،
کوچہ گردی سمجھیے۔"

"کوچہ گردی!" وہ کھو سی گئی۔ "کیا خوب کوچہ گرد تو کسی نہ کسی ط
میرا مطلب ہے آپ کے۔۔۔۔"

"رُما!" ڈاکٹر کیلاش نے چلبلے پن سے اُسے ٹوکا "ابھی تم کیا
کہ سب کچھ جاننا اتنا ضروری نہیں ہوتا۔"

"ہاں، میں نے کہا تھا" اُس کا چہرہ لال ہوگیا۔ "مگر۔۔۔ مگر" وہ کہ
چاہتی ہوگی کہ وہ تو کسی اور سیاق و سباق میں کہا تھا۔ چند لمحوں کے لا
پُرسکون ہوگئی اور بھنی ہوئی آواز میں بولی "لیکن جاننے کا اضطراب
مجھے ایسا لگتا ہے کہ ظہیر صاحب کے ساتھ زندگی کچھ زیادہ ہی کھیلتی رہی

میں حیرت بھری نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔

"تمھیں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے" ڈاکٹر کیلاش نے تنک کے کہا "تمھا
ایک ذی ہوش اور ہوش مند شخص موجود ہے۔"

"میں نے اپنے ہوش و حواس سمیت ہی سمجھا ہے۔" وہ سنجیدگی
کیوں ظہیر صاحب کا چہرہ دیکھ کے مجھے گمان ہوتا ہے کہ پیچھے کوئی سمند

"تم ہوا میں تیر چلا رہی ہو ظہیر بھائی!" کیلاش مجھ سے مخاطب ہوئ
کی باتوں کا بُرا مت مانیے گا۔ اسے دادی امّاں بننے کی بڑی عادت ہے۔"

"کیا کچھ ایسا ہی نہیں ہے ظہیر صاحب؟" اُس نے اپنے بھائی کی
کرتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

"میں، میں کیا کہوں" میری زبان لکنت کرنے لگی۔

اچھا ہوا ملازم چائے لے کے آگئی اور رُما چائے بنانے میں م
اس بار اُس نے مجھ سے شکر کے لیے نہیں پوچھا۔ چائے کے دوران اُس نے
اُس کی ماں اور چھوٹی بہن انورادھا مجھ سے ملنے کی بڑی آرزو مند

دنوں اُن سے میرے ہی متعلق باتیں کرتا رہا ہے میرے ہی متعلق نہیں ہو لین، شہ پارہ، چمپا بیگم، تجمل اور پیر جی سبھی کے متعلق۔ اُس کی ماں اور چھوٹی بہن کسی عزیز کے ہاں تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔ انھیں اب تک آجانا چاہیے تھا۔ اتنی دیر میں مجھے اس گھرانے کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ کیلاش کا ایک چھوٹا بھائی شملے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ باپ عرصے سے لندن میں مقیم تھا۔ باپ کے ذکر پر رُما کے لہجے میں ایک مغائرت سی شامل تھی۔ زمینوں اور جاگیروں کی اچھی آمدنی تھی اور ان دونوں بہن بھائی کے بہ قول دولت سے انھیں ایسی رغبت نہیں تھی۔ دونوں از خود یہ سب کچھ بتاتے رہے۔ مجھے بھی جواباً کچھ کہنا چاہیے تھا۔ شاید انھوں نے اسی لیے پہل کی تھی لیکن میں نے اپنی زبان بند رکھی اور رات ہو گئی۔ کیلاش کی ایک بار گھڑی پر نظر گئی تو وہ چونک اُٹھا۔ اُسے رات کی ڈیوٹی پر اسپتال جانا تھا۔ "آج چھٹی کر لو۔ بوٹ کلب چلتے ہیں وہیں جا کے ڈنر کریں گے۔" رُما نے مچلتے انداز میں اپنے بھائی سے کہا
"ظہیر بھائی اگر تیار ہوں۔۔۔۔"

"آج نہیں۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "پھر کسی دن سہی۔"

"آج ہی کیوں نہیں؟" وہ نازآفریں لہجے میں بولی۔ "کل کا کیا آپ کو اس قدر یقین ہے؟ جو آج مل رہا ہے اُسے آنے والے مبہم کل کی صوابدید پر کیوں چھوڑا جائے۔ مجھے کل پر ہمیشہ شبہ ہوتا ہے۔ کل محض ایک گمان ہے۔"

"آنے والا ہر لمحہ بھی تو ایک گمان ہے، آنے والے کل کے مانند۔" میں نے کہا۔

وہ چائے کا گھونٹ لیتے لیتے رک گئی اور اُس کی آنکھوں میں ستارے سے چمکتے اور ماند پڑتے رہے۔ "بے شک۔" کچھ توقف کے بعد وہ تمتماتی آواز میں بولی۔ "ہر آنے والا لمحہ کل کے مانند ہے لیکن یہ موجود لمحے جو نوازش پر مائل نظر آتے ہیں، سنتے ہیں یہ کسی خاص صورتِ حال سے بھی مشروط ہوتے ہیں۔ اگر سب کچھ یہی رہے تو شاید ان کا تسلسل نہ ٹوٹے۔ کل تک یہ دُنیا ہم سے جانے کیا کیا برتاؤ کرے۔ سو ہم اسے اس کا موقع ہی کیوں دیں۔ ہم یہ تسلسل ہی کیوں توڑیں۔ کل کی دُوری آنے والے لمحے کی نسبت بڑی ہے اور گویا زیادہ بڑا اندھیرا ہے۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ تیزی سے کہنے لگی۔ "کیا آپ کبھی بوٹ کلب گئے ہیں؟" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ اُس کی آواز اور پارا ہو گئی۔ "کیلی سے پوچھیے کیسی خواب ناک جگہ ہے۔ رات کے وقت تو اور فسوں گر۔ سمندر کا کنارہ اور لہروں کا اندھا شور۔ کشتیوں کی مرتعش روشنیوں سے لگتا ہے، پانی میں جگہ جگہ چھینٹے سے پڑے ہوں، جیسے پانی میں شعلے بھڑک رہے ہوں۔ جھومتے ناچتے گاتے ہوئے لوگ۔ خوش فکر، خوش نظر، سب ہنسنے اور کلفتیں بھلانے کے لیے آتے ہیں۔ کشتی میں بیٹھ کے دُور تک نکل جایئے اور لہروں کا جھولا جھولتے رہیے۔"

"میں تصور کر سکتا ہوں۔" میں نے خوش اطواری سے کہا۔

"آپ پیتے ہیں؟"

"جی!" میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ "جی نہیں بالکل نہیں۔"

"مجھے یقین تھا۔" وہ بے ساختگی سے بولی۔ "پھر آپ کا نشہ بھی خالص ہوگا۔ شراب ایک نقلی نشہ ہے، مصنوعی۔ شراب رنگین عینک ہے۔ مدہوشی میں کسی نظارے کے حقیقی رنگوں سے کوئی کیا اخذ کر سکتا ہے اور کس درجے غم محسوس کر سکتا ہے؛ تو جھوٹ ہے، اپنے آپ سے جھوٹ بولنے، اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش۔ مجھے پینے ہوئے لوگ کبھی اچھے نہیں لگتے، مجھے اُن پر ترس آتا ہے۔ ہوش زندگی کا بڑا جوہر ہے۔ مدہوشی زندگی مختصر کرنے کے مترادف ہے، جزوی خودکشی۔"

"تم کچھ زیادہ انتہا پسند ہوتی جا رہی ہو۔" کیلاش نے کسی قدر تلملاتے ہوئے کہا۔ "تم نے کبھی شراب پی ہے؟"

"پی ہے، ایک بار نہیں، تین چار بار۔"

"تم نے؟" وہ تعجب سے بولا۔ "میرے علم میں نہیں۔"

"تمھارے علم میں آنا ضروری نہیں تھا۔ تم اتنے سراسیمہ کیوں ہو رہے ہو؟ صرف مردوں کو اس کی اجازت ہے۔ مغرب میں چار سال تک تم کیا شاہد کرتے

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" کیلاش کی آواز کھنچنے لگی۔

"کیا میں نے کچھ نہیں کہا ہے۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"ظہیر بھائی کیا سوچیں گے۔"

"نہیں۔" میں نے کسمسا کے کہا۔ "میں بھلا کیا سوچوں گا۔"

"وہ ایک بالغ نظر نوجوان ہیں۔ وہ کیا سوچتے۔ میں نے کچھ ناروا تو نہیں

"قطعاً نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تو آپ نے بھی شراب پی؟"

"ہاں، تین چار بار۔"

"اور کیا محسوس کیا؟"

"میں نے جاننا چاہا تھا کہ یہ چیز کیا ہے۔ دوسری، تیسری، چوتھی بار میں محض اپنے تجزیے کی توثیق کے لیے پی حالانکہ تجربہ ہر بار یکساں تھا۔ میں نے پیالہ حلق سے اُتارا تو جانا کہ میں بے وزن ہو گئی ہوں، میرا وجود زمین کی کشش کا اسیر نہیں رہا اور میری آنکھیں، میں نے دیکھا کہ میری بینائی میری گرفت سے نکل گئی یا اس کے دائرے میں آنے والی چیزیں اپنی ساخت اور رنگت بدل چکی ہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ تو تجرید ہے، میرا جی چاہا کہ میں سمندر میں کود پڑوں، ناچنا شروع کر دوں، گاؤں اور خوب روؤں۔ مجھے اپنی کسی کیفیت پر اختیار نہیں رہا۔ میرا فیصلہ ہی مجھ سے چھن گیا۔ آدمی کی اس سے بڑی بے بسی کیا ہو سکتی ہے۔ میں شراب کو کوئی برائی نہیں سمجھتی لیکن یہ ایک فضول چیز ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ شراب میں نشہ ہوتا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو زندگی میں اس سے کہیں تیز اور پائدار نشے ہیں۔ یہ تو نیند کی گولی کے مانند ہے، سا نشہ، دوا کے مانند۔"

ڈاکٹر کیلاش اُس کے خاموش ہو جانے کا منتظر تھا، اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے تیزی سے بولا۔ "تمھارے بیان میں تمھاری خواہش، تمھارے اندر کوئی امتناع، کوئی اکراہ شامل ہے اور۔۔۔۔"

"میں اپنی ہی بات کر رہی ہوں۔"

"اتنی آسانی سے فیصلے صادر نہیں کیے جاتے۔ ساری خارجی چیزیں تقریباً تمام کی تمام ساختہ ہوتی ہیں، ساختہ آسودگی والی۔ غذا، لباس اور بہت سی چیزیں۔۔ بہرحال وقت کم ہے۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "تم کلب جانے کو کہہ رہی تھیں؟"

"ہاں ہاں، میں تو بہک ہی گئی۔"

"بن پیے بہک گئیں۔"

"دیکھا تم نے!" "میں یہی کہہ رہی تھی۔ بن پیے بھی کچھ کم نشے نہیں ہوتے ظہیر صاحب! اگر آپ ہاں میں جواب دیتے تو مجھے دکھ ہوتا۔ میں نے یوں ہی اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے آپ سے پوچھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ یہی کہیں گے۔ تاہم کلب میں شراب کے علاوہ بھی دل کش مشاغل ہیں۔ تیراکی، بلیرڈ، برج، رقص اور موسیقی۔۔۔ آپ چل رہے ہیں نا۔۔۔۔؟"

"ضرور چلتا مگر ایسا ہے کہ میں کسی سے کہہ کے نہیں آیا تھا۔ سب فکر مند ہوں گے اور یہ میرا لباس بھی کلب کے لیے شاید موزوں نہ ہو۔" میری ان تاویلات کے باوجود وہ اصرار کرتی رہی اور کلب کے رنگوں اور روشنیوں کا احوال خوابیدہ لہجے میں بیان کرتی رہی۔ اب میرے پاس ایک ہی جواز باقی رہ گیا تھا۔ میں نے اُس سے کہا "یقیناً یہ ایک دل کش صحبت ہوگی لیکن اس وقت کچھ جی آمادہ نہیں ہے۔"

"جی کو منانے ہی کے لیے تو چل رہے ہیں۔"

کیلاش نے تنبیہی انداز میں اُسے ٹوکا کہ ابھی یہ کس طرح مناسب ہے۔ اُس نے دبے لہجے میں کانتے کی طرف اشارہ کیا، وہ محجوب ہو گئی، خجل خجل سی۔ "مجھے افسوس ہے۔" وہ آزردگی سے بولی۔ "مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ یہ سب کتنا بے محل ہے۔ اس سانحے کو گزرے چوتھا دن ہے۔ آپ پر تو بہت بوجھ ہوگا۔ ممی نے کیلی سے کئی بار آپ کے ہاں جانے کے لیے کہا۔ میں نے اور انو نے بھی لیکن کیلی نے روک دیا، جانے کیوں۔" وہ تاسف کا اظہار کرتی رہی۔

"آپ کے بہت گہرے دوست تھے نا؟" اکبر نے بھی مجھ سے یہی پوچھا تھا اور جواب میں لفظ میرے حلق میں اٹک کے رہ گئے تھے۔

"کیلی نے بتایا تھا۔" اُس نے میرے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ "کیلی نے بتایا تھا کہ وہ کیسے مضبوط تھے۔ موت کا یہی ہے کہ بڑی اندھی ہوتی ہے۔ کیسی دلچسپ بات ہے آدمی نے ساری دُنیا پر غلبہ پا لیا ہے، اپنے آپ پر نہ پا سکا۔ کیسے کیسے زندہ لوگ دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتے ہیں۔ کوئی کسی سے کہے بھی کیا۔ موت کسی کو رعایت نہیں دیتی۔ میں ہمیشہ موت کے گھر سے بھاگتی ہوں بلکہ موت کے گھر میں بسنے والوں سے۔ اُن کی صورتیں نہیں دیکھی جاتیں۔ اُن کے پاس جا کے گونگے پن کا احساس ہوتا ہے، لفظوں کی کم مائگی کا۔ کیلی اُسی دن سے بہت دل گرفتہ ہے۔ دو روز تک ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا۔ آج ہی ذرا سنبھلا سنبھلا نظر آ رہا ہے۔ کیلی کے سوا ہم میں سے کسی نے جانے والے کو نہیں دیکھا تھا لیکن سبھی کو بہت رنج ہے۔"

میں سنتا رہا، کیا کہتا۔

کہنے لگی۔ "تمام راستے موت کی طرف جاتے ہیں۔ کبھی کوئی جلدی منزل پر پہنچ جاتا ہے، کبھی کسی کو دیر لگ جاتی ہے لیکن منزل سب کی ایک ہے۔"

"تمام راستے جب موت کی طرف جاتے ہیں تو لوگ طویل راستہ کیوں منتخب کرتے ہیں؟" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"ہاں!" وہ چونک سی پڑی اور لرزیدہ ہونٹوں سے بولی۔ "آپ نے کیسی نکتہ خیز بات کہی ہے، یقیناً، پھر طویل راستہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر کیلاش کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے لباس کی تبدیلی کے لیے چند منٹ کی اجازت مانگی۔ اُس کے جانے کے بعد میں اور رُما اکیلے رہ گئے۔ دیر تک وہ نگاہیں جھکائے جھکائے کھوئی کھوئی بیٹھی رہی۔

"یہاں آ کے اچھا لگا، جی کچھ ہلکا ہوا۔" میں نے اُس کے جھجک کی دھند دُور کرنے کی کوشش کی۔ "اتنی دیر میں سب کچھ بھولا سا رہا۔"

"بھلانے کی کوشش کیجیے۔ زندہ آدمیوں کے پاس اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ مرنے والوں کو بھلا دیں۔ اچھا ہوا آپ یہاں آ گئے۔ اس گھر میں شاید آپ کو کچھ سکون ملے۔ تبدیلی بھی بڑی اہم ہوتی ہے۔ یہاں آ جایا کیجیے، اپنا ہی گھر جان کے، کیلی کے بغیر بھی۔ یہ ایک رسمی سی بات ہے، لیکن میں برِبنائے رسم نہیں کہہ رہی۔ میں اپنے اظہار میں بخل نہیں کرتی۔ میں سمجھتی ہوں یہ بھی ایک طرح کی منافقت ہے۔ سچ یہی ہے کہ آپ کو دیکھ کے، آپ سے مل کے ایک طمانیت کا سا احساس ہوا ہے، کچھ حاصل کرنے کی سرخوشی۔ جب بھی آپ کا جی گھبرائے، بے تکلف یہاں چلے آیئے۔ ایسے آئیں گے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ گھر اور گھروں سے مختلف رہے۔ یہاں کے مکیں ایک دوسرے کا بہت لحاظ کرتے ہیں، ہر دم ایک دوسرے کے کام آنے کے لیے بے قرار لیکن اپنی ذات، اپنی آزادی کی قیمت پر نہیں۔ میری گزارش ہے کہ آیندہ کیلی کے حوالے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنے ہی حوالے اچھے لگتے ہیں۔"

"جی۔" میں نے منتشر آواز میں کہا۔ "آپ کا بہت شکریہ۔"

"اور ضروری نہیں کہ ایک دوسرے کی شناخت میں ایک وقت ہی صرف ہو، مرحلہ وار شناخت کا، وقت کے یہ فاصلے، یہ غیر ضروری فاصلے مٹا کے بھی ایک دوسرے کے متعلق اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔"

"جی، جی ہاں۔" میں نے جلدی سے سر ہلا کے کہا۔

"میں نہیں جانتی کہ آپ کے کس کام آ سکتی ہوں۔"

"آپ کا اتنا کہنا ہی بہت ہے۔"

"بہت بالکل نہیں ہے، میں عمل پر یقین رکھتی ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کے کسی کام ضرور آ سکتی ہوں، ایک اچھے دوست کے طور پر۔"

"جی ہاں، یہ میرے لیے باعثِ عزت ہوگا۔"

"میری بات کا شاید آپ کو یقین نہیں آیا؟"

"نہیں، یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا؟"

"یقین آتا تو آپ کی زبان سے یہ والہانہ جملے ادا نہ ہوتے۔"

"مگر سچ بھی تو یہی ہے۔"

"خیر۔" وہ مسکرانے لگی اور اُس کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی، متلاطم روشنی۔ اُس کی ڈبی ڈبی آنکھیں ویسے بھی ہر لمحے کسی حیرانی سے دوچار رہتی تھیں اب کچھ اور حیران نظر آ رہی تھیں۔ تمام تر سکون کے باوجود اُس کے سراپا میں کوئی اضطراب سا چھپا ہوا تھا، کچھ جاننے کی جستجو، کچھ کھو جانے کا ہیجان۔ وہ مسلسل انگریزی میں بات کر رہی تھی، شائستہ اور رواں انگریزی میں۔ اُس کے لہجے میں انگریزوں جیسی فصاحت تھی۔ میری انگریزی میں اُس جیسی روانی تو نہیں تھی لیکن مجھے لفظ ڈھونڈنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ کرشنا جی کے ساتھ اتنے دن رہ کے میری جھجک دور ہو گئی تھی۔ جیل میں بھی سونیا کو پڑھانے کے دوران بیشتر بات انگریزی میں ہوتی تھی۔

کیلاش نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ وہ سرمئی سوٹ میں کچھ اور وجیہہ لگ رہا تھا۔

"میرے پیچھے اس نے آپ کو ستایا تو نہیں؟" وہ شگفتگی سے بولا۔

"یہ اِن کی خوبی نہیں معلوم ہوتی۔"

"کبھی یہ بہت بے لگام ہو جاتی ہے، میں ممی سے کہتا ہوں کہ اب اس کی شادی کر دو۔"

رما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "آپ اندازہ کر لیجیے کہ بے لگام کون ہے۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔

ڈاکٹر کیلاش کو جلدی تھی۔ رما ہمیں باہر تک چھوڑنے آئی اور آخر تک افسوس کرتی رہی کہ اُس کی ماں اور بہن کو میری آمد کی اطلاع سُن کے بہت ملال ہو گا۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ میرے دروازے پر چلی آئی اور کہنے لگی۔ "دیکھیے، اب آپ آتے رہیں گے۔" اُس کے لہجے میں بہت کچھ شامل تھا ؎

کیا حسین تیور تھے کیا لطیف لہجہ تھا
آرزو بھی، حسرت بھی، حکم تھا، تقاضا تھا

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ایک خوش گوار تجربے کی خاطر ....." وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ کیلاش نے گاڑی چلا دی۔ دروازے تک اُس کے چیخنے چلّانے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ کیلاش کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ کیلاش زور زور سے ہنستا رہا۔

میں پاڑے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن اگر میں کیلاش سے کہتا تو وہ درمیان میں کہیں مجھے اُتارنے کے لیے تیار نہ ہوتا، اُسے پاڑے کی عمارت تک لے جانا بھی مناسب نہیں تھا چنانچہ ہم جولین کے گھر آ گئے۔ کیلاش کی ڈیوٹی کا وقت ہو رہا تھا لیکن جولین اور شہر پارہ کے اصرار پر وہ اندر چلا آیا اور کوئی آدھ گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ مارٹی بھی موجود تھا۔ کسی نے کبھی مجھ سے کہا تھا کہ اصل موت تو زندوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔ مرنے والا مر کے تمام ہو جاتا ہے، تمام احساس و شعور کے ساتھ۔ اُسے کون جا کے بتائے کہ اُس کے پیچھے کس کس کی آنکھوں میں آگ جلی، کس کس کے سینے سے دھواں اُٹھتا ہے۔ یہ تو بہت بڑی اذیت ہے۔ وہاں سب اُجڑے اُجڑے سے لگ رہے تھے جیسے موت ابھی تک گھر میں بسی ہوئی ہو۔ صبح سے وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ پاڑے سے بھی سارے دن کوئی نہیں آیا تھا۔ میرا آنا اچھا ہی ہوا۔ اُن کے کھوئے ہوئے، اُڑے ہوئے رنگ واپس آنے لگے۔ کیلاش کافی پی کے چلا گیا۔ اُن سب کی دل دہی کے لیے میں نے اُن کے ساتھ کھانا کھایا۔ ایک مجھی کو نہیں، اُنھیں بھی تو میری کسی پرسش کی ضرورت تھی۔ سب بیٹھک میں ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے بیٹھے رہے۔ مجھے اُن کے درمیان سے اُٹھنا نہیں چاہیے تھا لیکن اُدھر ابا جان پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اُن کے خیال سے مجھے اُٹھنا پڑا۔ اُنھی کی مہر سے اُنھوں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ میں اُنھیں پہلے بتا چکا تھا کہ میں سویرے گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ مارٹی بھی میرے ساتھ آ گیا۔ پہلی بار وہ ابا جان کے گھر آیا تھا۔ آ کے بہت خوش ہوا۔ صبح مارٹی اکبر اور فاخرہ کو اوٹ پٹانگ قصے سنا کے انھیں ہنساتا رہا۔ ناشتے کے بعد میں پاڑے کی طرف نکل گئے۔

وہاں نہ پیرو تھا، نہ تجمل۔ معلوم ہوا کہ پرسوں شام وہ تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے۔ کچھ دیر بیٹھے اور چلے گئے، پھر اب تک نہیں لوٹے ہیں۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ آخر پیرو اپنے گھر چلا گیا تھا، اپنی بیٹی اور بیوی کے پاس۔ اُسے دیکھ کے اُن کی خوشی کا تو ٹھکانا نہ رہا ہو گا۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ پیرو اُن کے لیے دوبارہ زندہ ہو کے آیا ہے۔ پیرو کے گھر کا پتہ مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں آ رہا تھا۔ یہاں پاڑے میں ماچھی یا دو ایک کے سوا شاید ہی کسی کو اس بابت کچھ علم ہو۔ ایسی صورت میں کسی سے پوچھنے کا محل نہیں تھا۔ پیرو نے اپنے گھر کو پاڑے سے بالکل دور رکھا تھا، ہر اعتبار سے دور۔ دو ایک آدمیوں کو چھوڑ کے شاید ہی کوئی پوری طرح جانتا ہو کہ پیرو کا ایک گھر بھی ہے۔ گھر، جیسا ایک گھر، اُس کی پھولوں سے بنی ایک لڑکی اور ایک باوقار و وفاشعار بیوی ہے۔ جب میں اُس کے گھر گیا تھا تو گیتا کالج میں پڑھتی تھی۔ اب تو اور آگے بڑھ گئی ہو گی۔ پیرو شب و روز عموماً پاڑے ہی پر رہتا تھا۔ ہفتے میں دو ایک راتوں کے لیے یا کسی ایک دن کے لیے وہ گھر کا رُخ کرتا تھا۔ جیل کے دنوں کے سوا اُس کا یہی معمول تھا۔ اپنے علاقے کے علاوہ بمبئی کے کئی اور دولت مند سیٹھوں سے بھی اُس کے خصوصی مراسم تھے۔ پاڑے کے آدمی پاڑے سے اُس کی غیر حاضری کا یہی تاثر لیتے تھے کہ آج کی رات یا آج کے دن وہ کسی سیٹھ کے ہاں عیش و عشرت میں مصروف ہو گا۔ کسی کو اُس کے اِن معمولات میں رخنہ اندازی کی ضرورت تھی، نہ جرأت۔ پیرو نے رخنہ اندازی ہی کے خیال سے یہ احتیاط کی تھی۔ اُدھر ماچھی پاڑے پر بیٹھا رہتا تھا۔ پہلی بار جب پیرو مجھے اور تجمل کو اپنے گھر لے گیا تھا تو پہلے وہ ایک سیٹھ کے ہاں گیا تھا۔ نیچے اُس کی بڑی دکان تھی، اوپر گھر تھا۔ وہیں پیرو کی موٹر کھڑی تھی۔ ممکن ہے یہ موٹر اُس کے سیٹھ دوست کی ہو۔ موٹر میں بٹھا کے وہ ہمیں کوٹھیوں اور بنگلوں کے علاقے میں ایک بڑے مکان میں لے گیا تھا جہاں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا اور ملازموں کے لیے الگ کمرے بھی۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کے بہت تعجب ہوا تھا۔ گھر کی حفاظت کے لیے مسلح ملازم تعینات تھے۔ پیرو نے منتخب آدمی ہی رکھے ہوں گے۔ اُس کی بیوی ایک صاحبِ حیثیت پارسی خاندان کی لڑکی تھی۔

پیرو کے کہنے کے مطابق زندگی میں اُس نے روشنی ہی روشنی دیکھی تھی۔ روشنی اور پھول۔ پیرو کے لیے وہ سب کچھ چھوڑ کے چلی آئی تھی۔ پیرو نے بھی اُس کے لیے ایک چھوٹا سا تاج محل بنا دیا تھا۔ کسی گھر میں خوشی ہو تو وہ تاج محل سے بھی بڑا ہوتا ہے۔

دوپہر تک میں پاڑے میں بیٹھا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ پورے دو دن ہو گئے تھے۔ اب اُسے پاڑے آ جانا چاہیے تھا۔ یہاں اور بہت سے لوگ بھی اُس کے منتظر تھے۔ پاڑے کے وہی معمولات تھے، وہی لوگ، وہی باتیں۔ دوسرے علاقوں کے داداؤں کے، پولیس کے اور جیل کے چرچے۔ کہاں کہاں وارداتیں ہوئیں اور کون چاقو مار بیٹھا۔ کلکتے کی کون سی ٹیم نے بمبئی کا رُخ کیا ہے۔ پاڑے کے عقب میں کھلی جگہ اور ٹین کے سائبان میں جسمانی کرتب جاری تھے۔ تیغ بازی، پٹا، لاٹھی، چاقو زنی اور تن سازی کے مشاغل۔ سب کچھ وہی تھا مگر سب لوگ گھروں سے جیسے لڑ کے آئے تھے یا کہیں کچھ لٹا کے آئے تھے۔ شامو اور جمرو مجھ سے لپٹ گئے۔ کہنے لگے کہ اُن کا دل اِس شہر میں بالکل نہیں لگ رہا ہے۔ استاد سے بولنے کی ہمت نہیں پڑتی، وہ واپس جانا چاہتے ہیں۔ کانتے کے بغیر اُنھیں سب کچھ سُونا سُونا لگ رہا ہے۔ وہ تو خیر کانتے کے بہت قریب تھے، ہر وقت کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ جو اتنے قریب نہیں تھے، ماچھی، گلیا، لچھمی، چھیدا، زورا وغیرہ، اُن کے چہروں پر بھی خاک اُڑ رہی تھی۔ اُنھیں دیکھ دیکھ کے پاڑے کے دوسرے آدمیوں پر بھی وحشت طاری تھی۔ آدمی کو دیکھ کے آدمی کھلتا ہے یا مرجھا جاتا ہے۔ زورا تو بھرا بیٹھا تھا۔ کانتے کا نام آیا تو وہ میرے شانے پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ میں نے اُسے تسلی دینا چاہا لیکن میرے پاس فضول کے چند جملوں کے سوا کیا دھرا تھا، وہی جو ازل سے سب ایک دوسرے سے بولتے ہیں۔ زورا رو دھو کے خود ہی چپ ہو گیا۔

بارہ بجے کے قریب جارجی بھی آ گیا تھا۔ وہ میرے قریب آ کے بیٹھ گیا۔ اُس نے میرے پیر چھوئے تو میں نے گھبرا کے سمیٹ لیے۔ مجھے اُس کے اِس طرزِ عمل پر حیرت بھی ہوئی، ندامت بھی۔ ماچھی نے پیرو کی جگہ مجھے بٹھا دیا تھا اور جارجی نے جیسے یہی سمجھ لیا تھا کہ پاڑے پر پیرو کی نیابت اب میں کر رہا ہوں۔ جارجی بالکل بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ مجھ سے وہ کانتے کی تعزیت کرنے لگا اور شکایتی لہجے میں بولا کہ یہاں کسی نے اُسے گھر کا پتہ بتایا ہی نہیں ورنہ وہ کانتے کا دیدار کرنے ضرور آتا۔ مجھ سے اُس کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ یہی چند دن پہلے اُسے تھوڑا بہت جانا بوجھا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے اُس کے درمیان کوئی دوری ہی نہ ہو۔ وہ اُس بات کی معذرت کرنے لگا جب پیرو، تجمل اور میں اُس کے ہوٹل گئے تھے۔ بولا کہ اُسے ہوش ہی نہیں تھا۔ میں اور تجمل استاد پہلی بار اُس کے ہاں آئے تھے اور وہ ہماری کوئی خاطر نہ کر سکا۔ اب سوچتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ پیرو کتنی دور جا چکا تھا۔ اُس کی آنکھیں اپنوں غیروں کی پہچان، اندھیرے اجالے کی تمیز بھول گئی تھیں۔ کہنے لگا کہ وہ جو کچھ بھی ہے پیرو دادا کی وجہ سے ہے مگر نہ جانے کیا ہوا کہ اُس کے قدم بہکتے گئے۔ پیرو دادا اگر بروقت نہ آ جاتا تو وہ نہ جانے کتنی دور چلا جاتا۔ پھر وہ بتاتا رہا کہ اب ہوٹل میں عورتوں کا داخلہ بالکل بند کر دیا گیا ہے۔ گو اس سے اُس کا کاروبار آدھا رہ گیا ہے لیکن اُسے کوئی غم نہیں۔ ماچھی نے چپکے سے اِس کی تصدیق کی کہ پاڑے کے آدمی جا کے سُن گُن لیتے رہے ہیں۔ اُس دن کے بعد سے کوئی عورت ہوٹل میں نہیں آئی ہے، یہاں تک کہ جارجی نے اپنی بیوی ماری کو بھی کاؤنٹر سے ہٹا دیا ہے۔ حالانکہ اب جارجی ایک ہی صورت میں ہوٹل چلا سکتا ہے کہ وہ شراب اور جوئے کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں گاہکوں کو فراہم کرے۔

میں نے ہر چند کوئی رائے زنی نہیں کی تھی مگر معلوم نہیں، جارجی میرے سامنے یہ صفائیاں کیوں پیش کر رہا تھا۔ شاید خجالت کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔ میں چپ رہا تو وہ عاجزی سے بولا، اُس کی بیوی ماری کی آرزو ہے کہ تجمل اور میں کسی دن پیرو دادا کے ساتھ اُس کے گھر آئیں اور ماری کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھائیں۔ میں نے کہا، ہاں کیوں نہیں، ضرور آئیں گے۔ میرے بارے میں اُسے بہت سی معلومات تھیں کہ میں نے چھنگا جیسے پرانے استاد کا پاڑا کس طرح حاصل کیا تھا۔ بمبئی کے سب سے بڑے دادا تیواڑی کے خاتمے کا سبب بھی وہ مجھی کو ٹھیرا رہا تھا۔ میں نے تردید کی کہ اُس میں تو سبھی کا ہاتھ تھا۔ کہنے لگا لیکن بنیاد تو میں ہی تھا۔ میں اس بات سے کیسے انکار کر سکتا تھا۔ "اپن کا من کرتا ہے، کبھی اپنے راجا کے چاقو کا بل آنکھ سے دیکھے۔ لوگ باگ بولتا ہے، بجلی ہے کہ جادو ہے۔" ایک لحظے کو تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہو لیکن وہ بہت سنجیدہ تھا۔ اُس کے لہجے میں اشتیاق بھرا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے پیش کش کی کہ بمبئی میں کسی قسم کا بھی کام ہو، میں اُسے بے تکلف بتا دوں۔ بس حکم دے کے اور ایک بار اُسے آزما کے تو دیکھوں۔ کہنے لگا کہ بمبئی تو ایک تہہ خانہ ہے، ایک کے بعد دوسرا اور۔ در تو ختم نہیں ہوتے، آدمی ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی میں اُس کے ساتھ بمبئی کے اِن تہہ خانوں میں چلوں، شاید میرے لیے اس نظارے میں بہت کچھ نیا اور انوکھا ہو۔ ابھی اُسے ہوٹل کھولے کتنے مہینے ہوئے ہیں لیکن اتنے عرصے میں جو کچھ اُس نے دیکھا ہے، وہ عمر بھر نہیں دیکھ پایا تھا۔ باہر سے یہ جو اجلے مکان نظر آتے ہیں کسی کو نہیں معلوم کہ اِن کے اندر کتنا اندھیرا بھرا ہوا ہے اور یہی حال مکینوں کا ہے۔ وہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ کیسے کیسے تابندہ چہرے، جن کی لوگ پوجا کریں، اتنے ارزاں بکتے ہیں۔ اُسے ہر طرف بازار ہی بازار نظر آتا تھا۔ اُس کا اعتبار ہی ختم ہو گیا تھا۔ کچے قدموں کے آدمی کا تو سر گھوم جائے۔ جارجی میری خاموشی کو میرا تجسس سمجھ رہا تھا۔ مجھے طرح طرح سے خوش کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ آدمی تربت میں بھی تو خوشامد قبول کرتا ہے۔ اُسے کچھ یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میں پیرو دادا کے لیے اُس کی موثر سفارش ثابت ہو سکتا ہوں۔ میں نے اشارۃً اُسے باور کرانا چاہا کہ پاڑے پر آدمی اپنی سفارش آپ ہوتا ہے۔ اُس کی حد سے زیادہ خجالت سے مجھے شرمندگی ہونے لگی تھی بلکہ گھٹن بھی۔

ڈھائی بجے دسترخوان بچھایا گیا تب کہیں وہ میرے پاس سے ہٹا۔ کھانے میں آتنی ... کے انتظار میں کی گئی تھی۔ کھانے کے بعد بھی وہ نہیں آیا۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی۔ تجمل تو خیریت سے ہے؟ کہیں پیرو کے گھر جا کے وہ بکھر نہ گیا ہو۔ پاڑے کا نہیں تو اُن دونوں کو ابا جان اور جولین وغیرہ کا تو خیال ہو گا۔ ہو سکتا ہے، وہ کہیں اُنھی کی طرف نہ نکل گئے ہوں۔ سوا تین بجے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ مارٹی، شامو اور جمرو بھی میرے ساتھ اُٹھ گئے۔ میرا ارادہ پیرو کے گھر جانے کا تھا مگر انھیں میں کیسے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ یوں روکنا بھی مناسب نہیں تھا لیکن اِدھر اُدھر کا کوئی عذر کرنے کے بجائے میں نے صاف صاف اُن سے کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ نہ آئیں، ابھی پاڑے پر رہیں۔ شام کو کسی وقت میں یہیں واپس

آجاؤں گا۔ رات بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے احتیاطاً یہ اُن سے کہہ دیا وہ سب بھی اتنے مجہول و ناتواں ہو رہے تھے کہ کسی نے مجھ سے حجت نہیں کی۔

دھوپ اترتی جارہی تھی۔ میں اندازے سے فاصلہ طے کرتا رہا۔ کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج تھا۔ مجھے کام بھی کون سا تھا۔ رات کو گھر ہی پہنچنا تھا۔ اُس وقت تک میرے پاس وقت ہی وقت تھا۔ پیسے میری جیب میں تھے۔ بس تھوڑی بہت نشانیاں مجھے یاد رہ گئی تھیں، وہی ذہن میں رکھ کے میں ایک سڑک سے دوسری سڑک تک پیدل فاصلہ طے کرتا رہا۔ آگے میں نے ٹم ٹم روک لی لیکن مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ ہر چوراہے پر راستے کی نشان دہی کرنے میں مجھے دیر لگتی تھی۔ ٹم ٹم والا جلد ہی گھبرا گیا۔ چناں چہ تھوڑی ہی دُور جاکے میں اُتر گیا اور اُتر کے مجھے اندازہ ہوا کہ میں تو بے دست و پا ہو گیا تھا۔ میری لگام بھی جیسے کوچوان کے ہاتھ میں تھی۔ پیدل آدمی راستوں میں شامل ہو کے چلتا ہے اور وہی بات تھی کہ پیدل تو میں اپنے ساتھ چل رہا تھا، اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا۔ طرح طرح کے خیال، طرح طرح کے وہم و گمان میرے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا، جھل کی حالت اگر ذرا بھی غیر ہوئی تو میں اُسے فیض آباد جانے کا مشورہ دوں گا۔ وہ یہاں رہا تو کانتے اُسے ستاتا رہے گا، ستائے گا تو وہاں بھی۔ اُس کا نقش تو جھل سے مٹائے نہ مٹے گا۔ کانتے تو اُس کی عادت تھا، اُس کا سایہ۔ کانتے کو وہ ایسے کس طرح بھول سکتا تھا مگر فیض آباد میں زریں موجود ہے۔ زریں اُسے اچھی طرح سمجھتی ہے۔ کاش وہ اِس وقت یہاں موجود ہوتی۔ اُس کے سامنے جھل بے بس سا ہو جاتا ہے۔ زریں کے علاوہ وہاں جہاں گیر ہے، نیاں ہے۔ اُستاد جا ہو کلکتے سے آسکتا ہے۔ فیض آباد کے اڈّے کے بہت سے لوگ ہیں۔ موت پر عزیز شاید اس لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ آدمی کو گداز دیتے رہیں کہ ابھی اور بھی باقی ہیں۔ ایک کے چلے جانے سے سب نہیں مر گئے۔ جگہ کی تبدیلی بھی دوا کا کام کرتی ہے۔ یہاں بمبئی میں بھی کئی گھر ہیں لیکن سفر کا احساس بھی کچھ کم بوجھ نہیں ہوتا۔ آدمی اپنے ٹھکانے ہی پر ٹھیک طرح جسم کھولتا اور پھیلاتا ہے۔

میں خود سے سوال کرتا، خود کو جواب دیتا رہا۔ لیکن ابھی وہ فیض آباد بھی تو نہیں جاسکتا۔ کوئی بھی اُسے یوں نہیں جانے دے گا۔ نہ ابّا جان، نہ جولین، نہ پیرو۔ اور ابھی تو خانم کا معاملہ بیچ میں ہے۔ کیا ضروری ہے کہ خانم نواب عالم تابکے چالیسویں کے بعد ہی وہاں سے آئے۔ پہلے بھی تو آسکتی ہے اور پہلے بھی تو اُس کا دل گھبرا سکتا ہے۔ اِس کا مطلب ہے، ہمیں یہاں میں بھی اُس کی خیر خبر رکھنی چاہیے۔ جانے وہ کس حال میں ہو۔ نواب لوگوں کا کیا بھروسا۔ ہمارے جانے کے بعد معلوم نہیں اُن کا رویہ کیسا ہو۔ خانم نے وہاں ٹھیر جانے کا فیصلہ کر کے غالباً غلطی ہی کی ہے۔ پتھروں کے دیوانے راجا نواب خانم کو بھی تو اپنا ہدف بنا سکتے ہیں۔ خانم کی شکل میں ہمارا ایک آدمی تو ابھی وہاں موجود ہی ہے۔ ہمارا سراغ لگانے اور ہمارے بارے میں حقائق جاننے کے لیے وہ اُسے مجبور کر سکتے ہیں۔ خانم بہت پختہ کار اور ہوش مند عورت ہے لیکن ایک اکیلی عورت کب تک مزاحمت کرتی رہے گی۔ جھل، پیرو اور ابّا جان نے اِس بابت ضرور سوچا ہو گا۔ گو اندر زنان خانے تک باہر کے کسی آدمی کی رسائی ممکن نہیں۔ بڑے نواب کو ہیروں وغیرہ سے ایسی رغبت معلوم نہیں ہوتی۔ ابھی بھائی کا زخم بھی تازہ ہے۔ اُس کی طبیعت ویسے بھی اس حرص و طمع پر مائل نہ ہو گی۔ خانم کے سلسلے میں اتنی مروت تو اُس کے دل میں ہو گی ہی کہ وہ اپنے سر گشتہ سودائی بھائی کی مسیحائی کے لیے اپنا گھر منتشر کر کے آئی ہے۔ اُس کا بھائی نہ رہ سکا مگر اُسے ایک آسودہ موت تو نصیب ہوئی۔ اُس کی روح تو اب ایسی رہے گی۔ خانم پر کسی افتاد کی صورت میں گیتی آرا اور رہبیں بھی اُس کی سپر ثابت ہوں گی۔ اُن کی موجودگی میں خانم کو محفوظ سمجھنا چاہیے۔ نواب زادی ہونے کے باوجود اُن میں وہ ... ہے، وہ تو خود شیشے کے مانند ہیں، خانم کو تماشا بنتے نہیں دیکھتی رہیں گی۔

ماچھی نے مجھے بتایا تھا کہ حیدرآباد سے ہمارے تعاقب میں سفر کرنے والے آدمیوں کو اُس نے باڑے پر روک رکھا ہے۔ وہ باڑے کی اوپری منزل میں قید ہیں۔ انھیں چھوڑ دیا جاتا لیکن کانتے کی موت کے بعد ماچھی نے فیصلہ بدل دیا۔ ماچھی نے کانتے کی ... پر عزم کیا تھا کہ اب وہ اُن دونوں کو اُس وقت تک نہیں چھوڑے گا جب تک حیدرآباد میں ابّا جان کی حویلی پر حملہ کرنے والوں میں سے ایک ایک کو چن کے ختم نہیں کر دے گا۔ ... کی غضب ناکی کا کانتے نشانہ بن گیا تھا۔ ماچھی ارادے کا اتنا ہی پکا تھا لیکن ریاست حیدرآباد، شہر جیسلمیر کے رانا مہتاب کی حویلی نہیں ہے جس میں ایک اندھیری رات فصیل پھلانگ کے وہ اور پیرو اندر داخل ہو گئے تھے اور جھل کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے مہتاب کی آنکھیں نکال لائے تھے۔ حیدرآباد میں قدم قدم پر ایک سے ایک رانا مہتاب ہے۔ جیسلمیر سے اُٹھ گنی، دس گنی بڑی سیکڑوں حویلیاں سر اُٹھائے کھڑی ہیں۔ ماچھی کو اندازہ تھا کہ حیدرآباد سے ہمارا لوٹ آنا کسی زنداں سے نجات کے برابر ہی نہیں، دوبارہ ملنے کے مترادف بھی ہے۔ باڑے میں مقید اُن دو آدمیوں نے حجت تمام کرنے کے بعد حشمت جنگ کی طرف اشارہ کیا تھا مگر ابھی تک یہ لازم نہیں ہے کہ ابّا جان کی حویلی پر آنے والے مسلح آدمی بھی اُسی کی طرف سے بھیجے گئے ہوں۔ جیسا کہ وہ کہہ رہے تھے، ممکن ہے اُن کا مقصد ہمارے تعاقب کے سوا واقعی کچھ اور نہ ہو۔ انھیں سرپرست یہی حکم دیا گیا ہو کہ وہ ہمارے بارے میں پورا اطمینان کر کے آجائیں کہ ہم کون ہیں اور کہاں کے اتنے بڑے رئیس ہیں جو ایک نادر ہیرا کسی جان پہچان، کسی رشتے حوالے کے بغیر ایک نواب کو پیش کر ... ہیں۔ اس جودوسخا کے پیچھے ہمارا کوئی اور مقصد تو نہیں۔ نواب کے معتمدین نے اُسے مشورہ دیا ہو گا کہ ان ... بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو جائیں تو کسی نازک وقت کام ہی آئیں گی۔ باڑے میں ہمارے قبضے میں موجود یہ دو آدمی اور ریل میں ... پوش اور اُس کے "خاوند" کا کوئی باہمی ربط ضبط معلوم نہیں ہوتا تھا۔ دونوں نے اپنے آقاؤں کے مختلف نام بتائے تھے۔ اُن بہروپیوں نے نواب قطب الدین کا نام لیا تھا مگر وہ ... ... ب بھی ہو سکتا ہے جس نے ابّا جان کی حویلی میں نقب زنی کرائی تھی لیکن وہ نواب حشمت جنگ ہی ہے تو بڑے نواب کی حویلی کا زنان خانہ اُس کی دست رس سے دُور نہیں۔ پھر تو خانم کا اُس کی زد پر آنا طے ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خانم ہمارے بارے میں زبان کھولنے کے بجائے موت کو ترجیح دے گی۔

میں نے تمام تنکے، کانٹے اپنے سر سے جھٹک دینے چاہے۔ ہم یہاں بیٹھ کے بھی کیا سکتے ہیں۔ کانتے کو رخصت ہوئے ابھی پانچواں دن ہے، حیدرآباد سے نکلے ہوئے دس دن کے قریب ہو رہے ہیں۔ ان دس دنوں میں فراغت کا کتنا وقت ہمیں ملا ہے۔

شاید وہ خانم کو نہ چھیڑیں، ایک عورت سمجھ کے اُسے معاف کر دیں۔ پہلے نواب حشمت جنگ کو اپنے آدمیوں کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے جو ابھی تک ہماری تحویل میں ہیں۔ اب بہت سوچ سمجھ کے ہی ہمیں حیدرآباد کا رُخ کرنا پڑے گا۔ خانم کے لیے وہاں جانا تو ہر صورت پڑے گا۔ چلتی ریل میں ہم نے جن آدمیوں کو زمین پر اُتار دیا تھا۔ وہ بھی اب اپنے آقا کے پاس پہنچ چکے ہوں گے۔ اُن کے آقا کو اب پہلے سے زیادہ محتاط ہو جانا چاہیے۔ ہماری طرف سے کسی جوابی اقدام کا خطرہ بھی اپنے سر پر منڈلاتا محسوس کرنا چاہیے۔ گو امکان یہی ہے کہ اُس کے واپس جانے والے نمک خواروں نے اپنی جان کی امان کے لیے اُس پر یہ حقیقت آشکار کرنے سے گریز کیا ہو گا کہ وہ ہمیں اپنے بھیجنے والے کا نام پتہ بتا کے آئے ہیں لیکن اگر اُنھوں نے ریل میں اپنے ساتھ بیتی ہوئی داستان کا ایک حصہ بھی گوش گزار کیا ہے تو باقی سب کچھ جہاں دیدہ نواب قطب الدین کو خود اخذ کر لینا چاہیے کہ ہاتھ میں آجانے کے بعد ہم نے اُن کے سرغنہ نواب کا پورا نام پتہ، سارا شجرہ جانے بغیر اُنھیں نہیں چھوڑا ہو گا۔ سب کچھ نقش کر لینے کے بعد۔ اُنھیں یوں چھوڑ دینے کی فیاضی سے مراد نواب کے لیے ہماری جانب سے ایک تنبیہ ہی ہونی چاہیے۔ کسی حساس طبع اور نکتہ بیں شخص کے لیے ایک جارحانہ تنبیہ۔ سو اگر وہ کوئی قطب الدین علی تھا تو اپنے آدمیوں کی ناکام واپسی اور اُن سے سفر کا ماجرا سُن کے اُس کی نیندیں ضرور اچاٹ ہو گئی ہوں گی۔

میں بہت دُور آچکا تھا۔ نہ وقت کا احساس ہوا، نہ فاصلے کا اور نہ تھکن کا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ لوٹ چلوں۔ اندھیرا ہو جانے پر نشانیاں بھی اندھی ہو جائیں گی مگر اتنی دُور آجانے کے بعد واپس جانے کو بھی دل نہیں مانتا تھا۔ شام کے وقت سڑکوں پر بھیڑ بھی بڑھ گئی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ گھوم پھر کے مجھے پھر اُسی جگہ آنا پڑا۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی اور اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا لیکن میں اِدھر اُدھر بھٹکتا ہوا کوٹھیوں اور بنگلوں کے ایک علاقے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر گلیوں میں جاکے میری رفتار تیز ہو گئی اور میرا شبہ ہر اگلے قدم پر بڑھتا گیا کہ اب پیرو کا مکان دُور نہیں ہے۔ پندرہ منٹ اردگرد کی گلیوں کے چکر کاٹنے کے بعد آخر میں اُس کے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ جانے کیوں مجھے کوئی بڑی منزل سر کر لینے کا سا سکون ملا۔ میں اگر پرسوں ہی پیرو سے پتہ پوچھ لیتا تو یہ دشواری پیش نہ آتی۔ دروازے پر ایک مستعد دربان موجود تھا۔ پچاس سے نیچے کا گٹھے ہوئے جسم کا ایک پستہ قد آدمی۔ وہ سر سے پیر تک متجسس نظروں سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے دھڑکتی آواز میں اُسے بتایا کہ مجھے پیرو دادا سے ملنا ہے۔

"ابھی کیدر سے آیا ہے صاحب؟" وہ کھردرے لہجے میں بولا۔

"اندر جاکے بولو کہ راجا آیا ہے۔" میں نے اُس کی ترش نگاہی نظر انداز کر دی۔ نئے آدمی کے لیے اُس کا رویہ یہی ہونا چاہیے تھا۔

مجھے ٹھیرا کے وہ اندر چلا گیا لیکن دروازہ جیسے ہی کھلا کاریڈور کے ساتھ بنے ہوئے چبوترے پر کھڑی ہوئی لڑکی نے مجھے دیکھ لیا۔ "کون ہے کون ہے؟" اُس نے بے تابانہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دربان سے پوچھا۔ دربان نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ پہلے تو اُس کی آنکھیں سمٹتی پھیلتی رہیں پھر ایک دم وہ چبوترے سے کود پڑی۔ "ارے آپ!" اُس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "آپ کب آئے؟"

وہ گیتا تھی۔ اُسے پہچاننے میں مجھے چند لمحوں کا تامل ہوا۔ وہ خاصی بدلی ہوئی تھی۔ پہلے سے بڑی معلوم ہو رہی تھی، لمبی اور تیکھی۔ اتنا بڑا عرصہ درمیان میں نہیں گزرا تھا جتنا اُس کے سراپے سے لگ رہا تھا۔ رنگت بھی بدل گئی تھی۔ بادامی رنگ اور گہرا ہو گیا تھا جیسے اُس میں سونا مل گیا ہو۔ لمبی پلکیں، متجسس شربتی آنکھیں، ترشے ہوئے رسیلے ہونٹ۔ لمبی سی چُٹیا کمر پہ لٹک رہی تھی۔ پیازی رنگ کی ساڑی اور ساڑی پر عنابی واسکٹ پہنے وہ سرتاپا ایک اور لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ ایک مضطرب اور اپنے آپ سے بے خبر سی لڑکی۔ تیور میں اضطراب آمیز شائستگی، نفاست آمیز اضطراب۔ مجھے دیکھ کے اُس کا وہی حال ہوا جو کسی بہت قریبی عزیز کی اچانک آمد پر ہو سکتا ہے۔ میرے آنے کا جیسے اُسے یقین نہ آرہا ہو اور میرے آنے کی خوشی کے اظہار کا طریقہ سمجھ میں نہ آرہا ہو۔ نظر آرہا تھا کہ پیرو اُسے مسلسل میرے بارے میں بتاتا رہا ہے۔ وہ باہر ہی سے چلّانے لگی۔ "پاپا! پاپا! دیکھیے کون آیا ہے۔" اور مجھے وہیں چھوڑ کے وہ سرپٹ اندر کی طرف لپکی پھر اُسے کچھ خیال آیا، فوراً پلٹ پڑی۔ "آیئے آیئے، اندر آیئے۔"

میں نے اندر جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ اُس نے بے چینی سے پوچھا۔ "اکیلے آئے ہیں؟"

مجھے ایک لمحے کو تعجب ہوا لیکن پھر میری سمجھ میں آگیا تھا۔ پیرو نے فرخ، فریال کے بارے میں اُسے بتایا ہو گا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو صرف میں ہی..."

اُس نے ... بات پوری نہ ہونے دی۔ "سویرے سے میں سوچ رہی تھی، شاید آج آپ آجائیں۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔ "آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں ہاں، بالکل ٹھیک۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کیا میں کچھ بدلا ہوا لگ رہا ہوں؟"

"نہیں، بالکل وہی۔ آپ میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔"

"تم کیسی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اور ممی، ممی کیسی ہیں؟"

"اُن کی طبیعت اچھی نہیں تھی لیکن اب پہلے سے بہت ... ہے۔" اُس کی آواز چہک رہی تھی۔

"پیرو بھائی کے آنے سے تو تم بہت خوش ہو گی۔"

اس کی آنکھیں ہنس گئیں۔ "پاپا!" وہ سرشاری سے بولی۔ "پاپا جب سے آئے ہیں لگتا ہے، یہ گھر زندہ ہو گیا ہے۔ اب کے اُنھوں نے دن بھی تو بہت لگا دیے تھے۔"

جیل میں پیرو کو کبھی اتنے دن نہیں لگے ہوں گے۔ میں نے سوچا اُس سے کہوں کہ اس سے پہلے پیرو کو تبت اور حیدرآباد جیسی بڑی جیلوں سے واسطہ بھی کب پڑا تھا۔ گیتا کی آواز اندر پہنچ گئی تھی، اندر سے تیز قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ دوسرے ہی لمحے پیرو میرے سامنے تھا۔ "ہائیں راجا!" وہ اچھل کے بولا۔ "تم کیسا! ابھی کیدر سے آگیا۔" اُس نے پوری طاقت سے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور زمین سے اُٹھا کے گھومنے لگا۔ گیتا کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ "کیسا ہے، ابھی سب ٹھیک تو ہے نا؟"

مَیں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "چلو چلو، اندر چلو۔" وہ مضطرب لہجے میں بولا اور وہیں سے آوازیں لگانے لگا۔ "اے تھجل بھائی! تھجل بھائی! پتہ ہے کون آیا ہے، ایدر، اپنا راجا آیا ہے۔"

میری کمر میں ہاتھ ڈال کے تقریباً دھکیلتا ہوا وہ ایک کشادہ اور روشن کمرے میں لے آیا۔ سامنے چوکی پر تھجل گاؤتکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور اُس کے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی لیکن روشنی میں تو خال و خط اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ صاف لگتا تھا کہ یہ بچی کھچی روشنی ہے، اندر جسم میں بہت اندھیرا بھرا ہوا ہے۔ کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس وقت کمرے میں اُس کے یوں پڑے رہنے سے سب ظاہر تھا۔ مَیں اُس کے پاس جا کے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ "کیسے آ گیا رے؟" اُس نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بس آ گیا، راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔"

"وادا دوپہر جانے کو بولتے تھے، پر سوچا، اب سویرے ہی نکلیں گے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "میں جو سوچ کے آیا تھا، ارادہ کرتے کرتے رہ گیا۔ یہ گھر بھی زرّیں کی حویلی سے کیا کم تھا۔" میری طرح گیتا تھجل کے بائیں جانب اُس کے پہلو سے لگ کے بیٹھ گئی تھی، کسی بچّی کے مانند جو ٹکر ٹکر دیکھتی بڑوں کی باتیں سنتی رہتی ہے۔ تھوڑی دیر میں پیرو کی بیوی رانی بھی آ گئی۔ اپنے گھر میں آدمی کو اس سے زیادہ کون سی کشادگی اور طمانیت مل سکتی ہے جو یہاں تھجل کو مل رہی تھی۔ مجھے بھی معلوم ہوتا تھا، تھجل یہاں عرصے سے مقیم ہے۔ مجھ سے پھر یہ بھی نہ کہا گیا کہ فرخ، فریال نے صبح چلتے وقت اصرار کیا تھا کہ میں تھجل کو گھر ہی لے آؤں۔ ابّاجان نے بھی یہی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہاں گیتا اور اُس کی ماں کسی طور فرخ، فریال اور جولین سے کم اُس کی نگہ دار نہیں تھیں۔ پیرو کی بیوی رانی کی نگاہوں میں تھجل کے لیے وہی عزت اور پذیرائی تھی جو کسی آنکھ میں ممکن ہے۔ پیرو کو ان دونوں میں کتنا وقت ملا ہو گا۔ ظاہر ہے، یہ وابستگی صرف دونوں کی تاکید و تلقین کا حاصل نہیں تھی۔ تبت کے سفر کے لیے تھجل کی طلبی پر کلکتہ آنے سے پہلے ہی پیرو نے ہمارے بارے میں اُن سے بہت کچھ کہا ہو گا، کہتا رہا ہو گا۔

پیرو کی بیوی رانی، جسے تھجل کو بھابی جی کے لقب سے مخاطب کرتے سن کر مَیں نے بھی یہی کہنا شروع کیا تھا، مجھ سے فرخ، فریال کے متعلق پوچھنے لگی اور وہی سوال کیا جو جولین نے مجھ سے کیا تھا کہ اتنے زمانے بعد اُن سے مل کے مجھے کیسا لگا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ابھی مَیں اُن سے پوری طرح ملا ہی کہاں ہوں۔ کانتے نے مہلت ہی نہیں دی۔ موت تو وہ ساتھ لے کے آیا تھا۔ اس پہلی رات کے سوا اُن سے ٹھکانے سے بات ہی کتنی ہو پائی ہے۔ کانتے کے نام پر وہ فسردہ ہو گئی اور خاموش بھی۔ پیرو اور اُس کی بیوی کے درمیان دوستوں کا سا تعلق تھا۔ لگتا تھا، پیرو اُس سے کچھ چھپاتا نہیں ہے۔ سبھی کچھ شاید اُسے معلوم تھا لیکن گیتا کے چہرے کی سادگی بتا رہی تھی کہ وہ بہت سی باتوں سے بے خبر ہے۔ اُسے نہیں معلوم کہ اُس کا باپ بمبئی کے کتنے پاڑوں کا دادا ہے اور پاڑا کیا، پاڑے کا دادا کون ہوتا ہے۔ اُسے کوئی بتاتا تو پھر وہ ضرور پوچھتی کہ آخر اُس کے باپ کو پاڑے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔ یہ حویلی تو نہیں تھی لیکن اس گھر میں سبھی کچھ تھا۔ کشادہ اور ہوادار کمرے، باغیچہ، طرح طرح کا ساز و سامان، آرائش کی چیزیں، کھڑکیوں اور دروازوں پر رنگ برنگے پردے، فرشی نشست کا ایک کمرہ، ایک کمرے میں صوفے، کرسیاں اور رنگ کی میز لگی ہوئی۔ جگہ جگہ گل دان، بے داغ دیواریں، خدمت گار، ایک باوقار، معاملہ فہم پڑھی لکھی بیوی۔ ٹھیر ٹھیر کے بات کرنے والی آواز میں گونج، لہجے میں گداز، پتے تُلے نقش و نگار، شہابی رنگ، اُجلی اُجلی سی، اپنے نام کی نسبت سے وہ کسی رانی ہی کی طرح تھی۔ اور ایک بیٹی، چینی کی کسی بڑی گڑیا سے مشابہ، چابی کے بغیر تھرکتی پھرکتی ہوئی گڑیا، پھولوں کی طرح نازک، شیشے کی طرح صاف و شفاف جیسے ریشم سے اور روشنی سے بنی ہو۔ کسی گھر میں اس سے زیادہ اور کیا ہونا چاہیے۔ اِن سب کے ہوتے پیرو کو پاڑے کی کیا ضرورت ہے۔ پاڑے اور اس گھر میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ پیرو کو یہاں آ کے تو بہت مشکل پیش آتی ہو گی یا پھر یہاں میں جا کے۔ یہاں تو ریشم ہی ریشم ہے۔ پاڑے میں ہر طرف خنجر تنے رہتے ہیں، لاٹھیاں، بلم۔ کسی دادا کی زندگی اور موت کے درمیان بس ایک چاقو کا فاصلہ ہوتا ہے۔ مَیں نے کبھی پیرو سے بات کروں گا، وہ پاڑے کیوں جاتا ہے۔ اگر پاڑے سے مراد گھر چلانے کے کسی معقول آمدنی کا حصول ہے تو پیرو تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اُس کے بازوؤں میں دم ہے، اُس کی آنکھیں بینائی سے بھری ہوئی ہیں اور اُس کے کان دُور افتادہ آوازیں اپنی طرف کھینچ لینے پر قادر ہیں۔ اگر ایسا ہے تو میرے پاس کرشنا جی کی چھوڑی ہوئی بہت بڑی رقم پڑی ہے۔ آٹھ لاکھ روپے کے بہ قدر۔ اب تک تو بینک میں رکھے رکھے اور بڑھ گئی۔ وہ میری رقم ہے۔ اگر پیرو مجھ پر اپنا حق سمجھتا ہے تو اُسے انکار نہیں کرنا چاہیے مگر شاید بات نہیں تھی۔ ایک بار کوئی پاڑے سے وابستہ ہو جاتا ہے تو پاڑا اُسے مشکل سے چھوڑتا ہے۔ پاڑا آدمی میں رچ سا جاتا ہے۔ پیرو کی وابستگی تو ابتدا سے ہے اور یہ بات تو کتنی بار اُس کی بیوی رانی نے بھی کہی ہو گی۔ معلوم نہیں، پیرو اُسے کیا جواب دیتا رہا ہے۔ ایک دن میں بھی اُس سے پوچھوں گا ضرور۔ ممکن ہے، پیرو کے پاس کوئی بہت بڑا جواز ہو جو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

گیتا مجھے اپنی مختصر سی مطالعہ گاہ میں لے گئی۔ جہاں نصاب کی کتابوں کے علاوہ سو ڈیڑھ سو کے قریب انگریزی ناول الماری میں سجے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں طبلہ رکھا تھا اور ہارمونیم بھی اور میز پر طرح طرح کی بانسریاں۔ میرے پوچھنے پر اُس نے شرمیلی آنکھوں سے بتایا کہ اُسے رقص اور موسیقی کا شوق ہوا تھا۔ باقاعدہ ایک استاد سکھانے آتے تھے۔ کئی ماہ کی تربیت کے بعد استاد کا کہیں تبادلہ ہو گیا۔ دوبارہ اُتنے اچھے کا استاد نہ مل سکا۔ پھر اس کا شوق ماند پڑ گیا۔ کبھی کبھی اُس کے بابا وہ خود ہی الٹا سیدھا بجا لیتی ہے۔ اُن تینوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے لیے کیا کریں۔ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ سب نے مل کے ہی کھانا کھایا اور پیرو مجھے بتاتا رہا کہ گیتا کی ماں نے کیا پکایا ہے اور گیتا نے کیا۔ پیرو کی بیوی مجھ سے پوچھنے لگی کہ مجھے کون سے کھانے سے زیادہ پسند ہیں۔ بے اختیار مَیں نے تھجل کی طرف دیکھ کے کہا۔ "پتلی دال اور خشکا۔" جیل کے سات سالوں میں مشترکہ

[...]ری تھی میرے جواب پر وہ معنی خیزی سے مسکرائی۔ وہ سمجھ گئی ہو گی کہ میری مراد کیا ہے۔ البتہ [...]نکھیں پٹ پٹاتی رہی۔ دس بجے کے قریب مَیں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا تو وہ دونوں مجھے [...] لیکن میرا خود بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ تھجل کی حالت پہلے سے کچھ بہتر معلوم ہو رہی تھی۔ [...] میرے آنے کا بھی کچھ اثر ہو گا مگر پیرو نے تاکید سے مجھے اُٹھا دیا کہ میرے نہ جانے سے [...]جان پریشان ہوں گے۔

وہ تینوں مجھے چھوڑنے کے لیے گھر سے نکل آئے۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ [...]بتوں کی وجہ سے کھمبوں کی روشنی چھلکتی ہوئی سڑک پر پڑ رہی تھی۔ کچھ آگے جا کے ہمیں [...]بھی لوگ ٹہلتے نظر آئے، خوش پوش لوگ۔ وہ رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کر رہے [...] اس علاقے میں ہر سُو سکون ہی سکون تھا۔ سارے کا سارا علاقہ کسی جنگل کے مانند تھا۔ [...] جنگل کے بیچ میں مکانات بنا لیے گئے ہوں اور آنے جانے کے راستے۔ ہم مختلف گلیوں [...] گزر کے خاص سڑک پر آ گئے۔ راستے میں فرخ فریال کے بارے میں گیتا اشتیاق آمیز [...]ہے میں بولی۔ "اُن سب کو بھی یہاں لائیے گا۔"

"کیوں نہیں، ضرور، وہ آتی رہیں گی۔"

"ابھی تھی اُس کے پاس کیوں نہ چلا جائے۔"

"مگر جب آپ لے جائیں گے تبھی ......"

"تم راجا کے ساتھ جا سکتا ہے۔" پیرو نے کہا اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "راجا! [...]بھی اِس کو اُودر لے جا۔"

"اِس وقت؟" گیتا نے مذبذب سے کہا۔

"اِس وقت میں کیا جاتا ہے۔ ابھی دو تین روز بیٹا لوگ کے ساتھ ہی رہنا۔ وہ [...]ستر اور اُس کا بھائی ہے۔ تم اکیلا ہونے کا بہت بولتا تھا، ایدر ابھی تم کبھی بھی اکیلا نہیں [...]رہے گا۔ اپن باہر سے تیرے لیے کیسا کانچ کا مانک، پھول کا مانک لوگ لایا ہے کہ [...]دیکھے گا تو بولے گا پاپا! اپن کو اودر ہی اُن لوگ کے پاس رہنے کا ہے۔ دیکھے گا تو دیکھتا [...] جائے گا۔ راجا سیدھا اُودر ہی جا رہا ہے۔ جانا ہے تو ابھی چلے جانے کا ہے۔ کیوں راجا؟"

"ہاں دادا!" مَیں نے اُس کی ہم نوائی کی کوشش کی۔ "چلو، ضرور چلو۔ یہ تو بہت اچھی بات ہو گی، سب خوش ہو جائیں گی۔"

"مگر رات بہت ہو گئی ہے۔" پیرو کی بیوی نرمی سے بولی۔

"رات بہت ہو گئی ہے۔" پیرو کی بیوی نرمی سے بولی۔

"رات بہت ہو گیا ہے۔ ابھی راجا جو ساتھ ہے۔ راجا اکھا شیر ہے۔" پیرو نے [...]زور سے کہا۔ "پتہ ہے، راجا کون ہے؟"

"وہ لوگ اب سو گئے ہوں گے۔"

"اُودر اپنا گھر ہے رانی!" پیرو ٹھنک کے بولا۔ "دیکھنا، ایدر راجا کا جاپ سنے گا [...]سنبھال پڑے گا۔" مگر پیرو کچھ توقف کے بعد خود ہی ہنس کے کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے، ابھی [...]سویرے اپن کے ساتھ چلنا۔ اپن سمجھ گیا۔ ابھی پہلی بار جا رہا ہے، ایسا تھوڑا چلا جائے گا۔" پیرو کے پاس شاید موٹر نہیں تھی۔ مَیں نے بھی نہیں پوچھا، ہوتی تو وہ اُسی میں مجھے پہنچا کے آتا۔ ہمیں گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ سواری مل گئی۔ میں پیچھے مڑ کے دیکھتا رہا، جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی، تینوں وہیں کھڑے رہے۔ میں پاڑے پہنچا تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ جبرو، شامو اور مارٹی کو ساتھ لے کے مَیں گھر آ گیا۔

دوسرے دن اوّل وقت میں تھجل اور پیرو کے ساتھ گیتا اور اُس کی ماں گھر آ گئی تھیں۔ وہ آئیں تو مارٹی، جولین، شہ پارہ اور چمپا بیگم کو بھی باندرے سے لے آئی۔

کانتے کے دسویں پر ابّاجان نے مارٹی اور ڈنگو کے توسط سے بہت سی دیگیں پکوا کر غریبوں میں تقسیم کرائیں۔ اس کے ایک دن بعد ابّاجان نے ایک بڑی سی سیاہ موٹر خرید لی تھی، تقریباً نئی موٹر۔ اُنھوں نے کہیں سے ایک کہنہ مشق ڈرائیور بھی ڈھونڈ لیا تھا۔

اُس روز کانتے کو گزرے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ تھجل اور پیرو ابّاجان کے گھر میں تھے۔ تھجل تو پہلے ہی سے تھا، پیرو کو بطورِ خاص ابّاجان نے بلوایا تھا۔ کمرے میں اُس وقت نہ منیر علی تھے، نہ مولوی اکرم۔ ابّاجان نے بوجھل آواز میں تھجل اور پیرو کو مخاطب کر کے کہا کہ "مَیں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ مجھے بھی بے چینی ہونے لگی کہ ابّاجان آخر ایسی کون سی بات کہنا چاہتے ہیں جو اُن کے لب و لہجہ پر اتنی سنجیدگی طاری ہے۔ "دیکھیے، میری بات توجہ سے سنیے۔" ابّاجان نے کہا۔ "ممکن ہے، ابھی یہ سب قبل از وقت معلوم ہو اور آپ کو گراں گزرے لیکن زندگی تو رواں دواں رہتی ہے۔ بے شک کانتے کے جانے سے سب کچھ اُجڑا ہوا لگتا ہے۔ دل کا وہ عالم نہیں رہا۔ زندگی بہت بے اعتبار ہے اور اب اور بھی بے اعتبار معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہی ٹھیک ہے کہ ہر شخص کے دن طے کر دیے گئے ہیں اور ہمارے پاس صبر و شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" ابّاجان نے چند لمحوں کے لیے تامّل کیا اور سر جھکائے اٹکتی آواز میں بولے۔ "پھر وقت ملے نہ ملے، یا کب ملے اور کتنا ملے۔ مَیں جو بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں، وہ نئی نہیں ہے۔ فیض آباد میں بھی مَیں نے آپ سے درخواست کی تھی اور آپ نے صاف جواب دے دیا تھا۔ میری التجا ہے کہ آپ اس پر نظرِ ثانی کریں۔"

"اپن سمجھ گیا بڑے صاحب! اچھا ہے، ابھی آگے نہ بولو۔" پیرو نے بے تابی سے کہا۔ "اپن سے ایسا ....."

ابّاجان نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے روک دیا۔ "دیکھیے، یہ سب بہت ہے، بے اندازہ ہے، میرے آپ کے تصور سے زیادہ۔ یہ میری ضروریات اور خواہشوں سے کہیں بڑھ کے ہے۔ اس سے زیادہ آدمی اور کیا ہوس کر سکتا ہے۔ آپ مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہیں اور میری خوشی کو بہرحال مقدم سمجھتے ہیں۔ سمجھ لیجیے، میری خوشی اسی میں ہے کہ آپ بھی اس میں شریک ہوں۔"

پیرو کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ابّاجان نے کہا۔ "میری بات پہلے پوری طرح سن لیجیے۔ تسلی سے۔"

"ہاں سن رہے ہیں بابا!" تجمل بدبداتے ہوئے بولا۔

"لیکن غور بھی کیجیے گا اور فوراً جواب دیجیے گا۔" اباجان نے تجمل کے لہجے پر توجہ نہیں دی اور نرمی سے کہا۔ "میں اکیلا اسے صرف نہیں کرسکتا۔ روپیہ پیسہ تو کس لیے ہے۔ آدمی کے لیے ہوتا ہے۔ آدمی کو اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اچھی زندگی گزارنے کے لیے اور اچھی زندگی گزارنے کی تمنا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ میرے پاس بظاہر زندگی زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔ یہ باقی وقت میں سکون اور آرام سے گزارنا چاہتا ہوں اور سمجھتا ہوں، اتنی لمبی مسافت کے بعد میری یہ خواہش بے جا نہیں ہے۔"

"بالکل نئیں ہے۔" پیر نے کہا۔ "اپن تو آپ کو خود ایسا بولنے کا تھا، کیوں تجمل بھائی؟"

"لیکن ایک بزرگ کی حیثیت سے، اُس حیثیت سے جو آپ نے مجھے دی ہے، میرا فرض ہے کہ میرے متعلقین، میرے پوچھنے والے بھی اپنی زندگیاں عزت مندانہ طور پر بسر کریں، اپنی مرضی کی زندگی۔ یقین کیجیے، ایسی کوئی بات ذہن میں نہیں ہے۔ ایسا کوئی بل کہ یہ آپ کا کوئی اجر ہے۔ اس کے حصول میں چونکہ آپ برابر کے شریک رہے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اس کا اجر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس بے جگری اور جذبے کے اجر کے لیے یہ سب بھی بہت تھوڑا ہے۔ اسے کوئی بدگمانی مت سمجھیے۔ آپ تو منع ہی کرچکے ہیں اور فرض کیجیے کہ فی الواقعی میرے دماغ کے کسی گوشے میں یہ وہم چھپا ہے کہ دولت جتنی اچھی چیز ہے اُتنی بُری بھی ہے، آدمی کو آدمی سے جُدا کر دیتی ہے، سو عقل و فہم کا تقاضا یہی ہے کہ حساب صاف رکھا جائے۔ خدا گواہ ہے، ایسی کوئی کھٹک دل میں نہیں ہے لیکن اگر ہے تو کوئی غلط بھی نہیں ہے۔ اسے نیک نیتی بھی سمجھا جاتا ہے، خیراندیشی، اور میں دلیل کے طور پر یہی کرسکتا ہوں کہ سب آپ کے سامنے پیش کردوں کہ آپ جو چاہیں اُٹھالیں اور جو چاہیں مجھے دے دیں۔ اللہ جانتا ہے کہ مجھے کوئی ملال نہ ہوگا اگر میرے لیے کچھ بھی باقی نہ بچے۔" اباجان کی آواز بھرّانے لگی تھی۔ "سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"اپن کا سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا۔" پیر تمتماتے لہجے میں بولا۔ "اپن کو اس کا کوئی ضرورت نئیں ہے۔ اپن اُودر پہاڑ کا طرف اس لیے نئیں گیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"اپن آپ کے لیے گیا تھا، اپن کا راجا کے لیے۔"

"یہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"پھر اپن ابھی کیدر کا ساجھے دار بن گیا۔ اپن نے تو سپن میں بھی ایسا کبھی نئیں سوچا۔"

"میرے ساتھ بھی کچھ یہی ہوا تھا۔"

"آپ کو مل گیا تو سمجھو اپن کو مل گیا۔ اپن کا مارا ماری تھوڑا کام آگیا۔ آپ کا پاس ہے تو اپن کے پاس ہے بابا! اپن کیا پھر ایدر آپ کے ساتھ نئیں رہنے کا؟"

"ہمیشہ کے لیے۔" اباجان نے جلدی سے کہا۔ "لیکن میری بات پر شاید آپ نے توجہ نہیں دی۔"

"ہم لوگ کیا اُٹھ کے چلے جائیں بڑے صاحب؟" بہت دیر بعد تجمل نے زبان کھولی۔ اُس کی آواز تڑخ رہی تھی۔

"نہیں نہیں آپ کوئی غلط، غلط ....."

"خدا کے لیے اب آپ کچھ نہ بولیے۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "بہت ضبط کیا لیکن مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔"

اباجان کی بے چین نظریں مجھ پر مرکوز ہوگئیں پھر اُنھوں نے اپنے ہی رکھے۔ دیر تک کمرے میں وحشت انگیز خاموشی طاری رہی مگر اچھا ہوا کہ نے پھر کچھ نہیں کہا اور شاید یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ اباجان اُٹھ کے نہیں گئے بیٹھے رہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد پیر واپس جانا چاہتا تھا کہ اباجان نے لیا۔ "آپ کو کہیں لے جانا ہے۔" اُنھوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کوئی ضروری تو ابھی ٹھہر جائیے۔"

"حکم کرو بابا! کیدر کو جانا ہے؟" پیر مستعدی سے بولا۔

"باندرے میں، میں نے ایک مکان دیکھا ہے۔ آپ لوگوں کو دکھا

"ضرور ضرور، کیسا مکان ہے؟"

"شاید پسند آئے۔"

پیر نے فرخ سے پان کی فرمائش کی تھی۔ اس وجہ سے کچھ دیر کی موٹر باہر موجود تھی۔ ڈرائیور ایک آواز پر کہیں سے نمودار ہوگیا۔ ان جب سے موٹر آئی تھی، میں پہلی بار اُس میں بیٹھ رہا تھا۔ ڈرائیور نے ہمیں اُس مکان کے سامنے پہنچا دیا جو اباجان کے بہ قول اُنھوں نے پسند یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی کائی زدہ چار دیواری کی وجہ سے اندر عمارت کے آثار نظر نہیں آتے تھے لیکن جیسے ہی مؤدب باوردی چوکی دار رنگ کا آہنی دروازہ کھولا اور موٹر اندر داخل ہوئی سبھی دیکھتے رہ گئے۔ طرف پھیلے ہوئے سبزہ زار میں جدید طرز کی ایک کوٹھی کھڑی تھی۔ ایک دروبست عمارت نئے رنگ و روغن سے آراستہ ویسے بھی پرانی معلوم نہیں ماہر عمارت ساز نے دس خاکے بنائے بگاڑے ہوں گے تو یہ نقشہ بنا ہوگا پر اندازہ ہوا کہ عمارت کے ایک دوسرے سے پیوست کئی حصے ہیں۔ اندر آنے کئی راستے، اندر باہر الگ الگ زینے۔ ایک کمرے کے بعد دوسرا کمرہ اور کمرا سلسلہ، ہال، مردانہ اور زنانہ حصے۔ عقبی باغیچہ، ایک جانب چھوٹا سا باغ اور حوض میں سنگ مرمر کا فوارہ، ایک طرف کھنچی ہوئی دیوار کے پیچھے ملازموں کاٹھ کباڑ کے لیے گودام، ٹم ٹم اور موٹر کھڑی ہونے کی جگہ۔ ساری عمارت تھی لیکن بھاری قسم کا فرنیچر موجود تھا۔ کئی کمروں میں بچھے ہوئے قالین بھی گئے تھے۔ ہال میں ایک بڑا فانوس بھی چھت سے لٹک رہا تھا۔ یہ اباجان کی عمارت تو نہیں تھی، نہ اس کا رقبہ اتنا لمبا چوڑا تھا لیکن بمبئی کے مکانات

بڑی بھی بمبئی میں ایسے مکانات کی تعداد کم ہی ہوگی۔

"یہ تو کسی نواب راجا لوگ کا ہی ہوسکتا ہے۔" پیر نے ساری عمارت دیکھنے کے اباجان سے کہا۔

"سارے نواب راجا پیسے کے نواب راجا ہوتے ہیں، آسمان سے نہیں اُترتے۔" ان کے لہجے میں ترشی موجود تھی۔ اُنھوں نے تجمل سے پوچھا۔ "کیوں کیسی ہے؟"

"اچھی جگہ ہے بڑے صاحب!" تجمل نے سر ہلا کے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے اور قیمت بھی زیادہ نہیں۔"

کسی نے اُن سے قیمت نہیں پوچھی۔ معلوم ہوتا تھا، اباجان یہاں پہلے بھی بار آچکے ہیں۔ عمارت میں موجود ملازم اُنھیں تعظیم دے رہے تھے اور اُن کی ہدایت دروازے کھولتے جاتے تھے۔ "یہاں اچھی خاصی گنجائش ہے۔" اباجان نے کہا۔ "گو پوری طرح میرے تصور کے مطابق نہیں ہے لیکن سرِدست گزارا کیا جاسکتا ہے۔ اور دیکھ لیں گے۔"

"ابھی اور کیا دیکھے گا بابا!" پیر تذبذب سے بولا۔

"جی چاہتا ہے ایک ایسا گھر ہے جس میں سب آرام و سکون سے سما سکیں۔" اباجان نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خاندان بھی تو چھوٹا نہیں ہے۔ سب مجھے بڑے کا رتبہ دیتے ہیں تو میرا بھی کچھ فرض ہے۔"

"جی جی۔" پیر واُن کی طرف تعجب سے دیکھنے لگا۔

"اس مکان کی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف خاندان ایک چھت کے نیچے ایک ساتھ رہنے کے باوجود اپنی اپنی پردہ داریاں بھی قائم رکھ سکتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ سب ایک دوسرے کے قریب آنے کے آرزومند ہیں، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے۔ فیض آباد میں زریں بیٹی کے ہاں جا کے مجھے اندازہ ہوا کہ کیا ممکن ہے یہی کچھ دیکھ کے میں نے ایک ایسے مکان کی تلاش شروع کی تھی جو سب کا گھر ہو۔ گیتا اور اس کی ماں سے مل کے میرے ارادے کو اور تقویت ملی۔ بہرحال یہ سب بعد کی باتیں ہیں، دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔"

"گیتا تو گھر لوٹنے کو نئیں بولتا تھا۔" پیر نے ہنس کے کہا۔ "اُس کا ماں بھی اپن کو دروازے کو ٹوکتا ہے۔ بولتا ہے ابھی اپن کو کیسا پلا پلایا بیٹا بیٹیاں مل گیا ہے۔ ابھی سب مل گیا ہے۔ اپن بولا، ابھی تم دیکھا کیا ہے، ابھی تم اُودر فیض آباد کیدر کیسا ہے۔"

"آپ کہیں تو پھر سودا کرلوں؟"

پیر واُن کی تائید ہی کرسکتا تھا۔ تردید کے لیے اُس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی، نہ تجمل کے پاس، نہ میرے پاس۔ جہاں روپے پیسے میں کاوٹ نہ ہو وہاں پھر اور سوچنے سمجھنے کا مشورہ بھی کیسے دیا جاسکتا ہے۔ اباجان کے ہاں ویسے بھی اثبات ہی اثبات تھا۔ کسی کو اس میں کیا کلام ہوسکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے اُنھوں نے اُن دونوں سے مال و زر کا ذکر کیوں کیا تھا۔ عندیہ لینا مقصود تھا یا جواز پیدا کرنا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اتنے عرصے میں اُنھوں نے بہت کچھ دیکھا اور جانا بوجھا ہے مگر تب سے یہاں تک اتنے دن ساتھ رہ کے اُنھوں نے کتنا دیکھا اور جانا بوجھا تھا جو دوبارہ اُنھوں نے یہ ذکر کرنا ضروری سمجھا۔ بہرحال یہ بھی طے ہوگیا تھا کہ وہ فیض آباد جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، یہیں بمبئی میں قیام کا ارادہ ہے۔ میں اُن سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا اور کسی اچھے موقع کا منتظر تھا لیکن اب شاید یہ بعد از وقت تھا۔ ٹھیک ہی ہوا جو میں نے اُن سے کچھ نہیں کہا۔ اپنی کوئی رائے اُن پر نہیں تھوپی۔ زریں کا خیال مجھے خود رکھنا تھا اور تجمل کی موجودگی میں میری بھی کیا ضرورت تھی۔

تجمل کو اُنھوں نے نہیں جانے دیا۔ میں شام کو پیر کے ساتھ پاڑے آگیا۔ پاڑے میں خلافِ معمول بڑا مجمع لگا ہوا تھا اور پیر کا شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اندھیری کے دادا راجن کے پاڑے پر پولیس نے چھاپا مار کے راجن کو گرفتار کر لیا تھا۔ پیر نے فوراً ضمانت کا انتظام کرنے کو کہا تھا لیکن جارجی نے بتایا کہ راجن پر علاقے کی ایک عورت کو قتل کرنے کا الزام ہے۔ جارجی کہہ رہا تھا، اتفاق سے وہ اُس عورت کو جانتا ہے۔ وہ فارس روڈ کی ایک مشہور طوائف کامنی ہے۔ راجن نے اُسے مستقلاً اپنے لیے وقف کرلیا تھا اور اُس کا سارا خرچ وہی چلاتا تھا۔ اُسے ایک گھر بھی لے کے دیا تھا۔ جارجی نے بتایا، اُسے معلوم ہے کامنی صرف اُس کی ہو کے نہیں رہی۔ راجن کو اس کی خبر نہیں تھی، پر جب خبر ہوئی تو اُس سے برداشت نہیں ہوا۔

"پر راجن ایک عورت کو نئیں مار سکتا۔" پیر نے اُسے جھڑک کے کہا۔ "وہ تیرے مافک نئیں ہے، اکھا دلوا ہے، اپن کو ضرور کوئی گھٹالا دِکھتا ہے۔"

پیر کسی تاخیر کے بغیر ملبھی اور زوراکو لے کے پاڑے سے نکل گیا۔ میں نے بھی اُس کے ساتھ جانا چاہا تھا لیکن مجھے اُس نے منع کردیا۔ میں نے رات کو دیر تک اُس کا انتظار کیا۔ وہ نہیں لوٹا۔ تجمل کی وجہ سے مجھے گھر آنا پڑا۔

دوسری صبح ناشتے کے دوران اباجان نے تجمل کو بتایا کہ کل رات اُنھوں نے مکان کا سودا کرلیا ہے لیکن ضروری ساز و سامان کے بعد ہی وہاں منتقل ہوا جاسکتا ہے اور اس اہتمام میں ہفتہ عشرہ تو لگ ہی جائے گا۔ تجمل نے یہ کسی مژدے ہی کے طور پر سنا اور اُنھیں مبارک باد دینا نہیں بھولا۔

ناشتے کے بعد تجمل سے کہہ کے میں پھر پاڑے آگیا تھا لیکن پیر دن بھر غائب رہا۔ ملبھی اور زورا بھی وہاں نہیں تھے۔ پاڑے میں آنے والے آدمی طرح طرح کی باتیں سنا رہے تھے کہ پولیس نے اندھیری کے علاوہ دوسرے پاڑوں کے داداؤں کو بھی تھانے طلب کیا ہے اور علاقے کے دو بڑے تاجروں کے ہاں بھی چھاپے مارے ہیں۔ جارجی یہ خبریں سننے اور اُنھیں دُہرانے میں پیش پیش تھا۔ وہ اب تقریباً یہیں رہتا تھا۔ پیر نہ ہوتا تو اُس کے انتظار میں، پیر آجاتا تو جب تک وہ پاڑے میں رہتا جارجی دھرنا دیے بیٹھا رہتا۔ مجھے اُس سے وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ میرے ہی پاس آجاتا اور میرے پہلو سے جڑا رہتا۔ کبھی کچھ کہتا، کبھی کچھ۔ اُس دن بھی میں

دیر تک پاڑے میں بیٹھا رہا لیکن پیرُو اور ماہیگیروں میں سے کوئی پلٹ کے نہیں آیا۔ راجن کے جیل جانے سے اندھیری کے پاڑے پر اُن کی موجودی ضروری تھی۔ آنے والے لوگوں کی اطلاع کے مطابق عدالت نے راجن کو ضمانت پر چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا ہر چند کہ مزید لوگوں کے گرفتار ہو جانے کے بعد اب پولیس کا شبہ محض راجن پر نہیں رہا تھا۔ غالباً پیرُو کا اندازہ درست تھا کہ وہ راجن نہیں ہو سکتا۔ شام کو گلیا اندھیری سے ہو کے آیا تو اُس نے بتایا، پیرُ علاقے میں شہادتیں سمیٹ رہا ہے۔ ظاہر ہے، ان دو دنوں میں وہ گھر بھی نہ جا سکا ہو گا۔ گیتا اور اُس کی ماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ جا کے اُنھیں تسلّی دے آؤں لیکن پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ میرے جانے سے وہ کھٹک سکتی تھیں اور یوں بھی یہ تو اُن کے لیے معمول کی بات ہو گی۔

اگلے دن صبح میں پاڑے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی کے کھنکارنے کی آواز آئی۔ وہ ابّا جان تھے۔ دوسرے لمحے وہ اندر چلے آئے۔ پہلی بار اُن کے اس طرح آنے سے میں گڑبڑا گیا۔ کمرے میں میں اکیلا ہی تھا۔ ضرور کوئی اہم بات ہو گی۔ اُنھوں نے کسی تمہید کے بغیر سرسری انداز میں مجھ سے کہا کہ نئے مکان میں اگر مجھے کسی خاص چیز کی ضرورت ہو تو اُنھیں بتا دوں۔ مجھ سے جواب نہیں دیا جا سکا۔ "کچھ بھی نہیں۔" میں نے بہ دقت جُڑ مراتی آواز میں کہا۔

میری بات اُنھوں نے نہیں سُنی۔ یکایک وہ ٹھٹک سے گئے اور جھپٹتے قدموں سے میری طرف بڑھے اور اُنھوں نے میز پر رکھی ہوئی میری مالا اُٹھا لی۔

زرّیں نے فیض آباد میں اس کے موتی از سرِ نو پروئے تھے اور مٹیالے رنگ کا غلاف چڑھا دیا تھا۔ اس سے دانے چھُپ جاتے تھے اور محفوظ بھی رہتے تھے۔ باہر سے دیکھنے میں وہ گنڈے قسم کی کوئی چیز نظر آتی تھی لیکن باہر سے کسی کا دیکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں ہمیشہ اُسے بنیان کے نیچے پہنتا تھا۔ غلافی نلکی میلی ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے دھونے کے لیے مالا باہر نکالی تھی کہ ابّا جان کی نظر پڑ گئی۔ وہ اضطراری اُنگلیوں سے اُس کے دانے ٹٹولنے لگے۔ "یہ تمھارے پاس....؟" وہ اضطراب سے بولے۔

میں نے سر جھکا لیا، اُن سے کیا کہتا۔

"یہ تو وہی ہیں۔" اُن کی آواز سن سنا رہی تھی۔ "یہ دُنیا کے نادر ترین موتی ہیں۔" اُن کی حیرت بجا تھی۔ اِن جیسے موتی اُن کے پاس بھی تھے۔ کورا کی لائی ہوئی پوٹلی کے دوسرے نوادر میں اس قسم کے موتی بھی شامل تھے۔ ابّا جان نے یہ دانے بمبئی کے ایک جوہری کے ہاتھ فروخت کر دیے تھے۔ جوہری سے مسز روپ پٹیل نامی ایک امیر بیوہ نے اُنھیں خرید لیا تھا۔ کرشنا جی جب مجھے کلب لے گئے تھے تو مسز روپ پٹیل کے گلے کے ہار میں وہ موتی دیکھ کے میرا بھی یہی حال ہوا تھا جو ابّا جان کا اس وقت تھا۔

"یہ تمھارے تمھارے پاس کیسے آئے؟" میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق میں گھُٹ گئی۔ اُن کی بے چین نگاہیں میرے چہرے پر منڈلا رہی تھیں۔ اچھا ہوا، اُنھوں نے دوسرا کوئی سوال نہیں کیا ورنہ میرے مُنہ سے کچھ بھی نکل جا۔ میرا جواب میرے چہرے پر لکھا تھا۔ "تو یہ یہ تمھارے پاس بھی تھے۔" وہ عجیب انداز میں بولے۔

میں خاموش کھڑا رہا۔

وہ بھی لمحوں تک بے حس و حرکت کھڑے مجھے گھورتے رہے۔ میرا رُ تھا لیکن اُن کی آنکھیں مجھے اپنے سارے جسم پر چبھتی محسوس ہو رہی تھیں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ "حوصلہ رکھو نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ذرا حالات قابو میں آ جائیں پھر دیکھیں گے۔ یا ہونا چاہیے۔"

مالا میز پر رکھ کے وہ فوراً چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد بھی اُن کی لرزتی آواز کی بازگشت میرے میں گونجتی رہی۔ میرا جسم سُن سا ہو گیا تھا۔ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ بھرا آدمی اپنا سے کیوں نہ پھوڑ لے۔ جانے کیوں میرے سینے میں ایسی گرج سی اُٹھی کہ مجھ نہ رہا۔ میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھُپا لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کون میں آیا تھا جس نے بھُجّل کو خبر کی تھی یا بھُجّل از خود آ گیا تھا۔ اُس نے مجھے سے لگایا تو میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ "کیا ہوا رے؟" وہ جتنا مجھ سے پوچھ میری آنکھیں اور اُمڈنے لگتی تھیں۔ "بول رے، مجھ کو بھی نہیں بولے گا؟" وہ بال کھینچنے اور مجھے جھنجوڑنے لگا۔

"کچھ نہیں ہے۔" میں نے بلکتے ہوئے کہا۔

"کچھ دھیان کر، اُدھر وہ تیری سگی بھی ہیں، کیا بولیں گی کہ بڑا بھائی۔" وہ چلبلاتی آواز میں بولا۔ "کیا ہوا رے....؟"

"کچھ نہیں ہوا، تم کیوں کیوں....؟"

"اُدھر ٹھیک سے بیٹھ جا۔" اُس نے مجھے بستر پر دھکیل دیا اور میرا سر اپنے پر رکھ لیا۔ "اپنے پاس بھی کمتی نہیں ہیں لاڈلے!"

"تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ کوئی بھی بات نہیں ہے، بس یوں مجھے ایسے ہی ہو جاتا ہے۔"

"بول رے، اب کس نے نوچ لیا ہے۔"

"کسی نے نہیں، تم سے کہہ دیا نا۔"

"بابا اِدھر سے ہو کے گئے تھے۔"

میں سسکیاں بھرتا رہا۔

"وہ کچھ بول کے گئے تھے؟ پر وہ تو کچھ بھی بول سکتے ہیں۔ وہ تو بابا!"

"وہ کتنی آسانی سے کہہ کے چلے گئے۔" میں نے آنسوؤں میں ڈو میں کہا اور اُسے بتانے کی کوشش کی۔ "تمھیں معلوم ہے، وہ کیا کہہ کے گئے اب اتنی دُور آ کے....؟"

"ٹھیک ہے رے۔" وہ مجھے تھپکنے لگا۔ "ایسا ہی آگے پیچھے ہو جاتا ہے۔"

"اگر وہ پہلے یہ سب۔"

"آدمی گھڑی دیکھ کے چلتا ہے، آدمی خود گھڑی نہیں ہوتا۔ پہلے بھی اُن نے ہی بولا تھا، اب بھی غلط بول کے نہیں گئے ہیں۔ جیتا تو تو ہی رے۔"

"یہ جیت ہے؟ یہ کیسی جیت ہے؟ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔"

کبھی لگتا ہے، تیرا دودھ بھی ابھی نہیں چھوٹا۔ اب سنبھال رے اپنے کو۔" ی آواز میں بولا۔ "یہ تجھ کو ایک دم کیا ہو جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر کلٹ کو دوڑتا ہے، اُبلنے لگتا ہے۔"

"یہ ذرا سی بات ہے؟ امّی چلی گئیں، فہمی چلی گئی۔ سب زیر و زبر ہو گئے۔ تم کہتے ہو ی بات ہے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "تم نے وہ گھر نہیں دیکھا تھا نا۔"

"پھر بات تو اس سے پہلے سے بھی کرنا!"

"کہاں سے، کہاں پہلے سے؟"

"گھر میں اس کو بابا لائے تھے ڈولی میں ٹھلا کے؟"

"نہیں، مگر مگر....؟" میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن میرے پھڑپھڑاتے ہونٹ جم گئے۔ وہ میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔ "ہر وقت اپنی طرف ہی مت ار۔ یاد ہے، اپنے نصیب میاں کیا بولتے تھے کہ اُستاد ہر آدمی کے ساتھ کوئی لگا ہوتا ہے۔ کبھی اُلٹا گھومنے لگتا ہے کبھی سیدھا۔ میں بولتا تھا، بڈھن یہ چکرا ئی نہیں، یہ سالی کھوپڑی ہی چکرا ہے۔ گھومنے پہ آتی ہے تو دن کو رات، رات ن کر دیتی ہے۔ پر لگتا ہے، نصیب میاں سچ ہی بولتے تھے۔ اپنے کو بھی ابھی ی جان پڑتا ہے، کچھ اور سمجھ میں نہیں آتا تو کیا بولیں۔ پر اب تو چکرا سیدھا منے لگا ہے۔ نہیں ہے کیا؟"

میں اُس سے کیا بحث کرتا کہ چکرا سیدھا گھومنے لگا ہے تو پھر کانٹے کیوں یا مُسن رہے۔ وہ کہنے لگا۔ "ابھی پرسوں دادا بول رہے تھے، جب تو کے گھر آیا تھا، بولتے تھے، ابھی تھوڑے دن بعد نکلنے کا ہے جس بھائی! اپنے پالکو دیکھا نہیں جاتا۔ تھوڑے دن اور ٹھیر جا، پھر چلیں گے۔ اب کے اوپر سے پیکم سارے کونے بچا کے ٹٹول کے آئیں گے۔ دادا تو بولتا ہے، اب کے لوٹیں و ایک ہی بات پر....؟"

"نہیں، اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ کوئی فائدہ نہیں۔ دادا نے پہلے پکو وقت برباد کیا ہے، کچھ کم سکھ اُٹھایا ہے جواب اور کی حسرت ہے اور تم، تم کے بھٹکتے مارے پھرتے ہو گے۔ اڈّے پر تمھیں واپس نہیں جانا تو اُدھر زرّیں انتظار کر رہی ہو گی۔"

"دیکھیں گے رے ایک بار اور۔"

"میں تمھیں نہیں جانے دوں گا، کسی کو بھی نہیں۔ اب کون سا تماشا دیکھنا رہ گیا ہے۔ جب بھی کہیں جاؤ، کوئی نہ کوئی دیوار، کوئی نہ کوئی زنجیر منتظر ہوتی ہے۔ دادا کا پورا گھر ہے اور کیسا گھر۔ اُنھیں وہیں رہنا چاہیے، اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ۔ میں تو دادا سے کہوں گا، وہ پاڑا ابھی چھوڑ دیں۔ وہ لوگ کچھ کہتے نہیں تو کیا محسوس بھی نہیں کرتے۔ میں نے طے کیا ہے کہ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ سب میری وجہ سے ہوتا ہے۔ اب اور کتنے گھر اُجاڑنے، کس کس کے حوصلے آزمانے رہ گئے ہیں۔ سلطان، وزیر، منّن میاں، کبّن خاں، گلنتے، اب اور کون دشمن رہ گیا ہے۔ تم بھول گئے؟"

"یاد ہے رے!" وہ تلخی سے بولا۔ "پر دیوار اور زنجیر ایک جگہ جمے رہنے پہ دور رہتی ہے کیا۔ رُت نہیں بدلتی، رات نہیں آتی! اور سب ایسے ہو گیا ہے کیا۔ اگر پاؤں نہ نکالتے تو یہ سب دکھائی دیتا؟"

"بس اتنا بہت ہے۔"

"اُدھر شیشے میں تھوڑا اکھڑا تو جا کے دیکھ، اتنا کدھر کو بہت ہے۔ بابا نے ذرا تنکا چھُو دیا تو ناچنے لگا، پھیل گیا۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہی کیوں، تم ٹھیک کہتے ہو، یہ بھی کیوں۔ یہی سب تو ہے جو سب کو اجیرن کرتا ہے مگر میں کیا کروں، میں کہاں جاؤں۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں چھُپانے کی بہت کوشش لیکن بس اچانک ..... میں تمھیں کیا بتاؤں۔ کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا گلا گھونٹ لوں، اپنے آپ کو چاقو مار لوں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں رے، چاقو تو تیرے پاس رہتا ہی ہے اور چلانا بھی بُرا نہیں آتا۔ مار لے پھر۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "اپنی ہی گدّی اونچی رکھنا۔"

میں نے بے اختیار اُس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "پھر میں کیا کروں، بتاؤ میں کیا کروں؟"

"مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔" اُس نے میرا سر اپنی آغوش میں چھُپا لیا۔ "اتنی دُور آنے کے بعد پوچھتا ہے کہ کیا کروں۔ اتنے دن کی دھوپ میں تو تیری کھال سخت ہو جانی چاہیے۔ تُو نے اِسے اور چھوئی موئی کر لیا۔" اُس نے کٹی پھٹی سی آواز میں کہا۔ "ابھی سے کیوں ہانپنے لگا۔ آگے تو دن پڑے ہیں رے۔"

"لیکن یہ دنیا بہت بڑی ہے۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"جتنی بڑی ہے، اتنی چھوٹی بھی ہے۔ کبھی عمر بیت جاتی ہے، کبھی ایک پل میں لپٹ جاتی ہے۔ کسی اور کا نہیں تو تجھے اُس کا بھی دھیان نہیں رہا۔ اُدھر اُس کا بھی تو یہی حال ہو گا، اُدھر کیا وہ کل سے بیٹھی ہو گی؟"

"کون جانے، اُس کا کیا حال ہے؟"

"رے، بھول گئی ہو گی کیا؟"

"وہ مجھے کبھی نہیں بھول سکتی۔"

"پھر ڈوری توڑ دی ہو گی اُس نے؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔ وہ زندگی بھر میری راہ دیکھتی رہے گی۔ اپنی آخری سانس تک۔"

"اور تو اِدھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا؟"

"مگر میں کون سی کھوہ میں اُسے ڈھونڈوں؟"

"کسی طرف تو منہ اُٹھانا پڑے گا رے۔"

"تمھیں معلوم ہے، دادا نے تم سے ضرور کہا ہوگا۔ حیدرآباد میں نواب ثروت نے ہمیں کیا بتایا تھا۔ اُس نے کہا کہ جیسے ہی اُس نے مولوی صاحب سے ہمارا ذکر کیا، مولوی صاحب گم صُم سے ہو گئے اور دوسرے دن اُس کی عدم موجودگی میں گھر سے چلے گئے، کوئی رقعہ، کوئی اطلاع دیے بغیر۔ اِس سے کیا ظاہر ہوتا ہے، یہی ناکہ وہ اُسے مجھ سے دُور رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک قاتل، ایک سزایافتہ کو اُس کے قریب نہیں پھٹکنے دینا چاہتے۔"

وہ سر ہلانے لگا۔ "ہاں سُنا تھا۔"

"مولوی صاحب اگر چاہتے تو کیا مجھے ڈھونڈ نہیں سکتے تھے؟"

"پر مولوی سے اپنے کو کیا لینا۔"

"لیکن وہ اُنھی کی تحویل میں ہے۔ وہ میرے بارے میں اُس سے جانے کیا کہتے رہے ہوں، کون کون سے عُذر پیش کرتے رہے ہوں۔ مجھے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے وہ اُسے مجھ سے چھپائے چھپائے پھر رہے ہیں۔"

"ابھی ایسا بول نہ ڈال، کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔"

"اور کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"ابھی کیا بولیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "مولوی نے اُسے سنبھال کے بھی تو رکھا ہے، ہر طرف سے بچا کے۔ بڑے صاحب (منیر علی) کیا بولتے تھے۔ مولوی مراد آباد اپنے گھر کو بھی تو نہیں لوٹا۔ وہ جیسلمیر کے چودھری رانا مہتاب، بڑے صاحب کے کاٹنے پر تُلے بھتیجے ارشد اور دکن کے نواب ثروت جیسے رشتے کیوں منع بول دیتا ہے۔"

وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ معاً اُس نے مجھے ٹھوکا دیا۔ باہر سے فرخ فریال کی آوازیں آرہی تھیں۔ "اُٹھ جا رے، ایسے دیکھیں گی تو ٹوٹ جائیں گی۔" اُس نے مجھے ایک جھٹکے سے اٹھا دیا۔

میں نے کوشش کی کہ وہ میرا چہرہ نہ دیکھ پائیں یا اُنھوں نے ہی نگاہیں چرا لیں۔ وہ جولین اور شہ پارہ کی آمد کی اطلاع دینے آئی تھیں۔ میں تجمل سے پوچھنا چاہتا تھا کہ پھر کیا بات ہے۔ آخر مولوی صاحب کب تک اس طرح بھاگتے رہیں گے، کب تک؟... مگر وہ فرخ فریال کے کندھوں کی بیساکھیوں پر کمرے سے چلا گیا۔ پھر کو اباجان اُسے ساتھ لے گئے۔ اتنے دنوں بعد کہیں اُس نے مجھ سے کچھ پوچھا تھا۔ اس دوران کوئی بات کرتے ہوئے کیا، اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی مجھے ڈر لگتا تھا۔

جولین اور شہ پارہ کل کے لیے سب کو اپنے گھر بلانے آئی تھیں۔ کل کانتے کا بیسواں تھا اور چمپا بیگم کی خواہش تھی کہ کل سب اُسی جگہ جمع ہو جائیں جہاں سے کانتے اپنے آخری سفر پر روانہ ہوا تھا۔ سہ پہر کو رانی اور گیتا بھی آگئیں۔ صرف جولین کی ماں اور چمپا بیگم کی کسر رہ گئی تھی۔ جمرو، شامو، مارٹی اور ٹنگو بھی موجود تھے۔ اُس دن کہیں جانے کو میرا جی ہی نہیں چاہا حالانکہ مجھے خیال تھا کہ پاڑے پر جا کے پیرو کی خبر لینی چاہیے۔ یقیناً وہ ابھی تک اندھیری میں پھنسا ہوا ہے ورنہ تجمل کو دیکھنے ضرور آتا۔ دوپہر کھانے کے بعد جمرو اور

شامو نے مجھ سے کہا بھی۔ میں نے صاف انکار نہیں کیا تھا، بس یہ کہ [illegible] بھی چُپ ہو گئے۔ مجھے گھر میں بھی کسی جگہ قرار نہیں تھا۔ کبھی کمرے میں [illegible] کبھی جولین اور شہ پارہ کے کمرے میں چلا جاتا جہاں سبھی موجود تھیں۔ [illegible] اندر سناٹا رہا تھا۔ رگ و پے میں خون جیسے دھڑک رہا ہو۔ تجمل کی شام تو میں اُس سے بات کرنے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ میرے ذہن میں [illegible] منڈلا رہی تھیں۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ ہو سکے تو کسی [illegible] وہ فیض آباد میں مستقل قیام کے لیے اباجان سے بات کرے۔ [illegible] میں بہت سکون ہے۔ جہاں گیر بھی وہیں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ [illegible] منیر علی کا پورا خاندان ہے۔ خانم بھی کسی دن واپس آجائے گی۔ یہاں [illegible] شور ہے، بہت بھیڑ۔ تجمل کی بھی یقیناً یہی خواہش ہوگی۔ میں اُس سے [illegible] میں بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ اب حیدرآباد جانا کس طرح ممکن ہے۔ کون خانم [illegible] گا، وہاں زیادہ دیر خانم کی موجودگی مناسب نہیں ہے لیکن تنہائی [illegible] نہ مل سکا۔

ساری رات مجھے نیند نہیں آئی، جب بھی آنکھیں بند کرتا [illegible] ہوتا جیسے مجھ سے کچھ اوجھل ہو جائے گا، کوئی چیز گم ہو جائے گی۔ صبح کسی وقت [illegible] لیکن کچھ دیر بعد مارٹی کی آہٹ پر ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا اور ناشتے کے [illegible] کولے کے پاڑے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ہمارے پہنچنے کے کوئی دس [illegible] پاڑے آگیا۔ چہرے پر غبار چھایا ہوا تھا لیکن مجھے دیکھ کے وہ اُچھل [illegible] لگانے لگا۔ "ہا راجا، اپن کا جانی بھی ایدری ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم کہاں ہو دادا! آخر کیا بات ہے؟ مجھے [illegible]"

اُس نے زور سے اپنا سر میرے سر سے ٹکرایا اور چھپاتی [illegible] "سب ٹھیک ہے جانی! اپن نئیں جاتا تو راجن کو تو سالا پھندا لپیٹ [illegible]"

"راجن نے قتل نہیں کیا نا دادا؟"

"نئیں شہزادے! اپن راجن کو جانتا ہے۔"

"اب تو سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں، ایک دم اکھا فٹ فاٹ ہے سالا۔"

"تو اب گھر جاؤ۔"

"ابھی نئیں راجا! اپن کو ابھی اندھیری لوٹنا ہے۔"

"اب بھی وہیں جانا ہے، تمھیں، ماچھی کو بھیج دو، میں چلا جاتا [illegible]"

"اوئے نئیں نئیں نئیں راجا! ابھی کل تک کا بات ادھر [illegible] تجمل بھائی کیسا ہے؟"

"بالکل ٹھیک دادا!"

"بولنا کہ اپن ابھی کیدر چلا گیا تھا، کل آئے گا۔"

میں نے اُسے بتایا کہ رات کو جولین کے گھر کانتے کا بیسواں [illegible] آنے کی کوشش کرے گا مگر اندھیری سے فاصلہ زیادہ ہے۔ اُسے [illegible]

جو اُس کا انتظار نہ کیا جائے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اندھیری کے پاڑے پر اُس کا ٹکے رہنا ایسا ہی ضروری ہوگا۔

وہ کچھ دیر بعد ہی چلا گیا۔ گُلبا، لچھمی اور جارجی کے کہنے پر میں دوپہر کے کھانے کے لیے ٹھیر گیا۔ جارجی اپنے علاقے کے کسی خاص باورچی سے بریانی اور انناس کی کھیر پکوا کے لایا تھا۔ دونوں چیزیں نہایت لذیذ تھیں۔ سبھی نے سیر ہو کے کھائیں۔ جارجی بار بار افسوس کرتا رہا کہ کاش پیرو بھی موجود ہوتا۔

شام کو جولین کے گھر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کیلاش بھی اپنی بہن رُما کے ساتھ آیا تھا۔ رُما سیاہ ساڑی میں ملبوس تھی۔ مجھے دیکھتے ہی شکایت کرنے لگی کہ وہ میرا انتظار کرتی رہی، روز ہی کیلاش سے پوچھتی تھی۔ میں نے ندامت سے کہا کیلاش نے کئی بار بتایا اور کئی بار میں نے ارادہ بھی کیا لیکن بس آتے آتے رہ گیا۔ کہنے لگی۔ "ہر چند کہ یہ سوگوار فضا ہے اور میں اپنے گھر سے اپنے دُکھ کا اظہار کرنے آئی ہوں لیکن مجھے ایک خوشی بھی ہے کہ اس بہانے اتنے لطیف، اتنے خوب صورت لوگوں سے شناسائی ہو گئی۔"

چمپا بیگم نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ شام ہی سے غریبوں میں کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ کانتے کو جولین کے ہاتھ کے کباب بہت پسند تھے۔ جولین نے خاص طور پر بنائے تھے۔ ساڑھے نو بجے کھانا لگ گیا۔ سب پیرو کی آمد سے مایوس ہو چکے تھے مگر وہ دونوں آگئے، پیرو اور ماچھی۔ دونوں عجلت میں تھے۔ کھانا بھی اُنھوں نے رسماً ہی تھوڑا بہت کھایا۔ کھانے کے بعد پیرو کچھ دیر تجمل اور اباجان کے ساتھ بیٹھا کانا پھوسی کرتا رہا پھر اُٹھ گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ گیتا اور اُس کی ماں بھی آئی ہوئی ہیں۔ کہنے لگا کہ گیتا مچل جائے گی۔ اب کل تو گھر جانا ہی ہے مگر جاتے جاتے دروازے سے پلٹ آیا اور مجھ سے بولا۔ "ٹھیک ہے، تھوڑا بُلوا دے اُن کو۔" میں نے کہا۔ "تم خود اندر چلے جاؤ، یہاں کس کا پردہ ہے۔" کہنے لگا کہ نہیں، وہاں سبھی ہوں گے اور کچھ دیر تو بیٹھنا پڑے گا۔ میں اندر جا کے اُن دونوں کو دروازے پر لے آیا اور دانستہ وہاں سے ہٹ گیا۔ پیرو نے اُن سے چند ہی لمحے بات کی ہوگی کہ پلٹ پڑا اور گھر سے نکل گیا۔ اباجان کی گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے کہا اِسے لے جاؤ۔ کہنے لگا، اس میں گیتا اور اُس کی ماں کو میں گھر واپس پہنچا دوں۔ میں نے کہا، یہ تو میرا پہلے سے ارادہ تھا۔

میں نے کچھ دُور تک اُس کے ساتھ جانا چاہا لیکن دونوں نے بہ اصرار مجھے لوٹا دیا۔

موٹر ایک تھی اور سب کو گھر واپس جانا تھا۔ میں نے سوچا، مارٹی سے کہہ کے گیتا اور اُس کی ماں کے لیے کوئی دوسری سواری منگوا لیتا ہوں لیکن اباجان نے مجھے روک دیا اور کہا کہ میں خود اُنھیں موٹر میں گھر چھوڑ کے آؤں۔ ڈاکٹر کیلاش اور رُما پیرو کے آنے سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ اکبر بھی موٹر میں میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ مارٹی کی بھی خواہش تھی لیکن میں اُسے پیرو کا گھر دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اُسے منع کر دیا کہ اباجان اور تجمل کو یہاں شاید اُس کی ضرورت پڑے۔

اباجان کے گھر جانے کے خیال سے میں گیتا اور اُس کی ماں کو پہنچا کے دروازے ہی سے لوٹ آیا۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ بس اکا دکا دکانیں کھلی تھیں۔ ڈرائیور نے مجھ سے اجازت لے کے ایک جگہ کھڑے کھڑے چائے پی۔ [illegible] اکبر کے ساتھ اُتر گیا۔ جتنی دیر میں ڈرائیور نے چائے پی، ہم نے ہوٹل سے ملحق پان کی دکان سے پان کھایا اور موٹر میں آکے بیٹھ گئے۔ جس وقت ہم باندرے کے علاقے میں داخل ہوئے، گیارہ بج رہے تھے۔ ایسی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی پھر بھی آمد و رفت میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔

ڈرائیور موڑ کاٹ کے اندر گلی میں جانا چاہتا تھا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ کے موٹر روک دینے کی ہدایت کی۔ موٹر کی تیز روشنی میں مجھے موڑ پر جمرو اور ٹنگو کھڑے نظر آئے تھے۔ وہ موٹر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اِدھر ایک جھٹکے سے موٹر ٹھیری، اُدھر وہ جھپٹتے قدموں سے میری طرف آئے۔ "لاڈلے!" جمرو نے لرزتی آواز میں مجھے پکارا۔ "پیرو دادا اور ماچھی کو آگے گلی میں کسی نے گولی مار دی ہے۔ اُدھر مت جاؤ لاڈلے! پولیس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔"

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ "کیا بک رہے ہو؟"

"ہاں لاڈلے! زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ پولیس نے اُدھر ساری گلیوں پہ گھیرا ڈال دیا ہے۔" جمرد کی آواز سٹ پٹا رہی تھی۔ "تھوڑی دیر کے لیے اپنے کو اُن کے سامنے نہیں جانا ہے۔"

"مگر ہوا کیا؟ کیا ہوا؟"

"کیا بولے کیا ہو گیا راجا بھائی!" ٹنگو بلکتے ہوئے بولا۔ "ابھی تھوڑا دیر میں کھل کے آجائے گا، پھر اُدور جانے کا ہے۔"

اُن کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں دروازہ کھول کے فوراً موٹر سے اُتر گیا اور میں نے جمرد کا بازو پکڑ لیا۔ "کیا بات ہے؟ دادا کیسے ہیں، صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟"

"اپنے کو کچھ نہیں معلوم لاڈلے! کچھ بھی نہیں...." جمرد لرزتے ہونٹوں سے بولا۔ اُس کی آواز حلق میں گھُٹ گئی۔

"اپن کچھ بھی نہیں بول سکتا راجا بھائی! ابھی یہ کیا اور کیسا ہو گیا۔" ٹنگو کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کہنے لگا کہ وہ تجھل کی ہدایت پر اُس کے لیے بیڑیاں لینے نکلا تھا۔ گھر جانے کے لیے چونکہ سب لوگ موٹر میں نہیں آ سکتے تھے اس لیے تجھل نے ایک ٹم ٹم لانے کو بھی کہا تھا۔ ٹم ٹم نہیں ملی تو وہ آگے بڑھ گیا۔ آگے راستے پر گرد گلیوں میں خلافِ معمول پولیس اور لوگوں کی تعداد [illegible] لیے چینی ہوئی۔ وہیں کسی جگہ بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ [illegible] گیا اور دیکھا کہ گلی کے فرش پر پیرِ دادا اور ماچھی خون میں ڈوبے [illegible] بے ہوش پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کے اُس کے ہوش و حواس جا[illegible] اُس کے دماغ میں یہی آیا کہ وہ جا کے تجھل کو خبر کر[illegible] تیز بھاگ سکتا تھا، بھاگ کر جولین کے گھر پہنچا۔ تجھل، مار[illegible] کو لے کر اُسی وقت گھر سے نکل پڑا۔ ٹنگو نے اکھڑی ہوئی سان[illegible] بتایا۔ "دادا استاد جاتے جاتے جمرد بھائی اور اپن کو بولا، آگے[illegible] کے روک دے۔"

میں لمحوں تک گُنگ کھڑا رہا۔

"جلدی کر دو لاڈلے!" جمرد مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولا کہ [illegible] ابا جان کو گھر چھوڑ آئیں گے۔ میں اکبر کو ساتھ لے کے فوراً [illegible] سے نکل جاؤں۔"

"مگر کیوں! کیوں؟"

"اُستاد نے کچھ جان کے ہی بولا ہوگا۔" جمرد نے [illegible] [illegible] زیادہ سوال جواب مت کر۔ ابھی جیسا استاد نے بولا ہے، ویسا [illegible] کرنا ہے۔"

"وہ جگہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟" میں نے ٹنگو سے پوچھا۔

"اتنا دور نہیں ہے۔" ٹنگو نے بتایا۔

"مگر دادا تو میرے گھر سے نکلنے سے پہلے چلے گئے تھے۔"

"پر ابھی آدھا پونا میل آگے گیا تھا کہ گولی...." ٹنگو نے ہونٹ بھینچ لیے۔ "ایسا ہی کچھ لگتا ہے اپن کو....؟"

میری رگوں میں خون جمنے لگا تھا۔ کیا مجھے تجھل کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے؟ ایک لمحے کے لیے میں نے یہی فیصلہ کیا تھا لیکن یہ میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ میرے جسم و جاں نے اسے مسترد کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اُن دونوں کو موٹر میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بہ عجلت موٹر میں بیٹھ گئے تھے کہ میں نے ٹنگو سے راستہ بتانے کے لیے کہا۔ وہ چیختے چلاتے رہے، پھر اُن کا لہجہ عاجزانہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میرے لیے ابھی دُور ہی رہنا بہتر ہے اور اگر نہیں تو موٹر جولین کے گھر بھیج دینی چاہیے۔ موٹر، منیر علی، مولوی اکرم، ابا جان، فرخ زیال وغیرہ کو لے کے گھر چلی جائے گی۔ اکبر ہمارے ساتھ ہے، کم از کم اُسے وہاں نہیں لے جانا چاہیے۔ آگے جانے کی کیا صورت ہو۔ میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے، جتنا میں اُنھیں یک جا کرنے کی کوشش کرتا، وہ اتنے ہی منتشر ہوتے۔ لگتا تھا، یہ کوئی بھیانک خواب ہے، خواب پر آدمی کو قدرت کہاں ہوتی ہے، کچھ دیر میں آنکھ کھل جائے گی۔ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟ ابھی ایک گھنٹہ ہی تو ہوا ہے، میں دادا اور ماچھی کو گلی کے آخری سرے تک چھوڑ کے آیا تھا۔ بار بار میری نگاہیں جمرد اور ٹنگو کی طرف اُٹھتیں کہ وہ کہیں مجھ سے صبر آزما مذاق تو نہیں کر رہے؟ میرے صبر و ضبط کا امتحان لے رہے ہوں لیکن دونوں کی پھٹی ہوئی آنکھیں، اُن کے جلتے چہرے دیکھ کے میرا سارا وجود ڈوبنے لگتا۔ موٹر آگے بڑھنے پر وہ خاموش ہو گئے تھے۔ مجھے بھی اُن سے مزید کچھ پوچھتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ موٹر کی رفتار بہت تیز تھی۔ میں نے ڈرائیور کو اور تیز چلانے کی ہدایت کی۔ ابھی ہم نے گلیوں کے دو ہی موڑ کاٹے تھے کہ ایک چورستے پر جمرد نے موٹر رکوا دی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ اکبر کو لے کے جولین کے گھر چلا جائے۔ شاید یہی مناسب تھا۔ یہاں سے جولین کے گھر سیدھا راستہ جاتا تھا۔ موٹر نہ پہنچنے کی وجہ سے ابا جان پریشان ہو رہے ہوں

گے اور اچھا ہے کہ اِس وقت وہ یہاں سے چلے ہی جائیں۔ یہ اطلاع اُنھیں بعد میں بھی مل سکتی ہے۔ اکبر نے ہمارے ساتھ چلنے کی ضد کی لیکن جمرو نے ڈپٹ کر اُسے منع کر دیا اور تاکید کی کہ وہ گھر جا کے کسی سے کچھ نہ کہے، یہی تاکید اُس نے ڈرائیور کو بھی کی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اُس نے اُن سے اور کیا کچھ کہا۔ موٹر ٹھہرتے ہی ٹنگو کے اشارے پر مَیں نے دائیں جانب کی گلی میں بھاگنا شروع کر دیا۔ ٹنگو میرا ساتھ دینے کی کوشش کرتا رہا لیکن چھوٹی ٹانگوں کے سبب وہ اتنا تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ مجھے اپنی رفتار بار بار کم کرنا پڑتی۔ اتنے میں جمرو بھی پیچھے سے بھاگتا ہوا ہمارے ساتھ آ گیا۔ گلی میں ہلکی ہلکی روشنی تھی اور کچھ زیادہ لوگ نہیں تھے لیکن جیسے جیسے ہم فاصلہ طے کرتے گئے، بھیڑ بڑھتی گئی۔ بیشتر مکانات کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں، لوگ ٹکڑیوں میں اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ آگے رت جگے کا سا منظر تھا۔ جہاں تک نظر جاتی، ہجوم نظر آتا۔ آگے پہنچ کے مجھے احساس ہوا کہ لوگ تو واپس آ رہے ہیں۔ مَیں نے رک کے کسی سے پوچھنا چاہا لیکن جمرو اور ٹنگو بڑھتے رہے۔ راستے میں سامنے آ جانے والے لوگوں کی وجہ سے ہمیں ایک طرف ہو جانا پڑتا، کبھی کوئی خود ایک طرف ہو جاتا یا اپنی جگہ ٹھہر جاتا۔ تین آدمیوں کو دوڑتے بے تحاشا بھاگتے ہوئے دیکھ کے لوگوں کی توجہ اُن کی طرف منعطف ہونی ہی چاہیے تھی لیکن ہم اُن کے تجسس اور تردد کی فکر کیے بغیر بھاگتے رہے۔ فکر تھی تو پولیس کی، راستے میں کوئی بھی سپاہی رکاوٹ بن سکتا تھا مگر کسی ایسی رکاوٹ کا سامنا کرنا نہیں پڑا اور ہم نے ایک بڑا فاصلہ طے کر لیا۔

سامنے چند قدم کی دُوری پر ایک بڑا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ راستہ بند تھا اور ہر سُو طرح طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک منتشر مجمع ہے۔ چند سپاہی بھی چیخ چیخ کر لوگوں کو بکھر جانے کی تلقین کر رہے تھے۔ میرا دل بُری طرح ... کر رہا تھا۔ جمرو نے میرا بازو پکڑ کے مجھے وہیں روک لیا۔ اُن دونوں کی سانسیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور دونوں پسینے میں شرابور تھے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ جمرو نے سانس استوار کرنے کی بھی مہلت نہیں لی اور ہانپتی آواز میں سامنے کھڑے ہوئے ایک سن رسیدہ شخص سے بھیڑ کا سبب پوچھا۔ وہ شخص بھی ابھی ابھی آیا تھا تاہم اُس نے بتایا کہ دو آدمیوں پر گولی چلی ہے۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر ہم آگے بڑھ گئے۔ وہاں لوگوں کی ایک دیوار سی کھڑی تھی۔ باہر آتے، اندر جاتے، ایک دوسرے کو دھکیلتے شور مچاتے لوگوں کی دیوار کے پار کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، اُسے عبور کر کے اندر جانے کے خیال سے میرے پیروں میں بڑ[illegible] پڑ گئیں۔ ... بے قراری اُن کی دیوانہ وار صداؤں سے کہ اندر کیا کچھ ممکن ہے۔ مَیں اُن سے پیچھے رہ گیا۔ جمرو اور ٹنگو [illegible] کو ہٹاتے ہوئے اندر پہنچ گئے تھے۔ میرے جی میں آئی کہ لو[illegible] لیکن جمرو نے پلٹ کے مجھے اپنے پاس کھینچ لیا۔

اندر قدم رکھتے ہی میرا جسم سُن ہو کے رہ گیا۔ وہاں میں سے کوئی نہیں تھا۔ درمیان کی خالی جگہ فرش پر ہر طرف بکھرا ہوا تھا، جمے ہوئے خون کے لوتھڑے۔ ایک پولیس افسر[illegible] ٹارچوں اور گیس کی لالٹین کی روشنی میں جگہیں ناپ رہے[illegible] نشان زدہ دائرے سے لوگوں کو دُور رکھنے کی کوشش کر رہے[illegible] چکر سا آنے لگا اور پھر میری آنکھوں میں بینائی نہیں رہی۔ جا[illegible] لمحے گزر گئے۔ مجھے اپنی کوئی سُدھ بُدھ نہیں تھی۔ جمرو نے مجھ[illegible] دیا تو مَیں اُچھل پڑا۔ مَیں نے بہت نظریں چرانا چاہا لیکن نگا[illegible] زمین پر پڑے ہوئے خون پر منڈلاتی رہیں۔ خون جیسے میری آ[illegible] میں بھی بھر آیا تھا۔ مجھے ہر طرف سرخی ہی سرخی دکھائی دے رہ[illegible]

"یہ لوگ کدھر گئے؟" جمرو کی متوحش آواز پر مَیں نے نگ[illegible] دیکھا، اُس نے کسی سپاہی کو روک لیا تھا۔

"کون لوگ؟" سپاہی نے برگشتگی سے کہا اور وہ سر سے جمرو کو گھورتا رہا۔

"یہی لوگ جن کو گولی لگی ہے۔"

"تم اُن کا کون لگتا ہے؟" سپاہی نے تلخی سے پوچھا۔

"ہم کیا لگتا۔" جمرو نے بھی اُسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"اُن کو ابھی اسپتال میں لے گیا ہے۔" سپاہی کے [illegible] جمرو کے پہلو میں کھڑے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔

مَیں نے بھی سُن لیا تھا۔ "کون سے اسپتال میں؟" مَیں [illegible] جھینپتی آواز میں پوچھا "کیسے ہیں وہ؟..."

"تھوڑا جان باقی تھا۔" وہ بے رحمی سے بولا۔ "دلدا لوگ سالا! ایک دم جان دار، حرام کا اولاد۔"

مجھ سے ضبط نہ ہوا۔ مَیں نے اُس کے گریبان پر ہاتھ [illegible] دیا۔ مَیں اُس کا گلا گھونٹ دیتا۔ وہ ڈکرانے اور ہاتھ پیر پٹخنے لگ[illegible] جمرو، ٹنگو اور سپاہی نے مجھے ہر طرف سے جکڑ لیا۔ سپاہی [illegible] میرے منہ پر مکا بھی رسید کیا۔ ایک جانب کاغذ قلم ہاتھ میں [illegible] ایک پولیس افسر کسی آدمی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ سپاہی [illegible] اُسے بھی آوازیں دیں۔ سب کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں [illegible] ہوش میں تھا، اُس نے تیزی سے مجھے اندر مجمع کی طرف کھینچ لیا۔ [illegible] ٹنگو یقیناً سپاہی کے آڑے آ گیا ہو گا جبھی میں اُس کی نگاہوں [illegible] اوجھل ہو گیا۔ اِس اثنا میں جمرو اردگرد کے لوگوں کو دھکیلتا ہوا [illegible] طاقت سے مجھے کھینچتا، گھسیٹتا باہر لے آیا۔ مجھ پر رعشہ طاری تھا۔ [illegible] دُور آ جانے کے بعد جمرو نے مجھے ایک دکان کے چبوترے پر بٹھا [illegible] اور ہانپنے لگا۔ اُس نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا، بس میری [illegible] پیکارتا رہا۔ اُس کے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سب کچھ زبان [illegible] سے تو نہیں کہا جاتا۔ اب مجھے خود احساس ہو رہا تھا کہ یہ کوئی وقت [illegible] تھا۔ ہمیں جلد سے جلد اسپتال جانے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ ٹنگو [illegible] سے بچھڑ گیا تھا لیکن ہمیں چبوترے پر کچھ ہی دیر ہوئی ہو گی کہ وہ [illegible] ڈھونڈتا ہوا آ نکلا۔ اُسے دیکھتے ہی جمرو اُٹھ گیا۔ ٹنگو کسی سے [illegible] معلوم کر کے آیا تھا کہ اُنھیں ڈاکٹر شیورام کے اسپتال لے جایا گیا ہے [illegible] یہ اسپتال یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ جمرو دکانوں کے [illegible] ہوا اُن کے ایک گلیارے میں داخل ہو گیا۔ یہ عام گزرگاہ نہیں تھی مگر [illegible] ہر نکلنے کے لیے یہی قریبی راستہ تھا۔ اب جمرو کی احتیاط میری سمجھ [illegible] اچھی طرح آ رہی تھی۔ سر دست یہاں سے دُور ہو جانا ہی بہتر تھا۔ [illegible] بھی گلی میں سپاہیوں کے تعاقب کا اندیشہ تھا۔ اِس وقت تو وہ [illegible] سلئے پر بھی شک کر رہے ہوں گے۔ مجمع میں افراتفری ہو جانے [illegible] ہمیں رَل مِل جانے کا موقع مل گیا تھا مگر ذرا سکون ہونے پر اُنھیں [illegible] اری جستجو لازماً ہونی چاہیے۔ سیدھے راستے میں ہمیں دیکھنے والا [illegible] کوئی شخص بھی پہچان سکتا تھا اور راستے کا پتھر بن سکتا تھا۔

گلیارے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چند ہی قدم بعد ہمارے [illegible] کیچڑ میں لتھڑ گئے۔ ہر طرف گلی سڑی چیزوں کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ [illegible] کوڑا کرکٹ کی وجہ سے زمین بھی ناہموار تھی۔ ہم اندھوں کی طرح [illegible] راہ ٹٹولتے ہوئے چلتے رہے۔ مجھ میں اُنھیں مشورہ دینے کی ہمت بھی [illegible] نہیں تھی۔ میری وجہ سے اُنھیں اِس راستے پر آنا پڑا تھا۔ ہمیں راستے [illegible] اتنا نہیں تھا جتنی دیر ہو رہی تھی لیکن دیر تو اور بھی لگ سکتی [illegible] تھی۔ اگر جمرو مجھے وہاں بروقت تھام نہ لیتا تو کیا ہوتا؟ پھر وہاں سے [illegible] اتنی آسانی سے نجات نہ ملتی۔ آگے چل کے جمرو کو بھی اندازہ ہو گیا کہ [illegible] اِس طرح دُور تک چلتے رہنا ممکن نہیں ہے۔ جیسے ہی عمارتوں [illegible] کے درمیان ایک تنگ گزرگاہ نظر آئی، جمرو اُسی طرف مڑ گیا۔ وہاں [illegible] سے سامنے پختہ سڑک دکھائی دے رہی تھی لیکن جب تک ٹنگو نے [illegible] آگے جا کے سڑک کا جائزہ نہیں لے لیا، ہم وہیں چھپے ٹھہرے رہے۔ [illegible] یہ وہ گلی نہیں تھی جہاں سے ہم گزر کے آئے تھے مگر یہاں روشنی بھی تھی اور سڑک بھی صاف تھی۔ ابھی تک بہت سے لوگ موجود تھے۔ سب کا رخ اپنے گھروں کی طرف تھا۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ جمرو نے شاید عجلت میں فیصلہ کر لیا تھا، ہم اسی متوازن رفتار سے ایک دوسرے کے آگے پیچھے سیدھے راستے پر چلتے رہتے تو شاید کسی کو گمان بھی نہ ہوتا مگر یہ سب اکیلے جمرو ہی پر موقوف نہیں تھا، گیا وہی پتھر کا بنا ہوا تھا۔ ٹنگو کو اس علاقے کے راستے یاد تھے، مجھے بھی تھوڑے بہت معلوم تھے لیکن اِس وقت سمت نہ وہ پہچان پا رہا تھا، نہ مَیں۔ ہم چلتے رہے، کہیں نہ کہیں تو یہ گلی ختم ہو گی ہی۔ ہمیں زیادہ دُور نہیں چلنا پڑا۔ جلد ہی گلی ایک کشادہ سڑک پر پہنچ کے ختم ہو گئی۔ کچھ فاصلے پر چوک کی تیز روشنیاں جل رہی تھیں اور گھنٹہ گھر کی گھڑی میں ایک بج رہا تھا۔ ٹنگو راستہ پہچان گیا تھا۔ اُس کے اندازے کے مطابق اسپتال تک پیدل کا فاصلہ تھا۔ لیکن چوک پر کھڑی ہوئی ٹم ٹم کے کوچوان نے آوازیں لگا کے ہمیں روک لیا۔ اُس سے کچھ کہے سُنے بغیر ہم ٹم ٹم میں بیٹھ گئے۔ تینوں کے جوتے اور پائنچے کیچڑ میں سیاہ ہو گئے تھے اور بُو اُٹھ رہی تھی۔ ہم پہلے صفائی کر لیتے تو ٹھیک تھا، اب وقت نہیں رہا تھا۔ کوچوان نے ہمارے کہنے پر رفتار تیز رکھی۔ وہ دونوں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ میری طرح اُن کے جسم بھی ریت کے، راکھ کے ڈھیر ہو رہے ہوں گے، اُن کی رگوں میں بھی آگ دہک رہی ہو گی۔ پیچھے سے موٹر کا ہارن گونجنے پر وہ دفعتہً سیدھے ہو گئے۔ کوچوان نے بھی ٹم ٹم ایک طرف کر لی، پولیس کی ایک جیپ تیزی سے گزر گئی، اُس میں سپاہی بھرے ہوئے تھے، اُنھیں ہماری طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ جمرو اور ٹنگو اُچک اُچک کے اُنھیں دیکھتے رہے۔ مگر جیپ آناً فاناً نگاہوں سے دُور ہو گئی تھی۔ کوچوان گھوڑے کو چابک مارتا ٹم ٹم پھر سڑک پر لے آیا۔ جتنی دیر ٹم ٹم چلتی رہی، مَیں اپنے آپ کو نوچتا کھسوٹتا رہا کہ مجھے ہر حال میں خود کو سمیٹ کے رکھنا چاہیے، اپنا سب کچھ سمیٹ کے، میری طرح دوسروں کی بینائی بھی کسی لمحے اُن سے چھن سکتی ہے۔ اپنے اوسان کی جتنی مجھے ضرورت ہے، اُتنی ہی دوسروں کو بھی ہے۔ اِس وقت مجھے بس ایک ہی دعا کرنی چاہیے، خدا کرے دادا اور ماچھی خیریت سے ہوں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ راستے بھر میں خود کو یہی تاکیدیں کرتا رہا مگر مجھے اِس خود فریبی کا زیادہ وقت نہیں ملا۔ دس منٹ سے بھی کم عرصے میں ٹم ٹم ڈاکٹر شیورام کے اسپتال پر جا کے ٹھیر گئی۔

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ بنگلے کے طرز کی ایک دو منزلہ عمارت تھی،

پتھروں سے بنی ہوئی ایک قدیم عمارت۔ گیٹ پر دربان پہرا دے رہا تھا۔ اُس نے ہمیں روکنا چاہا لیکن جمرو نے اندر پولیس کے پاس جانے کا عذر کیا تو دربان نے زیادہ پس و پیش نہیں کی۔ جمرو کو وہاں پولیس کی موجودگی کا پختہ یقین تھا۔ اسپتال کے احاطے میں قدم رکھتے ہی میرا دل بیٹھنے لگا جیسے کوئی مجھے دھکیلتا، گھسیٹتا لیے جا رہا ہو۔ میں اُن دونوں کے ساتھ قدم بڑھاتا رہا۔ پھلواری اور عمارت کے درمیان گھومتے ہوئے پکے راستے سے گزر کے ہم خاص دروازے تک پہنچ گئے۔ کاریڈور کے آس پاس کھلی جگہ پر پولیس کی کئی موٹریں کھڑی تھیں، اور سامنے کے کشادہ اور روشن دالان میں کئی بندوق بردار سپاہی موجود تھے۔ ہم سیڑھیاں طے کیا ہی چاہتے تھے کہ اُنھوں نے ہمیں ٹھیر جانے کا حکم دیا اور ایک سپاہی نے قریب آکے دھتکارتے لہجے میں ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں جانا چاہتے ہیں۔ جمرو نے اُن سے تصدیق چاہی کہ کیا پیرداد اور ماچھی دادا کو یہیں لایا گیا ہے؟ وہ اُن سے ہمارا تعلق پوچھنے لگا۔ جمرو نے جھجکتے ہوئے خود کو اُن کا عزیز بتایا۔ ہمیں دیکھ کے سپاہی کی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی تھی، اُس کی نظریں مسلسل ہمارے پیروں پر بھٹک رہی تھیں۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتا، میں نے اُس سے دادا کا حال پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے وہ لپکتا ہوا عمارت کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ چند لمحوں میں وہ نمودار ہوا تو اُس کے ساتھ ایک پولیس افسر بھی تھا۔ دونوں تیز تیز قدموں سے ہماری طرف آئے۔ پولیس افسر وہی سوال دہرانے لگا جو سپاہی پہلے کر چکا تھا، پھر اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ ابھی اندر ڈاکٹر کے ساتھ ہے۔"

"کیسے ہیں وہ لوگ .....؟" میں نے لڑکھڑاتی زبان سے پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں بول سکتا۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا، کیا ہم اندر نہیں جا سکتے؟"

"کیا کرے گا تم جا کے؟ ....." اُس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں پھر اُسے کچھ خیال آیا، ناگواری سے کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے، تم ابھی بیٹھ کے تھوڑا انتظار کرو۔" اُس نے سپاہی سے کہا کہ وہ ہمیں اندر لے جا کے بٹھا دے۔ یہ کہتے ہی وہ چلا گیا تھا مگر جاتے جاتے لوٹ آیا اور حکمیہ لہجے میں ہم سے بولا کہ اُسے ہم سے ضروری بات کرنا ہے، اطلاع دیے بغیر ہم واپس نہ جائیں۔

سپاہی نے ہمیں دالان سے ملحق ایک کشادہ اور روشن کمرے میں پہنچا دیا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، وہ تینوں وہاں موجود نہیں تھے، تجھل شامو اور مارٹی۔ ہم ایک طرف کونے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے، سپاہی واپس چلا گیا۔ کئی منٹ گزر گئے، کسی نے ہماری خبر نہیں لی۔ کمرے کے ساتھ ہی شاید کوئی راہ داری تھی جہاں سے لپکتی چمکتی ... مضطربانہ سرگوشیاں سی سنائی دے رہی تھیں۔ کمرے سے راہ ... کھلنے والا دروازہ بھی وا تھا۔ میں اُس طرف جا کے راہ داری ... کے بجائے اپنے آپ کو جکڑے بیٹھا رہا مگر میرا دم گھٹ رہا ... پیرو کی بیوی رانی کی صورتیں بار بار آنکھوں کے سامنے اُبھر ... ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو میں اُنھیں اُن کے گھر چھوڑ کے آیا تھا ... سے ضد کر رہی تھی کہ وہ اُن کے ساتھ گھر کیوں نہیں چل رہا ... کیسی مطمئن اور خوش خوش گھر لوٹی تھیں۔ اُن کے خیال سے ... ہو لینے لگتا۔ خدا دادا کو سلامت رکھے، میری زندگی ویسے بھی کسی کام ... کاش یہ دادا کو لگ جائے۔ میں وہاں بیٹھا بس دعائیں کرتا رہا ... میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ جمرو اور ٹنگو کی آنکھیں دروازے پر لگی تھیں ... پر ذرا سی آہٹ ہوتی تو دونوں چونک پڑتے۔ کوئی بھی اندر نہیں آیا ... افسر اور سپاہی ہمیں یہاں بٹھا کے بھول گئے ہیں۔ دیواری گھڑی ... بج رہا تھا۔ ویسے ہمیں یہاں آئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا لیکن ... تو گھڑی پر نہیں آدمی پر موقوف ہے، آدمی پر کیسا گزر رہا ہے ... منٹ ہم پر پہاڑ کے مانند گزرے تھے۔

پھر مجھ سے ایسے بے دست و پا، کسی معذور و مفلوج کی طرح ... نہ بیٹھا گیا۔ میں اُٹھ کے سیدھا راہ داری میں کھلنے والے دروازے ... کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ایک راہ داری ہی تھی، گلی جیسی۔ اِس ... اُس سرے تک دونوں جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہاں ... لوگ موجود تھے۔ سفید گاؤن میں اسپتال کے متحرک عملے کے ... افسر اور سپاہی۔ پہلے میں نے سر نکال کے باہر کا جائزہ لیا۔ تجھل ... مارٹی کے چہرے دور تک دکھائی نہیں دیے۔ یہاں اُنھیں ... چاہیے تھا۔ یقیناً وہ کسی کونے یا کسی اور کمرے میں ہوں گے۔ میں ... سے باہر آ گیا پھر جیسے ہی پہلو کے کمرے سے مجھے ایک عمر رسیدہ ڈ... نظر آیا، میں جھپٹ کے اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ جلدی میں ... اُس نے رک کر کبیدگی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے دبی دبی آواز میں اُس سے دادا اور ماچھی کے ... میں معلوم کیا۔

"ہم کوشش کر رہے ہیں لیکن اب دعا کی ضرورت ...

میرے بیٹے۔" وہ مجھ سے معذرت کرتا ہوا راہ داری میں چلا گیا ... دیکھتا رہ گیا۔ میری سانس سینے میں اٹک گئی تھی۔ درمیان ... سپاہی نے آوازیں دے کے مجھے ٹھیرنے کا حکم دیا تھا مگر ... ڈگمگاتے قدم تیزی سے اُس طرف بڑھتے رہے جدھر ڈاکٹر گ...

چند گز کے فاصلے پر مجھے ٹھٹک کے رک جانا پڑا۔ راہ داری کے بیچ میں بنے ہوئے بیضوی دائرے کے دائیں حصے میں جمگھٹا سا لگا تھا۔ نرسیں اسپتال کے عملے کے لوگ ایک بند کمرے کے گرد منڈلا رہے تھے۔ وہ پولیس افسر بھی وہاں تھا جس نے مجھے، جمرو اور ٹنگو کو کاریڈور میں روکا تھا۔ کمرے کی چوکھٹ پر سُرخ بتی جل رہی تھی۔ اسی کمرے میں وہ دونوں ہوں گے۔ اُس پر آپریشن تھیٹر کی تختی بھی نصب تھی۔ میرے دل میں بس یہی آئی کہ دروازے کے پہرے دار کو ہٹا کے سیدھا اندر داخل ہو جاؤں۔ بعد میں چاہے مجھے دھکے دے کے باہر نکال دیا جائے۔ دادا کیسا بھی ناراض ہو کتنے ہی غصے میں ہو، میری آواز سُن کے اُس کا چہرہ ہمیشہ کھل اُٹھتا ہے، وہ مجھے اپنی گیتا کی طرح عزیز رکھتا ہے۔ میں جا کے اُسے گیتا اور رانی کا واسطہ دوں گا۔ شاید میری آواز اُس کا حوصلہ بحال کر سکے، میری صوت اُس کے وجود کے اندھیرے میں کوئی کرن ثابت ہو۔ آدمی بھی تو آدمی کی دوا ہوتا ہے۔ میری صدا پر وہ ایسا غافل نہیں رہ سکے گا۔ وہ کتنی بار میری خاطر اپنی جان داؤ پر لگا چکا ہے، اِس بار میں اُس سے زندگی مانگوں گا۔ مجھے کسی تاخیر کے بغیر اندر جانا چاہیے۔ میں ڈاکٹروں سے عاجزی کر لوں گا کہ صرف چند لمحوں کے لیے اُس کے پاس جانے کی مہلت دے دیں اور روپے پیسے کی کوئی فکر نہ کریں، میرے پاس دھن دولت کی کمی نہیں ہے۔ ابا جان کے پاس بے شمار نادر و نایاب ہیروں کا خزانہ ہے، ڈاکٹر جو چاہیں اُس میں سے لے لیں، بس کسی طرح دادا کا ہوش واپس لے آئیں۔ تجھل بھی نظر نہیں آ رہا، وہ کہاں چلا گیا؟ کہیں وہ اندر تو نہیں ہے؟ اُسے تو دادا کے سرہانے ہی ہونا چاہیے۔ میرے دماغ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

میں اندر داخل ہو جاتا مگر دوسرے ہی لمحے وہ تینوں مجھے نظر آ گئے۔ ایک کونے میں کمرے کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی کرسیوں پر تجھل شامو اور مارٹی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ایک پولیس افسر بھی اُن کے قریب بیٹھا کاغذوں پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اتنی سی دیر میں وہ تینوں پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ بکھرے ہوئے بال، سُوجے سُوجے چہرے۔ کپڑوں پر خون کے دھبّے۔ اُنھیں اِس حال میں دیکھ کے میری رہی سہی ہمت بھی جواب دینے لگی۔ میں اُنھیں آواز دیتے دیتے، اُن کی طرف جاتے جاتے رہ گیا۔ اُسی وقت مارٹی اور شامو نے مجھے دیکھ لیا، جیسے اُنھیں بس میرا انتظار تھا۔ وہ اُمڈتے ہوئے میری طرف بڑھے اور آ کے مجھ سے چمٹ گئے۔ سارا ٹی ہڑکنے لگا۔ اُس کی سسکیوں سے میرا سینہ کٹ رہا تھا۔ میں اُسے کیا دلاسا دوں؟ اِس کی کمر تھپک کے چُپ کراؤں؟ کیا کروں؟ زبان کی طرح میرے ہاتھ بھی اینٹھ گئے تھے۔ ایک نادار دوسرے نادار کے آگے، ایک تہی دست دوسرے تہی دست کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو دوسرا کیا کرے۔ شامو کو جانے کیا ہوا۔ وہ مارٹی کو اُسی وقت میرے پاس سے لے گیا اور اُنھی کرسیوں پر جا کے بیٹھ گیا۔ میں وہاں اکیلا رہ گیا۔ میں اکیلا ہی کھڑا رہا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ چوکھٹ کی سُرخ بتی بجھ گئی اور دروازہ کھلنے پر کئی ڈاکٹر ایک دوسرے کے آگے پیچھے برآمد ہوئے۔ اُن کی پیشانیوں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اُنھیں دیکھتے ہی سب اُن کی طرف لپک پڑے۔ تجھل کو بھی میں نے کرسی سے اُٹھتے دیکھا، پھر وہ سب میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے بھی اُن کی جانب بڑھنا چاہا تھا لیکن مجھ سے ایک قدم بھی نہ چلا گیا۔

ایک لمحے کے لیے شور سا اُٹھا پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

اِس سناٹے کا مطلب میری سمجھ میں بعد میں آیا کہ وہ دادا اور ماچھی کے بارے میں فیصلہ سنا رہے ہیں۔ میرا سارا جسم دھڑکنے لگا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ نہیں نہیں، یا تو یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں یا سب میری آنکھوں کا جھوٹ، میرے دماغ کا فتور ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے کے جیتے جاگتے آدمی اِس طرح کیسے جا سکتے ہیں؟ میرے جی میں آئی کہ میں زور زور سے چیخوں، اپنا سر دیواروں سے پھوڑ لوں یا پولیس افسر سے تمنچا چھین کے سب کو گولی مار دوں، اِس جگہ ہی کو آگ لگا دوں مگر مجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔

اُنھوں نے ڈاکٹروں کے لیے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ میں بُت کے مانند کھڑا اُنھیں دیکھتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے سامنے سے گزر گئے۔

آدمی عناصر کا مرکب ہے تو حواس سے بھی عبارت ہے۔ بے حواسی بھی ایک قسم کی موت ہے۔ میں بھی کچھ دیر کے لیے مر گیا تھا، اندھا ہو گیا تھا کیونکہ میری استطاعت یہی تھی۔ کاش ایسا ہی رہتا، میرے حواس کبھی نہ جاگتے، میری آنکھیں بند ہی رہتیں۔ یہ عارضی موتیں تو آدمی کے لیے اور عذاب ہیں۔

مارٹی میرے سینے سے لپٹ کے رونے لگا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کون ہوں۔ یہ جگہ کون سی ہے اور سامنے کے کمرے میں کون بے حس و حرکت ..... مارٹی مجھ سے چمٹ چمٹ کے رو رہا تھا اور وہی سوئیاں میرے تن بدن میں پھر چبھنے لگی تھیں۔ کیا وہ دونوں اتنے اکیلے اتنے بے وقعت ہیں کہ اُن کے لیے یوں آسانی سے حکم صادر کر دیا جائے؟ پہلے بھی کئی بار میرے سینے میں گرج اُٹھی تھی کہ مجھے سیدھے پاٹے جانا چاہیے۔ اُس کتے کے لیے چاہے مجھے اِس سرے سے اُس سرے

تک بمبئی کے ایک ایک پاڑے جانا پڑے۔ وہ کوئی بھی ہو اور کتنے بھی ہوں، میں اُنھیں مہلت نہیں دوں گا۔ دادا کا خون ایسا ارزاں نہیں کہ اتنی دیر لگے۔ اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دادا اور ماچھی کے صرف اپنے ہاتھ پیر ہی نہیں ہیں، اُن کے اَن گنت ہاتھ پیر ہیں۔ دادا اور ماچھی ہی کے خیال نے اب تک مجھے روکے رکھا تھا۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ اب کس بات کا انتظار ہے؛ مجھے تو اُسی وقت نکل جانا چاہیے تھا۔ میری رگوں میں خون سن سنا رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ تھل اور سب یہاں سے چل پڑیں اور مجھے بھی اُن کے ساتھ جانا پڑے، مجھے نکل جانا چاہیے ورنہ وہ مجھے نہیں جانے دیں گے اور میرا جسم اِسی طرح جلتا رہے گا۔ اُن کمینوں تک کسی اور کے پہنچنے سے پہلے مجھی کو پہنچ جانا چاہیے۔ مَیں نے مارتی کو اپنے بازوؤں سے الگ کر دیا۔

وہ سب منتشر ہو چکے تھے۔ میری نظریں بے اختیار تھل کی طرف گئیں۔ وہ پولیس افسر اور سپاہیوں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔ جمرو اور ٹنگو بھی مجھے اُن کے قریب کھڑے دکھائی دیے۔ دونوں کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ میں وہیں ٹھیرا رہا۔ کسی طرف کا رُخ کرنے سے پہلے مجھے اپنے آپ کو طمانچے مارنے کی ضرورت تھی، اپنی بینائی کی درستی اور دل و دماغ کی یک جائی کے بغیر میں اُن تک کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر عین اُس وقت جب میں وہاں سے نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا، شامو میرے پاس آ گیا اور اُکھڑی اُکھڑی آواز میں کہنے لگا کہ مجھے فوراً یہاں سے چلا جانا چاہیے۔

"کیوں؟" مَیں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"وہ ہم کو تھانے لے جا رہے ہیں۔" وہ سرگوشی میں بولا۔

"تھانے! مگر کس لیے؟"

"تھوڑی پوچھ تاچھ کے لیے۔"

"اب کیا پوچھنا رہ گیا ہے؟"

"بول رہے ہیں تو جانا پڑے گا۔ تو گھر جا کے پہلے بابا کو بول دے اور پاڑے میں بھی بول آ اور، اور سیدھے تو اُدھر دادا کے گھر..." اُس کی آواز ڈوبنے لگی۔

"نہیں نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔"

"بولنا تو ہو گا لاڈلے!" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

"ہاں ہاں، مگر تھل بھائی ہی کو بھیجنا۔"

"ہم کو اُدھر دیری بھی لگ سکتی ہے۔"

"کیوں؟"

"سمجھا کر، پولیس کو تو تُو سارا جانتا ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"اپنے کو بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا لاڈلے کہ یہ کیا ہم سب کیا ہو گیا۔" وہ سسکتے ہونٹوں سے بولا۔

"میرا دل بہت گھبرا رہا ہے شامو!"

"ہم جلدی آنے کا کریں گے۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہو

"ٹھیک ہے، ایسا کر، تو ابھی پاڑے کی طرف مت جا۔"

پولیس افسر کی آواز پر وہ کوئی توقف کیے بغیر میرے سے چلا گیا۔ میں بھی اُسی لمحے راہ داری میں مڑ گیا۔ مَیں نے عبور کر لی اور کاریڈور کی سیڑھیاں طے کر کے دروازے کی دُور تک چلا آیا۔ معاً کسی نے پیچھے سے اونچی آواز میں ٹھہ حکم دیا۔ میرے قدم لڑکھڑا گئے تھے لیکن میں دروازے کی طا رہا۔ پھر پیچھے سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ مَیں نے سوچا دوڑ کر طے کر لوں اور جلد از جلد دروازے سے گزر جاؤں میرے سر پر آ گیا اور مجھے ٹھیرنا پڑا۔ "کدھر کو جاتا ہے؟" اُس سانسوں میں مجھ سے پوچھا، وہ ایک سپاہی تھا۔

مَیں نے اُسے بتانا چاہا کہ میں گھر جا رہا ہوں۔

"تم کو ابھی کچھ بولا تھا صاحب نے؟" میں چپ رہا ہوئی آواز میں بولا۔ "چلو، ابھی ساتھ چلنے کا ہے۔"

"کیوں؟" مَیں نے تلخی سے پوچھا۔

"یہ اُدھر افسر لوگ سے پتہ کرنا۔"

وہ ایک ہی آدمی تھا اُس کے شانے پہ بندوق لٹکی دل میں اُس کی گردن دبوچ لینے اور اُسے قریب کی بارہ لوٹ دینے کا خیال آیا، اُس طرف اتنی روشنی نہیں تھی اور دروازہ بھی دُور نہیں رہا تھا لیکن مَیں نے خود کو روک لیا میرے بازو پر ہاتھ مار کے مجھے کاریڈور کی جانب دھکیل تک وہ جانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ تھل، جمرو اور شامو بھی مو پاس آ چکے تھے۔ پولیس افسر میرا منتظر تھا۔ دُور سے مجھے دیکھ ہونے لگا کہ کیا مجھے ٹھیک سنائی نہیں دیتا، میں اُسے ا بغیر کہاں جا رہا تھا؛ میرے خاموش رہنے پر وہ اور جز بز ہو سے ایک دوسرے پولیس افسر نے آ کے اُسے ٹوکا اور عجلت دیا تب اُس کی زبان قابو میں آئی۔ تھل اور جمرو پہلے ہی تھے ... سے بیٹھتے ہی جیپ چل پڑی۔ راستے بھر خاموشی

تھانے کے ایک وسیع اور روشن کمرے میں اُنھوں

بنچوں پر بٹھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں تیز تیز قدموں سے تین پولیس افسر اندر داخل ہوئے، اُن کے ہاتھوں میں کاغذات تھے۔ ایک عمر رسیدہ افسر کی بغل میں ڈنڈا بھی دبا تھا۔ ڈنڈا میز پر رکھ کے اُس نے ہم سے کچھ فاصلے پر درمیان کی کرسی سنبھال لی۔ باقی دونوں افسر اُس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ اُن میں سے دو کو مَیں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اُن کے پیچھے دیوار کے ساتھ دو سپاہی بندوقیں لٹکائے مستعد کھڑے تھے۔ دروازے پر بھی دو مسلح سپاہی تعینات تھے۔ ایک سپاہی میز کے قریب ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ افسر کاغذات الٹ پلٹ رہے تھے کہ میرے برابر بیٹھے ہوئے جمرو نے آہستگی سے میرا ہاتھ دبایا۔ "تھوڑا سنبھل کے۔" اُس کے کہنے پر مَیں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ "اپنے کو سارا دھیان رکھنا ہے۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ مَیں نے اُس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی، کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی ہے جو یہ وقفے وقفے سے مجھے ٹھوکے دے رہا ہے؟ یہی کچھ شامو نے کمرے میں داخل ہوتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ "تھوڑی سی بے دھیانی سے دیر لگ سکتی ہے۔" جمرو بُدبُداتے ہوئے بولا۔ کیسا دھیان؟ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ ہمیں کس قسم کا دھیان رکھنا ہے اور ہم یہاں ایسے بے زبانوں کی طرح کیوں بیٹھے ہیں؟ مَیں جمرو سے پوچھنا چاہتا تھا مگر اُس نے کہنی مار کے مجھے میز کی طرف متوجہ کیا۔ درمیان والے عمر رسیدہ پولیس افسر کی نگاہیں ہم پر منڈلا رہی تھیں۔ اُس نے عینک اُتار کے میز پر رکھ دی اور بھاری آواز میں تھل کو مخاطب کیا۔ "جیسا تم نے بولا ہے، یہ لوگ تھوڑی دیر پہلے گھر سے نکلا تھا، کوئی دس بجے کے قریب ہے"

"ہاں صاحب!" تھل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اور اندھیری جانے کا بول کے گیا تھا؟"

تھل نے سر ہلا کے ہاں میں جواب دیا۔

"پھر تم کو کبھی اور کیسے معلوم ہوا؟"

"ہم سب پہلے بول چکے ہیں۔" تھل نے آہستگی سے کہا۔

پولیس افسر نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے ساتھیوں پر نظر ڈالی اور کاغذات ٹٹولنے لگا۔ "تم کتنی دیری بعد وہاں پہنچا تھا؟"

"یہ بھی ہم نے بول دیا ہے۔"

بائیں طرف والے ادھیڑ عمر افسر کی پھیلی پھیلی آنکھیں تھل پر جمی ہوئی تھیں، اُس نے نسبتاً نرم آواز میں کہا۔ "کوئی بات رہ گئی ہو تو یاد کر کے ہم کو بولو۔"

"یاد آنے پر ضرور بول دیں گے۔" تھل بھن بھناتی آواز میں بولا۔

"کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے پولیس کو تمھاری مدد کی ضرورت پڑے گا، ہم کو کھل کے بتاؤ، ابھی تمھارے خیال میں کون لوگ اُن کا دشمن ہو سکتا ہے؟"

"اپنے کو پتہ ہوتا تو پہلے اُدھری جاتے۔"

"وہ قانون کا کام ہے، ہمارا کام، اور ہم اُنھیں کھوج لے گا۔ اُنھوں نے کن لوگوں پہ ہاتھ ڈالا ہے، ہم بھی جانتا ہے۔ اُدھر سپاہی لوگ نے اُس کو پہچان لیا ہے۔ وہ پیرو دادا ہے۔"

"صرف دادا ہی نہیں بولو۔"

"ہاں۔" اُدھیڑ افسر جلدی سے بولا۔ "سب سے بڑا دادا، ہم کو معلوم ہے، ایک نمبر کا دادا۔"

تھل سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"تم نے بولا کہ تم لوگ اِدھر بمبئی کا نہیں ہے اور پیرو دادا تمھارے کسی آدمی کے بیسویں پر اندھیری سے ماچھی دادا کے ساتھ آیا تھا، کچھ دیر ٹھیرا اور چلا گیا، ایسا ہی بولا تھا تم نے؟"

"ایسا ہی۔" تھل نے ہنکاری بھری۔

"تم ابھی کدھر سے بمبئی آیا تھا؟"

"اپنی بات چھوڑو، ابھی اُس کی بات کرو۔"

"اُسی کے لیے پوچھتا ہے۔" دائیں طرف کی کرسی والے نوجوان پولیس افسر نے ترشی سے کہا۔

"اُلٹی طرف سے مت چلو۔"

"پھر سیدھی طرف کا تم بولو۔"

"کیا بولیں، اپنے پاس ابھی کیا رہ گیا ہے۔" تھل نے گہری سانس بھر کے کہا۔ "دادا کو ابھی تم نے کدھر بھیجا ہے؟"

"دونوں کا پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال میں۔"

"اپنے کو کب تک مل جائے گا؟"

"زیادہ دیری نہیں لگے گا۔" درمیان میں بیٹھے ہوئے افسر نے کہا۔ "پر اُن کو ابھی تمھارے حوالے کیوں کرے؟"

"پھر کس کو کرو گے صاحب؟"

"تم اُس کا وارث نہیں ہو۔"

"ہم اُنھی کے پاس لے جائیں گے۔"

"تم، تم اُنھیں جانتے ہو؟" نوجوان افسر نے تیزی سے پوچھا۔

"نہ جانتے تو ٹھیک تھا۔" تھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

"کون ہے وہ؟ کہاں رہتا ہے، ماہم کے پاڑے میں؟"

"وہ اپنے گھر رہتا ہے۔"

"گھر! گھر کدھر ہے؟"

"اِدھر شہر میں ہی ہے۔"
"تم بتانا نہیں چاہتا؟"
"بتا دیں گے پر پہلے ہم کو اُدھر جانا ہوگا۔"
"تم کو کیوں؟"
"اُس کو دیکھ کے وہ مر جائیں گے، ہم کو پہلے جا کے اُن کو سنبھالنا ہوگا۔" تھبل کی آواز بھرّا رہی تھی۔
"کون کون لوگ ہے اُدھر؟"
"بیوی اور بیٹی۔"
"بیوی اور بیٹی!" نوجوان افسر نے دُہرایا۔
"کیوں! نہیں ہو سکتا صاحب؟"
"ہو سکتا ہے۔" پولیس افسر پہلو بدل کے بولا۔
"وہ اُن لوگ کو سب سے دُور رکھتا تھا۔"
"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ بیوی اور بیٹی نہیں جانتا تھا کہ وہ پاڑا چلاتا ہے، پاکٹ میں ہر وقت چاقو رکھتا ہے، کتنی بار جیل جا چکا ہے۔ سارا بمبئی کے دادا لوگ کا وہ راجا ہے؟"
تھبل نے کچھ نہیں کہا۔
"بولو، چپ کیوں ہو گئے؟"
"آپ کرسی پر بیٹھے ہو۔"
"لگتا ہے، بہت قریب تھا تم اُس کے؟"
"آپ کو بُرا لگتا ہے صاحب؟"
"نہیں۔" پولیس افسر نے سر جھٹکا۔ "لیکن ....." وہ کچھ سوچ کے رک گیا اور مضطرب آواز میں بولا۔ "کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟"
"کاغذ پر لکھا ہے۔"
تینوں افسر کاغذ لوٹنے پلٹنے لگے۔ "تھبل!" نوجوان افسر نے تندی سے کہا۔ "صرف اتنا ہی نام ہے تمھارا؟"
تھبل نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"کیا کرتے ہو؟"
"دادا کا جان کار کیا کر سکتا ہے۔"
"داداگیری، ہا! تم بھی دادا ہے، کدھر؟"
"ابھی تو اِدھری ہے، کام کی بات کرو صاحب!"
"دیکھو تھبل دادا!" اُدھیڑ افسر نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "اپنے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اچھا ہوگا کہ تم سے جو پوچھا جائے سوچ سمجھ کر ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"
"یہ آپ کے ٹھیک ٹھیک بولنے پر ہے۔" تھبل نے کہا۔ "آپ کی ہر بات کا جواب دینا ضروری نہیں ہے۔"
"تم اپنے ہوش میں نہیں ہے۔" نوجوان افسر برہمی سے …
میں بیٹھے ہوئے عمر رسیدہ افسر نے میز تھپک کے اُسے تحمل کی تلقین …
اور ٹھیرے ہوئے لہجے میں تھبل سے کہا۔ "یہ پولیس اسٹیشن …
دادا! اور تم پولیس کے سامنے بیٹھا ہے۔"
"نئے نہیں بیٹھے ہیں۔"
"ایسا ہی لگتا ہے پر تم اِدھر ضرور نوا نوا ہے۔ یہ بمبئی کا …
ہے۔ اِس کے بارے میں تم نے تھوڑا بہت سنا ہوگا۔"
"اُوپر سے اُتر کے نہیں آیا ہے۔" تھبل کی آواز ترخنے …
"ہم بولتے ہیں، اپنے آپ کو زیادہ مت اُلجھاؤ۔ دُور چلے جاؤ …
اِدھر اُدھر کی منہ ماری سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ آپ لوگ …
آدمی ہے۔ اِدھر اپنا دو بھائی چلا گیا ہے اور آپ مخول کر رہے …
"یہ مخول ہے؟" نوجوان افسر بھڑک کے بولا۔
"ہم اِدھر پاکٹ مار کے نہیں آئے ہیں یا آپ کے گھر ڈاکا ڈالا …
"تم ایک خون، بلکہ دو خون کے گواہ ہو۔" دائیں طرف …
افسر نے کہا۔ "یہ پاکٹ مارنے اور ڈاکا ڈالنے سے بڑا ....."
"اپنے دو آدمیوں کا خون ہو گیا ہے۔" تھبل اُس کی بات کاٹ کے اونچی آواز میں بولا۔ "ایسا بولو صاحب۔"
"ایسا ہی ٹھیک ہے اور تم وہ پہلا آدمی ہے جو اُس کو … ہوا آیا تھا۔"
"ہم کو دو کے بعد تیسرے نمبر پہ آنا چاہیے تھا کیا؟"
"اپنا آواز تھوڑا نیچا رکھو۔ ضرورت سے اوپر اونچا ہے، سمجھا!"
"اپنے کو بھی آپ سے یہی شکایت ہے۔"
میں نے بے چینی سے جمرو اور شامو کی طرف دیکھا۔ یہ کیا …
رہا ہے۔ وہ کیوں گونگے اور بہرے بنے ہوئے ہیں۔ اُن …
سے کہتے کیوں نہیں کہ وہ ہم سے ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں …
کچھ حاصل نہیں۔ یہ لوگ پولیس سے کچھ نہیں کہہ سکتے تو تھبل ہی …
روک لیں۔ کم از کم وہی اپنا لہجہ بدل سکتا ہے۔ جمرو اور شامو …
ہدایتیں مجھے دے رہے تھے، وہ تھبل کو دینی چاہیے تھیں۔ تھبل …
میں نہیں معلوم ہوتا، ہونا بھی نہیں چاہیے۔ میں جانتا ہوں اُن …
کے سینے میں کیسا تلاطم برپا ہوگا۔ میں نے طے کیا کہ میں دخل دوں …
اور اُن سے کہوں کہ کچھ تو ہمارا خیال کریں۔ انھیں کوئی اندازہ …
کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے۔ ہم کس طرح جبر کیے یہاں بیٹھے ہیں۔ اُن …
کارروائی کے لیے وہ کوئی اور وقت نہیں رکھ سکتے؟ میں یک لخت

اُٹھ گیا لیکن فی الفور اِدھر سے جمرو نے، اُدھر سے شامو نے میرے بازو کھینچ کے مجھے بٹھا دیا۔
"کیا ہے؟ کیا ہے؟" کمرے میں ایک ساتھ کئی آوازیں گونجیں۔
"کچھ نہیں صاحب! کوئی بات نہیں۔" شامو نے جلدی سے کہا۔
"یہ کون ہے؟" نوجوان افسر نے درشتی سے پوچھا۔
"اپنا بھائی ہے صاحب!"
"ابھی کیا ہو گیا اِس کو؟ کیا بولتا ہے؟"
"کچھ نہیں صاحب، آپ اپنا کام کرو۔" شامو نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور کترائی ہوئی آواز میں مجھے سمجھانے لگا۔ "ابھی اُستاد کو رہنے دے۔"
پیچھے کھڑے ہوئے دونوں سپاہیوں نے بندوقیں سیدھی کر لی تھیں۔ دروازے پر تعینات سپاہی بھی آگے آ گئے تھے۔ تینوں افسروں کی نگاہیں دیر تک مجھ پر مرکوز رہیں، پھر نوجوان افسر نے ناگواری سے کہا۔ "کوئی اور، کچھ بولنا مانگتا ہے؟"
سب خاموش رہے۔ تھبل نے بھی کچھ نہیں کہا۔
"سنو دادا! ذرا غور کر کے سنو۔" بیچ والے افسر نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم کو تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔"
"اپنے کو آپ سے زیادہ ہے۔" تھبل کی آواز بھی کسی قدر سنبھلی ہوئی تھی۔
"ہم کریں گے، اگر جیسا تم بولتے ہو، ہم کو بھی دُکھ ہے کہ تمھارے دو آدمی مارے گئے ہیں۔ ہمیں بتاؤ کہ اِدھر قریب میں پیرو دادا اور ماچھی دادا سے کسی کا دنگا فساد تو نہیں ہوا تھا؟ اپنا مطلب ہے، تمھیں کسی پر شک ہو تو صاف صاف بولو۔ پولیس اپنا کام کرے گی۔ وہ جدھر بھی ہے، پولیس سے دُور نہیں ہے۔"
"آپ کو سارا بول دیا ہے، ہم دادا کی صورت دیکھنے پیچھے آتے، دادا سے پہلے اُس حرام کے تخم کا کریا کرم کرتے۔"
"تم کو اِس کا اجازت نہیں ہے۔ تم سے ابھی کیا بولا کہ اِس کے لیے ہم موجود ہے۔ ہم کس لیے اِدھر بیٹھا ہے۔"
"آپ کو دیر لگے گی صاحب اور ہم کو یہ راس نہیں آتی۔"
"اِس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ تم خود وہاں پہنچنا چاہتے ہو اور اِسی لیے ہم کو کچھ بتانا نہیں چاہتے؟"
"آپ ٹھیک سمجھے ہو، یہ اپنا حساب ہے۔ پتہ ہونے پہ بھی ہم آپ کو تکلیف نہیں دیں گے۔"
"ہم تمھیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔"
"آپ کا کام بعد میں شروع ہوتا ہے۔ بولو گے تو بعد میں آپ کے پاس آ جائیں گے۔"
"تم غلطی پر ہے، ہمارا کام پہلے بھی شروع ہوتا ہے۔ ہم تمھیں ابھی کو اِدھر روک سکتے ہیں۔"
"آپ کس کس کو روکو گے؟"
"تم سب کو، ہم تم سب کو روک سکتے ہیں۔"
"اور اُدھر جو بے گنتی کے بیٹھے ہیں؟ اُدھر اُس کی بولی لگانے والے تھوڑے نہیں ہیں۔ آپ سمجھتے ہو، دادا ایسا اکیلا، اتنا سستا تھا؟" تھبل نے سرد لہجے میں کہا۔ "اور اِدھر کون سی دیوار پر لکھا ہے کہ آپ ہم کو ایسے روک سکتے ہو۔"
"روک سکتے ہیں۔" اُدھیڑ افسر کرختی سے بولا۔ "اپنے پاس بہت ادھیکار ہے۔ ایک نہیں، کئی چارج لگا کے۔ تم جو ایسا بے لگام بول رہا ہے، یہی چارج لگا کے ہونے والے خون خرابے کی روک تھام کے لیے۔ پولیس تم کو شک میں بھی روک سکتی ہے۔"
"کتنے دنوں تک؟"
"جب تک تمھارا دماغ ٹھکانے پر نہ آ جائے اور ہم کسی ٹھیک جگہ نہ پہنچ جائے۔ جب تک ٹھیک آدمی کا گردن پہ اپنا ہاتھ نہ پہنچ جائے اور، اور جب تک تم پہ اپنا شک دُور نہ ہو جائے۔ تم نہیں جانتا، ابھی تم پہ شک کرنے کو کتنا، کتنا پوائنٹ بنتا ہے۔ تم اِدھر بمبئی کا رہنے والا نہیں ہے۔ بمبئی پولیس تمھارا آگا پیچھا بھی ایک دم نہیں جانتا۔ دادا تمھارے گھر سے لوٹ رہا تھا اور رستے کا ٹائم کا تم کو اچھی طرح پتہ تھا۔ دادا کا جان پہچان والے میں تم سب سے پہلے پہنچا تھا۔ تم کو سب سے پہلے خبر ملا جب کہ تم اُدھر دُوری پر گھر میں بیٹھا تھا۔ اُدھر گولی کا آواز بھی نہیں پہنچ سکتا۔ سمجھا! ہم کو ابھی سارا چھان بین کرنا پڑے گا کہ تم ..... تم۔"
تھبل چپ بیٹھا رہا۔ نوجوان افسر غصّے سے بولا۔ "ایسا نہیں ہے؟"
"آپ بادشاہ ہو صاحب! شک کرنے کو اپنے آپ پر بھی کر سکتے ہو۔ اُدھر ہمارے جانے سے پہلے وردی والے لوگ پہلے گئے تھے، بندوق بھی اُن کے پاس تھی، اور دادا سے رٹا کا بھی ہاں کے۔" تھبل کے منہ سے کچھ نکل جاتا، اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ "پتہ چلنے پر ہم گھر میں بیٹھے اُنگلی چٹخاتے رہتے؟ ایسا نہیں ہوتا صاحب! آپ نوے نوے افسر نہیں ہو اور آپ سے اپنی باپ دادا کی دشمنی کا اُدھار نہیں ہے۔ آپ ایسا نہیں کرو گے۔ تھوڑی بہت اپنے کو بھی اونچے نیچے کی جان کاری ہے۔

آپ چار دن میں تسلی کر لوگے' دس دن میں' سال بھر میں۔ سوال کرنا آپ کو ہی نہیں آتا' اپنے کو بھی آتا ہے اور جو اپنے کو نہیں آتا' وہ اُدھر کرانے کے آدمیوں کو آتا ہے' ہرجے خرچے کا پورا حساب۔ ٹکے سیر مل جاتے ہیں۔ اُلٹا پڑ جائے گا۔"

"تم ہم کو دھمکی دیتا ہے؟" نوجوان افسر چیختے ہوئے بولا۔

"آپ ٹھیک بولتے تھے صاحب! یہ بمبئی کی پولیس ہے۔" ٹھل نے زہر خند سے کہا۔ "ہم لوگ بالکل نہیں جانتے تھے۔"

"آگے ابھی اور جان لے گا۔"

"آپ بھی کچھ جان لوگے۔"

میرے کپڑے پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ اب میری سمجھ میں خوب آ رہا تھا کہ جمرو اور شامو بار بار مجھے کیوں ٹوک رہے تھے اور ٹھل نے جمرو اور ٹنگو کو گلی کے سرے پر مجھے روک دینے کے لیے کیوں بھیجا تھا اور شامو مجھے اسپتال سے نکل جانے کو کیوں کہہ رہا تھا۔ وہ یہی کچھ کہنا' یہی سب باور کرانا چاہتے تھے جس کا مجھے کچھ خیال ہی نہیں تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ ہم اُس شخص سے نسبت کے مدعی ہیں جو پاڑے کا آدمی ہے۔ پاڑے کا آدمی تو پاڑے کا آدمی ہوتا ہے' زندہ رہنے پر بھی' مرجانے پر بھی۔ دادا کا سب سے بڑا حوالہ پاڑا ہے۔ اُس کے پرسانِ حال کو بھی اسی حوالے سے برتنا چاہیے۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا تھا کہ ہم یہاں دادرسی کے لیے نہیں' جواب طلبی کے لیے لائے گئے ہیں اور ہماری آنکھیں' ہمارے چہرے' ہمارے حال کی شہادت نہیں ہوں گے۔ وہ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اُن کے گھروں میں شاید کبھی موت نہیں آتی۔

اُدھیڑ افسر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ درمیان والے افسر نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے منع کر دیا۔ وہ تینوں سر جوڑے ایک دوسرے سے آدھی انگریزی' آدھی ہندوستانی میں باتیں کرتے رہے۔ اُن کی سرگوشیوں کا کوئی کوئی لفظ مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ تینوں بہت مضطرب اور مشتعل نظر آتے تھے۔ جب تک وہ آپس میں گفتگو کرتے رہے' ٹھل بھی ساکت بیٹھا رہا۔ خاصی دیر بعد عمر رسیدہ افسر نے سر اُٹھایا اور جھجکتے ہوئے بولا۔ "دادا! اب تک ہم نے تم لوگ کے ساتھ بہت نرمی کیا ہے۔ لگتا ہے' تم یہ زبان نہیں سمجھتا۔ تم مجبور کر رہا ہے کہ ہم ابھی دوسری زبان میں بات کرے۔ ہم ایسا نہیں چاہتا پر ادھر نہ تم اپنی مدد کر رہا ہے نہ ہماری۔ ہم صاف بولے' ایسا کر کے تم ہمارے شک کو گھٹانے کے بدلے اور بڑھا رہا ہے اور اپنے لیے بالکل اچھا نہیں کر رہا۔"

ٹھل نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ میرے پاس بیٹھا ہوا جمرو یکایک کھڑا ہو گیا اور جلتی ہوئی آواز میں بولا۔ "مائی باپ! ہم کے گھر میں آگ لگے' آپ اُلٹا تیل چھڑکتے ہو۔ شک کا مطلب؟ ہم نے اُس کو مارا ہے۔ وہ ہماری جان تھا' ہم اپنے کو مارتے کیا؟ پھر ہم آپ کے سامنے بیٹھے ہوتے؟ بمبئی سے سو میل آگے نہ بڑھ گئے ہوتے۔ ہوا بھی نہ لگتی آپ کو اور آپ کیسی مدد کو بولتے ہو؟ چاہتے کیا ہو آپ؟ ہم آدمی کا نام چھپاتے ہیں کہ اپنے کو چھپاتے ہیں۔ ہم اُلٹا سیدھا کسی طرف انگلی اٹھا دے یا آپ کو بول دے کہ ہم خونی ہے' ہم کٹلہ ہے' ہم نے اپنا خون کیا ہے۔ آپ کیسے پولیس والے ہو جو آدمی کو نہیں پہچانتے۔ لگتا ہے' بس چور اچکوں سے پالا پڑا ہے۔ اڈے پاڑے کا آدمی کبھی نہیں دیکھا آپ نے۔ آپ ادھر روک کے کیا کر لوگے ہمارا؟ سولی پر چڑھا دوگے؟ ماں قسم! ابھی آپ دادا کا نام لیو' سولی تو دیر کی بات ہے' اپنے پاس چاقو ہے' ہم ابھی اُسے سینے میں نہ اُتار لے تو اپنی ماں کا جنا نہیں۔ ایک بار بول کے دیکھو۔ دو گئے ہیں' ابھی تیسرا چلا جائے گا۔ پھر تسلی ہو جائے گا آپ کا کہ دادا اپنے لیے کون تھا۔ مرنے سے ہم نہیں بھاگتے۔ روز مرتے ہیں' روز زندہ ہوتے ہیں۔ موت تو سالی اپنی جیب میں پڑی رہتی ہے۔ اپنے کو معلوم ہے کسی دن ایسی بیچ رستے میں ہی آئے گی۔ آپ زیادہ سے زیادہ موت کی سزا دوگے۔ موت کی سزا اِس سے بڑی نہیں ہے جو آپ ابھی دے رہے ہو۔ وہ ہمارا باپ تھا' اپنا بھائی تھا وہ۔ آپ اپنے پہ کسی بھائی' کسی باپ کو مارنے کا شک کرتے ہو۔ آپ کا کوئی رشتہ ناتا کسی سے نہیں ہے کیا؟ اپنی ایسی خواری کبھی نہیں ہوئی۔" جمرو کی آواز سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔

تینوں افسر اُسے گھورتے رہے' کسی نے کچھ نہیں کہا۔ جمرو کا گلا بیٹھ گیا تھا' وہ حلق میں گھٹی ہوئی آواز سے بولا۔ "ہم کو بولو صاحب! ابھی آپ خود کون سی زبان سمجھتے ہو؟ آپ کیسے جانوگے کہ؟....."

"تھوڑا ٹھیر کے۔" درمیان والے افسر کے ہونٹ پھڑک رہے تھے تاہم اُس کی آواز تھمی ہوئی تھی۔ "تھوڑا ٹھیر کے۔ ایسا جوش دکھلانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تھانہ ہے' اِدھر ایسا نہیں چلتا۔ ٹھیک ہے' تمھاری یہ بات ہم ایک بار کو مانے لیتا ہے کہ وہ تم نہیں تھا' پھر وہ کون تھا؟ تم پیر دادا کے لیے ایسا بڑھ چڑھ کے بولتا ہے' خود کو اُس کا دوست بتاتا ہے۔ تم کیسا دوست ہے کہ دادا کے ایک دشمن کا نام بھی نہیں جانتا؟"

"آپ پھر وہی رٹ لگا رہے ہو۔" جمرو بیزاری سے بولا۔ "یہ بہت ضروری ہے دادا۔"

"اپنے لیے آپ سے زیادہ ضروری ہے' آپ کے ساتھ تو اِدھر پوری فوج لگی پڑی ہے۔ اِدھر آپ اپنا جتن کرو' اُدھر ہم اُس ....." جمرو کے منہ سے گالی نکل گئی۔ اُس نے حتمی لہجے میں کہا۔ "ہم ایسے بمبئی سے نہیں لوٹیں گے۔"

"دادا پانچ چھ مہینے سے اُدھر اپنے ساتھ تھا بمبئی سے باہر۔" جمرو کے خاموش ہوتے ہی شامو ہچکچاتے ہوئے بولا اور اُنھیں بتانے لگا کہ ہم کوئی پچیس دن پہلے ایک بیمار ساتھی کے ساتھ یہاں آئے تھے' پانچ چھ دن اُس کی تیمارداری میں کسی کو اپنی خبر ہی نہیں تھی۔ اُس کا بہت علاج کیا۔ آپریشن کامیاب ہو گیا تھا لیکن اُسے جلدی تھی۔ ٹھیک بیس دن ہوئے' اچانک وہ بھی دادا کی طرح کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر چلا گیا۔ اِس تمام عرصے میں ہم اِنھی پریشانیوں میں گھرے رہے۔ ہمیں اپنا ہی ہوش نہیں تھا' کسی اور طرف نگاہ کیا جاتی۔ اُس کے روٹھ جانے کے بعد کہیں نکلنے بلکہ بمبئی میں ٹھیرنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن دادا کا خیال روکے رہا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ دادا کے پیچھے بمبئی میں کیا کچھ ہوتا رہا اور کسی نے پاڑے پر دادا کی دو بار واپسی اور شہر کے پاڑوں پر اُس کا ہاتھ پسند نہیں کیا۔ وہ کوئی ایک نہیں' بہت سے ہو سکتے ہیں۔ شامو کی آواز رفتہ رفتہ سندھر گئی تھی لیکن شاید ٹھل نے اس کی طرف منہ اٹھا کے دیکھا تھا یا اسے خود کچھ خیال آگیا تھا' وہ ہکلانے لگا اور آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"کیا ہوا؟" وہ تینوں چونک پڑے تھے جیسے شامو کوئی انکشاف کرتے کرتے رُک گیا ہو۔ "دادا بمبئی سے کدھر گیا تھا؟"

"وہ اپنے ساتھ تھا۔" شامو کے بجائے ٹھل نے جواب دیا۔

"کہاں' کیوں؟"

"ایسے ہی گھومنے پھرنے کے لیے' مستی کے لیے۔"

"مستی کے لیے۔" اُدھیڑ افسر بے تابی سے بولا۔ "دادا! تم ابھی چپ بیٹھو' اِس کو بولنے دو۔" اُس نے براہِ راست شامو کو مخاطب کیا۔ "ہاں کیا بول رہا تھا تم؟"

شامو نے ٹھل کی طرف نظر کیے بغیر آہستگی سے کہا۔ "ہاں صاحب! گھومنے پھرنے کے لیے' اس کے لیے کوئی نہیں کل سکتا۔"

"ایسا ہی بے وجہ؟"

"بولا نا آپ کو۔" شامو نے تیز لہجے میں کہا۔ "سیر سپاٹے کے لیے آپ کبھی باہر نہیں نکلتے ہو؟ اِدھر اُدھر مت بھٹکو صاحب! اپنا مطلب تھا کہ دادا بمبئی آنے کے بعد پورا انجانے میں تھا۔ یہی بولنا تھا آپ سے۔ اُسے کچھ پتہ ہوتا تو ہم کو بھی ضرور ہوتا۔"

"اور ہم کو ہوتا بھی تو بتانا اپنی مرضی پر ہے۔" ٹھل نے پھر چیختی آواز میں دخل دیا۔ "اور ہم آپ کو بولیں صاحب! بمبئی شہر اپنے لیے ایسا نوا بھی نہیں ہے۔ پہلے بھی ہم ادھر آ چکے ہیں۔ دادا کے ساتھ اچھا دیکھا بھالا ہے۔ ادھر کا بہت سا دادا لوگ ہم کو جانتا ہے۔" مجھے حیرت ہوئی کہ جب اُن کی برف کسی قدر پگھلی ہوئی نظر آ رہی ہے تو ٹھل کا لہجہ ایسا تند کیوں ہے۔ وہ اُنھیں کیا جتانا چاہ رہا ہے؟ ٹھل کی حالت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی تھی۔

نوجوان افسر کا جسم اُس کے قابو میں نہیں تھا۔ "ہی لکس دی مین کلپرٹ۔" اُس نے ٹھل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ "ہمیں کچھ دیر کے لیے اسے باہر کر کے باقی سے بات کرنی چاہیے۔"

میں نے سُن لیا تھا۔ وہ ہم سب کو باسٹرڈ اور ٹھل کی کٹھ پتلیاں کہہ رہا تھا اور بھی بہت کچھ۔ میں سنتا رہا لیکن میرے لیے خاموش بیٹھے رہنا دشوار ہو گیا۔ مجھے اٹھ کے اُن سے کہنا چاہیے تھا کہ وہ زبان سنبھال کے بات کریں۔ اِس سے پہلے کہ ... ٹھل کو باہر نکل جانے کا حکم صادر کریں' مجھے صاف صاف ... بتا دینا چاہیے تھا کہ پھر ہم میں سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ میں نے جمرو اور شامو کی طرف دیکھا۔ وہ بہرے بنے بیٹھے تھے۔ ٹھل' مارٹی اور ٹنگو بھی۔ میں انگریزی نہ سمجھتا تو میری بھی یہی کیفیت ہوتی۔ ہر آدمی اُتنا بہرا ہوتا ہے جتنا وہ نہیں جانتا اور مارٹی کو تو اتنی انگریزی ضرور آتی ہے' اُس نے سُن لیا ہوگا کہ وہ کیسی بدزبانی' دریدہ دہنی کر رہے ہیں۔ اُسے چپ دیکھ کے میں بھی اُٹھتے اُٹھتے رہ گیا۔

درمیان میں بیٹھا ہوا افسر کچھ سوچتا رہا پھر اُس نے اپنے نوجوان ساتھی کی تجویز یہ کہہ کے مسترد کر دی کہ ہم سب ایک جیسے ہیں' ٹھل کے جانے کے بعد ہم اور بے لگام بھی ہو سکتے ہیں یا زیادہ محتاط بھی۔ اُس نے مذبذب لہجے میں ٹھل سے کہا۔ "تم اِدھر بمبئی میں کب تک رہنے کا ہے؟"

ٹھل نے جواب دیا کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

"ابھی کوئی ضمانت کرا سکتا ہے؟"

"کاہے کی ضمانت؟"

"کہ تم لوگ اِدھر شہر میں ٹکے گا۔"

"ہم ایسی کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ آپ زیادہ بات مت کرو' سیدھا پرچی بناؤ۔"

"پرچی بننے میں ابھی کوئی دیر نہیں لگے گا۔"

ٹھل کے لبوں میں جنبش نہیں ہوئی۔

"ایک بار ابھی تم کو سوچنے کا موقع ہے۔" تجھل نے کچھ نہیں کہا تو عمر رسیدہ افسر سرکشی سے کہنے لگا۔ "زبان بند کرنے سے تمھارے لیے اچھا نہیں ہے دادا۔"

"کھلا رہنے سے ابھی اپنے کو کیا ملا ہے۔" تجھل نے جھنجلا کے کہا۔ "آپ اپنے لیے وکیل کا انتظام کرو۔"

"وکیل، کیسا وکیل؟" وہ متوحش انداز میں بولا۔

"ابھی ہم اُس سے بات کر کے ہی کچھ بولیں گے۔"

"تم بہت آگے کا بول رہا ہے۔"

"اپنا سر بہت گھوم رہا ہے صاحب! ابھی آپ کے ساتھ کھپا کے اور اُلٹا ہو جائے گا۔"

"تم پولیس کا پوزیشن نہیں سمجھ رہا ہے دادا!" اُدھیڑ پولیس افسر نے کسی قدر مفاہمت کے لہجے میں کہا۔

"پر آپ تو اپنے کو خوب سمجھ رہے ہو۔"

"نہیں۔" وہ سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم، ہم کوشش کر رہا ہے۔ ہم بولا کہ اپنے کو تم سے کوئی بیر نہیں ہے۔" اُدھیڑ افسر وہی کچھ دہرانے لگا جو کم و بیش وہ تینوں پہلے کہہ چکے تھے کہ یہ ایک نہایت سنگین واقعہ ہے، آج دو دادا گئے ہیں کل دوسرے جا سکتے ہیں، پاڑوں سے متعلق لوگ آپس میں خون خرابہ کر سکتے ہیں، اِس امکان کی پیش بندی کے لیے پولیس کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے، اُسے کسی بے گناہ آدمی پر ہاتھ ڈال کے خوشی نہیں ہوتی۔ پولیس بھی کسی کے سامنے جواب دہ ہے لیکن چونکہ پیرو اور ماچھی دادا کے لیے سب سے پہلے ہمی اُن کے سامنے آئے ہیں اِس لیے ہم سے اتنا کچھ کہا جا رہا ہے۔ جہاں تک پولیس کے اختیار کا تعلق ہے، وہ یقیناً بے حد حساب نہیں ہے لیکن ایسا کم بھی نہیں ہے۔ پولیس روکنے پہ آئے تو ہمیں کسی بھی الزام، کسی بھی شبے میں روک سکتی ہے۔ بعد میں ہم ثابت کرتے پھریں گے۔ یہی ہو گا نا۔ وہ بھی کچھ ثابت کریں گے لیکن پس منظر میں اگر کچھ نہیں ہے تو یہ ایک غیر ضروری، غیر نتیجہ خیز بات ہو گی۔ پولیس ہمی پر کیا، ایسی صورت میں کسی پر بھی شک کر سکتی ہے۔ وہ کہنے لگا کہ پولیس کو ایسے معاملات کا خوب تجربہ ہے۔ دادا لوگ عموماً نام نہیں بتلاتے، خود جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پولیس ایسے خودسر اور منتقم مزاج لوگوں کو کیسے چھوڑ دے جو اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ انھیں معلوم ہوتا تو پہلے وہ اُسی طرف کا رُخ کرتے اور انھیں مجرم کا نشان مل جائے گا تو پولیس کو اطلاع نہیں دیں گے، ہماری خواہش پر وکیل بلایا جا سکتا ہے مگر وکیل کیا کرے گا۔ وہ ہمیں روکنے ہی پر آ گئے تو وکیل بھی دیکھتا رہ جائے گا۔ عدالت بھی اتنا جانتی ہے کہ چالاک مجرم کبھی کبھی علی الاعلان سامنے آ کے بھی جرم چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جائے واردات پر ہمارا موجود ہونا دو باتیں ثابت کرتا ہے۔ خبر ملنے کے بعد ہمیں فطری طور پر وہاں چاہیے تھا یا پھر ہم نے اِس طرح اپنی دانست میں خود پر عائد والا ہر شک مٹا دینے کی کوشش کی ہے۔ پولیس افسر نے بے سے کہا۔ "کچہری عدالت ابھی دُور کا بات ہے۔ پہلے اپنے کو تسلی کہ یہ سب ایسا نہیں ہے۔"

"تسلی تو آپ اپنے کو دیو، آپ کا کون چلا گیا ہے جو الیا ہے۔" تجھل نے تپیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "جو آپ آگے پیچھے کا رہے ہو، اُس کا اپنے کو پورا پتہ ہے۔ پتہ ہے کہ آپ کتنی دُور تک چلو گے، آگے کون...."

پولیس افسر اُس کی بات کاٹ کے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا کہ عدالت بھی پولیس کے شبے کی تائید اُس وقت کرتی رہے گی جب تک پولیس کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتی، پولیس کا دوسرا رُخ ہے۔"

"ہم نے ساری مٹی نہیں کی ہے۔" تجھل نے کھردری آواز میں کہا۔ "اتنا چوپٹ نہیں ہے اُدھر۔"

"اِدھر بھی نہیں ہے۔" پولیس افسر کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ "کوئی تمھارا دشمن نہیں بیٹھا ہے۔ اپنے پہ بھروسا کرو اور کھل کے بولو۔"

"آپ کا رنگ کالا ہو جاتا ہے۔" تجھل نے بے اعتنائی سے کہا۔ "ہم کو بیان بدلنا نہیں آتا، اُدھر گلی میں جو بول دیا تھا اور آپ کے منشی نے لکھ لیا تھا، اُس کے بعد نیا کچھ نہیں ہے۔ لگتا ہے آپ کے پلے بھی نہیں ہے جبھی آپ پھر کی گھما رہے ہو۔ جب تک اُدھر کام لیتے رہو گے، ایسا ہی رہے گا۔ تھوڑا نیچے کو بھی آؤ اور چھاتی پہ ہاتھ دھر کے دیکھو۔"

اُدھیڑ افسر اضطراری انداز میں سر ہلا کے بولا۔ "پولیس تم لوگ میں سے ہے دادا!"

تجھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عمر رسیدہ افسر نے تیکھی آواز میں پوچھا۔ "ابھی تم کو چھوڑ دے تو کدھر جائے گا؟"

"آپ بولو، کدھر جانا چاہیے؟"

"ہم تم سے پوچھ رہا ہے۔"

"کدھر جاتا صاحب!"

"پاڑے جائے گا؟"

"پاڑے بھی جائیں گے پر پہلے اُن کو پھونکنا ہے۔" تجھل کی آواز ترخنے لگی تھی۔ "پاڑے بھی جائیں گے صاحب!"

"اُدھر دادا کی گدی پر بیٹھنے کا ہے؟"

"پاڑا کوئی راجا کی گدی نہیں ہے۔"

تجھل کا مفہوم عمر رسیدہ افسر کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ کسی قدر بوکھلا کے بولا۔ "پاڑے کی گدی پر کون بیٹھنے کا ہے؟"

"پاڑا مال جائداد نہیں ہوتا، راج پاٹ کی طرح، باپ آنکھ بند کرے تو بیٹے کے متھے پر تاج جما دیا جائے۔ پاڑا بل سے ملتا ہے اور بل تک رہتا ہے۔ دادا اُسی ٹائم ختم ہو جاتا ہے جب اُس کے ہاتھ پیر اپنے نہیں رہتے۔"

"تم.... تمھارا مطلب ہے کہ ماہم کے پاڑے کے لیے جو بھی جاتی بل والا آئے گا وہی گدی پر بیٹھنے کا ہے؟"

"یہ آپ بھی جانتے ہو۔"

"پر ہم نے دیکھا، اِدھر بہت بوڑھا بوڑھا لوگ بھی پاڑے پر ہے۔ اب اُس کا بل نہیں ہے پھر بھی وہ پاڑا چلاتا ہے اور سب اُس کا آگے پیچھے گھومتا ہے۔"

"پر پاڑا دادا کے جنے کو نہیں ملتا، آپ کی طرح آپ کی کرسی بھی...."

"ہاں ہاں ہم سمجھتا ہے۔" درمیان والے افسر نے مضطربانہ کہا۔

"پاڑے کا راجا، دادا جنتا نہیں، پالتا ہے اور بل کھو کے گدی پر بھی ٹکا رہتا ہے۔ جب اُس کے بنائے ہوئے پاڑے کے دادا لوگ ایسا چاہتے ہوں۔ پرانے دادا کی جان کاری، پرکھ کی اُن کو ضرورت پڑے تب...." تجھل نے انھیں بتانا چاہا، "لیکن ایسا کم ہوتا ہے اور دیر تک نہیں چلتا۔ وہی گدی سنبھالتا ہے جس کے بازو زیادہ پھڑکتے ہوں اور جس کی انگلیاں چاقو کے کھیل سے خوب واقف ہوں اور اندر پاڑے میں ایسا کوئی نہیں ہوتا تو باہر سے کوئی آ جاتا ہے۔"

"پیرو دادا کا بھی یہی تھا؟" نوجوان افسر بے چینی سے بولا۔

"ابھی تو اُس کا بل شروع ہوا تھا۔"

"پر وہ تو اُدھر بیس پچیس سال سے پاڑے کا مالک تھا؟"

"شہر کا راجا بننے کو یہ ٹائم بھی تھوڑا ہے۔ ٹھنڈے گرم کی پہچان میں پوری عمر ڈھل جاتی ہے۔ ابھی اُس کو نزدیک کا، پرے کا دیکھنا آیا تھا۔ بل اکیلا بازو کا نہیں ہوتا۔ اِدھر اُس جیسا کوئی نہیں تھا۔"

"تم بھی نہیں....؟"

تجھل نے جواب نہیں دیا، نوجوان افسر نے ایک لمحے کی مہلت دیے بغیر اُسے ٹوکا۔

"حکومت صاحب!" تجھل نے چلچلاتی آواز میں کہا۔ "بولیں گے تو آپ کو مرچ لگ جائے گی۔ آپس میں کانٹا نہیں رکھا جاتا۔"

نوجوان افسر کے کچھ کہنے سے پہلے اُدھیڑ افسر نے بے ربطی سے کہا۔ "دادا! جس لوگ نے چاقو کے بدلے گولی سے دادا کو ختم کیا ہے، اُس نے گدی کا لالچ میں ایسا کیا! کیوں؟ پھر وہ ضرور سامنے آئے گا، ابھی نہیں تو تھوڑا دیری میں...."

"ایسا نہیں آئیں گے، وہ حرام کے.... اتنے دھنی نہیں ہیں جو پاڑے پر سینہ پھلا کے ابھی آ جائیں۔ اِدھر آپ میں روڑا اٹکائیں، اُدھر اپنے کو خوار کریں۔ وہ ایسے آگ کی طرف نہیں بڑھیں گے۔ گولی نہ چلاتے پھر، وہ بھی پیچھے کی طرف سے...."

"پھر اُن کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"

"دادا بمبئی کے سارے پاڑوں کا دادا تھا۔"

"ہاں۔" اُدھیڑ افسر جھجکتی آواز میں بولا۔ "تم سمجھتا ہے کہ وہ پیرو دادا کے دباؤ سے سارے شہر کے پاڑوں کو نکالنے کے لیے بھی ایسا کر سکتا ہے؟"

تجھل سر ہلا کے رہ گیا۔

"پر اگر کوئی نیا دادا پھر سے ماہم کے پاڑے کے نیچے آنے کو بولے تو اِدھر بہت سا لوگ سامنے آ سکتا ہے۔"

"آپ غلطی پر ہو، نیا دادا آنے پر کون ایسے ماہم کے پاڑے کے حکم کو مانے گا۔ پاڑے کی چوکی لکڑی کی ہے، دادا لکڑی کا نہیں ہوتا۔ حکم کے لیے زور چاہیے۔"

"تم ابھی ماہم کے پاڑے پر بیٹھنا مانگتا ہے؟"

"اپنے پاس اڈے پاڑے کی کمائی نہیں ہے۔ اپنے کو ابھی صرف ایک بات سے مطلب ہے کہ دادا پر ہاتھ اُٹھانے والے کا گردن کب اُتار لیں۔"

"ایسا کیسے اُتارے گا؟" اُدھیڑ افسر طنزیہ انداز میں بولا۔

"اُس کا نہیں تو اپنا اُتار لے گا۔"

"ہم پوچھتا ہے، کدھر ڈھونڈے گا اُسے؟"

"ڈھونڈے گا صاحب!"

"کیسے؟"

"ابھی نکل کے دیکھیں گے۔"

ادھیڑ افسر نے مزید حجت نہیں کی۔ چند لمحوں تک سناٹا رہا پھر اسی نے کسمسائی آواز میں تھل سے پوچھا "دادا کے پاس مال تو بہت ہوگا؟"

"دادا کے پاس مال ہو تو اُس کا زور آدھا ہو جاتا ہے۔"

"ایسا کیسا؟"

"مال، زور کا گھن ہے۔"

"یعنی دادا کے پاس کوئی مال نہیں تھا؟"

"کسی دادا کے پاس اتنا نہیں ہوتا۔ مال کے لیے کوئی پاڑا نہیں چلاتا ہے۔"

"پھر کس لیے چلاتا ہے؟"

"اپنے ساتھ تھوڑے دن پاڑے پہ بیٹھو تو آپ کو پتہ چل جائے گا۔"

"دادا کا بیٹی کتنا بڑا ہے؟" یکایک عمر رسیدہ افسر نے تیور بگاڑ کر پوچھا، اُس کا لہجہ صاف چیلے پن کا تھا۔

تھل پھیلی ہوئی آنکھوں سے انھیں دیکھا کیا۔

عمر رسیدہ افسر نے اُس کے جواب کا انتظار نہیں کیا، تیزی سے بولا "جوان ہے؟"

"ہاں" تھل نے آہستگی سے کہا۔

"شادی کا لائق؟"

تھل چپ بیٹھا رہا۔

"بس ایک بیٹی!"

"ابھی دو چار ہوتی تو آپ کیا کر لیتا؟"

"جو پوچھتا ہے اُس کا جواب دو" نوجوان افسر نے خشونت سے کہا "اب اُن لوگ کو کون دیکھے گا؟"

"وہ اپنی بٹیا ہے۔"

"ہوں" عمر رسیدہ افسر ہونٹ سکوڑ کے بولا "تم دیکھے گا؟"

"آپ دیکھو گے کیا؟" تھل کی آواز تمتما رہی تھی۔

"تھوڑا کھینچ کے بولو تو اچھا ہے دادا!" نوجوان افسر نے برانگیختگی سے کہا "ہم پوچھتا ہے ادھر اور کوئی نہیں ہے اُس کا؟"

"ہوگا" تھل نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا "ہم نہیں جانتا۔"

"تم نہیں جانتا؟"

"یہی بولا ہے۔"

"گھر نہیں بتائے گا؟"

"بتائیں گے پر ابھی نہیں۔"

"ابھی بولنے میں کیا جاتا ہے؟"

دونوں افسروں نے آنکھیں میچ کے اُسے صبر و ضبط کی تلقین کی اور سرگوشیوں میں دیر تک اُس سے باتیں کرتے، کاغذات اُلٹتے پلٹتے رہے مگر بار بار اُن کی نظریں ہم پر بھٹکنے لگتیں جیسے ہم بیٹھے بیٹھے اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ اسی اثنا میں ایک دراز قد سپاہی تیز قدموں سے اندر داخل ہوا، اُس نے اُن کے قریب آکے سیلوٹ کیا اور کونے والے نوجوان افسر کے سامنے میز پر ایک پرچی رکھ دی۔ تینوں افسروں نے باری باری پرچی دیکھی۔ اُسے پڑھ کے اُن کے شانے سیدھے ہو گئے۔ انھوں نے رقعہ لانے والے سپاہی سے دھیمے لہجے میں مختصراً کچھ کہا، سپاہی فوراً واپس چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی عمر رسیدہ افسر نے تھل سے کہا "تو تم ہم کے پاڑے پہ نہیں جائے گا؟"

"ضرور جائیں گے۔"

"پر تم ابھی کیا بولا؟"

"ضرورت ہونے پہ ہر جگہ جائیں گے۔"

"کیسا ضرورت؟"

"یہ آپ جانتے ہو۔"

"دادا!" ادھیڑ افسر نے دخل دیا "تم نے اب تک ہمارا کوئی مدد نہیں کیا ہے۔" اُس کی آواز میں غصہ بھی شامل تھا، رنج بھی۔

"آپ خود ایسا کرنا نہیں چاہتے۔"

"کیا؟ کیا بولا تم؟"

"ادھر بمبئی میں ایک ہمی آپ کو دکھائی دیا ہے، سارا شہر دادا کو جانتا ہے، سارا دادا لوگ۔"

"تم کیا سمجھتا ہے، پولیس آنکھ بند کیے بیٹھی ہے؟"

"پھر ہمی کو کیوں جکڑ رہے ہو؟"

"کیونکہ تم خود کو اُس کا بھائی، دوست بولتا ہے۔"

"تو ہم اُلٹ بولیں، آپ چین سے بیٹھ جاؤ گے؟"

"ایسا نہیں، ایسا نہیں دادا! اپنے کو کس چیز سے چین آنے کا ہے، تم جانتا ہے، سچ جاننے سے۔"

"جھٹکے سے نہیں ملتا، تھوڑی دیر لگتی ہے۔"

"اتنی دیر ہم تم کو ادھر روکے رکھتا ہے" نوجوان افسر نے مشتعل ہو کے کہا "کیوں؟"

"اپنی چھٹی کرو صاحب!" تھل نے برہمی سے کہا

"چھٹی کر دے؟" نوجوان افسر بھڑک گیا اور دیوانہ وار انداز میں اپنے ساتھی افسروں سے پوچھنے لگا "یہ کیسا بولتا ہے، حکم چلاتا ہے؟"

"آپ کی مرضی ہے، پر شاید پھر اور دیر لگ جائے۔"

"اور ابھی ہم تم کو جانے دے تو....؟"

"تو آپ اپنے لیے بھلا کرو گے۔"

جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، نوجوان افسر اپنی نشست سے اچھل سا گیا۔ دونوں افسروں کے منع کرنے پر وہ ہذیانی انداز میں کہنے لگا۔

"ایک شرط پر ہم تم کو چھوڑنے کا سوچ سکتا ہے کہ تم اپنے آپ کچھ نہیں کرے گا، پہلے ہم کو بولے گا" ادھیڑ افسر نے اٹکتی آواز میں کہا۔

"آپ کیسی بات کرتے ہو؟"

"کیوں، تم ہم کو نہیں بولے گا؟"

"ہم کہاں کہاں ہتھیلی لگائیں گے۔ دادا نے پوری ادھری لوئی ادھری کاٹی ہے۔ جو آج پاڑوں پہ سینگ نکالے راج کرتے ہیں، اُن میں کتنوں کو دادا نے چاقو نچانا سکھایا ہے، یہ آپ جانتے ہو نہ ہم۔ کس نے دادا کا نمک زیادہ کھایا ہے، کون خون کا اچھیل ہے۔ ہم سارے شہر کا ٹھیکا لینے کا آپ کو بول دیویں؟ ادھر اپنے کو بہت سے جانتے ہیں، اُن کو پتہ ہے، دادا سے اپنا کیا ناتا ہے۔ وہ اپنے پاس سر پیٹتے، چھاتی کوٹتے آئیں گے۔ اُن کو بولنا چاہیے کہ ابھی کدھر اُن کا دھیان جاتا ہے، پر انھوں نے نہیں بولا، اپنے تک سینت کے رکھا کہ دادا کا ایک بدلہ چکانے کے لیے....."

"اپنا بات کرو، صرف اپنا بات۔"

"اپنی کیا بات کرے۔" جمرو بہت دیر سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، اچانک پھر کھڑا ہو گیا اور پھٹی ہوئی آواز میں ڈکرانے لگا "بہت ہو گیا، بہت ہو گیا صاحب بہادر! اب یہ ٹنٹا ختم کرو، جو فیصلہ کرنا ہے، اپنے کو بول دیو۔" اِس وقت جمرو کو چپ ہی رہنا چاہیے تھا۔ میں نے اور شامو نے اُسے بٹھانا اور خاموش کرانا چاہا مگر جتنا ہم نے اُسے روکنے کی کوشش کی، وہ اتنا بے قابو ہوتا گیا اور جو منہ میں آیا بکتا رہا۔ کہنے لگا کیا وہ اونچا سنتے ہیں۔ کوئی دوسرا جو ٹھیک طرح دیکھتا اور سنتا ہو، کوئی آدمی کا بچہ یہاں نہیں ہے؟ نوجوان افسر نے بھی چیخ کر اُسے سیدھی طرح بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور تھل سے کہا "اِس کے گلے میں پٹا ڈالو دادا!" تھل نے جیسے سنا ہی نہیں۔ جمرو شور مچاتا رہا۔ "کیا کر لوگے ہمارا؟ کیا کر لوگے؟ قسم سے ہم کو نہیں جانتے۔ آگے بہت پچھتاؤ گے۔ بہت ستایا ہے اپنے کو....." نوجوان افسر نے سپاہیوں کو اشارہ کر دیا۔ میں نے تھل کی طرف دیکھا تا کہ وہی اُٹھ کے جمرو کو سنبھالے مگر وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ سپاہی ہماری طرف بڑھ گئے تھے۔ شامو نے انھیں روکا اور جمرو سے منت کی کہ بس وہ کچھ دیر اور تحمل کر لے۔ ٹنگو اور مارتی بھی اُٹھ کے ہمارے پاس آ گئے تھے۔ سپاہیوں کی دست درازی سے پہلے ہی ہم نے جمرو کو بٹھا دیا، اِس میں خود جمرو کی انفعالیت بھی شامل تھی۔ شاید اُسے احساس ہو گیا تھا کہ آہ و فریاد سے کچھ حاصل نہیں۔ اتنی دیر میں اُسے یہ اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔

"یہ، یہ پاگل ہو گیا ہے؟" نوجوان افسر نے غصے سے لرزتی آواز میں کہا۔

"پاگل تو آپ بنا دو گے صاحب!" تھل کی آواز جمی ہوئی سی تھی۔ "ایسے وقت میں اپنے سے آنکھ مچولی کرتے ہو۔ پہلی بار کوئی ملا ہے آپ کو؟"

عمر رسیدہ افسر نے جلدی جلدی کاغذات سمیٹنے شروع کر دیے۔ اُس کا چہرہ سوج سا گیا تھا۔ دونوں افسروں نے اُس کی پیروی کی۔ وہ اٹھا ہی چاہتے تھے کہ ادھیڑ افسر تاسف آمیز ناراضی سے بولا۔

"لگتا ہے، تم یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔"

"پتا کرا کے نہیں جائیں گے۔" تھل نے کہا "بولنے کو ہم کچھ بھی بول کے اِدھر سے جا سکتے ہیں۔ آپ ایک کیا دس شرط رکھ لو پر آگے سارا اندھیرا ہے، ایسے میں آپ کو کیا بولے۔ اِدھر سے نکل کے اپنے کو کچھ معلوم نہیں، کدھر جانا پڑے۔ اِس ٹائم اپنے کو کچھ دکھائی سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ آپ سمجھتے ہو، یہاں سے نکل کے آگے راستے میں سب ہرا ہی ہرا ہے۔ اِدھر آپ کی بندی میں اپنے لیے بہت سکھ ہے۔ اپنے کو کہیں کسی کو دیکھنا، سننا نہیں پڑتا۔ اُس کے گھر میں وہ دونوں روتے روتے مر جائیں گی، دادا نے پھولوں میں رکھا تھا اُن کو۔ اپنے کو اُن کو بھی سنبھالنا ہے۔ اُن سے بولنا ہے کہ دادا اب لوٹ کے کبھی نہیں آنے کا، اب وہ اُس کو ایک دم بھول جائیں۔ اُدھر پاڑے پر سب بکھرا ہوا ہوگا۔ گھر میں اُس کے صرف دو جنے تھے لیکن دادا کا دوسرا گھر پاڑا بھی ہے۔ اُدھر بھی سب اُس کی اولاد کے مانند ہیں۔ اپنے کو اُن کو بھی تھامنا ہے اور وہ، آپ سمجھتے ہیں، وہ خنزیر کے جنے اپنی طرف سے آنکھ بند کیے پڑے ہوں گے، اُن کو پتہ ہے کہ ہم کون ہیں۔ دادا کا کانٹا انھوں نے نکال دیا ہے۔ جب تک ہم سامنے ہیں، اپنی ہڈی بھی اُن کے گلے میں پھنسی رہے گی۔ خود آگے نہیں آئیں گے تو اُدھر بمبئی کے سارے دادا لوگ کو تپھر ماریں گے کہ دیکھو باہر کا کون، پیر دادا کے پاڑے پہ چپک کے بیٹھ گیا ہے، ایک دن میں دادا کا سب کچھ بن بیٹھا۔ اِدھر وہ آپ کو تیلی دکھائیں گے۔ اپنے کو اُن کے پاس بھی جلدی پہنچنا ہے، نہیں پہنچے تو ہم اپنے آپ کو منہ دکھانے کے نہیں رہیں گے جتنی

دیر وہ زندہ رہیں گے، ہم کو نیند نہیں آئے گی، سارا چلتا رہے گا۔ ہم کو ایک طرف نہیں دیکھنا ہم نے دادا پر بہت بوجھ ڈالے تھے، پر اتنے نہیں جتنے وہ ڈال کے چلنا بنا ہے۔ آپ، آپ یہ سب نہیں جانو گے!"

"ہم جانتا ہے۔" وہ تینوں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ تھل جیسے ہی خاموش ہوا، ادھیڑ افسر نے کہا۔ "پر تم پولیس پر بھروسا کرے گا، ہمارا ساتھ دے گا، ہم سے دُور نہیں رہے گا تو اتنا سب نہیں ہوگا۔"

اُس کی آواز اُمڈ رہی تھی۔

تھل نے کچھ نہیں کہا تو پولیس افسر مضطرب ہو کے کہنے لگا۔ "ہم کیا بولتا ہے، ابھی سمجھتا ہے؟"

"سمجھ رہا ہے صاحب! اچھی طرح سمجھ رہا ہے۔" تھل نے سر ہلا کے کہا۔ "اپنے، تمھارے دونوں کے اچھے کے لیے بولتا ہے بابا! تم کو صرف اتنا کرنا ہے کہ جاننے پہ ہم کو اشارہ کر دو، بعد میں تم کو کوئی شکایت نہیں ہوئے گا۔"

"دیکھے گا صاحب! پر ابھی اپنی بھی ایک بات دھیان سے سُن لو۔ اگر آپ پہلے پہنچ گئے تو ہم سے بات کیے بنا آگے نہیں بڑھو گے؟ پہلے ہم کو دکھاؤ گے؟"

"کیا؟" ادھیڑ افسر حیرت سے بولا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی لکیریں دُور ہوگئیں۔ "ٹھیک ہے۔" اُس نے خفت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔ "ہم اِس پر سوچ سکتا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ فائلیں سمیٹ کے کرسی سے اُٹھ گیا۔ اُس کے دونوں ساتھی بھی۔ "باہر ممبئی کا سارا بڑا افسر موجود ہے، ہم کو ابھی تھوڑا اُن سے بات کرنے کا ہے۔" ادھیڑ افسر نے چلتے چلتے کہا۔

"آپ سے بڑا نہیں ہوگا صاحب!"

یہ سُن کے وہ تینوں پلٹ گئے لیکن ایک لمحے کے تامّل کے بعد تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

اُن کے جانے کے بعد کمرے پر سکوت چھا گیا۔ سپاہی ابھی وہیں کھڑے تھے، بتوں کے مانند، ہم پر نظریں جمائے۔ تھل نے بیڑی سلگا لی۔ مارٹی اور ٹنگو کے ہمارے پاس آجانے کی وجہ سے وہ سب سے الگ ہوگیا تھا۔ میں نے سوچا، اُس کے پاس چلا جاؤں لیکن میں جا کے کیا کرتا، اُسے اور پریشان ہی کرتا۔ چارہ گری کا حوصلہ نہ سہی آدمی یہ تو کر سکتا ہے کہ خاموش بیٹھا رہے۔ وہ سبھی سر جھکائے چپ بیٹھے تھے، میری طرح سب کا دم گھٹ رہا ہوگا مگر غم کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے، آدمی کو خود پر یہ جبر بھی کرنا پڑتا ہے۔ چاہے اُسے اپنے وجود سے گھن آرہی ہو۔ دیدوں میں روشنی نہ ہو تو آدمی بہت کچھ دیکھنے سے محفوظ رہتا ہے۔ ہوش گم کر دینا تو بہت آسان ہے، میری طرح اتنا میرے وہم گمان میں بھی نہیں تھا جتنا تھل کی اور اُن سب کی رگوں میں کھٹک رہا تھا۔ مجھے اُن کے سامنے بہت کم مائگی، کم تری کا احساس ہو رہا تھا۔ اُنھیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا جبھی وہ مجھے یہاں لانے سے اجتناب کر رہے تھے۔ میرا سینہ اتنے بوجھ کا حوصلہ نہیں رکھتا، پر مجھے، مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

دیر تک کوئی نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے اُنھوں نے ارادہ بدل دیا ہو یا دوسرے افسروں کو قائل نہ کر پائے ہوں۔ وہ خود بھی متذبذب تھے ورنہ فیصلہ کر کے جاتے۔ اگر اُنھوں نے افسروں تک تھل کا رویّہ، اُس کا لہجہ بھی منتقل کر دیا تو وہ بھی برہم ہو سکتے ہیں۔ تھل کا رویّہ ابتدا ہی سے معتدل ہوتا، جیسا وہ کہہ رہے تھے، وہ پہلے ہی ہاں کر دیتا تو اتنی دیر نہ لگتی۔ جمرو اور شامو نے بھی دخل دے کے اُنھیں اور متوحش کیا تھا۔ اتنی باتیں کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جلد یا بدیر اُنھیں ہمارے حق میں فیصلہ کرنا تھا لیکن یہ ضروری بھی نہیں ہے۔ وہ پہروں اپنا فیصلہ ملتوی کر سکتے ہیں، ہمارے لیے ایک پہر کی تاخیر بھی پہاڑ جیسی ہے۔ تھل نے شاید اِسی خیال سے اتنی عجلت کی تھی۔ ہماری نرم روی سے اُن کے وسوسے اور تقویت پا سکتے تھے۔ ممکن ہے، تھل کے ذہن میں یہی کچھ ہو۔ اتنی ردّ و قدح کا سبب صرف ذہنی انتشار نہیں ہو سکتا۔ بہر حال افسروں کے انتظار میں کوئی بے قرار نہیں تھا، جتنا اُن کے امکان میں تھا، وہ کر چکے تھے۔

بہت دیر بعد دروازے پر اُن کی آہٹیں گونجیں۔ سپاہیوں کے جسم اکڑ گئے۔ آنے والے صرف دو تھے۔ ایک نیا افسر بھی ادھیڑ افسر کے ساتھ تھا۔ "تم جا سکتے ہو دادا!" اُس نے اندر آ کے بلند آواز میں کہا۔ سب کی نگاہیں تھل پر مرکوز ہوگئیں۔ تھل بنچ پر بیٹھا رہا۔

"سُنا تم نے! ہم کو تمھارے لیے بہت بات کرنا پڑا۔" ادھیڑ افسر نے کہا۔ "پر یاد رکھنا، ہم نے تم پر بھروسا کیا ہے۔"

تھل نے اپنا جسم سمیٹا اور کھڑا ہو گیا۔

"کچھ رہ گیا ہو تو ابھی اپنے کو بول دو؟"

"نہیں صاحب!" تھل نے زیرِ لبی سے کہا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ ہم بھی اپنی جگہوں سے اُٹھ گئے تھے۔ دروازے سے باہر سائبان میں افسروں اور سپاہیوں کا ہجوم موجود تھا۔ ہم دروازے سے نکلے تو سب کا رُخ ہماری جانب ہو گیا۔ چند ہی قدم بعد سیڑھیاں تھیں مگر ہمیں تھل کی وجہ سے ٹھیر جانا پڑا۔ تھل ہمارے نزدیک ہی ادھیڑ افسر سے جانے کیا باتیں کرنے لگا۔ ایک دو منٹ الگ

ہم اُس کے انتظار میں کھڑے تھے کہ سامنے کھڑے ہوئے پولیس افسروں کے جھنڈ میں انتشار سا ہوا، ایک افسر اپنے قریب کے افسروں کو ہٹاتا ہوا تیزی سے آگے آیا، ابھی اُس نے بے تابانہ چند ہی قدم طے کیے ہوں گے کہ میری آنکھیں دھندلا سی گئیں۔ وہ ایس پی شکلا تھا، کرشنا جی کا معتمد۔ میں نے دوسری نگاہ میں پہچان لیا تھا اور میرا جسم ایک لمحے کے لیے ڈگمگا گیا تھا۔ میں اُس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ رُک گیا۔ میرے قریب آ کے اُس کے پاؤں بھی ٹھٹک گئے تھے "تم؟ ظہیر؟" اُس نے ہیجانی آواز میں کہا۔

میں نے سر جھکا لیا۔

اُس نے میرے شانے پکڑ لیے۔ "یہ تمھی ہو؟" وہ منتشر لہجے میں بولا "تم یہاں کیسے؟ کب آئے؟"

"بہت دن ہو گئے۔" میں نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

"بہت دن ہو گئے اور مجھے نہیں معلوم؟ کسی نے مجھے نہیں بتایا۔" وہ حیرانی سے بولا "مگر یہ سب یہ سب کیا ہے؟"

مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔

"کیا؟ کیا ہوا ظہیر میاں؟ تم بھی؟" میری خاموشی پر وہ اور پریشان ہو گیا۔ "کیا بات ہے؟" وہ سراسیمگی سے شامو اور مارٹی کی طرف دیکھ کے بولا۔ "تمھارا ان سے کیا تعلق ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟"

"کیا بتاؤں؟" میں نے سسکتے ہونٹوں سے کہا "پیردادا...."

"پیردادا!" وہ دہشت سے بولا "تم بھی اسی سلسلے میں آئے ہو؟ اوہ مائی گاڈ! پیردادا سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

میں اُسے کون سا رشتہ بتاتا۔

دوسرے پولیس افسر بھی ہمارے نزدیک آ گئے۔ شکلا کی نظریں سر سے پیر تک اس طرح مجھ پر منڈلا رہی تھیں جیسے اُس کی آنکھیں دھوکا کھا رہی ہوں۔ میرے گندے پیر، سیاہ پائنچے، شکستہ کپڑے، بے ترتیب بال۔ میری یہ حالت دیکھ کے اُسے بے قرار ہو ہی جانا چاہیے تھا۔ اُس نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔ "مجھے بتاؤ ظہیر میاں! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"اِنھی سے پوچھ لیجیے۔" میں نے قریب کھڑے ہوئے نوجوان افسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انھیں سب معلوم ہے۔"

"کیا آپ اِسے جانتے ہیں؟" نوجوان افسر نے انگریزی میں شکلا سے پوچھا۔

"اِنھیں یہاں کون نہیں جانتا۔" شکلا نے میرا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ "کرشنا جی کو تم بھول گئے۔ یہ اُنھی کے ساتھ رہتے تھے۔ مستانہ کیس اِنھی کی وجہ سے .... اور پکڑا گیا۔ "کیا ظہیر میاں بھی ان لوگوں میں شامل ہیں؟"

"جی ہاں۔" نوجوان افسر نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"نہیں نہیں، تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ان لوگوں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ پاڑے کے دادا ہیں۔ پیردادا، ماچھی دادا سے ان کے گہرے مراسم رہے ہیں۔"

"کیا واقعی؟" شکلا بے یقینی کے عالم میں بولا "کیوں ظہیر! یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ شکلا کی متردد نگاہیں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ "یہ کوئی بالکل مختلف معاملہ ہے۔" وہ بے چینی سے انگریزی میں بولا۔ "کیا بات ہے ظہیر! مجھے بتاؤ؟"

"مجھ سے اِس وقت کچھ مت پوچھیے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

اُس کے چہرے پر لکیریں پڑ گئیں۔ "مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟ ٹھیک ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "میں دیکھتا ہوں تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟ جولی کے ہاں؟"

"جی۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اور اب کہاں جا رہے ہو؟"

میری نظریں تجمل کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایس پی شکلا پٹ پٹاتی پلکوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ "آپ ہی کچھ بتائیے؟" اُس نے تند لہجے میں تجمل سے پوچھا۔

"اب کوئی بات نہیں صاحب!" تجمل نے بظاہر نرمی سے کہا۔

میں نے تجمل کو بتانا چاہا کہ یہ وہی ایس پی شکلا ہے جس نے فیض آباد میں مجھے تار دیا تھا کہ ابا جان جیسے حلیے کا ایک شخص آسام میں دیکھا گیا ہے، اسی اطلاع پر تجمل نے تبت جانے کا ارادہ کیا تھا اور ابا جان مل گئے تھے۔ یہ زیادہ مدت کی بات نہیں۔ کرشنا جی کے بعد یہی تھا جو ابا جان کی ٹوہ میں لگا رہا۔ اِس نے ہندوستان کے تمام تھانوں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا مگر شاید تجمل کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ خود اُسے پہچان چکا تھا۔ اس نے شکلا کو سلام کیا، شکلا نے تپاک سے جواب دیا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ وہ پہلے مل چکے ہیں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے جولین کے گھر کبھی اُن دونوں کی ملاقات ہوئی ہو۔ اُن کے انداز سے شناسائی ظاہر ہوتی تھی۔ شکلا کے چہرے پر اضطراب چھایا ہوا تھا۔ "ابھی سب ٹھیک ہے صاحب!" تجمل نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اپنے کو جلدی جانا ہے۔"

شکلا کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا، تجمل کی آواز پر ہڑبڑا سا گیا۔ "ہاں ہاں ٹھیک ہے، آپ لوگ جائیں۔" اُس نے بے خیالی میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم بھی جا رہے ہو مگر مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

"مجھے جانے دیجیے۔" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "میں آپ سے پھر مل لوں گا۔"

"صرف چند منٹ کے لیے نہیں ٹھہر سکتے؟" وہ تکدر سے بولا۔

مجھ سے انکار کرتے نہ بن پڑا۔ "ابھی اِس کو جانے دو شکلا جی!" تجمل نے اُس کا نام لے کے کہا۔ "اس کا باپ مر گیا ہے۔"

"باپ؟" شکلا حیرت سے بولا۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ اُس کو ایسا ہی سمجھتا تھا۔"

"پیردادا کو؟"

"ہاں صاحب! وہ اِس کے لیے باوا سے بھی زیادہ تھا۔"

"پیردادا!" شکلا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ "کیوں ظہیر؟" اُس نے مجھ سے تصدیق چاہی۔ میری خاموشی پر وہ مجھے جھنجوڑنے لگا پھر اُس نے میرے شانوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔ اُسے اپنی حیثیت کا خیال آ گیا تھا یا اطراف میں کھڑے ہوئے افسروں کا۔ اُس نے لمحوں میں خود پر قابو پا لیا اور ہمارے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

چبوترے کی سیڑھیاں طے کر کے ابھی ہم تھانے کا احاطہ عبور کر رہے تھے کہ شکلا پھر لپکتا جھپکتا ہمارے پاس آیا اور تجمل سے پوچھنے لگا کہ اُسے کسی مدد کی ضرورت تو نہیں؟

"ہو سکے تو اپنے لیے سواری کا بول دو صاحب! اتنی رات کو نہیں ملے گی۔" تجمل نے اُس سے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" اُس نے پیچھے مڑ کے کسی کو اشارہ کیا۔ نوجوان افسر بھاگا ہوا آیا۔ شکلا کے استفسار پر اُس نے بتایا کہ تھانے کے باہر موٹریں کھڑی ہیں، وہ ہمیں اسپتال تک لے جائیں گی جہاں دادا اور ماچھی موجود ہیں۔ وہاں ہمیں اُن کے وارث کے طور پر دستخط کرنے ہیں۔ شکلا نے اُسے ہدایت کی کہ اسپتال سے گھر تک پہنچنے کے لیے بھی سواری ہماری تحویل میں رہنی چاہیے...

"نہیں صاحب!" تجمل بوجھل آواز میں بولا۔ "اپنے کو ابھی ماہم کے پاڑے تک جانا ہے، گھر نہیں۔"

"لیکن یہ لوگ بتا رہے تھے کہ دادا کا تو اپنا گھر ہے۔" شکلا نے تجسس سے کہا۔

"ایک دم اُن کے سامنے کیسے لے جائیں۔"

"ہاں۔" شکلا نے تاسف سے تجمل کو مشورہ دیا کہ ایسا ہی ہے تو پیردادا کو ابھی اسپتال ہی میں رہنے دیا جائے اور بہتر ہے کہ پہلے ہم گھر ہو آئیں۔

"پاڑے بھی تو اُس کو جانا ہے، وہ بھی اُس کا گھر ہے۔"

"لیکن پاڑے کے لوگ بھڑک سکتے ہیں۔"

"نہیں لے جائیں گے تو اور فیل مچائیں گے صاحب!"

شکلا نے سر ہلا کے تائید کی اور مجھ سے کہنے لگا کہ اُس کی موٹر موجود ہے، ضرورت ہو تو میں لے سکتا ہوں، ڈرائیور بھی ساتھ ہے۔ میں سوچتا رہا کہ کیا جواب دوں، میں نے تجمل کی طرف دیکھا، اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ضرورت ہو گی تو ضرور اُسے زحمت دی جائے گی۔ شکلا اور نوجوان افسر ہمارے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ تھانے کی چار دیواری کے باہر تجمل کچھ فاصلے پر ہو گیا تھا۔ شکلا نے پہلو سے میرا ہاتھ تھام لیا اور بھن بھناتے لہجے میں بولا۔ "ظہیر! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے پہلے سے بتا دو؟"

"کیسی بات؟" میں نے بپھر کے کہا۔ "کوئی ایسی بات نہیں۔"

"مجھ پر اعتبار کرتے ہو نا؟"

"آپ بھی اُنھی جیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"پھر یہ سب کیا ہے ظہیر! میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔"

"میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا، یہ کیا ہو گیا۔"

"پیردادا سے تمھارا کیسا تعلق تھا؟"

"وہ میرا...." میری زبان لکنت کرنے لگی۔ "کیا بتاؤں۔ بہت لمبی داستان ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں۔"

"تم کہہ رہے ہو تو یقیناً نہیں ہو گی مگر کسی وقت کسی طرف سے بھی کوئی اندیشہ محسوس کرو تو دیر نہ کرنا۔" اُس نے مجھے متنبہ کیا کہ پیردادا بمبئی کا بہت بڑا دادا تھا، پولیس نے اِس واقعے کی سنگینی کا شدت سے نوٹس لیا ہے، ہیڈ کوارٹر کے حکم پر سارے شہر کی پولیس حرکت میں آ گئی ہے اور جگہ جگہ چھاپے مارنے کا ارادہ کر رہی ہے، پیردادا سے قربت کی وجہ سے میں بھی زد پہ آ سکتا ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ پولیس کی کارروائیاں اپنے انداز کی ہوتی ہیں، یہ تو میں جانتا ہی ہوں گا، پولیس کی رائے میں یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہو گا۔

میں سنتا رہا، میں نے کچھ نہیں کہا۔

"اتنے دنوں تک تم آئے کیوں نہیں؟ کیا کرتے رہے؟"

"فرصت ہی نہیں ملی، خیال تھا کہ کسی دن شاید آپ ہی آ جائیں۔"

"پچھلے دو مہینے میں کئی بار بمبئی سے باہر جانا ہوا۔" موٹریں قریب آجانے پر اُس کی سرگوشیاں بند ہوگئیں۔ بُجھل ابھی باہر کھڑا تھا۔ شُکلا نے اپنے ہاتھوں میں اُس کے ہاتھ جکڑ لیے اور معذرتی انداز میں بولا "مجھے علم نہیں تھا کہ ظہیر میاں بھی یہاں ہیں ورنہ ویسے بھی مجھے پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی ورنہ اتنا وقت نہ لگتا۔"

"اچھا ہوا جو آپ دیر سے آئے۔"

"کیوں؟" شُکلا چونک پڑا "یہ کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟"

"آپ اِدھر اکیلے تو نہیں ہو صاحب!" بُجھل نے چبھتی آواز میں کہا "اپنے کو جان کاری میں اتنی دیر تو لگتی۔"

شُکلا کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ میری طرح وہ بھی بُجھل کا مقصد نہیں سمجھ پایا تھا تاہم اُس نے تشریح نہیں چاہی، خوش اطواری سے بولا "پولیس کو کبھی کبھی اپنے آپ سے بھی ضد کرنی پڑتی ہے۔ اپنی مرضی کے خلاف چلنا پڑتا ہے۔ پولیس کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ میں ان کی جگہ ہوتا تو شاید مجھے بھی وقت لگتا۔ ہاں ظہیر کا سامنا ہونے پر صورت یقیناً مختلف ہوتی۔ مجھے معلوم ہے کہ ظہیر کم از کم پیچھے سے وار نہیں کر سکتا اور نہ اِس کے ساتھی ایسے ہو سکتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اِن میں کسی نے ظہیر کو نہیں پہچانا۔ یہ ایسا بدل بھی نہیں گئے۔ کرشنا جی کو گزرے بھی اتنا زمانہ نہیں ہوا کہ کوئی اُنھیں بھول جائے اور اُن کے محبوب ظہیر کو بھول جائے۔ یہ اشارہ بھی کر دیتے تو اُن سب کی مشکل بھی حل ہو جاتی، آپ کی بھی، بہرحال....."

"ہم پاڑے کے آدمی ہیں شُکلا جی! اپنا بوجھ ساتھ لے کے چلتے ہیں۔ آپ اِس کی وجہ سے ہم کو تھوڑا چھوٹ دیتے تو ہم منع بول دیتے۔ یہ کسی کا نام لیتا تو ہم اِس کو باہر کر دیتے۔"

"یہ اچھی بات ہے۔" میری توقع کے خلاف شُکلا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"اپنی بنتی ہے آگے بھی آپ کوئی ٹیکی مت لگانا، کندھے کا اُدھار ہم کو راس نہیں آتا۔"

"اوہ! ویری گڈ۔" شُکلا اُچھل کے بولا۔

یہ کچھ کہنے کا کیا محل تھا۔ شُکلا تو ہمارے لیے کہہ رہا تھا اِس سے پہلے کہ بُجھل کی زبان سے کچھ اور نکلتا۔ میں نے اُسے کہنی مار کے اندر بیٹھ جانے کی التجا کی۔ اندر نشست پر بیٹھتے ہوئے بُجھل شُکلا کو سلام کرنا نہیں بھولا۔ وہ سب اندر چلے گئے تو میں نے بھی جانا چاہا۔ شُکلا نے میری کلائی پکڑ لی "اپنا خیال رکھنا۔" اُس نے مرتعش آواز میں کہا "میں اِسی شہر میں ہوں۔"

میری رگیں کھنچنے لگی تھیں۔ میں جلدی سے اندر چلا آیا۔

❀ اسپتال کے دروازے پر زورا، گلیا، لچھمی اور چھیدا ہم [illegible] کے دھاڑیں مارنے لگے۔ اسپتال سے پاڑے تک سارے را[illegible] وہ منہ نوچتے، سینہ پیٹتے رہے۔ پاڑے کے علاقے میں جگہ جگہ گشت کر رہے تھے اور ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ مکانو[ں] کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے ہوئے تھے جیسے ہر گھر میں کوئی م[ر گیا] ہو۔ موٹریں پاڑے کی عمارت کے قریب پہنچیں تو ہر سُو شور م[چ گیا]۔ جب تک موٹریں پاڑے کے دروازے پر ٹھیر نہیں گئیں، لوگ [ساتھ] ساتھ بھاگتے رہے۔ موٹر سے اُتار کے وہ اُنھیں اپنے کندھوں پر [اندر] میں لائے۔ دیکھتے دیکھتے عمارت میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی [لوگ] بھی اندر گھس آئے تھے۔ دونوں کو اُسی تخت پر لِٹا دیا گیا تھا جہ[اں] ایک پہر پہلے وہ دندنایا کرتے تھے۔ زورا، چھیدا اور نہ جانے کو[ن] کون لوگوں سے بار بار خاموش ہو جانے کی منتیں کر رہے تھے۔ بھر کے لیے سناٹا چھانا، پھر وہی شور اُٹھنے لگتا۔ میں نے بس ایک [نظر] اُنھیں ایک دوسرے کے قریب پڑے دیکھا۔ جب وہ اُن کے چہ[روں] سے چادر ہٹانے لگے تو میں وہاں سے ہٹ آیا اور ایک کونے م[یں] کے بیٹھ گیا۔ اُن کی سسکتی بلکتی آوازیں سُن سُن کے میرا جسم [سُن] ہو گیا تھا۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا کہ شامو میرے پاس آگیا او[ر] منانے ہوئے بولا کہ میں یوں چھپ کے کہاں بیٹھ گیا ہوں [؟] سارے میں مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" میں نے چڑ کے کہا "میں کدھر جاتا، میری [فکر] مت کرو۔"

"استاد بلاتے ہیں لاڈلے!" وہ تلخی سے بولا۔

"مجھے یہیں رہنے دو، کہہ دو کہ نہیں ملا۔"

"کیا بولتا ہے؟" اُس نے میرے بال پکڑ لیے۔

"میں یہاں ٹھیک ہوں شامو بھائی!"

"میں بولتا ہوں، اُستاد نے پوچھا ہے۔"

"کیا بات ہے؟"

"اُسی سے جا کے پتہ کرنا، چل اُٹھ۔" اُس نے جھٹکے سے کھینچ کے اُٹھا لیا۔ چوکی کے اطراف لوگوں کا ازدحام تھا۔ ہم [ان] کے درمیان سے گزرتے ہوئے اندر کمرے میں چلے آئے۔ بُجھل [دادا] کے خاص کمرے میں بیٹھا تھا "کیا ہے رے! کدھر کھو گیا تھا؟" وہ [اُچھ]ل کے بولا۔

"کہاں جاتا، یہیں تھا۔"

"چلنا ہے ابھی....."

"کہاں؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"چلنا ہے رے۔"

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کہاں جانے کو کہہ رہا ہے "میں [نہ]یں جاؤں گا، خدا کے لیے مجھے مت لے جاؤ۔" میں نے بہت [ا]لتجا کی۔

اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں "چل رے! وہ اپنا نہیں تو تیرا [ہ]ی تھوڑا خیال کریں گی۔"

"وہ کسی کا خیال نہیں کریں گی۔"

"کوئی نہ جائے پھر؟" وہ غصے سے بولا اور اُٹھ کے میری کمر تھپکتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔ وہاں جانے کے خیال سے میری ٹانگیں لپکپانے لگیں۔ شامو نے مجھے آگے کی جانب دھکیلا، میں چوکھٹ سے ٹھوکر کھاتے کھاتے بچا۔ گلیا نے عقبی دروازہ کھول دیا تھا، ہمیں دوبارہ ہجوم کی طرف نہیں جانا پڑا۔ پچھواڑے ٹُم ٹُم کھڑی تھی۔ ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہیں بیٹھا۔ اِس طرف بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ دُور جا کے ٹُم ٹُم کی رفتار تیز ہوگئی، سڑکیں بھی سنسان ہوگئی تھیں۔ بُجھل گم سم بیٹھا رہا۔ ابھی ہم نے آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ اندھیرا ٹوٹنے لگا لیکن روشنی اُجالا تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ جیسے جیسے دادا کا گھر قریب آ رہا تھا، مجھے ہر شے گھومتی سی نظر آ رہی تھی، جیسے کوئی مسلسل میری جان کھینچ رہا ہو۔

مکان پر سکوت طاری تھا۔ میں رات ہی کوئی دس گیارہ بجے کے درمیان یہاں آیا تھا۔ اِس وقت پانچ بج رہے ہوں گے۔ چند گھنٹوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ رات اُن کے چہروں پر کیسی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ بات بات پر کھِلی جاتی تھیں۔ کیا معلوم تھا کہ چند گھنٹوں بعد مجھے یہاں پھر آنا پڑے گا اور صبح کے ساتھ میں اُن کے لیے اندھیرا لے کے آؤں گا۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ٹُم ٹُم ٹھیرتے ہی بُجھل اُتر گیا۔ اُس کی دستکوں پر دیر سے دروازہ کھُلا اور بندوق بردار گورکھا چوکی دار اندر سے برآمد ہوا۔ وہ آنکھیں مَلتا ہوا آیا تھا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کا جسم بل کھانے لگا "اندر جا کے بول، ہم آئے ہیں۔" بُجھل نے اُسے پوری طرح آنکھیں کھولنے کی مہلت بھی نہیں دی۔

وہ بوکھلا گیا "کیا ہے مالک! سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں رے! دیری مت کر۔" بُجھل نے اُلجھی ہوئی آواز میں کہا۔

چوکیدار گُنگ کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ اُس کی پیشانی ایک پل کے لیے سمٹ گئی؟ وہ فوراً دروازے سے ہٹ گیا "ابھی سب سوتا ہے۔" وہ اضطراب سے بولا۔

"اٹھا دے رے اُن کو۔" بُجھل نے حکیمہ لہجے میں کہا۔

"مالک کو پوچھتا ہے آپ؟" اندر جاتے جاتے اُس نے رُک کے پوچھا۔

"نہیں رے!" بُجھل نے درشتی سے کہا "گھر میں جا کے بول۔"

سامنے کے مختصر سبزہ زار سے ملحق ساری کوٹھی لوہے کی جالیوں میں محصور تھی۔ چوکیدار نے عمارت کے ستون میں نصب گھنٹی بجائی۔ اندر سے پیرو دادا کے خاص آدمی شبّی چاچا کی دھمکتی آواز سنائی دی "کون ہے گورے! کیا ہے؟"

چوکی دار ابھی جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ شبّی چاچا ہمارے سامنے آگیا۔ وہ بنڈی اور لنگی پہنے ہوئے تھا۔ کہنے کو وہ ملازم تھا لیکن اُسے گھر کے نگران کی حیثیت حاصل تھی۔ عمر میں بھی وہ پیرو سے بڑا تھا۔ گٹھا ہوا جسم، گندمیں رنگت، درمیانہ قد۔ اپنی وضع قطع سے بھی وہ گھر ہی کا کوئی فرد لگتا تھا۔ پیرو سے اُس کی شناسائی بہت پرانی تھی لیکن گھر میں آمد و رفت گیتا کے ہوش سنبھالنے پر ہوئی۔ گیتا کو سب سے پہلے اُسی نے پڑھانا شروع کیا تھا۔ پیرو کی رائے میں کسی جلاؤنے کے سبب اُس نے اپنے شہر سے بھاگ کے بمبئی کے جنگل میں پناہ لی تھی، اپنے بارے میں اُس نے نہ کبھی کچھ بتایا تھا، نہ پیرو نے جاننے کی کوشش کی تھی۔ پیرو کو شبہ تھا کہ اُس کا اصل نام شبّیر خاں ہے بھی کہ نہیں۔ بہت دنوں بعد پیرو کو معلوم ہو سکا کہ اُس کا تعلق ریاست رام پور سے ہے۔ پیرو کے اصرار پر وہ یہیں رہنے لگا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ گھر کی دیکھ بھال کے سوا اُس کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ گھر سے بھی وہ صرف ضرورت کے وقت نکلتا تھا۔ سارا حساب اُس کے ذمے تھا اور گھر کے دوسرے ملازم اُس کے سامنے جواب دہ تھے۔ پیرو اُسے بڑے بھائی کا درجہ دیتا تھا۔ رانی اور گیتا بھی اُسے بھائی اور چاچا کہتی تھیں لیکن شبّی چاچا ہر جگہ خود کو پیرو کا ملازم کہتا اور ایک مالک کی طرح پیرو کا احترام کرتا۔ گھر میں اتنا شامل ہونے کے باوجود سب سے الگ تھلگ رہتا، ضرورت پر سامنے آتا۔ وہ کوٹھی کے ایک کونے میں ملازموں کے لیے بنے ہوئے حصے میں رہتا تھا، البتہ

پیرو کی عدم موجودی میں اندر آجاتا۔ پیرو کے بارے میں اُسے سب کچھ معلوم تھا۔ پیرو کے بہ قول شتی چاچا پاڑے اور اُس کے گھر کے درمیان ایک پردے اور دیوار کے مانند تھا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ بے چین ہوگیا۔ "کون؟ کون؟ تھل بھائی آئے ہیں۔ اتنے سویرے سویرے؟ خیر تو ہے؟" اُس نے جالیوں کے درمیان بنے ہوئے دروازے کا تالا بہ عجلت کھول دیا۔ تھل وہیں پڑی ہوئی بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"خدانخواستہ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اتنے سویرے کیسے آنا ہوا؟" شتی چاچا نے ٹھنکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آنا بھی بس کا نہیں ہوتا شتی میاں!" تھل نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ "اُن دونوں کو اٹھا دے۔"

"کنھیں؟" شتی چاچا سٹ پٹا کے بولا۔ "بہو رانی اور بٹیا کو؟"

"اُنھی کو بولتے ہیں۔"

"کیا بات ہے تھل بھائی! خدا خیر کرے، سب خیریت ہے نا؟" شتی کے چہرے پر دہشت سی طاری ہوگئی۔ اتنی عمر میں آواز اور چہرے پہچاننا اُسے خوب آگیا ہوگا۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں پیرو کے بارے میں پوچھنے لگا کہ وہ کہاں ہے؟

"اُن کے سامنے ہی جان لینا، کدھر ہے وہ۔ اُن کو ابھی اٹھا دو شتی میاں!"

"کیا ہوا، ایسی کیا بات ہے؟" وہ بدحواسی سے بولا۔ "مجھے کیوں نہیں بتاتے آپ؟"

"بتانے کے لیے آئے ہیں۔" تھل نے اُسے جھڑک دیا۔ شتی چاچا دم بخود ہو کے تھل کی صورت تکتا رہا، پھر مزید استفسار کیے بغیر اندر کی طرف دوڑ پڑا۔ چند لمحوں بعد اندر سے دروازہ دھڑدھڑانے کی آواز آئی۔ دروازہ جلد ہی کھل گیا تھا۔ شتی چاچا کی چیخ پکار بند ہوگئی۔ پھر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ اُس نے اُن دونوں کو جانے کیا بتایا تھا مگر شاید کچھ زیادہ نہیں کیونکہ وہ فوراً واپس آگیا۔ آتے آتے اُس نے بیرونی کمرے کا دروازہ کھول دیا، کمرہ روشن کر دیا اور پردے ہٹا کے کھڑکیاں کھول دیں۔ کانتے کے چلے جانے کے بعد تھل نے اِس کمرے میں کئی دن گزارے تھے۔

ہمیں وہاں پہنچے چار پانچ منٹ ہی گزرے ہوں کہ رانی اور گیتا جھپٹتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ ہم دونوں کھڑے ہوگئے۔ گیتا نے آتے ہی دہشت زدہ آواز میں اپنے باپ کے بارے میں پوچھا۔ تھل نے ہاتھ پھیلا کے اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ میری رگوں میں خون جم گیا تھا۔ تھل نے رانی کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑا رہا۔ جانے کتنے لمحے گزر گئے، وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ گیتا نے اُسے اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ کچھ دیر اپنی سانسیں استوار کر سکے اور الفاظ ڈھونڈ سکے جو کبھی بہت حقیر ہو جاتے ہیں، بالکل بے جان، پتھر جیسے۔ گیتا نے اضطراری لہجے میں تھل سے دوبارہ پوچھا۔ "پاپا کدھر ہیں؟"

"اِدھر ہی ہے بٹیا، اِدھر ہی۔" تھل کی زبان اکڑ گئی تھی۔

گیتا کو یقین نہیں آیا۔ ایسی بچی نہیں تھی وہ۔ تھل کے بازو سے نکل کے وہ اُس کا چہرہ دیکھنے لگی پھر اُس نے پلٹ کے بے تابانہ مجھے دیکھا۔ تھل کی طرح میری نظریں بھی جھک گئیں۔ میرا تو سارا جسم اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ "پھر آپ....." وہ اٹکتی بہکتی آواز میں بولی۔ "یہ شتی چاچا.....؟"

"یہ بھی ٹھیک بولتے ہیں۔" تھل نے پھڑپھڑاتے ہونٹوں سے کہا۔

"کیا! کیا ہوا اُن کو....؟" رانی کی چیخ نکل گئی۔ تھل پتھر ہوگیا تھا۔ گیتا دیوانہ وار اُسے جھنجوڑنے لگی۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن مجھ سے وہاں نہ ٹھیرا جا سکا۔ اِس سے پہلے کہ وہ میرا گریبان پکڑ لیتیں میں کمرے سے بھاگ آیا۔ میرے قدم مجھے مکان کے دروازے تک لے آئے تھے اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہاں جانا چاہیے، کون سی کھوہ میں۔ دروازہ بند تھا اور چوکی دار موجود تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا تھا لیکن مجھ سے آگے بھی نہ جایا جا سکا۔ پیچھے سے شتی چاچا بھاگتا ہوا میرے پاس آگیا اور مجھے اپنے پہلو میں دبوچے اندر لے آیا۔ میرا اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں رہا تھا مگر دوبارہ اندر جانے کے خیال سے میرا دم پھر نکلنے لگا۔ شتی چاچا کی آنکھیں اُمڈ رہی تھیں۔ وہ اُلٹا مجھے تھپکیاں دینے لگا۔ میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔ وہ بھی نہیں رکا، مجھے وہاں چھوڑ کے سامنے کے بیرونی کمرے میں چلا گیا۔ وہ بین کر رہی تھیں، اُن کی چیخوں اور کراہوں کی صدائیں برآمدے تک آرہی تھیں۔ تھل کی گھٹی گھٹی آوازیں بھی اُن میں شامل تھیں۔ اُسے میں نے اکیلا چھوڑ دیا ہے، یہ احساس مجھے اور ہلکان اور ناتواں کر رہا تھا۔ میں اندر نہیں گیا۔ اتنی دیر میں باہر سے موٹر کا ہارن بجا۔ چوکی دار نے دروازہ کھولا تو منیر علی اور ابا جان اندر داخل ہوئے۔ فرخ اور فریال بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ سب ہانپتے کانپتے سیدھے میری طرف آئے تھے اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے تھے۔ میں کیا جواب دیتا۔ برآمدے میں گونجتی ہوئی رانی اور گیتا کی سسکیاں اُنھوں نے بھی سُن لی ہوں گی۔ پھر وہ میرے پاس نہیں ٹھیرے۔ اچھا ہوا جو وہ آگئے، مجھے ایک دم چھاؤں کا سا احساس ہوا۔ تھل اب اکیلا نہیں رہا تھا۔ ابا جان اور منیر علی کی آمد پر اُن کی آہ و بکا کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اُنھوں نے ایسا گریہ کیا کہ آدمی تو آدمی، در و دیوار دہل جائیں۔

دھوپ ابھی نہیں نکلی تھی مگر اندھیرا ختم ہوگیا تھا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ شتی چاچا اور گھر کے ملازم سسکتے بلکتے کئی بار میرے سامنے سے گزرے، کوئی بھی میرے پاس نہیں آیا۔ پھر بیرونی کمرے سے یکایک تھل نمودار ہوا۔ اُسے دیکھ کے میں ہڑبڑا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے مقابل آکے ٹھیر گیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "چلا آیا رے!" میرے ہونٹ سسک کے رہ گئے۔

"ابھی پاڑے جا کے اُن کو لانا ہے۔" اُس نے بکھری بکھری آواز میں کہا۔ "اِدھر کا دھیان رکھنا۔"

"میں بھی چلتا ہوں، یہاں ابا جان ہیں۔"

"ابھی اِدھر ہی رہ۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اِدھر تیری ضرورت ہے، تجھ پہ مان کرتی ہیں وہ۔"

"مگر مجھ سے، مجھ سے یہ سب....."

"پہلی بار تھوڑی دیکھ رہا ہے۔"

"مگر کوئی کتنی بار دیکھ سکتا ہے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "تمھاری بات اور ہے۔"

"ہاں رے! ٹھیک بولتا ہے۔"

"تم کہو تو میں پاڑے چلا جاتا ہوں۔"

"اُدھر کوئی اور ہیں کیا؟....."

"مگر یہاں مجھ سے اُن کے سامنے نہیں جایا جاتا۔"

اُس نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔ میرے تن بدن میں ایسا شور اُٹھا کہ پھر کچھ بھی خیال نہ رہا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ "نا نا، نہیں رے نہیں، ایسا کیسے چلے گا۔ تو بھی ڈھیر ہو جائے گا تو....." باہر سے ہارن کی آواز آنے پر وہ سیدھا ہوگیا۔ "موٹر آگئی ہے۔ میں چلتا ہوں، ابھی اندر جا کے بیٹھ تو ٹھیک ہے۔" میرے شانے دباتا وہ میرے پاس سے چلا گیا۔ موٹر جولین، اُس کی ماں، چمپا بیگم اور شہ پارہ کو لے کے آئی تھی۔ اُنھوں نے سیڑھیوں پر تھل کو روک لیا لیکن وہ اُن کے پاس نہیں ٹھیرا، آگے بڑھ گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی مجھ تک پہنچ گئیں۔ میرا سارا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ وہ یقیناً مجھ سے کچھ پوچھنا، کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ میں نے بیرونی کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ یکایک میرے سینے میں وہی آگ بھڑکی۔ تھل دروازے تک چلا گیا تھا۔ اُن چاروں کو وہیں چھوڑ کے میں نے تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں طے کیں۔ میری آواز پر تھل ٹھیر گیا۔ میں نے اُس کے پاس جا کے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ اُس کا دھیان کس طرف جاتا ہے؟

"کاہے کا دھیان؟" وہ چونک کے بولا۔

"یہی کہ وہ کون، کون ہو سکتا ہے؟"

"تو بھی وردی والوں کی طرح بولتا ہے۔"

"تم نے کچھ سوچا تو ہوگا، کسی طرف ضرور تمھارا....."

"بیٹھ جا اندر جا کے۔" وہ اُلجھ کے بولا۔

"تم کو کچھ شبہ ہو تو مجھے بتاؤ؟ دادا کی ارتھی اُس سے پہلے نہیں اُٹھنی چاہیے؟"

"پھر دادا لوٹ آئے گا؟"

"دادا تو کبھی نہیں لوٹے گا۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "تمھارا کیا مطلب ہے، کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے؟ پھر تو کبھی کسی طرف جانے کی ضرورت نہیں، تمھیں اس طرح چین آجائے گا؟"

"ایک وقت میں ایک ہی طرف کا پورا دکھائی دیتا ہے رے! دیکھیں گے اس کو بھی۔"

"تم اِس طرف دیکھو، میں جاتا ہوں، میں ایسے نہیں لوٹوں گا۔"

"پتہ ہے اپنے کو۔" وہ غصے سے بولا۔ "اِدھر کوئی تیرا جوڑی دار نہیں ہے۔ بڑا اُستم ہے تو۔ کلنٹے کا پکّا، تھوڑی دیر کا بھی اُدھار نہیں رکھتا۔"

"تم ٹھیک طرح بات کیوں نہیں کر رہے؟"

"جا تو ہی سیکھا ہے تو نے بس۔" وہ تمتمائی آواز میں بولا اور منہ پھیر کے سیدھا موٹر میں جا بیٹھا۔ میں دروازے پر کھڑا دیکھتا رہا۔ اُس کے بیٹھتے ہی موٹر روانہ ہوگئی۔ گو میں اندر لوٹ آیا تھا، اِس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ تھل میری آنکھیں اور دُھندلا گیا۔ میں اُسی وقت نکل جاتا مگر میں کون سی گلی، کون سے کوچے کا رُخ کرتا۔ میں نے تھل کی تائید یا اُس کی اجازت کے لیے اُس سے بات نہیں کی تھی۔ مجھے اپنے سر میں گونجنے والے مبہم اور مجہول شکوک کی تصدیق مطلوب تھی، یوں شاید مجھے کوئی اشارہ مل جاتا۔ ظاہر ہے تھل بھی کسی سمت کا تعین نہیں کر پایا تھا اِسی لیے مجھے تحمل کا درس دے رہا تھا ورنہ خود اُسے اتنا وقت گوارا نہ ہوتا یا کوئی اور بات ہے؟ وہ محض مجھے روکنے کے لیے تو ابھی سب کچھ خود تک محدود رکھنا نہیں چاہتا؟ نہیں، میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اُس پر تو ایک ایک لمحہ عذاب کے مانند گزر رہا ہوگا۔

دھوپ پھیلنے کے ساتھ ساتھ گھر میں پڑوسیوں کی آمد شروع ہوگئی۔ شتی چاچا نے سبزے پر شامیانہ لگوا دیا تھا۔ عمارت کے

اندر اور باہر دریاں اور سفید چادریں بچھا دی گئی تھیں۔ ابا جان اور منیر علی بھی شتی چاچا کے ساتھ مصروف تھے۔ میں ایک کونے میں سبزے پر بچھی ہوئی دری پہ آ بیٹھا۔ ابا جان اور منیر علی کئی بار میرے پاس آئے اور گپ چپ بیٹھے رہے۔ نہ کچھ وہ کہہ پاتے تھے، نہ مجھ سے کچھ کہا جاتا تھا۔ اُن کی سمجھ میں کچھ اور نہ آیا تو وہ مجھے کچھ دیر کے لیے کسی کمرے میں جاکے کمر ٹکانے کو کہنے لگے۔ میرے چلیے کی طرف بھی انھوں نے اشارہ کیا۔ پھر جولین مجھے برآمدے کی جالیوں میں دکھائی دی۔ وہ مجھی کو بلا رہی تھی۔ میں اُٹھ کے اُس کے پاس پہنچا، وہ میرا ہاتھ پکڑ کے اندر ایک کمرے میں لے گئی۔ یہ گیتا کا کمرہ تھا۔ یہاں فرخ بھی تھی۔ دونوں کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ جولین نے بھیگی ہوئی تولیا میرے سامنے رکھ دی۔ میرا کچھ جی نہیں چاہتا تھا لیکن نہ انکار کی ہمت تھی، نہ اِس کا کوئی جواز تھا۔ مجھے یاد ہے، کانتے کے وقت پیرو دادا نے کہا تھا کہ زندوں سے بھی تیرا کچھ واسطہ ہے۔ جولین کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں اگر کوئی تماشا بنا ہوا تھا تو یہ اچھا نہیں تھا۔ جولین اور فرخ کو میری فکر سے زیادہ گیتا اور رانی کی نگہ داشت کرنی چاہیے تھی۔ تولیا ایک طرف رکھ کے میں غسل خانے چلا گیا۔ پاجامے کے پائنچوں پر پانی انڈیلنے سے کیچڑ کے دھبے بڑی حد تک مٹ گئے۔

میں باہر آیا تو فرخ چائے کی پیالی لے آئی۔ میں نے کوئی پس و پیش نہیں کی اور چند گھونٹوں میں چائے حلق میں لوٹ لی۔ غم کی تازگی کے لیے توانائی بھی ضروری ہے۔ وہ دونوں میرے ساتھ باہر نکلیں۔ میں برآمدے کی طرف جانے کے بجائے اُن کے ساتھ بیرونی کمرے میں داخل ہوا۔ شہ پارہ، چمپا بیگم، جولین کی ماں، فریال اور پڑوس کی عورتوں کے درمیان رانی اور گیتا بتوں کی طرح بے سُدھ بیٹھی تھیں۔ بکھرے ہوئے بال، ویران آنکھیں۔ آدمی ایسے شیشے کے بنے ہوتے ہیں۔ اتنی دیر میں وہ ایسی اُجڑ گئیں کہ پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ کسی لمحے گیتا نے بھی دروازے کے قریب مجھے کھڑے دیکھ لیا، اُس کے بدن میں کوئی تلاطم سا اٹھا۔ جس بات کے تصور سے میرا دل ڈوبنے لگتا تھا، وہی ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے، جیسے کسی بچے سے کوئی چیز چھین لی جائے اور وہ حسرت و بے بسی سے منہ بسورنے لگے۔ یہی اُس کا حال ہوا۔ وہ میرے پاس آنا چاہتی تھی یا مجھے بلانا۔ دوسرے ہی لمحے وہ وہیں ڈھیر ہو گئی اور گھٹنوں میں سر دیے بلکنے لگی، چمپا بیگم نے اُس کا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ پھر میں ایک لحظے کے لیے بھی وہاں نہیں ٹھہرا لیکن باہر آ کے میری نگاہیں اُسی کو دیکھتی رہیں، اُسی کے گرد منڈلاتی رہیں۔

گیارہ بج رہے تھے جب موٹروں اور ٹم ٹموں کا شور بلند ہوا۔ پھر چند منٹوں میں اندر باہر ہر جگہ سارا مکان پاڑے کے آدمیوں سے بھر گیا۔ دادا کی چارپائی بیرونی کمرے میں رکھی گئی۔ تو وہ پاگلوں کی طرح واویلا کرنے لگیں۔ کوئی اُنھیں خاموش بھی کیا کرتا۔ اُن کا حال دیکھ کے سب کے ہوش گم ہوئے جا رہے تھے۔ کسی کو ہنستا دیکھ کے آدمی کو اتنی خوشی نہیں ہوتی، جتنا روتا دیکھ کے دل کٹتا ہے۔ سبھی بے حال تھے۔ زورا، چھیدا، گلیا، جھبی، جمرو، شامو، مارٹی، ٹنگو، دینا دادا اور پاڑے کے آدمیوں میں جانے کون کون مجھے ڈھونڈتے ہوئے میری طرف آ نکلے تھے اور میرے ہی گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ گلے مل مل کے روتے، اپنے آپ کو طمانچے مارتے، سر پیٹنے لگتے۔ کوئی کسی کو سنبھالتا اور خود بکھر جاتا۔ تجمل کے ساتھ آنے والوں کے بعد بھی لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ مکان کے باہر ساری گلی اُن سے گھر گئی تھی۔ اُن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ لگتا تھا، ماہم کا سارا علاقہ اُٹھ کے آ گیا ہے۔ چند ہی لوگ میرے صورت آشنا تھے۔ پھر یکایک جارجی میرے سامنے آگیا، اُسے دیکھ کے مجھے جھٹکا سا لگا مگر وہ خود بہت کھنڈر معلوم ہو رہا تھا۔ سارا چہرہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا، لال انگارا آنکھیں، ڈھلکے ہوئے شانے، مڑا تڑا جسم۔ وہ میرے سینے سے آ کے لگ گیا اور بُری طرح بلکنے لگا۔ مارٹی نے اُسے ہٹایا اور تشفی دلاسے دے کے ایک طرف بٹھا دیا۔ اُس کی بیوی ماری بھی چند لمحوں کے لیے مجھے نظر آئی، سڑک پر بیٹھی ہوئی کسی باؤلی بھکارن کی طرح، کوئی ذرا چھیڑے تو کاٹ کھائے۔ نہ اپنی خبر، نہ دوسرے کی، جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھی، معلوم ہوتا تھا، ویسے ہی اُٹھ کے چلی آئی ہے۔

مکان کے اندرونی حصے کے ایک گوشے میں سُکڑا سمٹا ایس پی شکلا بھی مجھے دکھائی دیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ اُس کے ساتھ یقیناً اور پولیس والے بھی ہوں گے۔ شکلا میرے پاس نہیں آیا، دُور دُور کھڑا رہا لیکن اُس کی نظریں مسلسل مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔

گیارہ بجے وہ دادا کو لائے تھے، تین بجے تک انھوں نے بنا سنوار کے اُسے پھولوں میں چھپا دیا۔ اُس کی ارتھی اُٹھی تو [illegible]اور رانی دیوانوں کی طرح چیختی بلبلاتی باہر نکل آئیں۔ جولین، [illegible]پارہ اور چمپا بیگم نے اُنھیں جکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ [illegible]ڑیں کھا رہی تھیں۔ دیوانگی کی طاقت ہی اور ہوتی ہے، گیتا [illegible]ی سے چمٹ گئی۔ تجمل، منیر علی اور شتی چاچا نے جا کے اُسے [illegible]بے بس کر دیا۔ تجمل اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹے جانے [illegible]کیا کہتا رہا۔ گیتا زار و قطار رو رہی تھی جیسے بس آنسوؤں میں [illegible]ل ہو جائے گی۔ تجمل کے اشارے پر وہ جلد ہی دادا کو گھر سے [illegible]لے گئے۔ گلی کے بیچ میں ایک چوکی پر ارتھی رکھ دی گئی اور [illegible]وں سے منت کی گئی کہ جسے دادا کا ویدن کرنا ہو، قطار میں آ[illegible]ئے اور آگے بڑھتا رہے۔ کوئی زور زور سے بار بار اِس قسم کے [illegible]لانات کر رہا تھا مگر سب بہرے ہو گئے تھے۔ کوئی سامنے سے [illegible]نہیں چاہتا تھا، کوئی دادا کے لیے پھول لایا تھا، کوئی گلاب [illegible]ں سے گلاب چھڑکتا، کوئی پھول بکھیرتا، کوئی بس ٹکٹکی باندھے [illegible]کھا رہتا۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس کچھ عورتیں گھر کے اندر نہیں [illegible]ی تھیں، وہ فارس روڈ کی عورتیں ہوں گی۔ وہ رنگ برنگی چنریاں، دوپٹے لے کے آئی تھیں۔ دادا کی ارتھی پر وہ اُنھیں پھیلاتی سجاتی رہیں۔ میں نے اب تک اُس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا اور نہ مجھے اِس نظارے کی حسرت تھی۔ ایک ہی رات کی تو بات تھی، میرے سینے میں اُس کا مسکراتا چہرہ نقش تھا، آدمی زندہ چہرے ہی سینے میں کیوں محفوظ نہ رکھے۔ میں اُس کے قریب نہیں گیا لیکن جمرو، شامو اور مارٹی مجھے گھسیٹتے ہوئے وہاں لے گئے۔ وہ پھولوں کے درمیان جیسے پلکیں موندے کسی سوچ میں گم تھا، جیسے ابھی کسی آہٹ پر آنکھیں کھول دے گا مگر اتنی صداؤں اور دستکوں کے باوجود اُس کی پلکوں میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔ زندگی بھر دادا لوگوں سے اپنا گھر چھپاتا رہا۔ کچھ خبر نہیں تھی، ایک دن ایسا راز فاش ہوگا، اتنے لوگ یوں شور مچاتے ہوئے آجائیں گے۔

دھوپ اُترنے لگی تھی اور ارتھی کے گرد لوگوں کا ہجوم کم نہیں ہو رہا تھا مگر پھر پاڑے کے داداؤں نے زبردستی دادا کی ڈولی کندھوں پر اُٹھالی۔ ابا جان اور منیر علی کو تجمل نے رانی اور گیتا کے خیال سے گھر روک دیا تھا حالانکہ وہ اِس کے لیے آمادہ

نہیں تھے۔

گھاٹ تک کوئی دو میل کا فاصلہ تھا۔ آگے پولیس نے موٹروں اور دوسری گاڑیوں کے لیے سڑک بند کردی تھی اسی لیے لوگ کسی رکاوٹ کے بغیر آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ دادا کی ارتھی کے آگے آگے پولیس کی موٹریں بھی چل رہی تھیں۔ بہت سے باوردی پولیس والے بھی ہجوم میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہم ابھی اقامتی علاقے سے نکل کے بڑی سڑک پر آئے تھے کہ ڈاکٹر کیلاش اکھڑی ہوئی سانسوں اور ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے آگیا اور مجھ سے وہی پوچھنے لگا جس کا مجھے خود علم نہیں تھا، وہ مجھ سے معذرت کرنے لگا کہ اُسے دیر سے خبر پہنچی۔ اپنی ماں اور بہنوں کو وہ گھر چھوڑ آیا ہے، گھر کے آس پاس موٹر کھڑی کرنے کی جگہ نہیں ملی تھی، اُسے دُور اُترنا پڑا، اِس طرح کچھ اور دیر ہوگئی۔ وہ میرے پہلو سے لگا لگا چلتا رہا۔ خاصی دُور بعد کسی بوڑھے کی آہ و بکاہ پر میں نے پلٹ کے دیکھا، ایس پی شکلا بھی میرے پیچھے چل رہا تھا، میرے سائے کی طرح جانے کب سے۔ میں اگر مڑ کے نہ دیکھتا تو گمان بھی نہ ہوتا۔

"آپ بھی؟" میں نے ٹھٹکی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کیسے؟"

اُس نے بڑھ کے میرا ہاتھ تھام لیا اور آہستگی سے بولا۔ "میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔" میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کہنے لگا۔ "پولیس اسٹیشن سے کچھ دیر کے لیے گھر گیا تھا، دل نہیں مانا، بے کلی سی رہی۔ تم سویرے وہاں بالکل ٹھیک نہیں تھے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب معلوم ہوسکا کہ دادا کا گھر کہاں ہے۔ اب کیسے ہو؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے سانس لے کے کہا۔

"کہاں ٹھیک ہو۔" وہ افسردگی سے بولا۔

میری خاموشی پر وہ بھی چُپ ہوگیا اور میرے قدموں سے قدم ملا کے بڑھتا رہا۔ کچھ دُور کے سکوت کے بعد وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے ظہیر! میں اتنا نہیں جانتا تھا۔"

"کیا نہیں جانتے تھے؟"

"یہی جو میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ سب بہت عجیب ہے۔ میں یہاں نہ آتا تو ایک نئے تجربے سے محروم رہتا۔ یہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ بلکہ مختلف ہے۔" میں صرف سُنا کیا۔ "مجھے بتاؤ ظہیر!" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ "یہ کون آدمی تھا؟"

"آپ نے اُسے کبھی نہیں دیکھا؟"

"دیکھا ہے کئی بار مگر اس طرح نہیں۔ ماہم کا سارا علاقہ بند ہے، کہیں کوئی کاروبار نہیں۔ اِدھر فارس روڈ کی عورتوں نے تین دن کے لیے اپنا کاروبار بند کرنے کا اعلان کیا ہے، صرف پولیس کے کسی سپاہی، کسی افسر کو اپنے دیکھے ہوئے پر یقین رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، آدمی کی کمائی صرف آدمی ہوتے کتنے اپنے رونے والے سمیٹتا ہے۔ پیرو دادا نے اتنے آدمی تھے؛ وہ اتنا مال دار تھا؛ یہ پاڑے کے دادا سے سوا بار

"وہ پاڑے ہی کا دادا تھا۔"

"مگر ایسا نہیں ہوتا۔"

"اور آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔"

"ہاں۔" وہ تذبذب سے بولا۔ "مگر یہ کیسے ہے؟"

میں سوچتا رہا، کیا جواب دوں۔ چوک آگیا تھا، یہیں کو راستہ جاتا تھا مگر کچھ دیر کے لیے سب کو ٹھیرنا پڑا۔ کسی بے شمار سکے نچھاور کیے تھے۔ اُدھر پاڑے کی جانب سے بہت کی ارتھی اُٹھائے آرہے تھے۔ جب تک وہ شامل نہیں ہو اُن کے انتظار میں کھڑے رہے۔ آگے راستہ کچھ کشادہ ہوگیا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ ماچھی کو لانے والوں کی شمولیت سے ہوگئے تھے۔ شکلا اور ڈاکٹر کیلاش، دونوں میرے چلتے رہے۔ ابھی گھاٹ کچھ فاصلے پر تھا کہ شکلا کسمساتے

"جولین بھی مجھے وہاں نظر آئی، کیا وہ دادا کو جانتی تھی؟"

"پھر وہ کیسے آتی۔"

"مگر اُس نے کبھی ذکر نہیں کیا۔"

"ضروری تھا کیا۔"

"نہیں۔" وہ خفیف سا ہوگیا۔ "میں نے وہاں دا اور بیٹی کو بھی دیکھا، دادا کے گھر کو۔ بہت دُکھ ہوا میرے یہ سب کچھ کسی کہانی کے مانند ہے۔ دادا ایسے گھر میں رہتا اچھی بیوی اور بیٹی، اتنا اچھا گھر ہوتے ہوئے وہ پاڑا کیوں

"شاید اِس لیے کہ اتنے لوگ اُسے پاڑے پر دیکھنا

"مگر وہ کون تھا؟" اُس کے پنجے کی گرفت میرے با ہوگئی۔ "وہ کون تھا جو پیرو دادا کو پاڑے پر دیکھنا نہیں جسے اُس سے ایسا بیر ہو۔ تمھیں کچھ پتہ چلا؟"

"اِس کی مہلت ہی کب ملی۔"

"پولیس بھی بہت ہاتھ پیر مار رہی ہے۔ چند آدمی گئے ہیں مگر شاید خانہ پُری کے لیے۔ کوئی مطمئن نہیں ہے شہر میں یہی چرچا ہے اور خوف پھیلا ہوا ہے۔ پولیس چھاپے مارے ہیں، بمبئی سے باہر جانے والے راستوں

ی کردی گئی ہے۔ ہتھیار رکھنے والوں کی چھان بین کی جا رہی پولیس کو شبہ ہے کہ وہ بمبئی کے پاڑوں میں سے کوئی ایک ی آدمی ہیں۔ ہوسکتا ہے، وہ دادا کے خاص پاڑے ہی میں سے ی ہو اور یہاں موجود ہو۔" شور کی وجہ سے اُس کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بول بھی ایسے رہا تھا جیسے خود سے طب ہو۔ گھاٹ قریب آنے پر وہ خاموش ہوگیا اور مجھ سے بھی ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر کیلاش بھی مجھ سے بچھڑ گیا۔ گھاٹ تنگ گزرگاہ میں داخل ہوتے وقت پیچھے سے ہجوم کا ایک لا آیا، سبھی منتشر ہوگئے۔ شکلا کی باتوں سے مجھے اُس وقت بہت شت ہو رہی تھی۔ میں اُس سے کہتے کہتے رہ گیا کہ کیا وہ یہ سب کسی اور وقت کے لیے اُٹھا نہیں رکھ سکتا مگر اُس کے جُدا نے کے بعد اندازہ ہوا کہ اُس کا ساتھ کتنا غنیمت تھا۔ وہ تو ری اشک شوئی، میری دل جوئی کی خاطر میرے ساتھ تھا، میرا یان بٹانے، مجھے سہارا دینے کے لیے۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ ئی میرے پاس نہیں آیا۔ نہ جمرو، نہ شامو، نہ مارتی۔ ڈاکٹر کیلاش بھی ہجوم میں کہیں کھو گیا تھا۔ جانے کیوں ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ ی لیکن سب کا رخ گھاٹ ہی کی جانب تھا۔ وہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے تھے یا پیچھے کوئی حادثہ ہوگیا تھا۔ اِس افراتفری میں، میں بہت پیچھے رہ گیا اور آخری آدمیوں کے ساتھ گھاٹ کے احاطے میں داخل ہوا۔ آگے جانے کے لیے جگہ ہی نہیں تھی۔ اور میں آگے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

دونوں کو لکڑیوں کے درمیان چبوترے پر رکھ دیا گیا تھا۔ میں گھاٹ کے سرے پر اُن سب سے پیچھے ایک پتھر پر بیٹھا رہا۔ کبھی سناٹا چھا جاتا، کبھی پنڈتوں کی صدائیں گونجنے لگتیں۔ پھر ایک دم ایسی چیخ پکار مچی جیسے سب اُن کے ساتھ جل رہے ہوں۔ مجھے نہیں معلوم، اُنھوں نے کب دونوں کو آگ لگائی اور کب آگ نے اُنھیں خاک کیا اور کس نے گھاٹ کے چبوترے پر اپنا سر پھوڑا، کون دیوانہ ہوا۔ جب سورج ڈوب گیا اور اندھیرا چھانے لگا اور لوگ بہت کم رہ گئے اور گھاٹ کے چبوترے پر رکھی ہوئی چتاؤں کے شعلے تھک چکے تب کہیں کسی گوشے سے ڈاکٹر کیلاش میرے پاس آگیا۔ اُس نے میرا شانہ جھنجوڑ کے مجھے اُٹھایا۔ میرے جسم میں بالکل جان نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے بازو کی بیساکھی کے سہارے مجھے چتا کے قریب لے گیا۔ وہاں تجمل، شامو، جمرو، مارتی سبھی موجود تھے اور چتا کے بجھتے شعلے دیکھ رہے تھے۔ آخر آگ نے سب کچھ راکھ کر دیا۔ دادا اور ماچھی دونوں راکھ ہوگئے۔ دیکھتے دیکھتے آگ نے سب کچھ خواب کر دیا۔ آگ نے مٹے ہوؤں کو مٹا دیا مگر وہ آگ جو زندوں کا نصیب ہے؟ جو جلاتی بھی ہے اور راکھ بھی نہیں کرتی۔ وہ آگ جو نظر نہیں آتی، وہ اِس سے کہیں تیز، کہیں زیادہ کاری ہے۔ وہ آگ جانے کب بجھے۔ آگ سے آگ جلتی ہے۔ رات ہوگئی تھی۔ وہ چبوترے کے سامنے دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ شاید اس لیے کہ زیادہ سے زیادہ آگ منتقل کرلیں۔ یہ آگ جتنی آزار تھی، اتنی قرار بھی تو تھی، یہ اعتبار کہ کوئی خالی سینہ لے کر گھر نہیں لوٹ رہا ہے۔

وہ سب ہمارے ساتھ گھر لوٹے لیکن ہم سے پہلے شبّی چاچا کے علاوہ بہت سے لوگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ سہ پہر کی طرح کم و بیش اُن کی تعداد اُتنی ہی تھی۔ ساری گلی میں شامیانے تنے تھے اور بجلی کے قمقموں کے ساتھ گیس کے ہنڈے جل رہے تھے۔ ایک طرف بہت سی دیگیں چڑھی تھیں۔ اتنی جلدی یہ اہتمام ابّا جان ہی نے کیا ہوگا۔ وہ یہی کرسکتے تھے۔ جس کی جتنی استطاعت ہو، اتنا ہی کر سکتا ہے۔ مال ہر چیز کا بدل ہے، کبھی یہ وقت بھی ضرور لیتا ہے مگر آدمی کا بدل نہیں ہے۔ ابّا جان اپنے لعل و جواہر سے آدمی واپس نہیں لا سکتے تھے۔ اُنھیں شاید احساس ہوا ہو کہ آدمی ایسے چٹکیوں میں چلا جاتا ہے۔ کانتے کو کچھ دیر بھی لگی تھی۔ دادا اور ماچھی جیسے گراں ڈیل ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ سہ سکے۔ دونوں طرح کے کھانوں کا انتظام تھا۔ ہندو مسلم کھانے الگ الگ۔ ہمارے پہنچتے ہی کھانا شروع کر دیا گیا۔ میں تجمل کے ساتھ سیدھا اندر چلا آیا۔ برآمدے میں جولین کیلاش کی بہن رما اور چند عورتیں بیٹھی تھیں، گیتا اور رانی کی ملنے والیاں ہوں گی۔ ہمیں دیکھ کے جولین ہماری طرف لپک پڑی۔ تجمل نے اپنے بازو کھول دیے۔ جولین کے چہرے پر گھٹا سی اُمڈ آئی، لمحوں کے لیے اُس کا سراپا متزلزل ہوا جیسے بہت دُور کے کسی تھکے ہارے کو کوئی دیوار نظر آجائے۔ دیوار سایہ بھی دیتی ہے، سہارا بھی مگر وہ فوراً سنبھل گئی۔ جولین کو خود پر اتنا اختیار تھا۔ تجمل نے بھی اُسے وقت نہیں دیا، وہ گیتا اور رانی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ جولین کے کہنے کے مطابق گیتا کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ دونوں نے ہزار منتوں کے باوجود نہ کچھ کھایا، نہ پیا۔ شور غل کے سبب اُنھیں بیرونی کمرے سے اندر کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ جولین نے رُندھی ہوئی آواز میں تجمل کو بتایا کہ جس وقت سے دادا کی ارتھی گئی ہے، گیتا بیگانہ سی ہوگئی ہے، نہ کسی

سے بولتی ہے، نہ کسی کی سُنتی ہے۔ ابّا جان، منیر علی بار بار آ کے اُسے دلاسے دیتے ہیں، سبھی اُس کی دل جوئی میں لگے ہوئے ہیں۔ ببّھل نے ایک پَل کی بھی تاخیر نہیں کی، وہ جولین کے کندھے پر ہاتھ ٹکائے اندر چلا گیا۔ مَیں اور ڈاکٹر کیلاش برآمدے میں کھڑے ایک دوسرے کی صورت دیکھا کیے۔ پھر مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔ مَیں ببّھل کی پیروی میں اندر کی جانب بڑھ گیا لیکن چند قدموں کے بعد مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر کیلاش رہ گیا ہے، اُسے بتا کے آنا چاہیے بلکہ اُسے بھی ساتھ لے چلوں۔ گیتا اُس کے لیے اجنبی ہے۔ کل ہی رات کانتے کے بلیسویں پر اُس نے رانی اور گیتا کو دیکھا تھا۔ گیتا کو بھی احساس ہو گا کہ کون کون کتنی دُور سے یہاں آیا ہے۔ لیکن یہ ٹھیک بھی ہے کہ نہیں؛ مَیں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ بس غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ اُٹھ گیا، اب اُسے روک دینا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ وہ مستعد کھڑا تھا، فوراً میرے ساتھ چل پڑا۔

مَیں جانتا تھا، وہ اِس وقت کس کیفیت سے دوچار ہو گا۔ وہ ایک عجلت پسند، ہڑ کل مزاج نوجوان تھا، جیسے نوجوان ہوتے ہیں۔ اُس نے مجھ سے کچھ جانتے بوجھنے کی عجلت نہیں کی تھی تو بہت ضبط کیا ہو گا۔ ویسے اُسے اِس کا موقع بھی کہاں ملا تھا۔ اُس کے بہ قول وہ سُنتے ہی چلا آیا تھا لیکن کیسی کیسی حیرانیاں اُس کا گرم خون جھلسا رہی ہوں گی۔ یہ تو اُسے معلوم ہی ہو گیا ہو گا کہ بیر کون تھا اور پیر داگز بمبئی کے پاڑوں کا واوا اُڑا جا تھا تو ہم کون ہیں، مَیں کون ہوں۔ اُس نے پہلی مرتبہ ہمارے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا، گیا وہی دُرست تھا۔ جب ہم پہلی بار اسپتال گئے تھے اور ہم نے رات گئے کانتے کو دیکھنے کی خواہش کی تھی، اُس نے اُس وقت فون پر اپنے ساتھی ڈاکٹر سے ہمارے لیے کیسے وہم و گمان کا اظہار کیا تھا اور کون کون سے خطاب و لقب سے نوازا تھا۔ گھاٹ پر جاتے وقت وہ میرے بائیں جانب تھا اور شکلا دائیں جانب۔ شکلا کی باتوں پر اُس کے کان لگے ہوئے ہوں گے حالانکہ شور کی وجہ سے یہ آسان نہیں تھا تاہم اُس کی متجسس سماعت سے سبھی کچھ اوجھل نہیں رہا ہو گا اور یہاں ہجوم کے درمیان ہونے والی چہ میگوئیاں، دادا کا چھُپا ہوا محل دیکھ کے حیرت زا تبصرے، پاڑے کے اتنے آدمیوں کا ہجوم دیکھ کے پڑوسیوں کے تعجب خیز بیانات۔ یہ سرگوشیاں اچٹتی اچٹتی میرے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ اِن کی بازگشت ڈاکٹر کیلاش نے بھی سُنی ہو گی۔ ویسے اِس کے سوا صورت بھی کون سی تھی۔ ببّھل کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ دادا

کو پاڑے تک محدود رکھتا یا گھر تک۔ پاڑے کے لوگ داوا[illegible] کرنے کے بعد اُسے ببّھل کے حوالے کر دیتے اور ببّھل گھر کے آدمیوں کے سامنے چُپ چھپاتے اُسے آگ دکھا دیتا۔ ہر[illegible] ساز ہوتا ہے، ہر بند دروازہ باہر کے لوگوں کی بینائی چھین[illegible] بعد میں جو طرح طرح کی داستانیں تراشی جاتیں، وہ اِن[illegible] کہیں زیادہ بے رحم ہوتیں۔ اب کسی سے شاید کچھ بھی چھُپا[illegible] رہا تھا۔ نہ منیر علی سے، نہ مولوی اکرم سے، نہ ایس پی شکلا[illegible] کیلاش سے۔ اور ابّا جان کو تو تبت سے اب تک اتنے[illegible] رہنے کے بعد بہت کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا۔ مولوی اکرم پہلے ہی[illegible] کے ہوٹل میں بیرو کی خوں باری اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے[illegible] منیر علی جیسلمیر میں میری اور ببّھل کی مشقِ ستم کے شاہد تھے۔ کو[illegible] رہ گئی تھی تو اب دادا نے پوری کر دی تھی۔ ڈاکٹر کیلاش کو اب[illegible] توثیق کے لیے اتنا اضطراب نہیں ہو گا جتنا اپنی آگہی کے انکش[illegible] پر ہو گا۔ جاننے کا آزار اکثر نہ جاننے سے زیادہ ہوتا ہے۔ [illegible] اندر کبھی توقع سے بہت مختلف اور سوا بھی نمودار ہوتا ہے۔ کچھ اُس کا حال ہونا چاہیے لیکن مجھے کوئی صفائی نہیں پیش[illegible] تھی۔ پاڑے کے آدمی کو یہ مجوبیت نہیں آتی۔

ہم کمرے میں داخل ہونے والے تھے کہ جولین دروازے[illegible] کہنے لگی، ہم اگر ابھی اندر نہ جائیں تو بہتر ہے۔ شام کے بعد اب کہیں ببّھل کو دیکھ کر گیتا کا جمود ٹوٹا ہے۔ اتنے لوگ گئے، اِس نے کم[illegible] بات نہیں سُنی۔ ببّھل نے جاتے ہی اُسے چوکی سے اُٹھا کے فرش[illegible] کر دیا اور جانے کیا جادو کیا کہ وہ بپھر سی گئی اور اب ببّھل[illegible] میں چھُپی بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو رہی ہے۔ یہ رونا[illegible] کے لیے مفید تھا۔ آنسو بھی کبھی علاج ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کیلاش[illegible] جولین کی تائید کی اور کہا کہ اُس کی موٹر میں ایسی دوائیں ہو[illegible] جو رات کو اُسے گہری نیند سُلا سکیں۔ نیند بھی اُس کے لیے [illegible] ہے۔ مَیں نے سوچا، اُس سے کہوں کہ وہ ببّھل کو بھی ایسی کو[illegible] دے دے، کسی چیز میں ملا کے سہی۔ کل رات سے اُس کے منہ[illegible] بھیل تک نہیں گئی ہے، نہ اُسے کھُل کے ایک گھڑی بیٹھنے کا ملا ہے۔ وہ بس بیڑیوں کا دھواں نگلتا اُگلتا رہا ہے۔ کسی کو اُ[illegible] طرف بھی دھیان دینا چاہیے۔ چارہ گر بھی آدمی ہوتے ہیں۔ ہم[illegible] کے قریب کھڑے رہے۔ گو اب اندر جانے کی ایسی ضرورت نہیں[illegible] لیکن میں ببّھل کے خیال سے وہاں جانا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد جولین پہلے اندر جھانک کے آئی تب ہم[illegible]

[illegible] گیا۔ سامنے ببّھل چوکی کے کنارے اُس کا سر زانوؤں پر رکھے بیٹھا [illegible] چیکے اُسے جانے کیا تلقین کر رہا تھا، کیا کچھ باور کرانے کی [illegible]شش کر رہا تھا، گیتا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل [illegible]ری تھا۔ فرخ، فریال، چمپا بیگم، جولین کی ماں، شہ پارہ اور مولوی [illegible]رم کی بیٹی ریحانہ چند اجنبی عورتوں کے ساتھ ایک طرف گٹھڑی بنی [illegible]ا کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ "دیکھ ری! کون آیا ہے۔" میرے پہنچتے ہی [illegible]ھل نے بلند آواز میں کہا جیسے رُوٹھے ہوئے کسی بچّے کو کوئی کھلونا [illegible]ھا دیا جائے۔ "جانتی ہے، اِس کو، یہ کون ہے۔" ببّھل اُس کے بال [illegible]نوارتے ہوئے بولا۔ گیتا کی بھیگی پلکوں پر ارتعاش سا طاری ہوا اور وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر کیلاش پر بھی اُس کی نظر گئی ہو [illegible]۔ "تیرا بابا اِس کو بیٹا بولتا تھا۔ اِس کو ابھی کون پوچھے۔" ببّھل [illegible]ے کہا۔ گیتا نے بے اختیار میری طرف دیکھا۔ خنجر اور کیا ہوتا ہے، اُس [illegible] بھیگی نظروں میں ایسی ہی کاٹ تھی۔

ببّھل کے اشارے پر مَیں بھاری قدموں سے چلتا کسی مجرم کی طرح اُن دونوں کے سامنے جا کے کھڑا ہو گیا۔ ببّھل نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اُس کے پہلو میں بٹھا دیا۔ "سنبھال رے اِس کو،" دبی دبی آواز میں بولا۔ میرا جسم سُن ہو گیا۔ "اِس کو بول کہ ابھی ایک گیا ہے، سالے نہیں۔" مَیں نے بہت کوشش کی کہ کچھ کہوں، کہوں کہ وہ [illegible] کو اتنا بے آسرا، بے سایہ نہ جانے مگر میری زبان ٹھٹھر کے رہ گئی۔ [illegible] ہر لفظ ہیچ معلوم ہونے لگا۔ ببّھل ہی کچھ نہ کچھ کہتا رہا۔ چند لفظوں [illegible] قتل موت کا آموختہ۔ آدمی کو توتے کی طرح یہ لفظ رٹے ہوتے ہیں لیکن دُہرانا بھی حوصلے کا کام ہے۔ سامنے آنے پر سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ آدمی کو اپنے الفاظ کی بے مائیگی کا احساس ہو تو اُس [illegible] زبان لکنت کرنے لگتی ہے۔ ببّھل کی زبان بھی اٹک رہی تھی، کہنے لگا۔ "[illegible] اِس کو بولتا ہوں کہ تُو تو شیر کی بیٹی ہے۔ شیر بھی ایک دن ڈھے [illegible]ہے۔ گولی سے نہیں تو اپنے زور سے۔ اِدھر کوئی بھی نہیں ٹکنے [illegible]گی نہیں، مَیں بھی نہیں۔ بولتے ہیں، پڑھ لکھ کے آدمی کو اونچا [illegible] دکھائی پڑتا ہے۔ تُو کیسی پڑھی لکھی ہے۔" پھر کہنے لگا۔ "ابھی برس [illegible] نہیں ہوا، وہ اِدھر سے کیا بول کے گیا تھا کہ ابھی لوٹنے کا بھروسا [illegible] لوٹ کے آ گیا پر زندگی اُس کو دوبارہ ملی تھی، بس تھوڑے دن کے [illegible] بلتا تو کیا کر لیتی ری۔ اُدھر ہم لوگ ساتھ تھے، سب ترچھے [illegible]ہے، اپنی جگہ پہ دوڑ کے چلے گئے۔ ماں سے پوچھ، اُس نے [illegible] بار اُس کو کھویا ہے۔ پہلے دن سے یہ آنکھ مچولی ہوتی رہی ہے [illegible] وہ ایسا ہی، ہتھیلی پہ دھر کے پھرتا تھا، پر جو سینت کے رکھتے

ہیں، دھوکا اُن کو بھی ہو جاتا ہے۔ پتا کسی کا نہیں لکھا ہے۔ اپنی ماں کو دیکھ ری۔ اُس کا بھی کوئی گیا ہے۔ وہ کیسے باندھے بیٹھی ہے اپنے کو۔" یہ سُن کے رانی پھٹ پڑی۔ گیتا پھر سسکنے لگی جیسے کوئی زخم اندر کچو کے لگاتا ہو، اُس کے سینے میں یک بیک ہوک سی اُٹھی۔ وہ میرے اتنے قریب بیٹھی تھی کہ مَیں اُس کی سانسیں سُن سکتا تھا۔ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی اُس کی اکھڑی اکھڑی سانسیں میرے سینے میں کوئی سمندر سا شور کرتا تھا کہ اُسے کسی طرح اپنے اندر جذب کر لوں۔ اُس کے سارے آنسو، سارے کرب اپنے اندر سمیٹ لوں۔ مَیں لمحے لمحے خود کو مجتمع کرتا تھا۔ مَیں نے بہ مشکل اپنا لرزتا ہاتھ اُس کے سَر پر رکھنے کی کوشش کی۔ وہ تو ابھی تک بھری بیٹھی تھی، اور بلکنے لگی۔ آدمی اتنے آنسو چھپائے پھرتا ہے۔ کوئی سوتا ابھی باقی رہ گیا تھا جو اُس کی آنکھوں سے رَواں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں، یہاں سے بھاگ جاؤں، مَیں یہاں کیوں آ گیا ہوں۔ یکایک مجھ پر دیوانگی سی طاری ہوئی۔ مَیں نے اُسے کھینچ کے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ مَیں نے بے تحاشا اُس کے ہاتھ چومے، اپنے دامن سے اُس کے رخسار خشک کیے۔ "نہیں نہیں، مت رو، خدا کے لیے مت رو۔" مَیں نے پھٹی ہوئی آواز میں اُس سے منّت کی۔ "تم اکیلی نہیں ہو، دادا چلا گیا ہے اور کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا مگر یہاں سب ... یہاں تمھارا بھائی مَیں موجود ہوں۔ مَیں اور یہ سب ... ببّھل بھائی ... ابھی تمھارے بہت سے گھر ...." میرے سینے نے میری آواز کا ساتھ نہیں دیا۔ مَیں اُسے تھامنے چلا تھا اور خود مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ دیر تک وہ میری جزوِ جاں بنی رہی۔ مجھ میں سمٹی، مجھ میں چھُپی سہمی سہمی سی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ اطراف میں کون کون ہماری جانب نگراں ہے اور یوں تو مَیں اُسے اور ہلکان کر رہا ہوں۔ کوئی ہمارے قریب نہیں آیا۔ ببّھل بھی خاموش بیٹھا رہا۔ پھر جانے کب، کسی لمحے جولین نے میرے پاس آ کے مجھے ٹھوکا دیا اور اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ جولین، شہ پارہ، فرخ اور چمپا بیگم نے اُسے مجھ سے جُدا کر دیا اور ڈاکٹر کیلاش نے مجھے چوکی سے اُٹھا دیا۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ کیلاش میری کمر جکڑے مجھے برآمدے میں لے آیا۔

رات گئے ہر سو سناٹا چھا گیا اور باہر کا سارا ہجوم رخصت ہو گیا تو جولین نے ایک ایک کو بیرونی کمرے میں اکٹھا کر لیا۔ زیں

کی طرح اُسے بھی حکم دینا آگیا تھا۔ بیرونی کمرے کے فرش پر دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ اباجان، منیر علی، مولوی اکرم، مارتی، شامو جمرو سبھی موجود تھے۔ ڈاکٹر کیلاش بھی تھا۔ رما بھی تھی۔ سب دسترخوان کے اطراف گم سم بیٹھ گئے۔ کسی نے کچھ نہیں لیا۔ نہ گیتا نے، نہ رانی نے۔ کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کھانے کو ہاتھ لگائے مگر سب کو وہ زہر اپنے حلق سے اُتارنا پڑا۔ موت کے کھانے اور زہر میں کیا فرق ہوتا ہے۔

✹ صبح دس بجے کے قریب پاڑے کی اوپری منزل کے بڑے کمرے میں شہر کے سارے پاڑوں کے دادا موجود تھے۔ نچلی منزل پر دادا کے سوگ میں آنے والوں کی کثرت کے سبب کوئی جگہ نہیں رہی تھی اِس لیے تجھل نے اُن سب کو اوپر جمع ہو جانے کو کہا۔ رات ہی اُنھیں مطلع کر دیا گیا تھا کہ وہ کل صبح دس بجے تک دادا کے پاڑے پہنچ جائیں۔ اُن سے یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ چاہیں تو اپنے اپنے پاڑے کے منتخب آدمی بھی ساتھ لا سکتے ہیں۔ دینا، سُندر، شوا، بالے، جارجی، نادرے، جگت، لال خان، سُورت والا، بنارسی اور دوسرے جنھیں مَیں ناموں کے بجائے شکل سے پہچانتا تھا اور وہ جنھیں مَیں بالکل نہیں جانتا تھا، بارش کے باوجود وہ سبھی وقت پر پاڑے آگئے۔ سب کے چہرے کھنچے ہوئے تھے اور پیشانیوں پر بل پڑے تھے۔ سارا کمرہ اُن کی قیاس آرائیوں سے گونج رہا تھا۔ ہر کوئی اپنے طور پر تأسف کا، غضب کا اظہار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد تجھل کے آنے پر خاموشی چھا گئی۔ اُس نے چوکی پر بیٹھتے ہی کسی تمہید کے بغیر اُن سے کہا۔ "اپنے کو زیادہ نہیں بولنا، بولنا ہے کہ تم پاڑے پر ابھی کس کو بٹھانا مانگتا ہے؟"

کسی نے جواب نہیں دیا، سب ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔

"چُپ رہنے سے کچھ نہیں بنے گا۔" تجھل نے اونچی آواز میں کہا۔ "تم نے کچھ سوچا ہے تو اپنے کو بولو۔"

"کیا! کیا بولے دادا!" خاصی دیر بعد بالے نے زبان کھولی۔

"ایسا تو نہیں رہے گا۔ اپنا مطلب ہے، تم میں کوئی ماہم کے پاڑے کی گدّی پر بیٹھنے کا ہے تو اُٹھ کے بولے۔ ایک، دو، تین، چار، جتنا بھی ہے۔ تم اُن کو اچھی طرح دیکھ لو اور جس پر سب کا جی ٹھکتا ہو، اُس کو اِدھر بٹھا دو۔"

"ایسا کیسے دادا! تم کیا بولتا ہے؟" کسی نے پیچھے سے کہا۔

"یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی تو اِس کا دوسرا [illegible] بھی ہے۔ کانٹا رکھ کے الگ کر لو، جیسا اپنے یَل پر دادا [illegible] ہوا تھا۔"

"تم بولو، تم نے کیا سوچا ہے؟"

"اپنے کو کیا سوچنے کا ہے۔" تجھل نے سپاٹ لہجے [illegible]

"ابھی اِس کو مت چھیڑو دادا!" بالے نے التجا کی۔ [illegible] جلدی مت کرو، ابھی کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ماہم کے [illegible] پر پیرو دادا کی جگہ بیٹھنا مانگتا ہے۔ کیوں! اپن ٹھیک [illegible] نا؟" اُس نے اُن سب سے پوچھا۔

سب نے متذبذب انداز میں بالے کی تائید کی۔

"پھر اِدھر کون رہے گا؟"

"ابھی پہلے دادا کی بات کرو اُستاد!" بنارسی دادا [illegible] سر اُٹھا کے کہا۔ "دادا کی گدّی پر تب تک کوئی ٹھیک نہیں [illegible] جب تک اُس کا حساب صاف نہیں کر لیا جاتا۔ اِس سے پہلے [illegible] اِدھر نہیں بیٹھنے کا۔"

"حساب کون صاف کرے گا؟" تجھل نے اُس سے [illegible]

"اپن کرے گا۔ حساب ضرور ہوئے گا، نہیں ہوئے گا [illegible] ماں کا جنا نہیں۔" لال خان نے غضب آلود لہجے میں کہا [illegible]

"اُس ٹائم تک اِدھر پاڑے پہ کون بیٹھے گا؟ پاڑے [illegible] ایسے خالی نہیں رہتی لالے! ایک جاتا ہے، دوسرا آجاتا [illegible] کا بولو۔"

"اِدھر ایسا کس کو بیٹھتے اچھا لگے گا۔ کوئی اور پاڑا ہو [illegible] چلتا۔ یہ پیرو دادا کا پاڑا ہے۔" باندرے کے دادا دینا نے [illegible] مارتی تجھل کے لیے حقّا لے آیا تھا۔ تجھل چند لمحے [illegible] رہا۔ چلم ابھی پوری طرح دہکی نہیں تھی۔ تجھل نے منال [illegible] ہٹا کے اُن سے کہا۔ "پاڑے پہ اُس ٹائم تک تالا مار دیں [illegible]

"تم جو اِدھر ہو، تمھی اِدھر بیٹھو۔" بالے تیزی سے بولا [illegible]

"نہیں رے! ہم کو اِدھر نہیں بیٹھنا۔"

"کیوں؟" بالے کی آواز بھرا رہی تھی۔ "اپن اکیلا نہیں [illegible] سب لوگ تم سے ایسا بولتا ہے۔ ابھی کچھ دن کے لیے تم [illegible] پیرو دادا کی خاطر، اُس کے پاڑے کی خاطر۔ زیادہ دیر [illegible] گا۔ اپن کو پتہ ہے، ماں قسم زیادہ دیر نہیں لگے گا۔"

"ہم کو یہاں سے جانا ہے۔"

"تم ابھی تو نہیں جاؤ گے۔ کل دادا گیا ہے، آج تم [illegible]

[illegible] بنارسی دادا نے تلخی سے کہا۔

[illegible] دادا کے بعد اب کون اِدھر ٹِکے گا رے!"

[illegible] ٹھیک ہے، اپن لوگ تمھارا کوئی نہیں، تمھارا نہیں تو دادا [illegible] کوئی ہے۔ اُسی کے لیے..." بالے جنونی انداز میں بولا۔

[illegible] "اپن کو دوسرا کام ہے۔ ابھی اُس کو کھوجنا ہے۔"

[illegible] "کس کو؟" لال خان اچک کے برہمی سے کہنے لگا۔ "تم اپن کو [illegible] دیتا ہے۔ ہم اِدھر اکھا بمبئی کا دادا لوگ چوڑی ڈال کے بیٹھا [illegible] جو اکیلا تم اُس کو ڈھونڈنے نکلے گا۔ وہ صِرف تمھارا ہی نہیں، [illegible] بھی بھائی تھا، باپ تھا وہ۔"

"اور اُس کے کسی بیٹے بھائی نے اُس پہ پیچھے سے گولی داغ [illegible] دی۔" تجھل نے زہرخند سے کہا۔

[illegible] "کیا بولتا ہے تم؟" لال خان کا چہرہ بگڑ گیا۔

"دادا کیا اُلٹا بولتا ہے جو ابھی مرچ لگتا ہے۔" بالے بکھری [illegible] دی آواز میں کہنے لگا۔ "وہ اپن میں سے ہی کوئی حرام کا... ہے، [illegible] دوسرا نہیں۔ وہ گیدڑ کا اولاد ابھی ہمارے بیچ بھی بیٹھا ہو سکتا ہے۔"

"اپن بھی ابھی یہی سمجھتا ہے۔" شوا اور سُندر نے بیک زبان کہا۔

"اِدھر ہی کوئی کالا بھیڑ ہے دادا!" سُندر تمتماتے لہجے میں بولا۔ "وہ ابھی تم بھی ہو سکتا ہے، اپن بھی۔ اپن اُس کو اِدھر ہی ڈھونڈ کے بھگتا دے تو ٹھیک ہے۔"

"نہیں ڈھونڈے گا تو کل دوسرے کا باری آئے گا۔" بالے نے کہا۔ "اب چاقو، بازو کا کام نہیں رہا۔ بندوق طمنچے کا بات ہے۔ اُجالے کا نہیں، اندھیرے کا ہے۔ سامنے کا نہیں، پیٹھ پیچھے کا ہے۔ وہ کوئی دادا نہیں ہے سالا، بھڑوا ہے۔ ایک بار اُس کے منہ کو خون لگا ہے تو ابھی بار بار ایسا ہوتا رہے گا۔"

سب مختلف بولیاں بولنے لگے۔ تجھل نے اُنھیں روکا۔ "پہلے اِدھر پاڑے کی بات کرو۔"

کوئی نہیں بولا۔ سب مضطربانہ ایک دوسرے کی لب کشائی کا انتظار کرتے رہے۔ پھر بالے نے خاموشی توڑی اور جھجکتے ہوئے بولا۔ "اِدھر کسی کو بھی بٹھا دو دادا! ابھی اپن میں سے کوئی لوٹ کے نہیں پوچھے گا۔"

"اپنے کو پتہ ہے، پر اِدھر پھر تم کو بُلانے کی کیا ضرورت تھی۔ اِدھر بھی بیٹھا ہے۔ ایک ایک سے پوچھ لو۔ سوچنے کا ہے تو تھوڑا ٹائم لے لو۔ ایک بات کا دھیان رکھنا۔ اِدھر جو بھی گدّی سنبھالے گا، پہلے کی طرح ہر کوئی اُس کو اپنے اپنے پاڑے کا بھتّا پہنچائے گا۔"

"ابھی اِس کا بات مت کرو دادا!" دینا نے کسی قدر جھنجلاہٹ سے کہا۔

"ہاں دادا! ابھی اِس کو مت چھیڑو۔" بنارسی نے بھی دینا کی حمایت کی، اوروں کی آوازیں بھی بلند ہوئیں۔

"پھر کا ہے کا ٹنٹا ہے، اُس کا کام پورا ہو گیا۔" تجھل دھمکی آواز میں بولا۔ "ہٹانے والے کا کام پورا ہو گیا۔"

"دادا کا بات سمجھو ابھی۔" شوا نے منتشر لہجے میں کہا۔ "ہم کو اِس وقت کچھ ایک دم ایسا ہی بنائے رکھنے کا ہے جیسا کل دادا کے وقت تھا۔"

"اور گولی ایک بار پھر چلے گی۔" تجھل نے زیر لبی سے کہا۔ لیکن سب نے سُن لیا اور سب چونک پڑے۔

"کیا دادا! ابھی کیسا بولتا ہے تم؟"

تجھل نے بجھتے ہوئے لہجے میں اُنھیں بتایا کہ دادا کے چلے جانے پر ماہم کے پاڑے سے شہر کے تمام پاڑوں کا واسطہ جوں کا توں رہے گا تو بندوق بردار پھر اِس طرف کا رُخ کرے گا اور اندھیرے کا منتظر رہے گا کہ کب نیا دادا اِس طرف آتا ہے۔

"ہاں ہاں! اِسی واسطے ہم بولتا ہے کہ اِس کو ابھی مت چھیڑو۔" بنارسی نے اضطراری انداز میں کہا۔

"نہیں چھیڑتا، آج سے سارے پاڑے کھُلے ہیں۔ پھر اپنا اپنے گھر کو جاؤ۔" تجھل تُرشی سے بولا۔ "اب گولی پر ساری بات ہے تو سب ٹھیک ہے۔"

"ہم، ہم سمجھ رہا ہے، تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"دادا ہو گا تو ضرور سمجھ لے گا۔"

"پر اپن سمجھے کہ تم بھی اِسی واسطے اِدھر بیٹھنے کو نہیں مانگتا۔" دینا نے اشتعال میں کہا۔

"یہی بات ہم تمھارے لیے بھی بول سکتے ہیں، اِدھر سب کے لیے۔" تجھل نے گونجتی آواز میں کہا۔

"ایسا؟" دینا پھنکارنے لگا۔ "ایسا ہے تو اپن ہی اِدھر بیٹھے گا۔ اپن دیکھے گا کہ کون شیر کا جنا ہے اور کتنا گولی پٹاخا ہے ابھی اُس کے پاس۔"

"سُن لیا تم نے۔" تجھل نے بلند آواز میں کہا۔ "آج سے دینا دادا اِدھر کا دادا ہے۔ تم سب لوگ مانتے ہو؟"

کمرے میں بھن بھناہٹ ہونے لگی۔ لال خان اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ بلند کر کے اُس نے سب کو خاموشی کے لیے کہا۔ "دادا!"

وہ ٹھیر ٹھیر کے بولا۔ ’’باہر کے پاڑے سے کوئی آدمی نہیں چلے گا۔ اِدھر ماہم کے پاڑے پر کوئی کمی نہیں ہے۔ اِدھر ہی کا کوئی آدمی ہوئے تو ٹھیک ہے۔ ماچھی دادا ہوتا تو بات ہی نہیں تھا، دُور دُور اُس کے بل کا کوئی نہیں تھا پر اِدھر اور بھی ہے۔ اپن سے پوچھو تو ابھی اِدھر کے پاڑے پہ اِدھر کے آدمی کا حق نکلتا ہے۔‘‘

’’حق کی بات مت کر لالے! پاڑے پہ حق صِرف بل کا بنتا ہے۔‘‘

یکایک دینا اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی کھردری آواز میں کہنے لگا کہ سرِ دست تھل سب سے موزوں آدمی ہے۔ دادا سے اپنے خصوصی تعلق کے ناتے تھل پر لازم ہے کہ وہ اُس کے پاڑے کا بھرم قائم رکھے، تھوڑے ہی دن کی تو بات ہے۔ تھل کو صرف اُس وقت تک بیٹھنا ہے جب تک دادا کو ختم کرنے والے سامنے نہیں آجاتے۔ تھل کی مرضی ہے کہ پھر جیسا چاہے کرے۔ اُس کے بعد ہم پھر اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ یہ رِیت نئی بھی ہے اور اچھی بھی کہ اِس طرح بھی ہم اپنے بارے میں کچھ فیصلے کر سکتے ہیں۔

دینا بیٹھا ہی تھا کہ چوکی کے دائیں جانب بھاری تن و توش، کالی رنگت کا ایک عمر رسیدہ دادا کھڑا ہو گیا اور دبے لہجے میں بولا۔ ’’مائی باپ! حکم ہوئے تو اپن بھی کچھ بولے؟‘‘

سب کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ آنکھیں اُبلی اُبلی، ٹھوڑی کا گوشت لٹکا ہوا، انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی اور کان میں دُریا پڑی ہوئی۔ مَیں اُسے نہیں جانتا تھا۔ تھل نے اُسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا لیکن شاید اُس نے دیکھا نہیں، کھڑا رہا اور کہنے لگا۔ ’’تم اپن کو نہیں جانتا، اپن پانڈے ہے، سوٗرت شہر سے آیا ہے۔‘‘

وہ ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بنارسی دادا نے اُٹھ کے اُس کا بازو تھام لیا اور تھل سے مخاطب ہو کے بولا۔ ’’اپن بولتا ہے۔ یہ پورا نہیں بولے گا کہ پانڈے دادا کون ہے۔ اِدھر بمبئی میں کسی پاڑے کا کوئی آدمی ایسا نہیں جس نے اگر پانڈے دادا کو دیکھا نہیں تو اِس کا نام بھی نہ سُنا ہو۔ یہ اِدھری پاڑا چلاتا تھا۔ پانڈے دادا مانگتا تو ایک وقت میں بمبئی کا اکھا پاڑا اِس کا گود میں ہوتا پر یہ اپنے پاڑے سے کبھی باہر نہیں نکلا اور نہ اِس کا طرف کبھی کسی نے آنکھ اُٹھا کے دیکھا۔ ابھی بمبئی میں کتنا دادا لوگ کو چاقو کا بولی پانڈے دادا نے سکھایا ہے۔ جیسا کوئی بولتا ہے، ایک دم ایسا مانک تھا۔ پانڈے دادا کے علاقے میں پنچھی بھی پوچھ کے اُڑتا تھا۔ چیتے کے مانک جھپٹ تھا اس میں۔ جدھر بولتا تھا، چاقو اُسی طرف کو جاتا تھا۔ ایک دن منگج پھر یلا تھا کہ

بمبئی کا پاڑا خلاص کیا اور سُورت چلا گیا۔ اُدھر شہر میں جو بڑا پاڑا ہے، وہ پانڈے دادا کا ہے۔ اِس کے ہوتے دوسرا کیسے ہوئے گا بھی کیسے۔ اور اِدھر جو سوٗرت والا دادا بیٹھا ہے، اُس کا بنایا ہوا ہے۔ پانڈے دادا اِس کو بمبئی کا پاڑا دے کے گیا تھا۔ برس ہو گیا پر ابھی تک لوگ پانڈے کا پاڑا ہی بولتا ہے۔ کبھو جب بمبئی کا یاد آتا ہے تو پلٹ کے آتا ہے۔ اپن کو پتہ نہیں کبھی پیرو دادا کو دیکھے بنا لوٹ کے گیا ہو۔ پیرو دادا سے اس کا یاری ہے۔ اچھا ہے کہ پانڈے دادا بھی اِدھر ہے۔ کوئی اور ہوتا تو ابھی اِس .....‘‘

’’بیٹھ جا۔‘‘ پانڈے دادا نے بنارسی کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اُسے بٹھا دیا۔ پہلے بھی وہ کئی بار اُسے ٹوک چکا تھا۔ بنارسی خاموش ہوا تو وہ تھل کی طرف ہاتھ جوڑ کے بولا۔ ’’اپن غلام اُس کا۔ عمر میں وہ اپن سے چھوٹا تھا پر اپن کا باپ تھا۔ کیا بولے اپن کا کیا تھا وہ۔‘‘ اُس نے دل گیر لہجے میں تھل کو بتایا کہ وہ کل ہی رات بمبئی آیا تھا، یہ سُن کے کہ پیرو لمبے سفر سے واپس آگیا ہے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ یہاں یہ دیکھنے کو ملے گا۔ کل رات سے ایک پل کے لیے اُس کی آنکھ نہیں لگی ہے۔ رات سے وہ پاڑے پر ہے۔ اُسے بھی اُن لوگوں میں شامل سمجھا جائے جو پیرو ماچھی کے قاتلوں تک پہنچنے اور انھیں کتّوں کے آگے زندہ ڈال دینے کے لیے بے چین ہیں۔ پیرو تو کسی چٹان کی طرح تھا، لوہے کا بنا ہوا۔

پانڈے دادا کی پاٹ دار آواز میں گرہیں سی پڑنے لگی تھیں۔ ’’اپن آج پہلی بار سب کے سامنے زبان کھولتا ہے، اپن ایک دم بمبئی سے کیوں چلا گیا تھا۔ ایک دن پیرو پاڑے پہ آ کے بولا، پانڈے دادا! اپن صاف بولے، جب تک تم ہاتھ نہیں کر لے گا، اپن کو ابھی چین نہیں پڑے گا۔ اپن تمھارے بارے میں سُن سُن کے تھک چکا ہے اور تمھارا چاقو، تمھارا ہاتھ دیکھنے کو اِدھر آیا ہے اور بول دے کہ پاڑا لینے کو نہیں، ہاں اگر اپن کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا تو اپن ماہم کا پاڑا چھوڑ کے چلا جائے گا۔‘‘ پانڈے کہنے لگا کہ اُس نے پیرو کو ٹالنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ اگر میرے پاڑے سے تمھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے تو مجھے بھی تمھارے پاڑے سے دلچسپی نہیں۔ پھر کیوں ہم ناگوار صورتِ حال سے دوچار ہوں مگر پیرو نہ مانا، وہ اصرار کرتا رہا اور چاقو نکال کے کھڑا ہو گیا اور دھمکی دینے لگا کہ اب یا تم پر ہو گئے یا میں۔ ناچار پانڈے دادا کو بھی چاقو نکالنا پڑا۔ پیرو کی خواہش پر وہ پاڑے کی ایک کوٹھری میں آ گئے، اُن دونوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ پیرو آیا بھی اکیلا تھا۔ دونوں چاقو آزمائی کرتے رہے اور پانڈے کے کہنے کے مطابق وہ تفصیل کیا بیان کرے۔ بہت دیر لگی۔ دونوں پسینے پسینے ہو گئے اور وہی ہوا جو پیرو دادا طے کر کے آیا تھا اور جس کا پانڈے کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو چکا تھا۔ پانڈے کا چاقو اُس کے ہاتھ میں برقرار نہ رہ سکا۔ پیرو اُسے سینے سے لگا کے چلا گیا۔ پھر پانڈے بھی اپنے پلٹے نہیں پھرا۔ دو ایک دن ضرور اُس نے تذبذب میں لگائے لیکن آخر اُس نے اپنے دل کے فیصلے پر عمل کیا۔ پیرو کو پیغام پہنچایا کہ وہ آ کے اُس کے پاڑے پر بیٹھ جائے یا اپنا کوئی آدمی بھیج دے۔ پیرو نے انکار کر دیا تو پانڈے اپنے عزیز شاگرد سوٗرت والے دادا کو پاڑے پر چھوڑ کے خود سوٗرت چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ سوٗرت والے کو تاکید کر گیا تھا کہ کبھی پیرو دادا اِس طرف آنکلے تو وہ پاڑے کی چوکی سے ہٹ جائے مگر پیرو نے اُس کے بعد کبھی پانڈے کے پاڑے کا رُخ نہیں کیا اور ایک دن اچانک سوٗرت پہنچ گیا اور پانڈے سے منت کرنے لگا کہ بمبئی واپس چلے۔ اُس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اُسے پانڈے کے پاڑے سے کوئی سروکار نہیں ہے مگر پانڈے پھر نہیں لوٹا لیکن وہ بمبئی برابر آتا رہا، صرف پیرو سے ملنے کے لیے۔ پیرو اُسے اتنی عزت دیتا تھا، اُس کا ایسا خیال کرتا تھا جیسے پانڈے اُس کا باپ، اُس کا اُستاد ہو۔ اُس نے کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا کہ پانڈے سے اُس کا کبھی کوئی تصادم ہوا تھا۔ پانڈے کو اگر کبھی بمبئی آنے میں وقت لگ جاتا تو پیرو اُس سے ملنے خود سوٗرت چلا جاتا۔

پانڈے کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس کی آواز بھی بھرّا رہی تھی۔ کمرے میں سنّاٹا سا چھا گیا تھا۔ چند لمحے وہ چپ کھڑا رہا پھر کہنے لگا کہ میرا دماغ کام نہیں کر رہا، وہ کون اندھے عقل سے عاری لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے ایک اتنے زندہ آدمی کو ختم کر دیا۔ اُنھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ کون تھا۔ وہ پیرو اور ماچھی دادا کے دشمن نہیں تھے، اپنے دشمن ہیں۔ ایک آدمی کی طاقت، اُس کے سارے دوستوں کی طاقت ہوتی ہے۔ ایک آدمی کے ختم کر دینے سے اُس کے دوست ختم نہیں ہو جاتے۔ اُنھیں دکھائی نہیں دیا کہ پیرو کے کتنے اور کیسے دوست ہیں، پہلے اُن سب کو ختم کرنا چاہیے تھا۔

پانڈے نے نسبتہً ٹھیری ہوئی آواز میں تھل سے کہا کہ کوئی ایک دن میں کیسے ماہم کے پاڑے پر نئے دادا کا خیال کر سکتا تھا۔ یہ تو پیرو دادا کا پاڑا ہے۔ اُس کی عدم موجودگی میں ماچھی بیٹھتا تھا تو بھی یہ پیرو کا پاڑا تھا۔ یہ عمارت اُسی نے بنوائی تھی۔ اِس کے در و دیوار پر اُس کے نقش ہیں۔

بنارسی نے اُٹھ کر پھر کچھ کہنا چاہا مگر پانڈے نے ڈپٹ کے اُسے بٹھا دیا اور کہنے لگا کہ یہاں لوگوں کے درمیان بیٹھ کے اُس نے بہت کچھ سُنا اور دیکھا ہے اور اِس نتیجے پر پہنچا ہے کہ تھل ہی کو پاڑے پر رہنا چاہیے۔ حالانکہ وہ تھل سے اتنا واقف نہیں لیکن اُسے یاد ہے، زیادہ عرصہ نہیں گزرا، پیرو نے اُس سے تھل کا ذکر بہت اشتیاق اور احترام سے کیا تھا اور کہا تھا، پانڈے! دیکھنا، اب کے بمبئی آیا تو اُس سے ملواؤں گا۔ پانڈے نے کہا کہ پیرو اگر تھل کا ذکر نہ کرتا تو بھی تھل کو دیکھ کے اُس کے بارے میں وہ یہی رائے قائم کرتا۔ پیرو ہاتھ کا صاف، دل کا صاف تھا۔ اُس کا کوئی دوست بھی اُسی جیسا ہو سکتا ہے۔ یہاں سب ماہم کے پاڑے پر بدستور رہتا پہنچانے کے لیے آمادہ ہیں تو اِس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک تجربہ کار شخص دادا کی گدّی سنبھالے۔ کوئی متنازعہ شخص پاڑے پر بیٹھا تو اِس سے دادا کے نادیدہ دشمنوں کا حوصلہ بڑھے گا۔ آج کی بات اور ہے، آج شہر کے جو دادا یہاں گم سم بیٹھے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں، کل انھی کے درمیان اِس معاملے پر اختلافات جنم لے سکتے ہیں اور پولیس اِس خلفشار سے فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ جیسا کہ تھل کا خیال ہے، مناسب یہی ہوگا کہ ہم ہر طرف کا دھیان رکھ کے کچھ طے کر لیں۔ کوئی ایسا فیصلہ جو ہم نے اِس طرح کبھی نہیں کیا، مگر جو کیا جا سکتا ہے جس پر سب متفق ہوں اور قائم بھی رہ سکیں۔ بمبئی کے پاڑوں میں سے کوئی دادا لیا گیا تو شاید زیادہ دیر تک ہم اُس کے ساتھ نہ چل سکیں۔ باہر کا آدمی ہونا چاہیے یا اِسی پاڑے کا۔ کسی کو حق تلفی کی شکایت نہیں ہوگی۔ وہ کہنے لگا کہ اُسے اِس اندیشے سے اتفاق نہیں ہے کہ پیرو دادا کے زمانے کی طرح سب جوں کا توں رہا تو دادا کے قاتل پھر اِس طرف کا رُخ کریں گے۔ اِس کا موقع ہی شاید نہ آئے۔ اگر ہم میں سے کوئی ایسی کسی احتیاط کے سبب پاڑے پر بیٹھنے سے کتراتا ہے تو اُسے پاڑے کا کام چھوڑ کے کوئی دوسرا دھندا کرنا چاہیے۔ بار بار ایسا نہیں ہوگا لیکن ہاں، اُن کی بازیابی میں بہت دیر

ہو گئی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ کہہ کے پانڈے بیٹھ گیا۔ کئی دادا کچھ کہنے کے لیے مضطرب تھے لیکن شوا کی آواز اُن پر غالب آئی۔ "ابھی تم بھی تو باہر کا آدمی ہے۔"

بیک وقت کئی اطراف سے شوا کی تائید میں آوازیں اُٹھیں۔ پانڈے سر جھٹکتا ہوا دوبارہ کھڑا ہوا اور ہذیانی سے انداز میں بولا "کیا بولتا ہے تم؟ پاگل ہو گیا ہے ابھی سب۔ تمھارا مطلب ہے، اپن کو باہر کا آدمی سمجھ کے ایسا بولا تم؟" وہ اتنا برانگیختہ ہو گیا تھا جیسے کسی نے اُسے گالی دی ہو۔ کہنے لگا کہ کیا وہ پھر سے دُہرائے جو یہاں بیٹھے لوگوں نے توجّہ سے نہیں سُنا۔ اُس نے یہ سب اِس لیے نہیں کہا تھا کہ اُس کے منہ پر یوں طمانچہ مارا جائے۔ یہ ماہم کا پاڑا ہے، پیرو دادا کا پاڑا۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کے توبہ کرنے لگا اور دریدہ لہجے میں بولا کہ اُس کے دل میں تو اب ایک ہی حسرت ہے کہ کسی طرح پیرو اور ماچھی دادا کے قاتلوں کے سر اُتار لائے۔ اُسے معلوم ہے کہ اِس طرح پیرو دادا اور ماچھی واپس نہیں آ جائیں گے مگر تب تک اُسے قرار بھی نہیں آئے گا۔ اِس وقت تو نہ اُس کا دل قابو میں ہے نہ دماغ۔ ایسی حالت میں وہ پاڑے پر کیا بیٹھے گا اور پاڑے کے لیے کیا کر سکے گا۔ یہاں تو ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو ساری ڈوریاں اپنے ہاتھ میں رکھتا ہو۔ یہاں دادا کا محترم دوست بتھل موجود ہے۔ اُس کے ہوتے کسی دوسرے کا خیال، پانڈے کے مفہوم کے مطابق، عاقبت نااندیشانہ ہی نہیں، مجرمانہ بھی ہے۔

کسی طرف سے پھر آواز اٹھی تھی۔ پانڈے دادا نے اُسے جھڑک دیا اور بولا کہ آگے کسی نے ایک لفظ کہا تو وہ اُٹھ کے چلا جائے گا۔

ہر طرف تکدّر آمیز خاموشی طاری ہو گئی۔ بتھل بھی چُپ رہا۔ پھر سب سے پیچھے دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا ہوا اندھیری کا موجود نوجوان دادا سکندر ہچکچاتے ہوئے اُٹھا۔ راجن کے جیل جانے کی وجہ سے چند روز پہلے پیرو نے اُسے اندھیری کے پاڑے پر تعینات کیا تھا۔ سکندر کچھ بولنے سے پہلے جیسے لفظ ڈھونڈتا رہا۔ اُس کے چہرے پر متانت تھی۔ اُس نے دھیمی آواز میں کہا کہ کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے ہمیں پولیس کے طرزِ عمل پر اچھی طرح نظر رکھنی چاہیے۔ پولیس جانتی ہو گی کہ دادا پر کسی ایک پاڑے ہی کے لوگوں نے حملہ کیا ہو گا لیکن پولیس کو اِس بہانے شہر کے تمام پاڑوں سے چھیڑ خانی کا موقع مل گیا ہے۔ آئندہ وہ اور تلخ رویّہ اختیار کر سکتی ہے اور جیسا کہ پانڈے دادا نے اشارہ کیا، پاڑے کے داداؤں کے درمیان نفاق کا بیج بو سکتی ہے۔

سکندر وہی کچھ دُہرانے لگا جو کل شام شکلا نے بتایا تھا کہ کل سارے دن پولیس مختلف پاڑوں پر چھاپے مارتی رہی اور ہر پاڑے سے متعدد آدمی گرفتار کر کے لے گئی۔ پولیس کا رویّہ نہایت درشت اور دہشت انگیز تھا۔ سکندر کو حیرت تھی کہ پولیس اب تک ماہم کے پاڑے پر کیوں نہیں آئی۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس پیرو دادا کے خاص پاڑے کو مشتبہ نہیں سمجھتی۔ اُس کا شبہ دوسرے پاڑوں پر ہے اور بے سبب نہیں ہو گا۔ یہ خاص بات سامنے رکھتے ہوئے ماہم کے پاڑے پر شہر کے کسی اور پاڑے کے دادا کا گدّی سنبھالنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ پولیس کی بے جا دخل اندازی سے نجات پانے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم جلد از جلد دادا کے قاتلوں کو پکڑ کے زندہ یا مردہ اُس کے حوالے کر دیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے تمام شکوے شکایتیں سرِدست یک سر فراموش کر دیں اور ایک دوسرے پر اعتماد کریں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قاتل پولیس کو ورغلانے اور کسی نتیجے پر نہ پہنچنے دینے کی پوری کوشش کریں گے۔ پولیس کی اُفتاد پڑنے پر ایک پاڑا دوسرے پاڑے کی مدد تبھی کر سکتا ہے جب سب کسی ایک مرکزی پاڑے سے بندھے ہوں اور اُن کے درمیان گہرا رابطہ ہو۔ ماہم کے پاڑے کی مرکزی حیثیت برقرار رہے گی تو کم از کم ایک طرف سے سکون رہے گا، پولیس کو اتنا کھُل کھیلنے کا موقع نہیں مل سکے گا اور یہ بھی ممکن ہے جب ماہم کے پاڑے پر کوئی ایسا دادا چوکی پر بیٹھا ہو جس کی سوجھ بوجھ، زور اور غیر جانب داری پر تمام پاڑوں کے دادا یقین رکھتے ہوں، جیسا کہ پیرو دادا نے ثابت کیا تھا۔

سکندر کی آواز بتدریج بلند ہوتی گئی۔ وہ کسی پختہ کار دادا کی طرح بردباری اور تحمّل سے ایک ایک کر کے مختلف پہلو کرید رہا۔ اُس کی زبان ذرا صاف ہوتی تو کوئی بھی اُسے پاڑے کا دادا نہ کہتا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ گزشتہ تین روز سے پیرو دادا کا بیشتر وقت اندھیری کے پاڑے پر گزرا ہے۔ پرسوں رات جب گولی چلی تو وہ باندرے سے اندھیری ہی کی طرف آ رہا تھا۔ اِس دوران سکندر کو اُس کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا۔ پیرو دادا بار بار بتھل کو یاد کرتا اور کہتا، راجن کا معاملہ جلدی طے ہو تو وہ اپنے دوست بتھل کے پاس جائے۔ وہ کہتا تھا، اگر کسی دادا کو دیکھنا ہے تو اپنے بتھل بھائی کو دیکھو۔

سکندر کی باتیں سب توجّہ سے سُنتے رہے تھے۔ وہ بیٹھ گیا تو کمرے میں بھانت بھانت کی آوازیں گونجنے لگیں۔ شنکرا، سُندر، لال خان، سورت والا، دینا، بنارسی مدنا، وہ سبھی شدّ و مد سے بتھل پر اصرار کرنے لگے کہ اُسے اب انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اُن کے لہجوں میں بظاہر کوئی کھوٹ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اُن میں دل سوزی بھی تھی اور تشویش و تردّد بھی۔

بتھل حقّہ گڑگڑاتا رہا۔ جب سب چُپ ہو گئے تو اُس نے نال ہونٹوں سے ہٹائی اور بھاری آواز میں کہا "ہم ایسے پاڑے نہیں بیٹھتے۔"

"پھر کیسے بیٹھتا ہے؟" دینا غصّے میں بولا۔

"بل پر بیٹھتے ہیں۔"

"پر اِدھر بل دکھانے کو کون بولتا ہے۔ جب سب چُپ ہے تو اپنے کو نا بولتا ہے۔" لال خان نے ناراضی سے کہا۔

"اپنے کو اِدھر ٹکنا نہیں ہے، پھر اُدھر دادا کے گھر کی طرف دیکھنا ہے۔ دونوں باؤلی ہو گئی ہیں۔"

"تو پھر اِدھر راجا دادا کو بٹھا دو۔" بالے جھپٹتی آواز میں بولا۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے جمرو نے مجھے کہنی ماری۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ بتھل انھیں منع کر دے گا اور کسی توقف کے بغیر بتھل نے یہی کیا۔

"پھر تم جس کو بول دو، کوئی تو بیٹھے گا اِدھر۔ کوئی آدمی تم کو برابر نہیں ملتا تو ابھی دادا کی جوتی چوکی پر رکھ دو۔" بالے کے لہجے میں بھی تندی آ گئی۔

"تھی بیٹھو دادا! اپن کی بنتی ہے۔" قلابے کے دادا جارجی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ اُس کی آواز دھڑک رہی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"تو بھی یہی بولتا ہے رے!" بتھل نے سر اُٹھا کے کہا۔

"ابھی یہی ٹھیک ہے۔" جارجی اٹکتی زبان سے بولا۔

بتھل نے ہنکاری بھری اور چُپ بیٹھا رہا۔ طرح طرح کی آوازیں آتی رہیں پھر پانڈے نے جھٹ اُٹھ کے بتھل کے پیروں پر اپنا چاقو ڈال دیا۔ بالے نے بھی اُس کی تقلید کی، جارجی نے بھی، سورت والے نے بھی اور دینا نے بھی۔ دیکھتے دیکھتے بتھل کے پیروں پر چاقوؤں کا ڈھیر لگ گیا۔ بتھل نے ہاتھ بلند کر کے اُن سے کچھ کہنا چاہا لیکن شور میں اُس کی آواز سنائی نہیں دی۔

❖ بتھل نے سر جھکا لیا۔ شاید اب حجت پوری ہو گئی تھی۔ وہ چاہتا تو ابتدا ہی میں چاقو نکال کے اُن کے سامنے کھڑا ہو جاتا یا مجھے اشارہ کر دیتا۔ اوّل تو اُن میں سے کوئی سامنے ہی نہ آتا، آتا بھی تو فیصلے میں زیادہ دیر نہیں لگتی، لیکن یہ چاقو کے زور پر پاڑا حاصل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اُنھیں اِس کے سوا بھی کچھ بتانا اور جتانا مقصود تھا جو اُنھوں نے یقیناً اچھی طرح جان لیا ہو گا۔ دوسری صورت میں اُنھیں اِس سفید و سیاہ سے آگہی کا موقع نہ ملتا اور وہ کوئی بھی اُلٹا سیدھا قدم اُٹھا سکتے تھے۔ شروع شروع میں مجھے بتھل کی مرضی کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بعد میں اُن کی باتیں سُن سُن کے میری سمجھ میں آ گیا کہ بتھل نے اُن لوگوں کو کیوں جمع کیا ہے اور اِس تکرار و حجت کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ بتھل کو نہ اڈّے پاڑوں سے اب کوئی سروکار ہے اور نہ بمبئی میں اُس کا مستقل رہنے کا ارادہ ہے۔ اُس کا بس چلتا تو وہ ہمیشہ فیض آباد میں اپنی زمیں کے پاس ہی رہتا۔ پیرو دادا کے پاڑے پر بیٹھنے کا خیال تک اُس کے ذہن میں نہیں ہو گا۔ اِس کا تصوّر ہی اذیت ناک تھا لیکن دادا کا پاڑا کسی ایرے غیرے کے حوالے بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عمارت دادا کی ذاتی ملکیت تھی اور عمارت ہی کیا، پاڑے کے جن آدمیوں سے زندگی بھر قدم قدم پر اُس کا ساتھ رہا جو گیتا کی طرح اُس کی اولاد کے مانند تھے، بتھل کو اُن کا بھی خیال رکھنا تھا۔ پاڑے کو لوٹ کھسوٹ سے بچانے کے لیے ہماری موجودی اور فعّالیت ضروری تھی، کسی اور طرح نہیں، باقاعدہ پاڑے کے نگراں کی حیثیت سے۔ اس میں ہماری عافیت کا پہلو بھی مضمر تھا۔ پولیس نے پرسوں رات ہمیں تھانے سے آ جانے دیا تھا لیکن وہ دوبارہ بھی ہماری طرف متوجّہ ہو سکتی تھی۔ چند دنوں کے لیے ہمیں بھی کسی پاڑے کی مضبوط چھت درکار تھی۔ بے پاڑے کا دادا پولیس کی نظروں میں کسی یتیم کے مانند ہوتا ہے۔

پولیس کو اب اس خبر سے اتنی حیرت نہیں ہو گی کہ وہی بتھل پیرو دادا کی گدّی پر موجود ہے جس نے تھانے میں افسروں کے استفسار پر پاڑے کی منصب داری سنبھالنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ پولیس سے قُربت رکھنے والے اور اُسے خبریں فراہم کرنے والے بعض دادا یہاں ضرور ہوں گے، اُن کے ذریعے پولیس کے علم میں یہ حقیقت بھی آنی چاہیے کہ بتھل نے کسی

اور اگر، جیسا کہ اُن کا قیاس تھا، قاتل بھی وہاں موجود
وبہ سب جان کے اُن پر کیا گزری ہوگی۔ اُنھیں تو ایسے ہی ٹال ک
بانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے یہ مجمع لگانے سے بتھل کا مقصد اُن
بجے ٹٹولنا بھی ہو اور اُنھیں یہ جتانا بھی کہ دادا کے نام لیوا
ن سے اُن پر وار نہیں کریں گے۔ نیچے آ کے بتھل نے اُن سے
، وہ جب تک پاڑے پر نہیں رہے گا، پانڈے دادا پاڑے کی
بھال کرے گا۔ یہ سن کے پانڈے دادا ہاتھ جوڑ کے انکار
ے لگا مگر بتھل نے اُسے زیادہ واویلا نہیں کرنے دیا۔ اُس
اپنا چاقو نکال لیا اور وہ غالباً پانڈے کے پیروں پر ڈالنا چاہتا
مگر پانڈے نے ایک دم بڑھ کے اُس کے ہاتھ جکڑ لیے اور
زدار اُس کے سینے سے لگ کے پھڑکنے لگا۔

علاقے کے کسی سیٹھ کی جانب سے دوپہر کے کھانے کا انتظام
لیا تھا لیکن بتھل کھانا کھائے بغیر اُٹھ گیا۔ پانڈے اور دوسرے
داداؤں نے اُسے روکنے کی کوشش کی لیکن بتھل نے دادا
گھر جانے کا عذر کیا تو سب چپ ہو گئے۔ پاڑے کے باہر لوگوں
بھیڑ لگی تھی اور چبوترے پر رکھی ہوئی دیگوں سے مسلسل کھانا
سیم کیا جا رہا تھا۔ پانڈے، سُورت والا، دینا، سکندر، لال خان
را چھیدا اور جارجی وغیرہ ہمیں موٹر تک پہنچانے آئے۔ سڑک
ے کنارے ابّا جان کی موٹر کھڑی تھی۔ جمرو، شامو اور مارٹی بھی
ہلے ساتھ بیٹھ گئے۔ پاڑے کے علاقے میں دُور دُور تک مسلح
سپاہی گشت کر رہے تھے اور دادا کے گھر کے اطراف گلیوں
یں بھی وہ ہمیں دکھائی دیے۔ گزشتہ رات کی طرح گھر کے باہر
محتاجوں اور ناداروں کی قطاریں لگی تھیں۔ شبّی چاچا ہمیں باہر
ہی مل گیا۔ اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ ابّا جان کی ہدایت پر غریبوں
میں کپڑا تقسیم کیا جا رہا ہے۔ بازار سے کپڑے کے گٹھ کے گٹھ آتے
تھے لیکن اِدھر آئے، اُدھر ختم ہو گئے۔ اب ابّا جان نے اُن کے لیے
لو کپڑا منگوایا تھا اور محلّے کے چند بزرگوں سے درخواست کی تھی۔
کر وہ اِس کارِ خیر کی نگرانی کرتے رہیں، کوئی سائل خالی ہاتھ نہ
جائے۔ شبّی چاچا کی روداد ادھوری چھوڑ کے بتھل تیز قدموں
سے سیدھا اندر چلا گیا۔ کوئی بھی وہاں سے نہیں گیا تھا اور کسی
نے ہمارے انتظار میں دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ برآمدے میں
پڑوس کی عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی جولین بتھل کو دیکھتے
ہی کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی کہ صبح سے کئی بار گیتا اُسے پوچھ چکی
ہے اُس کے لہجے میں شکایت تھی۔ وہی ہمیں اندرونی کمرے میں

لے گئی۔ وہاں فرخ، فریال، شہ پارہ اور مولوی اکرم کی بیٹی ریحانہ
کے ساتھ گیتا ایک کونے میں خوف زدہ بیٹھی تھی۔ ہونقوں
کی طرح پھیلی ہوئی آنکھیں، جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو،
چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ آدمی بھی گلستانوں کی طرح
ہوتے ہیں، مدّتوں میں بہار آتی ہے اور ایک تند جھونکے میں سب
کچھ اُجڑ جاتا ہے۔ اُس کی نظریں دروازے ہی پر لگی تھیں جیسے ہی
ہم اندر داخل ہوئے، وہ بے کل ہو گئی مگر اِس سے پہلے کہ وہ اُٹھ
کے ہمارے پاس آتی، بتھل لپکتا ہوا اُس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ تو دریا
بنی بیٹھی تھی، سر پہ بتھل کا ہاتھ آتے ہی اُمڈ پڑی۔ بتھل نے اُسے
وہاں سے اُٹھا لیا اور اُس کا بکھرا بکھرا سراپا اپنے پہلو میں سمیٹے
بیرونی کمرے میں چلا گیا، میں وہاں نہیں گیا۔

جولین کے بلاوے پر کھانے کے لیے جب میں بیرونی کمرے
میں پہنچا تو توقع کے خلاف گیتا بہت سنبھلی ہوئی تھی۔ اتنی دیر
میں بتھل جانے اُس سے کیا کیا کہتا رہا ہوگا، فرش پر لمبا دستر
خوان بچھا تھا اور گھر کے تقریباً سبھی افراد موجود تھے۔ مارٹی، جمرو
اور شامو بھی۔ غذا کی ضرورت ایک رسم بھی تو ہے، صبح و شام
کی رسم، سب بس کوئی رسم ادا کر رہے تھے۔ سفید ساڑی میں ملبوس
رانی بالکل میرے سامنے بیٹھی تھی۔ صبح کی نسبت اب اُس کے
چہرے پر عزم و اعتماد سا نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کے مجھے یک گونہ
سکون ہوا لیکن پھر ایسا لگا جیسے یہ استقامت صبر و شکر کی نہیں،
غصّے اور خود آزاری کی کوئی کیفیت ہے، جیسے رانی نے کچھ طے
کر رکھا ہو اور جیسے وہ کچھ چھپا رہی ہو۔ آدمی غم بھی تو چھپاتا ہے،
غم، غصّہ، خوف، نفرت۔ غم زدہ کو دوسروں کا بھی تو خیال رکھنا
چاہیے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ زخم خوردہ کو اپنے مسیحا کی نزاکتِ
احساس کا خیال بھی رہے۔ ہر غم شاید یوں ہی زہر بن جاتا ہے۔
ممکن ہے، رانی کے بارے میں یہ میرا گمان ہو۔ بہت سے وہم و گمان
آدمی کی اپنی نظر کا فتور ہوتے ہیں۔ آنکھیں اپنے اندر کے حبس،
اپنے اندر کے فشار سے مشروط ہوتی ہیں۔ ایک عینک آدمی کے
اندر بھی تو ہوتی ہے جس کے شیشے آدمی کے اپنے موسم سے بدلتے رہتے
ہیں، گھڑی گھڑی یہ پیمانے بدلتے رہتے ہیں۔

جولین نے میرے، جمرو، شامو اور مارٹی کے لیے ایک الگ
کمرے کا انتظام کر دیا تھا تاکہ ہم آرام کر سکیں مگر جولین اِس خلوت
کی منتظر تھی۔ کھانے کے بعد ہم چاروں وہیں آ گئے اور ابھی ہم نے
بستر پر کمر ٹکائی ہی تھی کہ جولین کے واپس آ جانے پر ہمیں اُٹھ جانا پڑا۔

قدرِ تامل و تکدر کے بعد یہ پیش کش قبول کی ہے۔ وہ چاقو
نکال کے سب کے سامنے کھڑا نہیں ہو گیا تھا۔

پاڑے پر بیٹھنے کی یہی بہترین صورت تھی کہ پیش کش اُن
سب کی جانب سے ہو۔ کسی کو پچھتاوا نہیں ہوگا کہ صرف ایک
اُس نے اِس گراں بار فیصلے کی تائید میں آواز اُٹھائی تھی۔ اتنی
جلد کسی کا دماغ نہیں لوٹے گا کہ کل کوئی یوں بے سوچے سمجھے منہ
اُٹھائے اپنا حق جتانے چلا آئے۔ اتنے آدمیوں کے بیچ میں کیے
گئے عہد سے لوگ اتنی جلدی نہیں پھرا کرتے۔ مروّت بھی کوئی چیز
ہوتی ہے جو پاڑے کے آدمیوں میں بھی دوسروں سے کم نہیں ہوتی۔
چاقو کے زور پر پاڑا حاصل کرنے سے مراد تھی، اُن سب کی پسپائی
جو ماہم کے پاڑے پر کب سے نگاہیں لگائے ہوئے ہوں گے۔ اُسی اقتدار
و ثروت کی جگہ پر اچانک ایک 'ادا'، وہ بھی باہر کے دادا کے قبضہ
جمانے کا تازیانہ وہ کبھی دل سے قبول نہ کرتے۔ وہ کھمبے نوچتے اور
شہر کے داداؤں کو تنکے چبھوتے تو دوسری طرف پولیس کو یہ باور
کرانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے کہ ہم تو بس انتظار میں بیٹھے
تھے کہ کب پیرو دادا کا کانٹا نکلے، اور کیا عجب کہ وہ ہی ہوں جنھوں
نے دادا کو اِس طرح راستے سے ہٹا دیا ہے۔ جانے کب سے ہم دادا پر
گھات لگائے ہوئے تھے کہ اُس رات وہ نشانے پر آ گیا۔ اِس
صورتِ حال میں اُن کی شوشے بازی کیسی مضحکہ خیز اور مبالغہ آمیز
لگتی، ہمیں دیکھ کے پولیس نے کچھ کم خیال آفرینی اور ہرزہ سرائی کی تھی۔

میرے سر سے جالے چھٹ رہے تھے۔ بتھل نے تھانے
میں دیر کیوں لگائی تھی اور وہ اُن تین افسروں سے کیوں اُلجھتا رہا
تھا۔ اگر ہم اُس وقت تھانے جانے سے پہلو بچاتے اور دانستہ
وہاں اتنی دیر نہ لگاتے تو شاید یہ فراغت کبھی نہ ملتی۔ دادا کے گھر
کے راستے میں، دادا کے گھر پر، پاڑے میں کسی بھی وقت وہ ناگہاں ہمارے
سروں پر پہنچ جاتے۔ بمبئی میں ہماری موجودی اور دادا سے تعلق کا ایک
ذرا سا اشارہ ہی اُنھیں مضطرب کر دیتا اور ہمیں اپنے رُوبرو کیے
بغیر اُنھیں چین نہیں آتا۔ ہم نے اُنھیں اپنی تلاش کی زحمت
نہیں دی تھی۔ یہ کام ہم نے خود انجام دے دیا تھا۔ اب اُنھیں
کوئی شکوہ نہیں ہوگا کہ اُس رات اُنھوں نے ہمیں اچھی طرح دیکھا
بھالا نہیں تھا۔ ہم دیر تک اُن کے سامنے رہے تھے۔ شاید کوئی کسر
رہ گئی تھی۔ بتھل کو دادا کی آخری رسم، گیتا اور رانی کی دل جوئی،
پاڑے کا نظم، سبھی کچھ ذہن میں رکھنا تھا۔ یہ نہ ہوتا تو کون کہہ سکتا
ہے کہ پھر دادا اور ماچھی کی لاشیں کب تک اسپتال کے سرد خانے

میں اینٹھتی رہتیں، سب کچھ اتنے تسلسل اور تواتر سے پیش
دادا کا پہلے پاڑے پر آنا، پھر گھر لے جانا، دادا کی سواری کہ
اہتمام اور دھوم دھام سے نہ اُٹھتی جیسے کوئی دولھا
پھر یہ سب کچھ کس طرح رونما ہوتا۔ بتھل نے تھانے سے
پیلے از خود پولیس افسروں کو شہ دی تھی۔ سکندر کو یہ
پولیس ماہم کے پاڑے پر اب تک کیوں نہیں آئی۔
بتاتا کہ ہم یہ مرحلہ پہلے ہی سر کر آئے ہیں۔ جمرو اور شامو
میں بار بار مجھے خاموش ہو جانے کی تلقین اسی لیے
تھے کہ کہیں اپنی دیوانگی میں مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد
اندھیرے میں آنکھیں کھلی رکھنے کی اذیت ستم بالائے
اُنھیں دُہری اذیت سہنی پڑتی تھی، مصائب و ابتلا کے
سے اپنے سر محفوظ رکھنے کی اذیت۔ صبر و ضبط تو بجائے خو
آزار ہے۔ آدمی گزرنے والے وقت سے نبرد آزما ہو یا آنے وا
پرپشتے باندھے۔ آدمی سے اپنا آپا ہی نہیں سنبھلتا کہ وہ دو
بیساکھی بنے۔ جسم میں آگ لگتی ہو مگر آدمی اپنی صدا اپنے
رکھے۔ اُنھیں یہ ہنر آتا تھا۔ میں نے اُن سے زور آزمائی
بازی کے تمام حربے سیکھ لیے تھے مگر مجھ سے یہ مشقت نہیں
تھی۔ ہزار کوششوں کے باوجود مجھے اِس جبر کے طریقے نہیں

وہاں نہ شیرینی بٹی، نہ دودھ کا شربت تقسیم ہوا،
پھول۔ نئے دادا کی مسند نشینی پر کسی جانب سے تحسین و آ
غلغلہ بلند نہیں ہوا۔ کچھ ہی دیر میں بتھل نیچے بیٹھے ہو
کے درمیان چلا آیا، اُس کے پیچھے پیچھے وہ سبھی آ گئے۔
چہروں سے کسی ناروا اقدام کی ناگواری مترشح نہیں ہو
ہی چھلک رہا تھا کہ اُنھوں نے عجلت میں کوئی فیصلہ
کیا ہے بلکہ صمیمِ قلب سے کیا ہے۔ دل تو ممکن ہے، بعضوں کا
شامل نہ ہو جتنا اُنھوں نے دماغ سے کام لیا تھا۔ دماغ
فیصلے کسی قدر پائدار ہوتے ہیں۔ بتھل کو اسی قدر مہلت
تھی، وقت کی ایک ذرا سی امان۔ جن کے دل نے اُن کے
ساتھ نہیں دیا تھا، اُن معدودے چند داداؤں کو یہ ا
گیا ہوگا کہ ایک آدمی کے راکھ ہو جانے سے پانڈے کے
اُس کے نقش مٹ نہیں جاتے۔ اُس کا زور اور اثر، اثر
کتنے اُس کے ہم نشینوں، ہم نفسوں میں حلول کر جاتی ہے،
میں دھڑکتی رہتی ہے، کتنے لوگوں میں وہ خاکستر زندہ
اقبال اُسی کو کہتے ہیں جو آدمی کے جانے کے بعد بھی قا

وہ تنہا آئی تھی۔ اُس نے معذرت بھی نہیں کی جو بات بات پر اُس کا خاصہ تھا۔ کہنے لگی' مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے' صبح ایک پولیس انسپکٹر تین سپاہیوں کے ساتھ گھر آیا تھا۔ یہ سُن کے ہم چاروں چونک پڑے لیکن چپ رہے۔ جولین نے بتایا کہ وہ گیتا اور رانی کے بیانات لینے کے ارادے سے آئے تھے جولین ہی نے اُن سے بات کی اور کہا کہ اِس وقت تو یہ ممکن نہیں ہے۔ دونوں کی حالت اِس قابل نہیں کہ کوئی بیان دے سکیں' اِس موقع پر اُن سے کچھ کہلوانا زخم کریدنے بلکہ زخموں پر نمک چھڑکنے کے برابر ہوگا۔ انسپکٹر نے حاکمانہ انداز میں اصرار کیا کہ یہ قانونی کارروائی ہے۔ چونکہ قتل کا معاملہ ہے' پس ماندگان کے بیانات حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے' یہ اُنھی کے مفاد کے لیے ہے۔ اُسے احساس ہے کہ یہ ایک مشکل وقت ہے تاہم گیتا اور رانی کو زیادہ تکلیف نہیں دی جائے گی۔ اُن سے چند ہی سوالات کرنے ہیں۔ شاید اِس طرح پولیس کو تفتیش میں کوئی مدد مل سکے۔ جولین نے اُس سے درخواست کی کہ اگر یہ اتنا ہی ضروری ہے تو وہ دو تین دن بعد آجائے مگر انسپکٹر بہ ضد رہا اور کہنے لگا اگر اُسے اُن دونوں سے نہ ملنے دیا گیا تو اِس کے بہت سے معنی لیے جاسکتے ہیں گویا گھر والے حقائق چھپانا چاہتے ہیں اور پولیس سے بوجوہ تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ جولین کے کہنے کے مطابق' اُس نے انسپکٹر سے بہت عاجزی کی مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا چنانچہ جولین کا لہجہ بھی سخت ہوگیا۔ اُس نے کہا' ٹھیک ہے' پھر آپ یہی سمجھیں۔ تعجب ہے کہ ایک نہایت نازک بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی۔ اِس وقت وہ کیا بیان دے سکیں گی اور اِس کارروائی سے ہونے والے حادثے پر کیا اثر پڑسکے گا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ جولین جیسی نرم بیاں لڑکی میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی مگر جرأت تو ساری صداقت کی ہوتی ہے جس کی جولین میں کوئی کمی نہیں تھی' کہنے لگی' اُس نے سوچا کہ شکلا کا حوالہ دے لیکن اُسے یہ بھی نامناسب لگا اور شکلا کا نام اُس کی زبان پر آتے آتے رہ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر انسپکٹر ہی کو پسپا ہونا پڑا۔ جولین کا کہنا تھا کہ وہ ناراض ہوکے چلا گیا۔ اُس کے بعد سے اب تک کوئی نہیں آیا ہے لیکن اُسے اندیشہ ہے کہ پولیس کسی بھی وقت پھر آسکتی ہے۔ جمرد کے پوچھنے پر جولین نے بتایا کہ اُس نے ابھی بُھل سے اِس بابت کوئی بات نہیں کی ہے' اِس کا وقت بھی نہیں ملا۔ بُھل جب سے آیا ہے' گیتا کے ساتھ ہے اور اُسے آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ مَیں فوراً کوئی رائے نہیں دے سکا۔ ظا[ہر ہے] وہ لوگ دوبارہ آسکتے ہیں اور اِس بار اُن کا رویّہ پہلے [سے] تلخ ہوسکتا ہے۔ مَیں نے جمرد اور شامو کی طرف دیکھا وہ [کچھ] نہ کہہ سکے۔ دادا کے گھر میں ہماری مسلسل موجودگی اور گیتا اور [رانی] کے آگے دیوار بنے رہنے سے پولیس کا سر پھر گھوم سکتا تھا۔

جمرد' شامو اور مارٹی بھی یہی سوچ رہے تھے۔ جولین بھی یہی جواب دے سکتی ہے۔ پولیس دوبارہ واپس چلی جا[ئے] گی' اِس کے سوا اُس کے پاس چارہ بھی کیا ہے لیکن اِس [سے] گیتا اور رانی کی اشک شوئی کے لیے اُن کے گھر میں رہنے [والے] غیر متعلق لوگوں سے کس درجہ بدگمان ہوسکتی ہے' اِس کا [اندازہ] نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ اِس وقت تو پولیس کے سارے متع[لقہ] اہل کاروں کی حسیں بھوکے آدمی کے مانند ہیں لہٰذا کیوں [نہ گیتا] اور رانی کو سمجھا بجھا کے اُن کے سامنے کردیا جائے تاکہ [وہ یہ] کڑوا گھونٹ بھی پی لیں اور صاف صاف کہہ دیں کہ وہ اِس سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتیں لیکن پولیس بھلا اِس جواب [سے] مطمئن ہونے لگی۔ سوال کرنا پولیس کا مشغلہ بھی ہے' شوق اور سب سے آسان کام ہے۔ وہ تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے سوال [کرے] گے' یہ دیکھے بغیر کہ اُن کے مخاطب پر کیا عالم گزر جائے گا [پھر] پولیس اُن سے پاڑے کا تذکرہ بھی کرے گی' دادا کے معمو[لات کے] متعلق' شروع سے اب تک دادا کے مشاغل کے بارے میں [اور اگر] کسی نے ذرا بھی تیز آواز میں گیتا سے کچھ کہہ دیا اور پاڑے [کا بتا] دیا کہ اُس کا باپ بمبئی کے سب سے بڑے پاڑے کا دادا تھا [تو بے] شک گیتا سے اب کچھ بھی چھپا نہیں رہے گا۔ کل سے آس پا[س کی] عورتیں جو چہ میگوئیاں کرتی رہی ہیں' وہ اُس کے کانوں میں بھ[ی پڑی] ہوں گی لیکن ایک ہی وقت میں اتنے سارے انکشافات [سے وہ] اور بے حال ہوجائے گی۔

جولین سامنے کی کرسی پر سر جھکائے بیٹھی رہی میرا [ذہن] بھٹک رہا تھا۔ اگر گیتا کو نہیں تو رانی کو اُن کی جناب میں [پیش] کردیا جائے۔ رانی نے نسبتاً اپنے ہوش و حواس تھام کے [رکھے] ہیں۔ اُسے پیرو کے پاڑے کے متعلق بھی سب کچھ معلوم ہے [جو پولیس] کے سامنے آسکتی ہے یا گیتا اور رانی کو یہاں سے ہٹا ہی [کیوں] نہ دیا جائے۔ ابّا جان انھیں اپنے گھر لے جائیں گے۔ پولیس کی آمد پر شتی چاچا کوئی بھی عُذر کردے گا مگر اِس طرح تو پولیس شک میں پڑسکتی ہے۔ مارٹی' جمرد اور شامو بھی اِسی کشمکش [میں

[ا]سی لیے میری طرح کچھ کہہ نہیں پارہے تھے۔ پھر مارٹی نے اُلٹی [بات کہ]ہ دی کہا کہ کیوں نہ ڈاکٹر کیلاش کو آگے کردیا جائے یا کسی [اور] ڈاکٹر کو۔ کوئی ڈاکٹر اُنھیں باور کراسکتا ہے کہ اِس ناچاری و [بے بس]ی کی حالت میں یہ سوال و جواب تو اُنھیں اور شکستہ کردیں [گے۔] ڈاکٹر کی بات پولیس نہیں ٹالے گی۔ کسی وکیل کی بھی مدد لی [جاس]کتی ہے۔ جمرد نے مارٹی کو دھتکار دیا۔ مارٹی کا مشورہ الیا غلط [نہیں] تھا لیکن اُس نے غور نہیں کیا کہ رانی اور گیتا کے نگہ دار کون [...]ہیں اور پولیس اُنھیں کن نظروں سے دیکھتی ہے۔ ہر عُذر پولیس [رد] کرسکتی ہے اور ہر عُذر پر اُسے حیلے کا گمان ہوسکتا ہے۔ پولیس [کو]ئی ایک شخص نہیں جسے قائل کردیا جائے۔ پولیس کی نفری کے قرار [کی] ایک ہی صورت ہے کہ وہ دونوں اُس کے سامنے جاکے غیر معمولی [است]قامت کا ثبوت دیں' سماعت کے حوصلے کا۔ وہ پولیس کے ہر [سو]ال کا جواب صبر و سکون سے دیں۔ جولین کو اُن کی طرف سے [ایسی] ہوش مندی یا مصلحت کوشی کی ذرا بھی خوش گمانی ہوتی [تو] وہ پولیس کو منع نہ کرتی۔ اُسے معلوم تھا کہ غم تو نشے کی طرح ہوتا [ہ]ے۔ نشے سے کہیں زیادہ اندھا اور بہرا۔ اِس عالم میں وہ ڈھنگ [س]ے کیا بات کرسکیں گی' وہ تو سسکنے بلکنے لگیں گی۔ آنسوؤں کے [س]وا اب اُن کے پاس کہنے کو کیا رہ گیا ہے۔ جولین کو پولیس کی طرف [س]ے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کسی بلاغت اور نزاکت کا لحاظ رکھے [گ]ی۔ پولیس تو اُنھیں ایک پاڑے کے دادا' شہر کے مشہور دادا کے خاندان کے طور پر برتے گی۔ کون سفارش کرے گا کہ دادا نے اُنھیں پاڑے سے بہت دور شیش محل میں رکھا تھا۔ شہزادیوں کی طرح اور ساری زندگی ریشم ہی دیا تھا۔ جولین کو معلوم تھا کہ پولیس [ہ]مارے بارے میں بھی کوئی گوشہ رکھ کے اُن سے بات نہیں کرے گی۔ لہجے کی مروت پولیس کو نہیں آتی۔ آتی ہو تو وہ پولیس ہی کیوں ہو۔ شک پولیس کا طرۂ امتیاز ہے۔ شک یوں بھی اندھیرے میں روشنی کی کرن ہے۔ شک ہی کوئی راستہ دکھاتا ہے۔ شک یقین کا زینہ ہے۔ کوئی ایک تیر تو نشانے پر بیٹھتا ہی ہے۔

مارٹی سمجھ نہیں پارہا تھا کہ پس منظر میں ہم موجود ہیں۔ کسی بھی تاویل سے پولیس کو ہمارے حوالے کا پس منظر الگ کرنے میں مشکل پیش آئے گی اور بالفرض سب کچھ ممکن بھی ہوجائے' گیتا اور رانی میں اپنے باپ کے ترکے کی کوئی جرأت عود کر آئے تو بھی کیا لازم ہے کہ پولیس اُن کے بیان کی سادگی کو ہمارے نرغے اور حصار پر محمول نہ کرے۔ ہم جو اِدھر دھرنا دیے بیٹھے ہیں یہی سب جمرو اور شامو کے دماغ میں کھٹک رہا تھا' یہی کچھ جولین نے اپنے طور پر اخذ کیا تھا۔ سارا تردد اُن دونوں کے لیے تھا۔ اُن کے لیے ہمیں اپنی ضرورت تھی۔ ہم درمیان میں نہ ہوتے تو جانے اُن کا کیا حال ہوتا اور نہ ہمارا کیا ہے' پولیس زیادہ سے زیادہ ہمیں ساتھ لے جائے گی اور سلاخوں کے پیچھے ڈال دے گی۔ کچھ بھی ہمارے لیے نیا نہیں ہے' نہ سلاخیں نہ کٹہرا۔ اِس سے زیادہ پولیس اور کیا کرسکتی ہے۔ یہاں بدنامی اور رسوائی سے کون ہراساں ہے۔ یہ دُوں عزمی' دل تنگی' یہ شکستہ خاطری تو اُن دونوں کی خاطر تھی۔ اُن کے لیے ہمیں خود کو محفوظ رکھنا ہے' صرف چند دنوں کے لیے۔ جب تک اُن کا حوصلہ استوار نہ ہوجائے' اتنے دنوں کے لیے۔

بار بار میری نظریں شکلا پہ جاتی تھیں' اُسی سے یہ مہلت مستعار لی جاسکتی ہے۔ شکلا سے کہہ کے اُنھیں روک دیا جائے۔ وہ ایک مختلف پولیس والا ہے' کرشنا جی کی طرح۔ شکلا اپنی آنکھوں سے گیتا اور رانی کا حال دیکھ سکتا ہے مگر جولین کو مَیں نے شکلا کا نام یاد نہیں دلایا۔ شکلا سے اپنی تمام نسبتوں کے باوجود جانے کیوں یہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس سے کچھ کہنے کا مطلب اپنے معاملوں میں اُسے مداخلت کی دعوت دینا ہے۔ گویا ایک سفارش کے لحاظ میں بہت سی ناگفتنیاں آشکارا کی جائیں اور قدم قدم پر اُسے ضروری غیر ضروری ہدایتوں کا استحقاق دیا جائے۔ میرا تو کچھ نہیں مگر بُھل کو شاید یہ سب گوارا نہ ہو۔ بُھل کا عندیہ لیے بغیر شکلا سے کوئی بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہر چند کہ اب ہم سب کے بارے میں شکلا کو بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ کل شام گھاٹ پر جاتے وقت وہ جس اضطراب کا اظہار کر رہا تھا' اُس نے اُسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھنے دیا ہوگا۔ شکلا کے لیے مجھ سے تعلق خاطر کا تقاضا بھی تھا اور کچھ اپنے منصب کا بھی کہ وہ ہر طرح باخبر رہے۔ اگر مجھ سے وہ کچھ نہیں جان سکا تھا تو اُس کے پاس وسیلوں کی کمی نہیں تھی۔ کل سے وہ اِسی جستجو میں رہا ہوگا اور اب شاید اُسے اچھی طرح معلوم ہوگیا ہوگا کہ بُھل کون ہے اور اصل میں' مَیں کون ہوں۔ میرے بارے میں اُس کے علم میں کوئی کمی تھی تو اب نہیں رہی ہوگی۔ جھنگا کا پاڑا چاقو کے زور پر حاصل کرنے کا واقعہ' بالم خاں کے پاڑے پر قبضہ' اور بھی بہت کچھ..... ماہم کے پاڑے پر بُھل کی گدی نشینی کی خبر بھی اُسے پہنچ گئی ہوگی اور خبر کاروں نے سب کچھ اپنے لب و لہجے'

اپنے مشاہدے اور تجربے کے مطابق بتایا ہوگا —
کو الف کہنے والا بے تصرف رہ نہیں سکتا
بڑھانے کا اگر موقع نہ ہوگا تو گھٹائے گا

اس آگاہی کی آسودگی کے باوجود شکلا کا اضطراب کم ہونے کے بجائے فزوں ہونا چاہیے۔ کل کی نسبت اب صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے۔ ہتھل ماہم کے پاڑے بلکہ شہر کے سب سے بڑے پاڑے کا دادا ہے۔ سو شکلا کے لیے احتیاط لازم ہے۔ کل بھی وہ اسی احتیاط کے سبب سادہ لباس میں یہاں آیا تھا۔ خود مجھے بھی اُس کی حیثیت کا خیال رکھنا چاہیے۔ اُس کی حیثیت پر حرف نہ آنے کی حد تک ہی سفارش کی جا سکتی ہے۔ وہ خود بھی اِس حد سے تجاوز نہیں کرے گا۔ وہ پولیس کا ایک اعلا افسر ہے اور یہ بظاہر اُس کے لیے ایک ادنا بات ہے۔ اِس ادنا بات کی ہمارے لیے کتنی اہمیت ہے، یہ ہمی جانتے ہیں، اُسے بتا نہیں سکتے مگر شکلا جیسا ذہین اور باریک بیں افسر ہر پہلو پر غور کیے بغیر کوئی حکم ایسے ہی جاری نہیں کر دے گا۔ ہتھل سے پوچھنے کی بات تو بعد کی ہے۔ شکلا کے سامنے زبان کھولنا خود مجھے کچھ نامناسب سا لگتا تھا۔ جولین نے بھی غالباً یہی کچھ سوچ کے اُس کا نام نہیں دُہرایا۔

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ہزار آدمی ایک سمت، ایک ہی ارادے سے دیکھیں تو سب کو ایک جیسا دکھائی دیتا ہے۔ تعداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہزار آدمی بھی یک جان ہو سکتے ہیں اور ہر شخص ایک نیا منظر اخذ کر سکتا ہے۔ یہ تو دیکھنے کی نیت پر، شدت اور شمولیت پر منحصر ہے۔ کون کتنا شامل ہے، کسے کتنی جستجو ہے۔ اُن تینوں کے سروں میں بھی وہی اندیشے گردش کر رہے تھے جن سے میں دوچار تھا۔ جولین کو بہت دیر ہو گئی تھی۔ اُس نے اُٹھنا چاہا تو جمرو نے اُسے روک لیا اور وہی کچھ کہا جو مآلِ کار ہم میں سے کوئی بھی جولین سے کہتا۔ جمرو نے اُسے ہدایت کی، اگر اب وہ لوگ دوبارہ آئیں تو بھی اُنھیں یہی جواب دیا جائے اور بہتر ہے کہ جولین ہی اُن سے بات کرے۔ گویا کوئی مرد نہیں۔ جمرو کا خیال تھا کہ شاید اب وہ آئیں ہی نہیں اور اپنے پہلے ہی تاثر پر اکتفا کریں۔ اُنھیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ دوبارہ بھی اُنھیں یہی جواب دیا جا سکتا ہے۔ بے شک یہ امکان بھی تھا، تو پھر کسی تردد کی ضرورت ہی نہیں، پھر تو سب کچھ بعد از وقت ہے۔ اب جو کچھ بھی ہو، اُس کے لیے سینہ کھُلا رکھنا چاہیے۔ اُس نے جولین سے کہا کہ وہ موقع ملتے ہی ہتھل کو یہ سب بتا دے، چاہے کچھ دیر کے لیے ہتھل کو گیتا کے پاس سے اُٹھانا پڑے۔

جولین کے جانے کے بعد ہم آنکھیں مَسلتے ہوئے اِدھر لوٹتے رہے۔ کسی کو نیند نہیں آئی۔ شہ پارہ اور فرخ چائے کا لے کے آئیں تو وقت کا اندازہ ہوا۔ شام ہو چکی تھی۔ ہم عجلت کمرے سے نکل آئے جیسے کوئی چوک ہو گئی ہو، جیسے گاڑی چھ والی ہو۔ باہر آ کے سب کے شانے ڈھلک گئے۔ سارا مکان خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ عمارت کے باہر فقیروں کی ٹولیاں جا چکی تھیں، اُن کی آوازیں اندر نہیں آ رہی تھیں۔ بشی چاچا نے سرِ شام ہی ساری روشنیاں جلا دی تھیں تاکہ گھر بھر میں لحظے بھر کے لیے اندھیرے کا احساس نہ ہو۔ آدمی خود کو کیسے کیسے بہلانے د پھر تو موت پر چراغاں ہونا چاہیے۔ ہمیں سرے پر رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر کیلاش آ گیا۔ اُس کے ہمراہ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس رَما بھی تھی۔ میں دونوں کی پذیرائی کے لیے اُٹھا تو کیلاش مجھ سے چمٹ گیا جیسے بہت دنوں کا بچھڑا ہوا ہو۔ مجھے آداب کہہ کے رَما اندر چلی گئی، کیلاش میرے برابر کرسی پر بیٹھ گیا، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچے ہوئے دیر تک وہ مجھے ڈوبی ڈوبی آنکھوں سے دیکھتا رہا، وہ کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ مجل سا گیا "کیا حال ہے آپ کا؟" وہ بے ترتیبی سے بولا

"ٹھیک ہے سب" میں نے خوش روی سے کہا۔

"سویرے بھی میں آیا تھا، آپ نہیں تھے۔"

"اچھا" میں نے چونک کے کہا "کب؟"

"آپ کے جانے کے چند منٹ بعد ہی"

"جولی نے مجھے نہیں بتایا۔"

"میں ٹھیرا ہی کتنی دیر" وہ جلدی سے بولا "بس خیر خبر کے سیدھا اسپتال چلا گیا۔"

میں نے سوچا، اُس کا شکریہ ادا کروں لیکن اُس کی کے جواب میں یہ شائستگی مجھے مصنوعی لگی، یہ اُسے اُداس کر دیتی۔ خاموش رہا تو وہ زیرِ لبی سے بولا "گیتا نے بہت اثر لیا ہے" میں کیا کہتا، کوئی آدمی کسی کے لیے ساری دُنیا ہوتا ہے۔ کہنے لگا "رَما کا حال بھی کچھ کم غیر نہیں ہے۔ رات گھر جانے کے بعد دیر تک جاگتی رہی اور یہی..... یہیں کا ذکر کرتی رہی۔ مجھ سے پوچھتی تھی، کیلی بتاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ خوشی اتنی مشکل کیوں ہوتی ہے؟ غم دینا اتنا آسان کیوں ہے؟ رات وہ یہیں رہنا چاہتی تھی، میں اُسے زبردستی ساتھ لے گیا۔"

"کیوں، کیا حرج تھا؟"

"کوئی حرج نہیں تھا، بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا مگر کبھی کبھی مجھے اُس سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کیسا ڈر! وہ تو ایک نہایت....."

میری بات اُس نے کاٹ دی "وہ کبھی بہت عجیب باتیں کرنے لگتی ہے، سرکشی کی حد تک۔ اب دیکھیے آپ، یہ لباس پہن کے آئی ہے۔ میں نے منع کیا تو کہنے لگی، گیتا کو احساس ہونا چاہیے کہ زندگی ابھی بہت باقی ہے۔ گیتا میں شگفتگی کا احساس رہنا چاہیے، اِس طرح وہ جلد ہی... میں نے اُس سے کہا مگر اور لوگ کیا کہیں گے، نہیں مانی، بولی کہ وہ لوگ دوسرے ہیں۔"

"دوسرے کیا؟"

"یہی کہ، اُس کا مطلب تھا کہ وہ مختلف لوگ ہیں" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا اور اُس نے وضاحت ضروری سمجھی "کوئی اور بات نہیں، اُسی دن گھر پہ صرف ایک بار آپ سے کھُل کے بات ہو پائی تھی، بس اُسی دن سے آپ کا چرچا ہے۔ کہتی ہے، تم نے ظہیر صاحب کو غور سے نہیں دیکھا۔ لگتا ہے، ایک نوجوان نے صدیوں کا سفر طے کیا ہے۔ وہ جتنی حقیقت پسند ہے، اتنی ہی تصوراتی بھی ہے۔ سب کو آپ کے پیمانے سے ناپتی ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ کیلاش کے قلب و دماغ میں کیسی ہل چل مچی ہو گی، طرح طرح کے سوال، دادا، پاڑا، چاقو، خون، پولیس۔ اُس نے اِس بابت کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ اُسے اپنے مخاطب کے آبگینے کا احساس تھا۔ رَما سے ہٹ کے وہ موسم کی باتیں کرنے لگا جو مہذب لوگوں کا شعار ہوتا ہے اور جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میری نظریں برآمدے پر لگی تھیں۔ کانوں کے ساتھ آنکھوں کا ارتکاز بھی ضروری ہے۔ بینائی منتشر ہو تو سماعت آدھی رہ جاتی ہے تاہم میں سر ہلا کے ہوں ہاں کرتا رہا۔ ہتھل باہر نہیں نکلا۔ میرا خیال تھا کہ سہ پہر کھانے کے بعد نہیں تو شام کو ہتھل ضرور کسی طرف کا رُخ کرے گا۔ سارے کانٹوں کا ایک ہی مداوا، سارے سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ ہم کسی طور اُن لوگوں تک پہنچ جائیں جنھوں نے اتنے بہت سے لوگوں کو درہم برہم کیا ہے۔ سب سے بڑی پیش بندی یہی ہے۔ ہتھل نے پولیس سے وقت کی رعایت حاصل کر لی تھی لیکن یہ مہلت لٹکتی ہوئی تلوار کے مانند تھی۔ معلوم ہوتا ہے، ہتھل کو کوئی جلدی نہیں ہے جبھی وہ اطمینان سے اندر بیٹھا ہے۔

میں نے کیلاش کے سامنے اشارۃً جولین سے پوچھ لیا تھا کہ اُس نے پولیس کی آمد سے ہتھل کو مطلع کر دیا ہے؟ اُس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ جواب میں ہتھل نے کم و بیش وہی کہا ہے جو جمرو نے کہا تھا۔ اِس کے باوجود ہتھل کے سکوت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

جمرو، شاموا اور مارٹی کے چہروں پر چھائی ہوئی دھند بتا رہی تھی کہ وہ بھی ہتھل کی اس ردّ و قدح کا جواز سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بھی بس منتظر بیٹھے تھے، کبھی سبزے پر ٹہلنے لگتے، کبھی برآمدے میں چلے جاتے اور پھر آ کے وہیں میرے پاس کرسیوں پر ڈھیر ہو جاتے۔ ہتھل کی تاخیر بے سبب بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ دو ہی باتیں ممکن تھیں یا تو وہ کسی سمت کی نشان دہی نہیں کر پایا تھا مگر اِس گوشہ نشینی سے تو کوئی الہام ہونے سے رہا۔ کیا وہ اتنی آسانی سے ہاتھ آ جائیں گے، ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر؟ گلی گلی کی خاک چھاننی پڑ سکتی ہے یا پھر یہ تھا کہ ہتھل نے اُن لوگوں کو پہچان لیا ہے اِس لیے اُسے کوئی عجلت نہیں اور کوئی ایسا ہی یقین اور اعتماد رکھے ہوئے ہے کہ وہ لوگ اُس کی دست رس سے دُور نہیں ہیں، کسی وقت بھی وہ اُن کے سروں پر پہنچ سکتا ہے۔ اِس وقت تو پولیس ہماری نقل و حرکت پر گہری نظر رکھے ہوئے ہو گی۔ ہم جہاں بھی جائیں گے، وہ سائے کی طرح ہماری نگراں رہے گی۔ ہو سکتا ہے، ہتھل کے ذہن میں بھی یہی ہو۔ اُس پر بھی یہ وقت کچھ کم گراں نہیں گزر رہا ہو گا۔ گیتا اور رانی کے چہرے دیکھ دیکھ کے اُس کا خون بہت جلتا ہو گا۔ اُن کے آنسو تو اُس کی رگوں میں سُلگتی ہوئی آگ اور بھڑکا رہے ہوں گے۔ جیسا کہ اُس نے پولیس اسٹیشن پر کہا تھا کہ اُسے اتنی دیر کے قرض کی عادت نہیں ہے۔

مگر وہ سرفروش خود، اپنے دشمن کون ہیں جنھیں ہتھل نے کھوج لیا ہے یا جو ابھی تک اُس کی نگاہ کی زد پر نہیں آ سکے ہیں۔ کل سے یہی سوال میرے سارے وجود پر منڈلا رہا تھا، میں کہ پاڑے کا ہر دادا، علاقے کا ہر آدمی جس نے پیرا اور ماچھی کے سا زندگی گزاری ہے اور جو کل اُن کی ارتھیوں پر، اپنے کسی عزیز کی موت کی طرح گریہ کناں تھے، یہ سوال اُن سب کے سینے بھی کھر ہو گا۔ پانڈے اور سکندر نے صبح پاڑے میں کہا تھا کہ وہ لوگ درمیان ہی کہیں موجود ہیں۔ مجھے نام یاد نہیں، کسی اور نے بھی اِس شبے کا اظہار کیا تھا، خود میرا دل بھی یہی کہتا تھا اور میری نگاہیں مسلسل اُن سب پر بھٹکتی رہی تھیں لیکن سب کے چہرے ایک جیسے نظر آ

تھے۔ صبح پاڑے پر میں نے زورا اور چھیدا سے بھی سُن گُن لینے کی کوشش کی تھی اور میرے کان داداؤں کے درمیان ہونے والی قیاس آرائیوں پر لگے ہوئے تھے۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میری طرح وہ سبھی ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگے ہوئے تھے اور سبھی کو دادا اور ماچھی پر اُٹھنے والے ہاتھ قلم کر دینے کی بے چینی تھی۔ سبھی پر خون سوار معلوم ہوتا تھا، اگر وہ اُنھی میں سے کوئی تھا تو اُس نے کیسا بہروپ بھرا تھا۔

گزشتہ تین چار دن سے پیرو اندھیری کے راجن دادا کے پاڑے کی دیکھ بھال کے لیے اندھیری ہی میں مقیم تھا۔ علاقے کی ایک عورت کی جان لینے کے الزام میں راجن کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ عورت سے راجن کا پرانا تعلق تھا لیکن پیرو کو یقین نہیں تھا کہ راجن جیسا دل کا زندہ دادا کسی عورت کو ختم کرنے کا گناہ بھی کر سکتا ہے۔

یہ خبر سُنتے ہی پیرو اندھیری چلا گیا تھا، بعد میں اُسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اُس کا اعتماد دُرست تھا اور خاصی تگ و دو کے بعد وہ پولیس کو راجن کی بے گناہی باور کرانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اب راجن چند دن میں جیل سے چھوٹ کر آ جائے گا لیکن ابھی اندھیری کے پاڑے کی نگرانی کے لیے پیرو کا وہاں رہنا ضروری ہے۔ اندھیری کے پاڑے کا بھتا بھی ماہم کے پاڑے آتا تھا اِس لیے پیرو کی یہ منصبی ذمّے داری بھی تھی کہ وہ راجن کی مدد کو پہنچے۔ جن لوگوں نے راجن کو قتل کے الزام میں جیل بھجوایا تھا، وہ پیرو کی دخل اندازی سے خوش نہیں ہوں گے۔ پیرو راجن کے لیے ثبوت اور شہادتیں جمع کر رہا تھا اور اُس نے اندھیری کے علاقے میں جا کے پاڑا منتشر نہیں ہونے دیا تھا۔ راجن کی زندگی، اُسے ناپسند کرنے والوں کی موت تھی۔ اُسے جیل سے چھڑا کے پیرو کا اُن لوگوں کی طرف پلٹنا لازم تھا۔

راجن کے بدخواہ خود اُس کے پاڑے کے دادا بھی ہو سکتے ہیں، دوسرے پاڑوں کے دادا بھی لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ دادا ہی ہوں اور اُن کا تعلق پاڑے ہی سے ہو۔ وہ کرائے کے آدمی بھی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکو قسم کے ورنہ پیرو کو اُنھیں شناخت کرنے یا اُن کی جانب پولیس کو اشارہ کرنے میں اتنی دیر کیوں لگتی۔ جن لوگوں نے اُنھیں کرائے پر حاصل کیا تھا، وہ اندھیری کے بااثر اور صاحبِ حیثیت لوگ ہی ہوں گے۔ سنا ہے، راجن بل کا پکّا اور خون کا کچّا ہے۔ اُس کا خون ذرا سی تپش سے بھڑک جاتا ہے! ایسا دادا کبھی نہ کبھی نقصان ضرور اٹھاتا ہے، اندھیری کا پاڑا بھی اُن تین پاڑوں میں شامل تھا جس نے پیرو کی عدم موجودی کے دوران ماہم کے پاڑے پر بھتا بھیجنا بند کر دیا تھا لیکن پیرو کو راجن کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑی جیسا کہ وہ بائی کلّا کے دادا دینا اور قلابے کے دادا جارجی کو خبردار کرنے گیا تھا کہ وہ کل صبح تک اُس کے پاڑے پر بھتا پہنچا دیں تو خیر ہے۔ راجن کے پاس بھی پیرو کو جانا تھا مگر دوسری صبح خود راجن ماہم کے پاڑے پر بھتّے کی پوٹلی لے کر حاضر ہو گیا۔ مَیں نے اُسی روز اُسے دیکھا تھا۔ وضع قطع اور لب و لہجے سے وہ پختہ کار اور ارادے کا مضبوط دادا نظر آتا تھا۔ اندھیری کے علاقے میں اُلٹا سیدھا کاروبار کرنے والے بہتیرے سیٹھوں کو اُس سے خار کھانا چاہیے۔ پیرو نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اُس کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ راجن کا قصہ پاک کرنے کے لیے علاقے کے کسی جوشیلے روپے پیسے والے نے کرائے کے آدمی خرید کے راجن کی محبوب عورت کو آڑ بنا لیا۔

عجب نہیں، جن لوگوں نے اُس عورت کو ختم کیا ہے، اُنھوں نے ہی دادا کا تعاقب کیا ہو۔ اگر وہ واقعی پاڑے کے آدمی نہیں تھے تو اُن تک پہنچنا ایسا آسان نہیں ہے۔ اِس سے پہلے اندھیری کے اُن امیر کبیر لوگوں کو شناخت کرنا چاہیے جو راجن کی حکمرانی سے نالاں تھے اور جا و پر بیٹھے بس ڈوریاں کھینچتے اور ڈھیل دیتے رہے تھے۔ پرسوں رات جب پیرو، ماچھی کے ساتھ کانتے کے چالیسویں پر جولین کے گھر آیا تھا تو دیر تک بٹھل سے باتیں کرتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے، اُس نے اِس سلسلے میں بٹھل کو کچھ بتایا ہو، پھر تو وہ سب کچھ بٹھل تک محدود ہو گا اور جب تک بٹھل چاہے گا، اُسی تک محدود رہے گا۔ اندھیری کے پاڑے کے آدمی راجن سے ناراض اپنے ہر ساتھی اور دوسرے پاڑوں کے داداؤں اور اپنے علاقے کے امیر کبیر لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ سب سے زیادہ تو راجن اُنھیں جانتا ہو گا۔ پاڑے کے آدمی نفرت و عداوت کی بُو جلد سُونگھ لیتے ہیں۔ راجن نے یا اُس کے ساتھیوں میں سے کسی نے کسی کی جانب شک ظاہر نہیں کیا ہے تو اِس کا یہی مطلب ہے کہ وہ بھی کچھ طے نہیں کر پائے ہیں، وہ بھی تذبذب میں ہیں۔ راجن کا کوئی ایسا نمایاں حریف نہیں تھا جس کی جانب بے دریغ، بے تردد انگلی اُٹھا دی جائے۔

اُدھر اندھیری کی پولیس کو بھی خوب معلوم تھا کہ راجن کی وکالت کے لیے پیرو اندھیری کے پاڑے پر آ چکا ہے۔ تین چار دن کی اِس مدت کے دوران راجن سے ملنے کے لیے پیرو کا کئی بار اندھیری کے تھانے پر بھی جانا ہوا ہو گا۔ پولیس بھی اِس اندیشے سے بے خبر نہ ہو گی کہ کسی نے راجن کے لیے پیرو کو اُس کی فعالیت کی سزا تو نہیں دی ہے۔ ایک شخص کو راستے سے ہٹا دیا گیا جو راجن کے لیے سپر

بنا ہوا تھا۔ ایک راجن کو ہٹانے سے کیا حاصل ہوا، اب ایک ایسا شخص اندھیری کے پاڑے پر موجود ہے جو کئی راجنوں کا حاصل جمع ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پیرو نے اُنھیں پہچان لیا ہو اور دانستہ تامل کر رہا ہو، اُس کے خیال میں پہلا مرحلہ راجن کے دفاع کا ہو گا۔ راجن کو محفوظ کرنے کے بعد وہ دوسرے مرحلے پر عمل کرتا۔ پاڑے کے آزمودہ کار دادا کا یہی طور ہونا چاہیے۔ بٹھل بھی یہی کچھ کر رہا تھا لیکن کبھی کبھی ذرا سا تامل بہت گراں پڑ جاتا ہے، زندگی کی قیمت پر۔ کوئی آدمی مرتے وقت یا کسی کو مارتے وقت یہ نہیں سوچتا کہ ایک آدمی کی زندگی صرف اُس کی نہیں ہوتی اور بھی کئی زندگیاں اُس میں شامل ہوتی ہیں۔

اور اگر یہ سب میرا قیاس ہے کہ پہلے اندھیری کی طرف قدم اُٹھانا چاہیے، اندھیری ہی سے کوئی سلسلہ نکلتا ہے تو پھر دوسرا کون ہے۔ جارجی کے خیال نے کئی بار میری آنکھیں انگارا کی تھیں اِس کا نام آنے پر کئی بار میرے سارے جسم میں آگ لگی تھی مگر جب بھی اُس کی طرف نظر جاتی، وہ اپنا ہی کوئی چہرہ، اپنا ہی کوئی عکس نظر آتا تھا۔ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی لال لال آنکھیں، سُتا ہوا زرد چہرہ، ٹوٹا پھوٹا سا کوئی جسم۔ وہ اتنا ہی آزردہ اور شکستہ خاطر تھا جتنا پیرو سے رفاقت کا کوئی بھی مدعی ہو سکتا تھا۔ گلیا اور لبھی نے مجھے بتایا تھا کہ جس رات دادا اور ماچھی پر گولی چلی تھی، جارجی پاڑے پر موجود تھا۔ پہلے ہی کئی دن سے وہ وہاں تھا بلکہ جس رات پیرو نے اُس کے جوئے اور شراب کے اڈّے پر اچانک پہنچ کے اُس کی گوشمالی کی تھی، اُس کے بعد سے جارجی بیشتر ماہم کے پاڑے پر دھرنا دیے بیٹھا رہا تھا۔ آخر پیرو نے اُسے معاف کر دیا تھا۔ اُس نے جارجی سے قلابے کا پاڑا نہیں چھینا۔ اِس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ جارجی نے پیرو کے حکم کی تعمیل میں فی الفور اپنے خفیہ اڈّے کا کاروبار بند کر دیا تھا، اِس کا سبب یہ بھی ہو گا کہ جارجی، ماری کا شوہر تھا اور ماری پیرو کو بہت عزیز تھی، اپنی بیٹی کی طرح۔ دونوں ابتدا ہی سے پیرو کے سامنے رہے تھے۔ دونوں کی شادی بھی اُسی نے کرائی تھی۔ پیرو ہی نے جارجی کے بازو کوٹ کوٹ کے اُسے زور آزما بنایا تھا، اُس کی اُنگلیوں کو چاقو کا مزا آشنا کیا تھا۔ پیرو ہی نے جارجی کو قلابے کے پاڑے کی گدی پر بٹھایا تھا۔

بمبئی آنے کی دوسری رات کا واقعہ ہے، ڈیڑھ مہینے پہلے جب پیرو میرے اور بٹھل کے ساتھ اُس کے ساحلی اڈّے پہنچا تھا۔ جارجی اُس وقت نشے میں چُور تھا، دوسرے دن وہ پاڑے پر بھتا لے کے آیا تو سر تا پا خجالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اِس عرصے میں وہ مسلسل پیرو کا تکدر دُور کرنے، اُس کی نظروں میں اپنا کھویا ہوا مرتبہ بحال کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ پیرو سے اپنی سفارش کے لیے اُس نے پاڑے کے ہر آدمی کی، یہاں تک کہ میری اور بٹھل کی خوشنودی حاصل کرنا چاہی تھی۔ میرا جی نہیں مانتا تھا کہ وہ جارجی ہو سکتا ہے۔ اُس میں اتنی جرأت کہاں سے آتی۔ پیرو نے اُس کے ساتھ ایسا بُرا بھی کیا کیا تھا۔ اُس نے اُسے بس چوری چھپے کا کاروبار بند کرنے کا حکم دیا تھا، بازاری عورتوں کا کاروبار، جو پاڑے کے دادا کا شیوہ نہیں ہے۔ پیرو نے اُسے پاڑا بدر نہیں کیا تھا اور اُس کی اُنگلیاں نہیں کاٹ لی تھیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے چاقو سے محروم ہو جاتا۔ سب کو معلوم تھا کہ جارجی بل کا کتنا ہی کھرا ہو، پیرو کے بغیر آدھا بھی نہیں ہے۔ پیرو کے دم سے تو شہر میں اُس کا اعتبار فزوں ہوتا تھا۔ ہر جنون کا کوئی جواز ہوتا ہے۔ اتنی بڑی دیوانگی کے لیے کوئی بڑی ضد، کوئی بڑا جواز چاہیے۔ جارجی ایسا دیوانہ نہیں لگتا تھا۔ وہ ہوتا تو بٹھل کبھی کا اُس کی گردن دبوچ لیتا اور بٹھل کا وقت ہی نہ آتا، پاڑے کے آدمی اُس سے پہلے ہی اُس کے ٹکڑے کر ڈالتے۔ جارجی بھی خود سب کے درمیان اِس طرح موجود نہ رہتا۔ پاڑے میں کسی ایک کی نظر تو اُس پہ جا کے ٹھیرتی۔

میرے سر میں ریت اُڑ رہی تھی اور یہ میرے دماغ ہی کا فتور تھا کہ حیدرآباد سے ہمارے تعاقب میں آنے والے دو آدمیوں کو بھی میں نے کٹہرے میں کھڑے دیکھا۔ وہ دونوں کئی دن تک ماہم کے پاڑے کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند رہے تھے۔ ہفتے ہوئے، اُنھیں چھوڑ دیا گیا تھا کیوں کہ جو کچھ وہ بتا چکے تھے، اِس سے زیادہ ممکن نہیں تھا۔ ہڈّیوں کو اِس سے زیادہ اذیت کی استطاعت نہیں ہوتی۔ گلیا اور لبھی جس پردہ پوشی سے اُنھیں پاڑے لائے تھے، اُسی بے خبری کی حالت میں اُنھیں کسی جگہ چھوڑ آئے تھے۔ ہمارے ٹھکانوں کے کسی راستے سے وہ واقف نہیں ہو سکے تھے۔ اُن کی حالت ہی اِس قابل نہ تھی کہ وہ مزید ایک دن بھی بمبئی میں ٹھیر سکیں۔ اُنھوں نے سیدھے حیدرآباد کا رُخ کیا ہو گا اور جلد سے جلد اپنے آقا نواب حشمت جنگ کے خاص معتمد نسبت شاہ خاں کی خدمت میں حاضر ہو کے سارا ماجرا گوش گزار کیا ہو گا۔ اُنھیں مزید کمک کے ساتھ بمبئی جیسے شہر میں از سرِ نو ہماری تلاش، ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھنے اور موقع ملتے ہی گولی مار دینے کا حکم دے کے دوبارہ بمبئی بھیج دیے جانے کا امکان نہایت موہوم معلوم ہوتا تھا۔ اُن کا مقصد صرف ایک تھا، ابّا جان کے پاس لعل و جواہر کے ذخیرے کا سُراغ لگانا۔ اُس کی تکمیل کے لیے ہماری

زندگی شرط تھی۔

سفر کے دوران بھرپور بھرے دو آدمیوں کو ہم نے ریل سے پھینک دیا تھا اور دوسرے ڈبّوں میں تیار بیٹھے اُن کے مسلح ساتھیوں کو ناکام لَوٹا دیا تھا۔ اُنھوں نے کسی اور نواب، نواب قطب الدین علی کا نام بتایا تھا۔ اُن کے بیان کے مطابق اُس کے مطلوب بھی ہیرے جواہر تھے۔ ریل میں بیتی ہوئی ساری رُوداد سُن کے اُس طالع آزما نواب کا پیمانہ بہت لبریز ہوا ہوگا۔ صاحبانِ زر کے پیمانے جلد لبریز ہو جاتے ہیں۔ اِس کی وجہ نازکی کے علاوہ تنگی بھی ہو سکتی ہے ہر چند کہ اِس آتشِ غضب میں ہماری شکر گزاری کا ایک پہلو بھی نواب کے پیشِ نگاہ رہنا چاہیے، ہم نے اُس کے زرخریدوں کو کٹھری میں بند کر کے چلتی ریل سے زمین پر صرف لڑھکا دیا تھا، ختم نہیں کیا تھا مگر آدمی کا کیا ہے۔ دنیا میں سب سے گراں اور سب سے ارزاں چیز آدمی ہے۔ نقد اُدھار ہر بھاؤ پر مل جاتا ہے۔ نہ ملے تو ساری دُنیا کے خزانے بھی تھوڑے ہیں۔ ممکن ہے، واپس جانے والوں نے اپنی ہزیمت کے انتشار میں نواب کے رُو برُو یہ اعتراف بھی کر لیا ہو کہ اُنھیں ہمارے سامنے اپنے فرستادے کا نام بھی بتانے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ انکشاف مستزاد تھا، ایک اور تازیانہ۔ یہ جان کے نواب قطب الدین علی کی رگوں میں بھڑکتا ہوا خون ایک لمحے کے لیے ضرور جم گیا ہوگا۔

اگر وہ وہی تھا جس نے حیدر آباد میں اباجان کی حویلی پر شب خوں مارنے کے لیے ۲۴ مسلح زور آوروں کا دستہ بھیجا تھا تو وہ ہم سے خوب واقف تھا۔ اُس وقت رہ جانے والی کوئی کمی ہمارے تعاقب کے سفر سے واپس آنے والوں نے پوری کر دی ہوگی۔ آتنی شناسائی آئندہ کے لیے احتیاط کا سبب ہونی چاہیے تاہم حالتِ اشتعال میں احتیاط کی تلقین کبھی اور زہر گھول دیتی ہے۔ حیدر آباد کے اُن اقبال مندوں کے پاس مال و زر کی کمی ہے نہ زور و اثر کی۔ ایسے میں ارادے خود رو پودوں کی طرح آدمی کے سَر میں اُگتے ہیں۔ نواب حشمت جنگ کے تزک و احتشام، لاؤ لشکر کا منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نواب قطب الدین علی بھی اُس کا کوئی ہم سر ہوگا۔ وہ ایک فوج کی فوج تیار کر کے ہماری سرکوبی کی مہم پر روانہ کر سکتے ہیں کہ ہم میں سے ایک ایک کو چُن چُن کے ختم کر دیا جائے اور یوں حیدر آباد میں ہمارے پلٹنے کی نوبت ہی کیوں آئے۔ یہ اُن کا آبائی مشغلہ ہے۔ ریاست میں وارد ہو کے ہم اور کچھ نہیں تو اُن کے حواس ضرور منتشر کر سکتے ہیں۔ ریاست سے باہر اُنھیں اپنی عزت و حرمت پر آنچ آنے کا کھٹکا بھی نہیں ہے۔ اباجان کی حویلی کے نقب زن،

سفر میں ہمارا پیچھا کرنے والے، شہر کے تمام اڈّوں کے دادا، عالم [illegible] کے محل کے ملازمین، شہر میں کیتنی آنکھوں کو ہمارے نقش و نگار ازبر [illegible] گے، سو بمبئی میں ہماری کھوج کچھ ایسی مشکل بھی نہیں ہے۔ اِس کے لیے وہ یہاں کے پاڑوں کے داداؤں سے بھی مدد لے سکتے ہیں اُجر[illegible] کے آدمیوں کی خدمات بھی خرید سکتے ہیں۔ وہ آدمی سے زیادہ نوادر [illegible] ہیں۔ پہلے ہی اُنھوں نے کون سے کم درجے کے فیصلے کیے تھے۔ ریل [illegible] ہم نے جن دو بہروپیوں کو پکڑا تھا، اُن کے پاس ہتھیار تھے اور [illegible] کے کہنے کے مطابق، اُنھیں حکم دیا گیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ ذرا بھی تامّل نہ کریں۔ ہتھیار کی موجودی سے اور مراد بھی کیا ہوتی ہے۔

اِن تمام دُور دراز اندیشوں کے باوجود میرا دل اُنھیں بہ یک جنبشِ لب مسترد کر دیتا تھا۔ یہ سب مجھے اپنے حواس کا فشار، اپنے اعص[illegible] کا خلفشار لگتا تھا۔ وہ چاہے نواب حشمت جنگ ہو، نواب قطب الدین علی، مہاراجا دھرم ویر، یا کوئی اور نواب راجا۔ وہ آدمیوں سے زیادہ پتھروں کے شائق ہیں، مکین سے زیادہ مکان کے مشتاق۔ پہلے اُنھیں اِس امر کا یقین کرنا چاہیے کہ ہماری تحویل میں نوادر کا کوئی بیش بہا خزینہ ہے بھی یا یہ محض دیوانے کا خواب ہے۔ اِس تعیّن کے بعد اُنھیں ہمارے سلسلے میں کسی تشویش و توحّش کی ویسے بھی حاجت نہیں۔ ہماری جانب سے کسی ردِ عمل کا خدشہ پیشِ نظر ہوگا تو اُس سے نمٹنے کے لیے ریاست کی حدود ہی زیادہ موزوں ہیں، اپنی حدود، زیادہ یقینی، زیادہ اعتباری، جہاں زمین اُن کی، آسمان اُن کا، حکم اُن کا، محکوم اُن کے، جہاں سب کچھ اُن کی دست رَس میں ہے۔ وہ بس اتنے پر اکتفا کریں، وہیں ہماری آمد کا انتظار کیوں نہ کریں۔ نواب حشمت جنگ کو تو ہماری واپسی کا ایک مستقل گداز حاصل ہے کہ خانم وہاں موجود ہے، کسی یرغمال کے طور پر۔ یہ بات دوسروں کے لیے بھی کچھ کم وجہِ قرار نہیں ہے۔

اُن کی دانست میں اُن کے جاہ و حشم کا اندازہ ہمیں خوب ہوگا۔ ہماری مشاقی، مستعدی، عزم اور ارادے کا سچ اپنی جگہ لیکن اُن کی سطوت و شوکت بھی کوئی افسانہ نہیں۔ بڑی حقیقت چھوٹی حقیقت کو مٹا نہیں دیتی تو اوجھل ضرور کر دیتی ہے۔ اُن کے خیال میں ریاست میں گزرے ہوئے شب و روز ہم اتنی جلدی نہیں بھولے ہوں گے، اُن کے نجی قید خانے، مسلح خدمت گار، اُن کی اپنی عدالتیں۔ نواب جہاں تاب کی حویلی کا محبس بھی ہمیں خوب یاد ہوگا اور بھی بہت کچھ۔ سو ہماری جانب سے کسی عاجلانہ، عاقبت نااندیشانہ ردِ عمل کا امکان قرینِ قیاس نہیں، قرینِ عقل بھی نہیں ہے۔ حیدر آباد آ کے ہماری طرف سے کسی ممکنہ اقدام کا خدشہ اُنھیں اُسی قدر ہوگا جو ہوش

[illegible]ندی کا تقاضا ہے۔ اُنھیں تو اب ہمیں ایک دوسرا ہی تاثر دینا چاہیے، بے نیازی کا، تجاہلِ عارفانہ کا، استغنا کا تاکہ ریاست میں کسی طور بلا از جلد ہماری آمد ممکن ہو سکے۔ اپنے آدمیوں کی واپسی پر پتھروں کے لیے اُن کی بے کلی اور سوا ہونی چاہیے۔ اُنھیں بتایا گیا ہوگا کہ ہم کتنے بیدار، کیسے اپنے سائے سے بھی محتاط سفر کرتے رہے ہیں۔ ہم نے بمبئی اُتر کے اپنے ٹھکانوں کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ ہم اُن دونوں لوندھا کر کے کس طرح اپنی منزل تک لے گئے تھے اور کس طرح اُن کی آنکھ کھلی تو وہ کوڑے کے ڈھیر پر پڑے تھے۔ سارے سفر میں، ہم اباجان کو حصار میں لیے رہے۔ اباجان جیسے ایک مختلف شخص کے ساتھ اتنے لوگوں کی ہمہ وقت موجودی کس طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ نگہ داری، نگہ بانی کس متاع کی حفاظت کے لیے ہے۔ کسی قیمتی شخص ہی کو اتنے پاسبانوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ایسے پاسبان؟ اُن دونوں نامرادوں نے اپنی بدبختی کا جواز پیدا کرنے کے لیے کچھ اور بھی حاشیہ آرائی کی ہوگی۔ یہ سب اُن کے آقاؤں کی جستجو کو سند دینے، اُن کا عزم تازہ کرنے کے مترادف ہے۔ ہماری ہر مزاحمت پر اُن کی لَو اور بڑھنا چاہیے، ہم اُنھیں اور زیادہ مطلوب اور زیادہ مرعوب ہونے چاہئیں، بجائے یہ کہ وہ ہماری نابودی کے درپے ہوں۔ وہ پاڑے کے آدمی نہیں، نواب لوگ ہیں۔ اُن کے آبا و اجداد نے ورثے میں کوئی نامکمل حکایت بھی نہیں چھوڑی ہے۔ اُنھیں ہمارا حوصلہ بہ قدرِ ہوش ہی آزمانا چاہیے۔ ہوش سے بے گانہ تو پھر کچھ نہیں دیکھتا۔ وہ کتنے ہی بد دماغ ہوں، بے دماغ نہیں ہیں۔ اُنھیں ہماری کمی بیشی سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ دہشت مراد ہے تو اِس طرح گویا ہماری واپسی کے راستے بند کرنا، ہمیں کھو دینا اور ہمیں خود سے دُور کر دینا ہے۔ اتنا جان بوجھ کے تو اُنھیں ہمارا خیال رکھنا چاہیے۔ اُن کیمیاگر راز دانوں اور چشم دید گواہوں کی طرح جن کے مٹ جانے سے سب خاک برُد ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیلاش چمر، شامو اور مارٹی میرے اردگرد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوا میں خنکی تھی۔ جولین نے کیلاش کے لیے چائے کا اہتمام کیا تھا۔ مَیں نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ جسم و جاں کی موجودی کیسا سراب ہے۔ ہوش و حواس کی یک جائی، ارادہ و خیال کے بغیر کیسی عجیب۔ آدمی کا سامنے رہنا اُس کی موجودی کی شہادت نہیں، آدمی محض جسم نہیں ہوتا، کسی بُت کی طرح۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی کتنا وہاں موجود ہے جہاں نظر آتا ہے۔ کون کس گمان، کس تصوّر، کس دُنیا میں ہے، یہ خود وہی جانتا ہے۔ شاید

ہر آدمی کے ساتھ یہی ہے، موجود ناموجود، حاضر غائب، کبھی پورا، کبھی اُدھورا، بٹا بٹا سا، پھر یہ اصرار کیا معنی رکھتا ہے کہ آدمی نظروں کے سامنے ہی رہے؟ شاید اِس لیے کہ اِس طرح کسی نہ کسی لمحے کُلّی طور پر اُس کے موجود رہنے کا امکان رہتا ہے ورنہ تو کچھ بھی نہیں۔ مگر سُنا ہے، آدمی کہیں بھی ہو، اُس کی صدا پہنچ جاتی ہے بشرطیکہ صدا میں کوئی کھوٹ نہ ہو اور اُسے کوئی سننے کا بھی منتظر ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ سمندروں پار بھی رشتہ قائم رہتا ہے، نفس کا رشتہ۔ بشرطیکہ دوسری جانب بھی کوئی بہت مشتاق ہو۔ یہ لہروں کا سفر ہے اور بے حد و حساب ہے۔ لوگ اور بھی کیا کچھ کہتے ہیں۔ کون جانے اِس میں کتنی شاعری، کتنا فسانہ ہے یا بعض رحم دل لوگوں نے ستم زدگاں کے لیے کچھ ایسی باتیں عام کر رکھی ہیں پر کبھی کبھی یہ بہت سچ لگتا ہے۔ مَیں خود اِس کا شاہد ہوں۔ کبھی مجھے ایسا لگتا ہے، کورا میرے قریب کہیں موجود ہے، وہ مجھے آواز دے رہی ہے، مجھے یاد کر رہی ہے، میرے لیے رو رہی ہے۔ ایسا ہے تو میری آواز بھی ضرور اُس تک پہنچتی ہوگی۔

ہمیں وہاں بیٹھے بیٹھے خاصی دیر ہو گئی۔ بتّھل باہر نہیں آیا۔ جولین اور شہ پارہ کھانا تیار ہونے کی اطلاع دینے آئیں تو کسی نے عذر نہیں کیا۔ بتّھل کو مَیں نے وہیں بیرونی کمرے میں دسترخوان پر بیٹھے دیکھا۔ سُوجے ہوئے پپوٹے، بھاری بھاری چہرہ لیکن یہ ایک سکون آمیز خاموشی تھی بلکہ حسرت آمیز۔ بے صدا کھنڈروں اور بے برگ درختوں کا سا سکوت۔ مَیں نے بتّھل کو غور سے دیکھا۔ اُس کی پیشانی پر اضطراب کی کوئی علامت نہیں تھی، یہ کوئی اور کیفیت تھی، اِس میں نہ کھنڈروں کی مردم بیزاری تھی نہ ننگے درختوں کی بے حسی [illegible] اور گیتا دونوں اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں ہی کا جزو معلوم ہو[illegible] تھے، اُن سے الگ نہیں۔ مَیں نے بھی گرد جھاڑنے اور بہ ہمہ ہوش و حواس اُن میں شامل ہونے کی کوشش کی مگر ہر بات اختیار میں نہیں ہوتی۔ یہ قدرت آدمی میں پیدا ہو جائے تو کمی کس بات کی۔ میرے سارے جسم سے جیسے بچھو چمٹے ہوئے تھے جو بار بار ڈنک مار کے رگیں کر دیتے تھے۔

کھانے کے بعد ابھی سب وہیں بیٹھے تھے کہ میں چپکے سے اُٹھ کے باہر چلا آیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ مَیں سبزے پر اِدھر سے اُدھر چکّر لگاتا رہا۔ چند ہی لمحوں میں اِس تنہائی سے میرا دل گھبرانے لگا۔ جانے کیا بات تھی جو کوئی باہر نہیں آیا تھا۔ میں دوبا[illegible] اندر جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ یکایک ایک خیال نے میرے قدم منج[illegible]

کرڈلے، مجھے یاد آیا، حیدرآباد میں ہم نواب ثروت یار کو اپنا پتہ بتا کے آئے تھے۔ وہی نواب ثروت یار جس کا پتہ مولوی صاحب نے مراد آباد کے مسافر خانے کے رجسٹر میں اپنی قیام گاہ کے طور پر درج کرایا تھا اور جسے دیکھ کے میں کچھ اور دیکھنا سُننا بھول گیا تھا۔ میں نے پیرو سے صرف ایک دن کے لیے حیدرآباد جانے کی ضد کی تھی اور اُن سب کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنا راستہ بدل دیں۔ میں اُس وقت یہ عجلت نہ کرتا، ایک ذرا تحمل کر لیتا تو سب کچھ اتنے تواتر سے پیش نہ آتا۔ نہ ہم حیدرآباد کا رُخ کرتے، نہ سونیا ملتی۔ آدمی کو خواب کیسے زندہ رکھتے ہیں۔ میری صورت نے اُس کے خواب چھین لیے۔ میں نے اپنا فسوں ہی توڑ دیا۔ نواب جہاں تاب کا زنداں، اباجان کے منہ پر طمانچے، اباجان کا گریبان تار تار ہونے کا منظر، آدمی کی بینائی چلی جائے تو بھی بعض منظر اوجھل نہیں ہوتے۔ نواب عالم تاب کی سانس بھی کسی آس میں اٹکی ہوئی تھی، زندگی تو باقی تھی۔ خانم بھی کیسی آزمائش سے دوچار ہوئی۔ نہ ہم وہاں جاتے، نہ اباجان کو اپنے لعل و جواہر کی پوٹلی کھولنی پڑتی۔ اُس ادھورے پتھر کی چمک نے کتنے لوگوں کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ کانتے بھی اُس کی بھینٹ چڑھ گیا اور وہاں جانے سے حاصل کیا ہوا؟

حیدرآباد پہنچتے ہی ہوٹل میں اپنا بندوبست کر کے میں اور پیرو، نواب ثروت کے مکان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اُسی پہلی ملاقات میں ہم نے نواب کو بمبئی کا پتہ بتایا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ دوسری ہی گھڑی حیدرآباد کی زمین ہمارے لیے کتنی تنگ ہو جائے گی۔ درمیان کے سترہ دن برتنے کے بعد ہم نواب ثروت یار کے پاس جاتے تو شاید بمبئی کا پتہ کبھی نہ لکھواتے۔ دوسری ملاقات میں اُس نے بتایا تھا کہ اُسے ہمارا پتہ یاد ہے۔ دوسری بار ہم بمبئی روانہ ہونے سے ایک پہر پہلے اُس کے گھر گئے تھے۔ نواب حشمت جنگ کی موٹر ہماری تحویل میں تھی اور دادا نے احتیاطاً نواب ثروت کے مکان سے خاصی دُور موٹر رکوائی تھی۔ باقی راستہ ہم نے پیدل طے کیا تھا اور اچھی طرح یقین کر لیا تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا ہے مگر ہماری آنکھیں دھوکا بھی کھا سکتی ہیں۔ بعد میں نواب حشمت جنگ کے ڈرائیور کی نشان دہی پر ہمارے دیوانے اُس علاقے کے بلکہ ارد گرد کے ایک ایک مکان پر جا کے دستک دے سکتے ہیں کہ ایسی شکل و صورت کے دو آدمی فلاں وقت اُن کے ہاں آئے تھے کہ نہیں۔ نواب ثروت یار نے ہماری آمد کا مقصد اُنھیں کھُل کے بتایا ہوگا۔ چھپانے کی اُسے ضرورت بھی کیا تھی۔ ہم نے اُسے جولین کے گھر کا پتہ بتا دیا تھا۔ جولین کے گھر کے قریب ہی گولی چلی تھی۔ سامنے پیرو اور ماچھی آ گئے، اُن کے ساتھ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی زد پر آجاتا۔ اگر یہ سب اُسی زنجیر کی ایک کڑی ہے تو یہ سلسلہ دادا ہی پر تمام کیوں ہو گیا۔ ابھی دوسرے کئی باقی ہیں۔ جمرو، شامو، مارتی، زورا، ٹنگو، اباجان، منیر علی، میں اور بتّھل۔ سبھی حیدرآباد میں تھے۔ دوسروں کی باری بھی جلد آ سکتی ہے۔ اب نہیں تو چند دن بعد وقت کے کچھ ٹھہر جانے پر، شہر میں پولیس کا جوش ٹھنڈا پڑنے پر۔ جولین کے گھر سے انھوں نے ہر شخص کا تعاقب کیا ہوگا اور انھیں ہمارے سارے ٹھکانے معلوم ہو گئے ہوں گے۔ پاڑا، اباجان کا گھر، پیرو کا گھر......

میرا سر بھن بھنا رہا تھا۔ بتّھل نے بھی اِس پہلو پر کچھ سوچا یا نہیں؟ میرے جی میں آئی کہ فوراً بتّھل کے پاس جا کے اُسے بتاؤں۔ میں نے جھپٹتے قدموں سے برآمدہ طے کر لیا تھا لیکن اندر کمرے میں جاتے جاتے ٹھہر گیا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بتّھل کو اُٹھانا مناسب نہیں، سب منتشر ہو جائیں گے لیکن یہی ایک بات نہیں تھی جس نے میرے قدم جکڑ لیے تھے۔ یہ دلیل اپنی جگہ برقرار تھی کہ انھیں اپنے سوال کا حتمی جواب ملنے کے بعد ہی اِس کشت و خون کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ کیا انھیں اُن کے سوال کا جواب مل گیا یا انھیں آدمیوں سے اتنا سروکار نہیں، جتنا پتھروں سے ہے۔ ہم کسی خزینے کے راستے کی دیوار بنے ہوئے ہیں تو بے شک یہ دیوار ڈھا دینا چاہیے مگر اِس یقین کے بعد کہ پیچھے کوئی خزینہ واقعی موجود ہے یا یہ محض نظر کا فریب ہے۔ نواب ثروت یار کے ذریعے انھیں ہمارا پتہ معلوم ہو گیا تھا تو اپنے آدمیوں کو ایک اجنبی شہر میں بھیجنے اور خطرے میں ڈالنے سے بہتر یہ تھا کہ وہ نواب ثروت یار ہی کی جانب سے ایک خط لکھوا کے ہمیں حیدرآباد بلا لیتے یا کہیں اور، اپنی کسی جاگیر میں، جہاں پرندے بھی اُن کی اجازت سے پرواز کرتے ہیں۔ نواب ثروت کا یہ چند لفظی خط ہی بہت ہوتا کہ مولوی صاحب اور کورا فلاں شہر، فلاں گاؤں میں موجود ہیں۔ ہم کسی تاخیر کے بغیر وہاں پہنچ جاتے۔ نواب ثروت یار کی جانب سے ایسا کوئی خط ہمیں نہیں ملا تو یہی مراد ہے کہ وہ اُس تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں ورنہ اِس سے محفوظ اور یقینی تدبیر کون سی تھی۔

میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ میں سبزے پر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور میں نے آنکھیں موند کے اپنے آپ سے نجات پانے کی کوشش کی۔ پھوار سے کپڑے گیلے ہو گئے تھے۔ اندر سے کوئی بھی نہیں آیا۔ میں وہیں تنہا بیٹھا رہا اور از خود مجھ پر غفلت سی طاری ہو گئی۔ شاید اِس لیے کہ اتنا ہی میرے بس میں تھا۔ سر بھی تو کسی پیمانے کے مانند ہوتا ہے لیکن ہذیانوں کا یہ وقفہ دم لینے کا سا تھا۔ میرے رگ و پے میں پھر وہی جلن ہونے لگی۔ نواب ثروت یار کی طرف سے اب اگر کوئی خط آئے بھی تو اُن کی صداقت کا کیا بھروسا؟ کیا کسوٹی ہے؟ وہ یقیناً جھوٹا خط ہوگا۔ مولوی صاحب جس انداز سے اُس کے گھر سے گئے ہیں، اُن کے لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایسی جگہ کیوں آئیں گے جہاں میرے آنے کی امید ہو، جو گھر میں نے دیکھ لیا ہو۔ نواب نے بتایا تھا کہ مولوی صاحب نے میرا پتہ معلوم کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ دوسرے ہی دن وہ وہاں سے چلے گئے جیسے انھیں علم غیب ہو گیا تھا کہ میں حیدرآباد ہی میں ہوں اور وہ وہاں رہیں گے تو میں کسی وقت اُن کے سامنے پہنچ کے دعوا کر سکتا ہوں۔ مجھ سے تو انھیں خوف آتا ہوگا۔ قتل کے جرم میں سات سالہ سزا یافتہ سے خوف آنا ہی چاہیے۔ نواب ثروت یار کی طرف سے مولوی صاحب کی خیر خبر کا خط آنے کی کوئی امید میرے ذہن کے کسی گوشے میں چھپی ہے تو اُسے یک سر خارج کر دینا چاہیے۔ نواب کی طرف سے ایسا خط کبھی نہیں آئے گا۔ آئے بھی تو اُس پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔

میں خود کو یہی کچھ باور کرا رہا تھا کہ ناگہاں ایک خیال نے میرے حواس معطل کر دیے۔ کہیں نواب ثروت یار نے دروغ گوئی نہ کی ہو، مولوی صاحب نے میرے بارے میں اُلٹا سیدھا بتا کے اُسے آمادہ کر لیا ہو کہ میرے آنے پر وہ اِسی قسم کا کوئی جواب دے دے تاکہ میں دوبارہ حیدرآباد کا رُخ ہی نہ کروں، اُس کے گھر پر دوبارہ دستک ہی نہ دوں۔ مجھے کورا سے دُور رکھنے کے لیے قتل ہی کیا، مولوی صاحب اور بھی سنگین الزام لگا سکتے ہیں۔ لہٰذا نواب ثروت یار نے ایک کہانی تراش کے مجھے سُنا دی اور یوں مولوی صاحب سے اپنی خاندانی رفاقت کا حق نبھایا جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا، کورا سے اُسے واقعی کوئی دلچسپی تھی تو مولوی صاحب کی ہم نوائی میں اُسے اور شدت اختیار کرنی چاہیے۔ مولوی صاحب نے جیسلمیر میں ارشد کا رشتہ مسترد کر دیا اور رانا مہتاب کا پیام بھی اور اِس دوران جانے کس کس کا۔ ظاہر ہے، وہ اُسے ایسے کب تک ساتھ رکھیں گے۔ کب تک دربدری کی زندگی بسر کریں گے۔ کسی ایک دن تو اُن کے اعصاب جواب دے ہی جائیں گے۔ نواب ثروت یار میں بظاہر کوئی خامی نہیں ہے۔ اُس کا نسب نوابوں کا ہے، وہ وجیہ اور شائستہ ہے اور سب سے بڑی خوبی تو دولت کی ہے۔ دولت آدمی کے دس عیب چھپا لیتی ہے۔

میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ نواب کے چہرے سے بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ تو مولوی صاحب کے رویّے سے دل برداشتہ تھا۔ دادا کو بھی احساس نہیں ہوا، اُسے آدمیوں کی پرکھ میں بڑی مہارت تھی۔ دادا کی آنکھ بھی دھوکا کھا گئی! آدمی اتنا بہروپ کیسے بھر سکتا ہے۔ ہمیں ایک لحظے کے لیے بھی گمان نہیں ہوا تھا کہ نواب داستان طرازی کر رہا ہے۔ اُس نے تو ہم سے بہت زیادہ ہمدردی ظاہر کی تھی، ہمیں روکنا بھی چاہا تھا۔ پھر اُسے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ اُس کی والدہ نے کورا کو پسند کر لیا تھا اور مولوی صاحب سے رشتے کی بات کی تھی۔ اُسے یہ سب بتانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صاف صاف کہہ سکتا تھا کہ مولوی صاحب آئے تھے اور اچانک کچھ بتائے بغیر چلے گئے تو ہم کیا کر لیتے۔ مگر یہ سب کچھ تو وہ اپنے بیان کا سچ ظاہر کرنے کے لیے بھی کہہ سکتا ہے۔ اُسے یہی تاثر دینا چاہیے تھا کہ مولوی صاحب کو یہ رشتہ نامنظور تھا اور اُن میں صاف انکار کی جرأت بھی نہیں تھی اِس لیے وہ کچھ کہے سُنے بغیر چلے گئے۔ یعنی وہ دوبارہ نہیں آئیں گے اور میں اِس طرف سے بالکل مایوس ہو جاؤں۔

میرے ہاتھ پاؤں بالکل شل ہو گئے تھے اور پورے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اگر یہی سچ ہے تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ مجھے فوراً حیدرآباد جانا چاہیے۔ میرا وجود یہی کہہ رہا تھا کہ مجھے ابھی اِسی وقت یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ حیدرآباد سے ہمیں چلے ہوئے ڈیڑھ مہینے سے اوپر ہو گیا ہے۔ سامنے دروازے پر چوکی دار موجود تھا، برآمدہ بھی خالی پڑا تھا۔ میری نگاہیں دروازے پر منڈلاتی رہیں۔ کسی کے باہر آنے سے پہلے ہی میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے ورنہ پھر بہت دیر ہو سکتی ہے۔ مجھ پر خفقان سا طاری تھا۔ میں نکل جاتا مگر مجھے ہوش آگیا۔ یہ ندامت کا پسینہ تھا جو رُوئیں رُوئیں سے اُبل رہا تھا۔ دادا کو گئے ابھی دو دن ہوئے ہیں، میں اُس کے قاتلوں کو فراموش کر کے حیدرآباد چلا جاؤں؟ وہ سب جو اندر بیٹھے گیتا اور رانی کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ اُن دونوں کے کون ہوتے ہیں جو میں نہیں ہوتا۔ اُن سب کے لیے یہ کیسا تماشا ہوگا۔ میں اُنھیں بتا کے بھی جاؤں تو بھی وہ کیا سوچیں گے کہ یہ کیسا آدمی ہے، اِسے صرف اپنی طرف دیکھنا آتا ہے۔ میں ہمیشہ یہی کرتا ہوں۔ میں نے مراد آباد میں مولوی صاحب کا پتہ دیکھ کے یہی عجلت کی تھی۔ اُس وقت بھی میں پاگل ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ مہینہ گزر گیا ہے تو چند دن اور سہی اور ایسے بھی میں حیدرآباد کس طرح جا سکتا ہوں۔ میں کتنی ہی احتیاط کر لوں، بھیس بدل کے جاؤں یا اندھیروں کی آڑ لے کے۔ کسی نے مجھے دیکھ لیا تو شاید میں کبھی نواب ثروت یار کی دہلیز تک نہ پہنچ سکوں۔ وہ تو تاک لگائے بیٹھے ہوں گے اور ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ دادا کو ختم کرنے والے حیدرآباد سے آئے تھے یا کوئی اور تھے، وہیں کے تھے تو حیدرآباد میں ایک نواب ثروت

کیا، جانے کس کس تواب اُجا کی فصیل پھاندنی پڑے۔

یہ بھی تو محض مفروضہ ہے کہ نواب ثروت یار نے مجھے اور دادا کو مولوی صاحب کے بارے میں غلط بتایا تھا۔ ممکن ہے، وہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔ درمیان میں کورا بھی تو ہے۔ اُس کی آمادگی کے بغیر مولوی صاحب اور نواب ثروت یار کی مرضی کیا حیثیت رکھتی ہے۔ وہی نواب تک مولوی صاحب کو روکے ہوئے ہو گی۔ وہی انکار کر دیتی ہو گی اسی لیے مولوی صاحب نے ہر جگہ معذرت کر دی تھی۔ اُس کے چہرے پر غبار آجانے کے خوف سے وہ زیادہ اصرار بھی نہ کر پاتے ہوں گے۔ وہ تو اُسے مسلسل آسرا دلاتے رہے ہوں گے کہ وہ مجھی کو ڈھونڈ رہے ہیں اور ایک دن میں ضرور مل جاؤں گا۔ وہ سمجھتے ہوں گے کہ کسی دن دنیا خود اُس پر غالب آجائے گی۔ کبھی تو اُس کا حوصلہ ماند پڑے گا اور آخر وہ اُن کی بات مان لے گی۔ مولوی صاحب نے ہمیشہ تنہا زندگی گزاری ہے، نہ بیوی نہ بال بچّے۔ پہلی مرتبہ کوئی یوں اُن کے ساتھ رہا ہے۔ اس عرصے میں وہ اس کے عادی ہو گئے ہوں گے۔ اُس کی جدائی کے تصور ہی سے اُن کا دل ہَول جاتا ہو گا۔ زہرہ اور منیر علی کہتے تھے کہ مولوی صاحب اُس کے لیے پلکیں بچھائے رکھتے تھے، مستقل سایہ بنے رہتے تھے۔ مولوی صاحب اُس کے لیے ایسے رشتے کی تلاش میں ہوں گے جو اُن کی طرح کورا کے آئینے کا خیال رکھ سکے۔ اُن سے زیادہ کون کورا سے واقف ہو گا کہ وہ کتنی شیشہ ہے اور اُنھوں نے کس طرح ریشم میں اُسے محفوظ رکھا ہے۔ اُنھیں اندازہ ہو گا، جس دن اُنھوں نے کسی اور کے بارے میں کورا سے پوچھا تو وہ اُسے کھو دیں گے چنانچہ وہ کسی ایسے دن کے شدّت سے منتظر ہوں گے۔ جب کورا کی استقامت میں خود ہی لغزش آجائے مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، کورا کا ارادہ اُس کی رگوں میں اور رچ بس رہا ہو گا، کسی درخت کی طرح

نواب ثروت یار کے پاس کتنی ہی دولت ہو اور مولوی صاحب اُسے کتنا ہی لائق آدمی سمجھتے ہوں، کورا کا اقرار بھی تو ضروری ہے۔ مجھے خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ فیصلہ کرنے والے صرف مولوی صاحب نہیں ہیں، اصل فیصلہ کورا کا ہو گا۔ اُس کی آنکھیں تو مجھی کو ڈھونڈتی ہوں گی، میرے خواب دیکھتی ہوں گی، میری طرح اُس کا دل بھی اُس سے کچھ کہتا ہو گا۔ وہ بھی آہٹوں پر چونک پڑتی ہو گی اور مولوی صاحب کا آسرا کیا، خود اُس کی امید اُس کی توانائی ہو گی۔ کیا معلوم کسی دن مولوی صاحب ہی کا پتھر پگھل جائے اور وہ جان لیں کہ کورا کا عزم کتنا توانا ہے۔ وہ اُسے اس لیے میرے سپرد کرنا نہیں چاہتے کہ میں سراپا فتنہ ہوں اور اُس کے لیے موزوں نہیں ہوں لیکن جب اُن کے اعصاب جواب دینے لگیں گے تو مآلِ کار اُنھیں میری جستجو ہو گی، وہ مجھ تک پہنچنا چاہیں گے۔ میں اُن سے کہیں دُور نہیں، بشرطیکہ وہ اسی نتیجے پر پہنچیں۔

میں سبزے پر بیٹھا اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا، مجھے اردگرد کی کوئی خبر نہ رہی تھی مگر میں یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں کے لیے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ بیداری ہے یا کچھ اور۔۔۔ میرے سامنے ڈاکٹر کیلاش کی بہن رُما کھڑی تھی۔ آسمانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس، بال کھلے ہوئے۔ تیز روشنی میں اُس کا چمپئی رنگ دمک رہا تھا۔ اُس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا، وہاں صرف دُھوپ تھی۔ برآمدے سے شبّی چاچا گزر رہے تھے۔ پھوار پڑنی بند ہو گئی تھی تاہم بدن کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ "آپ یہاں بیٹھے ہیں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں بس، ایسے ہی۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ میں مخل ہوئی۔"

"نہیں۔" میں نے اپنے شانے سیدھے کیے اور مستعدی سے کہا۔ "ایسے ہی اپنے آپ سے مخاطب تھا۔"

"سب سے آسان اور دلچسپ مشغلہ۔" وہ شگفتگی سے بولی۔ "میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آدمی کا سب سے بڑا رفیق وہ خود ہوتا ہے اور رقیب بھی۔ وہی خود کو سب سے زیادہ رُلاتا ہے، ہنساتا ہے۔ وہی اپنی سب سے زیادہ سُنتا اپنی سُناتا ہے۔" میں سر جھکائے خاموش رہا تو بے تابی سے کہنے لگی۔ "کیا سوچ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں، کوئی بات نہیں۔ باقی سب کہاں ہیں؟"

"اندر اُسی کمرے میں۔"

"کیا کر رہے ہیں؟"

"گیتا اور رانی سے جھوٹ بولنے کی کوشش۔"

"کیسا جھوٹ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"جو موت پر سب ایک دوسرے سے بولتے ہیں۔ جھوٹ ہمیشہ بُرا نہیں ہوتا۔ کبھی سچ بہت بے رحم ہوتا ہے، کبھی جھوٹ بہت معصوم۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "ایسے میں سب یہی کرتے ہیں، اور کریں بھی کیا۔"

"جھوٹ کا تعلق نیّت سے ہے۔"

"ہاں، اور پھر سچ کا بھی۔" وہ پلکیں جھپکتے ہوئے بولی۔ "نیّت اچھی نہیں تو سچ لعنت ہے۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اُس نے میری ہدایت پر عمل کیا

اور گہری سانس بھرنے لگی پھر آہستگی سے بولی "آپ کیسے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک۔"

"کہاں! چہرہ کیسا بجھا ہوا ہے۔ آپ تو ایک پڑھے لکھے جوان اور مضبوط ارادے کے آدمی ہیں۔"

میں پہلو بدل کے رہ گیا۔

"کل بھی میں آپ کو دیکھتی رہی، پہچانے نہیں جاتے تھے۔"

"واقعہ ہی کچھ ایسا ہے۔ پرسوں رات آپ بھی جولین کے گھر تھیں۔ دادا کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کچھ دیر بعد...."

میری آواز بھرّانے لگی۔

"میں نے انھیں دیکھا تھا اور اچھی طرح، زندگی سے بھرپور۔" وہ تیز تیز لہجے میں بولی "کیلی نے بھی مجھے بتایا ہے کہ وہ کیسے آدمی تھے، کتنے اچھے دوست، بہادر اور.... گیتا اور اُس کی ماں رانی کو بھی اُس رات وہیں دیکھا تھا۔ دونوں پھولوں کی طرح لگیں۔ اُن کے چہروں کی خوشی بتا رہی تھی کہ دادا کیسے شوہر، کتنے اچھے باپ ہیں۔ یہاں سبھی الگ ہیں، بالکل نئے آدمی۔ میرے لیے تو یہ سب حیرت ناک ہے۔ میں آپ کو بتاؤں، کیلی نے مجھے منع کیا تھا کہ آپ سے یا کسی سے گیتا کے باپ کے بارے میں، اِس سانحے کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں کہ یہ سب کیا ہے، کیوں ہوا، وہ کون لوگ تھے۔ اُس کا خیال ہے، یہ ذکر تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ مجھے خود احساس ہے کہ نہ اِس کا یہ موقع ہے نہ یہ ضروری ہے لیکن آدمی کا دماغ سوالوں کا جنگل ہے۔ یہ سب دیکھ کے طرح طرح کے سوال سر اُٹھاتے ہیں۔"

"آپ سب کچھ خود جان جائیں گی۔"

"مگر اِس کی ضرورت نہیں۔" اُس نے شدّ و مد سے کہا "ضروری نہیں کہ جوابوں کے بغیر ہم زندہ نہ رہیں۔ کتنے ایسے سوال ہیں جنھیں جانے بغیر ہم اِس دنیا میں پوری زندگی کے ساتھ موجود ہیں اور شاید زندگی گزارنے کا یہ ایک نہایت آسان نسخہ ہے کہ کم سے کم سوال کیے جائیں یا کم سے کم جواب چاہے جائیں۔" وہ میری جانب مضطربانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور توقع کم مت رکھیے، ہر جواب کی کوئی توقع ہوتی ہے۔ ناقابلِ یقین جواب کی توقع کی جائے تو شاید سب ٹھیک رہتا ہے۔"

"جانے دیجیے۔" وہ سر جھٹک کے بولی "میں آپ سے کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اتنے دنوں بعد تو آپ یوں ملے ہیں۔ پھر یہ وقت نکل جائے گا۔ اِس سے پہلے کہ یہاں کوئی آجائے اور آپ سے بات ممکن نہ ہو سکے، میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟" میں نے پٹ پٹاتی نظروں سے پوچھا۔

"کوئی ایسی بات نہیں۔" وہ مسکرا کے بولی "آپ اُس دن گو آئے تھے کیلی کے ساتھ تو بہت اچھا لگا تھا۔ پھر آپ کا انتظار رہا۔ میں نے کیلی سے کئی بار کہا بھی لیکن وہ ایک غیر ذمّے دار آدمی ہے۔ جہاں میں آپ کے کسی کام آسکتی ہوں تو ضرور بتائیے؟ یہ میں رسمی طور پر نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے بہ عجلت کہا۔

"سُنتے ہیں کہ ایسے وقت میں دوستوں کا رُخ کرنا چاہیے۔ اُن کی چھاؤں درختوں کے مانند ہوتی ہے۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کو اِس چھاؤں کی بڑی ضرورت ہے۔"

"چھاؤں کی کسے ضرورت نہیں ہوتی۔"

"اور لوگ کہتے ہیں، درختوں میں چھاؤں اتنی نہیں ہوتی جتنی آدمیوں میں ہوتی ہے۔"

"لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"اور جانے کیوں، ہر درخت کی طرح ہر آدمی کی چھاؤں یکساں نہیں ہوتی۔"

"درختوں کی بھی یکساں نہیں ہوتی، کسی کی کم، کسی کی زیادہ، کسی کی گھنی، کسی کی چھدری اور کسی کی بالکل نہیں ہوتی۔ یہ درخت درخت کی توفیق پر منحصر ہے۔"

"ہاں۔" وہ چمکتی آنکھوں سے بولی "اور لوگ گھنی چھاؤں کے درختوں کا رُخ کرتے ہیں۔ ہر آدمی کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ کسی کی چھاؤں بہت گھنی ہوتی ہے پر لوگ اُدھر نہیں بھٹکتے یا لوگوں کو نظر نہیں آتی؟"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے شائستگی سے کہا "اور کبھی دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔ قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ اتنی سی چھاؤں کے لیے کتنا طویل سفر طے کیا، کتنے درخت پیچھے چھوڑ آئے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلانے لگی۔ میں نے اُس سے کہا "کسی کے اندر ہی بہت آگ جل رہی ہو تو چھایا کیا کرے گی۔"

"ہاں۔" اُس کے ترشے ہوئے ہونٹوں پر لرزش سی طاری ہوئی۔ "بے شک یہ آدمی پر بھی منحصر ہے کہ اُسے کتنی چھاؤں کی ضرورت ہے، اُس کے اندر کتنی دھوپ ہے۔" وہ آدھی ہندوستانی اور آدھی انگریزی میں باتیں کر رہی تھی۔ کچے کچے منہ سے پکی پکی باتیں، نہایت انہماک سے، نفاست اور تپاک کے باوجود اُس کے لہجے میں کوئی تکلف نہیں تھا، بے ساختگی تھی۔ یہ کلام کی بات ہے کہ وہ کتنا دل نشیں ہے۔ شروع میں اُس کی آمد پر مجھے گھبراہٹ سی ہوئی تھی لیکن اب اُس کی جلتی

بجھتی آواز پر میرے کان مرکوز تھے اور مجھے ہلکا پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ کہنے لگی "پر دو آدمی جب بھی ملتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے کسی نہ کسی قدر سایہ ضرور رکھتے ہیں۔ درختوں کا مقصو صرف سایہ کاری ہے، یہ مسافر کی مرضی ہے کہ آگے کتنا بڑا سفر درپیش ہے اور اُسے کتنی دیر ٹھیرنا ہے۔ درختوں کو غرض اپنی چھایا سے ہوتی ہے اور یوں انھیں اپنے وجود کا جواز مل جاتا ہے۔ کوئی کسی درخت سے پوچھے کہ اُسے سایہ دے کے کتنا سکون ملتا ہے۔ میرا مطلب ہے، آدمی کے ساتھ بھی تو ایسا ہو سکتا ہے۔ آدمی بھی تو ایسے ہو سکتے ہیں۔" یہ کہتے کہتے وہ چونک سی پڑی اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولی "معلوم نہیں، یہ باتیں آپ کو کیسی عجب لگتی ہیں لیکن مجھے آگے پیچھے کی ایسی تمیز نہیں آتی اور میں سمجھتی ہوں، آپ بھی اِس پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔"

"نہیں نہیں، آپ تو بہت دل کش باتیں کرتی ہیں، خیال آفریں۔ آپ چھاؤں کی بات کر رہی تھیں۔ سچ پوچھیے تو مجھے اِسی کا احساس ہوا۔"

"مجھے یہ جان کے خوشی ہوئی لیکن باتیں ہی نہیں۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی "باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ میں ایک عملی آدمی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں نے کئی بار آپ سے ملنے کا ارادہ کیا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "لیکن بس رہ گئی۔ آپ کا جی نہیں چاہا؟"

"چاہا۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "پر ادھر مہلت ہی نہیں ملی۔"

"میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ ہم مرحلوں کے محتاج کیوں ہوتے ہیں۔ ہم تمام مرحلے ایک ہی جست میں کیوں طے نہیں کر لیتے۔"

"مجھے یاد آرہا ہے، یہ بات آپ نے پہلے بھی کہی تھی۔"

"مجھے رسوم و آداب کبھی نہیں بھاتے۔ یہ زندگی مشکل کر دیتے ہیں۔"

"لیکن ہم سب اِن سے مشروط ہیں۔"

"مگر کیوں؟ ہم پہلے مرحلے میں آخری مرحلے کے دوست کیوں نہیں بن سکتے۔"

"کیوں نہیں بن سکتے، لوگ بن جاتے ہیں۔"

وہ کہیں کھو سی گئی، میں بھی اُسے گنگ نظروں سے دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ بے چینی سے کہنے لگی "لیکن ہاں، ایک اہم بات میرے ذہن سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ یہ کیا ضروری ہے، دونوں شخص ایک ہی کیفیت سے دوچار ہوں۔ ایک شخص کو جلدی ہے، دوسرے کو نہیں، ایک کا تاثر کچھ اور ہے، دوسرے کا کچھ اور۔ مثلاً میں نے آپ سے جو شدید تاثر لیا ہے، آپ نے، ہو سکتا ہے، اِس طرح مجھے محسوس نہ کیا ہو۔"

"جی جی ہاں، مگر مگر۔" میری زبان لکنت کرنے لگی۔

اُس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ کہنے لگی "بعض اوقات مراحل عذاب بن جاتے ہیں۔ یہ زندگی بوجھل کر دیتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ان کی تاب نہیں لا پاتے اور دور ہو جاتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آدمی کا ایک دوسرے پر اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ آدمی کو آدمی سے بہت تلخیاں ملی ہیں اِس لیے وہ ترازو لیے پھرتا ہے۔ وہ بہت محتاط ہو گیا ہے یا یہ کوئی خوف ہے یا اِس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کسی انسانی قدر کی پاس داری کر رہا ہے، وضع نبھا رہا ہے اور کسی عہد و پیمان کی گرفت میں ہے۔ ہر پیمان ایک دوسرے کے مفادات کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے۔ کسی کے مفاد پر ضرب نہ پڑتی ہو تو پیمان پر کہاں ضرب پڑی۔ پھر ایک ایسا پیمان، ایسا جبر آدمی خود پر کیوں مسلّط کرتا ہے جس میں تیسرے آدمی کا داخلہ ممنوع ہو جب کہ تیسرا آدمی بھی ایک حقیقت ہے اور موجود ہے۔ کیا یہ دُنیا محض دو آدمیوں کے لیے ہے؟ تیسرے کی شمولیت اِس کا نظام بگاڑ دیتی ہے؟ یہ کون سی انسانی قدر کی پاس داری ہے جس میں تیسرا، چوتھا، پانچواں شخص نقصان اُٹھاتا ہے۔ کیا درخت کی چھاؤں صرف ایک شخص کے لیے ہے۔ ایک ہی شخص کے پاس رشتہ ہے؟ زندگی تو ایک مستقل مسافرت ہے۔ درمیان میں ہزار منزلیں، ہزار آدمی، ہزار حیرتیں ہیں۔ دو آدمی زیادہ تحفظ اور سکون سے رہ سکتے ہیں۔ دو آدمیوں کی خلوت دنیا کی بہترین راحت ہے مگر کیا ساری زندگی کے لیے؟ کیا ایک شخص متعدد لوگوں کو مطلوب نہیں ہو سکتا؟"

میں نے جواب دینا چاہا لیکن خاموش رہا تاکہ اُس کا سلسلہ نہ ٹوٹ جائے۔ کوئی بپھری بپھری سی لہر متلاطم تھی۔ وہ تیز تیز انگریزی میں باتیں کر رہی تھی، کھنکتی، چٹختی، چہکتی آواز میں۔ کہتے ہیں حلق تو آواز کا صرف وسیلہ ہے، آواز میں تو سارا بدن شامل ہوتا ہے۔ رَما کا انگ انگ جیسے اُس کی آواز میں شامل تھا۔ میں سُنتا رہا۔ کہنے لگی "کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، ایسی کیا بات ہے، یہ کیسا گورکھ دھندا ہے، کیسا تماشا ہے۔ آدمی کی سرشت جستجو ہے مگر یہ کیا ہے کہ وہ تجربے سے بھی گریزاں ہے۔ وہ اتنا دُور دُور کیوں رہتا ہے، لوگوں کے پاس کیوں نہیں آتا۔ اُن کا مشاہدہ، اُن کا جلوہ کیوں نہیں کرتا۔ میں اکثر یہ سوچتی ہوں اور اپنے طور پر طرح طرح کے نتیجے اخذ کرتی رہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے، ایک ہی شخص سے کسی کا جی سیر نہ ہوا ہو، ایک شخص کا طلسم بڑا ہے۔ ایک شخص کی دریافت سے کوئی نہ نمٹا ہو یا اسرار کھوج نہ پایا ہو۔ وہ زخم خوردہ ہے یا اپنی انا کا اسیر ہے۔ کوئی شخص انا بن گیا

ہے۔ وہ اعلا درجے کے ترکِ وایثار پر کمربستہ ہے یا پھر وہ مستقل تلاش میں ہے۔ آہ وہ شخص کیسا خوش نصیب ہے جو اتنے لوگوں کے ہجوم میں مرکزِ محور قرار پایا۔ جواب تو مل جاتے ہیں یا میں اپنی آسودگی کے لیے انھیں تراش لیتی ہوں، قیاس کر لیتی ہوں لیکن میرا مقصد کچھ اور ہے۔ یہ کیوں طے کر لیا گیا کہ درمیان کے چھوٹے چھوٹے سایوں سے آدمی کنارہ کیے رہے۔ ہو سکتا ہے یہی راحتیں کبھی اپنا دائرہ بڑھا لیں اور سفر تیز کرنے اور کسی مطلوبہ منزل تک جلد پہنچنے کا سبب بن سکیں اور میں کہنا چاہتی ہوں کہ دوسرے محض غاصب نہیں ہوتے، رہزن یا کم نگاہ۔ لوٹس کلب میں مجھے طرح طرح کے لوگوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک مثالیہ پرست لڑکی کسی مکمل شخص کی تلاش میں اپنے خواب ناک دن گنوا رہی تھی۔ وہ پابندی سے کلب آتی اور اپنے آپ میں گم رہتی تھی۔ وہ اپنے خیال و تصور میں اتنی دور جا چکی تھی کہ مثالیے کے سوا کسی کی رفاقت اُس کے لیے چھوت کی بیماری کے مانند تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ اُس نے بہت دلچسپ جواب دیا، خبر ہے اس نے کیا کہا؟"

"کیا، کہا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اُس نے کہا، اُسے درمیان میں ٹھہر جانے اور منتشر ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہے۔ تعبیر ادھوری رہ جانے کا ڈر، تصویر نا تمام رہ جانے کا خوف۔ میں نے کہا کہ یہاں کون درجۂ کمال پر فائز ہے اور تکمیل سے کیا مراد ہے اور انسان تو لمحہ لمحہ بدلنے والے عناصر کا مرکب ہے اور تم خود کس منتہائے کمال کی دعوے دار ہو۔ حسن کوئی کمال نہیں نقش و نگار کا دل آویز تناسب، رنگ روپ سب حسنِ کامل کا ایک رُخ ہے۔ وہیں مجھے ایک اور لڑکی ملی۔ اُس کے ہاں ایک اور نفسی گرہ پڑی ہوئی تھی۔ اُس پر مضحکہ خیزی کی حد تک ایک اندیشہ طاری تھا کہ رفاقت اتنی جاں فزا نہیں جتنی جدائی جاں سوز ہوتی ہے۔ لوگ جدا ہو جاتے ہیں اور پھر عذاب نازل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے بدلنے کو بھی جدائی سے تعبیر کرتی تھی۔ لوگوں کا بدل جانا بھی اُس کے خیال میں جدائی کے سانحے سے کم نہیں تھا۔ وہ بے شک لوگوں سے تپاک سے ملتی تھی مگر طنابیں کھینچ کے۔ عقل و ہوش کی بات ہوتی تو ٹھیک تھی، اُس کا معاملہ یکسر مختلف تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اُس نے شدید قسم کی رفاقت کا کوئی تجربہ نہ کیا ہو یا اس بے پناہ انسانی جذبے سے ناآشنا ہو مگر وہ اپنی وارفتگی و شیفتگی کسی متاع کی طرح اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے، زندگی کوئی دکان نہیں جس پر گاہک آیا چلا گیا۔ جس رفاقت میں آدمی ہمہ جاں شامل نہ ہو وہ سراب ہے۔ مہرباں لمحے آنے والے کڑے وقت کی مآل اندیشی میں کیوں گنوا دیے جائیں۔ یقیناً ہر شخص اعلا درجے کی رفاقت کا متحمل نہیں ہوتا۔ آدمیوں کے ظرف ایک جیسے نہیں ہوتے، اُسے قریب آنے دیا جائے مگر کوئی ہم زباں کبھی مل جائے جس میں دردآشنائی کا وصف اور چند قدم ساتھ چلنے کی استطاعت ہو تو اُس کے ساتھ رویّے کا بخل جبر کرنے کے مترادف ہے۔ یہ منافقت ہے، خود سے منافقت۔ اور میں نے کہا، کہ کل تو ہمیشہ سے بے اعتبار ہے۔ آدمی کی وسعت سمٹتی پھیلتی رہتی ہے۔ آدمی جدا ہوتے رہتے ہیں اور مثالیے آسمان سے نہیں اُترتے، اُترتے ہیں تو زمین پر بہت گرد و غبار ہے۔"

وہ کہتی رہی اور میں ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ یہ اُس کے بیان ہی کا لطف نہیں تھا، کچھ اور بھی تھا جو مجھے مبہوت کیے ہوئے تھا۔ کہنے لگی،

"کلب میں ایک نوجوان سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ تعلیم یافتہ، وجیہ اور ایک اچھے خاندان کا حوالہ رکھتا تھا۔ اُس سے کوئی بچھڑ گیا تھا اور اُس کے انتظار میں اُس نے گویا جوگ لے لیا تھا۔ وہ شائستگی سے لوگوں سے ملتا تھا مگر اُس شائستگی میں ایک عجب نخوت اور اجنبیت تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے۔ اُس نے زندگی کے حاشیے پر چلنا کیوں شروع کر دیا ہے۔ اس گریز میں کیا رمز ہے؟ اُس نے جو جواب دیا، وہ تصوری تھا، اُس کی بات میری سمجھ میں آئی اور مجھے اچھی بھی لگی۔ سنسنی خیز سی۔ اُس نے کہا، میں جس شخص سے مخاطب ہوں، وہ محض ایک جسم، ایک خول ہے، اُس کی روح اُس سے جدا ہو گئی ہے۔ میں نے پوچھا، کیا اُس کے دوبارہ ملنے کا امکان ہے۔ اُس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا کہ کون جانے۔ مجھے اُس سے بہت ہمدردی ہوئی، میں نے اُس کی دل داری کی کوشش کی لیکن وہ اپنے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر میں نے اُس سے کنارہ کر لیا۔ میں نے جانا کہ میری موجودگی میں اُس کے بادل گرجنے لگتے ہیں، اُس کی آنکھیں اُمڈ آتی ہیں۔ مجھے یاد ہے، میں نے اُس سے کہا تھا کہ یہ کائنات اتنی مختصر نہیں ہے۔ کہنے لگا، تمھیں کوئی ملے تو جانو کہ کتنی بڑی ہے۔ میں نے کہا، میں سمجھنا چاہتی ہوں، کہنے لگا، یہ سمجھایا نہیں جا سکتا، کوئی کبھی ملے گا تو خود بخود سمجھ میں آ جائے گا کہ اِس آگ میں کیسا نشہ ہے۔ میں نے کہا، مگر یہ تو فنا کا راستہ ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ اِسی کی تو اُسے آرزو ہے۔ وہ بہت شراب پینے لگا تھا۔ میں نے روکا تو بولا، آگ اور بڑھ جاتی ہے۔ اُس کی صحت خراب ہوتی گئی۔ کلب سے ناغے کرنے لگا، پھر ایک دن کسی طرف نکل گیا، کہاں، کیا خبر۔ میں نے اِس سلسلے میں اُس کے ایک عزیز سے پوچھا تھا، جواب ملا، دیوانہ کہاں جائے گا۔"

میری رگوں میں خون رکنے لگا تھا۔ وہ مجھے یہ سب کچھ کیوں سنا رہی ہے؟ ایسا لگا جیسے وہ مجھے آئینہ دکھا رہی ہو۔ اس نے جان بوجھ کے کلب کے ایک نوجوان کا افسانہ تراشا ہے اور اُن دو لڑکیوں کا ذکر بھی دانستہ اِسی سیاق و سباق میں کیا ہے۔ میں نے کہنا چاہا کہ اُس کی داستانیں نہایت نا تمام ہیں۔ دنیا میں اِتنا ہی نہیں ہے جتنا اُس نے جانا ہے۔ اِس سے بہت سوا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ آدمی کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی نفسی گرہ یا ذہنی کجی نہیں، جانے کیا ہے۔ کون کس موڑ پر مل جائے۔ یہ تو آدمی کے ملنے پر ہے اور زندگی پر ہے کہ وہ کس سے کیسا برتاؤ کرتی ہے۔

میں نے کچھ نہیں کہا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھورتا رہا۔ وہ تراپا اپنے آپ میں گم تھی۔ اُس کی سیاہ لٹیں شانوں پر جھول رہی تھیں اور پھول جیسے چہرے پر یاسیت اور تاسف کی دھند چھائی ہوئی تھی، جیسے چاندنی ٹھٹکی ہوئی ہو۔ نوجوان کے ذکر پر اُس کی آنکھیں بھاری ہو گئی تھیں، آواز بھی بکھر گئی تھی۔ اُس کا انداز بھی خود کلامی کا سا تھا۔ اِس میں کسی تردد اور پشیمانی کی کیا بات ہے؟ میں نے خود کو ٹوکا۔ میں نے اُس کی صاف بیانی اور بے باکی اپنی سبکی پر کیوں محمول کر لی؟ یہ میری اپنی کدورت ہے، اپنا اکراہ ہے جو میری رگیں کھینچنے لگی ہیں۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جسے اشاروں اور کنایوں کی ضرورت پڑے۔ وہ میرے بارے میں اتنا کچھ نہیں جانتی ہو گی، اسے بتائے گا بھی کون؟ وہ ایک ذہین و فطین لڑکی ہے اور اس نے میرے چہرے پر لکھا ہوا کچھ پڑھ لیا ہے۔ اس کے خیال میں میری مستقل سرگرانی و سرگشتگی کا سبب یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ سو یہ رویّے کی خیرات نہیں، معذوروں اور مفلوجوں سے خوش خصال لوگ جو سلوک کرتے ہیں، میرے کتنے ہی درد مند مجھے میرے سوال اور کسی کشکول کے بغیر اِسی نرمی اور گداز کی بھیک دیتے ہیں اور مجھے مزید ناتواں اور ہلکان کر دیتے ہیں۔ پہلے مجھے رما کی باتوں پہ اِسی خیرات کا گمان ہوا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ تو دلیلیں دے رہی تھی۔ اُس کے اظہار میں تو بہت انکسار اور تپاک تھا۔ وہ ایک حسین و جمیل لڑکی، یہ اس کا التفات، اس کی عنایت ہے کہ اتنے لوگوں کے درمیان سے اُٹھ کے میرے پاس آ کے بیٹھی ہے اور اپنے ریشم، اپنی چھاؤں سے میری دھوپ کم کرنے کا جتن کر رہی ہے۔ میری اور اس کی شناسائی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے لیکن اُس کے بہ قول، شناسائی میں مدت کی شرط کب ہوتی ہے اور مرحلوں کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کوئی نقش مٹا دینے کو کب کہہ رہی ہے یا اُس سے انکاری ہے۔ وہ تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔ اِس سے زیادہ کوئی کیا کہہ سکتا ہے اور کسی کو کسی سے اتنی غرض کہاں ہوتی ہے۔ میرا جی اُس کے لیے بہت امڈا، ایک لحظہ میرے جی میں آئی کہ اُٹھ کے اُسے سینے سے لگا لوں اور بتاؤں کہ کلب کے نوجوان نے جس آگ کا ذکر کیا ہے، وہ اُس نے طنزاً کیا ہو گا۔ لوگوں نے طرح طرح کے نام دے دیے ہیں مگر یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ یہ آگ تو بینائی جھلسا دیتی ہے۔ یہ کوئی نظریہ یا عقیدہ نہیں جس پر اصرار کیا جائے۔ یہ تو اپنی بقا کا اصرار ہے۔ بے شک زندگی ایک فرد سے دوسرے فرد تک نہیں ہوتی مگر ایک فرد ہی راستہ بن جاتا ہے، راستہ بھی وہی، منزل بھی وہی۔ دو آدمی مل کے کبھی ایک بن جاتے ہیں۔ ایک شخص چپکے سے دوسرے کا جزوِ جاں بن جائے تو دوسرا کیا کرے۔ اُس کا اختیار تو چھن جاتا ہے۔ کوئی فنا نہیں چاہتا مگر راستہ دوسرا کوئی دکھائی دے تبھی تو؟ میں اُس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے تحمل کیا۔ اُس نے کوئی سوال بھی نہیں کیا تھا، نہ میرے جواب کی منتظر تھی۔ وہ تو خود تائید طلب تھی اور اپنی دانست میں چارہ گری کے طور تجویز کر رہی تھی اور اُس کا لب و لہجہ وہی تھا، نرم و لطیف، مترنم اور دل سوز۔ میری رخنہ اندازی سے اُس میں شکن پڑنے کا احتمال تھا اس لیے میں بس سنتا رہا۔

پھر کیلاش کی آواز پر سب کچھ درہم برہم ہو گیا۔ رما بھی اچھل پڑی اور خجل خجل سی ہو گئی۔ کیلاش برآمدے سے آوازیں لگاتا یکایک ہمارے سامنے آ گیا اور شکایت جیسے انداز میں رما سے کہنے لگا، "وہ یہاں کب سے بیٹھی ہے؟" دوسرے ہی لمحے اُسے میری موجودی کا خیال آ گیا، اُس نے پیشانی کے بل صاف کرنے کی کوشش کی اور جھجکتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ یہ فتنہ انگیز کب سے یہاں بیٹھی ہے۔

میری نگاہیں رما کی طرف اُٹھ گئیں، میں نے نرمی سے کہا، "دیر سے۔"

"پہلے تمھیں مخل ہونے کی معذرت کرنی چاہیے۔" رما چہکتی آواز میں بولی۔

کیلاش سچ مچ معذرت کرنے لگا۔ میں نے اُسے تسلی سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، وہ بیٹھ گیا اور اپنی اُلجھی ہوئی سانسیں استوار کرتا رہا۔ "یقیناً اِس شریر نے غیر متعلق باتیں کی ہوں گی؟" اُس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

میں نے اُسے بتایا کہ اُس کی بہن نہایت دل نواز اور فکر انگیز باتیں کر رہی تھی۔ اِس سے زیادہ متعلق باتیں ممکن ہی نہیں تھیں۔

"پھر تو میں واقعی مخل ہوا۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "کیا گفتگو ہو رہی تھی؟"

"تمھارے بارے میں نہیں تھی۔" رما نے چہکتی آواز میں کہا۔ "یہی کچھ آدمیوں کے بارے میں۔"

"شکر ہے، تمھیں آدمیوں کی باتیں کرنا تو آئیں۔"
اُس کی برجستگی پر مجھے ہنسی آگئی۔ وہ دونوں بھی کھل کھلا اُٹھے۔ کیلاش کہنے لگا: "مجھے آپ کے چہرے پر شگفتگی دیکھ کے یقین کیجیے، بہت خوشی ہوئی۔" میں اُسے صرف دیکھ کے رہ گیا۔ اُس کی آنکھیں اسی خوشی کی غماز تھیں۔

"تم پھر احساس دلا رہے ہو۔" رما نے اُسے ٹوکا۔

"نہیں، بالکل نہیں۔" کیلاش نے فوراً تردید کی اور حسرت آمیز لہجے میں بولا: "آپ ایسے ہی رہیے، ایسے ہی خوش خوش۔ میں تو ڈر رہا تھا۔ یہ رما میری باؤلی بہن اکثر اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگتی ہے مگر آج تو مجھے اپنے دیکھے پر یقین نہیں آرہا، آج تو اس نے کمال کر دیا۔"

"اِن میں بہت خوبیاں ہیں، سب سے بڑی خوبی تو دردمندی ہے۔"

"آپ کہتے ہیں تو میں اپنی محفوظ رائے پر نظرِ ثانی کروں گا۔" کیلاش نے چہک کر کہا۔

"نہیں نہیں، تمھیں ملال ہوگا کہ تم نے کتنی دیر بعد یہ فیصلہ کیا بلکہ بعد از وقت۔" رما نے جواب دینے میں ایک لحظے بھی تامّل نہیں کیا۔

کیلاش سے کوئی بات نہ بن پڑی یا اُس نے میرے خیال سے نوک جھونک جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان دونوں میں فقرے بازی خوب ہوتی ہے۔ میں نے کیلاش سے کہا کہ اُس کی بہن کئی اعتبار سے ایک منفرد لڑکی ہے۔

"انفرادیت تنہا کر دیتی ہے۔"

"اور ممتاز بھی....." میں نے کہا۔

"ایسا نہ کہیے، یہ اور سرکش ہو جائے گی۔"

میرے منہ پر فقرہ آیا کہ کہوں، پھر تو اور دل کش ہو جائیں گی مگر میرے ہونٹ بس پھڑک کے رہ گئے۔

"لگتا ہے، آج اِسی کی باری تھی، یہی بولتی رہی ہے۔" کیلاش نے تیکھی آواز میں مجھ سے پوچھا: "کیا زہر اُگل رہی تھی؟" پھر اُس کے دمکتی نظروں سے رما کو دیکھتے ہوئے بہ عجلت ترمیم کی: "میرا مطلب ہے کیسی گل افشانی....."

"بہت کچھ....." میں نے گہری سانس لی۔

"یہ آپ سے ملنے کو بہت بے تاب تھی۔ آج اسے موقع مل گیا۔ میں سمجھ رہا تھا، یہ اندر کسی کمرے میں ہے۔ جولین سے پوچھنے پر مجھے یہی تاثر ملا تھا۔ دیر ہو گئی تو مجھے بے چینی ہوئی کہ یہ کہیں آپ کے پاس نہ پہنچ گئی ہو اور ایسے وقت اپنی نکتہ طرازیاں نہ بگھار رہی ہو، حالانکہ اُدھر منیر علی صاحب کچھ اپنے، کچھ پرائے قصّے سنا رہے تھے۔ گیتا اور رانی کی دل دہی کی خاطر سبھی متوجہ تھے مگر مجھ سے وہاں نہ بیٹھا گیا۔ میں نے اُن سے معذرت کی اور اِسے اندر ڈھونڈتا ہوا سیدھا یہاں آنکلا اور میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔"

"تم نے جولی سے پوچھ لیا ہوتا، اُسے معلوم تھا کہ میں یہاں ہوں بلکہ اُسی نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔"

"جولین نے؟....." میں نے تذبذب سے کہا۔

"ہاں، وہ وہاں مصروف تھی۔" رما سادگی سے بولی۔ "اُسے احساس تھا کہ آپ یہاں تنہا بیٹھے ہیں۔"

"تو کیا وہ محض جولین کی فرستادہ تھی اور ایک مہربان مہذب لڑکی کی طرح کوئی فرض نبھا رہی تھی؟ جولین نے اس سے کچھ اور بھی کہا ہوگا۔ کیا کچھ کہا ہوگا۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ ایسا تھا تو جولین خود بھی آسکتی تھی۔ وہ کیوں نہیں آئی؟ رما نے شاید چہرے سے میرے سینے کی گھٹن محسوس کر لی۔ اُس نے وضاحت ضروری سمجھی اور بے تابانہ بولی: "میں آپ ہی کو دیکھنے کے لیے وہاں سے اُٹھی تھی۔ اتفاق سے جولین اندر مل گئی اور اُس نے، جیسا کہ کہتے ہیں، میرے منہ کی بات چھین لی۔"

ابھی کیلاش نے کہا تھا، جولین سے استفسار پر اُسے تاثر ملا تھا کہ رما اندر کسی کمرے میں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جولین نے کیلاش کو دخل اندازی کے خیال سے جان بوجھ کر نہیں بتایا ہوگا۔ وہ خود بھی اسی لیے نہیں آئی اور شاید اُسی نے کسی کو اِس طرف نہیں آنے دیا۔ کسی نے کچھ پوچھا ہوگا تو اُس نے کوئی بھی عذر کر دیا ہوگا۔

"کیا سوچنے لگے آپ؟" کیلاش کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ میں اُسے کیا بتاتا، اپنی کیفیت خود میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہو رہی تھی۔ یہ ندامت کا کوئی احساس تھا یا اپنی بے چارگی کا یا گراں خوابی کا۔

"آپ کہیں کھو سے گئے؟" کیلاش نے اُداسی سے کہا۔

"میں سمجھتی ہوں۔" رما چپکے سے بولی۔

"کیا، کیا بات ہے؟" کیلاش مضطرب ہونے لگا۔

"تمھارے سمجھنے کی نہیں ہے۔" رما شکستہ لہجے میں بولی۔

"غالباً مجھ سے کوئی بھول ہوئی۔" کیلاش کی آنکھیں بھنچنے لگیں۔ "میں مخل ہی ہوا مگر یہ سانحہ تو گزر چکا۔"

رما نے کوئی تکلف نہیں کیا، کہنے لگی: "آہ کاش تم ابھی نہ آتے۔ رات گزر جاتی اور ہم ایک....."

اُس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے میں نے شرمندگی کا اظہار کیا۔ رما نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ رما، جولین کی سفارش پر آئی تھی یا ازخود، یہ شرافت و شائستگی تھی یا ازخود رفتگی۔ دونوں صورتوں میں اصل مقصود میری دل بستگی تھی ورنہ نیت میں کیا ابہام ہے۔ مجھے آخر کیا مطلوب تھا جس کی محرومی میرے سینے میں سوزش کا سبب بنی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اپنے گھر سے دُور، اپنے مشاغل سے کنارہ کیے میری خاطر یہاں بیٹھے ہیں اور مسلسل میری جستجو میں لگے ہیں۔

مجھے خود کو یک سو کرنے میں دیر نہیں لگی کیونکہ یہ فیصلہ نہایت آسان تھا کہ مجھے اِن کی نوازش پر بہر صورت شکر گزار ہونا چاہیے اور اپنی کبیدگی، اپنی خلش خود تک محدود رکھنی چاہیے۔ میری آزردہ خاطری سے اُن کی آنکھیں کمھلانے لگی تھیں۔ اپنے اس تیور کا کوئی استحقاق مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے کیلاش سے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں، میرا کچھ یہی ہے۔ مجھے یوں ہی بیٹھے بٹھائے کچھ ہو جاتا ہے۔ میں نے اُس سے کہا، دخل اندازی کیسی؟ ہم تو یہی دُنیا جہاں کی باتیں کر رہے تھے۔ رما اپنے کلب کے مشاہدات سنا رہی تھیں اور جیسا کہ میں نے کہا کہ وہ سب کچھ نہایت دل نشیں تھا۔

"اور میرے آنے سے ختم ہو گیا؟"

"ختم تو کسی وقت ہونا ہی تھا، اب نہیں تو کچھ دیر بعد۔"

"ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔" رما نے اُداسی سے کہا۔ "کوئی نہ کوئی حارج ہو جاتا ہے، کبھی وقت کبھی موسم۔ زندگی کبھی یکساں نہیں رہتی۔ شاید زندگی اور موت میں یہی امتیاز ہے۔ ایک مسلسل تغیر ہے، ایک مسلسل سکوت۔ موت شاید سب سے بڑا سکون ہے۔"

"پتھر کا سکون۔" کیلاش نے کہا اور مچلتے لہجے میں بولا: "ایک بات کہوں آپ سے؟"

"کیا بات ہے؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"آپ چند دن ہمارے ساتھ، ہمارے گھر چل کے کیوں نہ رہیں، کیوں رما؟"

"اِس سے زیادہ اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔" رما کی آواز مسرت سے لرز رہی تھی۔

"یہ، یہ کیسے ممکن ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں، یہاں بہت لوگ ہیں گیتا اور رانی جی کو دیکھنے کے لیے، اور پھر ہم کسی دوسرے شہر تھوڑی جا رہے ہیں۔ کسی وقت بھی جب بھی آپ چاہیں، یہاں آسکتے ہیں۔ دن میں دو بار، تین بار۔ اس تبدیلی سے دیکھیے کتنا اثر پڑے گا۔ رما کی داستانیں کبھی ختم نہیں ہوتیں، ورق پلٹتے جائیے۔ یہ ایک بہترین نگراں اور منتظم بھی ہے۔ ویسے بھی تو ایک ڈاکٹر ہے۔ اِسے چارہ گری ہی کی تعلیم دی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے ہمارے ہاں چل کے آپ خوش ہوں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر کیسے؟..... یہ کیسے ممکن ہے۔" میں نے اُسے کچھ اور نہیں کہنے دیا۔ "میں کیسے کہیں جا سکتا ہوں۔ یہاں رہنا میرے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا دوسروں کے لیے۔ گیتا اور رانی بھابی بہت برداشت کا ثبوت دے رہی ہیں لیکن اپنے دل کا حال وہ خود ہی جانتی ہوں گی۔ اِس وقت تو سبھی کو اُن کے سامنے رہنا چاہیے اور ابھی تو مجھے کئی کام کرنے ہیں۔ ابھی تو دادا کے خون....." میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"دادا کا خون!" کیلاش بے قراری سے بولا۔ "آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی دادا کے بہت سے معاملات بھی نمٹانے ہیں۔" اُس نے تکرار نہیں کی، کسمسا کے رہ گیا۔

"نہیں کیلی!" رما مایوسی سے کہنے لگی۔ "یہ ابھی مناسب نہیں ہے۔"

وہ دونوں چپ ہو گئے۔ دیر تک خاموشی رہی۔ رات ہو گئی تھی۔ میں نے یاد دلایا کہ اُنھیں گھر بھی جانا ہوگا۔ میری وجہ سے وہ نہ ٹھہریں، گھر میں بھی اُن کا انتظار ہوگا۔

"جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔" کیلاش بے ساختہ بولا۔ "ممی سے ہم کہہ کے آئے تھے۔ موٹر باہر کھڑی ہے، کسی وقت بھی چلے جائیں گے، ہاں اگر آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"نہیں، نیند کہاں۔" میں نے زہر خند سے کہا۔

"پھر چائے کیوں نہ پی جائے۔" کیلاش بچوں کی طرح ہمک کے بولا۔

"میں اندر دیکھتی ہوں کہ کیا صورت ہے۔" رما فوراً اُٹھ گئی۔ کیلاش میرے پاس بیٹھا زمین تکتا رہا۔ پھر زیر لبی سے بولا: "دادا کے قاتل کا کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں، چل جائے گا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"مناسب ہو تو مجھے کچھ بتائیے۔" اُس کا لہجہ التجائی تھا۔

"چھپانے کے لیے اب رہا بھی کیا ہے۔"

"میں اور بھی جاننا چاہتا ہوں، آپ کے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"میں بھی خود سے یہی پوچھتا ہوں مگر جو بھی ہے یا جو بھی ہیں، اُن کے پاس بھی وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

"یقیناً۔" وہ بے چینی سے بولا۔ "وہ زیادہ دیر تک نہیں چھپ سکیں گے۔ مآل کار اُنھیں عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا ہے۔ یہ میں بھی سمجھتا ہوں۔ گیتا اور رانی جی کے چہرے دیکھ کے جی کرتا ہے، جیل کچہری، سزا انصاف تو دُور کی بات ہے، اُنھیں دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔"

"یہی ہوگا۔" میری آواز اکڑ گئی تھی۔

"میں نے سوچا تھا کہ اِس سلسلے میں آپ کو ذرا بھی پریشان نہیں کروں گا لیکن بس، خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ طبیعت بحال ہو تو مجھے کچھ اور بتایئے؟"

"کیا بتاؤں؟"

"کچھ بھی۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے، چھوڑیے، کسی اور وقت سہی..."

"پیردادا بمبئی کا سب سے بڑا دادا کہا جاتا تھا۔"

"میں نے سُن لیا ہے مگر جس دادا کو میں نے دیکھا ہے، وہ سراپا محبت تھا۔"

"مگر وہ پاڑے کا مشہور دادا ہے۔ ساری بمبئی اور آس پاس کے شہروں میں سبھی اُس کے نام اور چاقو سے واقف تھے۔"

"یہ بھی مجھے معلوم ہوا ہے۔ ارتھی کے ساتھ اُمڈتے لوگ میں نے خود دیکھے تھے، وہ بُری طرح رو رہے تھے۔ اُن کے درمیان ہونے والی بہت سی چہ میگوئیاں میرے کانوں میں بھی پڑی تھیں۔ سب مشتعل تھے۔ میں نے ایسے واقعات پر مشتمل جھوٹی سچی بے شمار کہانیاں پڑھی ہیں۔ یورپ میں یہ واقعات عام ہیں اور جتنے عام ہیں، اُتنی ہی پولیس کی گرفت مضبوط ہے۔ اگر سامنے کوئی سُراغ نہیں ملتا تو وہ پہلے محرک پر توجہ دیتے ہیں۔"

"پاڑے کے دادا کا سب سے بڑا محرک خود پاڑا ہے۔"

"تو کیا وہ پاڑے سے متعلق آدمی ہو سکتے ہیں؟"

"دوسرے کیوں نہیں ہو سکتے؟"

"ہاں، دوسرے بھی، پاڑے سے کبھی کوئی گھاٹا اُٹھانے والے، پاڑے کے آداب و قواعد سے زک پانے والے لوگ۔" وہ تیزی سے بولا۔ "میں نہیں جانتا، سنا ہے، پاڑے کے اپنے لگے بندھے اصول و ضوابط ہوتے ہیں۔"

"کہاں نہیں ہوتے۔"

"میں نے پاڑا کبھی نہیں دیکھا۔ سب سُنا سنایا ہے یا کتابوں میں اس بابت کچھ پڑھا ہے۔ میرے ذہن میں، میں آپ سے کیا کہوں، پاڑے اور پاڑے سے متعلق لوگوں کا تصور میرے لیے بہت عجیب اور مختلف تھا لیکن یہاں تو..."

اُسے اپنا مدعا بیان کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی، میں نے اُس کی بات کاٹ کے کہا۔ "اچھوت سمجھتے تھے۔"

"ہاں کچھ یہی، میں آپ کو سچ بتاؤں، کوئی اچھا تصور ذہن میں نہیں تھا۔ دھاندلی، زورِ ظلم، چاقو یہی کچھ لیکن یہاں یہ سب دیکھ کے کہنا چاہیے کہ سب جھوٹ سا لگتا ہے، اپنی آنکھوں کا دھوکا، یہ بہت ناقابلِ یقین ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"شاید یوں ہے کہ ہم ایک ہی حوالے سے آدمی کو شناخت کرنے کے عادی ہیں مگر زندگی تو گوناگوں ہے۔ ہم ایک ساتھ کئی زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ تقریباً ہم سبھی، بازار میں کچھ اور، گھر میں کچھ اور سوچ میں کچھ اور، اندر کچھ، باہر کچھ۔ پاڑے کے لوگ بھی آدمی ہوتے ہیں، بگڑے ہوئے، سنبھلے ہوئے، خانوں میں بٹے ہوئے مگر تم جو یہاں دیکھ رہے ہو، تمام ایسا ہی نہیں ہے۔ وہ بھی ہے جس کا تصور تمھارے ذہن میں ہے۔ ایک ہی آدمی میں بڑے فاصلے ہو سکتے ہیں۔"

"مگر اچھائی اور بُرائی کا ایک جوہر تمام فاصلوں میں رہنا چاہیے۔ کیا ہر فاصلے پر جوہر بدل جاتا ہے۔ بہرحال میں اب پاڑے کے لوگوں سے سہما ہوا آدمی نہیں ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے، آپ مجھے پاڑے لے چلیں۔"

"کیا کرو گے وہاں جا کے۔"

"میں دیکھنا چاہتا ہوں، قریب سے دیکھنا، پھر کبھی کسی مناسب وقت۔"

"وہاں یہی لوگ ہوتے ہیں۔ پاڑے سے دُور ہی رہنا ٹھیک ہے۔"

"میں پاڑے میں شامل کب ہو رہا ہوں۔"

"تم شامل بھی نہیں ہو سکو گے، ہر شخص پاڑے کا آدمی نہیں بن سکتا۔"

"آپ سے بہت سی باتیں جاننے کو دل مچلتا ہے، میں سمجھتا ہوں، اِس کا یہ موقع نہیں ہے اور سوچتا ہوں، کہیں یہ دخل در معقولات تو نہیں، میں تجاوز تو نہیں کر رہا ہوں؟"

"تم تو اسی گھر کے فرد معلوم ہوتے ہو۔"

"میرے لیے یہ عزت ہے۔ میں بہت کچھ نہیں جانتا لیکن یہ سب لوگ، کیسے سادہ اور کیسے دل پذیر ہیں۔ گیتا سے تو میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ لگتا ہے، ہم نے کوئی نئی دنیا دریافت کر لی ہے۔" میں نے کچھ نہیں کہا۔ اُس نے بھی چُپ سادھ لی مگر چند ہی ثانیوں بعد وہ بے کلی سے بولا۔ "پولیس نے اب تک کیا کیا ہے، وہ بھی بہت سرگرم ہو گی؟"

"ہونی چاہیے مگر پولیس اپنے طور پر کام کرتی ہے۔"

"آپ لوگوں سے بھی رابطہ قائم کیا ہو گا اُس نے؟"

"کیا تھا۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"سُنا ہے، پولیس پہلے قریبی لوگ ٹٹولتی ہے اور اُس کا انداز سنگ دلانہ ہوتا ہے لیکن میرا کچھ کہنا نہ کہنا کیا، آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

"ہاں مجھے اِس کا اچھا تجربہ ہے۔"

میرا مطلب ہے۔" وہ مجوبی سے بولا۔ "کسی نتیجے پر نہ پہنچنے کی صورت ...یس پر وحشت بھی طاری ہو سکتی ہے اور پولیس یہ خیال ...رنی کہ بس پر کیا گزر جائے گی۔ اُنھی پر شک کرتی ہے جن کا نقصان ...یہ کیسی ستم ظریفی ہے۔"

"کیونکہ کبھی مطلوبہ اشخاص اُنھی میں سے نکل آتے ہیں۔"

"جی، جی ہاں۔" وہ بوکھلا سا گیا اور سمجھا کہ میں کہیں قریب کے ...آدمی کی طرف تو اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔ ذہانت ہمیشہ زُود حِس ...ہے۔ اُس کی نگاہیں بے اختیار برآمدے کی طرف اُٹھیں۔ میں نے ...ت کوئی نہیں کی تاہم ایک لمحاتی تردّد کے بعد اُس نے خود یہ نکتہ ...ر لیا کہ یہ کوئی بلیغ اشارہ نہیں، بس زبان پر آئی ہوئی ایک بات ...۔ پولیس کے ذکر پر اُس کی آواز سن سنانے لگی تھی۔ پولیس سے ...ط نہ پڑنے والوں کی آواز میں یہی اضطراب ہوا کرتا ہے۔ وہ اشاروں ...یوں میں مجھے احتیاط کی تلقین کرنے لگا۔ وہ صاف طور پر جو کہہ نہیں ...ہا تھا، میں اُسے سُن رہا تھا۔ میں تو اُسے کب سے سُن رہا تھا۔ اُس کی مراد ...ی کہ پھر ہم نے کیا سوچا ہے؟ میں کیا جواب دیتا۔ ہمارے سوچنے کے لیے ...ہے۔ تجھل سہ پہر سے اندر بیٹھا ہے۔ جمرو، شامو، مارتی اور ٹنگو بھی ہاتھ ...دُں توڑے اندر پڑے ہیں۔ میں یہاں سبزے پر بیٹھا تازہ ہوا کھا رہا ...دن اب رات ہو گئی ہے۔ پولیس دوبارہ یہاں نہیں آئی ہے لیکن ...ح ہوتے ہی یہ خدائی فوج دار پھر آ جائیں گے۔ تجھل نے جولین سے ...ہا تھا کہ پولیس کے دوبارہ آنے پر وہی جواب دیا جائے جو پہلے دیا جا چکا ...ے، پولیس اِس طرح واپس چلی جائے گی لیکن پھر آ جائے گی۔ یہ بات ...تجھل کو اچھی طرح معلوم ہو گی کہ گیتا اور رانی کو تادیر پولیس کے ...سوال جواب سے دُور رکھنا مشکل ہے اور اپنے آپ سے بھی۔

کیلاش یہی کہہ رہا تھا کہ پولیس کی بھٹکتی، منڈلاتی نظریں مآلِ کار ...ہم پر آ کے ٹک جائیں گی اور کیا ہو گا؟ وہ ہمیں لے جائیں گے۔ بمبئی آنے ...سے پہلے دادا ہمارے ساتھ کہاں گیا تھا؟ ہمارا تعلق کن اڈوں اور ...پاڑوں سے ہے؟ ہم بمبئی کیوں آئے تھے؟ جولین کون ہے جس کے گھر ...دادا اُس رات گیا تھا؟ وہاں کون کون تھا؟ وہی سوال جن کے ...جواب اُس رات تھانے میں اَدھورے رہ گئے تھے اور باقی قرض سمجھ ...کر اُنھوں نے ہمیں جانے دیا تھا مگر قرض تو باقی ہے۔ اُنھوں نے ...برملا کہہ دیا تھا کہ معافی کی ایک ہی صورت ہے کہ دادا کے قاتل اُن ...کے ہاتھ لگ جائیں یا اُن کے حوالے کر دیے جائیں یا اِس سلسلے میں ...کم از کم اُنھیں ہماری اعانت کا اعتماد حاصل رہے مگر تجھل تو اندر بیٹھا ...ہوا ہے۔ وہ اور کتنی دیر اُس کا انتظار کریں گے۔ ایک دن، دو دن، ایک ہفتے۔ ممکن ہے، وہ ماہم کے پاڑے پر تجھل کی نگرانی کی خبر سُن کے زفت ی کچھ اور رعایت دے دیں لیکن جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے، اُن کا پارا چڑھتا رہے گا۔ میں کیلاش کو یہی جواب دے سکتا تھا اور خود کو بھی کہ پھر ہم جیل میں ڈال دیے جائیں گے اور سلاخوں کے پیچھے ثبوت و شواہد کے لیے سر مارتے رہیں گے مگر بس اتنا ہی ہے؟ صرف یہی جواب؟ ہم اتنی آسانی سے خود کو پولیس کے حوالے کر دیں اور وہ بھی دادا کے خون کے الزام میں؟ یہ جواب مجھی کو تسلی نہیں دیتا تھا۔ کیلاش سے میں کیا کہتا۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر برآمدے میں آہٹ سُن کے چُپ ہو گیا۔ رَما خود چائے کی ٹرے لے کے آئی تھی، سر پر ساری کا پلو ڈالے ہوئے لگتا تھا جیسے وہ اِسی گھر سے متعلق ہو۔ جولین بھی اُس کے ساتھ تھی۔ "اب ایک ہم زبان بھی میرے ساتھ ہے۔" آتے ہی وہ کھنکتی آواز میں بولی۔ "جولی کو میں پکڑ لائی ہوں۔ اِس کے بغیر یہاں کوئی کمی سی لگتی ہے۔"

جولین کا بدن بَل کھا گیا۔ وہ سمٹ کے میرے پہلو کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر شہ پارہ بھی وہیں چلی آئی اور فرخ بھی۔ رَما نے سب کے لیے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی۔ اُس نے ابھی اور بیٹھنے کے ارادے سے چائے کا مشورہ دیا تھا اور جولین کو بھی اسی لیے ساتھ لائی تھی مگر جولین، شہ پارہ اور فرخ اندر کا حبس سمیٹے آئی تھیں۔ یہ کھلی فضا، سبزے پر کرسیوں کا ماحول اُن کے لیے نیا تھا۔ اِس سے مانوس ہونے میں اُنھیں کچھ نہ کچھ دیر تو لگتی، مجھے بھی لگی تھی۔ وہ چُپ چاپ جیسے ایک دوسرے کے بولنے کی منتظر رہیں۔ میرا دماغ بھی حاضر نہیں تھا۔ کیلاش بھی گُم سم بیٹھا تھا۔ رَما نے سخن طرازی کی اپنی سی کوشش کی، کیلاش کو مخاطب کر کے تیکھے لہجے میں بولی۔ "لگتا ہے، اب کے میں مخل ہوئی؟" کیلاش نے مضطربانہ میری طرف دیکھا۔ "تم نے محاسبی شروع کر دی ہو گی جو مَردوں کا شیوہ ہے۔ مرد جب بھی اکیلے ہوتے ہیں، اُن پر حقیقتیں طاری ہونے لگتی ہیں۔"

کیلاش اُس کی صورت تکنے لگا۔ "اور عورت ساتھ ہو تو حقیقت گریزاں۔" وہ ٹنک کے بولا۔

"زندگی حقائق کے سوا بھی ہے۔"

"اور وہ فریب ہے۔"

"فریب بھی حقیقت ہے کیوں کہ زندگی کے لیے لازم ہے جیسے خواب۔ ہم خواب نہ دیکھیں تو یہ صبر آزما زندگی کیسے عبور کریں۔"

کیلاش نے اُس سے جرح نہیں کی، وہ پکی ہوئی ساری

چائے ایک گھونٹ میں انڈیل کے کرسی سے اُٹھ گیا۔ رمانے بھی کوئی تعرض نہیں کیا اور کلائی کی گھڑی دیکھ کے چونک پڑی۔ جولین، فرخ اور شہ پارہ نے اُس سے رات وہیں ٹھہر جانے کے لیے اصرار بھی کیا مگر رمانے اپنی ماں کا عذر کیا کہ وہ گھر کہہ کے آتی تو ٹھیک تھا۔

دروازے تک ہم اُنھیں رخصت کرنے آئے۔ گلی دور تک سنسان پڑی تھی اور کتے بھونک رہے تھے۔ موٹر تک جاتے جاتے رما معاً پلٹ پڑی اور میرے سامنے آ کے کھڑی ہو گئی اور متجسس نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی "مجھے شبہ ہے کہ میرا ذہن بھی ناوقت تھا۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔" میں نے سیدھے ہو کے کہا۔

"بس یوں ہی جو دل میں آتا گیا....."

"مجھے سب یاد رہے گا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"ہو سکے تو کل آیئے۔"

"کل شاید ممکن نہ ہو مگر میں جلد ہی..... زندگی رہی تو جلد ہی ضرور آؤں گا۔"

"یہ آپ نے کیا کہا۔" وہ بے چینی سے بولی۔ "زندگی کی آرزو کرو تو زندگی راضی رہتی ہے، بہت خوشامد پسند چیز ہے یہ۔"

"مگر وہ دوسرے جو کسی کی نابودی کے لیے اس سے زیادہ شدید آرزو رکھتے ہیں، زندگی اُنھیں بھی مایوس نہیں کرتی۔"

وہ ٹھٹکی ہوئی سی کھڑی پلکیں جھپکاتی رہی۔ کیلاش نے موٹر میں بیٹھتے ہی ہارن بجانا شروع کر دیا۔ اُسے جانا پڑا۔ موٹر میں بیٹھنے سے پہلے وہ سب کو ہاتھ ہلانا نہیں بھولی۔

بیرونی کمرے سے گزرتے ہوئے میرے جی میں آئی کہ اندر جا کے تنبھل کو دیکھوں۔ دروازہ بند تھا لیکن کھڑکیاں روشن تھیں، میں آگے بڑھ گیا۔ جولین نے مکان کے عقبی حصے کی جانب ایک اور کمرے میں سونے کا انتظام کیا تھا۔ مارٹی، جمرو، شامو اور ٹنگو فرش پر بچھی ہوئی چاندنی پر اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ چاروں ہڑبڑاتے ہوئے اُٹھ گئے میرے پوچھنے پر اُنھوں نے بتایا کہ ابھی کوئی آدھ پون گھنٹے پہلے ہی وہ یہاں آئے ہیں۔ سب تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ میرا جسم بھی ٹوٹ رہا تھا۔ رما شاید ٹھیک کہتی تھی، کوئی چھاؤں ہی تھی جس میں مجھے نیند سی آ گئی تھی اور اتنی دیر تک جیسے سب دماغ سے اوجھل ہو گیا تھا۔ چھاؤں گزر جانے کے بعد اُس کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ آدمی اور درخت دونوں سایہ رکھتے ہیں لیکن بڑا فرق ہے۔ درخت کا سایہ سب کے لیے یکساں، آدمی کا ہر ایک کے لیے جُدا جُدا، کسی کے لیے ہے کسی کے لیے نہیں۔ ایک کے لیے ہے، دوسرے کے لیے نہیں۔ آدمی کا سایہ چھوئی موئی کی طرح ہوتا ہے۔ جیسے ہی کیلاش آیا، رما کا سایہ سکڑتا سمٹتا گیا۔

اُن چاروں کے آرام کی خاطر میں نے خاموشی مناسب سمجھی اور ایک کونے میں جا کے لیٹ گیا مگر وہ لوٹتے لوٹتے پاس چلے آئے اور جمرو کو جانے کیا ہوا، آ کے مجھ سے چمٹ گیا پناہ کی تلاش میں ہو، جیسے بہت گرد و غبار اکٹھا ہو گیا ہو۔ میں نے بھی اُس کا سر اپنے بازو میں جکڑ لیا۔ "کیا بات ہے جمرو بھائی؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

وہ سانسیں کھینچتا رہا۔ میں نے پھر پوچھا تو ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولا "کیا بولے لاڈلے!"

"دم گھٹ رہا ہے نا؟" میں نے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ٹھیک ہے سب....." وہ بُدبُداتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا ہے، تم تو بہت، بہت....."

"سینگ نہیں ہیں اپنے کے بس....." وہ میری بات کاٹ کے بولا۔

"نہیں نہیں، میں تو کہہ رہا تھا کہ تم سے دوسرے سیکھتے ہیں، تم نے مجھے بہت حوصلہ دیا ہے۔"

"کیا لاڈلے!" اُس کی آواز ڈوبتی گئی۔ "اپنے سے چھوٹی کو نہ دیکھا جاتا۔"

"گیتا کو؟" میں نے تذبذب سے کہا۔

"ہاں جانی! اُسے دیکھ کے خون بدن میں بہت کھولتا ہے۔"

"اب تو کچھ ٹھیک ہے وہ۔"

"ٹھیک ہے پر ایسی ٹھیک بھی نہیں۔ استاد بیچ میں نہ ہو تو ماں قسم اپنے سے ایک پل بھی نہ ٹھہرا جاتا۔"

"تنبھل بھائی سے کوئی بات ہوئی؟"

"کیسی بات؟"

"یہی، کہیں آنے جانے کی؟"

"نہیں لاڈلے! تجھ کو استاد کا پتہ ہے۔ سب ایک دم پیٹ میں باندھ کے رکھتا ہے، پوچھیں بھی کیا اُس سے۔ سامنے کا مال اُلٹا سیدھا دکھائی دے رہا ہے تب استاد کرے بھی کیا۔ گیتا کو چھوڑ کے کدھر جائے۔ کدھر جانے کو سوچے۔"

"پر اُستاد ایک اِسی مارے نہیں ٹھہرا جمرو بھائی!" شامو بیچ میں بولا۔ "باہر نہیں دیکھا، براتیوں کو باجے پٹاخے لیے؟" براتیوں سے شامو کی مراد پولیس تھی۔ پاڑے سے واپس آتے ہوئے ہم نے اُنھیں تمام راستوں پر تعینات دیکھا تھا۔ جہاں وردی والے نہیں تھے، وہاں سادہ لباس والے گشت کر رہے تھے۔ کیلاش اور رما کو دروازے پر رخصت کرتے وقت میں نے غور نہیں کیا لیکن شامو بتا رہا تھا کہ اُس نے کھانا کھانے سے پہلے مکان کے اطراف بھی کئی سادہ پوش گھومتے دیکھے ہیں۔

"استاد ابھی کچھ جان کے ہی اینڈ رہے ہے۔" مارٹی دبے لہجے میں بولا۔

"استاد کو اگر تھوڑا بہت پتہ ہو تو بھی اُسے اِدھر سے نہیں نکلنا چاہیے۔ اِدھر گیتا کے پاس اُس کا ٹکنا ضروری ہے۔"

"پر اپن تو نکل سکتا ہے جمرو بھائی؟" مارٹی نے کہا۔ "گھر بیٹھنے سے ابھی کچھ نئیں ملنے کا۔"

شامو نے بھی اُس کی تائید کی، کہنے لگا کہ میرے آنے سے پہلے وہ یہی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی سُن گُن مل سکتی ہے تو پاڑے سے یا کہیں بھی باہر جانے پر۔ گھر میں بند پڑے رہنے سے ہوا بھی آ کے تو ہمیں کوئی خبر دینے سے رہیں۔ شامو نے مشورہ دیا کہ اگر سرِدست تنبھل کا باہر جانا مناسب نہیں تو ہم تو نکل سکتے ہیں۔

"اپن لوگ چاہے تو ابھی بھی جا سکتا ہے راجا بھائی!" مارٹی تمتاتی آواز میں بولا۔

"ابھی؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"کیا ہے راجا بھائی! موٹر اِدری کھڑی ہے، ڈرائیور کو اپن جگا لے گا۔"

"گھڑی پہ بھی ایک نظر مار لے ماسٹر!" جمرو پھنکارتی آواز میں بولا۔

"دیکھ لیا ہے جمرو بھائی، اور ہم دیکھ کے ہی بول رہا ہے ڈیڑھ بج رہا ہے۔ اپن ابھی چلے تو سویرا ہونے سے پہلے پلٹ آئے گا۔ تھوڑا چل کے دیکھتا ہے ابھی۔"

"تھوڑا چل کے دیکھتا ہے....." جمرو نے اُسے دھتکار دیا۔ "ماسٹر! تیری کھوپڑی اُلٹ گئی ہے۔"

"کھوپڑی تمھاری بھی اپنے کو جگہ پر دکھائی نہیں پڑتی۔" شامو نے بگڑے لہجے میں کہا۔ "ماسٹر کیا اُلٹا بول رہا ہے۔ موٹر میں جائیں گے، اُسی میں لوٹ کے آئیں گے۔"

"تو پھر چلا جا، جا جا۔ روکتا کون ہے۔"

"ہاں چلے جائیں گے، تم سے پوچھ کے نہیں۔" شامو وحشت سے بولا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ "کیوں لاڈلے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ جمرو پھنکارتی آواز میں بولا "پر لوٹ کے اِدھر آنا ہے تو اپنے باپ اُستاد کو بول کے ضرور جانا۔"

"تم تو گرم ہونے لگے۔ ماسٹر تو ایک بات بول رہا تھا۔ بات پر کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو۔" شامو ناراض ہونے لگا۔ "ہم لوگ ابھی بات کر رہے ہیں، دفع نہیں ہو گئے اِدھر سے۔"

میں نے اُٹھ کے اُسے دبوچ لیا اور سمجھایا کہ جمرو غلط نہیں کہہ رہا۔ وہ خود بھی یہاں آرام سے نہیں ہے، ہماری طرح باہر نکلنے کے لیے بے کل ہے لیکن نہ یہ کوئی وقت ہے نہ تنبھل کو بتلائے بغیر باہر جانا مناسب ہے۔ میں نے شامو سے کہا کہ ابھی وہ خود شہر میں پھیلی ہوئی پولیس کا ذکر کر رہا تھا۔ اِس صورت میں باہر نکلنا کسی طور قرینِ عقل نہیں۔

جمرو بڑبڑانے لگا کہ ابھی صرف دو دن ہوئے ہیں، تنبھل کو پورے دو دن ہمارے ساتھ، ہمارے سامنے رہا ہے۔ جتنا ہمیں معلوم ہے اُتنا ہی اُسے، کوئی بات اوپر تلے ہو گئی تو ہم تنبھل کے لیے دوہری مصیبت کھڑی کر دیں گے۔

"ٹائم کا کیا ہے جمرو بھائی!" مارٹی پژمردگی سے بولا۔ "دو دن ہو گیا، پر جان پڑتا ہے، دو برس ہو گیا، اُس کے بھی اوپر۔ ماں قسم اپن کیا بولے، کیسا اکھا جسم میں....." مارٹی کی آواز بھرّانے لگی۔

"اپن نے اپنے کو ایسا کتا کبھی نہیں دیکھا۔"

میں نے مارٹی کو اشارہ کیا کہ اب وہ اور کچھ نہ کہے۔ شامو کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے اُس کا سر سینے میں چھپا لیا، وہ سُڑکنے لگا اور ہچکیوں سے رونے لگا۔ جمرو اور شامو کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے شامو کو مجھ سے چھین لیا اور بچوں کی طرح اُسے چمکارنے لگے۔

وہ دیر تک جاگتے رہے۔ کئی بار میرے دل میں آیا کہ اُنھیں بتاؤں، میرا ذہن کہاں کہاں بھٹکتا رہا ہے لیکن وہ پہلے ہی کیا کم بے آرام تھے، جو میں اُنھیں اور پریشان کرتا۔

رات کے آخری پہر کسی وقت اُن کی آنکھ لگ گئی۔

دیواری گھڑی میں سات بج چکے تھے۔ شبنی چاچا کی آواز پر ہماری آنکھ کھلی۔ وہ ہمیں اُٹھانے کے علاوہ کپڑے دینے بھی آیا تھا۔ اور جولین کی یہ ہدایت منتقل کرنے کہ نہا دھو کے اور لباس بدل کے ہم ناشتے کے لیے باہر آ جائیں۔ سب نے جلدی کی مگر کچھ دیر ہو گئی۔ باہر آ کے معلوم ہوا کہ بیرونی کمرے میں سب ناشتہ کر چکے ہیں۔ جولین اور فرخ نے دوسرے کمرے میں ہمارے لیے پھر الگ انتظام کیا۔ جولین نے بتایا کہ وہ ہمیں اور آرام کرنے دیتی مگر تنبھل کے حکم پر اُسے شبنی چاچا کو کمرے میں بھیجنا پڑا۔

"استاد بولے تھے؟" شامو نے بے تابی سے تصدیق چاہی۔

"ہاں شامو بھائی! باباہی کا حکم تھا۔" جولین نے مسکرا کے کہا۔ اُس کی مسکراہٹ پر شامو جھینپ سا گیا۔

کسی سے پھر ٹھیک طرح ناشتہ نہیں کیا گیا۔ جولین نے ٹوکا بھی کہ ایسی جلدی نہیں ہے لیکن سب نے جیسے تیسے چائے ختم کی بسکٹ زہر مار کیے اور برآمدے میں آ کے بیٹھ گئے۔ مجھے خیال آیا کہ کچھ دیر کے لیے گیتا اور رانی کو کیوں نہ دیکھ آؤں مگر میں ارادہ ہی کرتا رہ گیا۔

سامنے سے بھّل کو آتا دیکھ کے ہم سب یکایک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُسے کپڑے پہنے تیار دیکھ کے میری طرح اُن چاروں نے بھی اطمینان کی سانس لی ہو گی یا اُن کے دل بھی میری طرح دھڑکے ہوں گے۔ دل کا دھڑکنا بھی کبھی اطمینان کا سبب ہوتا ہے۔ منیر علی، اباجان اور مولوی اکرم بھی بھّل کے ساتھ تھے۔ بھّل برآمدے میں نہیں رکا، ہم منتظر تھے۔ اُس کے اشارے پر ہم نے تیز قدموں سے سیڑھیاں طے کیں۔ بھّل اتنی ہی دیر برآمدے سے پیوستہ سبزے پر ٹھہرا جتنی دیر میں اباجان نے اُس سے جلد واپس آنے کو کہا۔ منیر علی نے کچھ پڑھ کے ہم سب پر دم کیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں گیتا اور رانی کی صورت دیکھنے اور انہیں اپنی صورت دکھانے اندر جا سکتا۔ دروازے پر موٹر کھڑی تھی۔ بھّل نے ٹنگو کو روک دیا۔ بھّل ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا، میں، مارتی، جمرو اور شامو پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ موٹر منٹوں میں بڑی سڑک پر آ گئی۔ اُس کا رُخ پاڑے کی جانب تھا۔

دن خوب روشن ہو چکا تھا اور سڑکوں پر گاڑیوں کا شور گونج رہا تھا۔ چوراہوں پر جابجا پولیس ڈیوٹی پر تھی۔ جمرو، شامو اور مارتی کا حال تو نہیں معلوم لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت دن بعد باہر نکلنا ہوا ہے۔ سڑکوں پر بھیڑ کی وجہ سے موٹر کی رفتار بھی تیز نہیں تھی۔ راستے بھر نہ بھّل نے ہم سے کوئی بات کی، نہ ہم نے آپس میں کچھ کہا سُنا۔ ڈرائیور بھی خاموشی سے موٹر چلاتا رہا جیسے وہ موٹر ہی کا کوئی حصہ ہو۔ آدھے گھنٹے میں ہم ماہم کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ ابھی پاڑے سے دُور تھے اور چوراہے کے کیفے شیراز نامی چائے خانے سے گزر رہے تھے کہ ناگہاں مجید ہوٹل والے کی صورت میری آنکھوں میں گھوم گئی، مجھ سے سیدھا نہ بیٹھا گیا۔ اِس کی طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ وہی مجید جس نے مولوی اکرم سے اپنے لڑکے کے لیے فرخ کا رشتہ مانگا تھا اور انکار پر مغلوب الغضب ہو گیا تھا۔ اُس نے علاقے کی مسجد میں مولوی اکرم کو رسوا کرنے کی کوشش کی تھی اور الزام لگایا تھا کہ مسجد کے چندے کے لیے اُس کی طرف سے دی جانے والی رقم کا ایک بڑا حصہ مولوی اکرم نے خورد برد کر لیا ہے۔ اُس کا لڑکا بھی شہدا تھا۔ اُس نے کسی سُنسان گلی میں مولوی اکرم کو زدوکوب بھی کیا تھا اور بھی بہت کچھ ہوا تھا۔ یہ ہمارے بمبئی آنے کے دُوسرے دن کا واقعہ ہے۔ کالنتے ابھی موجود تھا۔ مولوی اکرم کی زبانی مجید کی ڈھٹائی کا سارا ماجرا سُن کے پیرو مولوی اکرم کو لے کے مجید کے ہوٹل پہنچا تھا۔ میں اور بھّل بھی ساتھ تھے۔ پیرو نے بھرے ہوٹل میں مجید کو کاؤنٹر سے اُٹھا کے فرش پر پٹخ دیا تھا۔ مجید نے پیرو اور مولوی اکرم کے پیر پکڑ لیے تھے۔ اِس دوران دادر کے علاقے کا دادا بالے بھی آ گیا تھا۔ اُس نے بھی بعد میں مجید کے ساتھ کچھ کم ذلت آمیز سلوک نہیں کیا ہو گا۔ پیرو نے چلتے چلتے مجید کو حکم دیا تھا کہ وہ دوسرے دن مسجد کے چندے میں پورے آٹھ ہزار روپے داخل کرا دے کیونکہ مجید نے مولوی اکرم پر آٹھ سو روپے کی بددیانتی کا الزام لگایا تھا۔ مجید نے کسی چون و چرا کے بغیر یہ حکم قبول کر لیا تھا مگر وہ کینہ پرور سفلہ آدمی نظر آتا تھا۔ پیسوں کی بھی اُسے کمی نہیں تھی۔ اُس کا لڑکا بھی اُٹھائی گیرا تھا اور ہر وقت اُٹھائی گیروں ہی کا جمگھٹ اُس کے ہوٹل میں جمع رہتا تھا اور پیرو کے لیے وہ باہر کے آدمی بھی بُلا سکتا تھا۔ بظاہر اُس میں اتنی بڑی جرأت معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن یہ بات جرأت کی بات نہیں، کینے کی ہے اور کینے کے لیے ناتواں، توانا کی شرط نہیں ہوتی۔ آدمی کو کمینہ بنتے دیر نہیں لگتی۔ اُس نے مولوی اکرم کو بھی معاف نہیں کیا تھا حالانکہ اُن کی خطا ہی کیا تھی۔ رشتے آتے ہیں، منع کر دیے جاتے ہیں لیکن وہ مجید تھا۔ کٹ حجت، کٹ کھنا ہو سکتا ہے، اُس کا دماغ پھر گیا ہو۔

میرے برابر بیٹھے ہوئے شامو نے میرے ہاتھ پیر دل کی اینٹھن محسوس کر لی تھی، اُس نے بھن بھناتی آواز میں مجھ سے پوچھا "کیا بات ہے لاڈلے؟"

میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔ ویسے بھی ڈرائیور کی موجودگی میں کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ پاڑا قریب آ رہا تھا۔ میں نے طے کیا کہ مجھے بھّل سے بات کرنی چاہیے۔ ممکن ہے، اُس کے ذہن میں یہ سب کچھ نہ ہو۔ آخر اِس میں حرج بھی کیا ہے۔ بھّل زیادہ سے زیادہ دھتکار دے گا۔ پھر میں نے سوچا، بھّل سے بات کرنے سے پہلے کیوں نہ میں بالے کو اشارہ کر دوں۔ وہ دادر کے علاقے میں ہے اور مجید کو طلب کر کے اُسے اُلٹا لٹکا سکتا، اُس کی کھال کھینچ سکتا ہے۔ کم از کم مجید تک تو ہم پہنچ سکتے ہیں اور اندھیری کے علاقے میں جا کے راجن کی محبوب عورت کو ختم کرنے اور اِس کا الزام راجن کے سر تھوپنے والوں کی چھان بین تو کر ہی سکتے ہیں۔ حیدر آباد کے لوگوں کی بات دُور کی ہے۔ جہاں تک

اُن کا تعلق ہے، ہم یکے بعد دیگرے تمام لوگوں کے گریبانوں پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں جو دادا سے ناخوش تھے یا جنھیں چھ سات مہینے کے غیاب کے بعد دادا کی بمبئی واپسی اچھی نہیں لگی تھی۔ ہو سکتا ہے اُنھی میں سے کوئی ہو، آگے اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

پاڑے کی گلی کے سرے پر موٹر ٹھیر گئی۔ باہر کئی آدمی موجود تھے، دیکھتے ہی ہماری طرف دوڑ پڑے اور ہمارے ساتھ ہی عمارت میں داخل ہوئے۔ اندر لوگوں کی تعداد کل جتنی تو نہیں تھی مگر اتنی کم بھی نہیں تھی۔ چوکی کے اطراف دری پر متعدد لوگ بیٹھے تھے۔ ہماری آمد کا سُن کے چوکی کے وسط میں بیٹھا ہوا پانڈے دادا اُچھل پڑا اور چیختا، دونوں ہاتھ پھیلائے بھّل کے سینے سے آ کے چمٹ گیا۔ "دادا! اپن کو کیدر کو چھوڑ گیا؟" وہ منڈلاتی آواز میں بولا۔

تمام لوگوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال دیا۔ پانڈے دادا بھّل کی بانہیں تھامے اُسے چوکی پر لے گیا۔ جب تک بھّل بیٹھ نہیں گیا، سب کھڑے رہے۔ "اپن سے جاستی دیر ایدر رُکا نہیں جائے گا، سمجھا دادا!" پانڈے توقف کے بغیر بڑبڑاتا رہا۔ کہنے لگا کہ کل سے یہاں لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ لوگ آتے ہیں اور رونا شروع کر دیتے ہیں اور طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں، وہ کس کس سے بات کرے اور کس کس کو سمجھائے۔ لوگ جاتے ہی نہیں جیسے اُن کے بیٹھے رہنے سے دادا لوٹ آئے گا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُس نے صبح سویرے ہمارا انتظار شروع کر دیا تھا کہ بھّل آئے تو اُس کے پاؤں پکڑ کے اُسے اِس ذمے داری سے سبک دوش کر دینے کی منت کرے۔ دوسروں نے بھی اِس کی تصدیق کی اور بتایا کہ کل ہمارے جانے کے بعد بھی رات گئے تک بہت سے پاڑوں کے دادا بیٹھے رہے۔ جو ہمارے سامنے چلے گئے تھے، اُن میں سے کئی پھر شام کو واپس آ گئے۔ آخر پانڈے کو اُن سے کہنا پڑا کہ بہتر ہے، اب وہ اپنے پاڑے دیکھیں اور اپنے اپنے علاقوں میں دادا کو ختم کرنے والوں کا کھوج لگائیں۔ جتنی دیر ہو گی، دادا کی رُوح بے قرار رہے گی اور اِس میں خود اُن کا قرار بھی مضمر ہے۔ یوں وہ دادا سے اپنی وابستگی کا حق ہی ادا نہیں کریں گے بلکہ اپنے ساتھ بھی سلوک کریں گے۔ جتنی دیر ہو گی، ثابت ہو گا کہ دادا بہت بے وقار، بہت حقیر اور اکیلا تھا۔ پھر تو پاڑے کا ہر دادا ایسا ہی ہے، ایسا ہی بے اماں۔ یہ بات چل پڑی تو..... گلیا کے کہنے کے مطابق پانڈے دادا نے اُن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہاں حاضری سے کچھ نہیں ہو گا۔ اِس طرح اگر وہ دادا سے اپنا تعلق جتاتے اور اُس کے پاڑے کے لوگوں پر کچھ تاثر قائم کرنا چاہتے ہیں تو اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ نئے دادا کو جھٹ سے پہچانتے ہو جاتے ہیں اور شہر کے پاڑوں سے اُس کے مراسم پہلے کسی حوالے

اور سفارش پر کتنی دیر چلیں گے۔ سب کو نئی کھیتی بونی ہوگی۔ تاہم کے پاڑے پر پیرو داداکے پسماں دگان اور اُس کی چوکی پر بیٹھنے والے نئے دادا کی نظروں میں سُرخ روئی مقصود ہے۔ تو اُس کا یہی طریقہ نہیں۔ یہاں بیٹھے رہنے سے داداکے لیے اپنے دکھ کا اظہار ہے تو لے ٹنک جم جم کے بیٹھیں لیکن داداکا حساب صاف کر کے۔

پانڈے نے اُن سے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ بالے اور جارجی کے سوا تقریباً وہ سبھی چلے گئے تھے لیکن رات گئے تک دوسرے لوگوں کی آمدورفت جاری رہی اور پانڈے اُن کے درمیان بیٹھا خود کو نوچتا کھسوٹتا رہا۔ گلیا کہتا تھا کہ پانڈے لوگوں کی باتیں سُن سُن کے اور اُن سے باتیں کرتے کرتے خود رونے اور تلملانے لگتا ہے کہ اُسے کن کانٹوں پر بٹھادیا گیا ہے۔ یہاں اُس کے ہاتھ پیر جکڑے ہوئے ہیں۔ بار بار پیرو دادا اُس کے سامنے آکے کھڑا ہوجاتا ہے۔ رات کو صرف ایک دو گھنٹے کے لیے پانڈے سو پایا۔ سو بھی پایا یا نہیں۔ زورا اور چھیدا نے اُسے بہ اصرار چوکی سے اُٹھاکے پیرو کے خاص کمرے میں پہنچادیا۔

ہم پاڑے پہنچے تو بالے موجود تھا۔ دینا بھی کچھ دیر میں آگیا اندھیری سے سکندر بھی۔ جارجی وہاں نہیں تھا۔ مَیں نے بالے کو الگ لے جا کے بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر رُک گیا کہ پہلے مجھے خود بالے کی ٹوہ لینی چاہیے اور پاڑے کے دوسرے لوگوں کا احوال سُننا چاہیے۔ ایک نہیں، جانے کتنے، جن کا دادا اور ماچھی سے عمر بھر کا ساتھ رہا ہے، ایسے بے تعلق نہیں بیٹھے رہے ہوں گے۔ وہ جتنے شکستہ ہیں، اُتنے ہی برگشتہ بھی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو وہ افواہیں ساتھ لائے ہوں گے۔ خالی زمین میں خود رَو پودے اُگ آتے ہیں، سبھی بے کار نہیں ہوتے۔ افواہوں کا بھی یہی ہے۔ دس میں سے کسی ایک کی تو کوئی بنیاد ہوگی۔ مجھے خیال آیا، پولیس نے واردات کی جگہ کے آس پاس مکینوں اور راہ گیروں سے اچھی طرح پوچھ گچھ کی ہوگی۔ پولیس کو اُن سے کوئی کارآمد بات معلوم نہیں ہوئی ہوگی۔ ضروری نہیں کہ پولیس ہر آدمی تک پہنچ گئی ہو اور ہر آدمی نے اپنا سینہ کھول رکھا ہو۔ لوگ خوف و دہشت میں نہیں بتا پاتے اور پولیس سے دُور رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ مَیں وہاں جاسکتا ہوں۔ ایک کوشش کر لینے میں کیا جاتا ہے۔

زورا نے ٹھّل کے سامنے حقّہ رکھ دیا، پانڈے کے حکم پر سماوار بھی لاکے رکھ دیا گیا۔ سکندر آتے ہی ٹھّل کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ جیسے ہی پانڈے دادا چُپ ہوا، اُس نے ٹھّل کو اطلاع دی کہ رات گئے اندھیری کے علاقے میں پولیس نے اچانک کئی گھروں پر چھاپے مارے ہیں اور کئی آدمی گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ سبھی سب کاروباری ہیں اور اندھیری کے کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اُن کا رابطہ رہا ہے۔ مَیں ٹھّل کے قریب بیٹھا سب کچھ سُن رہا تھا۔ سکندر نے صرف اطلاع دی تھی، تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن اُس کا اشارہ واضح تھا کہ پولیس کو اندھیری کے علاقے میں کوئی نشیب نظر آیا ہے یا کوئی اور راستہ نہ دیکھ کے پولیس بھی آخر اسی مفروضے پر تکیہ کر رہی ہے کہ راجن کے سر پہ ایک عورت کے خون کا الزام ڈالنے والے لوگ پیرو کے لیے بھی بہت تنگ دل، بہت بے رحم ہوسکتے ہیں، راجن کی دیوار جو بنا ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے، حوالات میں بند راجن ہی نے اِس طرف پولیس کی توجہ دلائی ہو۔ سکندر گرفتار ہونے والوں کے نام بتا رہا تھا۔

ہمیں پاڑے آئے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ بڑے دروازے سے لچھی لپکتا جھپکتا اندر داخل ہوا اور درمیان میں بیٹھے لوگوں کو پھلانگتا ہوا چوکی پر سیدھا ٹھّل کے پاس آیا۔ اُس کی حالت کہہ رہی تھی کہ وہ کوئی اچھی خبر لے کے نہیں آیا ہے۔ "دادا!" ٹھّل کے پوچھنے پر وہ اُکھڑی اُکھڑی سانسوں سے بولا۔ "اپن قلابے سے آتا ہے، اُودر تھانے میں اپن کو پتہ لگا، ماری اندر ہے۔"

ٹھّل نے منال ہونٹوں سے ہٹالی۔ "کیا بولتا ہے رے؟"

"ہاں دادا! ماری اُودر تھانے میں پڑا ہے۔"

"ماری!" پانڈے حیرت سے بولا۔ "جارجی کا گھر والی؟"

"ہاں دادا!"

"کیوں؟ سیدھا بول۔"

"اپن نے تھانے میں جانے واسطے بہت ہاتھ پیر مارا پر اُودر آگے پیچھے اکھا پولیس لگا پڑا ہے اور لوگ اپنا اپنا بولیاں نکالتا۔ اپن بھاگ کے جارجی کا پاڑے طرف گیا، اُودر بھی پولیس تھا، پھر گھر دیکھنے کو نکلا۔ پولیس اُودر بھی کسی کا اندر جانا نئیں مانگتا۔"

پانڈے نے متوحش لہجے میں پوچھا۔ "جارجی کیدر ہے؟"

"اپن پوچھا تھا، پر اُودر کوئی بھی ٹھیک نئیں بولا۔ آزو باز و پاڑے کا ایک بھی آدمی اپن کو دکھائی نئیں پڑا۔"

پانڈے نے ٹھّل کی طرف دیکھا۔ ٹھّل کی پیشانی پر لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔ سب کی نگاہیں اُسی پر مرکوز تھیں مگر وہ بُت بنا رہا۔

"اپن کو بہت اُلٹا دکھائی پڑیلا ہے دادا! تھانے پر پولیس کا سامونڑ گاڑی کھڑا ہے۔" لچھی نے اضطراری انداز میں بتایا کہ وہ جارجی سے ملنے کے لیے قلابے کی طرف گیا تھا۔ گیٹ وے آف انڈیا کے قریب اُسے ایک شناسا سپاہی نظر آیا لیکن اُسے بھی کچھ علم نہیں تھا کہ ماری تھانے میں کیوں موجود ہے اور پولیس نے جارجی کا پاڑا اور گھر کیوں گھیر لے رکھا ہے۔ سپاہی نے لچھی کو مشورہ دیا کہ وہ جتنی جلدی ہوسکے علاقے سے نکل جائے یا کہیں چھپ جائے اور جب تک کچھ واضح نہ ہو، باہر نہ نکلے۔ کسی سنگین واقعے ہی پر پولیس کی اتنی بڑی تعداد حرکت میں آسکتی ہے۔ سپاہی کی اطلاع کے بہ موجب ماری کو تھانے میں آئے گھنٹے بھر سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ لچھی وہاں نہیں رکا اور گلیوں گلیوں چلتا سواری پکڑ کے سیدھا پاڑے آگیا۔

چوکی پر سکوت چھا گیا تھا۔ ٹھّل خاموش بیٹھا حقّے کے کش بھرتا رہا، لمحوں بعد اُس نے بالے اور زورا کو اشارہ کیا۔ "دیکھ کے آؤ رے! لاڈو کا کیا بولتا ہے؟"

بالے اور زورا فوراً اُٹھ گئے۔ مَیں بھی اُن کے ساتھ اُٹھا تھا مگر ٹھّل نے تند لہجے میں مجھے اپنی جگہ بیٹھے رہنے کی ہدایت کی۔ میرا خیال تھا، ہم تینوں راجان کی موٹر میں جائیں جو پاڑے کی گلی کے سِرے پر کھڑی ہے۔ مَیں نے پوچھنا چاہا کہ جب بالے اور زورا جاسکتے ہیں تو ٹھّل مجھ پر پابندی کیوں لگا رہا ہے لیکن اُدھر سے جمرو نے میرا ہاتھ کھینچ کے مجھے چپ چاپ بیٹھے رہنے کی تلقین کی۔ ناچار میں بیٹھ گیا تاہم مَیں نے ٹھّل سے کہا کہ بالے اور زورا موٹر ساتھ لے جائیں تو بہتر ہے۔ میرا مقصد تھا کہ وہ جلد واپس آجائیں گے۔ ٹھّل نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ بالے اور زورا نے بھی ٹھّل کے ردِعمل کا انتظار نہیں کیا جیسے مَیں نے کوئی بہت فضول بات کہی ہو۔ وہ دونوں ایک بھی لمحے کی تاخیر کیے بغیر دروازے سے نکل گئے۔

"لوگ باگ اُودر کیا بولتا تھا؟" جیسے ہی زورا اور بالے نگاہوں سے اوجھل ہوئے، پانڈے دادا لچھی پر ناراض ہونے لگا کہ وہ اصل بات جانے بغیر وہاں سے کیوں چلا آیا؟

"اپن نئیں آنے کا تھا پر..."

ٹھّل نے ہاتھ اُٹھا کے لچھی کو روک دیا اور دھیمی آواز میں پانڈے سے کہا کہ فی الحال زورا اور بالے کی واپسی کا انتظار کیا جائے۔

گویا ٹھّل کی مُراد یہ تھی کہ لچھی کو اِس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم جتنا وہ بتا چکا ہے اور ابھی کوئی قیاس آرائی قبل از وقت ہوگی یا اِس احتیاط کی وجہ دوسری تھی۔ چوکی کے اطراف فرش پر مختلف پاڑوں کے دادا اور علاقے کے آدمی بیٹھے تھے، اُن کے سامنے کوئی حجت مناسب نہیں تھی۔ انھیں بس ایک حد تک شامل رکھنا چاہیے تھا مگر یہی بات تھی تو ٹھّل لچھی کو لے کے اندر جاسکتا تھا۔ وہ وہیں موجود رہا اور چند ثانیوں بعد لچھی اُس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

مجھ سے وہاں بالکل نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ کم و بیش سبھی کا یہی حال تھا۔ جمرو، شامو، مارتی، چھیدا، دینا، سکندر، گلیا سبھی کا، اُن کے چہروں پر رنگ آرہے تھے اور جا رہے تھے۔ سب بار بار ٹھّل کو دیکھتے۔ ٹھّل سر جھکائے حقّہ گڑگڑاتا رہا۔ شاید کسی کو بھی اُس کی خاموشی اچھی نہیں لگ رہی ہوگی۔ لگتا تھا، وقت جیسے نکلا جا رہا ہے اور ٹھّل یقیناً کسی غفلت کا مرتکب ہو رہا ہے۔

پانڈے دادا سے برداشت نہیں ہوا "ایسا کیسے دادا!" وہ منتشر لہجے میں بولا۔ "ماری ایسا کیا؟..."

ٹھّل نے اُسے بات پوری نہیں کرنے دی اور ناگواری سے کہا۔ "کیا بولیں دادا!"

"اپن یہی سوچتا ہے، ماری اُودر کیسے چلا گیا؟" پانڈے اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "ماری کو اپن چھوکری ٹیم سے جانتا ہے۔ دادا ہی نے اُس کا شادی جارجی سے بنایا تھا۔" ٹھّل کی خاموشی پر پانڈے پیچ و تاب کھانے لگا اور لچھی کو گالیاں بکنے لگا۔

"جارجی تو رات ایدر اپن لوگ کے ساتھ تھا دادا!" دینا نے

جھجکتے ہوئے کہا: "رات اپن سب ساتھ میں باہر نکلا تھا۔"

"کیدر جاتا تھا۔ ایک دم بھوت مافک شکل بنا تھا، کپڑا میلا چکٹ کتنا دن سے ایدری تھا' اپن بولا' ابھی بہت ہوگیا' گھر جاکے تھوڑا آرام کر بابا! نئیں جانا مانگتا تھا۔ اپن گالی دیا کہ سالا، ابھی دادا کا ایسا واندا ہے تو کاہے کو خالی پیلی ایدر جوڑی ڈالے بیٹھا ہے۔ ابھی گلے ما پٹا ڈال کے تین چار کو ایدر لائے تو اپن بولے' ہاں دادا کا سگا' دادا کا جانی ہے' دفع ہوگیا۔ اپن کو بعد میں دھیان بھی آیا کہ تھوڑا جاستی بول گیا۔"

پانڈے جو منہ میں آیا' کہتا رہا۔ تبھل نے دخل نہیں دیا۔ وہ شاید سُن بھی نہیں رہا تھا' معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو۔

ماری کا تھانے میں ہونا اِتنی بڑی بات نہیں تھی جتنی اُس کے گھر اور قلابے کے پاڑے کے اطراف پولیس کی سرگشت لچھمی کی اطلاع بہت اُدھوری تھی۔ کچھ بھی ممکن تھا۔ ہوسکتا ہے' رات اندھیری کی طرح پولیس نے اب قلابے کا رُخ کیا ہو اور یہ محض معمول کی بات ہو۔ یا رات اندھیری سے گرفتار ہونے والے تاجروں نے قلابے کی طرف اشارہ کیا ہو۔ پولیس کی ہرکارروائی دُور سے اتنی شدید نظر آتی ہے۔ گزشتہ تین دن سے پولیس مختلف جگہوں پر چھاپے مارتی رہی ہے مگر ماری کیوں؟ ماری نے ایسا کیا جرم کیا ہے؟ کہیں ماری لپیٹ میں نہ آ گئی ہو۔ گو لچھمی نے اُسی کے بارے میں بتایا تھا، ممکن ہے' جارجی اور قلابے کے پاڑے کے دوسرے آدمی بھی تھانے میں موجود ہوں۔

زورا اور بابے کو جلد یا بدیر واپس آنا ہی تھا مگر اُن کے آنے سے پہلے مختلف اِمکانات کا ایک اندازہ لگا لینا بہتر تھا۔ قلابے کے پاڑے پر ہونے والے کسی بھی واقعے سے بلم کے پاڑے کا ردِّعمل مشروط تھا۔ تبھل کی خاموشی اُس کے اضطراب کی غماز تھی' پیش بینی و پیش بندی کے اضطراب کی۔ میری نظریں بھی جانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھیں اور کسی ایک جگہ ٹھیرتی ہی نہ تھیں۔ نگاہ کا تعلق بینائی سے نہیں ہے' نگاہیں بے نور آنکھوں کی بھی ہوتی ہیں اور اُن کے لیے پردے' زاویے اور فاصلے کی شرط نہیں اور اِرادے کی بھی۔ پانڈے دادا کچھ دیر کے لیے سکون سے بیٹھا رہا تھا کہ پھر بے چین ہونے لگا اور جھینپتی آواز میں تبھل سے بولا: "ابھی اپن ہی خود قلابے طرف کیوں نہ چلے دادا؟"

مَیں نے بھی بے اختیار اُس کی تائید میں آواز اُٹھائی' میرے پیچھے سے کسی اور نے بھی۔ تبھل نے سر اُٹھا کے تند نظروں سے پہلے مجھے دیکھا' پھر پانڈے دادا کو اور سپاٹ لہجے میں بولا: "اُدھر ہی کون گئے ہیں دادا! اپنے ہی آدمی ہیں۔"

پانڈے دادا سر ہلاتا رہ گیا۔

تبھل کی کوئی خواہش نہ ہوگی' یقیناً اُس نے پانڈے اور اُس کے گرد بیٹھے ہوئے داداؤں کی رسیاں ڈھیلی کرنے کے لیے چائے کا ذکر کیا تھا۔ پانڈے ماتھے پر ہاتھ مارنے لگا جیسے اُس سے کوئی بڑی فروگزاشت ہوگئی ہو۔ سماوار سے بھاپ اُٹھ رہی تھی اور بالو نامی پاڑے کا ایک آدمی منتظر بیٹھا تھا۔ پانڈے نے زور سے چیختے ہوئے اُسے چائے کا حکم دیا حالانکہ بالو قریب ہی تھا۔ چھیدا نے چائے کی پہلی پیالی تبھل کے آگے رکھی تھی کہ یک بیک سب کی نظریں دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ کُرتے' پاجامے اور واسکٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ آدمی دروازے پر گُلیا سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ درمیانہ قد' درمیانہ تن و توش' سرمئی رنگ' وضع قطع سے وہ اجنبی لگتا تھا۔ اجنبی لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور کسی طرح کی روک ٹوک نہیں تھی۔ جانے اُس نے کیا پوچھا تھا کہ گُلیا کو حجت کرنی پڑی۔ اُسے وہاں رُک کے گُلیا لپکتا ہوا چوکی کی طرف آیا اور تبھل کے پاس پہنچ کے بولا: "دادا! وہ ظہیر کا نام لیتا ہے' بولتا ہے' اپن کو اُس سے ضروری کام پڑا ہے۔"

"ظہیر!" مَیں نے چونک کے کہا۔

"اپن بولا' اپن کو بول دیو۔" گُلیا نے تیزی سے کہا: "پر وہ ....."

میں فوراً اُٹھ گیا لیکن تبھل نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے منع کر دیا اور نووارد کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہماری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اپن کو اوپر کا دکھائی پڑتا ہے دادا!" گُلیا نے دبے لہجے میں کہا۔ اوپر سے اُس کی مراد پولیس تھی۔ مجھے بھی یہی شک گزرا تھا۔

اتنی دیر میں وہ تیز قدموں سے چلتا' فرش پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو عبور کرتا چوکی کے پاس آگیا اور جوتے اُتار کے تبھل کے سامنے بیٹھ گیا۔ اُس کے زبان کھولنے سے پہلے تبھل نے درشتی سے پوچھا کہ "کیا بات ہے؟"

"اپن کو ظہیر صاحب سے ملنا ہے۔" اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کام بولو؟"

"اپن کو اُنھی سے ملنا ہے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ اُس کے لہجے میں عاجزانہ اصرار تھا۔

مَیں تبھل کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ اِس سے پہلے کہ تبھل کوئی جواب دیتا' مَیں نے اُسے بتایا کہ میرا نام ظہیر ہے۔

مجھے دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں چمک سی اُمڈ آئی' وہ کھسک کے جھٹ میرے قریب آگیا اور سرگوشی میں بولا کہ مجھے اے ڈی آئی جی صاحب نے بُلایا ہے۔

"اے ڈی آئی جی!" میری آواز سٹ پٹا گئی۔

"جی جناب! شکلا صاحب نے۔"

"شکلا جی نے؟" مَیں نے حیرانی سے کہا۔

"جی جناب! آپ کو اور تبھل صاحب کو۔"

مَیں نے تبھل کی طرف دیکھا اور اُسے بتانا چاہا مگر تبھل نے سُن لیا تھا: "کدھر ہیں صاحب؟" اُس نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"اُدھر ہی تھانے کی طرف۔"

تبھل نے بس ایک لمحے تأمل کیا ہوگا کہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ پانڈے دادا اور چوکی پر موجود سبھی ایک دم ہمارے ساتھ اُٹھ گئے۔ تبھل نے اُنھیں بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور چوکی سے اُتر گیا۔

"ابھی کدھر دادا؟" پانڈے دادا وحشت سے بولا۔

مَیں نے نہیں دیکھا' تبھل نے کیا اشارہ کیا تھا جو پانڈے دادا کا پھڑکتا ہوا جسم ٹھٹک گیا تھا۔ تبھل نے اُسے مزید استفسار کی مہلت نہیں دی اور بہ عجلت دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

ماہم کا تھانا پاڑے سے خاصی دُور تھا۔ باہر منتشر کھڑے ہوئے پاڑے کے کئی آدمی مجھے اور تبھل کو دیکھ کے سیدھے ہوگئے۔ وہ ہمارے پاس آیا ہی چاہتے تھے مگر ہماری بے تپاک آنکھوں سے اُنھوں نے جان لیا کہ سرِدست ہمیں اُن کی توجہ کی ضرورت نہیں ہے یا ہمیں جلدی ہے' اُن کی رخنہ اندازی ناگوار خاطر ہوگی۔ وہ بس چند قدم بڑھ کے رہ گئے۔ گلی کے آخر میں دائیں جانب مڑتے ہوئے میری نظر پاڑے کی طرف گئی' مَیں نے وہاں چبوترے پر گُلیا' لچھمی' چھیدا' شنکرا' جمرو اور ماریٹ کے علاوہ بہت سے لوگوں کو کھڑے دیکھا۔ سب ہمارے پیچھے آنے کے لیے بے چین تھے۔

سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ابّا جان کی موٹر میں ڈرائیور اونگھ رہا تھا۔ موٹر سے ہم جلدی پہنچ سکتے تھے۔ مَیں نے تبھل کو مشورہ دینا چاہا' لیکن موٹر کے سامنے پہنچنے کے باوجود وہ آگے چلتا رہا' مَیں بھی چُپ رہا۔ اِس اجتناب کی تاویل سمجھ میں آتی تھی۔ تبھل کو کسی آمادگی کے لیے شاید کچھ وقت درکار تھا۔ لچھمی کی اطلاع کے چند منٹ بعد شکلا کے ہرکارے کی آمد ایک ہی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی تھی۔ کوئی غیر معمولی بات ہی ہوگی جو شکلا نے اِس طور ہمیں طلب کیا تھا اور تبھل کو بطورِ خاص۔ سادہ پوش سے اِس سلسلے میں کچھ سُن گُن مل سکتی تھی لیکن تبھل نے اُسے کسی مشکل میں نہیں ڈالا۔

پاڑے پہ آتے وقت دھوپ اِتنی تیز نہیں تھی' نہ سڑک پر ایسا ہجوم تھا جیسے سارا شہر اِسی علاقے میں سمٹ آیا ہو۔ پیدل چلنے والے بہرحال اپنا راستہ نکال لیتے ہیں۔ ہم کسی رکاوٹ کے بغیر تیز قدمی سے فاصلے طے کرتے رہے۔ ابھی ہم پاڑے سے کوئی میل بھر دُور آئے ہوں گے کہ شکلا کا فرستادہ سادہ پوش چلتے چلتے ہڑبڑا سا گیا اور اُس نے دونوں ہاتھ پھیلا کے ہمیں روک لیا۔ اُسی لمحے سامنے سے پولیس کی جیپ ہارن بجاتی ایک جھٹکے سے ہمارے قریب ٹھیر گئی۔ اُس میں پولیس افسر اور سپاہی بیٹھے ہوئے تھے' شکلا نظر نہیں آیا۔ رُکتے رُکتے جیپ کچھ دُور گھسٹتی چلی گئی۔ ابھی ڈرائیور نے انجن بند نہیں کیا تھا کہ ایک نوجوان افسر جست لگانے کے انداز میں اُتر پڑا۔ درمیان کا فاصلہ اِتنا نہیں تھا' چند قدم بعد وہ ہمارے سامنے تھا۔ اُسے دیکھ کے سادہ پوش کا جسم تن گیا اور اُس نے سپاہیانہ تن دہی سے افسر کو سلام کیا۔ نوجوان افسر نے سر کی خفیف جنبش سے اُسے جواب دیا' کسی قدر ناگواری سے۔ اُس کی پھیلی پھیلی آنکھیں ہم پر جم گئی تھیں' اُسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اُس نے ہچکچاتے ہوئے جیپ کی طرف اشارے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ تبھل اُسی جانب چل پڑا اور اِس سے پہلے کہ اردگرد ٹھٹکنے راہ گیروں کی بھیڑ لگتی' ہم جیپ کی پچھلی نشست پر جا بیٹھے۔ ڈرائیور کو بہت عجلت معلوم ہوتی تھی۔ جیپ مُڑنے پر پاڑے کی طرف جانے والا راستہ سامنے آگیا۔ مَیں نے ماریٹ' جمرو' گُلیا' لچھمی اور پاڑے کے کئی آدمی اِدھر اُدھر سڑک پر کھڑے دیکھے۔ ہمیں کچھ خبر ہی نہیں ہوئی' وہ ہمارے پیچھے آ رہے تھے اور اِتنی دور آگئے تھے کہ ہمارے اُن کے مابین گزوں کا فاصلہ رہ گیا تھا مگر جیسے جیسے جیپ کی رفتار تیز ہوتی گئی' فاصلہ بڑھتا گیا تاآنکہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

ڈرائیور اور افسر کے علاوہ دو بندوق بردار سپاہی بھی جیپ میں موجود تھے۔ ہم تینوں کے اضافے سے جگہ کی تنگی ہوگئی تھی۔ سڑکوں پر گونجتے شور کی وجہ سے کوئی بات کرنا یوں بھی ممکن نہ تھا۔ ممکن ہوتا بھی تو اب کچھ جاننے سے کیا حاصل تھا۔ ماہم کا تھانا آیا چاہتا تھا۔ سب گونگے بنے بیٹھے رہے۔ راستے میں نوجوان افسر نے کئی بار مُڑ کے ہمیں دیکھا جیسے ہم کہیں غائب تو نہیں ہوگئے۔ مَیں نے فٹ پیری پر اُس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ اُن میں خشونت نہیں تھی جتنی وحشت تھی اور حیرانی۔ اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ کسی حد تک بدحواس بھی لگتا تھا۔ ہم سے اُس کا برتاؤ عام پولیس والوں جیسا نہیں تھا۔ اِس کی وجہ شکلا سے تعلق کی رعایت تھی یا شہر کے سب سے بڑے دادا کا لحاظ مانع تھا یا کچھ اور؟ کوئی خاص ہدایت؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ہماری حیثیت کیا ہے' ہمیں خود کو کیا سمجھنا چاہیے۔

جیپ کی رفتار کم نہیں تھی۔ ڈرائیور بھی مسلسل ہارن بجا رہا تھا۔ دُور سے لوگ پولیس کی موٹر دیکھ کے ویسے ہی ایک طرف ہوجاتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ کے قریب گزر گئے' جیپ نہیں ٹھیری' مجھ سے ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ ہم ماہم کے علاقے سے آگے نکل آئے تھے۔ مَیں نے

سوچا، بتھل سے کہوں یا اپنے پاس بیٹھے ہوئے سپاہی کو ٹوکوں کہ وہ ہمیں کہاں لیے جا رہے ہیں لیکن کہیں بھی کوئی بھی منزل ہو ہمارے لیے اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مَیں نے اپنی زبان بند رکھی۔ بتھل نے بیڑی سلگا لی تھی اور لوہے کے ڈنڈے سے ٹیک لگائے دائیں طرف کے بھاگتے منظر دیکھنے میں گم تھا یا اپنے آپ میں۔

وہ قلابے کا تھانا تھا، جیسا کہ بتھل کہہ رہا تھا، چار دیواری کے اطراف بڑی تعداد میں سپاہی گشت کر رہے تھے۔ اندر بھی سپاہیوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ اتنے لوگوں کی موجودی کے باوجود تھانے پر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ جیپ سامنے کے حصے کے بجائے کونے پر ایک گول کمرے کے سامنے رُک گئی۔ اگلی نشست سے پولیس افسر تیزی سے نیچے اُترا۔ مَیں بھی اُس کے ساتھ اُٹھ گیا تھا لیکن بتھل کو بے حس و حرکت دیکھ کے ٹھیر گیا۔ پولیس افسر جب تک جیپ کے پیچھے ہماری طرف نہیں آیا اور اُس نے ہم سے اُترنے کے لیے نہیں کہا، ہم بیٹھے رہے۔ کمرے سے ملحق دالان جیسے ایک مختصر حصے میں پولیس افسر نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کی ہدایت کی اور وردی درست کرتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ دونوں بندوق بردار سپاہی باہر رہ گئے، سادہ پوش بھی۔

پولیس افسر کو گئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اندر سے یکایک شکلا نمودار ہوا۔ اُس کی آنکھیں جل سی رہی تھیں۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ آدمی کی نگاہ پہلے مانوس چہروں پر جاتی ہے، اُس کی نظر پہلے مجھ پر پڑی۔ وہ بے تحاشا میری طرف بڑھا اور میرا شانہ جکڑ کے بولا "آؤ، آؤ، اندر آجاؤ۔" میری نگاہ بے ارادہ بتھل کی طرف گئی۔ شکلا کو یک دم بتھل کی موجودی کا احساس ہوا اور اُس نے بتھل کے سلام کا جواب جلدی جلدی سر ہلاتے ہوئے دیا۔ "آؤ دادا بتھل!" بتھل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے اُس نے اُسے بھی اندر چلنے کی تلقین کی۔ اُس کی ہیجانی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے ہمارا شدت سے انتظار تھا۔ اُس کے اضطراب و انتشار کے باوجود مجھے اپنا جسم کھُلتا ہوا محسوس ہوا جیسے کہیں کوئی دریچہ وا ہو گیا ہو۔ شکلا کے رویّے میں معاندت نہیں تھی مگر جو بات بھی تھی، شکلا کے ہاں ہمارے لیے معاندت تو ویسے بھی محال تھی۔ وہ اُداس اور مایوس ہی ہو سکتا تھا۔ ہمارے لیے وہ پولیس والا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔

کمرے میں کئی اور افسران بھی جمع تھے۔ سب کرسیوں سے اُٹھ گئے۔ اُن کی متجسس نگاہیں ہم دونوں کو حصار میں لیے ہوئے تھیں مگر وہ لوگ زیادہ دیر کمرے میں نہیں ٹھیرے، شکلا نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر کوئی اشارہ کیا ہو گا، سب کمرے سے نکل گئے۔ میرے دل کی حرکت جیسے مدھم ہو گئی تھی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شکلا ہم سے بہت قریب میز کے کنارے پر بیٹھا رہا اور کسی تاخیر کے بغیر اُس نے بتھل سے پوچھا "آپ لوگوں کو کچھ پتہ چلا؟"

"کائے کا صاحب؟" بتھل نے تھمی ہوئی آواز میں کہا۔

"ماری کا؟"

"اپنے کو پتہ لگا ہے، ماری ادھر تھانے میں بیٹھی ہے۔"

"صرف اتنا؟ اتنا ہی؟"

"کیا بات ہے صاحب؟" بتھل نے تندی سے پوچھا۔

شکلا نے ہنکاری بھری اور بتھل کو گھورتے ہوئے بولا "ماری تم کو کب سے نہیں ملی دادا؟"

"دادا کے پُرسے میں پرسوں اُس کی صورت دیکھی تھی، ایک بار کو بس۔" بتھل نے جزبز ہو کے کہا "اپنا اُس سے زیادہ ناتا نئیں ہے صاحب! پیرو دادا کا بہت تھا۔ لوگ بولتے ہیں، دادا نے بس اُسے جنا ہی نہیں تھا۔ کاٹ پیٹ کے باقی کا سارا دادا نے بنایا تھا اُس کو۔ گھورے سے اُٹھا کے گھر میں رانی بنا کے بٹھایا تھا اُس نے۔"

"اور کچھ .....؟" شکلا بے تابی سے بولا۔

"قلابے کے دادا جارجی کے ہاتھ میں دادا نے ہی اُس کا ہاتھ دیا تھا، پر صاف صاف بولو، بات کیا ہے صاب؟"

"تم ماری کو کب سے جانتے ہو؟"

"زیادہ ٹائم سے نہیں۔ بیس پچیس دن سے اوپر نہیں ہوئے" بتھل نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بعد کو بھی ہم نے دوبارہ سے زیادہ اُس کو نہیں دیکھا۔"

"لیکن، لیکن ماری تو تم کو خوب جانتی ہے۔"

"ہم کو؟" بتھل کی آواز اونچی ہو گئی۔ "اپنے کو نہیں پتہ کیسے۔ دادا نے بولا ہو گا۔ ہر جگہ اپنے لیے ایسا ہی اُلٹا سیدھا بولتا تھا۔"

"تم ظہیر! تم کب سے اُسے جانتے ہو؟"

"یہی، جو بتھل بھائی بتا رہے ہیں۔" میری زبان لکنت کرنے لگی۔ "مگر آپ ..... آپ کیا، ماری نے کہیں ہمارا نام لیا ہے؟"

"ہاں!" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ماری یہاں کس جرم میں آئی ہے؟"

"قتل کے۔" شکلا نے سر جھکا کے کہا۔

میری سانس سینے میں اٹک گئی۔ "ماری نے قتل کیا ہے؟ کس کا؟" مَیں نے بتھل کی طرف دیکھا، وہ بھی ساکت بیٹھا تھا۔

"اُس نے اپنے شوہر کا خون کر دیا ہے۔"

"اپنے شوہر! جارجی کا؟"

شکلا نے ہونٹ بھینچ لیے اور اضطراری انداز میں اپنی
نی رگڑنے لگا۔

"کب؟" میری آواز ٹھٹھر گئی تھی۔ "جارجی تو رات، سُنا ہے
ک پاڑے میں تھا، ماہم کے پاڑے میں۔"

"ماری نے اُسے سویرے قتل کر دیا۔"

"کیوں؟ مگر ماری کیوں؟ نہیں نہیں، ہو سکتا ہے، کسی اور
اُسے ..... ماری تو ایک عورت، ایک اچھی عورت .....؟"

"ماری نے یہاں آ کے خود کہا ہے۔"

"ماری نے اقبال کیا ہے؟"

"ہاں، اُسی نے۔"

میرا جسم سُن ہو گیا، بتھل بھی کچھ نہیں بولا۔ ہم دونوں اُس کا
رہ تکتے رہے۔

"ماری نے آلۂ قتل بھی پولیس کو پیش کر دیا ہے، ایک خنجر .....!"
کلا نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مگر کیوں؟ ماری نے اِس کا کچھ سبب بھی بتایا؟"

"تمھارے خیال میں اِس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"مَیں، مَیں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"بتھل دادا! آپ بولو؟"

بتھل سر اُٹھا کے رہ گیا۔ کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ خاصی دیر بعد بتھل نے زبان کھولی "اُدھر اکیلا جارجی تھا صاب؟"

"یہ تم نے کیوں پوچھا دادا؟" شکلا کی آواز تڑخ رہی تھی۔

"ایسے ہی .....!" بتھل نے منہ بنا کے کہا۔

"تم دوسرے کو جانتے ہو دادا؟"

"نہیں، پر جارجی اکیلا نہیں ہونا چاہیے۔ اکیلا ہوتا تو تھوڑے دن ابھی اور مل جاتے، ماری اِتنے دن کی بھیک اُس کو اور
دے دیتی۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"اپنا کہنا سننا بعد میں رکھنا، ٹائم پڑا ہے اور ہم اِدھر ہی ہیں۔ آپ اپنی بولو صاحب! اور ایک بات اچھی طرح جان لو، آپ کو ہم وردی والا نہیں سمجھتے، آپ وردی والی بولو گے تو ہم سے ٹھیک .....!"

"نہیں دادا!" شکلا نے ہاتھ اُٹھا کے تیزی سے کہا۔ "ایسا مت کہو، کچھ ہرگز مت سمجھنا۔ میں کچھ پوچھنا، کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے کھُل کے بتاؤ، کچھ مت چھپاؤ۔"

"چھپانے کا اپنے پاس کچھ نہیں ہے۔" بتھل نے تلخی سے کہا۔ "اور آپ سے کیا چھپائیں گے، پھر ایک حکم پر نہیں آجاتے؟"

"مجھے اندازہ ہے۔"

"ہم کو ابھی سب آپ کی زبان سے پتہ چلا ہے۔"

"وہاں ایک اور بھی تھا۔" شکلا نے بتایا۔ "جارجی کا رشتے دار وکی نام کا، گوا میں رہنے والا غنڈا ..... اُس کی شناخت ہو گئی ہے۔ تم اُسے جانتے ہو؟"

"نہیں صاحب! ماری سے اُس کا نام سُنا تھا، دیکھا نہیں۔ پر وہی ہو سکتا ہے۔"

"وہی کیوں؟"

"یہ ماری نے آپ کو بول دیا ہو گا۔" بتھل سرد لہجے میں بولا۔

"وہ جارجی اور وکی .....!" مَیں نے سٹ پٹائی آواز میں کہا۔ "جارجی کی طرف بھی میرا دھیان گیا تھا لیکن وہ تو مسلسل دادا کے پاس، اُس کے پاڑے پر، وہ تو بالکل ہی .....!"

"اُسے اُن دنوں اُدھر ہی رہنا چاہیے تھا۔"

"مگر ماری کو، ماری کو یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"وہ بولتی ہے، اُسے پتہ تھا۔"

"پتہ تھا، جانتی تھی وہ؟" میری آواز حلق میں پھنس گئی۔

"نہیں، بولتی ہے، یقین تھا اُسے۔"

"یقین غلط بھی .....!" مَیں کہتے کہتے رُک گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ مَیں کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہا ہوں۔ پولیس نے ماری سے اُس کے یقین کے ثبوت ضرور چاہے ہوں گے۔ کوئی عورت اپنے شوہر کو یوں قتل کر سکتی ہے! میری رگوں میں خون سن سنا رہا تھا اور لگ رہا تھا جیسے یہ سب جھوٹ ہے۔

شکلا میز سے اُٹھ کے ہمارے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا اور رومال سے ماتھے کا پسینہ خشک کرتے ہوئے آہستگی سے بولا "دادا! ماری تم سے ملنا چاہتی ہے۔"

"اپنے سے؟" بتھل نے چونک کے کہا۔

"اُس نے تھانے آتے ہی تم کو بلانے کو کہا تھا۔ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے، تم سے بھی اور، اور راجا سے بھی۔" مجھ پر نظریں جماتے ہوئے شکلا تیکھے لہجے میں بولا "وہ ظہیر سے بھی ملنا چاہتی ہے۔"

"اب کیا چاہتی ہے وہ؟" مَیں نے ترشی سے کہا۔

"پولیس نے جاننے کی کوشش کی تھی مگر ماری نے انکار کر دیا، بولی کہ اُسے کچھ اپنے لیے بات کرنا ہے اور صرف تم سے۔ کسی کو اُس نے نہیں بلایا۔" نہ میں نے کچھ کہا نہ بتھل نے۔ شکلا

کلبلانے لگا۔ "کیا سوچنے لگے دادا ؟"

"کدھر ہے وہ شیر کی جنی ؟" بتھل نے بوجھل آواز میں پوچھا۔

"یہیں یہیں تھانے میں۔"

"اپنے کو لے چلو اُس کے پاس۔"

"ہاں" شکلا نے کسمساتے ہوئے کہا۔ "لیکن دادا مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے ؟"

"اُس سے پوچھ کے بولیں گے۔"

شکلا نے کچھ کہنا چاہا، پھر گہری سانس لے کے دفعتہً کرسی سے اُٹھ گیا۔ ہم بھی کھڑے ہو گئے اور اُس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل آئے۔ وہاں سپاہی اور ہمیں لانے والا پولیس افسر موجود تھے۔ اُن کی طرف توجّہ دیے بغیر شکلا دالان کے اندر ہی کھلنے والے ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ میری ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں، تاہم اپنا بُت گھسیٹتا ہوا میں بتھل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

ماری چوتھے کمرے میں تھی۔ باہر سنگین بردار پولیس والوں کا پہرا تھا۔ یہ حوالات نہیں تھی۔ تھانے کے پچھواڑے کوٹھری جیسا ایک تنگ کمرا حوالات بنا دیا گیا تھا۔ ایک کونے میں بچھی ہوئی چٹائی پر ماری دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ دن کی روشنی کے باوجود کمرے میں اجالا نہیں تھا۔ سپاہی نے بلب جلا دیا۔ ہم جیسے ہی اندر پہنچے، ماری یک لخت اُٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے تو چند لمحے گُنگ کھڑی رہی، پھر اُس کے بدن میں جیسے کوئی لہر متلاطم ہوئی، وہ وحشیانہ انداز میں بتھل کی طرف جھپٹی۔ بتھل نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ ماری بلک بلک کے رونے لگی۔ بتھل اُسے بازوؤں میں دبوچے خاموش کھڑا رہا۔

سپاہیوں نے جلد از جلد باہر سے تین کرسیاں لا کے رکھ دی تھیں۔ شکلا نے ایک کرسی اور لانے کا حکم دیا۔ ماری ہچکیوں سے رو رہی تھی، زار و قطار۔ جیسے بس کسی نشیب کے لیے اُس کی آنکھوں کا سیلاب رُکا ہوا تھا جیسے اُسے بس بتھل ہی کا انتظار تھا۔ بتھل اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا، اُس کی کمر سہلاتا رہا۔ ماری کی سسکیاں اور کراہیں سارے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ در و دیوار بھی جیسے شامل ہوں۔ ایسی آہ و زاری کہ دیکھنے اور سننے والے کو پاگل کر دے۔ آدمی کو خاک کر دے۔ "کیا کر لیا ری ؟" بہت دیر بعد بتھل نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہنے کی کوشش کی۔ "مر گئے تھے ہم کیا، اِتّی جلدی کائے کو پڑی تھی ؟"

ماری اور سسکنے لگی۔

شکلا وہیں کھڑا تھا۔ بتھل نے بہ مشکل ماری کو بازوؤں سے ہٹا کے کرسی پر بٹھایا۔ "بڑے صاحب اِدھر ہی ہیں، کیا بولیں" بتھل نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو جانا چاہیے دادا ؟" شکلا تذبذب سے بولا۔

"بیٹھو صاحب ! اِس کے لیے ابھی سب ایک جیسا ہے" نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ کرسی پر بیٹھی ماری گری گری جا بھی۔ بہت تھکی ہوئی، بہت دن کی تھکی ہوئی لگتی تھی۔ بال بکھرے، چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا۔ دھنسی ہوئی لال لال آنکھ نیلے رنگ کی چادر پیروں میں پڑی ہوئی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا ایسی خستہ شکستہ عورت سے خنجر اٹھایا گیا ہو گا۔ "بڑے صاحب کے نہیں ہیں۔" بتھل نے اُس سے کہا۔ ماری کو جیسے اپنی خبر بھی۔ منہ چھپائے سسکیاں بھرتی رہی۔ "اب کیوں بلایا ہے" بتھل کی آواز میں درشتی آ گئی۔ "پھوٹتی کیوں نہیں منہ سے اُ کے مت دیکھ اب ...."

ماری کے ہونٹوں پر لرزش طاری ہوئی اور وہ بتھل پا یاس بھری نظر ڈال کے رہ گئی۔

شکلا کے تالی بجانے پر ایک سپاہی اندر آ گیا۔ شکلا نے سے پانی منگایا اور نرم لہجے میں ماری کو متنبّہ کیا کہ اُس کی خو پر ہم دونوں کو بلایا گیا ہے۔ بہتر ہے کہ وہ اپنے حواس قابو میں ر جس کا وہ پہلے مظاہرہ کرتی رہی ہے۔ یہ تھانا ہے، ملاقاتی بہ دیر تک اُس کے سامنے نہیں بیٹھ سکتے۔ سپاہی پانی لے کے شکلا کے اشارے پر اُس نے گلاس ماری کے آگے بڑھایا تو مار نے منہ پھیر لیا مگر بتھل کے دخل دینے پر اُس نے چند گھونٹ اُ حلق میں اُتار لیے۔ شکلا اُسے سمجھانے لگا کہ ماری جتنا سچ بو گی اُتنی ہی اُس کے لیے آسانی ہو گی۔ ماری نے اُس تلقین پر توجّہ نہیں دی بلکہ اُس نے تو جیسے سنا ہی نہیں۔ شکلا پہلو بدلنے کہ کہیں اُس کی موجودگی تو ماری کی لب کشائی میں حارج نہیں رہی ؟ وہ اُٹھا ہی چاہتا تھا کہ بتھل نے ماری سے پوچھا۔ "بچے کدھر ہیں ؟"

ماری پھر پھوٹ پڑی اور بلکتی آواز میں بولی کہ بچے پو اسکول میں ہیں اور اُنھی کے لیے اُس نے ہمیں بلایا ہے۔ "اُن اب کوئی نہیں ہے دادا ! کوئی بھی نہیں۔" وہ اپنا چہرہ کھسوٹنے "اُن کی ابھی تو خود ہے۔"

"اپن جانتا ہے ؟ اپن ابھی کدھر ہے دادا ! اور ابھی رہنا بھی نہیں مانگتا۔" ماری کی آواز کے ساتھ اُس کا سارا بدن

باتھا، ہاتھ جوڑ کے مجھ سے اور بتھل سے التجا کرنے لگی کہ اب ہمی ں کے بچّوں کا خیال رکھنا ہے۔" وہ ایک دم بچّہ ہے، بہت چھوٹا دادا ! اُن کا کوئی بھی نہیں۔"

"اُن کا دھیان تھا تو پھر ایسا کیوں کیا ری ؟" بتھل نے ج کے کہا۔

"اپن کو ایسا ہی کرنے کا تھا۔ اپن نے کوئی غلط نہیں کیا۔" لڑ ی انداز میں بولی۔ "اپن اُسی دن، اُن لوگ کو ختم کر دیتا پر وہ۔" اپنے شوہر جارجی کو گالیاں بکنے لگی کہ جارجی گھر پہ تھا ہی نہیں۔ رات ہی وہ کئی دن بعد گھر لوٹا تھا۔"

"اپنے پاس کیوں نہیں آئی ؟ اُدھر دادا کے گھر دیدن نے آئی تھی تو بولا کیوں نہیں ؟"

"کیا بولتا دادا ! اپن اُس کا حال دیکھا تھا، گیتا کا اور دادا رانی کا.... اُن لوگ کو تمھارا ضرورت تھا، اُن لوگ کو تمھارا رت ہے، پھر اپن تم کو کیا بولتا۔"

"پر یہ تیرا کام نہیں تھا۔"

اپن جانتا ہے، کس کا تھا، تم بھی یہی کرتا۔ نہیں تو اپن اوپر کے دادا کو کیا منہ دکھاتا اور اپن اکھّا زندگی اپنے کو بھی کیا منہ تا۔ دادا نے اپن کو شادی میں خنجر دیا تھا اور جارجی کو بھی...."

"دیا تھا پر ...."

"اپن اُسی دن اُن باسٹرڈ کو اوپر بھیج دیتا۔ اتنا دیری کبھی یں لگاتا۔"

"وکی اِدھری تھا ؟"

"اُسی رات سے وہ گھر پہ تھا۔" ماری نے ترخنی آواز میں تایا۔ "دوسرا بھی تھا، ٹامی کُتّے کا جنا، پر وہ نکل گیا۔ وکی بھی ل جاتا۔"

"وکی اُس رات گھر پہ تھا ؟ کیا بولتی ہے، اُس کو تو نکل جانا یے تھا۔ ہم سمجھے تھے، وہ اُدھر اپنے ٹھکانے گوا کو چلا گیا ہو گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بتھل کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اتنے یقین سے وکی کا نام کیوں لے رہا ہے۔ گویا بتھل نے جارجی کو ہچان لیا تھا۔

"وہ نکل جاتا پر وہ باسٹرڈ زخم کھا کے آیا تھا۔ آگے نہیں جا کنے کا تھا۔ اُس رات کو سیدھا گھر آیا اور بولا، اپن کا لفڑا ہو لیا ہے ماری اِدھر اندھیری ما۔ اپن اُس کے بولے پر کوئی ڈاؤٹ یں کیا اُس کا بینڈیج کیا۔ دوسرا صبح جب دادا کا پتہ لگا تو اپن سب جان گیا۔ رات کو وہ رنڈی کا .... کدھر گیا تھا اور کدھر سے چاقو لگا کے آیا تھا۔ بندوق وہ پھینک کے آیا تھا۔ کسی گٹر شٹر میں ریوالور اُس کے پاس تھا۔ ٹامی اُس ٹائم اپن سے بول کے گیا تھا کہ وکی کے لیے ابھی تھوڑا سگریٹ اور برانڈی لے کے آتا ہے۔ وہ لوٹ کے نہیں آیا، گوا بھاگ گیا یا اِدھری کہیں چھپا پڑا ہوں گا۔ ہو سکتا ہے، پولیس کے ہاتھ پڑ گیا ہو، اپن کو نہیں معلوم ...."

شکلا کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہو رہا تھا مگر بتھل نے اُسے روک دیا اور ماری سے پوچھا۔ "تو بولتی ہے، وکی چوٹ کھا کے آیا تھا ؟"

"ہاں دادا !" ماری کی آنکھوں میں آگ سی جلنے لگی۔ "وکی کے بازو پر چاقو لگا تھا۔ ذرا سا سائڈ مار گیا، نہیں تو ٹھیک دل پہ لگتا۔ اپن وکی سے کچھ نہیں بولا، سمجھ گیا کہ دادا یا ماچھی نے گولی لگنے پہ گرتے گرتے چاقو مارا ہے۔ اپن کو پتہ ہے، دادا کا نشانہ کبھی آؤٹ نہ جاتا پر گولی اندر اُتر گیا تھا...."

"مگر تم، تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وکی دادا کو مار کے آیا ہے اور اُس کا زخم دادا یا ماچھی کے چاقو ہی کا ہے ؟" شکلا نے تمتاتی آواز میں پوچھا۔

"اپن اُن لوگ کو جانتا ہے۔ وہ ایک نمبر کا بھڑوا لوگ ہے۔ اپنا ماں بہن کو بیچ دے۔ وہ آدمی کا ...." ماری کی زبان اُس کے قابو میں نہیں رہی تھی۔ کہنے لگی، اُس رات زخمی حالت میں وکی اُس کے گھر آ گیا تھا۔ وہ نہ آتا تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اِس دوران کوئی اور، کوئی دوسرا آگے آ کے دادا کے خون کا اقبال نہ کر لیتا۔ ماری نے بتایا، جارجی نے گوپیرو کی سرزنش پر اپنا جوئے اور شراب کا خفیہ اڈّا بند کر دیا تھا اور پیرو سے معافی بھی مانگ لی تھی مگر جارجی بہت دُور جا چکا تھا۔ پھر یہ سانحہ سُن کے گوا سے وکی آ گیا اور کئی بار آیا۔ وہ دیکھتی رہی کہ وہ دونوں کمرے میں رات رات بھر بند رہتے تھے اور ہر چند اُنھوں نے ماری کو اپنے راز و نیاز میں کبھی شامل نہیں کیا تھا لیکن ماری کے بہ قول وہ اُن کی رگ رگ سے واقف تھی۔ اُس نے ایک بار جارجی کو تنبیہ بھی کی کہ وہ آئندہ ایسی کوئی غلطی نہ دُہرائے، بہت پشیمانی ہو گی، پیرو دادا کو اب بمبئی سے کہیں نہیں جانا ہے۔ اِس بار وہ معاف نہیں کرے گا کیونکہ وہ ایک مرتبہ رعایت دینے کا قائل ہے۔ اُس نے جارجی کو سمجھایا کہ ہمارے لیے پیرو دادا سے مفاہمت ہی میں عافیت ہے۔ پیرو کے پہاڑ سے ٹکرانے میں اپنا ہی نقصان ہو گا اور ویسے بھی پیرو دادا نے ہم سے بد سلوکی کیا کی ہے۔ اُس نے جارجی کو

قلابے کے پاڑے کا بادشاہ بنایا ہے۔ ماری اپنے شوہر سے یہی کچھ کہہ سکتی تھی۔ جارجی ناراض ہونے لگا کہ ماری کے دل میں ایسا خیال ہی کیوں آیا۔ جارجی نے اُسے اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ پیرو دادا کے لیے اُس کے دل میں کوئی عناد نہیں۔ ماری یہ سُن کے خاموش ہوگئی لیکن وہ مطمئن نہیں تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ جب تک وکی جارجی کے ساتھ رہے گا، جارجی کے قدم بہکتے رہیں گے۔ پھر جب ایک دن وکی اُسے کسی بڑے عذاب سے دوچار کر دے گا تب شاید جارجی کی آنکھ کھلے۔ اُس نے کئی بار اپنے شوہر کو وکی سے دُور رکھنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ جتنا وہ جارجی کو وکی سے دُور رکھتی، وکی اُتنا ہی اُس سے قریب ہوتا جاتا۔

وکی کے گوا سے بار بار ممبئی آنے کے باوجود اُس کا جارجی کے پاڑے پر نہ جانا، اپنی آمد محض گھر تک محدود رکھنا، اپنی سرگرمیوں میں ماری کو شریک نہ کرنا، جارجی کی مستقلاً پیرو کے پاڑے پر حاضری اور عاجزی۔ یکایک اپنی بیوی سے جارجی کا بدلا ہوا رویہ، خوش کلامی اور خوش اطواری، وکی کا احترام۔ ماری نے رُندھی آواز میں بتایا کہ یہ سب دیکھ کے اُسے دھڑکا لگا ہوا تھا اور اُس کے خیال میں جارجی اور وکی کی سازباز، پُراسرار قسم کی سرگرمیوں کا یہی مقصد ہو سکتا تھا کہ وہ جوئے اور شراب کا منفعت بخش اڈا دوبارہ کھولنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ سونے کا یہ درخت پیرو دادا نے ایک ہی ٹھوکر میں اکھاڑ دیا تھا۔ اِسے دوبارہ پیرو دادا کی آندھی سے محفوظ رکھنے کی تدبیر یہی ہو سکتی تھی کہ اب کے اڈّا کسی دوسرے مقام پہ کھولا جائے جہاں پیرو دادا کی رسائی نہ ہو سکے لہٰذا پیرو دادا کو کسی معاملے میں اُلجھانے کی سازش کی جائے۔ پولیس وغیرہ کا کوئی چکر چلایا جائے یا شہر کے داداؤں کو ورغلایا جائے تاکہ پیرو آئندہ اِس قسم کی انفرادی آزادیوں پر اثرانداز نہ ہو سکے۔ ماری کو یقین تھا کہ اِس سے زیادہ اُن کے بس میں نہیں ہے اور وہ دادا کو تو کیا نقصان پہنچائیں گے، اپنی رہی سہی بھی خاک میں ملالیں گے۔ جارجی اور وکی کی تمام کمینگی اور مکاری کے باوجود ماری کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ دونوں دادا کا پتھر ہمیشہ کے لیے اپنے راستے سے ہٹانے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ وہ اتنے اندھے اتنے پاگل ہوگئے ہیں۔

ہفتے ڈیڑھ ہفتے پہلے ماری نے ماہم کے پاڑے جا کے پیرو کو اشارہ بھی کر دیا تھا کہ جارجی کا دماغ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ پیرو ہنسنے لگا اور ماری سے بولا کہ ہو جائے گا، وقت گزرنے پر خود ٹھکانے پر آجائے گا۔ منہ کو لگا خون اتنی آسانی سے نہیں چھوٹتا۔ وہ چلی [illegible] تاہم وکی اور جارجی کی ٹوہ میں لگی رہی، اِس سے اُسے اضطراب [illegible] سوا کچھ نہیں ملا۔ چار دن پہلے وکی پھر گھر آیا اور طبیعت کی ناساز[ی] کا بہانہ کر کے زیادہ تر گھر میں بند رہا۔ اِس مرتبہ ٹامی بھی اُس کے س[اتھ] تھا۔ ماری نے اُن کے گھر سے باہر چلے جانے کے بعد اُن کے سامان کی تلاشی بھی لی تھی اور سامان میں بندوق دیکھ کے اُس کا ماتھا [ٹھنکا] تھا۔ ایک بار اُس کے جی میں آیا کہ وہ وکی کا کام تمام کر دے۔ ما[ری] بلبلاتی آواز میں بولی۔ کاش اُس میں یہ حوصلہ آجاتا تو آج سب بدلا ہوا ہوتا۔ ماری کے کہنے کے مطابق اُس نے ایک آدمی [کے] ذریعے وکی اور ٹامی کی آمد کی اطلاع ماہم کے پاڑے پر بیٹھے [پیرو] جارجی کو پہنچا دی تھی۔ جارجی اپنے عزیز دوست وکی کو دیکھ[نے] نہیں آیا تھا، اُس کی علالت کی خبر سُن کے بھی نہیں آیا۔ وہ ماہم [کے] پاڑے پر ڈیرا جمائے رہا حالانکہ تین چار دن سے پیرو اپنے پاڑ[ے] کے بجائے اندھیری کے پاڑے میں مقیم تھا اور اُس کی عدم موجود[گی] میں ماہم کے پاڑے پر جارجی کے ٹکے رہنے کا کوئی جواز نہیں [تھا]۔ دوسرے دن وہ گھر آیا تو خاصی عجلت میں تھا، تھوڑی دیر رُکا [اور] چلا گیا۔ ماری کو حیرت ہوئی، اُس نے وکی سے اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر کیا، نہ وکی نے اُس سے شکوہ کیا۔

اُس رات سورج غروب ہونے کے بعد وکی اور ٹامی [گوا] جانے کا کہہ کے نکلے تھے، اپنا مختصر سامان ساتھ لے کے جس [میں] بندوق بھی تھی۔ ماری نے سکون کی سانس لی۔ وکی کے چلے جا[نے] پر ہمیشہ اُسے سکون نصیب ہوتا تھا، مگر رات گئے وکی زخمی حال[ت] میں واپس آگیا اور اُس نے ماری کو بتایا کہ وہ گوا نہیں جا سکا۔ [راستے] میں اُس کا جھگڑا ہوگیا تھا۔ سامان بھی اُس سے چھن گیا ہے۔ [بس] سمجھ لو کہ جان بچ گئی۔ ماری نے بظاہر ہمدردی کا اظہار کیا [مگر اِس] مرتبہ وکی کی آمد سے اُس کا سینہ ایسا متلاطم نہیں ہوا۔ اُسے ایسا [لگا] جیسے قدرت نے خود وکی کو اُس کے پاس بھیجا ہو۔ وکی اُس کے [رحم و] کرم پر تھا۔ اُس نے سوچا کہ وکی کا شگاف اور گہرا کر دے اور پو[لیس] کو خبر کر دے کہ زخم خوردہ وکی اُس کے گھر میں موجود ہے لیکن اُ[س] نے یہ سوچ کے تحمل کیا کہ عجلت میں اُٹھایا ہوا کوئی قدم اُس کے [لیے] کسی بڑی مصیبت کا سبب نہ بن جائے۔ بہرحال اُس نے طے کر لیا کہ وکی سے نجات کی ایک ہی صورت ہے، وکی کی موت۔ یہ بات پہلے بھی کئی بار اُس کے دماغ میں آئی تھی لیکن پہلے اگر یہ کوئی خ[یال] تھی تو اب اِس نے فیصلے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اپنے عزم [...]

[...]ری اور توانائی پر اُسے یک گونہ ڈھارس سی ہوئی۔ ماری کے [...]ل بس اُسے مناسب موقع کا انتظار تھا۔

ماری کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ بتھل چپ بیٹھا اُس [ع]ورت تک رہا تھا۔ شکلا نے چند لمحے توقف کیا کہ ماری دوبارہ [...]ن کھولے مگر ماری کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور کہنے کے [...] اِس کے سوا اُس کے پاس شاید کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ”مگر یہ بہت [...]نی ہے۔“ شکلا متوحش لہجے میں بولا۔ ”وکی اور جارجی کو مجرم قرار [دینے] کے لیے یہ ثبوت ناکافی ہیں۔“

ماری نے بے چارگی سے اُسے دیکھا جیسے اُس کی سمجھ میں [شک]لا کی بات نہ آئی ہو یا کوئی جواب نہ بن پڑ رہا ہو۔

”تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ وکی ہی تھا۔“ شکلا نے بے تابی [سے] کہا۔ ”وکی دادا کے چاقو سے زخم لگوا کے آیا تھا؟ اُس نے تمھیں [بتا]یا؟ کسی اور نے؟ یا محض تم نے پیرو دادا کے قتل کی خبر سُن کے [سمج]ھ لیا۔ وکی اور جارجی کی کوئی بات، دادا کے خلاف ہونے والی [کسی] بھی سازش کا، کوشش کے باوجود تمھیں پتہ نہیں چل سکا تھا۔ [جیس]ا کہ تم نے کہا، تم سمجھتی تھیں کہ وہ دونوں پیرو دادا سے چھُپ کے [اڈّے] کا کاروبار دوبارہ شروع کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے اور اُن میں [اتنی ج]رأت نہیں ....“

”پر ابھی کون دادا کا ....“ ماری چیخ کر بولی۔

”کیا بولتے ہو صاحب!“ بتھل نے تلخی سے کہا۔

”دادا!“ شکلا تیز آواز میں بولا۔ ”پولیس عدالت میں ماری [سے] سوال کرے گی کہ ....“

”کرے صاحب!“ بتھل نے کہا۔ ”اب آپ ٹھیکا لگاتے رہو، [اُس] کے پاس دوسرا جواب کدھر ہے اور پھر کیا آپ اِس کو تھپکی دے [کے] گھر کو لوٹا دوگے۔“

شکلا کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ پہرے دار دروازے پہ منڈلا رہے تھے۔ ”ٹھیک ہے ری!“ بتھل یکایک اُٹھ گیا۔ ”کچھ اور رہ گیا ہو تو بول دے۔“

ماری پر خفقان سا طاری ہوا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تم، تم جا رہے ہو دادا؟ ....“

”بچوں کا پتہ بول دے۔“ بتھل نے بھن بھناتے لہجے میں کہا۔

ماری سرتاپا لرزنے اور گھگھیانے لگی، ہاتھ جوڑ کے بولی۔ ”اُن کو کچھ مت بولنے کا ہے، ایک بات بھی نہیں۔ ابھی ہو سکے [تو] اُن کو لوٹا ہی نہیں رکھنے کا ہے، بول دینا، تمھارا ماں باپ دونوں مرگیا، کچھ بھی بول دینا۔ اپن نے بچہ لوگ سے ابھی تک اَکھا چھپا کے رکھا ہے، اُن کو نہیں بولا کہ اُن کا باپ پاڑا چلاتا ہے اور اپن ..... اُن کو کچھ نہیں پتہ۔ ابھی چھوٹا ہے، وہ لوگ یہ سب دیکھے گا اور سنے گا تو کچھ نہیں پڑھ سکے گا۔ اپن کے پاس اپن کے پاس ....“ ماری نے اپنے لباس میں کہیں چھپی ہوئی پوٹلی جیسی کپڑے کی ایک تھیلی نکالی اور بتھل کے قدموں میں ڈالتے ہوئے بولی کہ یہ اُس کی جمع پونجی ہے۔

”یہ کیا ہے؟“ بتھل نے تھیلی اُٹھا کے ہلائی۔ وہ زیورات ہی ہوں گے، سکے اور اشرفیاں وغیرہ، اُن کی جھنکار سے بتھل کی بھویں سکڑ گئیں۔ ماری نے بتھل کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑا کے بولی کہ یہ اتنا زیادہ نہیں ہے مگر یہی کچھ اُس کے پاس تھا۔ یہ مال چند سال ضرور اُس کے بچوں کی کفالت کر سکے گا۔

”اپنے پاس اِس کی کمائی نہیں ہے ری!“ بتھل نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ تھیلی واپس کر دیتا لیکن اُسے خیال آیا کہ حوالات میں ماری کو اِس سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔

ماری کہنے لگی کہ صبح اُن دونوں کو ختم کر دینے کے بعد وہ اپنے سینے میں بھی خنجر بھونک لیتی لیکن عین وقت پر اُس کا ہاتھ رُک گیا کیونکہ بتھل سے بات کرنے کے لیے اُسے کچھ دیر اور زندہ رہنا چاہیے تھا۔ وہ یہ باتیں کر رہی تھی اور اُس کی آواز تڑپ رہی تھی، اُس کا سارا وجود لرزاں تھا۔ کہنے لگی، دادا نے میرے اور بتھل کے بارے میں اُسے بہت کچھ بتایا تھا، ممبئی سے جانے سے پہلے اور آنے کے بعد بھی۔ دادا نے اُسے بتایا تھا کہ بتھل سے مل کے ایسا لگتا ہے جیسے کسی طویل خواب سے آنکھ کھُل گئی ہو۔ اپنے ادھورے پن کا احساس اُسے بتھل سے مل کے ہوا تھا۔ ماری وہی کچھ کہہ رہی تھی جو میرے اور بتھل کے بارے میں، پیرو کی زبانی سُن سُن کے پانڈے، سکندرا اور پاڑے کے دوسرے دادا ہم سے کہہ چکے تھے۔ آدمی چلا جائے تو یہ سارا شہد زہر بن جاتا ہے۔ پیرو نے ماری سے کہا تھا کہ اب وہ ایک بڑے کنبے والا آدمی ہے۔ ایک بھائی اور بیٹا ہی نہیں، اُس کنبے میں اس کے اور بھی کئی بزرگ، کئی بیٹے بیٹیاں ہیں اور اُس نے ماری سے کہا تھا کہ اگر سچ پوچھو تو اب اُسے پاڑے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ پاڑے کا کوئی انتظام کر کے وہ باقی زندگی بتھل کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا، اپنے خاندان کے ساتھ ایک راحت کدے میں۔ ماری نے اُس سے التجا کی تھی کہ پیرو اپنے اُس کنجِ عافیت میں کوئی گوشہ اُس کے لیے بھی محفوظ رکھے۔ اُسے بھی تو وہ اپنی بیٹی کہتا ہے۔ ماری نے اُس سے کہا تھا کہ وہ بھی

بہت تھک چکی ہے' اُس کا بس چلے تو وہ کہیں دُور چلی جائے۔ اُسے جارجی کی بھی ایسی پروا نہیں' وہ صرف اپنے بچّوں کے لیے خود کو وقف کر دینا چاہتی ہے تاکہ اُن پر ماں باپ کی چھوٹ نہ پڑنے پائے۔ پیرو نے ہامی بھری تھی کہ ماری کو بھی وہ قلابے سے اپنے ساتھ لے جائے گا مگر یہ سب کچھ آنے والے وقت پر منحصر ہے کہ وہ کتنی جلد پاڑے سے نجات پاتا ہے۔ یہ کنارہ کشی اتنی آسان نہیں تھی۔ ماری کے اصرار پر پیرو نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے اور تِھل کو لے کے اُس کے گھر آئے گا اور اُس کے ہاتھ کی بُھنی ہوئی مچھلی اور تلے ہوئے جھینگے کھائے گا۔ یہ چیزیں پیرو کو بہت مرغوب تھیں۔ ماری بزعمِ خود گنتی کے اُن چند لوگوں میں تھی جو پیرو کے گھر' اُس کی بیوی اور بیٹی کے بارے میں کچھ جانتے تھے حالانکہ وہ پیرو سے اتنے تعلقِ خاطر کے باوجود اُس کے گھر کبھی نہیں جا سکی تھی۔

ماری مسلسل رو رہی تھی۔ تِھل کمرے سے نکل گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے شکلا اور میں بھی۔ ماری کی سسکیاں ہمیں دُور تک سنائی دیتی رہیں۔

کمرے میں کئی افسران موجود تھے اور شور گونج رہا تھا۔ شکلا کو دیکھ کے سب کھڑے ہو گئے اور سنّاٹا چھا گیا۔ ہیڈ میز پر پہنچ کے شکلا درمیان کی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی ہدایت پر وہ سب کمرے سے چلے گئے تھے لیکن شکلا دیر تک ہماری موجودی سے اور اپنے آپ سے بھی بے خبر سا بیٹھا رہا۔ تِھل نے بھی زبان نہیں کھولی' بیڑی پھونکتا رہا۔ اردلی چائے کی ٹرے لے کے آیا تو شکلا کو کچھ ہوش آیا اور کرسی پر اُس کا بکھرا ہوا جسم سمٹ گیا۔ اردلی نے چائے بنانے کے لیے اُس سے اجازت طلب کی تھی۔ شکلا نے جھڑکنے کے انداز میں اُسے منع کر دیا اور خود اپنے ہاتھ سے پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ میں نے چاہا کہ اُس کے ہاتھ سے چائے دانی لے لوں لیکن میں سوچتا ہی رہ گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں اکڑے ہوئے تھے۔ میں انکار بھی نہ کر سکا کہ مجھے چائے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ اُس نے پیالی میرے آگے رکھی تو میں نے کسی معمول کی طرح تعمیل کی۔ شکلا نے چند گھونٹوں میں چائے ختم کر لی تھی۔ کرشنا جی کی طرح اُس کے چہرے سے بھی کسی تاثر کا اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں تھا لیکن بزرست جیسے اُس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ آدمی بہت سمندر ہے پر سمندر ہے نہیں۔ سمندر کا پیالہ بھی کبھی تنگ پڑ جاتا ہے۔ شکلا کی آنکھوں میں دُھند سی بھری تھی۔ چہرہ بھی جل سا رہا تھا۔

پھر دفعتہً جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ ا... کے آنے پر شکلا نے نام بہ نام کئی افسران کو طلب کیا۔ وہ باہر ... ہی کھڑے تھے۔ اِدھر اردلی گیا' اُدھر وہ کمرے میں داخل ہو... یہ وہی افسران تھے جنھیں کچھ دیر پہلے شکلا نے کمرے سے چلے ... کا حکم دیا تھا۔ اُس نے اُن سے کرسیوں پر بیٹھ جانے کو بھی نہیں ... اور منتشر لہجے میں ماری کے بارے میں پوچھا کہ کوئی تازہ رپور... ہو تو اُسے مطّلع کیا جائے۔ ایک پختہ کار افسر نے' جسے شکلا نے پا... کے نام سے مخاطب کیا تھا' ایک قدم آگے آ کے ٹھیری ٹھیری آ... میں بتایا کہ ماری کے گھر سے مزید کوئی قابلِ ذکر چیز برآمد نہیں ہو... مکان کے اِرد گرد سے پولیس کا پہرا ہٹا لیا گیا ہے تاہم چند سپا... پر مشتمل نفری مکان پر تعینات ہے۔ پاٹل کے پہلو میں کھڑے ... ایک دوسرے افسر نے درمیان میں دخل دیا اور مودّبانہ لہجے میں ... کہ پولیس نے گھر کے اندر تمام کارروائی مکمل کر لی ہے۔ جس کمرے ... خون ہوا تھا' اُس کا سارا فرش لتھڑا ہوا تھا۔ پولیس نے فرش ... کرا دیا ہے۔ گھر کی الماری کا تالا توڑنے پر پرانے طرز کی ایک بند... نکلی ہے' وہ استعمال کے قابل ہے لیکن اُسے استعمال نہیں کیا... صندوقوں اور مچان پر پڑے کاٹھ کباڑ کی تلاشی کے دوران مخ... قسم کے چند چاقو بھی برآمد ہوئے ہیں اور کارتوسوں کے ڈبے... اِس کے علاوہ ایک تمنچا' ایک بینجو' ہارمونیم اور شراب کی بوتل... دیسی ولایتی دونوں قسم کی۔ گزشتہ رات واردات والے کمرے... یقیناً شراب پی گئی تھی اور صرف دو ہی آدمی شریک تھے۔ کمرے... خالی بوتل کے ساتھ دو گلاس پائے گئے ہیں۔ سارے گھر میں ر... پیسے اور زیورات وغیرہ جیسی کوئی چیز پولیس کو نظر نہیں آئی۔ گ... تمام چیزیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ کسی جگہ بے ترتیبی کے آ... نہیں تھے اور گھر میں ضرورت کی تقریباً ہر چیز موجود تھی۔ سامان... اہلِ خانہ کی نفاست' حسنِ ذوق اور نظر... کا اندازہ کیا جا سک...

پولیس افسر ... میں مخاطب تھا۔ درمیان میں ...

کہیں ہندوستانی بھی اُس کی زبان پر آ جاتی۔ جانے کیوں بار بار... کی نظر مجھ پر اور تِھل پر منڈلاتی تھی اور اُس کی آواز دھیمی پڑ جا... اُس کے بیان کے مطابق ماری از خود پولیس اسٹیشن آئی تھی... کہہ رہا تھا' واردات کے وقت سے پولیس اسٹیشن آنے تک کے... کے دوران ماری گھر میں کیا کرتی رہی؟ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا... تاہم ایسا لگتا ہے کہ ماری نے خاصی دیر گھر ہی میں لگائی۔ اُس... روپے پیسے' زیورات وغیرہ کا کوئی انتظام کیا یا کچھ اور۔ ممکن ہے...

اسٹیشن آنے اور اعتراف کرنے کا فیصلہ کرنے میں اُسے کچھ دیر لگی ہو۔ خنجر پر ماری کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ کسی پڑوسی نے شور غل کی آواز نہیں سُنی۔ قیاس ہے کہ اوّل صبح جب جارجی اور وکی سو رہے تھے' کمرے بند کر کے ماری نے اُنھیں ختم کیا۔ دونوں گہری نیند اور گہرے نشے میں تھے۔ محلّے کے لوگوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پڑوسی' جارجی کے گھر سے دُور رہنے ہی میں عافیت سمجھتے تھے۔ گنتی کے چند پڑوسیوں کے سوا اُس کے گھر کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ جارجی کی وجہ سے وہ ماری سے بھی کنارہ کیے رہتے تھے حالانکہ اُن کی نظروں میں ماری کو ایک خوش وضع' دردمند اور مظلوم خاتون کا درجہ حاصل ہے۔ ماری کے بچے بہت سے پڑوسیوں نے نہیں دیکھے۔ کسی کے پوچھنے پر ماری نے بتایا تھا کہ اُس نے دونوں بچّوں کو اپنے ایک عزیز کے ہاں پونا بھیج دیا ہے۔ موجودہ مکان میں ماری اور جارجی کو رہتے ہوئے چند سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔ اِس سے پہلے وہ قلابے کے گنجان آباد عیسائی پاڑے میں رہتے تھے۔ وکی کے بارے میں بھی محلّے والوں کو کچھ علم نہیں' بس اتنا ہی کہ وہ کبھی کبھی اُسے جارجی کے گھر آتے جاتے دیکھتے اور گوا میں مقیم جارجی کے ایک رشتے دار کی حیثیت سے جانتے تھے۔ جس وقت محلّے والوں سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی' اُنھیں جارجی کے گھر میں ہونے والے کسی حادثے کا علم نہیں تھا۔ پولیس کو اپنے علاقے میں جارجی کے گھر پہ دیکھ کے وہ پریشان ہوئے تھے لیکن صرف جارجی کا گھر پولیس کا مرکز و محور تھا اِس لیے اُن کی تشویش' دہشت میں نہیں بدلی۔ اُن کے خیال میں جارجی کے ہاں کسی وقت بھی پولیس دستک دے سکتی تھی۔ اُنھوں نے صبح صرف ماری کو دیکھا جب وہ تھانے جانے کے لیے گھر سے نکلی۔ کسی کو اُس کی رفتار سے کوئی شبہ نہیں ہوا۔ اُس نے کئی پڑوسیوں کے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیا۔ وہ انھیں معمول کے مطابق پُرسکون اور خاموش نظر آئی۔

انسپکٹر کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر شکلا نے اُسے روک دیا اور ایک تیسرے افسر کی جانب انگلی اُٹھائی جو اپنے ساتھی کی خاموشی کا منتظر تھا۔ شکلا کو اُس سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اوسط عمر کے اُس افسر نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق وکی کے بائیں بازو پر چاقو کا ایک گہرا زخم لگا ہوا ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے میں یہ زخم تازہ نہیں' کئی دن پہلے کا ہے۔ دونوں مقتولین کو ایک ہی خنجر سے ختم کیا گیا ہے' ایک ہی لمحے میں' اور ایک وار پر اکتفا نہیں کیا گیا' پے در پے کئی وار کیے گئے کہ دونوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا اور اُنھوں نے کم و بیش ایک ہی وقت آخری سانسیں لیں۔ انسپکٹر نے شکلا کو بتایا کہ ڈاکٹروں کی حتمی رپورٹ کا انتظار ہے اور بظاہر کسی پیچیدگی کا امکان نہیں ہے۔

شکلا کے استفسار پر پختہ کار افسر نے بتایا کہ قلابے کے پاڑے سے جارجی کے کئی ساتھی حراست میں لے لیے گئے ہیں لیکن باقاعدہ تفتیش ابھی شروع نہیں کی گئی ہے۔ شکلا نے اُس سے کہا کہ ٹامی نامی گوا کے ایک نوجوان دادا کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ ہو سکتا ہے' وہ گوا کی طرف نکل گیا ہو اور گزشتہ تین دنوں کے چھاپوں میں گرفتار ہو گیا ہو۔ وہ کہیں بھی نظر آئے' اُسے حراست میں لے لیا جائے۔ اگر وہ پہلے سے پولیس کی تحویل میں ہے تو اُسے قلابے کے تھانے منتقل کر دیا جائے۔

"یہ کون ہے جناب؟" پاٹل نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ بھی؟"

"نہیں۔" شکلا نے تندی سے کہا۔ "احتیاطاً کوئی حرج نہیں ہے۔" پھر شکلا نے خود ہی تردید کی۔ "یہ شخص بھی ایک کڑی ہے پاٹل اور پولیس کو شدت سے مطلوب ہونی چاہیے۔ فی الحال اتنا ہی سمجھو۔"

تینوں افسر دروازہ عبور کیا چاہتے تھے کہ شکلا کی آواز پر ٹھیر گئے۔ شکلا نے پاٹل کو مخاطب کر کے ماری کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ اُسے کسی دوسرے روشن اور ہوادار کمرے میں منتقل کر دیا جائے نیز ماری سے متعلق عدالت میں داخل کیے جانے والے تمام کاغذات پہلے شکلا کے سامنے پیش کیے جائیں۔

تینوں افسروں کے چہرے کھنچ گئے تھے تاہم اُنھوں نے مستعدی سے سر ہلایا اور کمرے سے نکل گئے۔

لمحے گزر گئے۔ اُن کے جانے کے بعد شکلا ساکت بیٹھا رہا... میری نظریں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ خاصی دیر ہو گئی تو تِھل نے دھی... آواز میں کہا۔ "اپنی چھٹی کرو صاحب۔"

"ہاں ہاں۔" شکلا سٹ پٹا سا گیا۔ "ٹھیک ہے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "آپ لوگ کو اب جانا چاہیے۔"

"بولو گے تو پھر آ جائیں گے' نہیں تو آدمی بھیج دینا۔"

شکلا نے جواب نہیں دیا' کچھ سوچتا رہا۔ تِھل اُٹھنے لگا تو شکلا اضطراری لہجے میں بولا۔ "ایک منٹ ٹھیرو دادا!"

تِھل کرسی پر دوبارہ بیٹھ گیا۔

"دادا! وہ کہتی ہے' اُسے یقین تھا کہ پیرو کو ختم کرنے والے وہی دو تھے۔ یہ خون اُس کے یقین کا ثبوت ہیں لیکن دادا! اُ... کا یقین غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"پر آپ کیا کرلوگے؟"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" شکلا تیزی سے بولا۔ "لیکن دادا کے قاتل پھر رہ جاتے ہیں اور پولیس کا کام ختم نہیں ہوتا، سمجھے دادا!"

"پولیس کا کام تو کبھی ختم نہیں ہوتا۔" بھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "پھر آپ لوگ کا کیا ہوگا۔"

"ہونہہ! یہ بھی ٹھیک بولتے ہو دادا!"

"تھوڑا دھیان دیں تو ایک بات بولیں صاحب؟" بھل نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

"کیا، کیا بات ہے دادا؟"

"ہوسکے تو آپ اندھیری کے راجن دادا کو چھوڑ دو۔"

مجھے بھی حیرت ہوئی، شکلا بھی چونک پڑا۔ "راجن؟ کون راجن؟"

"اندھیری میں شیلا نام کی جس عورت کے خون میں اُس کو اندر رکھا گیا ہے۔"

"ہاں ہاں، لیکن اُس کا اِس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"سمجھیں تو بہت نکل سکتا ہے۔"

"کیا مطلب! صاف صاف بولو دادا!"

"سب صاف ہے صاحب! ابھی پولیس نے اُس کا کھوج کب لگایا ہے۔"

"ہاں، نہیں لگا سکی ہے لیکن پولیس نے اندھیری کے علاقے سے اور گرفتاریاں کی ہیں۔ وہ کچھ کم اُلجھا ہوا معاملہ نہیں ہے مگر مگر...." شکلا بپھری ہوئی آواز میں بولا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ختم ہونے سے پہلے پیرو دادا تین چار دن سے اُدھر اندھیری میں تھا۔ اندھیری کا پاڑا ماہم کے پاڑے سے جُڑا ہوا ہے۔ دادا کو پتہ لگنے پر اُدھر جانا تھا۔ آپ شاید جانتے ہیں، پاڑوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"آگے بولو دادا!"

"دادا نے اُدھر پہنچ کے ساری گھوما پھری چھانا پھٹکی کی تھی اور تھانے جاکے بولا تھا، راجن کبھی ایسا نہیں کرسکتا۔ راجن کوئی زنخا بھنڈیلا نہیں ہے جو ایک عورت پر ہاتھ اُٹھائے۔ جس ٹائم راجن کی رکھیل کا خون ہوا، راجن اُس کے پاس نہیں تھا۔"

"مجھے یہ کیس کسی حد تک معلوم ہے۔ معلوم بھی ابھی، پیرو یا چھی کیس کی چھان بین کے دوران ہوا۔ تم ٹھیک کہتے ہو، پیرو دادا تین چار دن سے اندھیری میں تھا اور اُس نے راجن کو بے گناہ قرار دینے کی بہت کوشش کی تھی۔ وہ بار بار پولیس سے یہی کچھ کہتا رہا۔

اُس نے چند ایسے لوگوں کے نام ثبوت کے طور پر بتائے جنھوں نے راجن کو اُس رات اُس کے گھر سے باہر دیکھا تھا۔"

"اُس رات راجن اپنی رکھیل کے ساتھ گھر پہ ہی تھا صاحب!"

شکلا کرسی پر سیدھا ہوگیا۔

"پر کوئی حرام کا.... اُدھر دہائی دیتا ہوا آیا اور راجن کے پرانے اسامی کسی سیٹھ ساہوکار کا نام لے کے بولا، اُس کے ہاں چکر ہوگیا ہے اور پولیس آئی پڑی ہے۔ یہ سُن کے راجن اُلٹا ہوگیا۔ رکھیل سے بول کے باہر کو نکلا۔ اُدھر سیٹھ کے ٹھکانے پہنچا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ لوٹ کے رکھیل کے پاس آیا تو وہ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔"

"راجن یہی کہانی سناتا ہے۔" شکلا نے برہمی سے کہا۔ "سیٹھ کے آدمی بھی یہی کہتے ہیں کہ اُس رات راجن گھبرایا ہوا سیٹھ کے گھر آیا تھا، وہاں سناٹا دیکھ کے گالیاں بکتا لوٹ گیا۔ پولیس کو اِس کہانی پر یقین نہیں ہے۔ اِسی بیچ اُس عورت کا قتل ہوا۔ سیٹھ کے ہاں ہنگامے کی خبر سُن کے گھر سے نکلنے اور گھر واپس آنے کا عرصہ اتنا کم ہے کہ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ایک بالکل اجنبی آدمی کے آنے پر راجن کچھ سمجھے سوچے بغیر گھر سے نکل جاتا ہے۔ آدمی سے کچھ پوچھتا پاچھتا اور روک کے ساتھ چلنے کو نہیں کہتا۔ بہرحال پولیس نے عدالت میں یہ کیس پیش کردیا ہے۔ راجن چھوٹ بھی سکتا ہے، سزا بھی پاسکتا ہے۔"

"پر وہ راجن نہیں تھا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو، کس بنیاد پر؟"

"راجن کو ہم نہیں جانتے پر وہ پاڑے کا دادا ہے، اندھیری کے پاڑے کی گدی کا دادا۔ ایسے ہی کوئی پاڑے کی گدی پر نہیں بیٹھ جاتا۔ پیرو دادا نے ہم کو اُس کے بارے میں سارا بولا تھا۔ دادا ہم سے جھوٹ نہیں بول سکتا اور شاید ہم آپ سے۔ آپ عدالت بھی نہیں ہو جو ہم کو کانٹے پر رکھ کے زبان کھولنی پڑے۔ راجن اپنی رکھیل کو بیوی کی طرح رکھتا تھا۔ اُس کو ختم کرنے کے لیے راجن کے پاس آدمی لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ راجن کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو خبر سُن کے گھر میں نہیں رُک سکتا تھا۔ وہ اُس آدمی کو نہیں جانتا تھا پر جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کوئی بھی آدمی اُسے خبر دینے آسکتا تھا۔ اُس کو روک کے اور آگے پیچھے کا جان کے گھر سے نکلنے والا کوئی اور ہوتا صاحب! پاڑے کا دادا نہیں ہوتا۔ دادا اپنے بل پہ پھرا کرتا ہے، گھر میں چھپ کے نہیں بیٹھ جاتا۔ زیادہ دُوری نہیں تھی اور آدمی نے نام ایسے سیٹھ کا بولا تھا کہ راجن کو گھوم جانا تھا۔ اپنی رکھیل

سے بول کے وہ گھر سے نکلا اور جلدی لوٹ آیا۔ آیا تو سارا بگڑا ہوا تھا۔ راجن کو پھر کیا کرنا تھا صاحب؟"

شکلا بھل کی صورت دیکھتا رہا اور کسمساتی آواز میں بولا۔

"راجن کو پاس پڑوس کو جگانا چاہیے تھا۔"

بھل نے اُس سے کہا کہ شور مچا کے راجن تماشا بناتا اور لوگوں کو شہادت میں شامل کرنے کی کوشش کرتا۔ کیا اِس طرح وہ الزام سے بری ہوجاتا؟ راجن کو سب جوں کا توں رہنے دینا چاہیے تھا، کوئی چیز چھیڑنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ محلے میں ہنگامہ نہیں کرتا۔ مشکل دقت میں پاڑے کے دادا کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ راجن کو بہت اہم فیصلہ کرنا تھا۔ ایک دادا کی طرح اُس نے ضبط اور حوصلے کا ثبوت دیا اور یہی مناسب سمجھا کہ اپنے پاڑے جاکے پہلے اپنے آدمیوں کو بتائے پھر پولیس کو خبر کرے۔ راجن نے یہی سوچا تھا کہ پولیس نے پھندا ڈال دیا۔

"مگر پولیس نہیں سمجھتی کہ راجن گھر سے نکلا تھا۔ سیٹھ کے آدمی اُس کے خلاف گواہی نہیں دے سکتے۔ پولیس کا خیال ہے کہ نہ کوئی آدمی آیا، نہ راجن کسی سیٹھ کے ہاں گیا، نہ وہاں سے لوٹ کے گھر آیا۔"

"تو پولیس کو کیسے پتہ چلا صاحب!" بھل نے زہرخند سے کہا۔

"پولیس کو!" شکلا پہلو بدلنے لگا۔ "مجھے علم نہیں کہ پولیس کو اِس واردات کا کب اور کیسے علم ہوا۔"

"اپنے کو پتہ ہے۔" بھل نے سرد لہجے میں کہا کہ راجن کے جانے کے بعد کسی نے شور مچا کے محلے والوں کو متوجہ کیا کہ اندر گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔ اُس نے چیخیں سُنی ہیں اور گلی میں ایک شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ راجن کی طرف اشارہ نہ کرتا تو بھی اُس کا شور مچانا ہی کافی تھا۔ حواس باختہ پڑوسی گھروں سے باہر نکلے۔ اُنھوں نے اُس عورت کے گھر پہ دستکیں دیں۔ جواب نہیں ملا تو اُنھوں نے کسی گشتی پولیس والے کو ڈھونڈا، سارا ماجرا اُسے سُنایا اور یوں وہ گھر میں داخل ہوئے جہاں معاملہ کچھ اور تھا۔

"ہاں، شاید یہی کچھ پیش آیا۔" شکلا تذبذب سے بولا۔

"وہ لمبے کان والا.... کا جنا کون تھا جس نے فیل مچا کے پاس پڑوس کی نیند چوپٹ کی۔ کسی کو اتنی جلدی پتہ چل گیا کہ اِدھر اندر سے خون کی بو آتی ہے۔ پڑوسی لوگ بولتے ہیں، اُن لوگ نے کوئی شور شرابا نہیں سُنا، سڑک پر چلنے والے نے سُن لیا؟"

شکلا مضطربانہ انداز میں سر ہلانے لگا۔ بھل نے اُس سے کہا کہ واویلا کرنے والے راہ گیر نے اپنی چیخ پکار پر گلی میں اکٹھے ہونے والے پڑوسیوں کو بتایا کہ اُس نے فلاں گھر سے چیخیں سُنی ہیں اور گلی میں ایک آدمی کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی بیک وقت یا چند لمحوں کی تاخیر سے دونوں کام ہوئے، چیخ سننا اور گلی میں آدمی دیکھنا۔ اُس نے چیخ پہلے سُنی یا آدمی پہلے دیکھا؟ اُس نے پہلے آدمی دیکھا اور چیخ بعد میں سُنی تو گویا عورت اُس وقت زندہ تھی اور راجن ایک عورت کو زخمی کرکے گھر سے بھاگ رہا تھا اور بالفرض راہ گیر نے چیخ پہلے سُنی جب وہ گھر سے کچھ فاصلے پر تھا اور راجن کو گھر سے نکلتے ہوئے بعد میں دیکھا جب راہ گیر گھر سے کچھ قریب ہوچکا تھا تو اُس نے راجن کا نام نہیں لیا، وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ پڑوسیوں کی نظر میں اُس عورت کے حوالے سے وہ راجن کے سوا کون ہوسکتا ہے مگر وہ راجن ہی کیوں ہو؟ اور اگر فرض کرلیا جائے کہ راہ گیر نے راجن کا نام بھی لے دیا تھا۔ کسی خوف سے اُس نے راجن کے دُور چلے جانے کا انتظار کیا تب شور مچایا مگر وہ خود کہاں چلا گیا؟ کیا وہ پولیس کو دستیاب ہوگیا؟ پڑوسیوں نے اُسے کہاں کھو دیا؟ وہ اُنھیں جگا کے پھر کہاں غائب ہوگیا؟ اُسے کسی نے تلاش کیا؟

بھل چپ ہوگیا اور نئی بیڑی سلگا کے کش لینے لگا۔

"تم، تم پھر کیا سمجھتے ہو دادا؟" شکلا بے چینی سے بولا۔

"آپ وردی والے ہو اور بڑے افسر ہو۔ آپ کو ہم سے زیادہ چھلنی کرنا آتا ہے۔ ہم آگے کیا بولیں۔"

"مَیں نے تمھیں بتایا ہے دادا کہ میں اِس کیس سے اتنا باخبر نہیں ہوں لیکن اگر اِس کا تعلق پیرو دادا سے نکلتا ہے تو میں جاننا چاہوں گا۔ تم بولو دادا!" شکلا کی آواز میں اصرار شامل تھا۔

بھل نے اُسے بتایا کہ رات کا وقت تھا، گلی سنسان ہوچکی تھی۔ راجن چپکے سے گھر سے نکل جاتا تو باقی رات بھی گزر جاتی۔ صبح ہوجانے پر کسی کو معلوم ہوتا مگر اُسی وقت کسی نے شور کیوں مچایا؟ اس لیے کہ وہ راجن کو لاش غائب کرنے اور کوئی فیصلہ کرنے کی مہلت دینا نہیں چاہتے تھے۔ راجن کو وقت مل جاتا تو وہ ایک ہی رات میں سارا نقشہ بدل سکتا تھا۔ وہ راجن سے خوب واقف تھے۔

شکلا میز پر کچھ اور جھک آیا۔ بھل نے کہا کہ پولیس نے ضرور کسی دوسرے امکان پر غور کیا ہوگا لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تو اُس نے راجن ہی کو غنیمت جانا تاہم علاقے میں چھاپے اور دوسری گرفتاریوں سے یہ مراد ہے کہ پولیس کا یقین متزلزل ہوا ہے۔ پولیس کو کوئی آلہ بھی گھر سے دستیاب نہیں ہوا۔ وقت کا تعین بھی مشکل ہے اور کوئی چشم دید گواہ بھی نہیں ہے۔

"تمھارے خیال میں پھر وہ کون تھے؟" شکلا نے بے تابانہ پوچھا۔

"اب بھی آپ پوچھتے ہو، وہ کون تھے صاحب!" ٹھل نے ناگواری سے کہا۔ "اُن کو پتہ تھا کہ راجن کس ٹائم کو عورت کے پاس جاتا ہے، کب تک اُدھر پڑا رہتا ہے۔ کون سے سیٹھ سے اُس کا لاگ الاپ ہے جس کے وہاں ٹنٹے کی ہوائی سُن کے اُس کی کھوپڑی اُلٹ سکتی ہے اور اُس کا جیل جانا دادا کتنا دل پر لے سکتا ہے، کیا مرکھنا ہو سکتا ہے۔"

ٹھل نے شکلا کو بتایا کہ وہ پیرو کے مزاج آشنا تھے، پیرو کی ذمّے داری تھی کہ وہ اپنے زیرِ نگیں اندھیری کے پاڑے پر فوراً جائے اور صورتِ حال سمجھے اور اُسے قابو میں کرنے کی کوشش کرے۔ کسی پاڑے کے بھتّے میں حصّے دار بننے کا مطلب اُس پاڑے پر آنے والی کسی آفت میں شرکت بھی ہے، اُسے ہر ممکن تحفظ کی ضمانت دینا چناں چہ راجن کے دفاع کے لیے پیرو کا اپنے پاڑے سے باہر نکلنا لازم تھا۔ وہ پیرو کو منتشر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اُسے اپنے پاڑے سے باہر نکلنے اور اُس کے معمولات میں رخنہ ڈالنے میں۔ پیرو اندھیری پہنچ کے مسلسل دوڑ بھاگ کرتا رہا۔ اُس کے کام بہت سے تھے، ایک طرف اندھیری کے پاڑے کے دل شکستہ اور برگشتہ لوگوں کی لگام کھینچے رکھنا، علاقے میں اصل واقعے کے شواہد ڈھونڈنا، پولیس سے راجن کی وکالت کرنا وغیرہ وغیرہ! ادھر اُنھوں نے طرح طرح کی افواہیں پھیلا کے اُسے سکون سے نہیں بیٹھنے دیا۔ پیرو کی نظر میں اگر راجن کا جرم ثابت ہو جاتا تو اُس کا اندھیری میں تادیر ٹھیرے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اُس کا کام کسی نئے دادا کی تقرری پر ختم ہو جاتا لیکن راجن کی روداد میں اُسے بہت سارا سچ نظر آیا اس لیے پیرو کو زیادہ تگ و دو کرنی پڑی۔ اچھا پھل برآمد ہونے کی امید آدمی کی کوشش بڑھا دیتی ہے۔ یقیناً پیرو نے پہلے اندھیری کے پاڑے پر راجن کے ساتھی ٹٹولے ہوں گے، پھر علاقے کے سیٹھ ساہوکار چھانے ہوں گے جن سے راجن کے خاص مراسم تھے یا جو راجن سے خار کھاتے تھے۔ کسی اور جانب بھی اُس کی نگاہیں بھٹکتی رہی ہوں گی۔ یہ پیرو کے لیے، شہر کے سب سے بڑے دادا کی حیثیت سے وقار کا مسئلہ تھا اور خود اُس کے اپنے دل کے اطمینان کا بھی۔

ایک اور وجہ بھی تھی۔ بمبئی سے پیرو کی عدم موجودگی کے دوران تین پاڑے سرکشی اختیار کر چکے تھے۔ اندھیری کا پاڑا بھی اُن میں شامل تھا اور گو سبھی پیرو کی واپسی پر دوبارہ ماہم کے پاڑے سے وابستہ ہو چکے تھے لیکن اُن میں اپنا اعتماد بحال کرنے بلکہ فزوں کرنے اور شہر کے دیگر پاڑوں کو یہ باور کرانے کے لیے کہ پیرو ایک حقیقت ہے اور اُس سے مفر ممکن نہیں، راجن کے معاملے میں کی سرگرمی ایک فطری واقعہ ہے مگر اُسے کیا اندازہ تھا کہ وہ خود نرغے میں آ چکا ہے، گلی کے کتّوں نے ایکا کر لیا ہے اور گھات لگائے اُس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ جنگل کے شیر کو اُس کے پس خوردہ پلے ہوئے بھیڑیے حیلے ہی سے مار سکتے ہیں۔ وہ بس کسی ایک موقع کی تلاش میں تھے۔ اِس کام میں اُنھیں دیر بھی لگ سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے اُن کے ذہن میں کچھ اور بھی ہو لیکن اُنھیں ماہم کے پاڑے پر کسی سے معلوم ہو گیا کہ آج رات کانتے کا چالیسواں ہے اور پیرو جولین کے گھر باندرے جا سکتا ہے۔ پیرو نے شرکت کا مشروط وعدہ کیا تھا کہ آ سکا تو آ جائے گا مگر اُس نے کسی طرح وقت نکال لیا کیوں کہ کانتے کی بات تھی۔ اُدھر وہ اندھیرے میں پھن کاڑھے اُس کی واپسی کی راہ تکتے رہے۔ ماچھی پیرو کے ساتھ تھا۔ اِس سے بہتر صورت اُن کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔

"تمھارا مطلب ہے جارجی اور وکی؟" شکلا ہکلاتے ہوئے بولا۔

"جارجی تو سُور کا..... ماہم کے پاڑے پر پڑا ایندھ رہا تھا؟" ٹھل کی آواز اکڑ گئی۔ اُس نے شکلا کو بتایا کہ وکی اور ٹامی کے علاوہ دوسرے بھی ہو سکتے ہیں جو ممکن ہے، یہاں کے نہ ہوں، گو اسے اُن کے ساتھ آئے ہوں اور ماری بھی اُنھیں نہ جانتی ہو۔ کسی اور کا نہیں، پیرو دادا کا معاملہ تھا، اُن کی تعداد زیادہ بھی ہو سکتی ہے مگر بہت زیادہ نہیں۔ راجن نے جارجی کی دیکھا دیکھی، جارجی کی شہ پر ماہم کے پاڑے کا بھتّا بند کر دیا تھا لیکن جیسے ہی اُسے پیرو کی واپسی کی خبر ملی، وہ رقم لے کے آ گیا اور اُس نے پیرو کے پیر پکڑ لیے۔ راجن کی یہ ہزیمت جارجی کے لیے دل شکنی کا باعث ہو گی کہ ایک اور بُت ٹوٹ گیا۔ راجن کی محبوب عورت کے قتل کا سبب راجن سے عناد نہیں تھا۔ جارجی کو معلوم تھا کہ راجن کے پاس دوسرا راستہ بھی ہے، وہ بدنصیب تو چارہ بن گئی۔ اندھیری کا انتخاب اُنھوں نے خوب سوچ سمجھ کے کیا تھا۔ ماہم سے اندھیری کا فاصلہ خاصا ہے۔ قلابے سے اور زیادہ۔ پولیس اُن سے دُور ہی رہے گی اور اُنھیں راجن کی رکھیل جیسی کسی اجنبی عورت ہی کو منتخب کرنا چاہیے تھا۔ ایک ایسی عورت جس کا تعلق کبھی بازار سے رہا ہو اور متعدد آشناؤں سے ربطِ خاطر۔ اُس عورت سے جارجی اور وکی کا کوئی رابطہ یا واسطہ نہیں ہو گا۔ وہ کبھی راجن کے گھر بھی نہیں گئے ہوں گے۔ عورت سے کہانی ہی کچھ اور سمجھ میں آتی ہے۔ پولیس کرداروں کو کھوجتی رہے، پس منظر کے لیے ماپتی

ہے۔ اندھیری ہی کے علاقے میں راجن کے ساتھیوں، اڑوسیوں پڑوسیوں کو نوچتی رہے اور راجن کے سر پر تلوار لٹکی رہے اور پیرو بھی اندھیری میں گلی گلی بھٹکتا، سر پٹکتا رہا ہے۔ اندھیری میں پیرو کی آمد راجن کے دفاع کے لیے اُس کی بے تابیوں سے پولیس اچھی طرح واقف تھی۔ وہ اندھیری کے علاقے میں راجن کے حریف ڈھونڈ رہا تھا اور اُس نے راجن کے جرم پر پولیس کا یقین پھیکا کر دیا تھا۔ پولیس جانتی تھی کہ یہ بات راجن کے بدخواہوں، اُس عورت کے قاتلوں کے لیے کتنے تردد کا سبب ہو گی۔ سو اُنھوں نے اپنے گریبان تک پیرو کے ہاتھ پہنچنے سے پہلے ہی اُس کا کام تمام کر دیا۔ ایسی صورتِ حال میں پولیس کو یہی قیاس کرنا چاہیے۔ جارجی اور وکی پر آنچ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جارجی مستقل ماہم کے پاڑے پر رہا اور وکی کو بمبئی کی پولیس جانتی نہیں تھی۔

ٹھل خاموش ہو گیا۔ شکلا کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں مگر ابھی یہی حال تھا۔ ٹھل بیڑی پیتا رہا۔ شکلا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو ٹھل نے اجازت مانگی۔

"نہیں دادا! ابھی بیٹھو۔" شکلا ٹھٹھری ہوئی آواز میں بولا۔

"ہو سکے تو ایک چائے اور منگوا دو صاحب!"

"ہاں ہاں ضرور، کیوں نہیں۔" شکلا نے گھنٹی بجائی۔ اردلی کے آنے پر اُس نے تیز تیز لہجے میں چائے لانے کا حکم دیا اور ٹھل سے پوچھا کہ اُسے کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ ٹھل نے انکار کر دیا۔ پھر اُس نے مجھ سے پوچھا، ابھی مَیں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ وہ چونک کے بولا: "کھانے کا وقت بھی ہو چکا ہے، بلکہ گزر رہا ہے۔ مجھے دھیان ہی نہیں رہا۔"

"نہیں صاحب! مہربانی۔" ٹھل نے نرمی سے کہا۔

"گھر اتنا دُور نہیں ہے۔" شکلا جھجکتے ہوئے بولا: "ہم موٹر میں جائیں گے۔"

"اپنے کو بھوک نہیں ہے صاحب!"

"سچ پوچھیے تو مجھے بھی نہیں ہے۔"

شکلا نے اصرار نہیں کیا اور کہنے لگا: "کچھ اور تو نہیں رہ گیا ہے دادا؟"

"یہ تو آپ بولو صاحب!"

"نہیں دادا! شاید کچھ بھی نہیں۔" شکلا کی آواز پر افسردگی چھا گئی: "یہ سب کچھ میرے لیے ایک تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"ابھی تو لمبی پڑی ہے صاحب!" ٹھل نے تنک کے کہا۔

"پر کبھی جی کرتا ہے کہ بہت مختصر ہو جائے۔" شکلا شکستہ لہجے میں بولا: "یہ قلابے کا دادا جارجی تو پیرو دادا کا بنایا ہوا تھا۔"

"بنایا تھا پر شرط نہیں ہے صاحب! اوپر والے کے ساتھ بھی ایسا ہے۔"

شکلا پلکیں جھپکانے لگا۔

"وہ دادا نہیں رہے تھے صاحب!" ٹھل نے کہا: "اڈّے پاڑے کا دادا اور ہوتا ہے۔"

"وہ کیسا ہوتا ہے؟"

ٹھل نے کہا کہ دادا لوگ کبھی ایک دوسرے کو ایک پل نہیں بھاتے پر بل بُوتا نہ ہو تو اپنے حریف کو ٹھکانے لگانے کے لیے طرح طرح کے حربے اختیار کرتے ہیں۔ ٹھل کے بہ قول اوپر کی لڑائی لڑتے ہیں، شطرنج کی بازی کھیلتے ہیں لیکن وہ بندوق تان کے پیٹھ پیچھے سے وار نہیں کرتے، جو ایسا کرتے ہیں، وہ دادا کے بھیس میں چور اچکّے اٹھائی گیرے ہوتے ہیں۔ کسی دادا کو اُٹھائی گیرا بننے میں دیر نہیں لگتی، دادا بننے میں عمر لگ جاتی ہے۔ دادا تو بہت کم ملتے ہیں اور اُنھی کے دم پہ پاڑا اڈّا چلتا ہے۔ داداگیری الگ چیز ہے، دادا ہونا الگ۔

شکلا انہماک سے سُنتا رہا اور بے کلی سے بولا: "لیکن دادا! ایسی کیا بات تھی جو جارجی اس حد تک، میرا مطلب ہے، اتنی دُور چلا گیا۔ ایسا مشتعل..... ماری کی اور تمھاری باتوں سے۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو چکا ہے لیکن.....؟"

"دھندے میں پڑنے والا دادا، دادا نہیں رہتا صاحب!" ٹھل نے بھڑکتی ہوئی آواز میں کہا: "دادا لوگ بہت اُلٹ پھیر کرتے ہیں پر عورت نہیں چلاتے۔ دھندے میں پڑنے والا اور مال

بنانے والا دادا بچھو بن جاتا ہے۔ جارجی نے پہلی بار دھن دولت دیکھی تھی۔" تجھل نے شکلا سے کہا کہ دھن دولت میں دارو کا سا زور ہے، جتنا پیتے جاؤ، نشہ بڑھتا ہے لیکن پاڑے کے دادا کا نشہ اُس کا بَل ہے۔ دولت اڈّے پاڑے کی ضد ہے اور بَل کے لیے زہر ہے۔ سانپ کی طرح بَل کو جکڑ لیتی ہے۔ پاڑے میں آدمی مال بنانے نہیں آتا ورنہ سارے اڈّے پاڑے جوہری بازار ہوتے اور اُن کی جگہ محل دو محلے کھڑے ہوتے۔

"مگر دولت بھی بڑی طاقت ہے دادا بہت زور ہوتا ہے اُس میں۔" شکلا نے بے ربطی سے کہا۔

"ہوتا ہے صاحب! بہت ہوتا ہے پر اپنا بَل نہیں رہتا، مانگے کا، پرائے جیسا۔ آدمی اپنا بھی کھو دیتا ہے۔ ڈوری کہیں بھی نہیں ٹوٹتی۔ آدمی بھاگتا رہتا ہے، ساری سمیٹ لینے کو۔ دولت کا مطلب ہے، آدمی صرف اپنا ہو گیا۔ پاڑے کا آدمی ایک اپنا ہی نہیں ہوتا۔ آپ نہیں سمجھو گے صاحب!" تجھل نے تندی سے کہا۔

"مَیں سمجھ رہا ہوں دادا اور..... اور سمجھنا چاہتا بھی ہوں۔"

تجھل نے کہا کہ وکی نے جارجی کی آنکھوں میں چربی بھر دی تھی۔ جارجی کی عمر اتنی پختہ نہیں تھی اور عمر سے ایسا فرق بھی نہیں پڑتا۔ آدمی خود کچا ہو تو ماہ و سال کی گردش بھی کچھ کر نہیں پاتی۔ تجھل نے شکلا کو بتایا کہ ممبئی سے پیرو کی سات آٹھ ماہ کی عدم موجودی کے باعث جارجی نے اپنے ایک نوجوان رشتے دار وکی کی تحریک اور اعانت سے تلابے کے ساحل پر جوئے، شراب اور عورتوں کا خفیہ اڈّا کھول لیا تھا۔ یہ سمجھ کے کہ پیرو کہیں مر کھپ گیا ہے۔ اُس نے ماہم کے پاڑے سے بھی ناتا توڑ لیا۔ ممبئی واپس آنے پر پیرو کو جیسے ہی خبر ملی، وہ جارجی کے سر پہ پہنچ گیا اور اُس کی خوب گوشمالی کی کہ یہ حرکت کسی دادا کا شیوہ نہیں ہے۔ جارجی کو اڈّا فوراً بند کرنا پڑا اور دوسرے دن اُس نے ماہم کے پاڑے آ کے خود کو میرے سپرد کر دیا اور پیرو کی زندگی تک بیشتر پاڑے پر بیٹھا ہوا عاجزی کرتا رہا۔ بگڑا ہوا دادا کتا بن جاتا ہے پھر اس کے لیے کوئی سمت، کوئی راہ بند نہیں ہوتی۔ پیرو دادا کو اُسی رات اُس کی آنکھیں نکال لینی چاہیے تھیں۔ پیرو نے اُسے چھوڑ دیا، بعد میں وہ پاڑے آیا تو بھی اُس کا خیال آیا۔ ایسا نہیں تھا کہ پیرو اُسے اندر باہر سے جانتا نہ ہو۔ یقیناً پیرو نے ماری کی خاطر اُسے چھوٹ دی تھی اور سمجھا تھا کہ لوٹ پیٹ کے ایک دن ٹھیک ہو جائے گا۔ بیٹھا تو وہ مستقل پاڑے ہی پر ہے۔ داداؤں کو یہ رعایتیں راس نہیں آتیں لگتا ہے، پیرو ابتدا ہی سے اُسے ماری کی رعایت دیتا رہا تھا جو بھی گدی پر بٹھا دیا۔ کچا دادا کچے لوہے کی طرح پگھل جاتا ہے۔ پیرو کے بل وہ چلتا رہا۔ سب کو معلوم تھا کہ پیرو دادا سے اس کا کیا تعلق ہے۔

اردلی نے چائے لا کے رکھ دی۔ تجھل کے منتشر ہونے کے خیال سے شکلا نے ٹرے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ تجھل خاموش ہو گیا تو اُس نے چائے بنائی۔ پیالی خالی کرتے ہی تجھل اُٹھ کھڑا ہوا۔ شکلا بھی گھبرائے ہوئے انداز میں کرسی سے اُٹھ گیا۔ وہ ہمیں اور روکنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچ کے رہ گیا اور ہمارے ساتھ ہی دروازے سے باہر نکلا۔ کمرے کے باہر موجود افسران اور سپاہی شکلا کو دیکھ کے اِدھر اُدھر سمٹ گئے۔ شکلا ہمارے ساتھ چلتا رہا۔ "آپ بیٹھو صاحب!" تجھل نے چبوترے کی سیڑھی سے اُتر کے کہا۔ "ہم چلے جائیں گے۔"

"نہیں دادا! آپ جیپ میں بیٹھو۔" وہ قریب کھڑی ہوئی جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ آپ کو چھوڑ آئے گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں صاحب!"

"بیٹھ جاؤ دادا!" شکلا کا لہجہ گزارشانہ تھا۔ "مَیں نے آپ لوگوں کو بلایا تھا۔"

"آپ کسی ٹائم بھی حکم کر سکتے ہو، آپ کی ڈیوٹی ہے۔"

"نہیں دادا! ایسا مت کہو۔" شکلا کی آواز تمتا رہی تھی۔ اُس نے تجھل کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔ "بہت بوجھ تھا سر پہ دادا!"

"اپنے کو پتہ ہے صاحب!"

"جیسے ہی تھانے میں ماری کے آنے کی خبر ملی، میں سیدھا پیرو دادا کے گھر گیا تھا۔ وہاں جولین سے معلوم ہوا کہ آپ لوگ دس منٹ پہلے نکل گئے ہیں۔ میرا پاڑے آنا شاید ٹھیک نہیں تھا۔"

"وہ آپ کی جگہ نہیں ہے۔"

"پر اب پاڑا دیکھنے، پاڑے پہ آنے کو جی چاہتا ہے۔"

"اُدھر آدمی لوگ ہی ہوتے ہیں صاحب!"

"ہاں ہاں دادا!" شکلا بے قراری سے بولا۔ "اُنھی کو دیکھنے، اُنھی کو دیکھنے۔"

"ضرور آؤ صاحب!" تجھل کے لبوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ وہ ڈنڈا پکڑ کے جیپ میں بیٹھ گیا۔ مَیں بھی بیٹھنے کو تھا کہ شکلا نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ "مجھے افسوس ہے ظہیر!" وہ ڈوبی ڈوبی آواز میں بولا۔ "مَیں تمھیں بتاؤں مجھے بہت خوف تھا۔ یقین کرو میں ان دنوں سو بھی نہیں پایا ہوں۔"

"کاہے کا خوف؟" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"یہی کہ تم..... کہیں تم..... میرے دماغ میں جانے کیسے کیسے وہم تھے اور ایک بار تو مَیں نے سوچا، کچھ دنوں کی چھٹی پر دُور چلا جاؤں پھر تمھارے خیال نے مجھے روک لیا۔"

"نیند کسی کو بھی نہیں آئی....."

"تمھیں یوں اچانک اس طرح دیکھ کے نہ پوچھو کیا حال ہوا، ن اب مجھے تسلی ہو گئی ہے کہ تم محفوظ ہاتھوں میں ہو حالانکہ اب بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔"

"نہیں آئیں گی شکلا جی!"

اُس نے میری کمر تھپتھپا کے جیپ میں بیٹھنے کی ہدایت میں نے دیکھا، اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جیپ ابھی چلی ں تھی کہ وہ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے تجھل کے پاس گھر ہی جا رہے ہو دادا؟" تجھل نے اقرار میں سر ہلایا۔ شکلا کہنے لگا ں بھی ساتھ چلتا لیکن یہاں بہت سے کام نمٹانے ہیں۔"

"اب کیا رہ گیا ہے صاحب!"

"سارا نئے سرے سے دیکھنا پڑے گا دادا!"

"ہو سکے تو اُس ابھاگن کو جلدی کچہری بھیج دو۔ ٹھکانے سے بائے گی۔"

"اُسی کے بارے میں سوچتا ہوں دادا!"

"سوچنے کو کیا دھرا ہے صاحب!"

"دادا!" شکلا مچلتی آواز میں بولا۔ "مجھے بتاؤ، ہم اُس کی کیا کر سکتے ہیں؟"

"آپ بولو تو اُس کی جگہ بیٹھ جائیں۔"

"اوہ نہیں، نہیں دادا!" شکلا سر جھٹک کے بولا۔ "میرا مطلب یں ہے۔ سوچتا ہوں، بچے کس طرح رہیں گے۔ کاش کچھ میرے میں ہوتا۔"

"اُس کو اپنے حال پر چھوڑ دو صاحب!"

"اُس کے بچوں کا خیال آتا ہے۔"

"رو پیٹ کے ٹھیک ہو جائیں گے حرام کے....! اُن کے پاس جائیں گے ابھی۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گا دادا! ابھی دیکھو۔ مَیں کاغذات دوبارہ تا ہوں اور وکیلوں سے مشورہ کرتا ہوں۔"

تجھل نے کچھ نہیں کہا۔ شکلا جیپ کے پاس سے ہٹ گیا۔

جیپ پاڑے کی عمارت کے سامنے ٹھہری تو گلی میں کھڑے وہ سبھی ہماری طرف ٹوٹ پڑے۔ اُنھیں خبر مل گئی تھی کہ جارجی اور وکی نامی اُس کا کوئی دوست ختم کیا جا چکا ہے۔ باقی تفصیل کا اُنھیں علم نہیں تھا۔ تجھل نے اندر جاتے ہی پانڈے دادا سے کہا کہ وہ آدمی بھیج کے شہر کے تمام پاڑوں کے داداؤں کو بُلا لے۔

اُس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ کسی نے ہمارے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا لیکن شاید کسی کو بھی خواہش نہیں تھی۔ پہلے وہ ہم سے کچھ جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ پانڈے دادا تو بے حال ہو رہا تھا۔ اُس نے تجھل کو چوکی پر بیٹھ کے سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی اور سوالات شروع کر دیے۔ اُنھیں معلوم ہو گیا تھا کہ جیپ ہمیں تلابے کے تھانے لے گئی تھی۔ اِس دوران پاڑے پر آنے والے دادا بھی مختلف افواہیں لاتے رہے تھے۔ تجھل کے تحمل کی تلقین سے اُن کی سیری نہیں ہوئی، آخر تجھل کو صاف طور پر اُن سے کہنا پڑا کہ وہ تمام داداؤں کے جمع ہو جانے ہی پر زبان کھولے گا۔ جلد یا بدیر اُنھیں سب کچھ معلوم ہونا ہی تھا۔ تجھل کے اجتناب کی وجہ بظاہر یہی نظر آتی تھی کہ ایک جواب کے بعد واویلا ہونے لگتا۔ اُس کی خاموشی پر پانڈے دادا آزردہ خاطر سا ہو گیا۔ تاہم وہ جہاں دیدہ آدمی تھا۔ تجھل کی پس و پیش اُس نے اپنے اطراف بیٹھے ہوئے داداؤں کے سبب سے جانی ہو یا کچھ اور۔ بہر حال اُس نے مزید اصرار نہیں کیا اور کبیدہ کبیدہ اپنی جگہ چپ بیٹھا رہا۔ ہمارے تھانے جانے سے پہلے جو دادا چوکی پر بیٹھے تھے، وہ اب بھی موجود تھے بلکہ اُن کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تجھل نے اُن کی توجہ ہٹانے کے لیے کھانا لگانے کا حکم دیا۔ سب نے بس جیسے کوئی ذمے داری نبھائی۔ کھانا کھاتے ہی تجھل اُٹھ گیا اور پیرو کے خاص کمرے میں چلا گیا۔ اُن کی متوحش نگاہوں سے بچنے کا یہی ایک مناسب طریقہ تھا۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد پانڈے بھی چلا گیا۔

وہ سب میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ پہلے مَیں نے سوچا، اُن سے لاعلمی کا اظہار کروں کہ میں تھانے سے باہر بیٹھا رہا تھا اور تجھل نے اندر جا کے افسروں سے بات کی تھی، گو اُنھیں میری بات کا یقین نہ آتا لیکن اِس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ میرے شش و پنج پر وہ پیچ و تاب کھانے لگے۔ مَیں نے جھوٹ بولنے کے بجائے یکسر انکار کر دیا کہ سرِ دست مَیں اُنھیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ جو کچھ ہے، اُنھیں جلد ہی تجھل کی زبانی معلوم ہو جائے گا۔ وہ زبردستی تو کر نہیں سکتے تھے، گھُٹ کے رہ گئے۔ پھر مَیں نے بھی وہی کیا۔ جمرو، شامو، مارٹی اور زورا کے ساتھ اوپری منزل کے ایک کمرے میں آ گیا۔ اُن چاروں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا، مَیں نے از خود اُنھیں بتایا کہ ہم تھانے میں کیا سُن کے اور کیا دیکھ

کے آئے ہیں وہ گنگ ہوگئے۔ اُنھیں یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

پانچ بجے تک شہر کے تقریباً سارے دادا پاڑے میں جمع ہوچکے تھے۔ ہر طرف شور گونج رہا تھا۔ پانڈے دادا نے تبھل کو مطلع کرنے کے لیے کمرے میں آدمی بھیجا تو تبھل فوراً باہر آگیا۔ اُس نے بس چوکی کے وسط میں آنے کی مہلت لی اور کسی تمہید کے بغیر اُن سے کہا: "قلابے کے تھانے میں جارجی کی بیوی ہاری نے آکے بولا ہے کہ اُس نے جارجی اور اُس کے رشتے دار دتّی کو ختم کردیا ہے، بولتی ہے، اُن لوگ نے ہی پیرو دادا کو ختم کیا تھا۔"

عمارت میں سنّاٹا طاری ہوگیا پھر دوسرے ہی لمحے ایسا شور اُٹھا جیسے اُن سب کو بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ پانڈے دادا نے کھڑے ہوکے اور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے اُنھیں خاموش کرنے کی کوشش کی مگر تبھل ہی کی آواز اُن کے شور پر غالب آئی۔ تبھل نے نسبتاً اونچی آواز میں اُن سے کہا: "ہم جو بول رہے ہیں، وہ ذرا دھیان سے سنو۔ اپنے کو تھوڑا ہی بولنا ہے۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی تم کو دوبارہ بُلانا پڑے گا۔ بات آج بھی وہی ہے پر کل تم نے فیصلہ کیا تھا اور تمھارے بولنے پر ہم نے تمھاری بات مان لی تھی۔ پیرو دادا کی خاطر بھی ہم چپ ہوگئے تھے۔ آج صرف اپنے کو بولنا ہے۔ پیرو دادا کا سارا حساب چکتا ہوگیا ہے۔ جیسے بھی ہوا، ٹھیک ہے۔ اپنے کو ایسا نہیں چاہیے تھا۔ پر اس کی مار کھائے ایک ہمی نہیں تھے اور تھی نہیں تھے۔ دوسرے کا ہم سے بھی زیادہ ناتا تھا۔" تبھل کی آواز بھاری ہوگئی۔ ایک لحظے کے تامّل کے بعد وہ بولا: "قلابے کے تھانے سے ہم سیدھا اپنے گھر کو نکل سکتے تھے۔ پانڈے دادا اِدھر ہی تھا، بیٹھا رہتا پر سوچ کے چلے آئے کہ سامنے سب صاف کردیں تو اچھا ہے۔ ہم نے تم سے پہلے بول دیا تھا کہ ہم کو اِدھر ہی نہیں ٹکنا، آگے جانا ہے۔ تم کو اِسی واسطے اِدھر بُلایا ہے کہ اب ہماری چھٹی کرو، گدّی پر کسی اور کو بٹھا دو۔ ایک سے زیادہ دادا ہونے پر چاقو اُٹھا کے فیصلہ کرلو۔"

راجن کی جگہ اندھیری کے موجودہ دادا سکندر نے بے تابانہ اُٹھ کے کچھ کہنے کی کوشش کی، تبھل نے اُسے ڈپٹ دیا: "کسی کو کچھ نہیں بولنا، کوئی سوال جواب نہیں کرنا۔ بمبئی میں ہم پاڑاگیری کرنے کو نہیں آئے تھے۔ دادا نہیں رہا تو اب ہمارا کوئی کام بھی اِدھر نہیں ہے۔ بمبئی میں پاڑا چلانے کی ہم کو کبھی کھجلی ہوئی تو اپنے پاس چاقو ہے۔"

سب حیرت و اضطراب سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ سکندر کے بعد کوئی نہیں اُٹھا۔ تبھل نے دھیمے لہجے میں وضاحت کی: "اپنے کو پتہ ہے، ابھی اِدھر کوئی پیرو دادا نہیں ہے۔ ایسے دادا کا لانا مشکل ہے جو شہر کے سارے پاڑے باندھ کے رکھے، تو نال کاٹ دو۔ آج سے کوئی پاڑا ماہم کے پاڑے سے جُٹا بندھا نہیں ہے۔ سب کو اپنا الگ الگ بھگتانا ہے۔ کسی کو آکے اِدھر کوئی بھتّا نہیں پہنچانا۔ آگے نئے دادا کی مرضی ہے، سب کو ساتھ رکھے یا الگ کردے اور تمھاری مرضی ہے کہ تم اٹکے رہتے ہو یا کٹ کے۔ ہم ماہم کے کھونٹے سے سب کو باندھ کے جائیں تو بھی یہ زیادہ دیری نہیں چلے گا۔ اپنے کو ہتھیلی لگاکے اِدھر نہیں بیٹھنا اور نہ لوٹ کے بار بار کو بمبئی آنا ہے۔ پنجرے کی ایک تیلی کھوٹی ہو تو ایک ایک کرکے پنچھی اُڑ جاتے ہیں۔"

"ابھی ابھی اپن کو تھوڑا بولنے دو۔" باندرے کے دادا دینا نے چلّا کے کہا۔

"بیٹھ جا رے۔ اپنی بات پوری نہیں ہوئی۔" تبھل درشتی سے بولا: "ابھی ہم ادھر کی گدّی کے دادا ہیں اور تم سب نے مل کے ہم کو اِس پہ بٹھایا ہے۔ جو ہم بولتے ہیں، ٹھنڈے ہوکے اُس کو سنو۔ ماہم کے پاڑے کی گدّی کے دادا کا فیصلہ جان کے، سمجھا!"

دینا بے چین کھڑا تھا۔ اُس کے برابر بیٹھے ہوئے داداؤں نے اُسے کھینچ کے بٹھا دیا۔ تبھل نے پھر اُن سے کہا: "پاڑے کی زمین اور در دیوار سب پیرو کی جاگیر ہے۔ وہ نہیں ہے تو اب اُس کی بیوی اور بیٹی اِس کی مالک ہے۔ تم لوگ کو یہ پاڑا چلانا ہے تو کوئی تم کو ادھر سے نہیں نکالتا۔ بھاڑا چکاتے رہوگے تو سب ٹھیک چلتا رہے گا۔ یہ منظور نہیں ہے تو ابھی پاڑا خالی کردو اور اپنے لیے ادھر کوئی دوسری منڈھیا ڈال لو۔" سب جیسے بُت بنے بیٹھے رہے۔

"اپنے کو اور کچھ نہیں بولنا۔" تبھل نے حتمی آواز میں کہا: "جو بھی ماہم کی گدّی پر بیٹھنا چاہتا ہے، اپنے کو بولے۔"

کسی نے جواب نہیں دیا۔ تبھل نے چند لمحے انتظار کیا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں اُٹھی تو تبھل نے اُن سے کہا کہ اُن کے خاموش رہنے کی صورت میں ماہم کے پاڑے کی گدّی کے دادا کی حیثیت سے وہ پاڑا بند کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔

"ایسا کیسے دادا!" بنارسی دادا چیخ کے بولا۔ اُس کے ساتھ ہی شور مچانے لگے۔

"ایسا کیسے چلے گا دادا!" دادر کا دادا بالے بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور ہیجانی انداز میں بولا: "یہ پاڑا بند ہوجائے گا؟ پیرو دادا کا پاڑا؟ یہ اُس کی نشانی ہے۔"

چوکی پر کئی دادا کھڑے ہوگئے اور ہر کوئی اپنی بولی بولتا رہا۔ وہ ہاتھ چلا چلا کے صدائیں بلند کر رہے تھے۔ پانڈے دادا دوبارہ

[اُنھیں] خاموش کرنے کے لیے اُٹھا مگر اُس کی آواز پاڑے کے گونجتے [شو]ر میں گم ہوگئی۔ ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے وہ سب تبھل پر پل پڑیں [گے۔] تبھل نے جیسے اُنھیں کوئی گالی دی ہو۔

تبھل ساکت کھڑا رہا۔ وہ دُہائیاں دیتے اور گرجتے برستے رہے [تبھ]ل کے بُت میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ آخر اُن کی آوازیں ازخود [م]ند پڑنے لگیں۔ پانڈے نے سب کو عاجزانہ لہجے میں صبر و ضبط کی [تلق]ین کی اور کہا کہ تبھل کی بات سمجھنے کی کوشش کریں۔

"اِن سے پوچھو دادا! یہ کاہے کا رولا کرتے ہیں۔" تبھل نے [پانڈ]ے ہی سے کہا۔

"تم پاڑا بند کرنے کی بات مت کرو دادا!" بنارسی پھنکارتی [آ]واز میں بولا۔

"نہیں کرتا! پھر؟" تبھل نے گرج کے کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوئے گا۔"

"نہیں ہوگا، کون روکتا ہے تیرا ہاتھ۔"

"پاڑا چلے گا اور ایک دم چلے گا، پیرو دادا کے نام پہ چلے گا۔"

"پھر ٹنٹا کیا ہے؟ نیا دادا بٹھلاؤ۔"

سب ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے، کسی جانب سے [ک]وئی صدا نہیں اُٹھی۔ پھر بالے نے آگے آکے اور ہاتھ جوڑ کے تبھل سے کہا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرے۔ سب کے لیے وہ اِس وقت پیرو دادا کی جگہ ہے۔ اُس نے پہلے بھی اُن کی بات مان لی تھی، ہمیشہ کے لیے نہیں تو کچھ عرصے کے لیے ابھی وہ پاڑے پر بیٹھا رہے۔ بعد میں کوئی نہ کوئی انتظام ہوجائے گا۔ اُسے یقین ہے، فی الحال کوئی بھی ماہم کے پاڑے کی مرکزی حیثیت ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ جہاں تک پیرو دادا کی بیوی اور بیٹی کا تعلق ہے، وہ ہم سب کی ماں بہن ہے۔ پاڑے کا کرایہ کیا، اُن کے لیے جان بھی حاضر ہے۔ تبھل سنتا رہا۔ بالے کے بعد شنکرا تبھل کی منت کرنے لگا کوئی دادا بھی ماہم کے پاڑے کی گدّی پر بیٹھنے کا خواہش مند نہیں ہے۔ اُس نے پاڑے میں بیٹھے لوگوں سے مخاطب ہوکے پوچھا کہ کوئی ہو تو سامنے آئے۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ شنکرا بار بار لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ نوجوان سورت والے نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے خاموش کردیا اور تبھل سے بولا کہ اُسے دادا کی بیوی اور بیٹی کا اتنا خیال ہے، ہم بھی تو دادا کی اولاد کے مانند ہیں۔ سب نہیں تو ماہم کے پاڑے سے متعلق سارے دادا پیرو کی نگرانی میں پروان چڑھے ہیں۔ وہ سب اُجڑ جائیں گے۔ تبھل، دادا کے اِن پسماندگان کو کیوں بھولے ہے۔ سُست ۔ سب سے اتنی بے رُخی، بے تعلقی سے کیوں مخاطب ہے۔

سورت والا جارجی کو مغلظات بکنے لگا اور بولا، مجھے یقین نہیں آرہا کہ جارجی نے ایسا کیا ہے۔ کل تک، کل رات تک وہ ہمارے درمیان بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ وہ اتنا بڑا کمینہ ہے، کوئی خواب میں بھی تصوّر نہیں کرسکتا تھا۔ تبھل کی بد دلی کا سبب شاید وہی کتا ہو لیکن ایک نمک حرام کی غدّاری کی سزا اتنوں کو کیوں دی جا رہی ہے۔ پانچوں اُنگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ جارجی کے نطفے میں ضرور کوئی فرق تھا جو اُس نے اپنے مربّی، اپنے محسن کے ساتھ ایسا کیا۔ بے شک یہاں بہت سے دادا، پیرو دادا سے خار کھاتے تھے، اُس سے حسد کرتے تھے۔ وہ جنھیں ماہم کے پاڑے کی بالادستی ناپسند تھی اور جنھیں تیواڑی کے خاتمے کے بعد مجبوراً ماہم کے پاڑے سے وابستہ ہونا پڑا تھا۔ ہمیں معلوم ہے، اُن میں کئی رسّی تڑانے کے لیے سر پیر مارتے تھے لیکن پیرو کا پہاڑ ہٹانے کے لیے کسی کے دل میں بھی یہ بزدلانہ خیال نہیں آیا ہوگا۔ یہ کسی دادا کا کام نہیں۔ ایسا ہونے لگے تو پھر ہر بات آسان ہے۔ سورت والا بلند آواز میں بولا کہ دادا کی بیوی اور بیٹی کے لیے پاڑے کا کرایہ ہی نہیں، اس کے علاوہ بھی ماہ بہ ماہ کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ پہنچایا جاتا رہے گا، اپنے گھر کی طرح۔ یہ بمبئی شہر ہے اور یہاں کے پاڑے ایسے نادار نہیں ہیں جو اپنے پیرو دادا کا گھر نہ چلا سکیں۔

"بیٹھ جا۔" تبھل نے غرّا کے کہا: "زبان کاٹ لیں تیری حرام کے..... چندے کو بولتا ہے؟ ابھی ہم جیتے ہیں سنجی کے ....."

"نہیں نہیں دادا! ایک دم نہیں۔" سورت والا سٹ پٹا کے بولا: "ماں قسم اپن کا ...."

پانڈے دادا نے جھڑک کے اُسے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ شنکرا، دینا، بالے، زدرا اور پانڈے دادا وضاحتیں کرنے لگے کہ سورت والے کا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔

"زیادہ باتیں نہ بناؤ رے۔" تبھل نے بھڑکتی آواز میں کہا۔ "ہم نے تم سے بولا تھا، اپنے سے ضد بحثی مت کرنا۔ پورا نہیں سُنتے ہو کیا؟"

"سُن لیا ہے مائی باپ!" پانڈے کی نرم گوئی میں ترشی بھی شامل ہوگئی۔

"پھر آگے کا بولو دادا!" تبھل نے برگشتگی سے کہا۔

"کیا بولے مہاراج!" پانڈے دادا چوکی پر بیٹھے ہوئے داداؤں کو مضطرب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا: "تم سُنے تو ابھی کچھ بولے۔"

بجھل نے اُن سے کہا کہ تکرار سے کچھ حاصل نہیں، جو کچھ کہنا تھا وُہ کہہ چکا ہے۔ واضح رہے کہ وہ اُن سے اجازت طلب نہیں کر رہا۔ اُس کا فیصلہ اُن کی تائید یا انکار سے مشروط نہیں ہے۔ اُنھیں نے صرف اپنا فیصلہ کرنا ہے۔ دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا۔ اتنی سیدھی اور آسان بات اُن تک کیوں منتقل نہیں ہو رہی۔

"ایسا سیدھا اور صاف نہیں ہے جیسا تم بولتا ہے دادا!" بالے نے کہا۔

"ایسا کیا بات ہے دادا جو تھانے سے آکے تم ایک دم لوٹ گیا۔" پانڈے دادا بے چارگی سے بولا کہ ابھی تو کسی کی سمجھ میں یہی نہیں آ رہا کہ یہ سب ہوا کیا ہے، کیسے ہو گیا۔ جارجی نے یہ سفاکانہ قدم کیوں اُٹھایا؟ یہ سب تو تفصیل جاننے کے منتظر ہیں۔ جارجی کے ملوث ہونے کی خبر سُن کے ششدر ہیں۔ تھوڑا سانس لینے دو دادا!" پانڈے بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"اِس کے جاننے سے اپنی بات پر فرق نہیں پڑتا۔ تم پاڑے کے آدمی ہو۔ آگے پیچھے کا سارا سامنے آجائے گا۔"

"پر ایسا جلدی کا ہے کو ہے۔" شنکرا بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ "لگتا ہے، اپن لوگ سے کوئی بھول ہوا ہے کہ ابھی اوپر سے دادا کو....."

بجھل نے خشمگیں نظر سے اُسے دیکھا تھا، شنکرا کی آواز حلق میں گھٹ گئی لیکن اُسی لمحے بنارسی دادا چیخنے لگا اور بجھل کے بجائے اپنے اطراف بیٹھے ہوئے داداؤں سے مخاطب ہو کے بولا کہ کیا اتنے ہی وقت کے لیے اُن سب نے خوشامد کی حد تک بجھل سے منت کی تھی۔ ایک دن کے بل میں کیا وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ بجھل نے اُسے جواب دیا کہ پہلے اگر اُس نے اُن کے اصرار پہ بہ اکراہ ہامی بھر لی تھی تو اُس کی وجہ دوسری تھی۔ دادا کے خون کا قرض واجب تھا۔ اب کچھ نہیں رہ گیا اس لیے اب اُسے تادیر پاڑے پر ٹھہرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ کیا اُس نے واضح طور پر نہیں کہا تھا کہ اُسے زیادہ دن نہیں ٹھہرنا۔ بہتر ہے، خوش اطواری سے اُسے جانے دیا جائے۔ جو فیصلہ اُنھیں کل کرنا ہے، وہ آج کیوں نہ کر لیں۔

پانڈے کے پیچھے کھڑا ہوا سکندر آگیا۔ "اجازت ہو تو اپن ایک بات پوچھے دادا؟" سکندر کا لہجہ ٹھہرا ٹھہرا، ٹھنڈا ٹھنڈا سا تھا۔

"کیا ہے رے؟" بجھل نے ناگواری سے کہا۔

"اپن کو یقین ہے، تم دادا کا پاڑا بند کرنے کو نہیں مانگتے۔"

"پھر اتنا بولنے کی کیا ضرورت تھی لاڈ کے۔"

"ایک دم دادا! اپن بھی یہی سمجھتا ہے۔ پیرو دادا نے اِس کو بہت لگن اور چاؤ سے بنایا تھا۔ اکھا ممبئی میں ہیرا پاڑا ہے یہ۔ تم نے دیکھ لیا، اس ہیرا پاڑے کی گدّی سنبھالنے کو کوئی اپنی ماں کا جنا آگے نہیں بڑھا۔ تم نے سب کو الگ کر کے بھی بولا۔ کوئی نہیں اُٹھا۔ کسی نے چھاتی پر ہاتھ مار کے نہیں بولا کہ ابھی وہ دادا کی جگہ بیٹھنا مانگتا ہے۔ تم جانتا ہے، ایسا کس واسطے ہے دادا! تم خود بولا ہے، ابھی اِدھر کوئی بھی پیرو دادا نہیں ہے۔ دادا لوگ کو پتہ ہے، وہ کتنے دن کھینچ پائے گا۔ بیٹھنے کو بیٹھ جائے گا پر اکھا ممبئی میں لوٹ کے منہ دکھلانے کا بھی ہے۔ پچھلی دفعہ ہم سب اِدھر بیٹھا کیا بولتا تھا، بولتا تھا، اِدھر اینٹ اینٹ پہ دادا کا رنگ چڑھا ہے۔ پاڑے کے اندر کیا، باہر کیا، بہت پکا رنگ ہے اُس کا۔ پھیکا پڑنے میں تھوڑا ٹائم لگے گا۔ دادا کے تھوڑا دُور ہو جانے پہ۔ دھیرے دھیرے ہی اُس کا نشہ....."

"کام کی بات کر رے!" بجھل نے جھپٹتی آواز میں کہا۔

"وہی بولتا ہوں دادا! ایک دم وہی۔" سکندر تیزی سے بولا "اپن کا مطلب ہے، ابھی اِدھر کوئی نہیں ہے جو چاروں طرف کھینچ کے، باندھ کے رکھے۔ کوئی بھی آگے نہیں آئے گا۔ تم بھی چلا جائے گا تالا مار کے۔ پاڑا خلاص ہو جائے گا۔ ابھی دل پہ ہاتھ رکھ کے بولو، تم کو چین پڑ جائے گا اور اُدھر اُدھر دادا کا روح بھی خوش ہو جائے گا؟" سکندر کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ ساری عمارت میں خاموشی چھا گئی۔

"کون سی بات کا جواب دیں رے تیری۔" بجھل نے بیزاری سے کہا۔ "ایک ہی رٹا لگائے ہے۔" پہلی مرتبہ اُس کے لہجے میں نمی اور نرمی کی آمیزش تھی۔

"کسی بات کا مت دو دادا! اپن جواب کے لیے نہیں بولا سب۔ اپن کو پتہ ہے، تم کیا بولے گا۔ اب بھی دادا کی خوشی کی بات کرتا ہے حرام زادے۔ پر دادا اِس بات سے خوش نہیں ہوئے گا۔ تو دُکھی بھی نہیں۔ آگے پیچھے سب لوگ ٹھکانے سے ہو جائے گا۔ پاڑا بند ہو جائے گا تو سب لوگ اپنے ٹھکانوں پر چلا جائے گا۔ پانڈے دادا سورت لوٹ جائے گا، دینا پانڈے کو، بالے دادر کو۔ اپن اندھیری میں۔ اِدھر ماہم کا لوگ بھی کدھر سر کھپا لے گا۔ دادا کا پاڑا ابھی صرف ماہم علاقے کا پاڑا ہے یا اکھا شہر کا۔ اِس کو رہنا ہے

دادا! یہ خلاص ہو گیا تو پھر ہر پاڑا..... پھر آگے سدا کو ایسا ہی ہوتا رہے گا۔"

"ہم سے کیا بولتا ہے، اِدھر شہر کے سارے شیر امنا بیٹھے ہیں۔ جاتو کے دھنی، اِن سے بول۔ یہ تھوڑے دن کے لیے ایک دوسرے کو کندھا نہیں دے سکتے۔ ایک ہی تجھ کو لے دے رے، بلے گھرے دکھائی پڑتے ہیں۔ پاڑے کا، دادا کا اتنا درد پیٹ میں اُٹھتا ہے تو اِن کو بول۔ ہم اِدھر تیرے مہمان ہیں، آج نہیں، کل اِدھر سے چلے جائیں گے اور دادا کے ساتھ اُس رات ہم بھی نکل پڑتے تو..... تو اپنا نمبر بھی آجاتا۔ پھر کس کو اِدھر لاتا گدّی سجانے کو؟"

"اپن کو یقین ہے، ساتھ تم ہوتے تو ایسا کبھی نہیں ہوتا۔" سکندر نے بے ساختہ کہا۔ "وہ بات دوسری تھی پر ابھی تم اِدھر ہے اور اپن زیادہ ٹائم کے لیے نہیں بولتا۔ بس تھوڑی دیر کے لیے ابھی اس پہ تمھاری ضرورت ہے۔ تم بھی سمجھتا ہے، کیوں۔ اِس کے بعد تم چلے جانا، جدھر مرضی میں آئے چلے جانا، کون روک سکتا ہے تم کو۔"

"پھر کیا ہو جائے گا، سینگ نکل آئیں گے تم لوگ کے؟"

"نہیں نکلے گا پر یہ ٹائم بھی نہیں رہے گا، یہ جا نکلی ٹائم اور کچھ نہیں ہوئے گا تو تم تالا مار دینا۔"

"اپنے کو آگے بہت کام ہے رے!"

"ابھی دادا ہوتا تو تم کیا نہیں رُکتا؟"

"پر دادا نہیں ہے۔" بجھل نے بھاری آواز میں کہا۔

"دادا نہیں ہے تبھی تو اتنا بولتا ہے۔" سکندر عاجزی سے بولا "ہاں جاؤ دادا! دادا کے ناتے سے اپنا حق نکلتا ہے تم پہ، ابھی اپن لوگ تم کو اُسی کا قسم دیتا ہے۔"

"کیا! کیسا بولتا ہے رے؟"

"تم رہو گے تو اِدھر سب ٹھیک رہے گا۔ ابھی دیکھو، کیسا مل کے بیٹھا ہے۔ اِدھر کبھی ایسا نہیں ہوا، دادا کے ہوتے بھی....."

بجھل گم کھڑا رہا۔ اُس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور چہرے پر گہری لکیریں تھیں۔ عمارت میں سرگوشیاں گونجنے لگیں پھر چوکی پر بیٹھے ہوتے دادا آوازیں اُٹھانے لگے کہ بجھل کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اتنے لوگوں کی بات نہیں ٹالنی چاہیے۔

"پھر ویسا ہی رہے گا۔" بجھل نے جلتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"کیا، کیا بولا تم؟" سکندر بدحواسی سے بولا۔ پانڈے دادا بے اختیار بجھل کے پہلو سے چمٹ گیا اور اُس کے بازو پر سر مارنے لگا۔

"تم میں سے کوئی نہیں اُٹھتا تو ایک رستہ اور بھی ہے۔" سب کو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ بجھل نے اُن سے کہا کہ کوئی پاڑا بند کرنا نہیں چاہتا، نہ آگے آکے گدّی پر بیٹھنا چاہتا ہے اور اُس کے پاس بھی وقت نہیں ہے۔ کوئی یہ سمجھنا نہیں چاہتا کہ اُس کے انکار کی کوئی وجہ ہی ہو سکتی ہے ورنہ اتنے بڑے پاڑے کی گدّی کی کسے خواہش نہ ہو گی، خصوصاً ایسا پاڑا جو اُس کے عزیز دوست، بھائی پیرو کی امانت ہو۔ ایک اجنبی کو شہر کے اتنے دادا یہ مرتبہ دینے پر مُصر ہیں تو انکار ویسے بھی مناسب نہیں۔ اِس صورت حال میں ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی آدمی گدّی پہ بٹھا دے۔ "پاڑا اپنے نام پر چلے گا۔" بجھل نے گونجتی آواز میں کہا۔ "بیٹھے گا یہاں کوئی اور۔ جب تک ہم پاڑے سے باہر رہیں گے، اپنا آدمی، اپنی جگہ بیٹھا رہے گا۔"

چند لمحوں کے سکوت کے بعد عمارت میں وہی شور بلبلانے لگا۔ بجھل نے ہاتھ اُٹھا کے اُنھیں خاموش کیا اور کہا۔ "تم کو منظور نہیں تو منع کر دو، پانڈے اپنی جگہ بیٹھے گا اور اُس کو ٹیکی دینے کے واسطے جس کو ہم بولیں۔"

پانڈے دادا اپنا نام سُن کے اُچھل پڑا اور دہشت زدہ انداز میں بولا۔ "نہیں نہیں دادا! اپن کو معافی دلو، اپن ایک دم نہیں ٹھیرے گا، اپن ابھی بہت بھگت لیا۔"

بجھل نے اُس کی جانب نہیں دیکھا اور اِس سے پہلے کہ کسی طرف سے کوئی صدا بلند ہوتی، اُس نے کہا۔ "بالے، پانڈے کے ساتھ اِدھر رہے گا۔ جب تک ہم پلٹ کے نہ آئیں اور تم لوگ کو بلا کے نہ پوچھیں کہ ابھی تم میں سے کون جوان بلوان نے کھال کتنی موٹی کی ہے۔ کس نے جاتو کی بولی کتنی سیکھی اور اُس کو اپنی کتنی سکھائی ہے۔ اپنے تین پاڑوں کے سوا سارے پاڑے ماہم کے پاڑے سے الگ رہیں گے، بھتا بھی نہیں پہنچائیں گے۔ قلابے، اندھیری اور دادر کے پاڑے کے سوا۔ ہمارے پیچھے کسی کا دماغ اُلٹے گا تو اُس کو اِدھر چھاتی پھلا کے آنے سے تم سب روکو گے۔ جدھر ہم پانڈے اور بالے کو بول کے جائیں، وہ ہم کو خبر کریں گے۔ ہمارے لوٹنے تک تم اُس تیس مار کو انتظار کرنے کا بولو گے۔ ہمارے آنے سے پہلے کسی نے پانڈے اور بالے کو چھیڑا اور تم ہاتھ تاپتے رہے تو ہم تم کو دوبارہ اِس طرح نہیں بلائیں گے۔ ہم خود اُس کو دیکھ لیں گے اور

پھر آکے ہم بولیں گے بھی نہیں۔"
تبھل نے کسی کو دخل دینے کا موقع نہیں دیا اور کہا کہ یہ سب اُن کی خاطر ہے کیوں کہ نہ وہ پاڑا بند کرنے پر آمادہ ہیں نہ چوکی کے وسط میں آکے پاڑے کی باگ ڈور سنبھالنے پر تیار ہیں مگر یہ ایک مشورہ ہے جسے وہ یک سر مسترد کر سکتے ہیں۔ اُن کی تائید کے بل، یہ فیصلہ بن جائے گا۔ اچھا ہو گا کہ وہ خوب سوچ سمجھ کے جواب دیں اور چاہیں تو باہم مشورت بھی کر لیں۔ اُن پہ کوئی جبر نہیں ہے۔

وہ بنارسی دادا تھا جس نے اُٹھ کر کتراتے ہوئے، چباتے ہوئے لفظوں میں پوچھا کہ کوئی دادا پاڑے کی گدی پر بیٹھنے کا دعوے دار ہو تو کیا صورت ہو گی؟ بنارسی نے وضاحت کی، کیا اُسے چاقو نکال کے اپنا مطالبہ پیش کرنا پڑے گا یا کچھ اور؟ تبھل نے کسی تاخیر کے بغیر جواب دیا کہ یقیناً اُسے چاقو سمیت ہی اپنا دعوا پیش کرنا ہو گا۔ چاقو ہی کسی دادا کا سب سے بڑا حوالہ ہے۔ مقابل کوئی نہیں اُٹھا اور یہاں موجود سارے داداؤں کو منظور ہوا تو اُسے پاڑے کی گدی سونپ دی جائے گی۔ تبھل نے بھی صراحت ضروری سمجھی کہ وہ اور اُس کے ساتھیوں میں سے کوئی پاڑے کی گدی کا خواہش مند نہیں ہے۔ سو خاطر جمع۔ نہ وہ چاقو اُٹھائے گا نہ اُس کا کوئی ساتھی۔ ساتھیوں سے تبھل کی مراد شامو، جمروا اور مجھ سے تھی۔ اُس نے بنارسی سے کہا کہ یہاں سارے داداؤں کو اسی لیے طلب کیا گیا ہے کہ وہ آپس میں کوئی فیصلہ کر لیں کیونکہ پہلے بھی اُنھوں نے یہی کیا تھا۔ دادا کے پاڑے کے ترکے میں شہر کے وہ تمام دادا شریک ہیں جو ماہم کے پاڑے سے متعلق تھے مگر ظاہر ہے، پاڑا تقسیم نہیں کیا جا سکتا، نہ اِس کے اعتبار اور اِس کی ساکھ کی تقسیم ممکن ہے۔ اِس کا انتظام کسی ایک ہی کے سپرد کیا جا سکتا ہے اور اِس لیے کسی ایک کا انتخاب لازم ہے یا دوسرا طریقہ ہے۔ چاقو کے ذریعے خود کو دادا کے ترکے کا حق دار ثابت کیا جائے۔

بنارسی نے پھر سر نہیں اُٹھایا۔ تبھل نے ایک بار اُن سے اور پوچھا کہ کوئی آرزو مند ہو تو سامنے آئے، بہ صورتِ دیگر وہ سمجھے گا کہ سب اُس کے فیصلے پر متفق ہیں۔ پانڈے دادا کچھ بولنا چاہتا تھا، تبھل نے اُسے روک دیا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ تھانے سے آنے کے بعد یکایک تبھل کو کیا ہو گیا ہے۔ شروع شروع میں مجھے سب کچھ عجیب سا لگا تھا۔ جیسے تبھل کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہو۔ اتنے تسلسل سے اتنی بے ربطیاں پیش آئیں، ایسی ناگہانیاں ہوں تو آدمی کی یہی حالت ہوتی ہے۔

اُس نے پانڈے دادا اور بالے کے نام تجویز کیے تھے تو بھی مجھے بہت حیرت ہوئی تھی۔ پھر اتنے لوگوں کی طلبی اور اِس حجت و تکرار سے کیا حاصل تھا مگر یہ میری اپنی خستگی، اپنی بے مائگی تھی۔ تھانے سے آکے تبھل کو پہلا کام یہی کرنا تھا۔ اس تجدید کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی دادا کے جانے کے بعد پاڑے پر موجود رہنے کی۔ پاڑے سے دادا کے قاتلوں کی طرف جانے والے راستے نسبتہً آسان ہو جاتے تھے۔ داداؤں کے درمیان رہنے، اُن سے ہمہ وقت رابطہ رکھنے، اُن میں نظم و ضبط قائم رکھنے، اُن کی اعانت حاصل کرنے اور اِدھر پولیس، اُدھر قاتلوں کو کچھ باور کرانے کے لیے تبھل کو پاڑے کا کھونٹا درکار تھا جو بہ زور بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ کوئی دیر نہ لگتی لیکن اِس اندھیرے میں یہ اقدام کسی طور قرینِ عقل نہ ہوتا۔ مناسب یہی تھا کہ پیش کش اُن کی جانب سے ہو۔ ایسے غیر یقینی حالات میں اُنھی کی جانب سے پیش کش کا امکان تھا۔ وہ اتنے اندھے نہیں تھے کہ گرد و پیش کی دُھند چھٹنے سے پہلے گدی کی طمع کریں، گویا اُن کی پیش کش میں تبھل کی ترغیب اور خواہش کو جتنا دخل تھا، اُتنا ہی اُن کی نکتہ رسی اور معاملہ فہمی کا تھا، اسی لیے تبھل نے اُنھیں اکٹھا کیا تھا اور بہ ظاہر اکراہ سے پاڑے کا منصب قبول کر لیا تھا، بباطن بھی دادا کے بعد دادا کی جگہ بیٹھنا کوئی خوش گوار فریضہ نہیں تھا۔

ماری نے بہر حال اِس آزار سے جلد نجات دِلا دی۔ اُس کے تھانے چلے جانے کے بعد تبھل کے بہ قول کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ہمیں تھانے سے سیدھے گھر چلا جانا چاہیے تھا۔ پاڑے پر کوئی رہے نہ رہے، چلے نہ چلے، خاک اُڑے یا آگ لگے، ہمیں اب پاڑے سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔ غرض ہوتی تو دادا کی موجودی میں بھی پاڑا کسی اور کا نہیں تھا۔ تھانے سے ہم سیدھے گھر جا سکتے تھے، شام تک وہ ہمارا انتظار کرتے۔ دادا کا گھر اُنھوں نے دیکھ لیا تھا۔ شام کو وہ لال آنکھوں اور زرد چہروں کے ساتھ گھر آ جاتے۔ تبھل کو اندازہ تھا کہ جارجی کے ملوث ہونے کی خبر اُن کے لیے کیسی ناقابلِ یقین کتنی دہشت انگیز ہو سکتی ہے۔ اِس سے پیشتر کہ تبھل کے غیاب سے وہ طرح طرح کے وہم و گمان سے دوچار ہوں، آپس میں دست و گریباں ہوں اور نئے نئے شوشے چھوڑتے پھریں، تبھل کو اُن کے پاس جا کے بات صاف کر لینا چاہیے تھا۔ برملا دست برداری کا اعلان۔ تبھل کو احساس تھا کہ خوش وضعی کا یہ مرحلہ کتنا وقت طلب ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ سکندر کہہ رہا تھا۔ پاڑا بند کرنے سے تبھل کو واقعی کوئی خوشی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ زورا، چھیدا، گلیا، لچھمی اور جانے کتنے

ک ماہم کے پاڑے سے وابستہ تھے۔ تبھل کی نظروں سے وہ تمام
و جل نہیں رہے ہوں گے۔ پاڑا بند کرنے کے اعلان سے مراد تھی،
بتدا وہاں سے کی جائے جہاں بات ختم ہوتی ہے تاکہ وہ جلد کسی نتیجے
پہنچ سکیں۔ پاڑے پر دادا کی ملکیت کے دعوے اور کرائے کا ذکر
ا تھا تاکہ ماہم کے پاڑے کے لیے شہر کے متعدد داداؤں کی لوبھ ٹکنے نہ
ے اور بھی کئی باتیں تھیں جن کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔
پنے سوا کسی دوسری طرف میری نگاہ جاتی ہی کہاں تھی۔ ابھی نہ جانے کتنے
ن، کتنے عرصے ہمیں ممبئی میں رہنا تھا اور آگے بھی کتنی بار یہاں آنا تھا۔
ن سے دوبارہ بھی واسطہ پڑ سکتا تھا اور یہ تبھل کے لیے اپنے سکونِ
لب کا معاملہ بھی تو تھا کہ حساب کتاب میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔
ئینہ تو پاڑوں کے دادا کے پاس بھی ہوتا ہے، شاید تبھل کے گمان
یں نہ ہو کہ مآلِ کار وہ اُسی کو ہدف بنا لیں گے، راستی ہی زنجیر
ن جائے گی۔ تبھل کی بے غرضی ہی اُن کے اصرار کا محرک بن گئی۔
تنی حجت کے بعد تبھل کا انکار بلاغت سے بعید اور مروت و اعتبار
کے منافی تھا جس کی طرح خود تبھل نے ڈالی تھی۔ تبھل کے پاس
وئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اِس دائرے سے اپنی برأت کا کوئی
وشہ، کوئی روزن ڈھونڈے۔ وہاں پانڈے اور بالے کے سوا کوئی
ہیں تھا جن سے وہ سب دوسروں سے زیادہ مانوس تھے۔ پانڈے کی
طرح بالے نے بھی بہت پس و پیش کیا اور کہا کہ تبھل کی نیابت
کے لیے کسی کی کیا ضرورت ہے۔ اُس نے میری طرف اشارہ کیا کہ میں
موجود ہوں۔ کئی اطراف سے اُس کی تائید میں آوازیں اُٹھیں۔ میں
خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ تبھل انکار کر دے گا اور اُس نے
یہی کیا۔ اُس نے کہا کہ مجھے اِسی کے ساتھ جانا ہے۔

تبھل نے پھر انھیں مختصراً بتایا کہ ماری نے تھانے میں جا کے کیا بیان دیا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سُنتے رہے۔ تبھل نے ماری کے بچوں کا ذکر نہیں کیا اور کہا کہ وکی کا ساتھی نامی غالباً گوا بھاگ گیا ہے۔ قلابے کے پاڑے کے کئی اور آدمی بھی اُن کے معاون ہوں، ممکن ہے، وہ بھی گوا کی طرف نکل گئے ہوں یا یہیں شہر میں ہوں اور جارجی کی طرح ہماری آنکھوں میں دھول جھونکے بیٹھے ہوں۔ تبھل نے اُن سے کہا: "اب تم جانو، کتنے دن اُن کو کھلا رکھتے ہو۔"

سارے پاڑے میں آگ سی بھڑک اُٹھی۔ وہ نعروں کے انداز میں دہاڑنے لگے اور اُن کی وحشیانہ صدائیں عمارت کے در و دیوار سے ٹکرا کے ٹوٹتی، بکھرتی رہیں پھر اُن پر محرومی اور یاس کا عالم طاری ہوا، وہ آنسو بہانے اور گریہ و زاری کرنے لگے۔ تبھل کچھ دیر اُن کے درمیان بیٹھا پھر چوکی سے اُتر آیا۔ دروازے کی طرف جاتے جاتے اُس نے ٹھہر کے کہا کہ ابھی وہ ممبئی سے نہیں جا رہا لیکن شاید پاڑے پر اُس کا آنا ممکن نہ ہو سکے۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ورثے میں دادا اُسے کیسی امانتیں سونپ کے گیا ہے۔ وہ پاڑے سے بڑی آزمائش میں ہے۔ تبھل نے اُنھیں یہ جتانا بھی ضروری سمجھا کہ ممبئی سے جانے کے بعد کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کی واپسی کتنے عرصے بعد ہو لیکن اگر موقع ملا تو جانے سے پہلے پاڑے آنے کی کوشش کرے گا۔ اس دوران اگر کوئی دادا تیار ہو سکا تو یہ ایک نہایت اچھی بات ہو گی۔

چھ بج رہے تھے۔ سورج غروب ہوا چاہتا تھا۔ سب سر جھکائے ہمارے ساتھ پاڑے سے باہر نکلے اور گلی میں ایک ہجوم ہو گیا۔ پھر کسی نے ایک لفظ بھی تبھل سے نہیں کہا۔ پانڈے، بالے، شنکرا، سورت والا، بنارسی، سکندر، زورا، چھیدا اور جانے کون کون۔ گلی کے آخری سرے تک وہ ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ موٹر کے پاس تبھل ٹھہرا تو پانڈے اُس کے سینے سے چمٹ گیا۔ دیر تک اُس کا جسم تبھل کے بازوؤں میں پھڑپھڑاتا رہا۔ سبھی تبھل سے بغل گیر ہونا چاہتے تھے مگر پھر تو رات ہو جاتی۔ تبھل بہ عجلت موٹر میں بیٹھ گیا۔

سڑکوں پر بھیڑ کی وجہ سے موٹر کی رفتار سُست ہو گئی تھی۔

پھر ایک جگہ موٹر رک گئی۔ آگے کسی موڑ پر کوئی حادثہ ہو گیا تھا، موٹر نہ آگے جا سکتی تھی نہ پیچھے۔ ہر طرف شور مچا ہوا تھا۔ ٹرموں کی گھنٹیاں، گاڑیوں کی پوں پوں اور راہ گیروں کی چیخ پکار۔ ڈرائیور نے انجن بند کر کے باہر جا کے دیکھا اور آ کے بتایا کہ دور تک راستہ نہیں ہے۔ بھّل نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بے خبر سا بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ہم چاروں کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ ہم میں سے کسی نے موٹر سے اُتر کے حادثے کی نوعیت جاننے کی کوشش نہیں کی۔ باہر جتنا شور تھا، اندر موٹر میں اُتنا ہی سناٹا تھا۔ کبھی کبھی جمرو، شامو اور مارٹی چونک کے میری طرف دیکھتے مگر کچھ کہہ نہ پاتے۔ مجھے اُن کی بے چینی کا تھوڑا بہت اندازہ تھا۔ پاڑے میں اُنھوں نے بھّل کی زبانی سب کچھ سُن لیا تھا لیکن اس مختصر بیان سے ان کی تسلی نہیں ہوئی ہو گی۔ وہ اور بھی بہت کچھ جاننا چاہتے ہوں گے۔

ہم بہت دیر بعد تھانے سے پاڑے واپس آئے تھے۔ اتنی دیر تک ہم وہاں کیا کرتے رہے؟ ماری کو آخر کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جارجی اور دکی ہی تھے، وہ دونوں کتے جو پاگل ہو گئے تھے۔ ایک عورت نے انھیں کس طرح قابو میں کر لیا؟ کہیں ماری سے کوئی چوک تو نہیں ہو گئی؟ اس نے تھانے جا کے کیا بیان دیا اور ہمیں کیا کیا بتایا؟ جب ماری نے اعتراف کر لیا تھا تو آخر پولیس کو ہماری ضرورت کیوں پڑی تھی، صرف میری اور بھّل کی۔ ایسے جانے کتنے سوال جمرو، شامو اور مارٹی کی رگیں کرید رہے ہوں گے۔ بھّل کی وجہ سے اُن کی زبان اینٹھی ہوئی تھی۔ یقیناً اُن کے اضطراب میں ملال بھی شامل ہو گا۔ میری طرح کا ملال کہ ماری نے آخر اتنی عجلت کیوں کی، ماری سے پہلے تو ہمیں جارجی اور دکی کے سروں پر پہنچنا چاہیے تھا۔ دادا کی موت کے بعد جارجی مسلسل سب کی نظروں کے سامنے رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں کیسی دھول جھونکتا رہا۔ ایسا سوانگ کبھی کسی نے نہ دیکھا ہو گا پھر پچھتاوے میں آدمی اپنا منہ نہ نوچ لے۔ یہ تو ہماری ذمے داری تھی۔ ہمارا حق تھا، جو ماری نے ہم سے چھین لیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ جو لوگ پاڑے پر دادا کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ وہ بھّل کی زبانی ماری کا نام سن کے دم بخود رہ گئے تھے اور چند لمحوں تک سکتے کی سی کیفیت کے بعد اُن کے سر جھک گئے تھے۔ جیسے رنج اور ندامت میں کسی کا حال ہوتا ہے۔ وہ بہت کھسیانے کھسیانے سے لگتے تھے۔ وہ جارجی اور دکی کو اتنی آسان موت نہ دیتے۔ ماری کی طرح شراب پلا کے وہ ان پر وار نہ کرتے۔ وہ تو انھیں زیادہ سے زیادہ ہوش میں رکھتے، انھیں ٹکڑوں میں، قسطوں میں ختم کرتے۔ وہ انھیں ایک بار نہیں، بار بار مارتے۔

برسوں سے کئی بار پانڈے دادا دیوانہ ہوا تھا، وہ کبھی اپنا چہرہ کھسوٹتا، کبھی سینہ کوٹتا۔ کہتا کہ دادا اور ماچھی کا خون بہانے والوں کے سر اُتارے بغیر اُسے چین نہیں آئے گا۔ بالے بھی یہی کہتا تھا اور بھی بہت سے لوگ یہی ہذیان بکتے ہیں۔ سر اتار کے کیا سکون آ جاتا ہے، سکون کیا کسی جنونی کی ہزیمت سے وابستہ ہے؟ دادا اور ماچھی کیا اتنے ہی ارزاں تھے؟ اب اطمینان ہو جانا چاہیے کہ دو کمینے اور بزدل آدمی بہر حال اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ آدمی کا عوض آدمی ہوتا ہے۔ یہاں یہی دستور ہے۔ چاہے کوئی کسی کو کتنا ہی عزیز، کسی کے لیے کتنا ہی قیمتی ہو، چاہے وہ کئی آدمیوں سے بڑا، کئی جانوں پر بھاری ہو، اپنی ذات میں سمندر ہو یا پہاڑوں کا مثیل، اُسے ایک ہی آدمی گنا جاتا ہے۔ اُسے اُس کے عزیزوں اور طلب گاروں سے جُدا کر دینے کی سزا محض ایک حقیر آدمی ہے، ایک بادو، جارجی اور دکی۔ آدمی کی قیمت تو اُس کے طلب گاروں سے طے ہونی چاہیے۔ مجھے اپنے اسکول کے زمانے کا ایک واقعہ اچھی طرح یاد تھا۔ اسکول سے ملحق ڈگری کالج میں ایک مرتبہ کسی طالب علم نے ایک بزرگ اُستاد کو ختم کر دیا۔ ہر طرف غل مچ گیا۔ پروفیسر تیس سال سے پڑھا رہا تھا اور بہت محبوب و محترم شخص سمجھا جاتا تھا۔ اُس کی ارتھی اُٹھ رہی تھی تو لگتا تھا، سارا شہر ٹوٹ پڑا ہو۔ میں بھی شریک تھا۔ میں نے کالج کے طلبہ کو دھاڑیں مارتے دیکھا تھا۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ دیواروں سے سر پھوڑ لیں۔ ایک طالب علم نے صرف اس وجہ سے اپنے استاد کو ختم کر دیا تھا کہ استاد نے اُسے اپنے مضمون میں نمبر کم دیے تھے۔ شاگرد نے پورے کالج کو ایک مطلوب شخص سے محروم کر دیا۔ اُسے سزا مل گئی مگر کیا واقعی تلافی بھی ہو گئی؟

موٹر کو ساکت و جامد کھڑے ہوئے کئی منٹ گزر گئے۔ پھر کہیں دس پندرہ منٹ بعد شور مچاتی گاڑیوں نے رینگنا شروع کیا۔ پولیس والے چیخ چیخ کر ہدایات دے رہے تھے۔ آگے جا کے معلوم ہوا کہ ایک ٹرم کا گھوڑا بدک گیا تھا۔ اس افراتفری میں کئی تیز رفتار گاڑیاں اور موٹریں ٹکرا گئیں۔ سڑک پر کھنچے ہوئے دائرے میں خون بکھرا ہوا تھا۔ نزدیک ہی ٹوٹی پھوٹی گاڑیاں کھڑی تھیں اور لوگوں کا ہجوم تھا۔ راستہ بہت تنگ تھا، کچھ دور جا کے صاف ہو گیا۔ مگر تیز

رفتاری سے موٹر چلانا پھر بھی ممکن نہیں تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا۔

سب دروازے کے قریب بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

ہمیں دیکھ کے سبھی چونک سے پڑے جیسے ہماری بہ سلامت واپسی کوئی اَن ہونی ہو۔ اُن کی آنکھوں کی وحشت اور ویرانی سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ بھّل سب سے پہلے گیتا کے پاس گیا اور اس سے پہلے کہ گیتا کی پلکیں چھلک پڑتیں، بھّل نے اُس کے گال تھپ تھپا کے اُس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا: "اب کہیں نہیں جا ناری اپنے کو۔" بھّل کی آواز ہانپ سی رہی تھی۔ اُس نے گیتا سے کہا کہ اب وہ گھر ہی میں رہے گا، مستقل اُس کے پاس۔ اور کوئی بھی نہیں جائے گا، گیتا کی اجازت کے بغیر کوئی بھی گھر سے باہر نہیں جائے گا۔ گیتا کے ہونٹ پھڑ پھڑا کے رہ گئے۔ بھّل نے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ شاید یہی بہتر تھا۔ وہ گیتا کے پہلو میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور لمحوں تک گیتا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے بے سدھ سا بیٹھا رہا۔ شبّی چاچا نے حقہ اُس کے آگے لا کے رکھ دیا تھا لیکن منال بھّل کے زانو پر پڑی رہی۔

آج بھی گھر کی ساری روشنیاں جلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا بڑھنے پر روشنیاں اور عیاں ہو گئیں۔ شبّی چاچا کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ روشنیوں میں کیا رکھا ہے، ان سے کیا ہوتا ہے مگر جو کچھ دست رس میں ہے، اس میں کوئی کسر کیوں چھوڑی جائے۔ آدمی کے اندر بھی بر قمقمے ہوتے تو سب کچھ کتنا آسان ہوتا۔ جب ذرا اندھیرا گہرا ہوا، بٹن دبا دیا۔ دیر ہو گئی۔ سب گونگے بنے بیٹھے رہے۔ بار بار ہر نظر بھّل پر آ کے مرکوز ہو جاتی۔ اُس کا سوچا سوچا، اُدھڑا اُدھڑا چہرہ اُنھیں اجنبی لگ رہا تھا تاہم اُنھیں بھّل کو بھی کچھ رعایت دینی چاہیے تھی غالباً اسی سبب سے وہ خاموش تھے یا اُنھیں نئے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ کرشنا جی کہتے تھے، تکرار سے لفظ بوسیدہ ہو جاتے ہیں اور دنیا میں جس چیز کی سب سے زیادہ کمی ہے، وہ لفظ ہیں۔ اُن سب کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں رہے تھے۔ کہتے ہیں، آنسو سینہ کچھ ہلکا کر دیتے ہیں مگر آنسو بھی لفظوں کے مانند ہیں، اندر بہت آگ لگ رہی ہو تو جس طرح لفظ ساتھ نہیں دیتے، آنسو بھی کام نہیں کرتے، آنسو بھی جل جاتے ہیں۔

مولوی اکرم نے منیر علی سے وقت پوچھا اور کلمہ پڑھتے ہوئے یک بیک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عشا کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ سبزے پر ایک کونے میں جا نماز بچھی تھی۔ شبّی چاچا بھی شامل ہو گئے۔ مولوی اکرم نے تکبیر پڑھی۔ امامت بھی اُنھوں نے کی۔ میں، جمرو، شامو، مارتی اور ٹنگو اُٹھ کے عمارت کے عقبی حصّے میں چلے آئے۔ میرا سارا جسم دُکھ رہا تھا لیکن یہ اندر کسی کمرے میں جا کے لیٹ جانے کا وقت نہیں تھا۔ وہ سب میری طرف متوجّہ ہو جاتے۔ عقبی حصّے کے وسیع دالان میں نواڑ کے پلنگ رکھے تھے۔ جمرو اور شامو اُن پر پھیل گئے۔ میری طرح اُن کے جسم بھی اینٹھ رہے ہوں گے۔ آدمی آدمی کا کتنا پابند ہے۔ اُن کا جی بھی یہاں سے بھاگ جانے کو چاہتا ہو گا لیکن ہر ایک کے پیر سے کوئی زنجیر لپٹی ہوئی تھی۔ اسیری صرف زنداں کی نہیں ہوتی۔ وہ گُم سُم اِدھر اُدھر پڑے کسمساتے، کلبلاتے رہے۔ میری توقّع کے خلاف اُنھوں نے مجھ سے کچھ جاننے، کچھ پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ گھر آ کے اور سب کے چہرے دیکھ کے شاید اُن کا حوصلہ زیادہ پست ہو گیا تھا۔ اتنی دیر میں انھیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو میں اُنھیں خود آگاہ کر دیتا اور اگر میں کچھ چھپا ہی رہا ہوں تو مجھے مجبور کیوں کریں۔ عقبی حصّے میں بہت سکون تھا مگر یہاں آ کے دم اور گھٹنے لگا تھا۔ نماز کے دوران ہمارا وہاں بیٹھے رہنا بھی نامناسب تھا۔ میں ٹنگو کو بھیج کے دکھوانا چاہتا تھا کہ ابّا جان وغیرہ نے نماز ختم کر لی ہو تو اسی طرف چلیں۔ اتنے میں شہ پارہ کی آواز آئی۔ سب ہڑ بڑا گئے جیسے سب کسی خواب سے دوچار ہوں۔ شہ پارہ کھانا لگ جانے کی اطلاع دینے آئی تھی۔ کسی کو بھی خواہش نہ ہو گی لیکن کسی نے انکار نہیں کیا۔

ہم گھوم کے عمارت کے سامنے والے حصّے کی طرف آئے تو وہ کھانے کے لیے اُٹھ رہے تھے۔ اُسی لمحے دروازے کی گھنٹی بجی۔ جو جہاں تھا، وہیں ٹھیر گیا۔ ابّا جان نے ٹنگو کو باہر جا کے دیکھنے کا اشارہ کیا۔ اِسی اثنا میں بھّل خود دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں بھی لپک کے اُس کے پاس پہنچ گیا۔

مجھے ایک لحظے کے لیے گمان ہوا تھا کہ کہیں شکلا نہ ہو، اِس کے باوجود باہر اُسے اپنے سامنے دیکھ کے مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ سادہ لباس میں اپنی موٹر کے پاس کھڑا تھا۔ موٹر بھی پولیس کی نہیں تھی۔ بھّل نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ شکلا نے بڑھ کے اُس کا شانہ پکڑ لیا "آؤ آؤ صاحب! اندر آؤ۔" بھّل نے کسی قدر اضطراری آواز میں کہا۔

"سب خیر تو ہے؟"

"ہاں ہاں، بالکل، سب ٹھیک ہے۔" شکلا جھجکتے ہوئے بولا۔

"اِدھر سے گزر رہا تھا، سوچا...۔"

"اچھا کیا صاحب، بہت اچھا کیا۔"

"یہاں آ کے احساس ہو رہا ہے کہ یہ وقت نامناسب ہے۔"

"کیا صاحب! کیسا بولتے ہو۔"

"جی نہیں مانا، بس اِدھر کا رُخ ہو گیا۔"

پنے کو شک تھا، آپ آ سکتے ہو۔"

کلا پلکیں جھپکانے لگا۔ "آپ کو اندازہ تھا؟ کیسے کیسے؟"

ابھی تک آپ آدھے وردی والے ہو۔"

ب لمحاتی توقّف کے بعد شکلا مسکرا پڑا۔

نیر علی، مولوی اکرم، جمرو، شامو وغیرہ سبھی باہر آ گئے تھے۔

ب تھے۔ مارتی، جمرو اور شامو کے لیے البتہ وہ نیا نہیں تھا۔

ت کی رات وہ اُسے تھانے میں دیکھ چکے تھے۔ شکلا اندر آتے

بچا رہا تھا، شائستگی کی جھجک۔ بھّل نے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھ

ہ اندر چلنے کو کہا تو اُس نے مزید تامّل نہیں کیا۔ وہ سر جھکائے

ں ہوا۔ اُسے دیکھ کے یک بارگی میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ اِس وقت

بے سبب نہیں ہو سکتی، ابھی سہ پہر تو ہم اس سے رخصت ہوئے

لوم پھر کیا خبر لایا ہو۔ مگر شکلا کے انداز و اطوار اور لب و لہجے

بسی آلودگی نہیں تھی جو میری وحشت سوا کرتی۔ اندر آ کے روشنی

ہی اُس کی نظر ابّا جان پر پڑی، وہ ٹھٹک کے رُک گیا۔

با باہیں، اپنے لاڈلے کے بابا۔" بھّل نے آہستگی سے کہا۔

یں، مَیں دیکھ رہا تھا۔" شکلا حیرانی سے بولا۔ ابّا جان سے

نے کے لیے بے ساختہ اُس نے ہاتھ پھیلا دیے۔ "مَیں آپ کو

تھا۔"

مجھے!" ابّا جان نے تذبذب سے کہا۔ "کیسے؟ مجھے یاد نہیں

جناب سے...۔"

اتنی بار آپ کا حُلیہ سُنا اور...۔" وہ کہتے کہتے ٹھیر گیا اور میری

ہیں جما کے بولا۔ "آپ میرے لیے بالکل اجنبی نہیں ہیں،

پوچھیے۔"

ابّا جان کے علم میں تھا کہ بمبئی میں مجھے بہت سے لوگ بلکہ تقریباً

کے نام سے جانتے ہیں اِس لیے وہ چونکے نہیں تاہم چند ثانیے

نوں سے شکلا کو دیکھتے رہے۔ یوں بھی اُس کی وضع قطع میں

ار تھا، لہجے میں بُردباری تھی۔ بھّل نے ابّا جان کی پریشانی دُور

کر اُنھیں بتایا کہ شکلا ہی کی وجہ سے ہم اُن تک پہنچ سکے تھے

ں نے ابّا جان کی تلاش کے لیے ہندوستان بھر کے تھانوں کو

انہ کیے تھے، اُن کے بعد شکلا ہی اس سلسلے میں پیروی کرتا

خط میں میرا بتایا ہوا ابّا جان کا حُلیہ تفصیل سے درج تھا اور

زبر ہو گیا تھا۔ آخر آسام میں ابّا جان نظر آ گئے۔ شکلا کے تار کے

ہیں یہ اطلاع فیض آباد میں ملی تھی۔ بھّل نے شکلا کو نہیں بتایا کہ

ابّا جان ہمیں نہیں مل سکے تھے، ہمیں تبّت کا سفر کرنا پڑا اور ابھی بہت کچھ دیکھنا سننا رہ گیا تھا کہ نشانے چوکتے رہے، ہم زندہ و سلامت واپس آ گئے۔ شکلا ٹوہ میں نہ لگا رہتا تو شاید ابّا جان ہمیں کبھی نہ ملتے۔ ملتے بھی تو جانے کب، کس حال میں۔ تبّت سے لعل و جواہر کے انبار کے ساتھ اُن کی تنہا واپسی کس طرح ممکن ہوتی، اور واپسی کا سوال تو بعد میں آتا، اُنھوں نے صدیوں پہلے کے مدفون خزانے تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اُس محبس کی سنگلاخ دیواروں، دروں میں چھپے ہوئے نوادر کریدنے میں اُنھیں ایک عمر لگ جاتی۔ ابّا جان کے چہرے پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔ اُن کے ہونٹ شکلا کے احسان کی زیر باری سے سسکتے رہے۔ ممکن ہے، اُنھیں امّی کی یاد بھی آئی ہو اور فہمی کی بھی، اور بھی بہت کچھ اس ذکر پر سب کچھ تازہ ہو جانا چاہیے۔ وہ شکلا سے کچھ نہ کہہ سکے۔

"مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا، آج دونوں کو، دونوں باپ بیٹے کو ساتھ دیکھ کے یقین کیجیے کیسی کیسی،" شکلا کی آواز بھی بھرا گئی۔ "کاش کرشنا جی آج زندہ ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب اُنھی کا...۔"

درمیان میں جولین کے آنے پر شکلا کی آنکھوں کی چمک فزوں ہو گئی۔ جولین نے رسمی سلام کے بعد اُسے کچھ کہنے کی مہلت نہیں دی اور سامنے بچھے ہوئے دستر خوان پر چلنے کا حکم دیا۔ اس حکم میں تعلق خاطر کا ناز بھی شامل تھا۔ شکلا نے کہنا چاہا کہ وہ بے شک کھانا کھا کے نہیں آیا ہے لیکن اُسے بھوک بھی نہیں ہے۔ جولین نے اُس کا عذر مسترد کر دیا۔ برآمدے میں جانے سے پہلے شکلا نے بھّل سے خواہش ظاہر کی کہ پہلے وہ پیرو دادا کی بیوی اور بیٹی سے ملنا چاہتا ہے۔ گیتا اور رانی، فرخ اور فریال کے قریب کچھ فاصلے پر کھڑی تھیں۔ بھّل کے ساتھ شکلا خود اُن کے پاس گیا، اُنھیں ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا اور لمحوں گنگ کھڑا رہا۔ "یہ پولیس کے بہت بڑے افسر ہیں ری، شکلا جی" بھّل نے بھاری آواز میں کہا۔ گیتا اور رانی نے بیک وقت سر اٹھا کے اُسے دیکھا، اُن کے چہروں پر ایک آن کے لیے کوئی تلاطم سا آ کے گزر گیا۔

"مگر میں، مَیں یہاں پولیس افسر کی حیثیت سے نہیں آیا ہوں، مجھے آپ سے ملنا تھا۔" شکلا افسردگی سے بولا۔ "مجھے بھی اُن لوگوں میں سمجھیے جو یہاں آپ کے دکھ درد میں شرکت کے لیے موجود ہیں۔" شکلا کی زبان اٹکتی رہی۔ وہ وہی کچھ کہتا رہا جو آدمی کے مقدور میں ہے۔ لوگ مرتے رہیں گے اور اُن کے پسماندگان کے سامنے زندہ رہ جانے والے یہی مجہول جملے دُہراتے رہیں گے۔ کوئی نہیں جانتا، سوگوار صرف ایک بات سننا چاہتے ہیں کہ اُن سے بچھڑ کے جانے والا کب تک واپس آ جائے گا، کوئی ترکیب، کوئی تدبیر بتاؤ کہ وہ اُسے دوبارہ حاصل کر سکیں۔ کسی کو یہ دعوا کرنا نہیں آتا۔ نہیں آتا تو یہ ہم دردیاں کیسی؟ سب بے کار ہے۔

گیتا اور رانی خاموشی سے سنتی رہیں۔ شکلا کے اظہار میں دل سوزی بھی تھی، بے چینی بھی۔ دونوں نے ساڑی کے آنچل سے مُنہ چھپالیا۔ پھر نہ جانے شکلا کو کیا ہوا، اُس نے ہیجانی انداز میں گیتا کو اپنے پہلو میں کھینچ لیا، کہنے لگا: "میری چھوٹی بہن کامنی بھی بالکل تمھارے جیسی ہے۔ بہت چھوٹی تھی کہ ماں مرگئی، پتاجی بھی چند دنوں بعد چل بسے۔ مَیں نے ہی اُسے پالا پوسا ہے۔ میرے لیے وہ بیٹی کے مانند ہے۔ تمھیں دیکھ کے ایسا لگتا ہے، سچ مانو، ایسا لگتا ہے کہ اب ایک نہیں، میری دو بیٹیاں، دو بہنیں ...."

شکلا کو احساس ہوا تو وہ مضطربانہ گیتا کی پیٹھ سہلانے، اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا اور بولا: "نہیں، نہیں، رو و مت، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم پڑھی لکھی لڑکی ہو، علم تو حوصلہ دیتا ہے، علم سے تو اندھیرا اجالا زیادہ سمجھ میں آتا ہے۔ جب سے دُنیا بنی ہے، یہی ہوتا رہا ہے، آگے پیچھے لوگ بچھڑ جاتے ہیں۔ یہاں جتنے بھی ہیں، سب ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ سب کی تقدیر ایک جیسی ہے۔ ہر آدمی چھوٹی بڑی مدت کا مسافر ہے۔ تمھارے پتاجی نے تو اتنے لوگ، اتنے اچھے لوگ تمھارے لیے ورثے میں چھوڑے ہیں۔ یہ تو بہت بڑی دولت ہے۔ جانے والے تو کبھی بہت اکیلا، بہت تنہا کر جاتے ہیں، تمھارے پاس تو اتنے ...؟"

گیتا اور پھوٹ پڑی۔ بٹھل نے شکلا کی مدد کی اور گیتا کو اُس سے جُدا کر دیا۔ وہ روتی سسکتی گیتا کے شانوں پر ہاتھ رکھے برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔

دسترخوان پر بٹھل نے شکلا کو اپنے پاس ہی بٹھایا۔ میں بھی اُس کے ساتھ تھا، جولین میرے برابر تھی۔ وہ بار بار شکلا کے آگے ڈونگے رکھتی۔ اُس کے اصرار پر شکلا آخر تک ہاتھ چلاتا رہا۔ منیر علی اور مولوی اکرم نے کھانے کے دوران فضا پر چھایا ہوا غبار دُور کرنے کے لیے کئی مرتبہ موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اتنا ضرور ہوا کہ گیتا اور رانی کے آنسو تھم گئے۔ کھانے کے بعد بھی شکلا دیر تک دسترخوان پر بیٹھا رہا اور مختلف موسموں میں مختلف غذاؤں کے خواص کے بارے میں منیر علی کی باتیں انہماک سے سنتا رہا۔ وہ کھُلی کھُلی آنکھوں سے سب کو دیکھتا تھا، کسی حد تک حیران و پریشان آنکھوں سے۔ جب دوبارہ سارے مرد برنڈے پر آ بیٹھے تو بھی اُس کا یہی عالم رہا۔ ابّا جان نے شکلا کے قریب کی کرسی سنبھال لی تھی۔ ایک شخص کے اچھا لگنے کے علاوہ اس قربت کی وجہ اور بھی ہوگی۔ اُن کی نظریں مسلسل شکلا کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ کرسی پر بھی اُنھیں ایک پہلو قرار نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شکلا سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں مگر جیسے سرا نہیں مل رہا ہے۔ گھر کے ایک آدمی کو، دادا سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کو جوبے کلی ہونی چاہیے، وہ اُنھیں بھی ہوگی۔

اَب تک سَب کچھ جوں کا توں قبول کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں وہ اندھا وقت گزر چکا تھا۔ ابّا جان کو گرد و پیش کا جاننے کی بہت تڑ ہوگی، پولیس کے رویّے اور اندازے جاننے کی بے تابی۔ ہم پر کوئی آنے یا کسی طور ہمارے ملوّث ہو جانے کا خدشہ اُن کے سینے میں دھڑکتا ہوگا۔ جو بات وہ ہم سے نہیں پوچھ پاتے تھے، مناسب سمجھتے تھے یا ہم سے کسی معقول بات کی توقع نہیں تھی، اُسے پو کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ ایک پولیس افسر اُن کے سامنے موجود بٹھل کے بہ قول ایک بڑا پولیس افسر شکلا کی خوش بیانی، وضع و مروّ جگہ، اِدھر جولین نے بھی شکلا کے لیے سب کا تکدّر دُور کرنے میں مدد کی تھی۔ اُس کی بے ساختہ خاطر داری اور غیر ارادی التفات کا بھی دخل تھا جبھی شکلا کسی کو ایسا اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے بہت سے وہ اس گھر میں آرہا ہو۔ جولین کی ماں اور رچما بیگم تو ویسے بھی اچھی طرح جانتی تھیں۔ اُنھوں نے بھی شکلا کا ایک اچھا تاثر قائم کر جولین کی امانت کی تھی مگر شکلا کا تعلق بہرحال پولیس سے تھا اور ابّا جا ایک سرد و گرم چشیدہ شخص کے خیال میں اُس کی اچانک آمد محض اظہا کے لیے نہیں ہوگی، کوئی دوسرا مقصد بھی ہوگا۔

شکلا کی طرف ابّا جان کی رغبت یک طرفہ نہیں تھی، شکلا بھی اُنھی کی جانب مائل تھا۔ وہ بمبئی کے موسم کی نیرنگی کے بارے میں تجربے سُنا رہا تھا اور کوئی عجب نہیں تھا کہ باتوں باتوں میں کسی لمحا اُن سے پوچھ لے کہ آخر کیا مجبوری تھی جو اُنھیں اپنے آبائی گھر اور شہر دور ہونا پڑا، کیوں جلد جلد وہ نئے گھر، نئے شہر بدلتے رہے۔ اُنھو نے اِس کی بھی پروا نہیں کی کہ اُن کا جوان بیٹا ٹھوکریں کھا کے کسی گھر واپس آسکتا ہے، اُس کے لیے کوئی پتہ نشان تو بتا کے جاتے۔ کیا نے اپنی دانست میں اُس پر خاک ڈال دی تھی؟ اُس کی یاد تو اُنھیں آتی ہوگی، کہیں کوئی اُس کے قد، اُس کی کاٹھی کا نظر آتا ہوگا تو آنکھیں بہت جلتی ہوں گی۔ آخر کیا ستم ٹوٹا تھا، کون سی دہشت تھی جو وہ خود بچائے بچائے، چھپائے چھپائے پھرتے رہے؟ شکلا کو بہت کچھ معلو نہیں تھا۔ مَیں نے ساری بات کرشنا جی کو بھی نہیں بتائی تھی کہ ابّا جان گھر چھوڑنے کا اصل سبب کیا تھا۔ مجھے خود بھی اتنا کہاں معلوم تھا۔ کے سان دگمان میں بھی نہ ہوگا کہ ایک اجنبی لڑکی کے ترک کیے ہو کاغذات کے نقش و نگار نے اُن کی بینائی خیرہ کر دی تھی۔ نہ معلوم ابّا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اُس کی کیا حالت ہوتی۔ اس چیستاں میں عزت کے راستے چھپے تھے، ابّا جان کو اُنھیں کھوجنا تھا۔ کسی مہم جو اور طالع آ کی طرح۔ سمندر کی گہرائی جتنی قریب آتی ہے، آدمی اتنا ہی ڈوبتا ہے

ون پیچھے رہ گیا، کس نے صدا لگائی، اِس کا ہوش کِسے رہتا ہے۔ ی اِس کمال کی طلب میں ایسے ہی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ ہر کمال کے ے ایثار شرط ہے، ایثار، قربانی، صبر و ضبط۔ پر ابّا جان نے کاغذات ے آگے کے علم پر توجہ نہیں دی تھی جو دیوار کا نوشتہ ہے۔ وہ نقش اندھیروں میں بھی روشن رہتا ہے۔ کاغذات میں آبِ حیات کا نقشہ ں تھا جس کے بغیر ہر کمال عارضی ہے، ناپختہ اور ناتمام۔

شکلا نے ابّا جان سے کوئی ایسی بات نہیں کی جس کا جواب نا اُنھیں مشکل ہو جاتا۔ یہی اندیشہ ابّا جان کو بھی روک رہا ہوگا جو پیر و دا کا تذکرہ اُن کی زبان پر نہیں آرہا تھا، کہیں معزز مہمان کوئی اطمینان ش جواب دینے کے موقف میں نہ ہو۔ جمرو، شامو، مارٹی اور ٹنگو کچھ ر وہاں بیٹھ کے چپکے سے ایک ایک کر کے باہر نکل گئے تھے۔ شکلا نہ تا تو میں بھی اُن کے ساتھ نکل جاتا مگر شکلا نہ ہوتا تو وہ بھی کیوں تے۔ اس اثنا میں جولین نے چائے کی ٹرے لا کے رکھ دی تھی۔ ں نے چائے بنائی اور ابّا جان نے آدھی پیالی بھی ختم نہ کی ہوگی کہ انک اُٹھ گئے۔ شاید اُنھیں احساس ہو گیا تھا کہ بٹھل کی موجودگی میں ہ شکلا سے دادا کا کوئی ذکر نہیں چھیڑ سکتے اور خود اُن کی موجودگی بٹھل ر شکلا کی کسی ضروری بات چیت میں حارج ہو رہی ہے۔ اُنھوں نے کلا سے واجبی معذرت کی۔ اُن کے ساتھ ہی منیر علی اور مولوی اکرم بھی ٹھ گئے۔

میرے اور بٹھل کے سوا کوئی نہ رہا تو شکلا نے بس چند لمحوں کا وقف کیا، سرگوشیانہ انداز میں بٹھل سے کہا کہ تھانے سے ہمارے جانے کے بعد وہ پھر ماری کے پاس گیا تھا اور اُس نے ماری سے اُس کے بیان پر نظرثانی کے لیے کہا تھا، ماری نے انکار کر دیا۔ ہمارے جانے کے بعد وہ بالکل نڈھال ہو گئی تھی۔ شکلا نے بتایا کہ کل صبح ماری کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، پولیس نے کاغذات تیار کر لیے ہیں۔ ماری کل بھی جیل منتقل ہو سکتی ہے اور اُسے چند دن کے لیے حوالات میں بھی روکا جا سکتا ہے۔ اِس دوران ماری اپنے بیان میں تھوڑی سی ترمیم کر لے تو سزا میں کمی ہو سکتی ہے۔

بٹھل سر ہلاتا رہا۔ "وہ نہیں کرے گی صاحب!" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اُس کے بچوں کا خیال آتا ہے۔" شکلا بے قراری سے بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کی کیا مدد کی جائے۔"

"اب تو تالی بجاؤ صاحب!"

"وہ ایک اچھی عورت لگتی ہے۔ کاش وہ یہ واردات خود کرنے کے بجائے سیدھی پولیس اسٹیشن آجاتی، پھر یہ سب نہ ہوتا۔"

"آگے کا دیکھو صاحب!"

"ہاں۔" شکلا مایوسی سے بولا۔ "وہ تھانے آچکی ہے۔ وقت کو پیچھے چلنا نہیں آتا۔"

"آپ بولو تو اُس کو اُٹھوا دیں؟"

"جی، جی۔" شکلا اچھل سا گیا۔ "کیا کہتے ہو دادا؟"

"سوچ لو صاحب!"

شکلا کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی۔ "تھانے سے اُسے اُٹھایا جا سکتا ہے؟"

"آپ کی مرضی پر ہے۔" بٹھل نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اوہ! نو نو۔" شکلا سر جھٹک کے بولا اور ایک ثانیے کے تذبذب آمیز سکوت کے بعد کہنے لگا۔ "پھر، پھر وہ کہاں جائے گی؟"

"دُنیا کوئی چادر نہیں ہے صاحب!"

"اور بچوں کا...؟؟"

"ساتھ ہی رہیں گے اُس کے۔"

"اور سب چھپے رہیں گے؟" شکلا تلخی سے بولا۔ "کب تک؟ کہاں تک؟ وہ قتل کی ملزمہ ہے دادا۔"

صرف دو ہی تو کیے ہیں صاحب!"

شکلا نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا، تم، تم کیا کہہ رہے ہو دادا!"

"نہیں آتا تو جانے دو۔"

"میری بات دھیان سے سُنو۔" شکلا کی آواز میں ترشی تھی۔ "تم جو کہہ رہے ہو، میرے خیال میں وہ بالکل ممکن نہیں ہے لیکن اگر، اگر ایسا ہو سکتا ہے تو اِس سے اُس کا کوئی بھلا نہیں ہوگا۔ ایسا مت سوچو دادا! ہم اور بھی کئی طریقوں سے اُس ابھاگن کی مدد کر سکتے ہیں۔ صحیح مشورہ تو ایک اچھا وکیل ہی دے سکے گا۔ اِدھر پولیس نے بھی اپنی رپورٹ میں ماری کے لیے نرم روّیہ اختیار کیا ہے۔ وہ ایک عورت ہے، عدالت ضرور اس کا خیال رکھے گی۔" بٹھل چُپ بیٹھا رہا تو شکلا جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ "قانون بھی عجیب ہوتا ہے۔ عدالت کو اچھی طرح یقین ہوگا کہ ماری ایک عادی مجرم نہیں ہے اور وہ دوبارہ ایسا سنگین جُرم نہیں کرے گی۔ ایک لمبی کارروائی کے بعد عدالت بھی جس نتیجے پر پہنچتی، ماری نے وہی کیا ہے مگر ماری کو سزا صرف اِس وجہ سے ملے گی کہ اُس نے عدالت کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔" شکلا بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "پر شاید یہی ٹھیک بھی ہے۔ ایک مرتبہ یہ حق عام کر دیا جائے

تو...۔" شکلا خود چونک پڑا اور حتمی لہجے میں بولا۔ "میری نظر میں ایک قابل وکیل ہے، بیرسٹر بھارگو۔ ذرا مہنگا ہے مگر ہم ماری کے لیے روپے پیسے کی پروا نہیں کریں گے۔ پیسہ ہوتا ہی کس لیے ہے، جتنا پلّے ہے پھینکیں گے، کیوں دادا؟"

"آپ زیادہ جانتے ہو صاحب!"

"کیا یہ پیسے کا صحیح استعمال نہیں ہوگا؟"

"ٹھیک بولتے ہو صاحب!"

بٹھل کے لہجے میں کسی تندی کی آمیزش تھی جو شکلا نے محسوس کرلی۔ "میرا مطلب ہے دادا!" اُس نے نسبتہً تیز آواز میں کہا۔ "بے شک روپیہ پیسہ ہر جگہ نہیں چلتا۔ سونے کا سکّہ بھی بعض جگہ کھوٹا ہو جاتا ہے۔ ہم عدالت کو روپے پیسے سے نہیں خرید سکتے، نہ خریدنا چاہیے مگر ایک تجربہ کار وکیل عدالت میں ماری کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ جتن کرلینے میں کیا حرج ہے۔ ہم کم از کم اُس کی سزا تو کم کرا سکتے ہیں۔" بٹھل کے لبوں میں جنبش نہیں ہوئی۔ شکلا منتشر سا ہوگیا۔ "کیا تم نہیں چاہتے کہ وہ... وہ؟"

"کیسا بولتے ہو صاحب!" بٹھل نے سر اُٹھا کے کہا۔ "ہم تو آپ سے بولے تھے، اُس کی جگہ جا کے بیٹھ جائیں۔"

"نہیں دادا! اِس کی ضرورت نہیں۔ تم بس اتنا کرو، ماری سے جا کے کہو کہ اپنی زندگی ہار چکی ہے تو آگے بچّوں کی زندگی پڑی ہے۔ اُسے بولو، جیسا وکیل مشورہ دے، ویسا ہی بیان دے، تھوڑی ہوش میں آجا۔"

"ملیں گے تو ضرور بول دیں گے۔"

"رات ہوگئی ہے۔" شکلا گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں بھارگو جی سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں، صبح تم جتنی جلدی ہو سکے تھانے پہنچ کے اُس سے مل لو تو اچھا ہے۔ تمھاری بات وہ ضرور مانے گی دادا! ہمیں اُس میں زندگی دوبارہ جگانی ہوگی، سمجھے دادا! دوپہر جب تم نے اُسے دیکھا تھا، اُس وقت وہ کچھ اور تھی۔ لگتا ہے جیسے تم سے ملنے کے لیے اُس نے طاقت بچا کے رکھی تھی۔ شام کو میں دوبارہ اُس کے پاس گیا تو پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اتنی دیر میں وہ ایسی اجڑ گئی تھی کہ مجھ سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں کی۔ اُٹھ کے بیٹھی اور بس خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں انسپکٹر ٹھاکر کو اُس کا خیال رکھنے کا کہہ کے آیا تھا ضرورت پڑنے پر فوراً ڈاکٹر کو بھی بُلانے کا...۔"

"آگ اپنے آپ کو بھی جلاتی ہے صاحب!"

"بالکل دادا! وہ تو ریت کا، راکھ کا ڈھیر معلوم ہوتی تھی، دیکھا نہیں جاتا تھا۔" شکلا کی آواز اُس کے اضطراب کی غمّاز تھی۔ "میں تمھیں بتاؤں، شام اُسے دیکھ کے مجھے شبہ ہوا کہ شاید ہی وہ عدالت کے فیصلے تک چل سکے۔"

"نہیں چلے گی صاحب وہ۔" بٹھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم بھی یہی سمجھتے ہو؟" شکلا تیزی سے بولا۔ "پر دادا! سچ پوچھو تو اِس میں تمھارا بھی دخل ہے۔"

"اپنا!" بٹھل کرسی پر سیدھا ہوگیا۔ "کیا بولتے ہو آپ صاحب بہادر!"

"تمھیں بچّوں کا وارث بنا کے وہ نچنت ہوگئی ہے، سارے کاموں سے نمٹ چکی ہے، اُسے یقین ہے کہ تم اُس کے بچّوں کے لیے اُس سے بڑا سایہ بنو گے، تم، ظہیر اور... گو اُس نے اپنی کل جمع پونجی تمھارے حوالے کر دی ہے مگر وہ جانتی ہے کہ اس کے بغیر بھی ایک بار ذمّے داری لے کے تم وہی کرتے جو زیادہ سے زیادہ تمھارے بس میں تھا، جان سے زیادہ اُن کی حفاظت۔"

"وہ تو الٹی ہوئی ہے صاحب! آپ نے دیکھا ہی ہے اُس حرام کی جنی کو، ہم نے آپ کے سامنے اُس کو سارا بولا تھا۔" بٹھل نے ترشی سے کہا۔

"میں نے دیکھا تھا۔ تم یہی کرتے، تمھاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا لیکن تمھاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ماری کو اتنا یقین بھی نہ آتا۔ وہ تو تم تھے دادا، کوئی اور نہیں۔ اُس وقت تمھیں اسی طرح سننا چاہیے تھا جس طرح وہ کہہ رہی تھی مگر اب تم، تم اُسے بتا سکتے ہو، تمھیں اُس سے کہنا چاہیے کہ ایک ماں سے زیادہ کوئی اُس کے بچّوں کے لیے بہتر نگراں نہیں ہوتا، کوئی بھی نہیں۔ تم اُسے اپنی مجبوریاں بتا سکتے ہو، سیدھے اور سچّے عذر... اِس صورت میں وہ... میرے کہنے کا مقصد یہی ہے۔" شکلا کو وضاحت میں مشکل پیش آرہی تھی۔ وضاحت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بٹھل ساکت و جامد بیٹھا اُسے گھورتا رہا۔

"مجھے اٹھنا چاہیے۔ صبح تھانے میں ملاقات ہوگی۔ اُمید ہے تم جلدی آؤ گے۔" شکلا کا لہجہ حکمیہ بھی تھا، التجائی بھی۔ بٹھل نے آنکھیں بند کر کے اثبات کا اظہار کیا۔ "ویسے بھی اب تمھارے پاس وقت ہی وقت ہوگا۔" شکلا نے کہا۔ "پاڑے تو جانا نہیں۔" میری نظریں یکایک بٹھل کی طرف گئیں، میری طرح اُسے بھی حیرت ہوئی ہوگی۔ پاڑے پر بٹھل کے نہ جانے کے بارے میں شکلا کس وثوق سے کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھنا چاہا لیکن بٹھل کو خاموش دیکھ کے چپ رہا۔

شکلا تیکھے لہجے میں کہنے لگا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ تم نے ابھی

پاڑے سے ناتا توڑنا کیوں ضروری سمجھا حالاں کہ تمھارے اور ظہیر کے کسی بھی ہمدرد کی یہی خواہش ہوگی کہ تم کبھی پاڑے کا رُخ نہ کرو مگر ابھی، ابھی شاید تمھارا وہاں جاتے رہنا کچھ بہتر ہوتا۔"

"اب اپنا اُدھر کوئی کام نہیں تھا۔"

"دوسروں کا تھا، پولیس تمھیں وہاں دیکھنا چاہتی تھی۔ پولیس کو اندیشہ ہے کہ تمھارے جیسے دادا کے پاڑے سے ہٹنے کے بعد دادا لوگ بہت دنوں تک آپس میں جُٹے نہیں رہیں گے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آگے کیسی لُوٹ مار مچے، اُن کے درمیان کتنا سر پھٹوّل ہو۔ ہمیں فوراً ہی خبر دی گئی تھی۔ شام ہی کو پولیس افسروں کی میٹنگ بلائی گئی۔ میرا خیال ہے، اب تمھیں یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں کہ کئی پولیس افسروں کا مَن تمھاری طرف سے صاف نہیں تھا۔ صبح ماری کے تھانے آنے سے پہلے، یعنی کل رات تک اُنھیں شک تھا کہ کہیں وہ تمھی نہ ہو۔ تم نے اُس رات، دادا کی موت کی رات تھانے میں بہروپ بھرا تھا اور پولیس کو فریب دینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اُنھیں افسوس تھا کہ تمھیں اُس رات تھانے میں کیوں نہ روک لیا گیا۔ اِس دوران تمھیں تمام نشانات، شہادتیں مٹانے کا موقع مل گیا ہوگا۔ وہ تم پر ابھی ہاتھ تو نہ ڈالتے، تمھیں کچھ اور وقت دیتے کیوں کہ وہ تمھاری طرف سے پوری طرح باخبر تھے۔ اُنھیں معلوم تھا کہ تم نے بہت دیر بعد پاڑے پر پیرو کی جگہ بیٹھنا قبول کیا تھا۔ وہ افسر جو تمھارے جیسے دادا کے ہاتھ آجانے کے بعد اتنی آسانی سے چھوڑ دیے جانے کے فیصلے پر ناراض تھے، اُن کی رائے میں پاڑے پر تمھارے نہ بیٹھنے کی ٹھیک بھی ایک دکھاوا تھی۔ اُن افسروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی اِسی بِرتے اُن کی بات نہ چل سکی لیکن وہ افسر جنھوں نے تم پر اعتبار کیا تھا، کوئی بات واضح نہ ہونے کی وجہ سے ڈگمگانے لگے تھے۔ بے جیسے کوئی سُراغ ملنے میں اُنھیں ناکامی ہو رہی تھی، وہ کم زور پڑ رہے تھے۔ لوٹ پھر کے اُن کی نظریں تمھاری ہی طرف آتیں۔ ماری آجاتی تو شاید تمھیں زیادہ وقت نہ ملتا۔"

"اپنے کو بس اتنے ٹائم کی ضرورت تھی۔"

"اتنے ہی ٹائم کی؟" شکلا تعجب سے بولا۔

"دادا کو آگ میں پھونکنا اور تھوڑا اِن دونوں کو سنبھالنا تھا۔" بٹھل نے برآمدے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پھر وہ بھی دیر نہ کرتیں۔"

"اندازہ ہے دادا!" شکلا گہری سانس لے کے بولا۔ "میں سوچتا ہوں، اُس رات اگر وہ تمھیں تھانے میں روک لیتے اور تمھارے بجائے کسی اور ذریعے سے گیتا اور اُس کی ماں کو دادا کی خبر ملتی، تو جانے کیا کچھ بدلا ہوا ہوتا...۔"

"نہیں روکتے صاحب وہ اپنے کو۔"

"نہیں روکتے! تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اپنے کو پتہ تھا، وہ روک سکتے ہیں۔ اسی واسطے ہم نے پورا ٹائم لگایا تھا، اُن کو آگے پیچھے کا سمجھانے کو، اِس کے بعد اپنے کو جانے ہی دینا تھا۔"

"میں، میں جانتا ہوں۔" شکلا ہکلاتے ہوئے بولا۔ "پہلے نہیں تو بعد میں مجھے اِس کا احساس ہوا اور اب یہاں آنے کے بعد کچھ زیادہ معلوم ہوا کہ تم نے وہاں کس لیے اتنی تکرار کی تھی۔ پولیس کے سلسلے میں تمھارا تجربہ کم نہیں ہوگا مگر دادا! میں اُنھی لوگوں کے درمیان رہتا ہوں۔ اُن میں سے کسی کا دماغ پھر سکتا تھا، وہی راستے کا پتھر بن جاتا۔ وہ تینوں افسر تمھیں چھوڑنے کا فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ باہر آکے اُنھوں نے یہی کہا بھی مگر پولیس نے یہ سوچ کے کہ تم پر کڑی نگرانی رکھی جائے گی، تمھیں تھانے سے جانے کی اجازت دے دی، فرض کرو اگر ایسا...؟"

"پھر اپنا بھی اُلٹ سکتا تھا صاحب!"

شکلا کے چہرے پر لکیریں کھنچ گئیں جیسے بٹھل کی بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی ہو یا اُسے ناگوار گزری ہو یا بٹھل کی دماغی حالت پر اُسے شک ہونے لگا ہو۔ تاہم اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ "دیر تو ہو جاتی دادا! خیر۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "جانے دو، اب سب بعد کی باتیں ہیں۔ بات کہاں سے چلی تھی، کہاں نکل گئی۔ جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا۔"

"آپ سویرے آنے کا بول رہے تھے۔"

"ہاں!" شکلا مستعدی سے بولا۔ "اور میں، میں کہہ رہا تھا، شکر کرو کہ ماری آگئی۔ وہ نہ آتی تو وہ تمھیں زیادہ وقت نہ دیتے۔"

"ہم بھی نہیں لیتے صاحب!"

"مَیں، مَیں سمجھا نہیں تم...؟"

"اپنے کو جان کاری تھی، وہ اِدھر اپنے پاس ہی پلٹیں گے۔"

"پھر تم!" شکلا جھپٹتی آواز میں بولا "کیا تم، تمھیں معلوم تھا کہ وہ جارجی اور وکی ہی..."

"نہیں تھا تو ہو جاتا صاحب!" بتھل نے تنک کے کہا "پہلے ہم اسی سور کی اولاد کے پاس جاتے۔"

جولین کے آنے پر شکلا کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔ اُس کی نظریں مسلسل بتھل پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے جولین کی طرف بھی توجّہ نہیں دی۔ جولین بھی ٹھیری نہیں، چائے کی ٹرے اُٹھائے خاموشی سے اندر چلی گئی۔ شکلا اپنے آپ میں گم رہا پھر دفعتہً کرسی سے اُٹھ گیا۔ ہم دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔ ابھی ہم دروازے سے باہر نہیں نکلے تھے کہ شکلا پھر رک گیا اور بتھل کا بازو پکڑ کے بولا "میں نے تمھارا بڑا وقت لیا دادا۔"

"وقت کی بات تو تالی جیسی ہوتی ہے صاحب!"

"ہاں!" ایک لمحے بعد شکلا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھِل اُٹھی "مگر یہ سب میری طرف سے تھا۔" وہ اُمڈتی آواز میں بولا۔ "یقین کیجیے، آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، تقریباً شام ہی ہو گئی تھی جب آپ لوگ تھانے سے گئے تھے۔ کچھ دیر مجھے وہاں اور لگی۔ مَن پر بہت بوجھ تھا گھر پہنچ کے نہایا، کپڑے بدلے اور ہیڈ آفس کی طرف جانا چاہتا تھا کہ اِس طرف نکل آیا۔ میں نے بتایا نا، بس جیسے موٹر کا رُخ خود بہ خود اِدھر ہو گیا۔ یہ بھی خیال نہ رہا کہ آپ لوگوں کو آرام کی ضرورت ہوگی۔ دن بھر تھانے اور پاڑے میں لگ گیا تھا۔ وقت مرضی پر نہ چلے تو تھکن بڑی ہوتی ہے اور رغم تو یوں بھی بہت بڑی تھکن ہے۔ پر جی نہیں مانا، سچ پوچھو تو جانے کتنی باتیں دماغ میں اٹک رہی تھیں، کھٹک رہی تھیں۔ یہاں آ کے سب کچھ گڈمڈ ہو گیا۔ تھانے میں اتنی دیر ملاقات رہی تھی، اتنے آمنے سامنے لیکن کوئی کمی محسوس ہوتی رہی اور اب یہ اور بڑھ گئی ہے۔"

"باتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے صاحب! کمی بڑھتی رہتی ہے، پوری ہو جاتی ہے تو بولتے ہیں، ناتے میں دم نہیں رہتا۔"

"ہاں دادا" شکلا پلکیں پٹ پٹانے لگا "تم سے ملنا میرے لیے ایک بہت..." وہ کچھ کہہ نہیں پایا، اُس کا جسم بل کھا گیا۔

"کیا کہا جائے دادا؟"

"کچھ مت بولو صاحب! اپنے کو بھی بہت سُکھ ملا آپ سے مل کے، اور ہم پر تو آپ کا ویسے بھی بہت ادھار ہے، اُوپر سے نیچے تک بندھے ہیں صاحب! آپ کے واسطے سے لاڈلے کو اِس کا بابا مل گیا۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا، یہ سب تو کرشنا جی..."

"آپ کا بھی بہت ہے۔ اِدھر بمبئی آ کے ایسا ہی اُلٹ پلٹ ہوتا رہا۔ آنے کو ٹائم ہی نہیں ملا۔ پر آپ کے پاس آئے بنا اُوٹتے نہ..."

"مجھ پر اعتبار ہے دادا؟" یکایک شکلا نے منتشر لہجے میں کہا۔

"کیا بولتے ہو صاحب!"

"تو پھر بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟"

"کیا صاحب! کس طرف کا بولتے ہو؟"

"میں اور جاننا چاہتا ہوں۔" اور بہت کچھ۔"

"اپنے کو نہیں پتہ، آپ کیا بولتے ہو۔"

"کاش میں پولیس والا نہ ہوتا۔"

"ہم آپ کو نہیں سمجھتے، ایک دم نہیں۔ آپ بولو صاحب کدھر کا آپ کو ڈھکا ہوا لگتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" شکلا نے بہ عجلت کہا "میں اپنی بات ٹھیک طرح کہہ نہیں پا رہا ہوں۔ بہرحال پھر..." شکلا سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کی موٹر تک ہم بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اُس نے چابی گھما کے دروازہ کھولا مگر موٹر میں بیٹھنے سے پہلے وہ مُڑ کے بتھل سے بولا "دادا! اُس کے بچّوں کے پاس کب جانا ہے؟"

"جلدی صاحب، جلدی جائیں گے۔" بتھل نے تحمّل سے کہا۔

"جلد ہی جانا چاہیے، ممکن ہے، اُن تک کوئی ایسی ویسی خبر پہنچ جائے۔ بچّوں پر بُرا اثر پڑے گا۔ مناسب سمجھو تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں؟"

"ضرور صاحب! ضرور۔"

"اُن سے کیا کہو گے، کیا بتاؤ گے دادا؟"

"ٹائم پر دیکھیں گے۔"

"میں مسلسل سوچتا رہا ہوں، دماغ کام نہیں کرتا، یہ آسان کام نہیں ہے دادا!"

"اپنے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے صاحب!"

"اگر کوئی اچھی صورت نہ بنی تو مَیں، مَیں اُنھیں گھر لے آؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک اچھی ماں کے اچھے بچّے ہوں گے۔"

"اتنا آگے کا ابھی کیوں دیکھتے ہو صاحب!"

شکلا اضطراب سے سر ہلانے لگا "تم بھی اپنا خیال رکھنا۔ کوئی کانٹا سا بار بار چبھتا ہے۔ پولیس کی نظر اب تم پر بالکل نہیں ہے لیکن پاڑے کے لوگ! اُن کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ واقف ہو۔ تم سب نمٹا کے وہاں سے چلے آئے ہو اور دوبارہ جانا بھی نہیں چاہتے، نہ وہاں بیٹھنے والوں کو تمھاری جلد واپسی کی اُمّید ہوگی۔ مجھے معلوم ہوا ہے، اُنھوں نے تمھیں روکنے کی بہت کوشش کی تھی اُس وقت انھیں یہی کرنا چاہیے تھا پر وقت بہت جلد گزر جاتا ہے آدمی بھولنے پر آئے تو اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ کل ہمیشہ دوسرا ہوتا ہے۔ وہاں اور بھی بہروپیے ہو سکتے ہیں، اور بھی کئی جارجی۔ اُنھیں زیادہ دیر تمھارا بمبئی میں ٹھیرے رہنا پسند نہیں آئے گا۔ کچھ بھی ہو، وہ تمھیں سدا پیرو دادا کے رشتے سے دیکھیں گے تم نے پاڑے الگ الگ کر دیے، یہ تم نے اچھا کیا۔ یہی ٹھیک فیصلہ تھا مگر کوئی اور نہیں تو ابھی ماہم کا پاڑا باقی ہے۔ آج وہاں سب ایک زبان سے بولتے ہیں۔ کل یہی لوگ ایک دوسرے کے خلاف اُٹھ سکتے ہیں اور سب اِس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں گے کہ جب تک تم بمبئی میں ہو، اُن کا مطلب پورا نہیں ہو سکتا۔ تم کسی وقت بھی اپنا حق جتانے آ سکتے ہو۔ بہت عرصے تک اُنھوں نے پیرو داد کی من مانی قبول کی، اَب پہلی بار اُنھیں چھوٹ ملی ہے۔ وقت کچھ گزر گیا تو شاید وہ ایک دوسرا پیرو برداشت نہ کریں۔ ایک دوسرا پیرو یا اُس کی جگہ کوئی لاڈلا یا راجا..." شکلا میری طرف دیکھے بغیر زیرلبی سے بولا "سُنا ہے، چاقو پر راجا دادا کا ہاتھ بھی بہت صاف ہے؟"

میرے کانوں میں چنگاریاں سی لپکیں حالاں کہ شکلا کے لفظوں میں زہر تھا نہ طنز و استہزا۔ میں نے کچھ نہیں کہا، سر جھکائے کھڑا رہا۔ بتھل نے دخل دینا چاہا تو شکلا نے اُسے روک دیا "پہلے میری سُن لو دادا!" اُس نے عاجزانہ انداز میں کہا "اب وہ پیرو دادا کے گھر کا راستہ بھی جانتے ہیں۔"

"ہم کو بھی جانتے ہیں صاحب! اچھی طرح سے۔"

مجھے علم ہے، وہ کس طرح تمھیں جانتے ہیں، بہت بڑے دادا کی حیثیت سے۔ یہی کہنا چاہتے ہو تم؟ پر پیرو دادا بھی شہر کا سب سے بڑا دادا تھا۔ کتنی آسانی سے اُنھوں نے... تم کہ گے کہ ماہم کے پاڑے پر پیرو کے خاص آدمی ہیں۔ وہ ایک اشارے پر پیرو کے لیے جان قربان کر دینے کو تیار رہتے تھے۔ اُسی کے پالے ہوئے ایک کُتّے نے دادا کو ختم کر دیا۔ میرا مقصد کچھ اور نہیں دادا! بس تھوڑی سی احتیاط مُراد ہے۔ اِس گھر کو تمھاری بہت ضرورت ہے۔ اُس دن جب دادا کی ارتھی اُٹھ رہی تھی، مَیں بھی یہاں لوگوں کے درمیان ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اُس دن میں نے گیتا اور اُس کی ماں کو دیکھا تھا۔ آج وہ بہت سنبھلی ہوئی ہیں۔ سمجھ رہے ہو دادا۔"

بتھل ہنکاری بھر کے رہ گیا۔

"کچھ بُرا لگا ہو تو معاف کر دینا۔" بتھل کی خاموشی نے شکلا کو مجوب کر دیا تھا۔ وہ دبی دبی آواز میں کہنے لگا "سارا اونچا نیچا تو خود تمھارے سامنے بھی ہوگا۔ نہ جانے میں اتنا کیوں کہہ رہا ہوں اپنی حد سے زیادہ۔"

"اب آپ جاؤ صاحب!" بتھل نے آہستگی سے کہا۔

شکلا کے چہرے کا رنگ ایک آن کے لیے متغیّر ہوا پھر وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا "ہاں دادا! میں چلتا ہوں، پر ابھی جی نہیں بھرا۔ یہاں اس سوگ میں بھی کیسی ٹھنڈک ہے، ہو سکا تو دو ایک دن میں پھیرا لگاؤں گا، وقت نکال کے۔"

"نہیں صاحب! اپنی بنتی ہے، ابھی آپ اِدھر مت آنا۔"

"کیوں، کیوں دادا؟" شکلا کی زبان حلق میں اٹک گئی تھی۔

"آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے، اڈّے کے، پاڑے کے لوگ ہیں صاحب! آپ پولیس کے بڑے افسر ہو۔ گھر بھی یہ پیرو دادا کا ہے۔ اِدھر اَب سارے میں گھنٹی..."

"مگر مجھے اس کی، اِس کی پروا نہیں ہے۔"

"اپنے کو ہے صاحب!" بتھل اُس کی بات کاٹ کے بولا۔

"آپ کے لیے بولتے ہیں۔"

شکلا ٹھٹکی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ بتھل نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے موٹر میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شکلا چند لمحے سکوت میں کھڑا رہا پھر اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور موٹر میں بیٹھ گیا۔

اُس کے جاتے ہی مَیں سیدھا کمرے میں چلا آیا۔ تھوڑی دیر میں جمرو، شامو، مارٹی اور ٹنگو بھی آ گئے۔ وہ قریب کی جگہیں گھومتے رہے تھے، اُنھوں نے شکلا کی موٹر جاتے ہوئے دیکھ لی تھی۔ چاروں نے جیسے نشہ کیا تھا۔ وہ آتے ہی بستروں پر اوندھے سوندھے پڑ گئے۔ اُنھیں میرے اور اپنے آرام ہی کا خیال ہوگا جو چند رسمی لفظوں کے سوا اُنھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

رات گئے تک مجھے نیند نہیں آئی۔ پھر رات کا آخری پہر ہوگا جب کہیں میری آنکھ لگی اور کئی دن بعد مجھے ٹوٹ کے نیند آئی۔

بے حسی میں شاید یہی ہوتا ہے۔

صبح کسی کا ہاتھ مجھے اپنی پیشانی پر محسوس ہوا تو میری آنکھ کھُلی۔ میں ہڑبڑا کے اُٹھ گیا۔ سفید کُرتے اور پاجامے میں ملبوس جولین آئی تھی، نکھری نکھری، اُجلی اُجلی۔ پہلی نظر میں تو مجھے زریں کا گماں ہوا، جولین کو اس لباس میں، میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ میرے ہڑبڑانے پر وہ بھی گھبرا گئی۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اُس نے متردّد لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہاں، بالکل۔" میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں کمرہ خوب روشن تھا۔ جولین کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ "کیا وقت ہوا ہے؟" جولین کے جواب دینے سے پہلے میری نظر گھڑی پر گئی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ "اتنی دیر ہو گئی؟" میں نے سٹ پٹاتی آواز میں کہا۔

"تو کیا ہوا۔" وہ مُسکراتے ہوئے بولی۔ "دِنوں کی نیند تھی۔"

"یہ لوگ کہاں گئے؟"

"جمرو بھائی تو سویرے سویرے بابا کے ساتھ نکل گئے تھے باقی سب یہیں ہیں۔"

"کہاں! بتّھل بھائی کہاں گئے ہیں؟"

جولین کو کچھ معلوم نہیں تھا مگر مجھے یاد آ گیا۔ بتّھل کو تو صبح ہوتے ہی قلابے کی طرف نکل جانا چاہیے تھا۔ یقیناً اُس نے میرے اُٹھنے کا انتظار کیا ہو گا۔ "مجھے اُٹھا لیا ہوتا۔" میں نے تن دہی سے کہا۔

"بابا نے منع کر دیا تھا۔ کئی بار میں جھانک کر گئی، فرخ اور رفیال بھی، تم بے خبر سو رہے تھے۔" جولین شگفتگی سے بولی۔ "کیا بہت ضروری کام تھا؟"

"نہیں۔" میں نے بہ شدّت تردید کی۔ "کوئی ایسا کام نہیں۔"

اتنی دیر میں میری آنکھیں پوری طرح کھُل گئی تھیں۔ آدمی بھی مناظر اور موسموں کی طرح خواص رکھتے ہیں۔ کوئی تا دیر اُن سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک کھڑی ہوئی ہے۔ "بیٹھ جاؤ۔" میں نے اپنے بال درست کرتے ہوئے کہا۔

قریب کوئی کرسی نہیں تھی۔ وہ میرے پائنتی سکڑ کے بیٹھ گئی۔ میرے جی میں آیا، اُس سے کہوں کہ تم ان کپڑوں میں کیسی مختلف کتنی اچھی لگ رہی ہو۔ ہو سکے تو یہی لباس پہنا کرو مگر مجھے مناسب لفظ نہیں ملے۔ "اور اندر تو سب خیریت ہے؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، سب ٹھیک ہے۔" اُس کی آنکھیں اور چمک اُٹھیں۔ رانی بھابی اور گیتا آج اور بہتر لگ رہی ہیں۔ خدا کرے، سب ایسا ہی رہے۔"

"ہاں دیکھو، اتنی جلد تو..." میری آواز گھٹنے لگی۔

"سب اُن کے قریب ہی رہتے ہیں، کسی وقت بھی وہ خود کو تنہا اور بے آسرا نہ سمجھیں۔ اُنھیں احساس رہے کہ ایک پیرو بابا گئے ہیں، اُن کے پوچھنے والے ابھی بہت سے ہیں۔"

"مگر کبھی بہت سے آدمی بھی ایک آدمی کا بدل نہیں ہوتے۔"

"کوئی بھی اُن کے لیے پیرو بابا کی جگہ نہیں لے سکتا۔" جولین یاس سے بولی۔ "رشتے عہدوں کی طرح نہیں ہوتے۔"

اس نے کیسی سچّی بات کس سادگی سے کہی ہے۔ میں اُسے دیکھا کیا۔ "رات شکلاجی دیر تک بیٹھے رہے؟" مجھے خاموش دیکھ کے اُس نے پوچھا۔ اُس کا لہجہ تجسّس سے عاری نہیں تھا۔

"ایسے ہی۔" میں نے کہا اور سوچا کہ ماری کے متعلق اِسے بتا دینے میں کیا حرج ہے لیکن پھر یہ بہت سے سوال کرے گی اور مجھ سے شاید ہر بات کا جواب نہ دیا جا سکے، سو میں نے اپنی زبان بند رکھی۔

"رات رما اور کیلاش بھی نہیں آئے۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

"مجھے بھی کئی بار اُن کا خیال آیا، کوئی کام ہو گیا ہو گا۔"

"وہ دونوں بہت اچھے ہیں۔"

"بہت، کم لوگ ایسے ہوتے ہیں۔"

"کیلاش کو تو دیکھا ہی تھا، رما تو کچھ اور بھی... وہ ایک ذہین، ہم درد اور..." وہ لفظ ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو انگریزی میں بولی۔ "ویل مینرڈ اور کری ایٹو..."

"ہاں، اُس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔"

"خوب صورت بھی بہت ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ میں نے کہنا چاہا، تم میں بھی یہ خوبیاں کم نہیں ہیں لیکن میں سوچتا رہ گیا یا اُس نے مجھے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہیں دی، سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ "تمھاری بڑی تعریف کرتی ہے۔"

"ہُنھ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "تعریف کیا، سب ہم دردی کرتے ہیں۔ میری صورت ہی شاید کچھ ایسی ہے۔"

"صورت کی بات نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "تم کیا سمجھتے ہو، تمھاری صورت کیسی ہے؟"

"مجھے کیا معلوم، کوئی بات تو ایسی ہو گی۔ میں تو یہی دیکھتا ہوں۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہتا، لوگ خود بہ خود ہم دردی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔"

"وہ تم سے خاصی متاثر لگتی ہے۔"

"پہلا تاثر تو صورت ہی کا ہوتا ہے۔"

"مگر پہلا ہی، رما ایسی لڑکی نہیں جو سامنے کی چیزوں پر توجہ دے۔" جولین کی دھیمی آواز میں تیقن بھی تھا، تلقین بھی تھی، کہنے لگی۔ تم کسی سے کچھ کہتے جو نہیں، یہ بھی تو وجہ ہو سکتی ہے۔ رما کی نظریں ویسے بھی خوب گہری ہیں۔ ابھی کل ہی کہہ رہی تھی کہ اِس شخص سے مل کے کسی دریافت کا سا احساس ہوتا ہے۔"

"وہ ایسی ہی دل چسپ باتیں کرتی ہے، خیالی، تصوّری۔"

"ایسا غلط تو نہیں کہتی۔"

"تم بھی یہی سمجھتی ہو؟"

"میرا کیا! میں تو اُس کی بات کر رہی ہوں۔" وہ کسی قدر خفگی سے بولی اور چادر کی شکنیں درُست کرنے لگی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی کش مکش سے دوچار ہے اور کچھ کہنا چاہتی ہے مگر لمحے گزر گئے، وہ چُپ رہی۔ میں نے کہا۔ "اب گھر کب جاؤ گی؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"جانا چاہتی ہو؟"

اُس نے پلکیں اٹھا کے ایک نظر مجھے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ "میرا مطلب ہے، اُدھر بھی گھر خالی پڑا ہو گا۔ تمھارے اسکول کا بھی حرج ہو رہا ہو گا۔" میں نے رُک رُک کے کہا۔

"تو کیا مجھے چلے جانا چاہیے؟"

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں، میں کہنا چاہتا تھا کہ کب تک ایسے..." میری آواز بھٹکنے لگی۔ "کوئی اور بات دل میں مت لانا۔"

"جانے تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں، شاید میں خود بھی نہیں جانتا۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "بس ایسے ہی خیال آیا کہ سبھی منتشر ہو گئے ہیں۔"

کوئی نئی بات تو نہیں، ایسے وقت میں یہی ہوتا ہے کسی کو بھی یہاں کوئی الجھن یا پریشانی نہیں ہے۔ سب کی یہی کوشش بلکہ آرزو ہے کہ کسی طرح جلد سے جلد دونوں کو قرار آ جائے۔ اِس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو ہے مگر، مگر..."

"یہ سب تو کسی کے بھی ساتھ پیش آ سکتا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے ناتوانی سے کہا۔

"لگتا ہے، تمھیں کچھ زیادہ..." وہ لفظ چبا چبا کے بولی۔

"تم بہت تھکے ہوئے ہو، بہت تھک گئے ہو۔"

"یہ تھکن نہیں ہے۔"

"پر کچھ ہے تو سہی۔"

"کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے کبیدگی سے کہا۔

اُس نے حجّت نہیں کی اور نگاہیں نیچی کیے بیٹھی رہی، پھر نرمی سے بولی۔ "تم سے کئی باتیں کرنی تھیں۔ وقت ہی نہیں مل پاتا۔ خیر پھر کبھی، تم اب تیار ہو جاؤ، میں ناشتہ لاتی ہوں۔"

"کیا بات ہے؟ بیٹھو نا!"

"اندر سے آئے دیر ہو گئی ہے۔"

"اندر تو سبھی لوگ ہیں۔"

"تم تو فکرمند ہو گئے۔" اُس کے لرزیدہ ہونٹوں پر مُسکراہٹ بکھر گئی، ایک اختیاری مُسکراہٹ، مہذّب لوگوں کو جو خوب آتی ہے۔ "ذرا اُدھر کا حال دیکھ کے پھر آتی ہوں۔ اتنی دیر میں تم منہ ہاتھ دھو، کپڑے باتھ روم میں رکھے ہیں، تبدیل کر لینا، نہانے کا ارادہ ہو تو گرم پانی کا برتن بھی رکھا ہوا ہے۔" وہ مجھے ہدایات دیتے ہوئے اُٹھنے لگی تو میں نے غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ایسا لگا جیسے اُس کی کلائی کانچ کی بنی ہو، ایک ذرا تیز گرفت سے ٹوٹ جائے گی مگر دوسرے ہی لمحے میرے جسم کی طاقت جیسے کسی نے کھینچ لی، میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا یا مجھ سے چھوٹ گیا اور میں نے دیکھا، اُس کا سراپا بھی کسی شاخ کی طرح لچک گیا ہے۔ وہ بیٹھ گئی۔ لمحوں تک خاموشی طاری رہی نہ میں نے اُس سے کچھ کہا نہ اُس نے۔ "کوئی خاص بات نہیں۔" آخر وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔ "جانتے تو تم بھی سبھی کچھ ہو۔ سب تمھارے سامنے ہے۔ میں کوئی اضافہ نہیں کروں گی۔ ایسا لگتا ہے جیسے تم کچھ بھول گئے ہو، بار بار بھول جاتے ہو۔ بھول جانا اور یاد آ جانا آدمی کے بس میں نہیں، پر آدمی کے بس میں تو بہت کچھ نہیں ہے۔ زندگی بھر وہ اپنے بَس کی چادر کھینچتا، پھیلاتا رہتا ہے۔ شاید زندگی بھی اتنی ہی ہے۔"

جولین رک گئی۔ مجھے اُس کے سلسلے میں گرہ پڑ جانے کا اندیشہ تھا جبھی اپنے تجسّس کے باوجود میں نے بیچ میں ایک لفظ نہیں کہا۔ اُسے بھی ایک لحظے کی مدت میں میری سماعت کی طرف سے کوئی اطمینان مطلوب تھا کہ اُس کی سمٹی سمٹی آواز نسبتہً کشادہ ہو گئی، کہنے لگی کہ جہاں تک اُس کے مشاہدے میں آیا ہے، آدمی دو طرح کی زندگی گزارتا ہے، ایک اپنے لیے، ایک دوسروں کے لیے۔ دونوں ساتھ ساتھ۔ اپنے لیے کم دوسروں کے لیے زیادہ۔ اپنے لیے تو اُسے زندگی کا دس فی صد حصّہ بھی شاید نہیں مل پاتا۔ یہاں ہر شخص بندھا ہوا ہے، اُس نے یکا یک

مجھ سے پوچھا "تم نے رُوسو کو تو پڑھا ہوگا؟"

"رُوسو کو! ہاں ہاں، کبھی پڑھا تھا۔" میری زبان پر جیل کا نام آتے آتے رہ گیا کہ مَیں نے جیل میں معاہدۂ عمرانی نامی کتاب پڑھی تھی۔ میرا شوق دیکھ کے جیلر صاحب اور سُونیا مجھے ہر طرح کی کتابیں فراہم کرتے تھے۔ اُس کے بعد تو مجھے پڑھنے لکھنے کا ایسا موقع ہی نہیں ملا مگر مجھے رُوسو کا نام اچھی طرح یاد تھا۔

"اُس نے کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ پیدا ہوتا ہے مگر جدھر دیکھو، زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، جکڑ جاتا ہے۔" جولین کا چہرہ جل بجھ سا رہا تھا، آواز بھی جیسے پگھل رہی ہو، دوپٹے کا کونا انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے بولی کہ رُوسو نے یہ قول کسی اور پس منظر، حوالے سے کہا تھا لیکن یہ تو بہت وسیع ہے۔ طرح طرح سے اِس کی تشریح کی جاسکتی ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ جو لوگ صرف اپنی زندگی گزارتے ہیں یا جنھیں اِس کا موقع مل جاتا ہے، وہ خوش قسمت ہیں یا دوسروں میں مصروف رہنے والے، دوسروں کی خاطر خود کو بھول جانے والے، دانستہ یا مجبوراً۔ کوئی بھی صورت ہو مگر یہ اچھی بات کہی جاتی ہے اور شاید یہی ہونا بھی چاہیے پھر بھی معلوم نہیں کہ سچ کیا ہے؟ اپنے لیے زندہ رہنا سچ ہے یا دوسروں کے لیے؟ کون سا سچ بڑا ہے، کس میں زیادہ لطف ہے؟

اُس کی آواز اُلجھنے لگی۔ ہندوستانی میں اُسے مشکل پیش آتی تھی تو وہ انگریزی کا سہارا لیتی تھی۔ مَیں گونگوں کی طرح بیٹھا رہا۔ "رُوسو نے کہا تھا کہ آدمی آزاد پیدا ہوتا ہے مگر کیا واقعی ایسا ہے؟" وہ بکھرے بکھرے انداز میں بولی۔ "یوں کہا جائے تو کیا غلط ہوگا کہ آدمی پابند پیدا ہوتا ہے کہ وہ جنگل میں نہیں پیدا ہوتا اور وہ اپنی آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے، ہر دم اِس جتن میں رہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنی زندگی گزارے مگر یہ تو اُس کے آگے پیچھے کی دیواروں اور زنجیروں پر منحصر ہے کہ وہ کتنی اُس پر مہربان ہوتی ہیں اور آدمی کامیاب ہو جائے، وہ ساری زنجیریں، سارے رشتے ناتے توڑ کے خود کو آزاد کرالے تو کیا وہ جنگل کی طرف نکل جائے۔ اگر وہاں بھی آدم زاد جا نکلے وہ پھر اُس کے گرد گھیرا ڈال دیں گے۔ زنجیروں سے مراد دوسرے آدمی ہیں۔"

اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھ پر کوئی سنّاٹا سا طاری تھا۔ اُس نے میرے جواب کی ضرورت بھی نہیں سمجھی میرے سکوت میری تائید پر محمول کیا یا لاجوابی پر۔ کسی توقف کے بغیر وہ بولی کہ تنہا آدمی کا شاید کوئی وجود نہیں۔ آدمی آدمی سے عبارت ہے ایک جنگل نشیں کی زندگی کتنی ہی اپنے لیے ہو مگر دوسروں کے لیے اُس کی موت کے مانند ہے۔ آدمی دوسروں کے حوالے سے مرتا ہے کہ اُس کی موت کا احساس کرنے والے اُس کے پسماں دگان ہی ہوتے ہیں۔ وہ خود تو ہر قسم کے احساس سے مبرّا ہو جاتا ہے۔ کوئی جنگل میں چلا گیا ہے تو صرف اپنے لیے زندہ ہے، دوسروں کے لیے نہیں۔ تنہائی آزادی نہیں ہوتی اور تنہائی کی یہ آزادی تو پھر بھی مشروط ہے۔ آزادی سے کیا مراد ہے؟ ذات کی آزادی! پھر یہ تو اُسی وقت مکمل ہوگی جب آدمی ہر قسم کے بیرونی اثرات اور نقش و نگار سے مستثنا ہو جائے۔ ابتدا ہی سے اُس کی تربیت مختلف ہو اور انسانوں سے اُس کا واسطہ یکسر نہ پڑے لیکن یہ ایک اَن ہونی بات ہے۔ آدمی کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اُسے ابتدا سے دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ آزاد کب پیدا ہوتا ہے۔ رُوسو نے سماجی اقدار، روایات، قانون اور اخلاقی ضابطوں کو زنجیروں اور دیواروں سے موسوم کیا ہے۔ ان سے مفر نہیں تو ملال سے کیا حاصل۔

جولین کے تراشیدہ ہونٹوں پر لفظ جیسے اُمڈ اُمڈ کے آرہے تھے، کہتے ہیں، نہاں خانے کی تپیدگی کے بغیر لہجے میں یہ سوزش نہیں ہوتی۔ اُس کی آواز دھڑک رہی تھی۔ کہنے لگی، یقیناً آدمی کو کچھ دیر اپنے ساتھ بھی رہنا چاہیے کہ دوسروں پر صَرف ہونے کے لیے یہ توانائی ضروری ہے۔ وقت جس قدر بھی ایسی مہلتیں دے، اُنھیں غنیمت سمجھنا چاہیے۔ کاش یہ مہلت ملا ہی نہ کرتی اور آدمی عارضی آزادی کے سراب میں نہ رہا کرتا۔ یہ عارضی آزادیاں تو اُسے اور پریشان کرتی ہیں۔ اُسے دوبارہ معمول کی زندگی سے مطابقت کرنے کی دشواری پیش آتی ہے پھر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے۔ آدمی کا تعلق اپنی ذات سے بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس کے خواب اپنے ہوتے ہیں، خیال اپنے اور خواب بھی ایک حقیقت ہیں کہ آدمی کو آسودہ رکھتے ہیں یا پراگندہ کرتے ہیں۔ تخلیق کا بھی یہی ہے کہ یہ بھی فرد کے خواب کی طرح ہے بلکہ خواب کی تعبیر کا درجہ رکھتی ہے۔ کوئی تخلیق، کسی فکر کے بغیر ممکن نہیں ہوتی اور فکر خلوت کے بغیر۔ اور پھر وہی بات، کیا خلوت آزادی ہے؟ تخلیق کی قدرت کسی نہ کسی حد تک ذہن و فکر کی آزادی کی نشان دہی کرتی ہے مگر خیال ہو یا خواب یا تخلیق، سب پر اُن کے عہد کی چھاپ ہوتی ہے۔ آدمی خواب اپنی زبان میں دیکھتا ہے اور سوچتا بھی اپنے عہد کے واسطوں سے ہے۔

وہ کہتی رہی، چپکے چپکے، دھیمے دھیمے انداز میں تند و تیز باتیں۔ بے شک میری حیرت اور تردد میں اب اشتیاق بھی شامل تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اُسے پہلی بار دیکھ اور سُن رہا ہوں۔

وہ دن یاد آرہے تھے۔ شروع میں جب مَیں نے کرشنا جی کو اپنے ...ے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور اُنھوں نے میری تعلیم کے لیے اُسے مقرر ...تھا۔ اُس وقت بھی اُس کی جُز بینی اور خیال آفرینی کا یہی حال تھا۔ ...نا جی اِسی وجہ سے اُسے پسند کرتے تھے۔ اُنھوں نے اُسے مزید ...ادر مطالعے کا مشورہ دیا تھا۔ بعض اوقات وہ اُسے کتابیں بھی ...ھنے کو دیتے تھے۔ کرشنا جی کے بعد اُن کا سارا سامان مجھے منتقل ...تھا تو کتابوں کا ایک انبار بھی ساتھ تھا۔ مَیں نے وہ سب کچھ جولین ...والے کر دیا تھا اور مَیں نے دیکھا تھا، یہ کتابیں جولین نے نہایت ...قے سے الماریوں میں سجائی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا، ممبئی سے ...ی عدم موجودگی کے دوران وہ بس انھی سے شغل کرتی رہی ہے۔ ...ے خبر تھی، اُس وقت مجھے پڑھانے کے لیے آنے والی نازک اندام ...بدہ قامت، ترشے ہوئے خال و خد، کھلتے ہوئے گندمیں رنگ، ...ن کھناتی، گنگناتی آواز میں بات کرنے والی وہ اُداس اُداس اور ...م مستعد، اجنبی لڑکی گھر کی ایک فرد بن جائے گی۔ میری آنکھوں میں ...رکی دُھند کب کی چھٹ چکی تھی مگر نہ جانے دفعتّہ اُسے کیا ہوا کہ اُس کی زبان ...نے لگی۔ "مَیں جانے کتنی دُور چلی گئی۔ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔" وہ ...ت زدہ لہجے میں بولی۔ "پھر بھی شاید یہ سب ایسا نہیں جو مشکل ...ے سمجھ میں آئے۔"

"مَیں، مَیں سمجھ رہا ہوں۔"

"مجھے اتنا کچھ نہیں کہنا تھا، بس..."

"اِسی طرح، اِسی طرح کہتی رہو۔"

"کیوں؟" اُس کا چہرہ لال ہو گیا۔

"یہ باتیں کرتے ہوئے تم کیسی خناث سی ہو۔"

"اچھی نہیں لگ رہی ہوں گی۔" وہ سرسراتے ہوئے بولی۔

"مَیں نے کب کہا۔ کِس نے کہا یہ؟"

اُس کا سر اور جُھک گیا۔

"تُم چُپ کیوں ہو گئیں؟" میں نے مضطربانہ کہا۔

"شاید کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے۔"

"ضرور تم پر کسی احساس کا غلبہ ہو گیا ہے۔"

"کیسا احساس؟"

"یہی کہ، یہی کہ میری کوئی بات بُری لگ جانے کا احساس مگر ...م تو بہت اچھی، بہت سچی باتیں کر رہی ہو۔"

وہ مسکرانے لگی اور جھجکتے ہوئے بولی۔ "صرف اتنا کہنا تھا کہ ...م اکیلے نہیں ہو، بہت سے ہیں جو تمھاری طرف دیکھتے ہیں۔ تمھیں دیکھ کے جن کی ہمّت بڑھتی ہے اور خوشی ہوتی ہے کہ تم اُن کے پاس ہو، وہ تمھارے پاس ہیں، باوا جان، فرخ فریال، اکبر، فارہہ، جہاں گیر، کس کس کا نام لوں، منجھل باوا، زرّیں، نیساں، خانم اور راب رانی بھابی، گیتا... یہ بھی تو تمھاری زندگی میں شامل ہیں۔ آدمی دیکھنے میں ایک نظر آتا ہے مگر اُس میں بہت سے اور بھی ہوتے ہیں۔ ان سب سمیت مل کے ہی کسی آدمی...؟"

مَیں نے اضطراری انداز میں تائید کرنی چاہی تو معلوم نہیں وہ کیا سمجھی، عاجزی سے بولی کہ بہتر ہے، میں کچھ نہ کہوں، جو جواب مجھے دینا ہے، مناسب ہوگا کہ مَیں خود کو دُوں اور گھٹی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "لگتا ہے، فرخ، فریال تمھیں حاصل کر کے بھی تم سے دُور ہیں۔ اِس حقیقت کے باوجود کہ تمھیں کسی اور طرف دیکھنے کا وقت ہی کب اور کتنا ملا ہے۔" مَیں نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے پھر روک دیا۔ "مجھے تمھارے حال کا تھوڑا بہت اندازہ ہے۔ تم دوسروں کے لیے خود پر کم جبر نہیں کرتے لیکن وہ اس سے سوا چاہتے ہیں اور سوچو تو تمھارے لیے بھی یہ ضروری ہے۔ وقت بہت گزر گیا ہے۔ پہلے کی بات اور تھی، اب، اب تمھیں اور طرف بھی دیکھنا ہے۔"

"میں اپنی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔"

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" وہ بے تابی سے بولی۔ "دوسرے لوگ جیل خانہ نہیں ہوتے۔ وہ تمھارے کام آنا چاہتے ہیں۔ سب کی یہی آرزو ہے کہ تم کسی طرح خوش رہو۔ دوسرے بھی تو کسی کے کام آتے ہیں۔"

"ہاں ہاں، میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ..."

اُس نے میری بات نہیں سُنی اور تیزی سے بولی۔ "آدمی کو کبھی نہ کبھی کسی ایک جگہ ٹھہر کے پیچھے کی طرف دیکھنا، کچھ سوچنا ضرور پڑتا ہے۔ ہوا نے جن کا ساتھ نہیں دیا یا لکیروں نے، جو کچھ بھی ہوا، وہ اپنے کام نہیں آسکے یا اپنے نہیں بن سکے تو وہ خود کو دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مَیں جانتی ہوں، تم اپنے طور پر بہت کوشش کرتے ہو گے مگر کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اب کچھ دوسروں پر چھوڑ دو، کچھ عرصے کے لیے سہی..."

"میرا، میرا کیا مطالبہ ہے، اب کوئی بھی نہیں۔" میری آواز ڈوبنے لگی۔ "پہلے بھی کچھ نہیں تھا۔"

"اِسے شکایت مَت سمجھنا، مَیں شاید اپنی بات کہہ نہیں پا رہی۔" اُس کا بدن بے قرار سا ہو گیا۔ اور وہ مضطرب لہجے میں بولی۔ "نہ جانے میں کیا، کہنا چاہتی ہوں۔"

"گھبرا کیوں رہی ہو، تم نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔"

"مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تمھارے لیے کچھ نیا نہیں ہے۔"

"ضروری نہیں کہ صرف نئی باتیں ہی کی جائیں۔ دوسرا کوئی کہتا ہے تو اپنے سوچے ہوئے کو زبان مل جاتی ہے۔ کوئی تصدیق ہو جاتی ہے۔ یقین کرو۔ میری تو ہر دم یہی کوشش رہتی ہے کہ مجھے کچھ یاد نہ رہے، کچھ بھی۔ لیکن میں، میں کیا کروں۔۔۔" میری آواز بھرّانے لگی۔

"ایسے نہیں، ایسے کوئی کیسے کچھ بھول سکتا ہے۔ اِس کے لیے تو بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں، اور یہ تو گرہوں پہ ہے کہ وہ کتنی پڑی ہوئی ہیں، نقش کتنا گہرا ہے۔ پر آدمی سامنے کی زندگی کیوں کھو دے۔ دھوپ ہی میں کیوں کھڑا رہے۔ رما کے بہ قول آدمی چھوٹی چھوٹی چھاؤں سے کیوں کنارہ کش رہے۔"

مجھے یہی حیرت ہو رہی تھی کہ رما اور جولین کی باتوں میں کیسی مماثلت ہے۔ "لگتا ہے، رما نے سبھی کچھ دُہرا دیا ہے۔" مَیں نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

"وہ ایک نفیس لڑکی ہے، کہہ رہی تھی کہ مجھے خوشی ہو گی، اگر مَیں ظہیر صاحب کے کسی کام آ سکی اور کہہ رہی تھی، یہاں بمبئی کی بھیڑ بھاڑ میں سکون کی بہت سی جگہیں ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ مَیں انھیں وہاں لے جاؤں۔ مَیں نے کہا۔ یہ تو بہت اچھا ہو گا۔"

"وہ بالکل اپنے بھائی کے مانند ہے، دوست، دردمند مگر شاید وہ مجھے مریض سمجھتی ہے کوئی۔"

"مریضوں کی کمی نہیں ہے اس شہر میں۔"

"مَیں بھی کسی مریض سے کیا کم ہوں۔"

"ایسا مت کہو، میرا خیال ہے، اُسے تمھارے بارے میں اتنا کچھ معلوم نہیں ہے، ویسے بھی تو کوئی کسی سے متاثر ہو سکتا ہے۔"

"ہاں ہاں۔" میرے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

"اُس سے مِل کے اچھا لگتا ہے۔ یہاں سبھی کے دل میں اُس نے گھر بنایا ہے۔ اپنی دل نشین باتوں، بے تکلفی، دوسروں کے کام آنے کے جذبے اور اپنی ذہانت سے۔ اُس کے ساتھ بیٹھ کے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ مَیں سمجھتی ہوں، تم اُس کے ساتھ چند دن گھوم پھر کے دیکھو، کچھ اور نہیں تو یہ کڑا وقت نکل جائے گا۔ رما ایک ایسی لڑکی ہے جو کبھی کبھی، کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ مَیں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ ایک قیمتی لڑکی ہے۔ میری بات سن کے وہ کھِل کھِلا پڑی لیکن یہ سچ نہیں ہے کیا، اتنی بہت سی خوبیاں ایک شخص میں

کب اور کہاں۔۔۔۔۔۔" اُس نے اپنی لمبی پلکیں اُٹھا کے تائیدا نظروں سے مجھے دیکھا۔ مَیں چپ رہا۔ وہ بے کلی سے بولی۔ "نہیں کیا ایسا؟"

"نہیں۔" مَیں نے چونک کے کہا۔ میرا دل بُری طرح دھ لگا تھا۔ مجھ سے کچھ اور نہیں کہا گیا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ ا کیا کہنا چاہیے۔

وہ دیر تک گُپ چپ بیٹھی رہی۔ پھر معاً مسہری سے اُٹھ گئی۔ "مجھے اب چلنا چاہیے۔"

"کیوں، کیا بات ہے؟" میں نے بے ترتیبی سے کہا۔

"بس، بہت وقت ہو گیا ہے۔"

"چلی جانا۔"

"آ جاؤں گی پھر۔" وہ تذبذب سے بولی۔

"اُسی لمحے باہر سے کسی کی چاپ سُنائی دی۔ جولین نے شانے پر دوپٹا درست کیا اور ایک مُسکراتی نظر مجھ پر ڈال کے جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مَیں نے بھی اُسے نہیں روکا مگر ابھی وہ کمرے ہی میں تھی کہ دروازے پر فرخ نمودار ہوئی۔ "ارے، آپ یہاں ہیں جولی۔" فرخ کی چہکتی آواز کمرے میں گونجی۔ مجھ پر اُس کی نگاہ بعد میں پڑی، وہ پریشان سی ہو گئی، خجل بھی ہوئی۔ اُس نے گھبراہٹ کے عالم میں مجھے سلام کیا۔ جولین ٹھیر گئی اور فرخ کا ہاتھ تھامے ہوئے دوبارہ میرے پاس آ گئی۔

"کیسی ہو تم، تم فرخ!" مجھے اپنا ہی لہجہ مصنوعی لگا۔ مَیں ہاتھ بڑھا کے بے اختیار اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ کچھ سہم سی گئی تھی۔ میرے سارے جسم میں یکایک ایک لہر سی اٹھی۔ مَیں اُسے اپنے سینے سے لگانا اور خوب پیار کرنا چاہتا تھا۔ مَیں اُسے بازو میں سمیٹ لیتا لیکن جولین پاس ہی کھڑی تھی۔ یکایک کسی نے ٹھوکا سا دیا، جولین کیسی اجنبیت محسوس کرے گی۔ چند لمحے پہلے وہ میرے پاس بیٹھی تھی اور میری خاطر اپنا سینہ جلا رہی تھی، کئی بار اُس کے لیے بھی میرے بازو منڈلائے تھے۔ میرا جی چاہا تھا کہ مَیں اُسے سینے سے لگا کے بہت روؤں، اُس سے کہوں کہ میرے لیے کیوں اتنی آزردہ ہوتی ہو، تمھاری ہر دلیل درست ہے، سب سچ ہے لیکن مَیں کیا کروں، بس اچانک سب کچھ جیسے میرے ہاتھ سے چھین جاتا ہے۔ مَیں جتنا بھی سمیٹ کے رکھتا ہوں، کسی لمحے سب بکھر جاتا ہے۔ آدمی اپنے بس کی چادر بھی تو بس سے زیادہ نہیں کھینچ سکتا۔ مَیں نے خود سے پوچھا، جولین کے وقت میرے بازو کیوں اٹھ گئے

مجھے اِس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ شمار میں کیا فرخ پہلے ہے، جولین بعد میں؟ ایسا بالکل نہیں تھا۔ جولین کے لیے بھی دل میں اتنی ہی ہمک اُٹھتی تھی جتنی فرخ کے لیے۔

وہ دونوں مسہری پر میرے قریب بیٹھ گئیں۔ فرخ میرے سے چمٹ گئی۔ اُس کے انداز میں وارفتگی تھی جیسے وہ اپنے کی جزوِ جاں بن جانے کو بے چین ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے، چہرے پر لالی پھوٹی پڑتی تھی۔ اُسے یوں گلزار کے جولین کی بازگشت میرے رگ و پے میں گونجتی تھی۔ آدمی کو لیے نہیں تو دوسروں کے لیے روشنی بن جانا چاہیے۔ اُس ایک اور سوال نے مجھے حیران و ہراساں کیا۔ جولین اس قدر پاس لے مجھ سے اتنی کھنچی کھنچی کیوں بیٹھی ہے؟ اِس میں فرخ جیسی شیفتگی بے ساختگی کیوں نہیں ہے؟ بے شک اُس کی آنکھوں میں فرخ سے چمک اور رخساروں پر فرخ سے گہری سرخی تھی مگر مجھے کوئی ب نہیں سوجھا اور مَیں نے جولین کا امتناع اپنی کسی کوتاہی کے ل پر محمول کیا، مَیں نے جانا کہ یہ میرے کسی سوال کا جواب ہے مگر ن سے سوال کا جواب؟ اور کون سی کوتاہی کا ردِ عمل؟

جولین کے ٹوکنے پر فرخ اُٹھ گئی۔ دونوں نے حکمیہ انداز میں ے جلد از جلد تیار ہو جانے کی ہدایت کی تاکہ وہ ناشتہ لا سکیں۔ اب شتے کا وقت نہیں رہا تھا اور مجھے کوئی خواہش بھی نہیں تھی لیکن ھوں نے سُنی اَن سُنی کر دی اور کمرے سے چلی گئیں۔ میں تا دیر مسہری بے ارادہ بیٹھا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ اپنی استواری کی کوئی کوشش تی یا مجھے کسی چیز کی تلاش تھی۔ نہانے کے دوران بھی میری نگاہیں بھٹکتی رہیں، مَیں اپنے آپ سے وضاحتیں کرتا رہا۔ دو بالٹی پانی سے رف باہر کی گرد صاف ہوتی ہے، اندر کے گرد و غبار کے لیے تو سمندر بھی ناکافی ہے۔

(۲)

ہٹھل کے انتظار میں دوپہر کا کھانا دسترخوان پر نہیں لگایا گیا تھا۔ اُس کی واپسی دو بجے کے قریب ہوئی۔ اتنی دیر کسی سبب کے بغیر نہیں ہوئی ہو گی۔ ابا جان کی موٹر بھی اُس کے پاس تھی۔ ہٹھل سے پوچھنے سے کچھ حاصل نہ تھا، یہ ہٹھل کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ مجھے کھانے میں ماری سے ملاقات کے بارے میں کچھ بتائے یا نہیں۔ ال مجھے ایک تسلی تھی کہ جمرو بھی اُس کے ساتھ گیا تھا۔ مَیں اُس سے پوچھ سکتا تھا۔ مَیں نے تحمل کیا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو ان کے چہروں پر ضرور نظر آ جاتی۔ ہٹھل کے چہرے پر نہیں تو جمرو کے چہرے پر۔ وہ مضمحل اور مایوس ضرور دکھائی دیتا تھا، مضطرب اور متوحش نہیں۔

کھانے کے بعد سب بیرونی کمرے میں آ بیٹھے، پیر دادا کے خاص کمرے میں۔ بتی چاچا نے حقہ پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ تین بج رہے تھے۔ ہم مردوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ ابا جان نے منیر علی اور مولوی اکرم کی طرف دیکھ کے ہٹھل سے کہا کہ اگر اُس کی طبیعت بحال ہو تو وہ کچھ بات کریں۔ ہٹھل نے حقے کی نے مُنہ سے ہٹالی اور کسی قدر تردد کا اظہار کیا کہ ایسی کیا بات ہے؟ ابا جان نے جواب دینے کے بجائے کسمساتے ہوئے پوچھا کہ آیندہ کے لیے اُس کا کیا ارادہ ہے؟ ہٹھل نے استفسار کیا کہ اُن کا اشارہ کس طرف ہے؟ ابا جان نے دبی آواز میں کہا کہ رانی اور گیتا کے بارے میں اُس نے کیا سوچا ہے؟

"کاہے کا سوچنا باوا؟"

ابا جان نے صراحت کی کہ اُن کا مدعا ذرا قبل از وقت ہے لیکن بے حقیقت نہیں ہے۔ جلد یا بہ دیر ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔ اِس وقت وہ دونوں سامنے نہیں ہیں۔ ہم سب یہاں موجود ہیں۔ بہتر ہو گا کہ ہم ابھی اس معاملے پر کچھ غور و فکر کر لیں۔ یہ ایک مشکل مرحلہ ضرور ہے لیکن زندگی کی یہی روش ہے حقیقت سے کہیں مفر نہیں ہے۔

"آپ بولو، آپ کے مَن میں کیا ہے۔" ہٹھل کا لہجہ ناخوش گواری سے عاری نہیں تھا۔

"ہاں۔" ابا جان نے نرمی سے کہا۔ "مَیں نے جو سوچا ہے یا جو مجھے مناسب لگتا ہے، وہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میری رائے میں گیتا اور رانی کو جتنی جلد ہو سکے، یہاں سے منتقل کر دیا جائے۔"

ابا جان نے ہٹھل کی پیشانی پر ابھرتی سلوٹیں ضرور دیکھ لی ہوں گی مگر اُنھوں نے کسی تامل کے بغیر اپنی بات جاری رکھی اور ہٹھل سے کہا، یقیناً اِس مکان سے اُن کی وابستگی جذباتی ہے اور اُنھی دونوں کی کیا، ہم سب کے لیے یہ جگہ پیرو کی یادگار کی حیثیت رکھتی ہے تاہم جب تک وہ دونوں اِس مکان میں رہیں گی، ذہنی اور قلبی طور پر منتشر رہیں گی۔ اِس عمارت کے گوشے گوشے میں پیرو موجود ہے۔ اِس کی پرچھائیاں اُن کا غم تازہ کرتی رہیں گی۔ اتنے لوگوں کی ہمہ وقت موجودگی، نگہ داشت اور تسلیوں سے اتنا ہوا ہے کہ اُن کا حوصلہ بندھا رہا ہے مگر ظاہر ہے، یہ سارے لوگ مستقل یہاں نہیں رہ سکتے۔ آج نہیں تو کل، اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ انھیں جانا بھی چاہیے۔ یہ مکان بھی اتنا بڑا نہیں کہ سب یہاں رہ سکیں اور

نہ عملاً یہ ممکن ہے اور بھی... اور بھی کئی باتیں ہیں۔

مجھے خدشہ تھا کہ ٹھل ضرور برہمی کا اظہار کرے گا لیکن اُس نے زبان بند رکھی۔ ابّا جان نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ اُسی وقت منیر علی نے دخل دیا۔ "بات یہ ہے بھائی صاحب! دل میں کوئی فرق مت لائیے۔ بخدا یہاں سے جانے کے لیے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔ کوئی بھی یہاں سے جانا نہیں چاہتا سب کی ایک ہی کوشش ہے کہ کسی طرح اُن دونوں بدنصیبوں کا دکھ بٹا سکیں لیکن اب اِس مکان میں خود گیتا اور رانی کا رہنا زیادہ مناسب نہیں ہے۔ پہلے کی بات اور تھی۔ پیرو بھائی نے اپنی یہ جنت ساری دُنیا سے چھپا کے رکھی تھی۔ اِس علاقے میں کسی کو بھی..." منیر علی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "زیادہ بہتر تو آپ ہی سمجھتے ہوں گے۔ کسی کی زبان کون روک سکتا ہے۔ طرح طرح کی باتیں پھیل رہی ہیں۔ پولیس کے لوگ یہاں پورے تین دن چکر لگاتے رہے ہیں۔ اُنھوں نے جانے کیا زہر اگلا ہے۔ خُدا اُس وقت پیرو بھائی بھی ساتھ تھے۔ صفدر بھائی کہتے ہیں، اِنھوں نے پیرو بھائی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کیا ہی اچھا ہو، وہ بھی یہیں منتقل ہو جائیں جیسا کہ توقع تھی، جواب میں پیرو بھائی نے کہا کہ اِس سے بڑی خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔ آپ کو کچھ یاد ہے؟" منیر علی نے ٹھل سے پوچھا۔

ٹھل سر ہلا کے رہ گیا۔

"گزشتہ دو دن سے صفدر بھائی وہاں جا رہے ہیں۔ خاصا کام مکمل ہو چکا ہے۔ جو رہ گیا ہے، وہ ہم وہاں جا کے اپنے سامنے پورا کرا لیں گے۔ اُس مکان کی خوبی یہ ہے کہ ایک ساتھ رہنے کے باوجود سب پوری خلوت، اپنے مزاج اور منشا کے مطابق رہ سکتے ہیں۔ گنجائش ہی گنجائش ہے وہاں، اور سب سے بڑی گنجائش تو دل کی ہے۔ سچ تو یہ ہے، اِسی مقصد سے، مِل جُل کے رہنے کی غرض سے اُسے خریدا گیا تھا۔" منیر علی نے ٹھیر کے ہماری جانب نگاہ کی کہ شاید ہم میں سے کوئی اُن کی ہم نوائی کرے مگر جب کوئی کچھ نہ بولا تو اُنھوں نے کسی قدر تیز آواز میں ٹھل سے پوچھا۔ "آپ نے غور کیا بھائی؟"

"ہاں بابا!" ٹھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"پھر آپ کا کیا خیال ہے؟"

"کیا، کیا بولنا ہے اپنے کو؟"

"یہ تو صرف ایک مشورہ ہے، آپ کے ذہن میں کچھ اور ہو تو بتائیے۔"

"سب ٹھیک ہی بولتے ہو آپ۔"

"نہیں، میرا کچھ نہیں، مَیں تو..." منیر علی کی زبان لکنت کرنے لگی۔ "آپ فرمائیے۔"

"ابھی پہلے اُن سے بھی پوچھ لو بابا۔"

"بالکل درست مگر وہ بے چاریاں کیا کہیں گی۔ اب اُن کے پاس کہنے سننے کے لیے رہ کیا گیا ہے۔ وہ تو ہر حال میں راضی ہیں اور اچھی طرح جانتی ہیں کہ ہم اُن کی بہتری ہی کے لیے کوئی کریں گے۔ سُنا ہے کل رانی کے کوئی بھولے بسرے قریبی عزیز بعد آئے تھے، اُنھوں نے رانی سے کہا تھا کہ اب وہ چاہیں تو خاندان میں واپس آ سکتی ہیں، تمام تلخیاں اُن کے شوہر کے وقت تک تھیں۔ تفصیل تو مجھے نہیں معلوم، لیکن سُنا ہے، رانی نے شدت سے انکار کر دیا۔ بہر حال صبح جولین کی ماں اور چمپا بیگم نے یہاں سے جانے کی بابت اُن کا عندیہ لینے کی کوشش کی تھی، دونوں چپ ہو گئیں۔"

"ابھی تو دسواں بھی نہیں ہوا ہے بابا۔"

"اللہ آپ کو خوش رکھے، مَیں نے بھی یہی کہا تھا۔ بے شک ابھی تو کم از کم اُنھیں یہیں رہنا چاہیے۔" منیر علی نے یاس سے کہا۔ "ہے تو بہت عجیب سی بات۔ بھرا پُرا گھر ہے اور اپنا گھر اپنا ہی ہے۔ اِسے چھوڑنا اُن کے لیے دوسرے بڑے صدمے سے کم نہ ہوگا۔ پیرو بھائی نے یہ مکان اپنے لیے نہیں، اُن کے لیے بنایا تھا لیکن ہر چیز اختیار میں نہیں ہوتی۔ جانے ہی کا مرحلہ مشکل ہے لیکن اللہ نے چاہا، ایک بار وہ یہاں سے چلی گئیں تو اُنھیں اتنا قلق نہیں ہوگا۔ اُنھیں اندازہ ہوگا کہ گھر تو مکینوں سے ہوتا ہے۔ یوں چھوٹی بڑی چار دیواریاں تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ دوسری جگہ بھی اُن کا اپنا گھر ہوگا۔ صفدر بھائی نے اُن کے لیے اور بہت کچھ سوچا ہے جس کا اظہار سرِ دست مناسب نہیں ہے۔ ایک پیرو بھائی کو تو ہم واپس نہیں لا سکتے۔" منیر علی گلوگیر آواز میں بولے۔ "البتہ جو مکان میں انشا اللہ اُس میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ اتنے دنوں میں ہم لوگ کے بارے میں گیتا اور رانی نے اتنا تو..." منیر علی نے اپنی آنکھوں سے چھلکتے آنسو چھپانے کی کوشش کی مگر اپنی بلکتی ہوئی آواز نہ چھپا سکے، کہنے لگے "میرا خیال ہے، کسی موزوں وقت آپ اُن سے بات کر لیجیے گا۔" ٹھل حقہ گڑگڑاتا رہا۔

منیر علی نے کچھ دیر انتظار کیا تاہم اُنھوں نے ساری تائید تردید خود کر دی تھی۔ ٹھل اُن سے اور کیا کہتا۔ منیر علی خاموشی سے اُٹھ گئے۔ اُن کے ساتھ ابّا جان اور مولوی اکرم بھی اُٹھ گئے۔ جمرو، مارٹی اور ڈنگو بیٹھے رہے۔ پھر وہ بھی چلے گئے۔ مَیں اکیلا رہ گیا۔ ٹھل سے جانے کیا کچھ کہنا اور سُننا چاہتا تھا۔ جبھی باہر چلنے کے لیے جمرو کے اشارے پر مَیں نے انکار کر دیا تھا۔ مَیں لفظ ڈھونڈتا لیکن لفظ تو بعد میں آتے ہیں۔ مجھے کوئی سِرا ہی نہیں مل رہا تھا۔ بہت سی باتیں تھیں کہ اوّل و آخر کی ترتیب نہیں ہو پاتی تھی ٹھل کی گراں باری کا احساس ہوگا۔ پھر مَیں نے سوچا، بہتر ہے کہ مجھ سے کوئی سلسلہ جنبانی کرے لیکن اُسے تو جیسے میرے موجود ہونے کی خبر ہی نہیں تھی۔ آدمی کی موجودگی کا تعلق اُس کے جواز سے ہے۔ اکارت آدمی کا ہونا نہ ہونا یکساں ہے۔ مَیں اُس کی نظر میں کسی بےکار محض کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے ٹھیک سے بات کرنا ہی کب آتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ مَیں صرف ہذیان بک سکتا ہوں، صرف پریشان کر سکتا ہوں۔

آخر مَیں بھی وہاں سے اُٹھ گیا۔ میرا قیاس اتنا غلط نہیں تھا، اُس کے بُت میں کوئی جُنبش نہیں ہوئی۔ اُس نے سَر اُٹھا کے ایک نہیں سمجھے، کیا کچھ فسانے بنا کے، فسانے سُنا کے گئے ہیں۔ تعزیت کا سلسلہ جاری ہے۔ محلّے کی آسودہ حال عورتیں دیکھنے میں تو بڑی سلیقہ مند اور معاملہ فہم معلوم ہوتی ہیں مگر بچیاں بتائیں گی کہ اِن میں سے کتنی پُرسا دینے، ہم دردی کا اظہار کرنے آئی تھیں اور کتنی سُر چھونے اور تماشا دیکھنے۔" منیر علی نے رُک کے ٹھل کی طرف دیکھا اور ہچکچاہٹ سے بولے۔ "سمجھ رہے ہیں آپ؟"

ٹھل کے ہونٹ باہر نکل آئے تھے۔ اُس نے کچھ نہیں کہا۔

"یہ وجہ ہے۔" منیر علی کی آواز جھرجھرانے لگی۔ "یہ مکان سارے علاقے میں مشہور ہو گیا ہے۔ آپ کہیں گے، اِن کی فکر کیوں کرتے ہو۔ لوگ تو جو منہ میں آیا، بک دیتے ہیں۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، چارہ کچھ نہیں ہے لیکن اُن دونوں نے کیا قصور کیا ہے۔"

منیر علی کی بات ٹھل کی سمجھ میں آ رہی ہوگی جبھی وہ چپ بیٹھا رہا۔ ابّا جان کی نسبت منیر علی کی زبان بل نہیں کھا رہی تھی لیکن وہ بھی کھُل کے نہیں کہہ پا رہے تھے کہ پیرو نے آخر یہ مکان سب سے چھپا کے کیوں رکھا تھا، اپنے قریب ترین ساتھیوں سے بھی اگر اس کی کوئی وجہ تھی تو وہ اب بھی موجود ہے۔ اگرچہ پیرو سامنے نہیں ہے لیکن ہم ہیں، وہی پاڑے کے لوگ۔ پیرو دادا کی ارتھی اُٹھتے وقت ممبئی کے سارے دادا یہاں جمع ہو گئے تھے۔ علاقے کے ہر شخص نے یہ اِزدحام دیکھا تھا۔ ارتھی کے جلوس میں ٹھل سب سے آگے تھا۔ اُنھیں اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ ٹھل کون ہے جسے ممبئی کا سب سے بڑا دادا پیرو سر آنکھوں پہ بٹھاتا تھا، جس نے پیرو کے بعد اُس کے پاڑے کی گدّی سنبھالی تھی اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔

جو لوگ پیرو دادا کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور اُس جیسی موت مرتے ہیں، اُن کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں تراش لی جاتی ہیں۔ منیر علی نے ٹھل سے یہ سب کچھ نہیں کہا تھا لیکن اشارہ ہی کافی تھا۔ ٹھل نے پلٹ کے اُن سے یہ نہیں کہا کہ یہ مکان نہ محلّے والوں کی میراث ہے، نہ گیتا اور رانی کسی کے رحم و کرم کی محتاج ہیں۔ جس کی زبان بہکتی ہے اور جس کی آنکھ میں تنکے زیادہ چبھتے ہیں، اُسے دیکھ لیا جائے گا اور یہاں کسی کو یہ صورتِ حال گراں گزرتی ہے تو وہ چلا جائے! ابّا جان، منیر علی، مولوی اکرم، جولین وغیرہ جس کا جی چاہے، اپنے گھر چلا جائے۔ ٹھل اور بھی بہت کچھ کہہ سکتا تھا لیکن وہ سرنگوں بیٹھا رہا۔ شاید اِس لیے کہ منیر علی اور ابّا جان کے مدّعا میں کسی قسم کی آلائش نہیں تھی۔ اُنھیں گرد و پیش کے لوگوں کا اتنا خیال نہیں تھا جتنا گیتا اور رانی کے آب گینے کا پاس تھا۔ اُنھیں پیرو نے پھولوں کی طرح رکھا تھا۔ پیرو کی جیب میں ہر وقت چاقو رہتا تھا اور پاڑے کے آدمی کے لیے چاقو تو ایک علامتی چیز ہے، اُس کے دست و بازو اُس کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ اُس کا ارادہ ہی چاقو ہوتا ہے۔ پیرو نے اپنی بیوی اور بیٹی کو اپنا یہ زور نہیں دکھایا تھا کیونکہ گھر اور پاڑے کے راستے شاید ایک نہیں ہوتے۔ پاڑے کے آدمیوں کو پاڑے اور گھر میں مطابقت اور مفاہمت کی یہی مشکل پیش آتی ہوگی۔ پیرو نے اسے یک سر دو حصّوں میں منقسم کر دیا تھا۔ اُس کی زندگی ساتھ دیتی تو یہی کچھ رہتا۔ یقیناً پیرو کے ذہن میں اچھی طرح واضح ہوگا کہ آگے کسی مرحلے پر اُسے کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اُس نے کیا سوچا تھا، یہ تو وہی جانتا تھا لیکن گیتا اور رانی اور اپنے گھر سے اُس کی گہری وابستگی سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کبھی کسی موقع پر پاڑے سے مکمل انقطاع کی کوئی صورت اُس کے ذہن میں ضرور رہی ہوگی۔ ممکن ہے اُس نے ٹھل سے اس بارے میں کبھی کچھ کہا ہو۔

ٹھل کی خاموشی پر منیر علی نے ٹوکا۔ ٹھل نے بھاری آواز میں منیر علی ہی سے پوچھا کہ پھر ان کی کیا رائے ہے؟ "کیا بتاؤں بھائی میں نے تو اسی لیے آپ سے، آپ کے سامنے ساری..." منیر علی بے چارگی سے ابّا جان کی طرف دیکھنے لگے۔

"فیض آباد چلنے کا کریں بابا؟"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" منیر علی نے بے تابانہ کہا۔ "وہاں

زرّیں بٹیا ہے۔ اُس کا آپ کو معلوم ہے۔ اُس کی چھاؤں سب کے لیے عام ہے، سب کے لیے یکساں ہے۔ تلافی تو ممکن نہیں لیکن زرّیں سے مِل کے دونوں کو خوشی ہوگی۔ وہ سبھی کو راس آتی ہے۔ خدا نے اُس کی نگاہ اور زبان میں بڑی تاثیر دی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں، میں نہیں کہہ سکتا، اگر زرّیں بیٹا فیض آباد میں نہ ہوتی تو جیسلمیر سے اپنا آبائی گھر چھوڑنے کا صدمہ، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس طرح برداشت ہو پاتا۔ میری بھی یہی رائے تھی مگر صفدر بھائی بھی درست کہتے ہیں ان کے خیال میں ماحول کی اتنی بڑی تبدیلی گیتا اور رانی کے لیے ناساز گار بھی ہوسکتی ہے جیسلمیر سے میرے فیض آباد منتقل ہونے اور رانی اور گیتا کے وہاں جانے میں بڑا فرق ہے۔ صفدر بھائی کی بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ گیتا اور رانی کا ابھی کچھ عرصے یہیں بمبئی میں رہنا مناسب ہے۔ اتفاق سے صفدر بھائی نے چند دن ہوئے اسی شہر میں ایک ایسا مکان حاصل کرلیا تھا جہاں سب سما سکتے ہیں کسی محل سے کیا کم جگہ ہے وہ۔ آپ نے بھی اُسے خوب دیکھا ہے۔ نظر میری طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ اِس بے خبری کا سبب اُس کی نظر میں میری بے مائگی و بے بضاعتی کے سوا کیا ہوسکتا تھا۔ آدمی اتنا گم تو نہیں ہوسکتا اور بتّھل جیسا آدمی؛ جس کی بینائی کے لیے آنکھیں کھلی ہونا ضروری نہیں تھا۔

باہر سبزے پر جمرو، شامو، مارٹی اور ٹنگو کوئی نہیں تھا۔ گلی میں بھی وہ نظر نہیں آئے۔ میں اِردگرد کی گلیوں میں گھومتا رہا۔ دھوپ اُوپر لوٹ رہی تھی۔ گلیوں میں راہ گیروں کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی عموماً بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں کے علاقے میں ہوتی ہے۔ میں آگے نکل گیا۔

یہ میرا گمان نہیں تھا۔ شروع میں، گو میں نے اِسے واہمہ ہی سمجھا تھا۔ ایک دو نہیں، یکے بعد دیگرے کئی راہ گیر مجھے دیکھ کے ٹھٹکے، ممکن ہے، ابّا جان اور منیر علی اُس طرف اشارہ نہیں کرتے تو مجھے کچھ احساس نہ ہو پاتا۔ میں اُن میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ ظاہر ہے، وہ مجھے پہچانتے ہوں گے، اُن کے جسم کھنچ سے گئے۔ اُن کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ دہشت کی آمیزش بھی تھی۔ بہت سے خوف کدورت کی طرف جاتے ہیں، عناد کی طرف۔ بتّھل جیسے اڈّے پاڑے کے کسی آدمی کے لیے یہ علامتیں کسی تکدّر کا باعث نہیں ہوتیں۔ یہ تو معمول کی بات ہے، تماشے کا حصّہ ہے پھر اڈّے پاڑے کا آدمی ہونے سے کیا حاصل؟ بتّھل پیرو کے گھر میں بیٹھا تھا ورنہ اُسے اتنا کچھ سننے کی عادت نہیں تھی۔ کون جانے کہ جسم سے آزادی کے بعد روح کا اپنے متعلقین سے سروکار بھی ہوتا نہیں، نہ ہونے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ انسانوں کو یہی چاہیے کہ ایسا ہوتا ہے اور ہوتا ہے تو روحیں اپنے پُرسانِ اثبات سے یقیناً آسودہ ہوتی ہوں گی۔ اور پیرو تو گیتا اور را[...] صورت میں ویسے بھی موجود تھا۔ رُوح کی خوشی و ناخوشی کا [...] ایک اَن دیکھی چیز ہے۔

گلیوں سے گزرتا ہُوا میں بہت دُور چلا آیا۔ اندھیرا ہو[...] تھا۔ اندھیرا ہو جانے پر مجھے کچھ سکون سا ملا۔ جیسے میں محفوظ ہو[...] یا میرا کوئی حصار ٹوٹ گیا ہے۔ آگے سڑکوں پر گو تیز روشنی تھی [...] کی روشنی کی طرح تسلسل سے نہیں۔ کتنی ہی روشنیاں کرلی جا[...] تو رات ہی رہتی ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے، اندھیرا کرنا آسا[ن] کرنا مشکل ہے۔ گھر واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں چلتا جتنی دُور ہوتا گیا، مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم و جاں کے روز[ن] رہے ہیں۔ آدمی بھی مکان کے مانند ہوتا ہے، دریچے دروا[زے] سب ہوتے ہیں اس میں۔ کبھی یہ ایسے بند ہوتے ہیں کہ کھلتے نہیں۔ بہت دنوں بعد، مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے زمانو[ں] میں یوں اکیلا صرف اپنے ساتھ سڑکوں پر چل رہا ہوں۔ نہ کو[ئی] نہ مقصد۔ کہتے ہیں، منزلیں اور مقصد کبھی خود بہ خود پیدا ہو[تے] ہیں۔ روزن کھلنا بھی ایک مقصد ہے، تازہ ہوا بھی۔ ہوا [...] در آئے۔ منزلیں بھی آدمی کی طرف آتی ہیں۔ گھر سے چلتے [...] میری آنکھوں میں دھُند سی بھری تھی، سارے جسم میں۔ مجھے [...] آیا، اگر میں اور دُور ہو جاؤں تو کیا ہوا یوں ہی چلتی رہے [...] پر ایسی ہی مہربان؟ کچھ اور نہیں تو میرا بوجھ صرف میرے [...] ہوگا، دوسروں پر نہیں۔ میرا آزار مجھ تک محدود رہے گا [...] اس سے متاثر نہیں ہوں گے۔ آدمی سب کچھ کتنا ہی خود تک [...] دوسرے کسی نہ کسی طرح زد پر آجاتے ہیں۔ آزار بھی وبائی م[...] کی طرح ہوتا ہے متعلقین کو چھوت کی طرح لگ جاتا ہے [...] بھی ہوتا ہے کہ کوئی اپنے آپ کو ہزار چھپائے، اُس سے نسب[ت] کے مدعیوں سے کچھ چھپا نہیں رہتا۔ وہ خود اس کا آزار جذب [کر] لیتے ہیں ورنہ نسبت ہی کیسی! اس کی صرف ایک صورت [...] آدمی ان کے سامنے ہی نہ رہے پر یہ کہاں ممکن ہے، جنگل ہی [...] نہیں۔ جولین بھی کچھ تو کہہ رہی تھی جنگل میں آدمی دوسروں سے دور ہو جائے گا اور دوسروں کے لیے مزید آزار کا سبب نہیں [...] لیکن وہ خود جو اپنے ساتھ بستیوں کا گرد و غبار، بستیوں کے [...]

ساتھ لے کے جائے گا۔ میں اپنے آپ سے جانے کیسی اُلٹی سیدھی، بے سروپا باتیں کرتا آگے بڑھتا رہا اور میں نے خود سے کہا، آدمی کو اپنے نسبت داروں کے قرار کا ایسا ہی خیال ہے تو جنگل، بیاباں کیا ایک مرتبہ خود ہی کو خاک بُرد کیوں نہ کردے۔ کسی نہ کسی دن ویسے بھی یہی فیصلہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی لوگ یہ فیصلہ خود کرلیتے ہیں۔ یوں انھیں مستقل قرار آجاتا ہے اور اُن کے ماتم گساروں کی آگ بھی بھڑکتے بھڑکتے ایک وقت ٹھٹھر جاتی ہے۔ پر جو لوگ یہ فیصلہ نہیں کرپاتے، اُن کی ڈوری شاید مضبوط ہے، اُن کے کشکول میں آرزو کچھ باقی ہے۔ آنے والے دلوں سے کسی رحم اور رعایت کی آس میں وہ ایسا نہیں کرپاتے۔ بدلتے موسم، اپنے اِردگرد ہر لحظہ بدلتی چیزیں انھیں آسرے میں رکھتی ہیں یا پھر انھیں اپنے آپ سے ضد ہو جاتی ہے، اذیت سہنے کی سرکشی۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اُن میں کتنا حوصلہ، آسمان کا کتنا زور ہے۔ انھیں ہر دم یہ گداز رہتا ہے کہ نجات کا فیصلہ تو ایک آن کی دُوری پر ہے۔ اس نتیجے پر پہنچنے سے پہلے، کیا عجب کہ پتھر پگھلنے کا موسم شروع ہو جائے۔

جانے کیا ٹھیک ہے، کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سب کیا ہوتا ہے، کیا ہونا چاہیے۔ غالباً زندگی کا یہی طور سب سے زیادہ موزوں ہے کہ آدمی اپنی سعی کرلے، کچھ موسموں پر چھوڑ دے اور ہوسکے تو سردیوں کے لیے آگ بچائے رکھے، گرمیوں کے لیے پانی۔ آدمی اپنی بساط سے زیادہ کی طلب کیوں کرے۔ طلب کرے اور اصرار بھی لیکن انکار کے لیے بھی آمادہ رہے۔ بھکاریوں کی طرح جو صدا لگاتے ہیں، لگائے جاتے ہیں اور گھُرکیاں کھا کے اپنا رستہ لیتے ہیں۔ وہ ایک دہلیز پر بیٹھ نہیں جاتے اور دروازہ توڑ کے اندر مکینوں کا گلا نہیں گھونٹ دیتے۔ بھکاری کا کام صدا بلند کرنا ہے۔ کوئی ایک دروازہ تو کھلتا ہے پر کوئی بھی نہ کھلے تو؟ میں نے خود سے پوچھا، تو آدمی ایسے ہی سو جائے۔ دوسرے دن صدا لگانے کی ہمت رہی تو ٹھیک، نہ رہی تو انجام کو پہنچ جائے گا۔ جولین کی باتیں میرے دماغ میں گردش کررہی تھیں۔ صبح وہ ایک اور بات کہہ رہی تھی کہ آدمی خود کیوں نہ دروازہ بن جائے جن دروازوں پر صدا رسا ہوتی ہے، اُن میں بھی تو آدمی رہتے ہیں۔

مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں تو بس سر اُٹھائے چلتا رہا۔ کسی چوراہے پر ایک شخص نے اچانک مجھے ایک طرف دھکا دیا تو میری آنکھیں کھلیں۔ وہ ناتواں شخص جھپٹ کے مجھے ایک طرف دھکیل نہ دیتا تو میں سامنے سے آتی ہوئی ٹم ٹم اور اُس کے منہ زور گھوڑے کی لپیٹ میں آجاتا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سُن ہوگیا۔ میرا جسم جھُول گیا تھا۔ کسی دوسرے راہ گیر نے بوڑھے آدمی کی مدد کی۔ دوسرے لمحے میں اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ جانے کیوں میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود کر آئی، پھیکی پھیکی۔ ایک آن میں فیصلہ ہو جاتا۔ میں نے دبے لفظوں میں بوڑھے کا شکریہ ادا کیا تو وہ خفا ہو کے بولا "دارو پی ہے کیا؟" میری خاموشی پر اُس کے لہجے میں کچھ نرمی آگئی اور وہ میری کمر تھپ تھپاتے ہوئے کہنے لگا "خدا نے خیر کرلی۔ یہ سڑک ہے میاں! جوان آدمی ہو، ابھی کیا دیکھا ہے زندگی میں۔ آنکھیں کھلی رکھ کے چلا کرو، گھوڑا بدک جاتا تو ایک تم ہی نہیں، اور لوگ بھی لپیٹ میں آجاتے۔" غلطی میری تھی۔ میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ وہ ایک ہمدرد آدمی تھا مجھ سے پوچھنے لگا "کیا بات ہے، پریشان نظر آتے ہو؟" میں نے اُسے یقین دلانا چاہا کہ ایسی کوئی بات نہیں، بس چوک ہوگئی۔ میرے جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ میرا نام پتہ اور منزل پوچھنے لگا۔ پھر میں ابھی کچھ بتا نہیں پایا تھا کہ وہ مضطرب ہو کے بولا "کیا کام کرتے ہو؟" میں سوچ رہا تھا کہ اِسے کیا بتاؤں، کیوں کہ میں تو کوئی کام ہی نہیں کرتا۔ میرے شش و پنج سے اُس نے جانے کیا سمجھا۔ میں نے نہیں دیکھا تھا کہ کب اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکالا۔ میرا سارا جسم اکڑ گیا تھا۔ جب اُس نے اپنی بند مٹھی میرے ہاتھ میں کھولنی چاہی۔ میں گھبراہٹ میں پیچھے ہٹ گیا۔ سکّے فٹ پاتھ پر گر گئے

اور چھناکے کی آواز آئی۔ ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ ہاتھ کھینچ کے بوڑھے کے منہ پر طمانچہ رسید کروں لیکن اُس کی سہمی صورت دیکھ کے میرا ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے رہ گیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ زمین پر پڑے ہوئے سکے اُٹھا کے مجھ سے کچھ کہتا، مَیں تیز قدمی سے آگے بڑھ گیا۔ اُس کی آوازیں میرا تعاقب کرتی رہیں۔ پھر ٹریفک کے شور میں گم ہو گئیں۔ مَیں نے بھی پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔

سڑکوں پر بہت بھیڑ تھی اور چیخ پکار بھی بہت تھی۔ اب مجھے سب کچھ سنائی اور دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اتنی دیر مَیں بند آنکھوں اور بند کانوں سے راستہ طے کرتا رہا تھا۔ صوت و صورت کی موجودی سماعت و بصارت سے مشروط نہیں ہے۔ گرد و پیش میں اُٹھنے والا شور اور سامنے کی چیزوں سے مراد یہ نہیں ہے کہ انھیں دیکھا اور سُنا بھی جا رہا ہے۔ میرے دست و بازو دیر تک سُن سناتے رہے۔ اُس وقت مجھے اِس کا اِتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ چند لمحے پہلے بیتے ہوئے منظر کا ہر نقش اب شکلیں بدل بدل کے میری آنکھیں خیرہ کر رہا تھا۔ زندگی باقی رہتی تو ہاتھ پیر سلامت نہ رہتے۔ میری جیب میں پڑا ہوا چاقو یوں ہی دھرا رہ جاتا۔ فٹ پاتھ سے اُتر کے میں نے سڑک پر ایک دو قدم بڑھائے تھے کہ عین وقت پر بوڑھے کی نظر پڑ گئی اور اُس نے مجھے آ لیا۔ وہ مجھے پہلے سے دیکھ رہا تھا۔ غلطی ٹم ٹم والے کی بھی کم نہیں تھی۔ اُسے گھنٹی بجانی چاہیے تھی۔ ممکن ہے، اُس نے بجائی ہو اور میں سُن نہ سکا ہوں یا وہ بھی میری طرح کسی اور شور، کسی اور خیال میں منہمک ہو۔ آدمی کو اپنے پیش منظر سے کبھی اتنا بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ کہتے ہیں، موت کو ایک بہانہ چاہیے، حالاں کہ موت کو کسی بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر لمحہ موت کا لمحہ ہے۔ ٹل جائے تو دوسری بات ہے، ٹل جائے تو زندگی ہے۔ موت کا نظر انداز کیا ہوا لمحہ زندگی ہے یا یوں کہیے کہ زندگی موت کی رعایت ہے، رسّی کی ڈھیل ہے جو پلک جھپکتے میں کھینچ لی جاتی ہے۔ زندگی بھی بس ایک پل ہے۔ پل پل جُڑ کے بنتی ہے اور ایک اشارے میں ساری پونجی لُٹ جاتی ہے۔ بوڑھا ٹھیک کہتا تھا۔ مجھے کچھ ہو جاتا تو ایک میرا ہی کچھ نہ جاتا۔ یہ خبر بھٹّل تک پہنچتی، ابّا جان، جولین، فرخ، فریال، فارہہ، اکبر تک تو کیسا کہرام مچتا۔ کون اپنا مُنہ نوچتا، کون دیواروں سے سر پھوڑتا۔ میں اِس کا تصور ہی کر سکتا تھا۔ زریں، خانم، شہ پارہ، نیساں، جہاں گیر، کون کون، سب اُجاڑ ہو جاتے۔ پیرو کی موت پر کسی نے کہا تھا کہ موت کا اصل عذاب تو زندہ رہ جانے والے پسماں دگان پر

ٹوٹتا ہے۔ ایک آدمی کی موت جانے کتنوں کو ویران کر دیتی ہے، ایک آدمی کتنے آدمیوں میں زندہ رہتا ہے۔ اپنے لیے نہیں تو اُسے دوسروں کے لیے زندگی پر اصرار کرنا چاہیے۔ جولین کا یہی مطلب تھا کہ اپنے اختیار کی نہیں، اپنے لیے کارگر نہیں تو ایسی زندگی دوسروں کے اختیار پر چھوڑ دینا چاہیے، دوسروں کی امانت سمجھ کے برتنا چاہیے۔

مَیں جولین سے بہت کچھ نہیں کہہ سکا تھا کہ کسی کی زندگی پہلے ہی گروی رکھی جا چکی ہو، کوئی اپنا اختیار پہلے ہی ترک کر چکا ہو، پہلے ہی سے کسی دوسرے کی زندگی گزار رہا ہو تو وہ کیا کرے؟ ابھی کچھ دیر پہلے اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو سبھی پر پہاڑ سا ٹوٹ پڑتا مگر ایک دوسرے کے غم گسار بہت تھے، ایک دوسرے کا دُکھ درد بٹا لیتے۔ کسی دن انھیں صبر آ ہی جاتا۔ یہ کوئی گلہ نہیں، یہی ہوتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے مگر ایک شخص کا کیا ہوتا! یہ تو مَیں جانتا ہوں، وہ جہاں بھی ہے، میری وجہ سے وہ اِس اجیرن زندگی پر مُصر ہوگی۔ اِس دربدری میں کوئی آرزو ہی کورا کی قوت، اُس کی سپر بنی رہی ہوگی۔ مولوی صاحب اُس سے یہی کہتے ہوں گے کہ میں بہ ہمہ ہوش و حواس موجود ہوں اور وہ ایک دن مجھے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مولوی صاحب نے اتنے دنوں میں خوب سمجھ لیا ہوگا کہ کوئی تسلّی دلاسا، کوئی عیش آرام اُس کے لیے اِس سے بڑا نہیں ہوگا جتنا میرے نام کا دلاسا اور میرے ذکر کا آرام اور مولوی صاحب بھی اُس سے اتنا نہ کہہ پاتے ہوں گے، جتنا وہ خود سے کہتی ہوگی۔ آدمی کا دِل خود ایک صدا اور روشنی ہے۔ پہلی بار کلکتے کے ہوٹل میں جب ہم چند کمینے لوگوں کی نظر میں آ گئے تھے اور وہ اُسے مجھ سے جُدا کرنے کے درپے تھے تو وہ بہت نڈھال ہو گئی تھی۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں گھبرا گھبرا کے کہتی تھی کہ بس میرے قریب رہو۔ مجھے چھوڑ کے کہیں مت جانا۔ مَیں سائے کی طرح اُس کے ساتھ رہتا تھا، حالاں کہ میری سمجھ میں خود نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں، کون سے گوشے میں سر چھپاؤں، اُسے دُنیا کی نگاہوں سے کیوں کر محفوظ رکھوں۔ ہم دونوں ہوٹل کے کمرے میں بند باتیں کرتے رہتے تھے۔ مجھے اُس کا ایک ایک لفظ یاد ہے، اُسے بھی سب ازبر ہوگا۔ ہم نے بہت سے عہد کیے تھے۔ یہ عہد ہی اُس وقت ہمارے لیے تقویت کا باعث بنے تھے۔ بعد میں اِنھی نے مجھے زندہ رکھا، اُس کے لیے بھی یہی زندگی رہے ہوں گے۔ ایک دوسرے پر اعتماد سے بڑی توانائی کوئی نہیں ہوتی۔ اُسے مجھ پر ایسا ہی یقین تھا جو اُس نے اندھیری رات میں بدھ گیا سے بھاگ کے سیدھے میرے گھر کا رُخ کیا تھا اور ابّا جان کا بے اعتنائی کا رویّہ دیکھ

کے بے سر و ساماں میرے ساتھ گھر سے نکلنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ مجھ سے زیادہ مضبوط اور محفوظ پناہ اُس کے لیے کوئی نہیں ہے۔ اُس نے میری آنکھیں دیکھی تھیں جو ہر دم اُسی کی جستجو میں رہتی تھیں اور میرا چہرہ، جو اُس کے لیے بے قرار رہتا تھا۔ اُس کا دل گواہی دیتا ہوگا کہ میری نگاہیں اب بھی اُس کے لیے بھٹکتی ہیں۔ مَیں جو کچھ سوچا کرتا تھا، منیر علی کی بیٹی زہرہ نے بالکل وہی مجھے بتایا تھا۔ زہرہ نے اُسے خوب دیکھا تھا۔ وہ کہتی تھی، کورا کے چہرے پر بادل سے منڈلائے رہتے ہیں۔ ہر لمحے آنکھوں میں اُمڈتی ہوئی کوئی گھٹا، ذرا چھیڑو تو برس پڑے۔ وہ آہٹوں پر چونک پڑتی تھی۔ زہرہ نے مجھے اُس کا سارا حال بتایا تھا۔ زہرہ کے بہ قول اُس نے کئی مرتبہ کریدنے کی کوشش کی۔ کورا نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ بتاتی بھی کیا۔ اپنا ارادہ توانا رکھنے کے لیے آدمی اپنا حال خود میں چھپائے رکھتا ہے۔ میرا بھی کچھ یہی ہے، جولین کو مَیں کیا بتاتا کہ اُس کی ہر دلیل کسی بھی معیار و اعتبار کی رُو سے درست ہے مگر جواب تو کچھ اور آتا ہے، نتیجہ تو کچھ اور ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دلیلیں تو میں خود کو بھی دیتا ہوں۔ میرا اِن سارے لوگوں کے درمیان کھُلی آنکھوں اور کھُلے کانوں کے ساتھ رہنا اِس کا ایک ثبوت ہے۔ مجھے تو چلتے رہنا، بڑھتے رہنا چاہیے تھا، زمین کے آخری سرے تک، اپنے حصّے کے وقت کے اختتام تک۔ پھر کہیں رُک کے میرے بیٹھ جانے سے اور کیا مراد ہے۔ جتنا کچھ میرے پاس ہے، مَیں نے اُس میں پس و پیش کب کیا ہے۔ مَیں اپنی سی کوشش بہت کرتا ہوں لیکن وہی ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر ڈال دینے کے مصداق، کوئی کنکر کہیں سے آ جاتا ہے اور سب منتشر ہو جاتا ہے۔ اچانک اُس کا سوالی سراپا میرے سامنے آ جاتا ہے، جیسے وہ مجھے بُلاتی ہو اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مجھ سے کچھ چھینا جا رہا ہو، جیسے مجھ سے کوئی بھول ہو رہی ہو۔ جانے کتنے لوگ یوں ہاتھ پیروں سے ثابت نظر آتے ہیں۔ بہت سارا وزن اُٹھا لیتے ہیں، ضرورت پڑنے پر دیوار بن جاتے ہیں، کوئی آوٗ سر کسی جانب اُٹھے، تلوار بن جاتے ہیں، اندھے کی لاٹھی بن کے راستہ پار کرا دیتے ہیں۔ پر کون جانے اِن شہ زوروں میں خود کتنا اندھیرا ہے، کتنی پسپائی، کیسی ٹوٹ پھوٹ ہے۔

آگے سڑک کی مرمّت کی وجہ سے راستہ تنگ ہو گیا تھا۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کتنا وقت ہو گیا ہے۔ مَیں نے راستہ پہچاننے کے لیے اطراف میں نظریں گھمائیں۔ یہ جگہ میری دیکھی بھالی تھی۔ جوہو کا علاقہ تھا۔ مَیں بہت دُور نکل آیا تھا، وقت بھی زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی کثرت تھی مگر شام کی طرح افراتفری نہیں تھی۔ جوہو سے مجھے کیلاش اور رما کی یاد آئی۔ اُن کا گھر زیادہ دُور نہیں رہ گیا تھا۔ کوئی بات ہی ہوگی جو وہ دو دن سے نہیں آ سکے تھے۔ مَیں نے سوچا، مجھے جا کے پوچھنا چاہیے۔ مَیں تنگ راستے سے گزر گیا لیکن دیر ہو جانے کے خیال سے میرے پاؤں سُست پڑنے لگے۔ میں نے سامنے نکڑ پر بنے ہوئے ہوٹل میں وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مجھے گھر سے چلے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ واپسی کے سفر میں اور وقت لگتا۔ میں کسی سے کہہ کے بھی نہیں آیا تھا۔ اتنی دیر میری غیر حاضری پر سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔ سو میں نے گھر واپس جانے اور جلد پہنچنے کے لیے سواری پکڑنے کا ارادہ کیا۔ سامنے سے آتی ہوئی گھوڑا گاڑی میری آواز پر رُک گئی لیکن اچھا ہوا، گاڑی پر بیٹھنے سے پہلے مَیں نے پیسوں کے بارے میں اطمینان کر لینا مناسب سمجھا۔ مَیں نے ابھی کوچوان سے کچھ نہیں کہا تھا، مجھے جیب ٹٹولتے دیکھ کے اُس نے چابک مار کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے یاد تھا، کئی روز پہلے جولین نے چند روپے میرے کُرتے میں ڈال دیے تھے۔ صبح کپڑے بدلتے ہوئے یا تو میں جیب خالی کرنا بھول گیا یا پیسے کہیں گر گئے، خرچ کرنے کا تو کوئی موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب اتنا لمبا سفر مجھے پیدل طے کرنا تھا۔ کوئی اور چارۂ کار بھی نہ تھا، میں تیز تیز قدموں سے بڑھتا رہا۔ شارعِ عام نہ ہوتی تو شاید مَیں بھاگ کے راستہ طے کرتا۔ جلد ہی مَیں نے ایک بڑا فاصلہ گزار دیا۔ پھر ابھی ایک چوراہے سے نکل کے پان کی کسی دکان کے نزدیک آیا تھا کہ مجھے رُکنا پڑا۔ "راجا دادا!" کسی کی چہچہاتی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ وہ دو آدمی تھے، ایک دُبلے پتلے چھریرے جسم کا بیس اکیس سالہ، بڑی مونچھوں والا، دوسرا اُس سے کچھ بڑا اور کسی قدر فربہ۔ اُس کی مونچھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ مَیں نے پلٹ کے انھیں غور سے دیکھا۔ اُن کے چہرے شناسا معلوم ہوتے تھے، نام ذہن میں نہیں آ رہے تھے۔ مَیں جیسے ہی ٹھیرا، انھوں نے لپک کے میرے پیر پکڑ لیے۔ پاٹے ہی کے آدمی لگتے تھے۔ "اپن کو پہچانا دادا؟" چھریرے آدمی نے کہا۔ "اپن جگنو ہے اور یہ، یہ تمھارا غلام۔" وہ اپنے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ مار کے اضطراب سے بولا۔ "یہ دیوا ہے۔"

مَیں نے جلدی سے سر ہلایا۔ اُن کے نام بھی میرے لیے نئے نہیں تھے لیکن کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا کہ انھیں کس پاٹے پر دیکھا ہے۔ میرا تذبذب وہ بھانپ گئے۔ "اپن کو بھول گیا دادا؟

اپن چھنگا دادا کے پاڑے پر...."

"ہاں ہاں۔" مَیں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کیسے ہو تم لوگ؟"

"اپن ٹھیک ہے، ایک دم بالکل ٹھیک۔" جگنو نامی شخص بے تابی سے بولا۔ "تم کو ابھی اُدھر پیرو دادا کی ارتھی پر دیکھا تھا، پھر اکھا تین دن، ہم پاڑے پر بیٹھا رہا، ایک بار کو تم کبھی اپن کی طرف بھی آنکھ گھما کے دیکھے... اپن سلام بھی دیا تھا۔"

"مجھے دھیان نہیں رہا۔" میں نے معذرتی لہجے میں کہا۔

"کدھر کو رہتا، اپن کو سارے کا پتہ تھا، اس واسطے بڑھ کے آگے کو نہیں پہنچا۔" دیوا نے اضطراری انداز میں کہا۔ "قسم سے، اپن تم کو بہت یاد کیا دادا!" اُس کی آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

مَیں نے مسکرا کے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "مَیں بمبئی میں نہیں تھا، بہت دنوں بعد آنا ہوا تھا، پھر یہاں آ کے کہیں آنے جانے، کسی اور طرف دیکھنے کا وقت ہی نہیں مل پایا۔"

"اپن کو پتہ پڑا تھا کہ ابھی تم اِدھر بمبئی آ گیا ہے۔ کئی بار سلام کرنے کو اُدھر ہم پاڑے کا پھیرا لگایا، تم نئیں دکھائی دیا، پھر ملا تو ایسا... اکھا الٹا پلٹی کے بعد..." دیوا سر جھٹکنے لگا اور چونک کے بولا۔ "ابھی تھوڑا ہوٹل میں بیٹھنے کا ہے، چائے پانی..."

"نہیں نہیں، مجھے کچھ جلدی ہے، پھر کبھی سہی۔"

"صرف ایک کوپ چائے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

جتنا میں کہہ سکتا تھا، مَیں نے اُن سے کہا مگر وہ بہ ضد ہو گئے کہ مجھے ایسے نہیں جانے دیں گے۔ ناچار مجھے آمادہ ہونا پڑا۔ ہم تینوں نزدیک کے ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہوٹل میں بھیڑ زیادہ تھی لیکن انھوں نے کسی نہ کسی طرح جگہ تلاش کر لی۔ میرے لیے کرسی صاف کی، مَیں نے نہیں دیکھا کہ کب اُنھوں نے بیرے کو اشارہ کیا تھا۔ بیرے نے ملائی بھری چائے کے ساتھ مکھن ڈبل روٹی، بسکٹ اور سموسوں کی پلیٹیں بہ عجلت میز پر سجا دیں۔ اُن دونوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہوٹل میں دست یاب ساری چیزیں منگوا کے میرے سامنے رکھ دیں۔ مجبوراً مجھے کچھ نہ کچھ ہاتھ چلانا پڑا۔ اِس دوران وہ حسرت آمیزی سے چھنگا کے پاڑے کے بارے میں بتانے لگے، گدی پر میرے وہاں بیٹھنے اور جانے کے بعد کے واقعات۔ میں انھیں اب اچھی طرح پہچان گیا تھا۔ پہلے دن جب میرے اور چھنگا استاد کے درمیان دیر تک چاقو آزمائی ہوئی تھی، یہ دونوں موقع پر موجود تھے تیواڑی کی سرکوبی کے لیے جو منتخب آدمی اکٹھے کیے گئے تھے، اُن میں بھی یہ شامل تھے اور سارے واقعے کے شاہد تھے۔ پیرو کے پاڑے پر جب تیواڑی کو پکڑ کے لایا گیا تھا اور بٹھل حجت بسیار کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھا تھا اور دوسرے ہی لمحے تیواڑی کی ناک اُس کی ہتھیلی پر تھی۔ چھنگا کے پاڑے پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے آدمیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے مَیں نے چند دن چاقو بازی سکھائی تھی، یہ دونوں سیکھنے میں پیش پیش تھے۔ اُنھی دنوں کا یہ ذکر کر رہے تھے، اتنا وقت نہیں گزرا تھا مگر اُن کے لہجے کی آزردگی سے لگتا تھا، ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ چند دنوں کی مشق کے بعد مَیں اور وقت نہیں دے پایا تھا، اِسی کا دونوں افسوس کر رہے تھے۔ کہنے لگے، اس کے بعد اُنھوں نے کئی پاڑوں کا رُخ کیا اور مختلف داداؤں کی جی جان سے خدمت گزاری کی لیکن کسی جگہ اُن کا دل نہیں لگا اور وہ گویا ایک قدم بھی نہ بڑھ سکے۔ بار بار کھونٹے بدلنا دادا کو راس نہیں آتا، اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے وہ پھر اپنے پُرانے علاقے میں آ گئے۔ جہاں چھیدا، اُن کا پُرانا ساتھی، چوکی پر بیٹھا تھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ میری تلاش میں وہ کلکتے بھی گئے تھے۔ وہاں بٹھل کے اڈے پر میں موجود نہیں تھا۔ بٹھل بھی نہیں تھا۔ وہ سچ کہہ رہے تھے۔ اُن دنوں ہم ابا جان کے تعاقب میں تبت کی گھاٹیوں اور پہاڑوں میں بھٹک رہے تھے۔ کلکتے میں اُنھیں میرے دوسرے ٹھکانے فیض آباد کی بھی سُن گُن ملی۔ وہ فیض آباد نہیں گئے کیوں کہ اُنھوں نے وہاں میری ناموجودگی کے بارے میں تسلی کر لی تھی۔ ایک مہینے تک وہ میرا انتظار کرتے رہے اور بمبئی میں کسی ایک دن میری آمد کی اُمید باندھے کلکتے سے لَوٹ آئے۔ اُنھیں معلوم ہو گیا تھا کہ پیرو بھی ہمارے ساتھ گیا ہے۔ چناں چہ میری بمبئی واپسی کے بارے میں وہ اور پُرامید تھے۔ اِس دوران وہ مسلسل پیرو کے پاڑے پر آتے جاتے رہے۔ پھر بمبئی میں جیسے ہی اُنھیں میری آمد کی خبر ملی اور مَیں پیرو کے پاڑے پر نہ مل پایا تو اُنھوں نے میرا پتہ یعنی باندرے میں جولین کا گھر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ گھر ڈھونڈنے میں کام یاب ہو گئے تھے تاہم کانتے کی اطلاع سُن کے اُنھوں نے کسی اور بہتر وقت کے لیے اپنا ارادہ موخر کر دیا۔ کہہ رہے تھے، آج قسمت نے یاوری کی اور مَیں اُنھیں یوں اچانک نظر آ گیا۔ شاید اُن کے عزم نے مجھے اِس طرف کھینچ لیا تھا، ورنہ میرا تو گھر سے نکلنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ مجھے تنہا دیکھ کے وہ اور خوش تھے کہ کھُل کے دل کی بات کر سکتے تھے۔ اُنھوں نے مجھے دُور سے دیکھ لیا تھا اور اُنھیں یقین نہیں آیا تھا کہ مَیں ہی اُن کے سامنے ہوں۔

مجھے بھی اپنے سُنے ہوئے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں حیرتی آنکھوں سے اُنھیں دیکھتا رہا۔ "ابھی کیا بولے راجا دادا!" جگنو عاجزی سے کہنے لگا۔ "اپن لوگ کو ابھی تھوڑا ٹیم دیو دادا!"

مَیں سمجھ رہا تھا کہ وقت دینے سے ان کا کیا مقصود ہے۔ مَیں نے اُنھیں بتایا کہ میرا تعلق کسی پاڑے سے نہیں ہے اور نہ آیندہ کسی پاڑے پر بیٹھنے کا ارادہ ہے۔

"اپن کو پتہ ہے، کل اپن اُدھر ماہم کے پاڑے پر ہی بیٹھا تھا جب بٹھل دادا تھانے سے پلٹ کے آیا تھا اور آ کے پانڈے دادا کے سر پہ تاج لوٹ دیا تھا۔ اپن اُدھر منہ بند اکھا ناٹک دیکھا تھا۔"

"وہ ناٹک نہیں تھا۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"جانتا ہے۔" دیوا نے جلدی سے کہا اور خفت آمیز لہجے میں وضاحت کرنے لگا کہ مَیں کچھ اور نہ سمجھوں، جگنو کا مطلب یہ ہے کہ بٹھل تھانے سے خوب تیار ہو کے آیا تھا کہ اُسے بات کہاں سے شروع کرنی ہے۔ اُس طرح پانڈے دادا کے پاس کوئی راستہ ہی نہیں رہ جاتا تھا۔ دونوں خاصے معاملہ فہم تھے، ذہین بھی۔ دیوا ٹھیک طرح اپنے ساتھی کے طرز کی وضاحت نہ کر سکا تو اُس نے موضوع بدل دیا، آواز دھیمی کر کے بولا، خیر جو ہونا تھا، ہو چکا ہے۔ پانڈے اب پیرو کی جگہ بیٹھا ہے۔ بالے کو اُس کا نائب یا دستِ راست بنا دیا گیا ہے۔ پانڈے، پیرو کا دوست تھا، بالے پروردہ ہے۔ یہ اشتراک جاری رہے تو بہت اچھا ہے لیکن اِس کا امکان نظر نہیں آتا۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے رُکھائی سے کہا۔

"بٹھل دادا کو اب کاٹے کو پاڑے پہ بیٹھنے کا تھا۔ ماری نے اُس سور کے بچے جارج کو خلاص کر کے بٹھل دادا کے واسطے کام ہی نہیں چھوڑا تھا۔"

ایک ثانیے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ اِن کا تعلق پولیس سے نہ ہو۔ دونوں باخبر بھی اچھے لگتے تھے مگر یقیناً ایسا نہیں تھا۔ اُن کے انداز و اطوار میں بڑی لپک اور بے قراری تھی۔ آلودگی میں یہ بے ساختگی نہیں ہوتی۔ جگنو نے کُہنی مار کے دیوا کو ٹوکا اور تاسف سے بولا کہ ظاہر ہے، بٹھل نے ہر طرح سوچ سمجھ کے پاڑا پانڈے کے حوالے کرنے اور خود علیحدہ ہو جانے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ اُسے بھی اندازہ ہو گا کہ پیرو کا اتنا بڑا پاڑا منتشر ہو سکتا ہے، ختم ہو سکتا ہے۔

"پیرو دادا ختم ہو گیا تو اب پاڑے کا کیا..." مَیں نے زہر خند سے کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے دادا پر اپن کو تھوڑا معاف کرو تو بولے۔" جگنو نے لجاجت سے کہا۔ "تم جیسا بولتا ہے، ایک دم ٹھیک ہے۔ پر تم کو کچھ فرق نہیں پڑتا، تم راجا لوگ ہو، ابھی جو بی پاس بیٹھا لوگ سے پوچھو۔ ماہم پاڑے پر اور اکھا بمبئی جنگل میں پیرو دادا کا ایک دو پالتو نئیں ہے۔ ابھی ادھر چھوٹا بڑا بہت کتا ہے جس کا گردن میں اُس کا پٹا ڈلا تھا، جو اُس کا مار کھاتا تھا اور دُم ہلاتا تھا، وہ کیا بولتا ہے سالا، کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اپنے کو، جاستی دن نئیں جائے گا، تم خود دیکھ لے گا، سب اُلٹا ہو جانے کا ہے۔ ادھر ایک سے ایک حرامی دادا پڑا ہے۔ ابھی سب آگے کو بڑھ کے بولتا ہے۔ اونچا اونچا سُر میں، اپن پاڑا نئیں مانگتا، اپن دادا کا غلام ہے، ماہم پاڑے ساتھ جُڑا رہنے کو مانگتا ہے، ہا، ایک دم سالا حرام کا..." دیوا کی آواز گھُٹنے لگی۔ چائے کے گھونٹ سے اُس نے خشک گلا تر کیا اور جیسے وقت نکل جائے گا، ایسے بدحواسی کے عالم میں کہنے لگا کہ کچھ دنوں کی بات ہے، پیرو کی موت کو چند دن ہوئے ہیں کہ کھچڑی پکنی شروع ہو گئی ہے۔ داداؤں کے گروہ بن رہے ہیں، ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔ ابھی تو دادا لوگ خود حیران و پریشان تھے کہ اچانک یہ کیا ہو گیا۔ جیسے جیسے وقت ٹھہرتا جائے گا اور جس دن اُنھیں یہ یقین ہو جائے گا کہ بٹھل لوٹ کے نہیں آئے گا یا وہ بمبئی سے چلا جائے گا اور اس دوران چند سرکردہ دادا اپنے گٹھ جوڑ سے کسی خوش گمانی کا شکار ہو گئے تو کچھ کہا نہیں جا سکتا، یہاں شہر میں پھر کیسا خون خرابا ہو گا۔ دیوا کم و بیش وہی کچھ دُہرا رہا تھا، جس کا اندیشہ کل رات شکلا نے ظاہر کیا تھا اور جس کا اظہار پاڑے سے بٹھل کی دست برداری کے وقت داداؤں نے کیا تھا۔ پانڈے نے بٹھل سے کہا تھا کہ اُسے پیرو کی بیوی اور بیٹی کی اتنی فکر ہے لیکن جو لوگ زندگی بھر پیرو کے ساتھ رہے، اُس کا دم بھرتے رہے، اُس کے ایک اشارے پر جو اپنی زندگیاں قربان کرنے کو تیار رہتے تھے، وہ کہاں جائیں۔ کہاں جا کے سر چھپائیں؟ مَیں نے دیوا سے کہا، یہ محض اتفاق ہے کہ پیرو اور راچھی کی پیٹھ پر کسی ناہنجار نے گولی پھونک دی مگر دونوں کا ویسے بھی تو وقت آ سکتا تھا۔ ہم یہاں نہ ہوتے اور اُس کی زندگی کا چراغ بُجھ جاتا تو وہ کیا کرتے؟ دیوا نے کسی جھجک کے بغیر وہی جواب دیا جو بٹھل کو کسی دادا نے دیا تھا کہ پھر اور بات تھی لیکن اب تو ہم موجود ہیں۔ پیرو دادا کی نسبت سے، ہم پر اُس کے نمک خواروں کی نگہ بانی کی ذمّے داری عائد ہوتی ہے۔ وہ بھی ہر اعتبار سے پیرو کے پسماندگان ہیں۔ دیوا دہائی دینے کے انداز میں نظرِ ثانی کے لیے کہنے لگا کہ زیادہ عرصے کے لیے نہیں تو کچھ وقت کے لیے ہمیں ماہم کے پاڑے پر رہنا چاہیے۔ اگر پہلے پولیس کی نظروں میں مشکوک ہونے کے

کسی اندیشے میں ہم ماہم کے پاڑے کی گدّی سے اجتناب کر رہے تھے تو ماری کے اعتراف کے بعد یہ صورت بھی نہیں رہی ہے۔

"ماری کے اقرار کے بعد ہُبَل بھائی نے پاڑا چھوڑنے کا اعلان کیا تھا۔" مَیں نے درشتی سے کہا۔

"بالکل دادا! ایک دم، پھر کیا بات ہے، یہی تو اپن بھی بول رہا ہے۔" دیوا کچھ بدحواس ہو گیا اور افسردگی سے بولا کہ پیرو کا اتنا بڑا پاڑا کسی بدترین انجام سے دوچار نہ ہو جائے اسی لیے وہ اتنا کہہ رہا ہے۔ "تھوڑا ٹیم کے لیے دادا!" اُس نے بچّوں کی طرح مچل کے کہا۔

"تھوڑے اور زیادہ وقت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں اِس شہر میں نہیں رہنا، کچھ اور کام ہیں، اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ بعد میں، ہمارے جانے کے بعد وہ کچھ نہیں ہو گا جو اب ہو سکتا ہے۔" میں نے جھڑکتی آواز میں اُس سے پوچھا۔

"نئیں ہوئیں گا ایسا۔" جگنو سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ "اپن جانتا ہے، ابھی اتنا نئیں ہونے کا، ہُبَل دادا اتنا دن پھر خالی پیلی تالی بجانے کو پاڑے پر بیٹھنے کا کیا! آدمی بنا کے جائیں گا، تیار کر کے۔"

"آدمی ایسے نہیں بنتا، چاقو کی ہیرا پھیری اور ہاتھ پیر کی زورا زوری سے۔ پاڑے کی گدّی کے لیے اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے راجا دادا!" جگنو بے کلی سے بولا۔ "پر آدمی لوگ سے آدمی نکلتا ہے۔" وہ کٹی پھٹی سی آواز میں کہنے لگا کہ انھیں اپنی نوآموزی اور ناپختہ کاری کا اچھی طرح علم ہے لیکن ہُبَل کے سلسلے میں اُن کی آنکھ نے دھوکا نہیں کھایا ہے۔ ہر چند کہ انھیں اُس کی قربت کا موقع کم ملا ہے مگر جتنا بھی میسّر ہوا، انھوں نے اُسے ضائع نہیں کیا۔ جگنو کے کہنے کے مطابق، وہ پورے تین دن تک پیرو کی ارتھی کے جلوس اور ماہم کے پاڑے پر ہُبَل کے نزدیک تر رہے ہیں۔ اِس سے پہلے بھی وہ ہُبَل کا سایہ بنے رہے تھے۔ جب میں نے چھنگا کا پاڑا حاصل کر کے وہاں چوکی پر بیٹھنا شروع کیا تھا اور ایک دن ہُبَل کی اچانک آمد پر مَیں نے اُس کے لیے چوکی خالی کر دی تھی مجھے دیکھ کے انھیں ہُبَل سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اُس کا قرب اُن کے لیے کسی خواب کی تعبیر کا درجہ رکھتا تھا۔ جگنو کے بہ قول، اُسے اور دیوا کو ہُبَل کا جسم دبانے، حقّہ تیار کرنے اور اُس کی جوتیاں اٹھانے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ ہُبَل کی آمادگی شرط ہے۔ جگنو آہ بھر کے بولا۔ "اپن کو پتہ ہے، ہُبَل دادا کے ہاتھ میں پڑ کے پتھر بھی ہیرا بن جانے کا ہے، ایسا نئیں ہے کیا؟"

مَیں خاموشی سے سُنتا رہا۔ ہُبَل کے ذکر پر دونوں کی آنکھیں دمک رہی تھیں۔ دیوا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ جگنو نے اُسے روک دیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "آپ اچھا سمجھتے ہو دادا! ابھی ناراض مت ہونا، اپن کا من میں جو بات تھا، ابھی منہ پر آ گیا۔ اپن نے سالا کسی پاڑے شاڑے کا ٹھیکا نئیں لیا پڑا ہے۔"

مَیں نے صراحت کرنی چاہی لیکن اِس کی ضرورت نہیں تھی، وہ خود ہی چُپ ہو گئے۔ دیوا نے میرے آگے سموسوں کی پلیٹ بڑھا دی۔ مَیں نے اُن کی خاطر ہر پلیٹ سے کچھ نہ کچھ لیا۔ پیالی میں بچی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مجھ سے پوچھے بغیر بیرے نے گرم چائے کی ایک اور پیالی میرے سامنے لا کے رکھ دی۔ کچھ کھا پی کے مجھے کسی قدر تازگی کا احساس ہوا۔ معاً میری نظر گھڑی پر گئی اور مَیں مضطربانہ کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی ہڑبڑا گئے، پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے؟

"بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"گھر ہی تو جانے کا ہے دادا!"

"ہاں ہاں پر...." مَیں تیزی سے ہوٹل سے نکل گیا۔

"اپن کے لیے ابھی کیا حکم ہے؟" دیوا نے بھی عجلت کی اور ہوٹل کے باہر آ کے میرے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔

"کیسا حکم؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"اپن ابھی کدھر کو جائے؟" جگنو کتراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کدھر کیا؟" دوسرے لمحے اُن کا مدّعا میری سمجھ میں آیا۔ "مَیں نے تمھیں بتایا نہیں کہ اڈّے پاڑے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"نئیں ہے تو کیا ہوا دادا!" جگنو نے لپک کے میرے پیر پکڑ لیے۔ "تم تو خود اکھّا پاڑا ہے۔ اپن کو یاد ہے، ایک بار تم بولا تھا، کوئی پاڑا دادا سے بڑا نئیں ہوتا۔ بولا تھا تم نے ایسا؟"

"ہاں" مَیں نے اُلجھ کے کہا۔ "ضرور کہا ہو گا۔"

"اپن جانتا ہے، ابھی تم چاہے تو اکھّا بمبئی کا پاڑا تمھارا پاڑا ہو۔ تم جدھر جائیں گا، پاڑا تمھارے ساتھ چلیں گا۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"کچھ نہیں مائی باپ، بس ایک بار کو اپن کا ہاتھ پکڑ لو۔" دیوا منّت سے بولا۔ "اپن تمھارا بہت انتظار کیا ہے۔"

"بے شک کیا ہو گا لیکن شاید اب وقت گزر گیا ہے۔ اڈّے پاڑے سے میرا تعلق نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اُن سے کوئی دل چسپی نہیں۔ وہ اور بات تھی، اور وقت تھا، مجھے کسی سبب سے چھنگا کے پاڑے کی ضرورت تھی، اِسے تھوڑا بہت تم بھی سمجھتے ہو گے۔ چھنگا کوئی ایّس دادا نہیں تھا، اُستاد آدمی تھا۔ چاقو پکڑنا اُسے بہت اچھا آتا تھا۔ دم میں البتّہ کچھ کم زور پڑ گیا تھا۔ یہ جان کے ہی میں اُس کے پاڑے پر گیا تھا۔ میرے متعلق تمھیں کچھ زیادہ خوش فہمی ہے۔ چھنگا کے پاڑے کے بعد میں دو اور پاڑوں پر گیا تھا، وہ بہت چھوٹے تھے۔ انھی دو تین چھوٹے موٹے پاڑوں کے سوا مَیں نے کبھی پاڑا نہیں چلایا اور وہ بھی کتنے عرصے کے لیے۔ یقین کرو، مَیں نے بہت دنوں سے چاقو کھولا تک نہیں ہے۔ بہتر ہے، تم کسی اچھے دادا کی تلاش کرو۔ یہاں بمبئی میں ایک سے ایک کھرا اُستاد، دادا پڑا ہے۔"

"ہوئے گا، اپن کے لیے نئیں ہے، اپن کو کدھر بھی نئیں ملا، تم جیسا کدھر بھی نئیں ہے۔ ابھی کچھ بولے دادا! اپن کو پتہ ہے، تم نے چھنگا دادا سے جان کے ویری لگایا تھا۔ تم پہلے ہی اُس کا چاقو گروا سکتا تھا۔ تم نے اُس کو غلاص بھی نئیں کیا، چھوڑ دیا اُس کو۔ اپن نے اکھّا تماشا اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ یہی کچھ تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ایسے نہیں جائیں گے۔ اُن سے حُجّت میں اور دیر ہو جاتی۔ مَیں نے نرمی سے کہا کہ اچھا دیکھیں گے۔ ممکن ہے، جلد ہی بمبئی سے جانا پڑ جائے۔ پھر آنا ہوا اور فراغت ہوئی تو جو تھوڑا بہت آتا ہے، مَیں تمھیں ضرور بتاؤں گا۔

"نئیں دادا! ابھی اپن تم کو نئیں چھوڑنے کا ہے۔"

اُن کے منّت گزار لہجے کے باوجود میں نے اُنھیں گھور کے دیکھا۔ دونوں نے سر جھکا لیا۔ "کیا مطلب؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"اپن کا ابھی بہت خواری ہو گیا ہے۔" جگنو بلبلاتی آواز میں بولا۔ "نئیں معلوم، پھر تم کب ملے؟"

"مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" مَیں نے بے ربطی سے کہا۔ "لیکن بمبئی آنا جانا رہے گا۔ تم نے اتنا انتظار کیا ہے تو کچھ اور سہی...."

میری بات جیسے اُنھوں نے سُنی ہی نہیں۔ جگنو گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اپن سے ابھی انتظار نئیں ہوئے گا دادا! اپن مر جائیں گا۔"

"پھر تم، تم۔" مَیں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ جتنی دیر ہو رہی تھی، مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ میں آگے بڑھ جاتا لیکن یا تو مجھے شبہ تھا کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے یا اُن کی انفعالی حالت نے میرے پیر جکڑ لیے تھے۔ مَیں نے اُن دونوں کے شانے پر ہاتھ رکھ کے مُسکرانے کی کوشش کی اور اُنھیں مطمئن کرنے کی بھی۔ وہ اور بے قرار نظر آنے لگے۔ "تمھیں کوئی پاڑا چاہیے؟" مَیں نے بہ ظاہر خوش دلی سے پوچھا۔

"نئیں دادا! اپن پاڑا نئیں مانگتا۔" دونوں نے تقریباً ایک ساتھ جواب دیا۔

"پھر کیا ہے؟ کسی دادا کو بھگتنا ہے؟"

دونوں نے سر ہلا کے انکار کیا۔ جگنو کسی قدر تامّل کے بعد دبی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپن کو اپنے سے بھگتنے کا ہے۔"

"اپنے سے!" مَیں نے تعجب سے کہا۔

جگنو نگاہیں جھکائے ہوئے بولا۔ "اپن، اپن اکھّا دادا بننا مانگتا ہے۔"

سُنا ہے، کسی بے پناہ خلش کے بغیر آواز میں یہ سوز نہیں ہوتا۔ مَیں نے نسبتہً ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھو! پاڑا کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ ہو سکے تو پاڑے کا خیال چھوڑ دو۔"

"تم بولیں گا تو اپن لوٹ کے پاڑے کا مُنہ نئیں دیکھیں گا۔"

"پھر دادا بننے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہے دادا!" دیوا نے بے تابی سے کہا۔ "اپن پاڑے واسطے نئیں، بس ابھی دادا بننا مانگتا ہے۔"

"میں یہی پوچھ رہا ہوں، جب تمھیں پاڑے پر نہیں بیٹھنا تو دادا بننے سے حاصل؟"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جگنو جھجکتے ہوئے بولا۔ "تمھارے جیسا! تم بھی تو سب جانتا ہے اور پاڑے پر نئیں ہے۔"

"ہاں ہاں۔" مَیں کچھ اور نہ کہہ سکا۔

"بل صرف پاڑے کا لوگ میں نئیں ہوتا دادا۔" دیوا نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنا مافی الضمیر بتانے کی کوشش کی کہ اپنی ذات کے اعتماد کے لیے بھی کوئی کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، حفظِ ماتقدّم کے لیے، اور اپنے لیے نہیں تو کسی دوسرے یا دوسروں کے لیے۔ پاڑے کے سوا بھی تو زندگی میں ہر قدم، ہر موڑ پر بل کی ضرورت پڑتی ہے۔

مَیں نے کہا۔ "ہاں کیوں نہیں، ٹھیک ہے۔ تمھاری یہی خواہش ہے تو مَیں ضرور تمھارا ساتھ دوں گا اور مجھے خوشی ہو گی، اگر تم جیسا کہہ رہے ہو، واقعی اسی لیے کچھ جاننے کی خواہش مند ہو، ویسے تمھاری مرضی۔"

"نئیں دادا!" جگنو اضطراب سے بولا۔ "تم، تم جیسا بولیں گا۔"

دیوا نے شدّت سے اُس کی تائید کی اور کہنے لگا۔ "ایسا ابھی ایک سچ بول دے دادا!"

"کیا بات ہے!" مَیں نے تجسّس سے پوچھا۔

"تم سے بات کرنے سے پہلے اپن کا من میں تھوڑا میلا تھا، ابھی تم سے ایک دم نئیں چھپانے کا، اپن کا من کرتا تھا کہ ابھی ایک بار، صرف ایک بار کو کسی پاڑے کا گدّی پر بیٹھے۔" جانے کیوں یہ کہتے ہوئے دیوا کی آواز پھٹنے لگی۔ اُس نے جلد ہی خود پر قابو پایا اور سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "پر ابھی کبھی پاڑے کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھے تو اپنی ماں کا جنا نئیں۔"

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" مَیں نے ہم دردانہ لہجے میں کہا۔ "یہ کوئی شرط نہیں، مَیں نے تو صرف ایک مشورہ دیا تھا۔"

اِس سے پہلے کہ اُن میں سے کوئی زبان کھولتا، میں نے اجازت چاہی۔ وہ میری صورت دیکھنے لگے۔ مَیں نے قدم بڑھائے تو وہ بھی میرے ساتھ چلنے لگے۔ شروع میں تو مَیں نے یہ سوچ کے احتراز نہیں کیا کہ ممکن ہے، اُن کی منزل بھی اسی سمت ہو لیکن خاصی دُور آنے کے بعد بھی اُنھوں نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تو مَیں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟

"تمھارے ساتھ دادا!" دیوا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرے ساتھ! مگر مَیں تو گھر جا رہا ہوں۔"

"اپن بھی ساتھ چل رہا ہے۔"

میرا سر گھوم گیا جیسے جسم میں یک بارگی آگ بھڑک اٹھی ہو۔ مَیں نے وہیں ٹھیر کے خشمگیں نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔ اُن کی وہی کیفیت تھی جو دست و بازو توڑ دے۔ دونوں پر کوئی ندامت سی طاری تھی، سرتاپا تسلیم و اقرار۔ خفگی کے باوجود اُن کے چہروں پر پسینہ چمک رہا تھا۔ مَیں درشتی سے کچھ کہہ دیتا مگر مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ بر بنائے وضع تو میری ہم رکابی پر مُصر نہیں ہیں؟ مَیں نے دوبارہ اُنھیں تاکید کی کہ وہ اپنے ٹھکانے واپس جائیں، مَیں چلا جاؤں گا۔ جواب میں وہ خاموش کھڑے رہے۔ مَیں نے اُنھیں سمجھایا کہ وہ غیر ضروری تکلّف نہ کریں، رات ہو گئی ہے اور مجھے دُور پیرو دادا کے گھر جانا ہے۔ اُن کے لیے واپسی مشکل ہو جائے گی۔

"اپن واپس نئیں آئیں گا۔" دیوا نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں! کیا تم بھی اُسی طرف جا رہے ہو؟"

"اپن تمھارے، ابھی تمھارے ساتھ..." دیوا الفاظ چبانے لگا۔

ظاہر ہے، اب کسی قسم کی رُو رعایت کا جواز نہیں رہا تھا۔ مَیں نے طے کیا، مجھے صاف طور پر کہہ دینا چاہیے کہ اپنا راستہ لو۔ تاہم مَیں نے جبر کیا اور کہا "ٹھیک ہے، چلتے رہو پھر۔"

"ابھی راستہ دُور ہے دادا! بولے تو وکٹوریا کر لے۔"

"نہیں۔" مَیں نے اُنھیں جھڑک دیا۔ "مجھے پیدل ہی جانا ہے۔" میں نے اُنھیں یہ نہیں بتایا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اُنھوں نے بھی لوٹ کے نہیں پوچھا کہ مجھے تو گھر پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ وہ چلتے رہے اور میری تیز رفتاری کا ساتھ دیتے رہے۔ دیر تک مَیں نے اُن سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی کچھ نہ بولے۔ شاید مَیں اُن سے اتنا کبیدہ اور برگشتہ نہیں تھا جتنا خود سے تھا۔ جانے کیوں میں ہوٹل میں اُن کے ساتھ چائے پینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اب تو یقیناً اُدھر سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔ کسی نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ایسی بات نہیں تھی۔ دادا کے واقعے کے بعد سب کا اعتبار متزلزل ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے، جمرو، شامو وغیرہ میری تلاش میں نکل بھی چکے ہوں۔ بہر حال جتنی تیزی سے ممکن تھا، میں فاصلہ کم کرتا رہا۔ ٹانگیں کھنچنے لگی تھیں۔ آگے سارے راستے مَیں نے اُن دونوں سے لاتعلق رہنے کی کوشش کی لیکن وہ تو ہمہ جاں، ہمہ نفس میرے ہم قدم تھے۔ اُن کا بوجھ بھی جیسے مجھ میں شامل ہو گیا تھا۔ اِس دوران میں بار بار خود کو تلقین کرتا رہا کہ حرج بھی کیا ہے، یہ آخر میرا کیا نقصان کر رہے ہیں اور مَیں انھیں زبردستی کس طرح روک سکتا ہوں۔

گھر اب اتنی دور نہیں رہ گیا تھا جتنی دُور ہم آ چکے تھے۔ ہوٹلوں اور پان کی دکانوں کے سوا تقریباً ساری دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سڑکوں پر لوگوں کی تعداد بھی برائے نام تھی۔ راستے میں کئی جگہ مجھے پولیس والے دکھائی دیے۔ پولیس کا پہلا کام شک ہے۔ تین آدمیوں کو اتنی تیز رفتاری سے بڑھتے دیکھ کے اُنھیں بے کلی ہو سکتی تھی۔ وقت بھی مناسب نہیں تھا۔ دُکانیں بند ہو جانے کی وجہ سے روشنی خاصی کم ہو گئی تھی۔ پولیس کے علاوہ درمیان میں ہم تینوں کے جاننے والے باڑے کے لوگوں سے بھی واسطہ پڑ سکتا تھا۔ بمبئی میں اب مَیں کوئی ایسا گُم نام دادا بھی نہیں رہا تھا۔ قدم قدم پر مجھے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کچھ اور نہیں تو وقت اور نکل جائے گا مگر وقت کے نہ کان ہوتے ہیں [illegible] ہیں، وہ کسی ضدی بچّے کی طرح ہے یا کسی خود سر حاکم کی طرح۔ اپنی مرضی سے روپ بدلتا رہتا ہے۔ چلتے چلتے دیوا فٹ پاتھ پر اُبھرے ہوئے کسی پتھر سے چوٹ کھا کے اوندھے مُنہ گر پڑا۔ مجھے پھر رُکنا پڑا۔ وہ جلدی سے کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ گیا۔ اُس لمحے میرے جی میں آیا کہ مَیں چلتا رہوں لیکن دیوا کی چھِلی ہوئی ٹھوڑی سے خون چھلک رہا تھا۔ مَیں نے اُس کی چیخ بھی سُنی تھی۔ چھوٹی موٹی چوٹ ہوتی تو دیوا اتنا مرا گرا نہیں تھا، پی جاتا۔ مَیں نے جگنو کے ساتھ دیوا کے کپڑوں کی گرد جھاڑی۔ پیچھے فرش کا کچھ حصّہ گیلا تھا جس پر پہلے دیوا کا پاؤں رپٹا، پھر سنبھلنے کی کوشش میں اُس کا توازن اور بگڑ گیا۔ مَیں نے جولین کا رومال جیب سے نکال کے دیوا کا چہرہ صاف کیا۔ اُس کی ٹھوڑی سے خون بہنے لگا تھا۔ چند لمحوں میں اُس کے ہونٹ بھی خون سے بھر گئے۔ پتھر نے دانتوں اور مسوڑھوں کو بھی زک پہنچائی ہو گی۔ گھٹنے بھی محفوظ نہیں رہے ہوں گے۔ دیوا لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا تھا۔

اور ہر چند کہ اُس نے دوسرے ہی لمحے مستعدی کا مظاہرہ کیا لیکن

ن کے انکار کے باوجود اُسے سامنے کی بند دکان کے چبوترے پر راُس کی ٹھوڑی کا جائزہ لیا۔ خون نہیں رُک رہا تھا۔ خون سے ں تر ہو گیا۔ جگنو بدحواسی سے کبھی اُسے تسلی دیتا، کبھی مجھے۔ مَیں ے کسی قریبی حکیم ڈاکٹر وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ تو وہ اِدھر اُدھر وڑا کے رہ گیا۔ گیلے فرش کی کیچڑ خون میں مل گئی تھی۔ کہیں سے باتا تو اچھا تھا۔ میرے اشارے پر جگنو بھاگتا ہوا ایک طرف گیا، پھر ااور قریب کی ایک عمارت میں گھُس گیا۔ اچھا گنجان علاقہ تھا۔ اتنی ئی راہ گیر ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ اُنھیں مدد کرنے کے بجائے یل جاننے کی بے چینی تھی۔ وہ بہت مشکل سے میری التجا پر چُپ جگنو فوراً کہیں سے پانی سے بھرا ہوا لوٹا لے آیا۔ لوٹے کا مالک بھی ڑھے اُس کے پیچھے لپکتا ہوا آیا تھا۔ ٹھوڑی صاف کرنے پر زخم رت نظر آئی۔ اتنا گہرا نہیں تھا لیکن بیچ میں گچّی سی بن گئی تھی۔ خون ے کے لیے الگ سے کوئی کپڑا نہ میرے پاس تھا، نہ جگنو کے پاس۔ جگنو کا کُرتا پھاڑے بغیر چارہ نہیں تھا۔ لوٹے والا آدمی سب یادہ مشورے دے رہا تھا، اُسی نے اپنی چادر اتاری۔ چادر کے وہ دبلا پتلا شخص بنیان پہنے ہوئے تھا۔ شرافت کا شکل و قامت، حیثیت سے تعلق نہیں ہے۔ اِس سے پہلے کہ اور راہ گیر اکٹھے ہوتے نی اپنی بولیاں بولتے، لوٹے والے کی ہدایت پر ہم وہاں سے چل ے۔ کوئی ایک فرلانگ کی دُوری پر وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا، پھر ، دوسری تنگ گلی میں۔ وہ کسی ڈاکٹر رستوگی کا ٹوٹا پھوٹا سا مطب ۔ لوٹے والے نے بے دریغ دروازہ کھٹ کھٹانا اور آوازیں لگانا رع کر دیا۔ کسی نہ کسی طرح اُس نے نیند خراب ہونے پر ناراض لڑ کو منا بھی لیا۔ دیوا کو ڈاکٹر کے حوالے کر کے میں پیچھے ہٹ گیا، انک مجھے اپنی خالی جیب کا خیال آ گیا تھا۔ اگر دیوا اور جگنو کی جیبوں ں بھی مرہم پٹّی کے پیسے نہ ہوتے تو؟ میں اس پشیمانی کا اندازہ ہی کر لکتا تھا۔ روپے پیسے کے بغیر آدمی اپاہج سے کم نہیں ہوتا۔ گھر سے چلتے قت یہ لاٹھی ضرور ساتھ رکھنی چاہیے۔ جب تک جگنو نے اپنی جیب سے ڈاکٹر کی فیس ادا نہ کر دی، میں اپنی انگلیاں توڑتا، ہونٹ کاٹتا رہا۔

ڈاکٹر پندرہ بیس منٹ تک اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔ دیوا کے چہرے پر جا بہ جا لال دوائی کے دھبّے پڑ گئے تھے۔ اُس کے نیچے کے دو دانت بھی ہل گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اُنھیں نکالا نہیں۔ دوا لگا کے خون روک دیا۔ ہم مطب سے باہر آئے تو سڑکیں اور سنسان ہو چکی تھیں۔ کئی منزلہ عمارتوں کے دروازوں اور کھڑکیوں کی روشنیاں بھی بیشتر بجھ چکی تھیں۔ فٹ پاتھ پر ٹکڑیوں میں بیٹھے ہوئے چوسر اور تاش کے شوقین بھی اِکّا دکّا ہی کہیں نظر آ رہے تھے۔ دکانوں کے چھجّوں کے نیچے سوئے ہوئے لوگوں کی تعداد بھی اس نسبت سے بڑھ گئی تھی۔ میری رفتار اب اتنی تیز نہیں تھی۔ اب جو کچھ بھی ہو، گھنٹے بھر بعد یا پہلے پہنچنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ایک گھوڑا گاڑی قریب آنے پر جگنو نے میری طرف دیکھا، مَیں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بھی خاموش رہا۔ میرا خیال تھا، اب کسی جگہ اُنھیں ارادہ بدل دینا چاہیے۔ ممکن ہے، یہ میری طرف سے اشارے کے منتظر ہوں۔ دیوا اب لنگڑا کے نہیں چل رہا تھا لیکن لازماً اُسے تکلیف ہو رہی ہو گی۔ مَیں نے جلدی نہیں کی تاکہ اُنھیں اِس غیر ضروری زحمت کا مزید احساس ہو سکے۔ کچھ دور جا کے پھر میں نے زبان کھولی اور دیوا سے کہا کہ اُسے سرِ دست آرام کی ضرورت ہے۔ اِردگرد دُکانوں کے تھڑوں پر جہاں اور بہت سے لوگ سوئے ہوئے ہیں، اُسے بھی کہیں جگہ مل سکتی ہے۔ میری توقع کے خلاف خود کو چاق و چوبند ظاہر کرنے کے لیے دیوا اپنے بازو پھیلانے اور جسم کو جھٹکے دینے لگا۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن اس عالم میں اُن کا اصرار وضع و مروّت سے سوا تھا، مرتبت سے بیش۔ رُتبہ کسی محبوب و محترم سے اظہارِ التفات کا یہ قرینہ نہیں ہوتا۔ یہ جس شخص کو کسی منزلت کا سزاوار سمجھ رہے ہیں، اُس کی پیشانی پر بھی اُن کی نظر ہونی چاہیے۔

میری رفتار سست پڑ گئی۔ اور مجھے ازسرِ نو اپنے حواس مجتمع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ کوئی ایسی بات ضرور ہے جسے میں اخذ نہیں کر پایا ہوں یا ٹھیک طرح سُن نہیں سکا ہوں۔ یہ کسی موقع کے منتظر ہیں جو اُنھیں مل نہیں پایا ہے یا مَیں نے نہیں دیا ہے۔ اِس دیوانہ واری کا سبب محض فشارِ اعصاب ہی نہ ہو گا۔ اپنی گفتگو اور طور طریق سے یہ ایسے سادہ اور بے ارادہ بھی نہیں لگتے۔ جو کچھ یہ کہہ نہیں پا رہے ہیں یا مَیں سُن نہیں پا رہا ہوں، وہ مجھے اِن سے پوچھنا چاہیے، سو مَیں نے دیوا کو براہِ راست مخاطب کیا۔ مَیں نے ہم دردانہ لہجے میں اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتے ہیں؟ دیوا کے ہونٹ پھیل گئے اور اُس نے بکھری ہوئی آواز میں جواب دیا کہ اب اُن کا کوئی گھر نہیں ہے۔ آج یہاں، کل وہاں۔ مَیں نے کہا کہ پھر مجھے گھر تک پہنچانے کے لیے اتنی زحمت کیوں کر رہے ہو؟

دیوا نے دزدیدہ نظروں سے پہلے مجھے دیکھا، پھر جگنو کو اور بہ دقّت جواب دیا کہ وہ تو میرے ساتھ جا رہے ہیں۔ یہی شبہ میرے رگ و پے میں کھٹک رہا تھا۔ میرا سر پھر گھومنے لگا۔ تاہم میں نے ضبط کیا اور اُن سے پوچھا "میرے ساتھ کہاں؟"

"جدھر ابھی تم کو جانے کا ہے دادا!" جگنو سراسیمہ لہجے میں بولا۔

"مَیں، مَیں تو پیرو دادا کے گھر مہمان ہوں۔"

"اپن کو بھی اُدھر ہی لے چلو دادا!"

"تمھیں!" اپنی آواز مجھ سے سنبھل نہیں رہی تھی۔ "مَیں تمھیں وہاں کیسے لے چل سکتا ہوں۔ تمھارا دماغ ٹھکانے پر نہیں لگتا۔ مَیں نے تمھیں بتایا نہیں کہ میری حیثیت خود وہاں مہمان کی ہے۔"

"اپن تمھارا نوکر ہے دادا! ابھی اُدھر ہی کہیں کو پڑا رہے گا۔" جگنو گڑگڑایا کہ اُن دونوں کو دروازے پر جگہ مل جائے تو بھی اُن کے لیے بہت ہے۔ وہ وہاں سب کی خدمت کریں گے۔ میری، ببّھل کی، پیرو دادا کی بیوی اور بیٹی کی۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟ ایسا کیسے! ایسا کہاں ہوتا ہے۔" میری زبان سٹ پٹانے لگی۔ مَیں نے اُنھیں یاد دلایا کہ پیرو دادا کا گھر موت کا گھر ہے۔ وہاں پہلے سے بہت سے لوگ موجود ہیں۔ مَیں نے اُن سے اور بھی بہت کچھ کہا لیکن اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا، اُنھوں نے میرے پیر پکڑ لیے اور وہی رٹ لگاتے رہے۔

دوسروں پر قابو پانے میں کبھی اتنی مشکل پیش نہیں آتی، جتنی خود پہ پانے میں پیش آتی ہے۔ میرے بازو اکڑنے لگے، جی میں آیا، دونوں کو گدّی سے پکڑ کے اِن کے سر ٹکرا دوں۔ تلے ہوئے دو ایک ہاتھوں میں یہ کچھ دیر کے لیے بے سُدھ ہو سکتے تھے۔ گھر اب اتنا دُور نہیں رہ گیا تھا۔ مَیں آسانی سے باقی راستہ طے کر سکتا تھا اور مَیں اتنی دیر میں مجھ عقل کے اندھے کو سجھائی دیا کہ میں گھوڑا گاڑی نوبت پہلے کر سکتا تھا۔ گھر اُتر کے بس اندر جا کے پیسے لانے پڑتے۔ دونوں میری ٹانگوں سے چمٹے اپنے سر میرے پیروں پر رگڑ رہے تھے۔ مَیں نے بے اختیار اُن کے بال پکڑ کے اُنھیں جھٹکے سے اُٹھایا۔ اُنھوں نے نہ کوئی مزاحمت کی نہ فیل مچایا۔ میں جانے کیا کرتا لیکن دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری تھا۔ میرے ہاتھ پتھر کے ہو گئے۔ چند لمحوں تک مَیں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اِن کا کیا کروں۔ مَیں نے اُن جیسے آدمی کبھی نہیں دیکھے تھے۔ مَیں نے اُنھیں چھوڑ دیا۔ جہاں ہم تھے، یہ جگہ نہ اتنی اندھیری تھی نہ روشن۔ مَیں ایک دکان کے چبوترے پر آ کے بیٹھ گیا۔ وہ دونوں بھی آہستہ آہستہ میرے پاس آ گئے اور زمین پر سر جھکائے میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔

مجھے اپنے آپ کو سمیٹنے میں وقت لگ گیا۔ "کیا بات ہے؟" مَیں نے جکڑی ہوئی آواز میں اُن سے پوچھا۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ مَیں نے دوبارہ پوچھا۔

"اپن کو ابھی اپنے سے الگ مت کرو دادا!"

"کیا، کیا چاہتے ہو تم؟" مَیں نے شکستگی سے کہا۔

"اپن پہلے اکھّا بول دیا ہے۔"

"کیا بولا ہے تم نے؟ اور مَیں نے، مَیں نے تم سے کچھ نہیں کہا، کچھ نہیں کہا۔ کاہے کی جلدی ہے تمھیں۔ آخر ایسی کیا بات ہے؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے ہو؟"

"اپن تمھارا بہت انتظار کیا ہے۔"

"مَیں نے سُن لیا ہے۔" مَیں نے پھُنکارتی آواز میں کہا۔

"ابھی اپن کو مت چھوڑو دادا! مر جائیں گا اپن۔"

"ہا۔" مَیں نے پیچ و تاب کھا کے کہا۔ "اِس وقت میں تمھیں مل پاتا تو تم زندہ رہتے۔"

"کدھر کو دادا! اپن زندہ ابھی کدھر کو ہے۔" جگنو کی آواز کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہنے لگا کہ دادا کی موت کی وجہ سے وہ رُکے ہوئے تھے کہ ابھی میرے پاس اُن کا آنا مناسب نہیں ہے، نہ وہ کچھ کہہ پائیں گے نہ مَیں سُن پاؤں گا۔ وہ قسم کھانے لگا اور وہی سب کہہ رہا تھا کہ ایک ایک لمحہ اُنھوں نے گِن گِن کے کاٹا ہے۔ اُن کی قسمت تھی کہ آج مَیں اُنھیں مل گیا اور تنہا مل گیا۔ جیسا کہ اُن کی آرزو تھی۔ ورنہ مجھ سے ملنے کے بعد بھی جانے کب اُنھیں اس طرح اپنا احوال بیان کرنے کا موقع مل پاتا۔

"مگر کیوں؟ صرف دادا بننے کے لیے؟"

"ہاں دادا!" جگنو نے سانس کھینچ کے کہا۔

"کیوں؟ دادا بننے کی ایسی وحشت کیوں ہے تمھیں؟"

"ایک بار کو۔" دیوا ملتجی لہجے میں بولا۔ اُس کی عاجزی میں تپیدگی نمایاں تھی۔ کہنے لگا کہ وہ صرف ایک مرتبہ کے لیے مکمل دادا بننا چاہتے ہیں۔ پھر چاہے اُن کے ہاتھ پیر توڑ دیے جائیں۔

"مگر کیوں؟"

"اپن پر ابھی بہت اُدھار ہے دادا!"

"کیسا اُدھار؟" مَیں نے اضطراب سے پوچھا۔

"بنارسی کا۔" جگنو سرد مہری سے بولا۔

"بنارسی کون؟ بنارسی دادا؟"

"دادا نئیں، ابھی کُتّا بولو۔"

"بنارسی سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

"بہت ہے دادا!" جگنو کی آواز تڑخ رہی تھی۔ "بس ایک بار کو اپن کا ہاتھ پکڑ لیو، اپن کو پتہ ہے، اکھّا آگے پیچھے کا ابھی۔۔۔"

"کیا بات ہے، کھُل کے بتاؤ۔" اُس کی بات کاٹ کے مَیں نے بے چینی سے کہا۔

"کیا بولے دادا! ابھی کیا بولے۔" جگنو نے اپنا منہ چھپا لیا۔ وقت کا کچھ احساس ہی نہیں رہا۔ پہلے دونوں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے۔ میرے اصرار اور تسلّی تشفّی پر جگنو نے زبان کھولی اور جو کچھ اُس نے بتایا، وہ ایسا دل دوز تھا کہ آدمی سنّاٹے میں آ جائے۔ جگنو کے کہنے کے مطابق وہ بچپن میں سوتے جاگتے ایک خواب دیکھا کرتے تھے، ایک بڑے مکان کا آنگن اور آوازیں اور چہرے۔ وقت کے ساتھ وہ سب دھندلاتا گیا اور اُنھیں صرف اتنا یاد رہا کہ ایک عورت اُن کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اُس کا نام نولکھی تھا۔ نیلی نیلی بڑی بڑی آنکھیں، لمبے بال اور رنگ سونے جیسا۔ اُس کی آواز بہت میٹھی تھی اور لہجہ بہت نرم تھا۔ وہ اوسط قد اور متناسب بدن کی ایک عورت تھی۔ اُس نے ایک ماں کی طرح جگنو اور دیوا کی پرورش کی اور بہت دنوں تک وہ اُسے اپنی ماں ہی سمجھتے رہے۔ نولکھی کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بھی رہتی تھی، برس ہوئے اُس کے مرنے کے بعد نولکھی اکیلی رہ گئی۔ جگنو بتا رہا تھا کہ شروع میں اُس کے گھر کئی مردوں کی آمد و رفت تھی۔ بعد میں ایک شخص رہ گیا تھا۔ اُس وقت وہ بہت چھوٹے تھے۔ جگنو، دیوا سے عمر میں کچھ اور کم تھا۔ نولکھی کے پاس آنے والا شخص جب بھی گھر آتا، گھر کے واحد کمرے میں چلا جاتا۔ جب تک وہ اندر رہتا، نولکھی بھی اُس کے پاس رہتی۔ نولکھی کی کوشش ہوتی کہ دیوا اور جگنو اُس آدمی کی نظروں سے دور رہیں۔ جس دن اُس کے آنے کا وقت ہوتا، نولکھی پہلے ہی جگنو اور دیوا کو کہیں چھپا دیتی یا باہر بھیج دیتی۔ وہ درشت چہرے، کرخت آواز اور بلّی جیسی آنکھوں والا شخص بنارسی تھا۔ پاڑے کا دادا، دُور دُور اُس کی پھُرتی، لپک اور چاقو بازی کا شہرہ تھا۔ بعد میں نولکھی کو جگنو اور دیوا سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، بنارسی کی آمد پر وہ خود کسی کونے میں دُبک جاتے یا باہر گلی میں چلے جاتے۔ کبھی اتفاقاً آمنا سامنا ہو جاتا تو اُنھیں ہمیشہ بنارسی کی گالیاں سُننی پڑتیں۔ وہ اُنھیں پلّے کہتا تھا، بڑا پلّا، چھوٹا پلّا۔ پلّوں کو دیکھ کے کسی کا منہ اتنا نہ بگڑتا ہوگا جتنی بنارسی کی شکل بگڑ جاتی تھی۔ اُس کی آہٹ پر دونوں کا دل ڈوبنے لگتا۔ نولکھی کا بھی کچھ یہی حال تھا، پہلے وہ بنارسی سے ذرا کھُل کے، اونچی آواز میں بات کر لیتی تھی، ہوتے ہوتے اُس کی زبان بھی لکنت کرنے لگی۔

وہ بستی کسی جیل خانے کے مانند تھی جہاں آدمی کو زندگی کی سزا ملتی تھی۔ وہ خود ہی صید، خود ہی صیّاد تھے۔ جیل سے یہ سزا بس اتنی مختلف تھی کہ آدمی لوٹ کے پھر وہیں آ جاتا تھا۔ بہت بھاگنے کی کوشش کرتا مگر لوٹ کے وہیں آنا پڑتا۔ مرد صبح گھروں سے نکل جاتے، شام ڈھلے واپس آتے، بہت سی عورتیں مزدوری کرتیں اور اپنے بچّوں کو کرائے کی عورتوں کی تحویل میں دے جاتیں۔ چند پیسوں کے عوض یہ بوڑھی عورتیں دن بھر اُن کے بچّوں کی رکھوالی کیا کرتیں۔ یہ بچّوں کی حفاظت کا طریقِ کار تھا، تربیت کا نہیں۔ غریب بچّوں کو کسی تربیت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اتنی سزاؤں کے بعد آدمی بچّوں کی خواہش کیوں کرتا ہے، پیدا ہو جاتے ہیں تو اُنھیں ختم کیوں نہیں کر دیتا۔ زنداں میں قیدیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ خود آزاری ہے یا کوئی انتقام، جانے کیا ہے، آدمی اپنی زندگی سے کچھ نہیں سیکھتا۔ بہرحال جگنو اور دیوا کو رکھوالی کرنے والی کرائے کی عورتوں کے پاس نہیں جانا پڑا کیوں کہ نولکھی سارا دن گھر ہی رہتی تھی۔ جگنو اور دیوا کے ساتھی گلی کے بچّے تھے جو صبح و شام گلیوں میں شور مچاتے، چھینا جھپٹی کرتے رہتے۔ جس کے پاس زیادہ طاقت ہوتی، وہ زیادہ مستحق سمجھا جاتا۔ آئے دن گلی کے بچوں میں سر پھٹوّل ہوتی، اُن کا اُدھورا کام اکثر رات کو اُن کے والدین نمٹاتے۔ نولکھی، جگنو اور دیوا کو گلی کے بچّوں میں شامل ہونے سے منع کرتی تھی مگر یہ تو بڑے مکانوں میں ممکن تھا، بستی کے گھروں اور گلی میں امتیاز ہی کتنا تھا۔ جگنو اور دیوا ایک دوسرے کے لیے ہم جان و ہم دل تھے۔ دونوں کی یہ یک جائی اُنھیں گلی کے بچّوں میں برتر کر دیتی تھی۔ نولکھی نے شروع شروع میں اُنھیں پڑھانے کے لیے ایک استاد کا بھی انتظام کیا تھا۔ وہ جلد ہی حرف و عدد کا کرتب سیکھ گئے تھے۔ اپنے ہاتھ سے اُنھیں الفاظ و اعداد کی اچھی شکلیں بنانا بھی آ گیا تھا کہ ایک دن یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک روز توقع کے خلاف بنارسی اُس وقت آ دھمکا جب استاد موجود تھا، دیوا اور جگنو کتابوں سے سر کھپا رہے تھے۔ معلوم نہیں کیوں، بنارسی کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی۔ اُس نے استاد کو دھکّے دے کے باہر نکال دیا اور ساری کتابیں کاپیاں پھاڑ دیں۔

اُن دنوں گھر میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوا تھا، ایک لڑکی کا۔ نولکھی پھولی نہیں سماتی تھی، وہ لازماً بنارسی کی بیٹی تھی۔ اُنھیں یاد نہیں کہ بنارسی نے کبھی اپنی بچّی پھول وتی کو نظر بھر کے دیکھا ہو۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ پھول وتی سے اُس کا رویّہ ایسا خاردار نہیں تھا۔ پھول وتی پھولوں کی طرح تھی، بالکل اپنی ماں پر گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھی ماں کی آنکھوں کی طرح نیلی تھیں۔ جیسے جیسے جگنو اور دیوا پر وقت گزرتا گیا، وہ بہت کچھ سمجھتے گئے کہ نولکھی اُن کی ماں نہیں ہے اور بنارسی اُن کا باپ نہیں ہے اور نولکھی بنارسی کی زوجیت میں بھی نہیں ہے۔

البتہ نولکھی کا سارا خرچ بنارسی کے ذمّے ہے اور خرچ کی کمی بیشی بنارسی کی خوشی و ناخوشی پر ہے۔ بنارسی سے پہلے کوئی اور تھا جو نولکھی کے پاس آتا تھا، بنارسی کا بڑا بھائی، نام اُس کا کچھ اور تھا مگر سب کاشو دادا کہتے تھے۔ وہی شاید جگنو اور دیوا کو نولکھی کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ کاشو بھی پاڑے کا دادا تھا اور کوئی بہت بڑا شہ زور۔ اُنھوں نے سُنا تھا کہ بنارسی اپنے بڑے بھائی کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔ جگنو اور دیوا نے کئی بار نولکھی کو کرید لے کی کوشش کی۔ اُنھیں محسوس ہوا کہ یہ ذکر نولکھی کے لیے دُکھ کا باعث بنتا ہے۔ وہ کوئی مُناسب جواب نہ دے پاتی۔ نولکھی ہی دُنیا میں اُن کی ایک پناہ تھی اور اُنھیں وہ کچھ دیتی تھی جو کوئی اور نہیں دیتا تھا، عزّت، پیار اور چھاؤں۔ وہ بھی اُسے یہی سب کچھ دینے کے لیے بے تاب رہتے تھے، سو وہ نولکھی کی اداسی اور ویرانی کے عوض اپنے بارے میں کچھ جاننے سے اجتناب کرتے تھے۔ تاہم نولکھی کی زبانی اتنا معلوم ہوا تھا کہ بنارسی کا بھائی کاشو اُن کا باپ تھا۔ وہ کسی لڑائی میں مارا گیا۔ اُن کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ کاشو دادا اُن دونوں کو نولکھی کے پاس چھوڑ گیا۔ اِس سے زیادہ نولکھی کچھ نہیں بتا پاتی تھی یا اُسے واقعتہً کچھ معلوم نہیں تھا۔ بہرحال اُنھیں نولکھی کے بیان پر یقین نہیں تھا۔ خود کو بنارسی جیسے کمینے شخص کا رشتے دار تسلیم کرنا ان کے لیے نہایت روح فرسا بات تھی۔ اُنھیں شبہ تھا کہ نولکھی نے اُن سے بہت کچھ چھپایا ہے اور اُنھیں خوف تھا، اُن کے زیادہ تنگ کرنے پر نولکھی کوئی ایسی بات نہ کہہ ڈالے جسے سننا اُن کے بس میں نہ ہو۔

پھر بنارسی کی آمد میں تواتر نہیں رہا۔ کبھی ہفتے میں دو بار آجاتا، کبھی ایک بار۔ وقت بھی طے نہ رہا۔ جب بھی آتا، شراب میں جھومتا، دندناتا ہوا آتا یا وہیں شراب منگوا کے پیتا۔ جگنو اور دیوا سامنے ہوتے تو اُنھیں حکم پہ حکم دیتا۔ شراب پی کے وہ اور بدمست ہو جاتا۔ جگنو اور دیوا کے لیے وہ طرح طرح کے حقارت آمیز القاب تراشتا، حرامی، حرام خور کے لقب تو مسلسل اُس کی زبان کا درد ہوتے۔ کبھی وہ اُنھیں طیش میں آکے ہمیشہ کے لیے گھر سے نکل جانے کا حکم صادر کرتا۔ جگنو اور دیوا نے منافقت بھی کرنی چاہی لیکن اُن کی خوشامد کا اثر صرف کچھ دیر رہتا، بنارسی پھر اپنی خصلت پر اُتر آتا۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ آخر ایک دن اُنھوں نے عاجز آکے گھر چھوڑ دیا۔ نولکھی اُن کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی۔ بمبئی بڑا شہر تھا۔ وہ چند روز تک اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتے ہوئے اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب رہے مگر پھر بنارسی کے پاڑے کے آدمیوں نے اُنھیں دیکھ لیا۔ وہ اُنھیں پکڑ کے مارتے پیٹتے گھر لے آئے۔ نولکھی کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں کو سینے سے چمٹائے روتی رہی، اُس نے منتیں کر کے اُن سے وعدہ لیا کہ وہ آیندہ کبھی اُسے اکیلی چھوڑ کے نہیں جائیں گے، اُنھوں نے اب کے ایسا کیا تو وہ زندہ نہیں رہے گی، پھول وتی بھی مر جائے گی، جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بنارسی گھر آیا تو اُنھیں دیکھ کے پاگل ہو گیا۔ اُس نے نولکھی اور پھول وتی کی بھی پروا نہ کی، دونوں کو ننگا کر کے اتنا مارا کہ جگنو بے ہوش ہو گیا۔ دیوا جسم کا توانا تھا، وہ بلکتا، دھاڑیں مارتا سب کچھ برداشت کرتا رہا۔ پھول وتی سُن ہو گئی تھی۔ نولکھی نے مداخلت کی تو بنارسی نے اُس پر بھی ہاتھ اُٹھایا۔ جگنو اور دیوا کو یہ کہنے کی مجال نہیں تھی کہ گھر سے نکل جانے کا حکم بنارسی ہی نے اُنھیں دیا تھا۔ پھر اُنھوں نے طے کیا کہ اب وہ اِس شہر ہی میں نہیں رہیں گے۔ وہ پھر گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہفتے عشرے تک وہ شدید مشقتیں کر کے اپنا پیٹ بھرتے رہے۔ رات ہوتی تو ریلوے اسٹیشن کے ڈھکے کھُلے مسافر خانے میں جا پڑتے۔ وہاں بھی لوگ اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک دفعہ تو اسٹیشن سے پانچ چھ شُہدے اُن کی مدد کرنے، اُنھیں پناہ دینے کے بہانے کسی ویرانے میں لے گئے۔ یہ بات بتاتے ہوئے جگنو کی حالت ہذیانی ہو گئی۔ وہ اپنا منہ نوچنے لگا۔ اُن کے لڑکپن اور شکستہ حُلیے کی وجہ سے سب اُن پر شک کرتے اور گھر سے مفرور، کہیں سے کچھ چُرا کے بھاگے ہوئے لڑکے سمجھتے۔ یہ جہنم گھر سے بھی زیادہ سخت تھا۔ جتنے دن وہ سورت میں رہے، نولکھی اور پھول وتی اُن کا تعاقب کرتی رہیں، وہ اُن کی آنکھوں میں بیٹھی آہ و بُکا کرتی رہیں۔ ہر لمحے وہ خود کو ملامت کرتے کہ نولکھی اور پھول وتی کو بے آسرا چھوڑ کے آگئے، اُنھوں نے یہ کچھ ٹھیک نہیں کیا، نولکھی کو کسی کل چین نہ ہوگا۔ سو وہ ایک دن خاموشی سے گھر واپس آگئے۔ اُنھوں نے صحیح فیصلہ کیا تھا، لگتا تھا، وہ کسی اور گھر میں آگئے ہیں۔ نولکھی اور پھول وتی پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ اب کے وہ تیار تھے کہ واپسی پر اُنھیں پھر بنارسی کا سامنا کرنا پڑے گا مگر اُن کی قسمت اچھی تھی کہ اپنے علاقے میں ہونے والی قتل کی کسی واردات میں بنارسی پولیس کو مطلوب ہو گیا تھا۔ وہ شدّت سے آرزو مند تھے کہ کاش بنارسی کو بھی سزا ہو جائے، اُسے پھانسی کی سزا ہو لیکن کچھ نہیں ہوا۔ بنارسی پورے ایک ہفتے بھی جیل میں نہیں رہا۔ جیل سے چھوٹ کے وہ سیدھا نولکھی کے پاس آیا۔ نولکھی نے اُسے رات بہت شراب پلا دی اور یوں جگنو اور دیوا بنارسی کی نظروں سے اوجھل رہے مگر یہ تو ایک رات کی بات تھی۔ بنارسی تو موجود تھا اور وہ سب

ز نجیر میں جکڑے ہوئے تھے۔ زنجیر کا حلقہ کبھی ڈھیلا ہو جاتا، اتنا تنگ کہ بس دم نہ نکل پاتا۔

کسی جواز کے بغیر بنارسی نے اچانک خرچا کم کر دیا تھا۔ نولکھی ہاتھ کھُلا ہوا تھا۔ کوئی مانگنے آتا تو جو اُس کے پاس ہوتا، دے ...۔ سب سے زیادہ پیسے وہ جگنو اور دیوا پر خرچ کرتی تھی تاکہ اُنھیں ... طور محرومی کا احساس نہ رہے، وہ اچھے کپڑے پہن سکیں اور پاس ...س میں بات بنی رہے۔ یہ محض نولکھی کی خوش گمانی تھی۔ اُس نے ...ت داری کو اتنا ارزاں سمجھ لیا تھا۔ گھر سے باہر تو یہ اور مہنگی ہو ...ی ہے۔ عام بچّوں کی طرح دیوا اور جگنو نے کبھی اُس سے جیب ...چ میں اضافے کے لیے ضد نہیں کی۔ اُنھیں گھر کا حال معلوم تھا کہ ...ھی خود ہی کتنا بچا کے رکھتی ہے تاہم اُس کی خوشنودی کے لیے وہ ...ند پیسے قبول کر لیتے تھے۔ بنارسی کی طرف سے خرچا کم کر دینے پر ...لکھی کی پریشانی میں اضافہ ہوا تو جگنو اور دیوا کو کچھ سکون ملا۔ وہ ...سمجھے کہ اب شاید بنارسی نے اُن کے گھر میں دل چسپی لینا کم کر دیا ہے، ...رچ کی کمی سے گھر پہ بنارسی کے استحقاق کا جواز بھی کم ہو جاتا ہے۔ اُن ...کی خواہش تھی کہ کیا ہی اچھا ہو، بنارسی خرچ بالکل ہی بند کر دے۔ وہ ...و جھاڑ دھولیں گے، ایک وقت کا کھالیں گے، کچھ بھی کر لیں گے۔ بنارسی سے اُنھیں نجات مل جائے گی مگر یہ تو بنارسی کے ستم کا ایک طور تھا۔

وہ اُسی طرح سینہ پھُلائے آتا رہا۔ نولکھی کے لیے گھر چلانا مشکل ہو گیا تھا، کھانے پینے تک کی تنگی۔ ہاں اب بنارسی گھر آنے کے بعد خاص اہتمام کرتا۔ وہ جگنو اور دیوا کو پیسے دے کے کھانے پینے کی چیزیں افراط سے منگانے کی شاہ خرچی کرنے لگا۔ صبح اُس کا پس خوردہ اُن کے کھانے کے لیے بہت ہوتا۔ خرچ میں کمی کی بات جگنو اور دیوا کی سمجھ میں کچھ عرصے بعد آئی۔ بنارسی نولکھی سے کچھ اور چاہتا تھا۔ ایک رات اُس نے پہلی بار نولکھی کو اپنے ساتھ باہر چلنے کا حکم دیا۔ نولکھی نے بہت پس و پیش کیا، بچّوں کے تنہا رہ جانے کی تاویل پیش کی مگر اُسے جانا پڑا۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر بعد واپس آجائے گی مگر وہ رات بھر اُس کا انتظار کرتے رہے اور چھوٹی پھول وتی کو سمجھاتے رہے۔ صبح سویرے نولکھی واپس آئی تو اُس کی حالت بہت شکستہ تھی۔ کسی نے اُس سے کچھ نہیں پوچھا، پھول وتی نے بھی نہیں۔ پھر تو مہینے دو مہینے بعد بنارسی نے یہ معمول بنا لیا۔ باہر پاڑے کا کوئی آدمی منتظر کھڑا رہتا۔ بنارسی آکے نولکھی کو تیار ہو جانے کا حکم دیتا۔ وہ کتنی ہی منتیں کرتی، بچّوں کا واسطہ دیتی، بنارسی پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ نولکھی نے صاف انکار کر دیا۔ بنارسی نے اُس کی چٹیا پکڑ کے اتنے طمانچے مارے کہ وہ دُہری ہو گئی۔ نولکھی کے باہر جانے پر عموماً بنارسی رات گھر میں گزارتا اور دارو پیتا رہتا۔ وہ تینوں دھڑکتے کانپتے ہاتھوں سے بنارسی کے گینڈے جسم کو تیل پلاتے رہتے۔ جب تک بنارسی کے خرّاٹے شروع نہ ہو جاتے، وہ وہاں سے نہ ہٹتے۔ پھر نولکھی نے عذر کرنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ خاموشی سے باہر کھڑے پاڑے کے آدمی کے ساتھ چلی جاتی۔ صبح واپسی پر بنارسی اُسے طلب کرتا تو وہ اُس کے پاس چلی جاتی۔ پھر بنارسی نے از خود پیسوں میں دوبارہ اضافہ کر دیا۔ جس رات نولکھی باہر جاتی، واپسی پر اُس کے پاس بھی کچھ نہ کچھ رقم ہوتی۔ پیسوں سے گھر کی حالت کچھ سُدھر گئی مگر نولکھی کے مجسّمے میں خراشیں پڑنے لگی تھیں۔ وہ زیادہ تر خاموش رہنے لگی۔ تینوں اُس کی دل جوئی کی کوشش کرتے، وہ اُنھیں آغوش میں بھینچ کے بس رونے لگتی اور روتی رہتی۔

وہ بارہا سوچا کرتے کہ آخر اُنھوں نے بنارسی کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ تو جب بھی موقع ملتا ہے، اُسے خوش رکھنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ کیا جیسا کہ بنارسی کہتا ہے، واقعی وہ آدمی کے تخم سے نہیں ہیں۔ اُن میں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کون سی کجی ہے، کیا کمی ہے۔ کیا اُنھیں ٹھیک طرح دیکھنا، سننا اور بولنا نہیں آتا؟ کیا اُن کا چہرہ وہ نہیں جو آئینہ اُنھیں دکھاتا ہے؟ وہ گھُورے پر پیدا ہوئے تھے؟ پھر یہ سلسلہ کہاں جا کے ختم ہوگا، کیا وہ ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے؟ کیا بنارسی کے پاس کوئی جادوئی طاقت ہے؟ کیا اُسے علم ہو جاتا ہے کہ وہ اُس سے کس قدر نفرت کرتے ہیں؟ وہ خود سے بہت سے سوال کرتے تھے۔ تمام سوالوں کا ایک ہی جواب آتا تھا، بنارسی! وہ روز و شب بنارسی کے تسلّط سے نولکھی کو نکالنے کے خواب دیکھا کرتے۔ کئی بار اُنھوں نے اُسے مشورہ دیا کہ زمین بہت بڑی ہے کیوں نہ وہ سب کسی دوسرے شہر میں جا کے بس جائیں، کسی دوسری جگہ جا کے وہ جیسے تیسے محنت مزدوری کر کے گزر بسر کر لیں گے۔ نولکھی ہامی بھر لیتی مگر پھر جانے اُسے کیا ہو جاتا، وہ عذر کرنے لگتی کہ اور بڑے ہو جاؤ، اچھے دن آتے دیر نہیں لگتی، جہاں اتنا وقت گزارا ہے، کچھ اور ٹھہر جاؤ۔ وہ یہی سنتے رہتے اور اُن کی سمجھ میں نہ آتا کہ نولکھی بنارسی کے آگے اِس قدر بے بس کیوں ہو جاتی ہے۔ ضرور کوئی ایسی بات ہے جو وہ نہیں جانتے۔ نولکھی کی کوئی کم زوری بنارسی کے پاس ہے۔ سب سے بڑی کم زوری تو عورت ہونا ہے مگر عورتیں تو اور بھی ہیں۔ وہ کچھ کر نہ پاتے تو اُنھیں نولکھی پر غصّہ آتا، نفرت کی حد تک۔ دونوں اُس سے بات چیت بند کر دیتے۔ نولکھی اُنھیں مناتی رہتی پھر اُنھیں خود خیال آجاتا کہ نولکھی

تو اُن سے زیادہ مجبور رہے۔ کئی بار جگنو اور دیوا کے دل میں آئی کہ وہ کسی روز بنارسی کا کام تمام کر دیں۔ جس وقت وہ نشے میں چور ہو، وہ اُس کے سینے میں رسوئی کی بڑی چھری گھونپ دیں یا کہیں سے زہر لا کے اُس کی شراب میں ملا دیں۔ جس رات گھر میں نولکھی نہ ہو، اُس رات یہ کام اور آسان ہوگا۔ کوئی الزام آیا تو نولکھی محفوظ رہے گی، صرف اُنھیں سزا ہوگی۔ جیل کی زندگی اس زندگی سے بہتر ہوگی۔ اُنھوں نے سُنا تھا کہ کم عمر قاتلوں سے رعایت برتی جاتی ہے۔ اُنھیں زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سال کی سزا ہوگی، ٹھیک ہے، سات سال گزر جائیں گے مگر اِس عرصے میں نولکھی اور پھول وتی کا کیا ہوگا؟ اُن کے بغیر تو وہ ویران ہو جائیں گی۔ نولکھی اور پھول وتی کے خیال سے جگنو اور دیوا کے ہاتھ پیر ٹوٹنے لگتے۔

گلیوں کے لڑکوں سے اُنھوں نے بہت سے ہنر سیکھ لیے تھے۔ تاش، چوسر اور دوسری بازیاں، اٹھائی گیروں اور اچکوں کے کرتب، تمباکو نوشی۔ بعد میں اُنھوں نے جیب کاٹنے کی بھی مشق کی اور ابھی ہاتھ صاف نہیں ہوا تھا کہ دیوا پکڑا گیا۔ پہلی بار وہ جگنو سے جُدا ہوا۔ دونوں کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر کتنے نامکمل ہیں۔ دونوں تڑپتے رہے، نولکھی الگ دیوانی بنی رہی۔ دیوا کئی ہفتے جیل میں رہا پھر نولکھی کے اصرار پر بنارسی نے ہیر پھیر کر کے اُسے چھڑایا۔ بنارسی اُسے چھڑا کے لایا تھا۔ گھر آ کے اُس نے دیوا کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور اپنے ہم راہ آنے والے پاڑے کے آدمی کو اشارہ کیا۔ بنارسی کے حکم پر وہ دیوا کے ناخن کھینچتا، کانوں کی لویں رگڑتا رہا۔ جتنا دیوا چیختا بلکتا، بنارسی کی آنکھوں کی چمک اتنی ہی گہری ہو جاتی۔ دیوا کا حال بہت بگڑنے لگا تو کونے میں دُبکے ہوئے جگنو نے ہمت کر کے بنارسی کے پیر پکڑ لیے کہ خدا کے واسطے اب وہ بس کرے۔ بنارسی کی توجہ ہٹانے کے لیے اُس نے خود پر ذمّے داری لینی چاہی، کہا کہ دیوا کا کوئی قصور نہیں، مَیں نے اِسے اُکسایا تھا۔ بنارسی نے اُسے بھی دیوا کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

جگنو نے مجھے اپنا اور دیوا کا ہاتھ دکھایا۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ دونوں کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلیوں کے پورے کٹے ہوئے تھے۔ بنارسی نے اُنھیں تنبیہ کی تھی کہ جتنی بار وہ جیب تراشی کے جُرم میں پکڑے جائیں گے، یہی ہوتا رہے گا۔ جگنو کے بہ قول بعد میں اُنھوں نے بنارسی کو کوئی ایسا موقع نہیں دیا۔ دوسری بار بھی دیوا ہی جیل گیا مگر اب کے نولکھی نے بنارسی سے سفارش نہیں کی۔ دیوا دو ڈھائی مہینے بعد خود چھوٹ کے آ گیا۔

سڑک پر سناٹا اور گہرا ہو گیا تھا۔ دور و نزدیک بھونکتے کُتوں کا شور سناٹے کا احساس اور دلاتا۔ جگنو ٹھیر گیا۔ اُس کی آواز گھُٹنے لگی تھی، اُسے پانی کی ضرورت تھی اور پانی کا امکان نہیں تھا۔ اُس نے بیڑی جلانے کی اجازت چاہی۔ بیڑی کے چند کش لگا کے وہ بولا کہ اُن کے خیال میں اُن کے گھر پر بنارسی کے تسلط کا بہ ظاہر ایک ہی بڑا سبب تھا اور ایک ہی صورت میں وہ یہ غلبہ ختم کر سکتے تھے کہ کسی طرح نولکھی کو بے فکری کا یقین دلا دیں۔ اتنا کما کے لائیں کہ نولکھی کو کوئی اندیشہ یا خدشہ لاحق نہ رہے پھر وہ اُسے کہیں بھی لے جا سکتے ہیں چناں چہ اُنھوں نے ہوٹل میں بیرا گیری کی، سڑکوں پر بوجھ اٹھایا، پھیری لگائی، سامان اِدھر سے اُدھر منتقل کرنے والی گاڑیاں کھینچیں۔ دونوں ساتھ مل کے کھینچتے تو وزن زیادہ اُٹھا لیتے تھے لیکن وہ بہت کم پیسے اکٹھے کر پاتے تھے۔

پیسوں کی اُنھیں شدید طلب تھی۔ کہیں کوئی درخت مل جائے جس پر پیسے کا پھل آتا ہو، کوئی خزانہ، کوئی نسخہ کیمیا، زندگی میں پیسے کی کرشمہ سازی کے جلوے، وہ صبح و شام دیکھا کرتے تھے۔ سیٹھ لوگ، صاحب لوگ، ناک بھوں چڑھاتی ہوئی رشیم کی بنی شیشے کی بنی عورتیں، گاڑیاں، عمارتیں، پیسے کا مطلب ہے کہ آدمی کے کئی ہاتھ، کئی آنکھیں، کئی جسم ہو گئے دگنا، چار گنا، ہزار گنا آدمی، ایک زندگی میں کئی زندگیوں کا لطف، ایک جنم میں کئی جنم پیسے کا مطلب ہے، رنگ، روشنی، خوشبو، سب کو پیسہ مرغوب ہے۔ پیسہ آدمی کی رفتار تیز کر دیتا ہے، چوری، جیب تراشی اور جوئے وغیرہ میں کسی وقت بھی قسمت یاوری کر سکتی ہے۔ دن بھر کے کمائے ہوئے پیسے رات کو جگنو اور دیوا داؤ پر لگا دیتے۔ کبھی کچھ فائدہ ہوتا، کبھی سارے گنوا دیتے۔ مگر اب اُنھیں اتنا غم نہ ہوتا، بھوک سے بھی اُنھیں ایسی بے کلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ میلوں پیدل چلنے اور کئی دن تک فاقہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ دن دن بھر اور رات رات بھر گھر سے غائب رہنے لگے۔ نولکھی بھی اُن سے کچھ نہ پوچھتی۔ اسٹیشن پر وہ مسافروں کی تاک میں رہتے، جہاں بھی موقع ملتا، کوئی چیز اُٹھا کے بھاگ کھڑے ہوتے اور اونے پونے بیچ دیتے۔ پھر اُنھیں اندازہ ہوا کہ کسی باقاعدہ دادا کے سہارے بغیر جیب تراشی اور چوری وغیرہ میں کام یابی ممکن نہیں۔ اُنھوں نے چھوٹے موٹے داداؤں کا رُخ کیا اور بنارسی سے دُور دُور کے پاڑوں کے چکر لگانے شروع کیے۔ اُن کی آنکھوں میں بسی ہوئی دہشت اور اُن کے چہروں پر برستی وحشت، اُن کی نوعمری اور جسمی ناتوانی ہر جگہ رکاوٹ بنی رہی۔ دادا اُن سے زر خرید دن جیسا سلوک کرتے، کبھی بہت گندے اور اوچھے مذاق۔ جگنو اور دیوا اچھی طرح جان لیے تھے کہ پاڑے میں کوئی جگہ حاصل کرنے کے لیے یہ سلوک پہلے حیلے کا درجہ رکھتا ہے۔ سو وہ وہاں ہر کام کے لیے تیار رہتے، چائے انا، حقہ تیار کرنا، مالش، پاڑے کی جھاڑو، داداؤں کے دیگر کام۔ وہ ٹک جاتے مگر ابتدا ہی میں دو ایک پاڑوں پر بنارسی کے آدمیوں نے اُنھیں دیکھ لیا۔ وہاں اُن لوگوں نے جانے کیا کچھ کہا سُنا تھا کہ جگنو اور دیوا کا پاڑوں پر مزید ٹکے رہنا دشوار ہو گیا۔ پاڑوں کے دادا بھی کم و بیش اُنھی خطابات سے اُنھیں نوازنے لگے جو بنارسی کا وظیفہ تھے۔ بہت سے دادا نولکھی کے بارے میں اُن سے کرید کرید کر پوچھتے، بنارسی اور نولکھی کے بارے میں ایسی نارو باتیں دیتیں جن کا جواب دینا تو کجا، سننا بھی جگنو اور دیوا کو گوارا نہیں تھا۔

جگنو کہہ رہا تھا، وہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ وہ کیوں زندہ ہیں، دُنیا میں تو اُن کا کوئی کام ہی نہیں ہے۔ کبھی اُنھیں اپنا وجود اتنا حقیر لگتا کہ وہ موت ڈھونڈا کرتے۔ موت بھی اُنھیں نہیں آتی تھی۔ جو اُنھوں نے سنا تھا اور جس کی تردید کے لیے وہ ہمہ دم ہمہ جاں سرگرداں رہے تھے، وہ اُنھیں سارا سچ لگتا تھا، نامرادوں کے لیے ایک جواز کا گداز کہ سب کچھ لکیروں اور ستاروں پر منحصر ہے۔ کچھ لوگ پیدا ہی ٹھکرائے جانے کے لیے ہوتے ہیں۔ نالی کے کیڑوں اور خارش زدہ کُتوں کی طرح۔ زمین ہر کسی کو راس نہیں آتی۔ یہ زمین اُن کے لیے نہیں ہے تو وہ کیوں اصرار کر رہے ہیں۔ کبھی اُنھیں ہر رنگ اور ہر آواز ایک جیسی لگتی۔ اُنھیں معلوم تھا کہ موت کی دُوری بس ایک ارادے کے فاصلے پر ہے لیکن یہ فاصلہ اُن سے عبور نہیں ہو پاتا تھا۔ اس کے درمیان اُن کا گھر پڑتا تھا، جہاں نولکھی اور پھول وتی رہتی تھیں۔ وہ جب گھر لوٹ کے آتے تو نولکھی کی پھیلی ہوئی بانہیں کچھ دیر کے لیے اُنھیں سب کچھ بُھلا دیتیں۔ پھول وتی اُن کے بازوؤں میں جھول جاتی۔ اُنھیں سب خواب سا لگتا، کوئی طلسم سا، اسی خواب اور طلسم کی تعبیر کی تلاش میں وہ پھر گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ روز اُن سے یہی تماشا سرزد ہوتا تھا۔

بعد کے دنوں میں بنارسی کی آمد میں فصل بڑھ گیا۔ پندرہ بیس روز میں ایک بار۔ اسی نسبت سے جگنو اور دیوا کو کسی قدر فراغت نصیب ہوئی۔ پھول وتی چپکے چپکے اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ اُنھیں کسی کی نظر لگ جانے کا دھڑکا لگا رہتا۔ وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی تھی، باتیں ہی نہیں، سفید و سیاہ کی پرکھ بھی اُسے خوب ہو گئی تھی۔ جس رات بنارسی گھر آتا، وہ جگنو اور دیوا کو اُس سے دور رکھنے کے لیے گھر کے دروازے پر کسی کیل، کنڈے میں کوئی کپڑا اٹکا دیتی، جگنو اور دیوا دروازے ہی سے لوٹ آتے اور رات کسی فٹ پاتھ پر گزار دیتے۔ اُن کی موجودی میں بنارسی آ جاتا تو بات دوسری تھی پھر وہ تمام آگ سینے میں دبائے اُس کی خدمت کرتے اور کسی بھی حکم کی تعمیل کے لیے ہر لمحے مستعد رہتے۔ ایک رات بنارسی انگوچھا پہنے چارپائی پر اوندھا پڑا تھا۔ نولکھی اُس وقت کمرے میں نہیں تھی۔ اب جگنو اور دیوا کے ہاتھ مالش میں طاق ہو چکے تھے۔ بمبئی کے پیشہ ور مالشیوں سے اُنھوں نے بہت سی نازک رگیں چھونا، چھیڑنا، یوں کہیے کہ رگوں کے تار ہلانا سیکھ لیا تھا۔ کم سے کم وقت میں مساموں کو زیادہ سے زیادہ تیل پلانا بھی اس فن میں شامل ہے۔ یہ جگنو اور دیوا کی مالش کا نشہ تھا یا دارو کا کرشمہ، بنارسی اُس رات بہت خوش نظر آتا تھا۔ اُن کا جی نہیں چاہتا تھا تاہم اُنھوں نے خوب سوچ سمجھ کے زبان کھولی اور کسی قدر ناز بردارانہ، تمام تر نیازمندانہ لہجے میں پہلی بار بنارسی سے فرمائش کی کہ وہ اُسے اپنے پاڑے میں جگہ دے دے۔ وہ وہاں دوسرے داداؤں کی طرح اُس کی خدمت کرتے رہیں گے۔ کوئی اُن سا وفادار، خدمت شعار بنارسی کو شاید نہ ملا ہو۔ جگنو اور دیوا کو دوسرے پاڑوں کا اچھا تجربہ ہو چکا تھا۔ دوسرے کسی پاڑے سے وابستہ ہونے سے اُن کا جو مقصد تھا، وہ بنارسی کے پاڑے پر بھی پورا ہو سکتا تھا۔ اتنے گرم و سرد موسم گزارنے کے بعد آدمی میں یہ شاطری و زمانہ سازی آ جاتی ہے۔ جوا کھیلنا اُنھیں آ گیا تھا۔ یہ ایک ایسی بازی تھی جس میں جیت سے بہت فرق پڑتا تھا، ہار سے کچھ نہیں۔ جتنا وہ ہار چکے تھے، اِس سے زیادہ اُن کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ جگنو کے بہ قول اُنھیں ذرا وقت درکار تھا جو اُنھیں کبھی نہیں ملا، سانس لینے کا وقت۔ ورنہ دوسرے پاڑوں میں وہی ہوتا رہے گا جو اب تک ہوتا رہا ہے۔ تمام ذلتوں کے باوجود، بنارسی کے پاڑے میں بڑی امان تھی۔ وہاں وہ کم از کم نولکھی کے بارے میں رسوا کُن باتیں سننے سے محفوظ ہو جاتے تھے، وہ باتیں جو اُنھیں بہت ڈسا کرتی تھیں۔

اُن کی التجا سُن کے بنارسی ہنکاریاں بھرتا رہا۔ اُنھوں نے تکرار نہیں کی تا کہ خرخراتا ہوا کُتا بھڑک نہ جائے، بس کسی طرح چپکے سے راستہ مِل جائے۔ لوچ صرف آواز کا نہیں، نگاہ کا بھی ہوتا ہے، رفتار کا بھی اور ہاتھوں کا بھی۔ دیر تک وہ چپ چاپ اُس شکرے کے جسم پر اپنے ہاتھوں کا لوچ، اپنی انگلیوں کی مہارت آزماتے رہے۔ اُنھوں نے اُس فیلِ بدمست کی خاموشی شانِ خسروی پر محمول کی۔ آخر وقت بہت گزر گیا تو بنارسی نے انگڑائی لی اور ڈوبی ڈوبی، بہکی بہکی آواز میں پوچھا

کہ نولکھی کہاں ہے۔ وہ اُلٹے قدموں کمرے سے چلے آئے۔ چند لمحوں بعد نولکھی کمرے میں چلی گئی۔

بہت عرصے بعد اُنھوں نے ایک نرم وسبک رات گزاری۔ آدھی رات تک وہ اور پھول وتی سرگوشیاں کرتے رہے، دُنیا جہان کی باتیں۔ پھول وتی اپنے چہکتے لہجے میں اُنھیں آس پاس کے قصّے سُناتی رہی۔ پھر اُنھیں نیند آگئی۔ بنارسی علی الصّباح چلا گیا تھا۔ اُس روز اُنھوں نے بہ طورِ خاص غسل کا اہتمام کیا، صاف کپڑے پہنے۔ وہ اپنی طرف سے پوچھنا نہیں چاہتے تھے، بار بار اُن کی نظریں نولکھی کی طرف اُٹھتی تھیں کہ شاید بنارسی نے اُن کے بارے میں اُس سے کوئی بات کی ہو۔ نولکھی بہت تھکی ہوئی تھی، سُوجی سُوجی آنکھیں۔ تاہم اُس نے اُن کے لیے سبزی کا پراٹھا بنایا اور بالائی والا چائے کا پیالہ۔ ناشتہ کر کے وہ گھر سے نکل گئے۔ اُس وقت دس بج رہے تھے۔ کچھ اور وقت گزارنے کے لیے وہ اِدھر اُدھر سڑکوں پر مٹر گشت کرتے رہے۔ اُن کا رُخ بہر حال پاڑے کی طرف تھا۔ دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی جب اُنھوں نے دھڑکتے قدموں سے پاڑے پر قدم رکھا۔

دالان کے وسط میں کئی داداؤں کے درمیان بیٹھا، بنارسی دادا چوسر کھیل رہا تھا۔ دونوں کو دیکھ کے اُس کا ہاتھ رُک گیا۔ جگنو اور دیوا چند قدم آگے جا کے ٹھیر گئے اور نظریں جھکائے کھڑے رہے۔ بنارسی کی شعلہ بار نظروں اور دھمکتی آواز پر وہ پہلے ہی متزلزل ہو گئے، اُن سے کچھ کہا نہیں جا سکا۔ بنارسی کو جیسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اُس نے پھنکارتے لہجے میں اُن سے پوچھا کہ کون سی پریشانی اُنھیں یہاں لائی ہے۔ جگنو نے جیسے تیسے ہمت کی اور رسٹ پٹاتے ہوئے رات کی بات یاد دلائی۔ بنارسی کا مُنہ پھیل گیا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف منہ کر کے وہ یک دم ہنسنے لگا، جیسے جگنو اور دیوا نے کوئی لطیفہ سنایا ہو یا کوئی بہت ہی مضحکہ خیز بات کہی ہو۔ بنارسی کے ساتھیوں نے بھی اُس کی ہم نوائی کی۔ ساری عمارت اُن کے قہقہوں سے گونجنے لگی۔ وہ دونوں ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کی صورت دیکھا کیے۔ بنارسی اپنے آدمیوں سے مخاطب ہو کے چنچلے پن سے بولا "لو بھئی مُستا! چھٹّی ہو گیا سالا۔ ابھی اکّھا چاقو چھرا پھینکنے کا ہے راجا لوگ کے آگے ..." جگنو نے صرف نظر کیا اور عاجزانہ کہا کہ وہ دونوں پاڑے کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ بنارسی برہم ہو گیا اور گالیاں بکتے ہوئے بولا کہ اُنھوں نے کیا سوچ کے اُس کے پاڑے پر قدم رکھنے کی جراَت کی ہے۔ جس ہتھ پیکے، اٹھائی گیرے کا جی چاہے، مُنہ اُٹھائے چلا آئے؟ ایں؟ یہ اصیلوں کا پاڑا ہے، چوڑوں چماروں کا نہیں۔ اُنھوں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے، یہاں داخلے کے لیے ...۔ وہ جو مُنہ میں آیا، بکتا رہا۔ جگنو اور دیوا کا بس نہیں چلتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائیں۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ ہم دونوں کی جیبوں میں چاقو تھے اور جی یہی کرتا تھا کہ زقند بھر کے بنارسی کے سر پر جا پہنچیں اور اِس سے پہلے کہ وہ اور اُس کے حاشیہ بردار کچھ سنبھلیں، ہم بنارسی کا جسم چیر پھاڑ ڈالیں، پھر چاہے ہمارے ساتھ جو بھی ہو۔

لیکن اِس سے پہلے کہ بنارسی کے آدمی اُنھیں دھکّے دے کے پاڑے سے نکالتے، وہ وہاں سے چلے آئے۔

بنارسی کے اِس برتاؤ کے بعد جگنو اور دیوا نے کسی پاڑے سے وابستگی کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ جہاں جیسا کام مل جاتا، کر لیتے، جہاں جیسا موقع ہاتھ آتا، ہاتھ کی صفائی دِکھا دیتے۔ بنارسی کی آمد میں بتدریج کمی کے سبب گھر کے خرچ میں بہت تنگی ہونے لگی تھی۔ اب بہت کچھ اُنھی پر منحصر تھا۔ کبھی گھر میں روٹی نہ پک پاتی تو نولکھی اور پھول وتی خود مزدوری کی غرض سے باہر جانے کے لیے اصرار کرتیں۔ گھریلو کاموں اور زیرِ تعمیر عمارتوں میں عورتوں کو روزگار مل جاتا تھا۔ شاید یہ نام کا اثر تھا، پھول وتی کپڑے پر ایسے ایسے گُل بُوٹے تراش لیتی تھی کہ نگاہیں دھوکا کھا جائیں۔ جگنو اور دیوا نے دونوں کو گھر سے نہیں نکلنے دیا اور خود شب و روز ایک کرتے رہے۔ بے شمار نامرادوں کی طرح لکشمی کی مسیحائی پر اُن کا یقین تھا۔ لکشمی کا کچھ طے نہیں ہے، کسی آن بھی مہربان ہو جائے۔ وہ جانتے تھے کہ رنگ، ذات، قد کاٹھی، ناتواں، توانا کے امتیازات سے لکشمی کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اُن کی گلی سے ایک گلی آگے کاٹھ کباڑ کا کام کرنے والا، تھل تھل کرتا موٹا اور کالا سیٹھ نراٹن برسوں سے لکشمی کی نگاہِ خاص کا زندہ ثبوت تھا۔ وہ لوگ ابھی موجود تھے جنھوں نے ایک زمانے میں اُسے سڑکوں پر بے حال دیکھا تھا، اور ہوا کے جھونکے سے بل کھا جانے والا سیٹھ فیروز، لکشمی کو جانے اُس کی کون سی ادا بھا گئی تھی کہ ہزار جان سے فریفتہ تھی۔ بنارسی جیسے آدمی سیٹھ فیروز کی دہلیز پر ہڈی کے لیے منڈلایا کرتے تھے۔ جگنو اور دیوا نے جوئے کے علاوہ ٹونے ٹوٹکے بھی بہت کیے کہ کوئی ایک لمبا ہاتھ پڑ جائے، صرف ایک بار۔ اُس کے بعد تو وہ لکشمی کو ایسا روک کے، باندھ کے رکھیں گے، ایسی اطاعت گزاری اور پرستاری کریں گے کہ دُنیا دیکھے مگر وہی بات، لکشمی کی اپنی پسند اور ترجیح ہوتی ہے۔ یہ بھی گمان ہے کہ کوئی اُسے روک کے، باندھ کے رکھ سکتا ہے۔ ٹھیرنا نہ ٹھیرنا سب اُس کی مرضی پر ہے۔ جگنو اور دیوا جتنا اُس کی جستجو میں رہتے تھے، اُتنا ہی وہ اُن سے بے نیاز تھی، اور اُن کا وہی حال تھا جو اُن جیسے بے شماروں کا تھا۔ اُنھیں معلوم تھا کہ لکشمی کا ظرف اتنا کشادہ نہیں ہے۔ وہ معدودے چند، سو میں سے چند ایک ہی پر اپنی نوازشیں ارزاں کرتی ہے۔ باقیوں کی آسرے میں گزر جاتی ہے۔ غالباً یہی رمز ہے کہ کسی آسرے میں زندگی آسانی سے کٹ جاتی ہے۔

نولکھی کے بدن میں کوئی مکڑی چھپ کے بیٹھ گئی تھی اور لگتا تھا، اُس کی بیٹی پھول وتی جیسے مسلسل اپنی ماں کا خون چوستی رہی ہو۔ اپنی ماں کا سارا رنگ روپ اُس نے چُرا لیا تھا۔ نولکھی کے پتّے گرنے شروع ہوئے تو دیکھتے دیکھتے صرف شاخیں رہ گئیں اور شاخیں دیمک کو مرغوب ہوئیں۔ بنارسی کی آمد کبھی کبھار کی رہ گئی، مہینوں مہینوں کے وقفے سے۔ جگنو اور دیوا کی اُس سے مہینوں ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔ ہر چند کہ اب وہ زیادہ وقت گھر ہی گزارتے تھے، بیمار نولکھی کی خاطر اور اپنی پھول وتی کی خاطر، وہ ان کی جُزوِ جاں تھی، اندھیروں میں کسی چراغ کے مانند، صحرا میں پھول کی طرح۔ وہ اُسے چھپا کے رکھتے تھے کہ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے، کہیں کوئی دیکھ نہ لے کہ اُن کے گھر میں ایک شہ زادی چھپی ہے۔ رات کو وہ ٹوٹے ٹوٹے بکھرے بکھرے گھر آتے تو اُس کا چہرہ دیکھ کے اُن کی ساری کلفتیں کافور ہو جاتیں۔ نولکھی کے علاج کے لیے وہ اپنی بساط سے زیادہ کوششیں کرتے رہے۔ کچھ دن کے لیے وہ بھلی چنگی ہو جاتی، پھر پہلے سے بھی بدتر...

برس بیت گیا، بنارسی نہ پلٹا، پھر کوئی چھ مہینے اور گزر گئے، بنارسی نے لوٹ کے خبر نہیں لی مگر ایک رات وہ راستہ بھول گیا۔ جگنو اور دیوا گھر میں تھے۔ سب اُسے دیکھ کے دم بہ خود رہ گئے۔ نولکھی کے حال سے بنارسی کا رنگ کچھ متغیّر ہوا اور اُس نے جگنو اور دیوا ہی پر الزام دھرا کہ اُنھوں نے نولکھی کی علالت کے بارے میں اُسے مطلع کیوں نہیں کیا۔ جگنو اور دیوا کیا جواب دیتے، بنارسی نے علاج کے لیے اچھی خاصی رقم نولکھی کے حوالے کی۔ یہ مہربانی جگنو اور دیوا کے لیے حیرت انگیز تھی۔ وہ بنارسی سے ایک پیسہ تک لینے کے روادار نہ تھے لیکن رقم واپس کرنے میں بنارسی سے ربط ضبط کا پہلو نکلتا تھا اور اُس کے کاٹ کھانے کا خدشہ الگ تھا۔ وہ چپ رہے۔ اُنھیں اطمینان تھا کہ بنارسی اب بار بار نہیں آئے گا کیوں کہ نولکھی کے بدن میں خون نہیں رہا ہے اور اُس کی آنکھوں کا نیلا رنگ گدلا گیا ہے مگر یہ اُن کا واہمہ تھا۔ بنارسی تو تواتر سے آتا رہا اور توقع کے خلاف اُس نے روپے پیسے کی اعانت بھی جاری رکھی۔ ایک روز وہ کسی وید کو بھی ساتھ لایا۔ گھر میں اُس کی دوبارہ آمد و رفت جگنو اور دیوا کو بہت شاق گزرتی تھی۔ وہ حیران و پریشان سب کچھ دیکھتے رہے، تماشائی کی طرح۔ بنارسی کا یہ رویّہ اُس کی خود غرضی اور سخت گیری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ پشیمانی اور مجبوبی آدمیوں کو ہوتی ہے، یہ آدمیوں کا شیوہ ہے۔ بنارسی میں آدمیوں کی خوبو ہی نہیں ہے، وہ اُن سے بھی بہ ظاہر کوئی پرخاش نہیں رکھتا تھا لیکن اُس کا رویّہ دوستانہ بھی نہیں تھا۔ سڑک پر صدائیں لگاتے ہوئے بھکاریوں کو دیکھے بغیر جس طرح راہ گیر گزر جاتے ہیں، جگنو اور دیوا سے بنارسی کا سلوک بھی کچھ یہی تھا۔ چند دنوں میں وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گئے تھے اور اُن دونوں کا بھی یہی حال تھا، نولکھی اور پھول وتی کا۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے عرصے میں بنارسی کا شمار بمبئی کے نامی گرامی داداؤں میں ہونے لگا تھا۔ اُس کا پاڑا شہر کے بڑے پاڑوں میں گنا جاتا تھا۔ شہر کے سب سے بڑے دادا تیواڑی سے اُس کے خصوصی مراسم تھے۔

تیواڑی کے نام پر میں سیدھا نہ بیٹھا رہ سکا۔ اُسی وحشی نے کرشنا جی کو ختم کیا تھا۔ کرشنا جی کو گئے ہوئے اتنے دن نہیں گزرے تھے کہ تیواڑی اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اُس کے بہت سے حواری بھی چلے گئے تھے لیکن کرشنا جی اتنے ارزاں نہیں تھے۔ جب بھی تیواڑی کا خیال آتا، میری رگوں میں خون جلنے لگتا۔ اُس وقت بمبئی کے متعدد پاڑے اُس کے حاشیہ بردار تھے، پیر و دادا کے پاڑے کی طرح آپس میں جتے ہوئے تو نہیں تھے مگر کوئی تیواڑی سے الگ نہیں تھا۔ اختلاف ویسے بھی منصب داروں کو پسند نہیں آتا۔ تیواڑی تو آدھی بمبئی کا راجا تھا۔ میں نے دخل نہیں دیا اور خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ جگنو نے بتایا کہ بنارسی نے گھر کے خرچ ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ اُس نے اُس مختصر گھر میں رنگ و روغن کرایا۔ کئی چیزوں کا اضافہ کیا۔ نئی مسہری، بستر چادریں، میز کرسی، نئے طرز کے برتن وغیرہ۔ دوائیں، پھل، وید حکیم کا خرچ مستزاد تھا مگر نولکھی اور زیادہ ہمت کھونے لگی۔ اب اُس کے چہرے پر آنکھیں ہی رہ گئی تھیں۔ پھول وتی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ ہر وقت سہمی سہمی رہتی تھی جیسے تیز دھوپ میں گلاب فریادی سا لگتا ہے، اپنے رنگ اور خوشبو کے لیے اصرار کرتا رہتا ہے۔ بنارسی کے آنے پر اُس

کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ بنارسی نے پہلے کبھی ایک باپ کی طرح اُس کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا تھا مگر اب اچانک وہ اُس کا بھی خیال رکھنے لگا تھا۔ اُس نے پھول وتی کے لیے نئے کپڑے بنوائے، چاندی کے کئی زیور، طلائی بالیاں اور نتھ۔

پھول وتی بچی نہیں رہی تھی جو کھلونوں سے بہل جاتی اور جو اپنے جلوہ و منظر میں خود مزیّن و مرصّع ہوں، اُن میں ایک استغنا بھی لازم ہے۔ جگنو کے مفہوم کے مطابق، پھول وتی تو خود سرتاپا ایک ملبوسِ بہار تھی، ترشے ہوئے مجسمے کے مانند۔ لباس و زیور اُس کی چھب کیا بڑھاتے، اور نشاطِ قلب کے بغیر تو یوں بھی سب اکارت ہے۔ آدمی کا وجود بھی اکارت۔ ممکن ہے، نولکھی نے اپنی بیٹی کو بنارسی سے اُس کی نسبت کے بارے میں کچھ باور کرایا ہو۔ پھول وتی کی عزتِ نفس کے لیے کوئی نہ کوئی جواز تو اُس نے دیا ہی ہوگا۔ نولکھی کچھ نہ بتا پائی ہوگی تو ہوش مند پھول وتی نے خود اخذ کرلیا ہوگا، مگر اصل نسبت تو تعلقِ خاطر کی ہوتی ہے، دل داری و دل ستانی کی، غم گساری اور دردِ مشترک کی۔ پھول وتی نے شیر خواری سے آغازِ شباب تک بنارسی کا ایک ہی روپ دیکھا تھا یا بنارسی نے اپنا ایک ہی رنگ دکھایا تھا، پاڑے کا دادا، جو سینگ نکالے، ڈکراتا ہوا اُس کے گھر آنے کا حق رکھتا ہے، جس کی آمد پر اُس کی ماں بے دست و پا ہو جاتی ہے، بار بار اُس کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھتی ہیں۔ پھول وتی کے رگ و ریشے میں پیوست اپنے نقش کھرچنے میں بنارسی کے لیے کوئی بھی مدّت بہت کم تھی۔ بعض نقش مٹائے نہیں مٹتے، آدمی کے ساتھ جاتے ہیں۔ سب کچھ اتنا گہرا تھا کہ بنارسی کی ہر مہربانی صاف اُس کے ستم کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے روز افزوں لُطف و کرم سے پھول وتی بہت ہراساں تھی۔ اُس نے جگنو اور دیوا سے التجا کی کہ جتنی جلد ہو سکے، وہ کسی طرف بھاگ نکلیں۔ حکیم ڈاکٹر کو دکھانے کے بہانے نولکھی کو کسی طرح اسٹیشن لے جائیں گے اور کسی بھی گاڑی میں بیٹھ کے جتنی دُور ہو سکے گا، چلے جائیں گے مگر اب دیر ہو گئی تھی۔ اب یہ ایسا آسان نہیں رہا تھا۔ نولکھی طویل سفر کے قابل نہیں تھی۔ جگنو اور دیوا نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ انھوں نے گھر کے آس پاس اکثر بنارسی کا کوئی نہ کوئی آدمی منڈلاتے دیکھا ہے۔ بنارسی نے یہ اہتمام کچھ جان کے ہی کیا ہوگا۔ یہ سُن کے پھول وتی اور پریشان ہو جاتی۔

ایک روز بنارسی شام کو آکے گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد نولکھی کا حال کچھ اور ابتر ہو گیا۔ بنارسی کی موجودگی کے سبب جگنو اور دیوا گھر سے نکلے ہوئے تھے۔ پھول وتی نے پڑوسیوں سے منت سماجت کرکے اُنھیں تلاش کرایا۔ دونوں قریب ہی مل گئے۔ گھر پہنچے تو پھول وتی کی آنکھوں سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔ نولکھی کراہ رہی تھی۔ دونوں کسی ڈاکٹر کے لیے گھر سے نکلنا چاہتے تھے مگر نولکھی نے روک لیا اور کہا کہ وہ اُن سے چند باتیں کرنا چاہتی ہے، پھر وقت ملے نہ ملے۔ اُس نے پھول وتی کو ہدایت کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے کمرے سے چلی جائے۔ پھول وتی پاس سے ہٹ گئی تو نولکھی نے جگنو اور دیوا سے کہا کہ وہ کسی طرح پھول وتی کو لے کے یہاں سے دُور چلے جائیں، بمبئی شہر سے بہت دُور۔

یہ نولکھی کیا کہہ رہی ہے؟ دونوں ہکا بکا اُس کی صورت دیکھنے لگے۔ نولکھی نے اُن سے کہا کہ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو اور بہتر ہے کہ کوئی حیل و حجت نہ کرو۔ اب وقت بالکل نہیں رہا۔ اگر پھول وتی کو محفوظ کرنا چاہتے ہو تو میرا خیال کیے بغیر یہاں سے بھاگ نکلو، پھر مجھے زیادہ سکون سے موت آئے گی۔

یہ کیسے ممکن تھا۔ جگنو اور دیوا سناٹے میں آگئے۔ نولکھی نے پھر اُن سے منت کی اور اُنھیں بتایا کہ بنارسی کے ارادے اُسے اچھے نہیں لگ رہے۔ بنارسی سے کچھ بعید نہیں، ابھی موقع ہے۔ اُس کی (نولکھی کی) موجودگی میں وہ آسانی سے پھول وتی کو لے جا سکتے ہیں، پھر جانے کیا ہو جائے۔ اُن سے زیادہ کوئی اور پھول وتی کا محافظ نہیں ہو سکتا اور نہ وہ دونوں پھول وتی کے بغیر چین سے رہ سکیں گے۔ نولکھی نے اُکھڑی سانسوں میں اُن سے کہا کہ اُس نے پھول وتی اور جگنو دیوا میں کبھی کوئی فرق نہیں کیا۔ اُس کی تمنا تھی کہ وہ پھول وتی کا بیاہ اُن میں سے کسی ایک کے ساتھ کرے گی۔ اب تک اُس نے اِس خواہش کا اظہار یوں نہیں کیا تھا کہ ابھی یہ قبل از وقت تھا۔ دوسرے وہ پھول وتی کی مرضی بھی دیکھنا چاہتی تھی اور کوشش کے باوجود آج تک وہ یہ نہ جان سکی کہ جگنو اور دیوا میں سے کون پھول وتی کو زیادہ عزیز ہے۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ ایثار پر آمادہ رہتے ہیں۔ نولکھی کو یقین تھا کہ پھول وتی کے معاملے میں بھی وہ یہی کریں گے، کوئی ایسا فیصلہ جس میں تینوں کے لیے سلامتی اور سکون ہو۔ نولکھی نے کہا، اُسے اندازہ ہے کہ ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا کس قدر دشوار ہوگا لیکن اِسی میں تینوں کی بہتری ہے۔ کسی ایک کے پیچھے ہٹ جانے کا مطلب پھول وتی سے مکمل دست برداری نہیں ہے۔ اچھا ہوگا کہ اُن کے درمیان اس معاملے میں کوئی تلخی نہ ہو، ورنہ پھر یہی مناسب ہے کہ وہ پھول وتی کے لیے کوئی اور بَر ڈھونڈ لیں اور اچھی طرح جان لیں کہ اُن کے مابین رنجش کی صورت میں پھول وتی بھی کسی فیصلے کا حق رکھتی ہے۔ یوں

وہ خوش رہیں گے، نہ پھول وتی اور نہ اُس کی ماں کی رُوح کو قرار ملے گا۔

دونوں سب سُن رہے تھے اور حیران تھے کہ نولکھی یہ کیسی باتیں کر رہی ہے۔ ابھی سہ پہر تو وہ اُسے بہت بہتر چھوڑ گئے تھے تھوڑی دیر میں یہ کیا ہو گیا۔ جگنو اور دیوا یہ سب دیکھنے اور سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کیا واقعی، جیسا کہ نولکھی کہہ رہی ہے، وہ اُن سے جُدا ہو رہی ہے۔ اُن کے حواس کام نہیں کر رہے تھے کہ وہ کیا کریں، نولکھی کو کیا جواب دیں۔ اُن میں تو یہ کہنے کی ہمت بھی نہیں تھی کہ نولکھی اُن کا بھی کچھ خیال کرے، اُس کے بغیر تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ نولکھی نے ان کے لرزتے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپانا چاہا اور کرب سے بولی، وعدہ کریں کہ جو اس نے کہا ہے، اُسی پر عمل کریں گے۔ جگنو اور دیوا کو رونے کا بھی یارا نہیں تھا، دونوں نے دیوانہ وار اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور بلکتی آواز میں دیوا نے وہی کچھ کہنے کی کوشش کی، جو بسترِ مرگ پر پڑی ہوئی اپنی ماں، بہن یا اپنے کسی جزوِ جاں کے لیے کوئی کہہ سکتا ہے۔ نولکھی کے زرد ہونٹوں پر ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے اشارے سے دونوں کو قریب ہونے کے لیے کہا اور اُن کی پیشانیاں چوم کے بولی کہ وہ اُسے معاف کر دیں، وہ اُن کے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔ بہت آرزوئیں تھیں اُس کے دل میں۔ کہنے لگی، وقت نے ساتھ ہی نہیں دیا۔ شروع کے دن اِس خوف میں گزر گئے کہ وہ دونوں کہیں اس سے چھن نہ جائیں۔ نولکھی نے اُن سے کہا کہ وہ سینے پر کوئی بوجھ لیے مرنا نہیں چاہتی۔ پہلی بار اُس نے اُنھیں بتایا کہ کاشو دادا اُن کا باپ نہیں تھا۔ یقیناً وہ کسی بڑے گھر کے کسی دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتے ہوں گے جہاں سے کاشو دولت کی لالچ یا دُشمنی میں اُنھیں اُٹھا کے لے آیا تھا۔ اُس نے کاشو سے اصل بات جاننے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ کاشو کو بہت جلدی تھی۔ وہ کچھ روپیہ پیسہ نولکھی کے حوالے کرکے فوراً چلا گیا تھا۔ اُس نے نولکھی اور اُس کی ماں کو بچوں کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ جب تک وہ واپس نہ آئے، اس کی امانت سمجھ کے دونوں بچوں کی نگرانی کی جاتی رہے۔ جگنو کو اس وقت تیز بخار تھا۔ ماں بیٹی نے اس کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دیے۔ کاشو کی خصلت سے وہ واقف تھیں۔ جگنو کو اگر کچھ ہو جاتا تو وہ درندہ اُن کی زندگی اجیرن کر دیتا۔

کاشو واپس نہیں آیا۔ نولکھی اور اس کی ماں انتظار کرتی رہیں تاآں کہ اُنھیں اُس کی موت کی خبر ملی۔ کسی نے بتایا کہ ناگ پور کے قریب کاشو مارا گیا۔ نولکھی کو یقین نہیں آتا تھا کہ کاشو جیسا گراں ڈیل، چست و چالاک، چاروں طرف آنکھیں کھلی رکھنے والا شخص اتنی آسانی سے کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ اس نے انتظار کیا۔ رفتہ رفتہ کاشو کے دیے ہوئے پیسے اور کچھ اپنی جمع پونجی سب کچھ وقت کی بازی گری میں چھو ہو گیا۔ ماں کو بمبئی کی آب و ہوا راس نہیں آئی تھی۔ اُس کے ہاتھ پیروں کو سمندر کی ہوا نے کھوکھلا کر دیا تھا۔ بچوں کی دیکھ بھال وہ ایسی مستعدی سے نہیں کر سکتی تھی۔ تاہم فاقوں سے تنگ آکے نولکھی نے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ اُس کے پاس ایک ہی ہنر تھا، جو بے چہرہ لوگوں میں نہیں ہوتا۔ آس پاس کے چند لوگوں نے شروع شروع میں اُس کی مدد کی۔ پھر وہ مطالبے کرنے لگے۔ نتیجتہً نولکھی کو چند لوگوں سے رسم و راہ رکھنی پڑی۔ اس طرح ایک روز بنارسی اُن کے گھر آگیا۔ کاشو نے نولکھی سے اپنے چھوٹے بھائی کا بہت تذکرہ کیا تھا۔ دونوں میں کوئی عداوت نہ تھی تو یگانگت بھی نہیں تھی، دونوں اپنے اپنے راستے چلتے تھے۔ حالاں کہ کاشو ہی بنارسی کو بمبئی لایا تھا۔ یہاں آکے کاشو کے بہ قول، وہ وقت سے پہلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ نولکھی نے جگنو اور دیوا کے بارے میں بنارسی کو کچھ نہیں بتایا تھا مگر بدقسمتی سے ایک روز اُس کی بوڑھی ماں کی زبانی نکل گیا کہ دونوں بچوں کو کاشو اُن کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ ماں نے اپنی دانست میں احتیاط کی تھی کہ بعد

میں کسی وقت بنارسی کو سچ کا علم ہوا تو نہ جانے کیا قیامت برپا کرے۔ یہ سُن کے بنارسی کئی دن غائب رہا، واپس آیا تو بہت کشیدہ و کبیدہ تھا۔ نولکھی نے ٹوہ لینے کی کوشش کی لیکن بنارسی کی مرضی کے بغیر اُس سے کچھ جان لینا کارے دارد تھا۔ ابتدا ہی میں نولکھی کو دونوں بھائیوں کے فرق کا خوب اندازہ ہوگیا تھا۔ کُتّے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے مختصر یہ کہ بنارسی کسی طور اپنے بھائی کا ہم سر نہیں تھا۔ کاشو کو بات سننا آتا تھا، بنارسی صرف اپنی بولی سنتا، اپنی بولی سمجھتا تھا۔ نولکھی نے کہا کہ کاشو کی موت اور بنارسی کی آمد کے دوران وہ بمبئی چھوڑ کے کہیں چلی جاتی تو شاید سب بدلا ہوا ہوتا لیکن اِدھر کاشو کی موت کی خبر دیر سے آئی، اُدھر جگنو اور ردیوا، دو چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہونے کی وجہ سے وہ کہیں اور جا کے قسمت آزمانے کا حوصلہ نہ کرپاتی، اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز بنارسی آجائے گا اور اپنا ہی گھر نولکھی کے لیے زنداں بن جائے گا۔

جگنو اور ردیوا گُنگ بیٹھے تھے۔ آج پہلی مرتبہ نولکھی نے اُن کے اور اپنے بارے میں اتنا کچھ کہا تھا۔ جگنو اور ردیوا پر متضاد کیفیتیں طاری تھیں۔ خوف، رنج، خوشی، غصہ، حیرت۔ طرح طرح کے سوال اُن کا سینہ متلاطم کیے ہوئے تھے مگر اُنھوں نے کچھ نہیں پوچھا۔ غالباً اِس اندیشے سے کہ نولکھی کی زبان میں لکنت نہ آجائے یا وہ کوئی ایسی بات نہ پوچھ بیٹھیں جس کا جواب دینا، اپنے آپ سے نبرد آزما شکستہ جاں نولکھی کے لیے مشکل ہو یا جو جواب سننا خود ان کے لیے عذاب۔ وہ بُتوں کی طرح گُم سُم بیٹھے سنتے رہے۔

سب کی نظر شمع پر رہتی ہے۔ خود شمع کتنے اندھیروں سے دوچار ہے، یہ کوئی نہیں جانتا، نولکھی نے اُنھیں بتایا کہ بچپن ہی سے اندھیروں نے اُس کا گھر دیکھ لیا تھا۔ وہ چند سال کی تھی کہ باپ کا انتقال ہوگیا، کچھ عرصے بعد اکلوتا بڑا بھائی ملیریا میں چل بسا۔ وہ غازی پور کے ایک چھوٹے سے زمیں دار یا ایک بڑے کسان کی بیٹی تھی جس کے پاس اپنا ایک معقول قطعۂ اراضی تھا۔ باپ گوشہ نشین آدمی تھا، اُدھر قریب میں کوئی غیرت مند عزیز نہیں تھا جو ماں بیٹی کا سہارا بنتا۔ شوہر اور بیٹے کے صدمے سے نیم جاں نولکھی کی ماں نے ناچار کاشت کاری کے کاموں کی نگرانی شروع کی لیکن زمین کو غالباً مردوں سے کوئی خاص رغبت ہے جبھی اس زنِ نادار کے ہاتھ سے نکلتی گئی۔ ایک چھوٹا سا قطعہ گزر اوقات کے لیے رہ گیا۔ وہ بھی نکل جاتا مگر ایک رات کاشو اُن کے گھر آدھمکا۔ نولکھی جوان ہوچکی تھی اور ماں کو اس کی بہت فکر تھی۔ ایک چینی کہاوت ہے، حسین لڑکی کی منگنی اس کے پالنے میں ہوجاتی ہے، نولکھی کے کئی رشتے آئے۔ جگنو اور ردیوا اندازہ کرسکتے تھے کہ ارد گرد کے کتنے لوگوں نے نولکھی کو گھر لانا چاہا ہوگا۔ ماں ابھی کوئی فیصلہ نہ کرپائی تھی کہ کون سا گھر اور کون سا بر نولکھی کے لیے موزوں رہے گا کہ کاشو آگیا۔

اُس رات ماں بیٹی اپنی ایک قدیم ملازمہ کے ساتھ گھر میں سو رہی تھیں۔ ملازمہ کا عمر رسیدہ شوہر غازی پور سے باہر کسی میلے میں گیا ہوا تھا۔ وہ موجود ہوتا بھی تو کیا فرق پڑتا۔ بہرحال تینوں عورتیں گھر میں اکیلی تھیں کہ پہلے کھٹکے پر نولکھی کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، اپنے سامنے ایک خشم ناک، خنجر بدست شخص کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ وہ کاشو تھا۔ اس نے بتایا کہ پولیس اس کے پیچھے ہے، جب تک پولیس کا خطرہ ٹل نہیں جاتا، وہ گھر میں چھپا رہے گا۔ کوئی بھی مطلق پریشان نہ ہو۔ اس کے ساتھ اعانت کی گئی تو وہ خاموشی سے چلا جائے گا اور اس خدمت کا صلہ الگ دے گا اس نے ان تینوں کو ایک گوشے میں بیٹھ جانے کا حکم دیا، اسی اثنا میں اس کی نظر نولکھی پر پڑی۔ نولکھی کی ماں اور خود نولکھی نے اپنے آپ کو بہت چھپانا چاہا، حُسن و جمال بھی مال و زر کی طرح ہوتا ہے، ڈھکا چھپا رہے تو بد نگاہی سے محفوظ رہتا ہے۔ کاشو اپنے آپے میں نہ رہا نولکھی کو دیکھ کے وہ سب کچھ بھول بیٹھا کہ کہاں ہے۔ اسے اتنا بھی یاد نہ رہا کہ انھی لوگوں نے پناہ دی ہے مگر پناہ تو اس نے خود حاصل کی تھی، خنجر کے زور پر، اور خنجر اسی کے پاس تھا۔ وہ خود بھی کسی خنجر سے کیا کم تھا۔ ملازمہ کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ کاشو کی ایک ضرب سے وہ بے سُدھ ہوگئی۔ نولکھی کی ماں نے مزاحمت کرنی چاہی مگر کاشو جیسے قوی ہیکل کے سامنے وہ کتنی دیر ٹکتی۔ نولکھی ویسے ہی اَدھ موئی ہوچکی تھی۔

نولکھی کے بہ قول، وہ اسی رات مرگئی تھی۔ موت اور کیا ہوتی ہے۔ یہ دوسری نولکھی ہے جس نے اُس سیاہ رات کو ایک اور جنم لیا تھا۔ کاشو نوٹوں کی گڈّی اور سونے کی چوڑیاں اس کے سرھانے ڈال کے کسی وقت چلا گیا۔ نولکھی کو چپ لگ گئی۔ ماں اور ماں جیسی ملازمہ نے بہت منت سماجت کی کہ جو لکھا ہوتا ہے، اُس سے مفر نہیں ہے، کوئی بھی اسے ٹال نہیں سکتا۔ آدمی تو بہت بے بس ہے۔ ماں نے اپنے لیے بیٹی سے زندگی کی بھیک مانگی۔ نولکھی کہہ رہی تھی، اب کیا رہ گیا تھا۔ وہ خود کو ختم کرلیتی۔ یہ اس کی ماں ہی تھی جس نے اُسے مرنے نہیں دیا اور اپنی بیٹی پر اور ستم کیا۔ ایک شورہ پشت اجنبی کے گھر

میں داخل ہونے کے واقعے سے صرف ملازمہ واقف تھی جس کی ایثار پیشگی اور وفا خوئی پر ماں بیٹی کا ایمان تھا۔ اُس کے سوا پھر کون تھا۔ جس نے باہر جا کے نولکھی اور اُس کی ماں کے دیے ہوئے کسی پرانے زخم کا قرض وصول کیا۔ دو تین روز میں پاس پڑوس کا ہر شخص ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتا پھر رہا تھا کہ تم نے کچھ سُنا ہے۔ ماں بیٹی نے خود کو گھر میں محبوس کرلیا۔ ماں کس کس سے جا کے کہتی کہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا، انھوں نے کسی کو اپنے گھر نہیں بلایا تھا۔ یہ بجلی تو کسی کے بھی گھر گر سکتی تھی، اُس رات اُن کا آشیانہ زد پر آگیا۔ ماں بہت متوحش تھی کہ وہ ہر ایک کے پاس جا کے اپنی صفائی کیا پیش کرے۔ لوگ کہنے پہ آئیں تو سننا ہی نہیں چاہتے۔ اپنے پرائے سب بیگانے نظر آتے تھے۔ اپنا آپا بھی بیگانہ، ایسی بے بسی کہ آدمی کو اپنا سایہ بھی پرایا لگے مگر نولکھی کو جیسے کچھ خبر ہی نہ تھی۔ کوئی گلہ نہ شکوہ، دعوا نہ مطالبہ۔ گھر کی دیواروں کے باہر اپنی رسوائیوں سے اُسے کوئی غرض نہیں تھی۔ ماں نے زندگی کی نیرنگیاں افراط سے دیکھی تھیں سو اُس میں تھوڑی بہت استقامت تھی یا استقامت اور اُمید لازم و ملزوم ہیں آنے والے اندھے لمحوں سے روشنی کی اُمید! کہتے ہیں یہ اثبات محض گمان بھی نہیں۔ کبھی بہت سی روشنی مل جاتی ہے۔ آدمی کو اپنے محبس میں کوئی ایک روزن کُھلا رکھنا چاہیے۔ نولکھی کی ماں کو ویسے بھی آسرے اور آس کی عادت تھی۔

کوئی چوتھے دن، آدھی رات کے وقت جب ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، کاشو پھر آگیا، ملازمہ اور اس کے شوہر کی رفاقت کا اب کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ دونوں ماں بیٹی اکیلی تھیں۔ لٹنے کے لیے اب اُن کے پاس اور تھا بھی کیا۔ کاشو کو دیکھ کے نولکھی کے سراپا میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ ماں البتہ ٹھٹھر کے رہ گئی۔ کاشو کے ہاتھ میں اس وقت خنجر نہیں تھا۔ خنجر کی بے اثری کا اب شاید اُسے اندازہ تھا۔ آتے ہی اس نے حواس بجا رکھنے کو کہا اور تسلی دی کہ وہ کسی اور ارادے سے نہیں آیا ہے۔ اُس کے لہجے میں حکم بھی تھا، معاملہ فہمی بھی تھی۔ اُس نے کہا کہ دونوں اچھی طرح اُس کی بات سنیں اور سمجھ لیں کہ اُسے زیادہ بات کرنا اور تکرار کرنا نہیں آتا۔ اس نے حتمی آواز میں کہا کہ وہ انھیں لے جانے آیا ہے، یہاں سے دُور۔ جو کچھ اُن کے پاس نقدی زیور ہے، وہ سمیٹ لیں اور باقی سارے گھر بار اور زمین وغیرہ کا خیال چھوڑ کے اُس کے ساتھ چلیں اور خاطر جمع رکھیں، بعد میں سب چیزوں کا ازالہ ہوجائے گا۔ اُس نے اعتراف کیا کہ اُس رات اس سے بڑی چُوک ہوگئی تھی۔ اُسے معلوم ہے کہ اس کے بعد اُن کے لیے زندگی کتنی تنگ ہوگئی ہے۔ وہ اُن کے بارے میں ساری واقفیت حاصل کرکے آیا ہے اور ندامت کا اظہار کرنے نہیں آیا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں۔ یہ زبان اُسے نہیں آتی۔ اس کی دوبارہ آمد محض نولکھی کی وجہ سے ہے کیوں کہ وہ نولکھی سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا۔ وہ فقرہ جو ہر سرکش اور کج رَو کے ورد زباں ہوتا ہے، کاشو نے بھی دُہرایا کہ ایک بار کوئی چیز اُسے پسند آجائے تو ہر قیمت پہ وہ اُسے حاصل کرلیتا ہے۔ سو وہ نولکھی کو لینے آیا ہے۔ جو ہوچکا، اُسے بھول جانا ہی مناسب ہے۔ گیا وقت لَوٹ کے نہیں آتا لیکن آنے والے دن نولکھی کے ہوں گے۔ اُس نے کہا، کاشو جب کچھ کہتا ہے تو اس کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ نولکھی خوش رہے گی اور نولکھی کی خاطر، نولکھی کے لحاظ میں وہ اُس کی ماں کو بھی ساتھ لے جانے کو کہہ رہا ہے۔ اچھا ہے کسی چون و چرا کے بغیر وہ اُس پر اعتماد کریں۔ اس کے سوا اُن کے پاس کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ وہ خوش اسلوبی سے آمادہ ہوجائیں گی تو اُنھی کے حق میں بہتر ہوگا ورنہ اُس کے آدمی اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں۔

بمبئی میں نولکھی کے پاس اُس کے گھر جیسا گھر تو نہیں تھا لیکن سر چھپانے کے لیے بہت تھا۔ گھر شاید اسی کو کہتے ہیں جہاں مکینوں کی عمل داری ہو۔ شروع میں در و دیوار سے ماں بیٹی کا رویہ مغائرت کا تھا لیکن جلد ہی اُنھیں احساس ہوگیا کہ یہ گھر اُنھی کا ہے اور اُنھیں کہیں اور نہیں جانا، اور جلد ہی اُنھیں یہ تجربہ بھی ہوا کہ پڑوسی بولیاں، طور طریقے کتنے ہی مختلف ہوں، آدمی ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ نئی زمین اور نئے لوگوں سے اُن کی مفاہمت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُن کے پاس کاشو کے بہ قول کوئی راستہ نہیں رہا تھا بلکہ اس کی وجہ خود کاشو تھا جس نے اُن کے لیے سارے دروازے کھلے رکھے تھے اور کوئی سمت اب اُنھیں خود نظر نہیں آتی تھی۔ کاشو کبھی روزانہ، کبھی ناغوں سے وہاں آتا تھا مگر کسی گھر ہی کی طرح۔ اُس نے کبھی اُن کی عمل داری میں دخل نہیں دیا۔ بمبئی آکے نولکھی اور اُس کی ماں کو کاشو کے بارے میں اور بھی باقی کچھ معلوم ہوا تھا کہ کاشو پاڑے کا آدمی ہے، اس کا ایک علاقہ ہے جہاں کوئی دوسرا کاشو سر اُٹھا کے نہیں چل سکتا۔ نولکھی کی ماں کاشو کے گھر آنے پر کونوں میں سمٹ جاتی تھی اور بیٹی کو اشاروں اشاروں میں احتیاط کی تلقین کرتی تھی کہ یہ شیوۂ محکومیت بھی ناگوارِ خاطر ہوسکتا ہے، گویا مطلق محکومیت یا ساکت و جامد محکومیت میں بھی ضرر کے اندیشے ہیں۔ ماں سمجھ نہیں سکی تھی کہ نولکھی کے کسی شغل و عمل میں اس کی نیت کی تنگی یا ارادے

کی کوتاہی شامل نہیں ہے۔ یہ شیوۂ تسلیم و رضا تو کسی خودکار عمل کی طرح ہے اور کسی خوف کا حاصل نہیں۔ نولکھی کو کاشو سے بالکل خوف نہیں آتا تھا۔ کاشو ہی کیا، نولکھی کو اب کسی چیز سے خوف نہیں آتا تھا، اندھیری رات، بچھو، آسمان کی گرج چمک، پتھروں پر جس طرح سب گزر جاتا ہے معلوم نہیں، ایسی اطاعت جو خوف پر قائم ہو، حاکم کے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ کاشو میں سوجھ بوجھ کی کمی نہیں تھی۔ اُسے بھی علم ہوگا کہ نولکھی کی محکومیت، نولکھی کے ارادے کی تابع نہیں ہے بلکہ نولکھی کے پاس اب کوئی ارادہ ہے ہی نہیں۔ یہ صورت کاشو کو کسی اذیت سے دوچار کرتی تھی یا سرخوشی کا باعث تھی۔ یہ کاشو ہی بہتر جانتا تھا۔ بمبئی آنے کے بعد، بہرحال، کاشو نے اونچی آواز میں کبھی نولکھی سے بات نہیں کی۔ اس کی آمد پر نولکھی اُس کے سامنے حاضر ہوجاتی اور خاموش ہی رہا کرتی۔ اُسے کاشو پر غصہ آتا تھا نہ کاشو کے قُرب سے اُس کے چہرے پر غم کی گھٹائیں بھٹکتی تھیں۔ کاشو اُس کے لیے نئے کپڑے زیور، خوشبو اور پھول لاتا۔ نولکھی انھیں اپنے بدن پر سجا لیا کرتی۔ کاشو کی خوشنودی کے لیے نہیں، کاشو کے جانے کے بعد بھی وہ ایسی سجی بنی رہتی تھی اور اس کے قدم آئینے کی طرف نہیں اُٹھتے تھے۔ کسی شخص کا آئینے سے واسطہ نہ رہے تو یہ زندگی کا کون سا درجہ ہے؟ یہ سوال جگنو نے مجھ سے نہیں کیا تھا، جگنو کی باتوں سے خود بہ خود میرے ذہن میں منڈلایا۔

کئی سال گزر گئے اور نولکھی کو پہلی بار کاشو سے اُس وقت خوف آیا جب وہ جگنو اور ردیوا کو اس کے پاس چھوڑ کے گیا۔ کاشو کی ہدایت کے بہ موجب نولکھی نے پہلے پہل انھیں کاشو کی امانت ہی کے طور پر برتا لیکن جگنو اور ردیوا کو ہمہ وقت نولکھی اور اس کی ماں کی ضرورت تھی۔ بچّوں کو اپنی طرف توجہ مبذول کرانے کا فن آتا ہے۔ وہ انھیں ہمکتی نگاہوں سے دیکھتے تھے، حسرت بھری، اشتیاق بھری نظروں سے۔ وہ ہردم جاری و ساری زندگی کی علامت تھے، ایک مسلسل سویرا، ایک مستقل مداوا۔ یہ وہی تھے جو نولکھی کے گم گشتہ ارادے کی بازیابی کا سبب بنے۔ وہ اتنے سادہ و معصوم، ایسے چینی کے گڈّوں کے مانند تھے کہ نولکھی کا بس نہیں چلتا تھا، انھیں اپنی آنکھوں میں بسا لے۔ جگنو اور ردیوا کو چند ٹوٹے پھوٹے لفظوں پر مشتمل زبان آتی تھی، جگنو کو تو اور بھی کم، مگر نولکھی اُن کی ہر جنبش لب سے ایک جہان معانی اخذ کرلیا کرتی۔ اُن کا بھی یہی حال تھا، کہتے ہیں، بچّے بہت کچھ آنکھوں سے سنتے ہیں جو انھیں نہیں آتا تھا۔ نولکھی کا سارا کہا ہُوا دونوں خوب سنتے، خوب سمجھتے تھے۔ رات دن وہ ایک دوسرے سے کسی راز و نیاز میں محو رہتے۔

جگنو اور ردیوا نے نولکھی کو بہت پریشان، بہت ہلکان کیا انھوں نے دوبارہ اُسے خوف آشنا کیا۔ کسی وقت بھی کاشو واپس آسکتا تھا۔ اُس کی آمد کے خوف نے نولکھی کو بہت مضطرب اور منتشر کیا ہوا تھا۔ وہ طرح طرح کے منصوبے بناتی کہ کاشو آئے گا تو وہ اُنھیں واپس نہیں کرے گی، صاف انکار کردے گی۔ کاشو کسی سوغات کے لیے بہت پوچھا کرتا ہے۔ وہ اُس سے کہہ دے گی کہ کوئی زیور، لباس، کوئی سوغات نہیں چاہیے۔ جانے وہ کیا کیا سوچا کرتی، کاشو آئے تو اُسے زہر کیوں نہ دے دے۔ اس کے آنے سے پہلے وہ سب کہیں بھاگ کیوں نہ جائیں۔ اتنی بڑی دُنیا ہے، کاشو اُسے کہاں کہاں ڈھونڈ سکے گا۔ دوچار دن کی بات ہوتی تو نولکھی کے لیے جگنو اور ردیوا کی جدائی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ دن بہت ہوگئے تھے، اور جتنا وقت بڑھتا جا رہا تھا، کاشو کی آمد کی ہیبت سے نولکھی اتنی ہی ناتواں ہوتی جارہی تھی۔ تمام خوف زندگی کی طلب سے عبارت ہے۔ نولکھی کو اب زندگی کی شدید طلب تھی

بہت دن گزر گئے۔ کاشو نہیں آیا، اس کی موت کی خبر آئی۔ یہ سُن کے نولکھی پر جانے کیوں سکوت طاری ہوا اور وہ پہروں آنسو بہاتی رہی۔ اِدھر ماں نے اُسے ٹوکا کہ کاشو کا نہ آنا، جگنو اور ردیوا کے لیے کسی اور کے نہ آنے کی ضمانت نہیں ہے۔ نولکھی بھی اِس حقیقت سے واقف تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کاشو کی موت کے تیقن کے باوجود دروازے پر بھٹکتی آہٹوں سے اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، دروازے پر بار بار اُسے اجنبی دستکوں کا گمان ہوتا۔ کچھ دن اور بیت گئے مگر کوئی نہیں آیا۔ نولکھی کو کسی قدر قرار آنے لگا لیکن اُس نے دوسری طرف غور ہی نہیں کیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ماں کی پس انداز پونجی دقت بُرد ہوگئی۔ کچھ عرصے تک زیوروں نے ساتھ دیا لیکن جب وقت ہی ساتھ نہ دے!

نولکھی کو اپنی فکر نہیں تھی، جگنو اور ردیوا کے لیے ایک ذرا سی دھوپ بھی اُسے گوارا نہ تھی۔ اُنھیں چھاؤں دینے کے لیے نولکھی کو گھر سے نکلنا پڑا۔ نہ معلوم آگے اُسے اور کہاں تک جانا پڑتا کہ اس اثنا میں بنارسی آگیا۔

زندگی بھر کا ساتھ بھی بسا اوقات فاصلے کم نہیں کرتا اور بعض لوگ بہت دور رہتے ہوئے، بہت وقت گزرنے کے بعد بھی ہم دم ساتھ رہتے ہیں۔ آدمی سے آدمی کے فاصلے کی پیمائش کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کا تعلق وقت سے ہے نہ منزلوں سے۔ کاشو، کم سے کم جب تک گھر میں ہوتا، اُن کے ساتھ رہتا تھا مگر وہ اس کے ساتھ نہیں رہتے تھے۔ اتنی گرہوں کے لیے ایک جُگ کی گرد بھی کم ہے۔ بمبئی آنے کے چند دنوں

ھی کی آزمودہ کار ماں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اُس نے اپنی قدیم ملازمہ ِسلوک کیا۔ ملازمہ نے باہر جا کے افترا پردازی نہیں کی تھی کہ اُس ن کے گھر ایک خنجر بہ دست شخص آیا تھا اور اس نے سب کو بے بس تھا، اُس نے نولکھی سے اُس کی متاع چھین لی۔ یہ کاشو تھا جس ھا پاس پڑوس میں اپنی ستم رانی کی داستان عام کرائی۔ ملازمہ نے کو بیٹی کی طرح پالا تھا۔ اس نے نمک کا حق ادا کرنے کی ہر طرح ش کی ہوگی مگر سب کو جزئیات کے ساتھ سارا کچھ معلوم تھا۔ ملازمہ کھاتی کہ پڑوسیوں کی زبانی یہ تفصیل جان کے اُسے خود حیرت تھی۔ لوگ اس سے تصدیق چاہتے تھے۔ اس کے بہ قول، اُس نے انکار کردیا تھا لیکن مبالغے کی تردید نہ کرنا اس کے بس میں نہیں دگا۔ اُس وقت نولکھی کی ماں کے ہوش و حواس یک جا نہیں تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ملازمہ کے سوا گھر میں اور کون دتھا؟ بمبئی میں نولکھی کے تئیں کاشو کی وارفتگی دیکھ کے ماں نقل میں آیا کہ اس رات کوئی فوج پولیس کاشو کے پیچھے نہیں تھی، ب دکھاوا تھا۔ وہ پورے ارادے سے اس کے گھر میں داخل ہوا ا کیوں کہ، یقیناً اُس نے پہلے کہیں نولکھی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ ِسکتا ہے، وہ دوبارہ کبھی اُس گھر کا رُخ نہ کرتا لیکن اُس رات ں نے نولکھی کو بہت قریب سے دیکھا تھا، پھر نولکھی سے دور رہنا ں کے لیے ممکن نہ رہا اور نولکھی کے حصول کے لیے ایک ہی دردناک ریقہ اس بے درد کے دماغ میں آیا کہ وہ ہر طرف کانٹے بچھا دے۔ شوہر اور بیٹے کی جدائی سے شکستہ حال عورت، نولکھی کی ماں، جو کسی طرح تیز ہواؤں کا سامنا کرتی رہی تھی، چند دنوں میں حوصلہ ار بیٹھی۔ صیاد ایک اور سوانگ بھر کے پھر آیا تھا۔ نولکھی کی ماں کے پاس انکار کے لیے تنکے کا بھی سہارا نہ تھا۔ وہ نظر دوڑاتی تو ارد گرد کوئی ایسا نہ تھا جو چند لفظوں کے گداز کی فیاضی کرتا۔ کاشو نے جیسے سب کو اندھا کردیا تھا۔ نولکھی کی ماں خزاں ختم ہونے کے آسرے ں وہاں ٹھہر جاتی، کچھ عرصے میں، ممکن ہے یہ بے امانی بے سروسامانی ر رہتی مگر نولکھی کی ماں کب تک وضاحتیں کرتی رہتی۔ اپنی بیٹی کے لیے وہ کس کس کے آگے درگزری کی بھیک مانگتی۔

نولکھی کہتی تھی کہ مرتے دم تک اس کی ماں کی زبان پر ملازمہ کا ذکر تھا۔ اُسے یہی خلش تھی کہ غازی پور جا کے وہ اپنی ملازمہ سے معافی نہ مانگ سکی۔ نولکھی نے ماں کی دل بستگی کے لیے وعدہ کیا تھا کہ وہ چوری چھپے سہی، کسی طرح، ایک بار غازی پور ضرور جائے گی۔ نولکھی کو ماں سے کیے ہوئے وعدے کی تکمیل کی مہلت نہ مل سکی۔ کاشو ہوتا تو شاید یہ کبھی ممکن ہوجاتا مگر بنارسی کا رنگ ڈھنگ اپنے بھائی سے بالکل الگ تھا۔ نولکھی کہتی تھی، یہ وہی تھا جس کے آنے کے بعد اس کی ماں کی کمر ڈھے گئی۔ وہ زیادہ دنوں تک اپنی بیٹی کا ساتھ نہ دے سکی۔ بعض لوگ اوجھل ہوجانے کے بعد زیادہ نمایاں ہوجاتے ہیں۔ کاشو کے چلے جانے کے بعد ماں بیٹی کو اس کے اندھیرے اُجالے کا اندازہ ہوا۔ بنارسی نے یہ احساس اور سوا کیا۔ کاشو میں جتنا غضب تھا، اتنا تحمل بھی تھا۔ اسے ہر طرح کی زبان آتی تھی، نرمی کی، سختی کی۔ یہی نہیں کہ کاشو نے اپنے ایک دو مقرّب ترین ساتھیوں کے سوا کسی سے بمبئی میں نولکھی اور اپنے اس گھر کا تذکرہ نہیں کیا تھا، بلکہ نولکھی کا کہنا تھا، اُسے یقین ہے، اُسے ایک نئے گھر میں بسانے کے بعد بمبئی میں کاشو کا کوئی دوسرا گھر نہیں تھا۔ ہو بھی تو اس نے کبھی نولکھی سے اس بابت کوئی اشارہ نہیں کیا۔ بنارسی کے آنے پر نولکھی کو بہت کچھ یاد آتا تھا۔ لگتا تھا، بنارسی بھی یہی کچھ جتانے آیا ہے، لگتا تھا جیسے وہ اپنے بڑے بھائی کا کوئی قرض وصول کر رہا ہو مگر ایسا نہیں تھا۔ بنارسی کو کاشو سے ایسا کوئی علاقہ نہیں تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو کبھی اپنے آپ کو بھول جاتے ہوں، جو کبھی اپنے سوا، دوسروں کے بارے میں بھی فکرمند ہوتے ہوں، اپنے بھائی ہی کے لیے سہی۔

نولکھی ہانپنے لگی۔ جگنو اور ردیوا اُس کے دائیں بائیں بیٹھے وحشت زدہ آنکھوں سے سب کچھ سُنا کیے۔ نولکھی اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن مسلسل بولتے رہنے سے اس کے سینے میں دم نہیں رہا، اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ نولکھی نے بے شک جگنو اور ردیوا کو باہر نہیں جانے دیا تھا، خود انھیں بھی اپنے دل و دماغ کے سنّاٹے میں کسی وید حکیم کے پاس جانے کا ہوش نہیں رہا۔ نولکھی کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ ذرا بھی دیر کی جائے۔ وہ اندر کمرے سے پھول وتی کو بلانے کے لیے آواز دینا چاہتے تھے مگر پھول وتی تو اُن کے قریب ہی موجود تھی۔ جانے وہ کب سے سامنے، کونے میں کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔ اُسے دیکھ کے دونوں یک لخت اُٹھ گئے۔ وہ دروازے تک نہیں پہنچے تھے کہ نولکھی کی کرب ناک صداؤں نے ان کے قدم لڑکھڑا دیے۔ "نہیں نہیں، میری بات سُنو، اب کوئی فائدہ نہیں۔" وہ لرزتی ڈوبتی آواز میں بولی کہ کیوں وقت ضائع کرتے ہو، پھول وتی کو لے کے فوراً یہاں سے نکل جاؤ، جب تک تم نہیں جاؤ گے، میں تڑپتی رہوں گی۔ نولکھی نے ان سے کہا کہ وہ اُسے پُرسکون موت دینا کیوں نہیں چاہتے۔

جگنو اور دیوا بچوں کی طرح سسکنے لگے، عاجزی سے بولے کہ وہ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اُسے نہیں مرنے دیں گے اور یوں چھوڑ کے نہیں جائیں گے۔

جگنو کہہ رہا تھا کہ نولکھی اُن کے آگے ہاتھ جوڑ کے بولی کہ اب اُسے کوئی دوا نہیں چاہیے۔ دوا کا وقت گزر چکا ہے۔ اُس نے اُن سے کہا کہ وہ سمجھتے کیوں نہیں، اُس کے لیے اس سے بڑا دکھ کیا ہوگا کہ آخری وقت میں اس کے جگر گوشے سرہانے نہ ہوں مگر وہ کچھ جان کے ہی اُن سے یہ بنتی کر رہی ہے، بنتی نہیں تو اسے اُس کا حکم سمجھا جائے۔ کہنے لگی کہ وہ پھول وتی کو دوسری نولکھی بنانا نہیں چاہتی۔ وہ بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ نولکھی کی کہانی کسی طور دہرائی جائے۔

نولکھی مسلسل اُن سے التجا کرتی رہی۔ جگنو اور دیوا نے اسے سمجھانا چاہا کہ ایسا اندھیر نہیں ہے۔ وہ وقت اور تھا، اور یہ غازی پور نہیں، بمبئی ہے۔ وہ آخر دم تک پھول وتی کی حفاظت کریں گے۔

وہ اُسے جانے کیا کیا تسلیاں دلاسے دیتے رہے مگر اُن کی آواز خود اُنھیں مطمئن نہ کرتی تھی، نولکھی پر کیا اثر ہوتا۔ نولکھی کے چہرے پر اور وحشت اُتر آئی، وہ بے کلی سے بولی کہ وہ کچھ سننا نہیں چاہتی، کوئی تاویل، کوئی دلیل۔ سب سے بڑی دلیل بنارسی ہے، جگنو اور دیوا بنارسی کو اُس سے زیادہ نہیں جانتے۔ بنارسی، کا شو نہیں ہے اُس سے کچھ بھی بعید نہیں۔ بنارسی کا اپنے سوا کسی سے کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے۔ بہتر ہے کسی پس و پیش کے بغیر جگنو اور دیوا نولکھی کی خواہش کی تکمیل کریں، یہی سمجھ کے کہ یہ اس کی آخری خواہش ہے یا وہ نولکھی کا کوئی حق ادا کر رہے ہیں، اس پر کوئی احسان کر رہے ہیں۔

جگنو اور دیوا اس طرح کیسے جا سکتے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ بنارسی نے پھول وتی کے لیے کوئی ایسی ویسی بات ضرور کہی ہو گی جو نولکھی اس قدر بے چین ہے۔ اُن کی سمجھ میں اور بھی بہت کچھ آ رہا تھا جو نولکھی کہہ نہیں پا رہی تھی، مگر نولکھی سے آنکھیں پھیر کے گھر سے نکل جانے کی استطاعت اُن میں نہیں تھی۔ پھول وتی بھی سب سُن رہی تھی۔ دونوں بھائیوں نے مضطربانہ اُس کی طرف دیکھا۔ اُن کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ پھول وتی سے اُس کی رائے پوچھیں لیکن کچھ پوچھنے کی ضرورت کیا تھی۔ پھول وتی کوئی اُن سے الگ تو نہیں تھی۔ وہ ماں کے سینے سے لپٹی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ نولکھی اپنے ناتواں بازوؤں میں کبھی اُسے سمیٹ لیتی، کبھی پرے دھکیلنے کی کوشش کرتی۔ وہ ہذیان بکنے لگی تھی کہ پھول وتی اُسے چھوڑ دے، سب اُسے چھوڑ کے چلے جائیں۔ وہ آرام سے مر جائے گی۔ اب دیر بھی کتنی رہ گئی ہے۔ چند سانسوں کا پھیر ہے۔ کہنے لگی، سب اُسے مرا ہوا دیکھنے ہی پر کیوں مُصر ہیں۔ بعد میں جانے کیا ہو جائے، کیا نہ ہو جائے، نولکھی پر خفقان طاری تھا۔ آخر وہ بے حال ہو گئی۔ پھر دیوا کسی کو بتائے بغیر باہر نکل گیا۔ بھاگتا بھاگتا وہ قریب کے ایک معمر وید کے پاس پہنچا۔ وید پہلے اُن کے گھر آ چکا تھا۔ وہ نولکھی کو دیکھ کے بڑبڑانے لگا کہ اِسے یہ کیا ہو گیا ہے، ابھی کچھ عرصے پہلے تو خاصی بہتر تھی۔ وید طرح طرح کے سوال کرنے لگا کہ یہ کس کے زیرِ علاج ہے، کیا کھاتی پیتی رہی ہے۔ دیر تک وہ نولکھی کی نبض ٹٹولتا رہا۔ اس نے چند دوائیں تجویز کیں اور اپنے چوبی بکسے سے کچھ مشروبات نکال کے بہ مشکل نولکھی کو پلائے وہ ایک تند مزاج شخص تھا۔ اُس نے کچھ خیال نہیں کیا کہ اُن تینوں پر کیا گزر جائے گی، کہنے لگا کہ دوا اپنی جگہ مگر اب دُعا کی زیادہ ضرورت ہے۔ صبح تک دیکھ لیں ورنہ اب یہی چارہ رہ گیا ہے کہ سرکاری اسپتال میں داخل کرا دیں۔ ممکن ہے، ولایتی علاج میں نولکھی کے لیے شفا لکھی ہو جاتے جاتے وید دروازے سے پلٹ آیا اور انھیں ہدایت کی کہ مریض کی دل جوئی بھی دوا کا کام کرتی ہے۔ وہ نولکھی کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے، سکھ پہنچانے کی کوشش کریں۔ اُس کے سامنے اونچی آواز میں بات بھی نہ کریں۔ دیوا، وید کے ساتھ جا کے مزید دوائیں لے آیا۔ دونوں وہیں، نولکھی کی چارپائی کے گرد بیٹھے رہے۔ پھول وتی ماں کی پائنتی پر سر رکھے سسکیاں بھرتی رہی۔ نولکھی کی جب بھی آنکھ کھلتی، اُس کا نحیف و نزار، سراپا پھڑکنے لگتا، اُس کی ویران آنکھیں بے قراری سے انھیں دیکھتیں اور لرزیدہ ہونٹوں پر کوئی شکوہ سا اُٹھ آتا اور وہ بے سُدھ ہو جاتی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں